Hitler Ki Aap Beeti

ہٹلر کی آپ بیتی

از

ایڈوولف ہٹلر

تعارف

ازقدوس صہبائی

اگر سکندر یونانی چنگیز خان اور نپولین تاریخی تذکروں میں ''اعظم'' کے لقب کے سزاوار ہیں تو یقیناً ہٹلر اعظم کی ترکیب لفظی بھی ناموزوں نہیں۔ اگر مصطفےٰ کمال کا نام صرف اس لیے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے یورپ کے مرد بیمار کو ایک مرتبہ پھر دنیا کی تنومند قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ تو پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی جس شکست خوردہ ذہنیت اور احساس کمتری کے تاریک غاروں میں گر چکا تھا وہاں سے اسے نکال کر دنیا کی زبردست ترین سلطنتوں کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے والا ہٹلر بھی کبھی انسانی حافظے کو فراموش نہ ہو گا۔

ہٹلر نے اس وقت منتشر ذہن رکھنے والے جرمنوں کو نہ صرف ایک زبردست طاقت کی صورت میں منظم کر دیا بلکہ انہیں ایک نیا فلسفہ دیا۔ اس فلسفے کا عنوان طاقت اور تشدد ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے دوررس اثرات نے آج جمہوری اور راشترا کی دونوں فلسفوں کو قابل عمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ''تزک ہٹلری'' کے مترجم مولانا ابراہیم علی صاحب چشتی کے الفاظ میں آج روسی اور امریکی دونوں بلاکوں نے۔

''ہٹلر کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا ہے کہ طاقت اور کامیابی ہی سچائی ہے۔۔۔۔ انگریزی، روسی اور امریکی عسا کر نے جرمن افواج کو میدان جنگ میں ضرور شکست دی لیکن وہ ہٹلری نظام فکر کو نہ مٹا سکے ہٹلر کے دشمن گو اس کے خلاف کامیاب ہیں لیکن اس کے فلسفہ اور طریق کار کے سامنے لاجواب ہیں۔۔۔۔ تشدد کے اس پیغمبر نے ایک عالمگیر جنگ میں ہوش سنبھالا دوسری جنگ لڑتے لڑتے دنیا سے روپوش ہوا اور اب اس کی تلقین تیسری عالمگیر جنگ کی تیاری کروا رہی ہے۔''

''تزک ہٹلری'' کا مترجم مفسر یا نقاد کا منصب اختیار نہیں کرنا چاہتا اس لیے یہ فرض

کسی سوانح نگار کے ذمے ہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ناظرین کو کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پیشتر ہٹلر کا تاریخی کردار کسی خارجی معیار پر پرکھنے کے لئے کچھ مواد مہیا کرے۔ جب آج کی دنیا میں ہر قابل ذکر سلطنت ہٹلر کے نظام فکر اور طریقہ کار ہی کو مختلف اصطلاحات کا جامہ پہنا کر کروڑہا معصوم اور بے زبان انسانوں کو جنگ کے جہنم میں جھونک دینے کی تیاریاں کر رہی ہے تو سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آخر کار کسی نہ کسی روز کوئی ایک ہٹلر کامیاب ہو جائے گا اور یہ جنگیں جو مختلف لفظی نعروں یا ذہنی اصطلاحوں کو سامنے لا کر لڑی جا رہی ہیں بجز بے گناہ اور فریب خوردہ افراد کا خون بہانے کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکیں گی کیا دنیا کی نجات ایک ہٹلر ہی کے عروج و دوام میں مضمر ہے۔

کوئی ذہن جس کا منتہائے مقصود عوام کی آسائش اور امن عالم ہو کبھی اس سوال کا جواب اثبات میں قبول نہ کرے گا جس طرح ہر ہٹلر کا عروج عوام کی پریشان حالی اور اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ہٹلر چند روزہ حکومت کے بعد فنا کی آغوش میں ناپید ہو جاتا ہے یا تو اس کے جانشین اس کے تشدد دانہ اور ظالمانہ طریقہ کار کو تباہ نہیں کر سکتے یا قدرت کے جذبہ انتقام کا سیلاب اس تشدد اور ظلم کی طاقت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے چنگیز کے مرتے ہی اس کی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو گیا لوئی شانزدہم کے مستبدادانہ کردار نے انقلاب فرانس کو جنم دیا فرانس کے انقلابی لیڈروں کے اعتدال سے تجاوز نے انہیں نپولین کے اقتدار سے پامال کروایا۔ اور خود نپولین کی ہوس **ملک** گیری برطانیہ کی حرص کشور کشائی کا شکار ہو گئی۔

ہٹلر بیشک ایک بے پناہ طاقت تھا اور ہٹلر کے معنوی فرزند بھی اس کے نقش قدم پر چل کر ضرور ایک تباہ کن طاقت ثابت ہوں گے لیکن ہٹلر کے فلسفہ تخریب اک دوام ممکن نہیں دائمی امن و سکون اور مسرت کے لئے بنی آدم کی فطری خواہش ایک ایک ہٹلر کو فنا کر کے دم لے گی جب تک دائمی سلامتی کارگاہ عالم پر چھا نہیں جاتی تب تک ظلم اور کفر کے

شیرازے اسی طرح بن بن کر منتشر ہوتے رہیں گے۔

ہٹلر کے آغاز اور انجام کا ایک نقشہ ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے ہٹلر سے ملیے اور چشم تصور سے دیکھئے کہ یہ فتنہ کس طرح پیدا ہوا۔ کیسے پرورش پائی اور کیا کیا گل کھلانے کے بعد کن نئے فتنوں کے بیج بو کر کس فتنہ سامانی سے روپوش ہو گیا۔

ہٹلر 1889ء میں بویریا (جرمنی) اور آسٹریا کی سرحد پر بمقام ''سرانوام ان'' پیدا ہوا موضع سرانو کا ایک گمنام اور آوارہ منش لڑکا کس طرح ایک روز یورپ کے آسمان پر ایک خونیں آفتاب بن کر چمکا یہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز کہانی ہے۔

ہٹلر کے باپ کا نام الوئس ہٹلر تھا وہ ایک موچی تھا جس کی زندگی اس کی پہلی بیوی کی امداد کے سہارے بسر ہوتی تھی بیوی کی مدد معاش سے میاں کسٹم انسپکٹر بن گئے نہ جانے اس داستان میں کہاں تک سچائی ہے لیکن فتح یاب اتحادی اپنی تحقیق کے بل پر دعوے کرتے ہیں کہ ہٹلر اپنی ماں کی ناجائز اولاد تھا اور ہٹلر کے ماں باپ کی رسمی شادی اس کی پیدائش کے مدتوں بعد پایہ تکمیل کو پہنچی ایسا واقعہ بھی ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ عیسائی یورپ کے رسم و رواج کے مطابق میاں بیوی کی شادی سے پہلے عرصے تک ایک دوسرے کی '' آزمائش '' کرتے رہنا۔ ایک عام دستور ہے اس شادی کے بعد ہٹلر کی ایک بہن پاؤلا 1897ء میں اور پھر ایک بھائی اڈورڈ پیدا ہوئے۔

ہٹلر کا عہد طفلی زندگی کی ہر مسرت سے محروم تھا باپ ہمیشہ ہٹلر کی اس آرزو کی مخالفت کرتا تھا کہ وہ ایک نقش کار یا آرٹسٹ بنے یہاں تک کہ خود ہٹلر کے بیان کے مطابق رفتہ رفتہ وہ اپنے باپ سے نفرت کرنے لگا۔ تقدیر نے اسے ماں کی آغوش محبت میں بھی زیادہ دیر سکون خاطر حاصل نہ کرنے دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ہٹلر کی زندگی میں کبھی اس سے سچی محبت کی ہی نہیں گئی سماج نے ہٹلر کے بچپن میں اس سے جو بدسلوکی روا رکھی تھی بڑے ہو کر ہٹلر نے تمام دنیا سے اس کا خوفناک انتقام لیا سچ ہے برے اسباب کے نتیجے بھی ہمیشہ برے ہوتے ہیں جو قوم اپنے نونہالوں کو گناہ و سخت گیری

سے محفوظ نہیں رکھتی اسے جلد ہی اپنے اعمال کی پاداش بھی بھگتنی پڑتی ہے۔

عنفوان شباب میں ہٹلر شجاعان جرمنی کے کارنامے تاریخ کے صفحات سے پڑھ پڑھ کر آپے سے باہر ہو جاتا تھا اگرچہ اس کا باپ آسٹریا ہنگری کی ملوکیت کا نمک خوار تھا۔ لیکن ہٹلر اس گھن کھائے ہوئے بوسیدہ شاہی خاندان سے سخت متنفر رہتا تھا۔

جب اس کی عمر تیرہ سال کی تھی تو اس کا باپ مر گیا دو سال بعد ماں بھی اسے داغ مفارقت دے گئی وہ تنہا تھا اس وسیع، بے رحم، تاریک اور ڈراؤنی دنیا میں بالکل تنہا رشتے داروں کے ٹکڑوں پر اسے زندگی بسر کرنا اجیرن دکھائی دیتا تھا۔ ذرا سوچئے اس ننھی سی جان کا احساس رنج و کرب کتنا شدید ہوگا۔

اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ہٹلر آسٹر دی دارالحکومت ''وی آنا'' کو روانہ ہوا وہ ایک تمدن نا آشنا چھوٹے سے گاؤں سے چل کر ایک بڑے شہر میں بے یارو مددگار پہنچا تھا اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ ہمیشہ افکار و آلام میں مستغرق رہتا تھا اس کے پاس پیٹ بھر کر کھانے کو پھوٹی کوڑی نہ تھی لیکن اس کے دل میں اب بھی یہی سمائی تھی کہ وہ ایک نقشہ نویس آرٹسٹ بنے گا۔ اس نے ایک آرٹ سکول میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے مدرسین نے یہ نادری حکم سنا دیا کہ وہ نقشہ نویسی کی بجائے فن تعمیر کی تعلیم حاصل کرے۔

افلاس نے اسے بری طرح گھیر رکھا تھا مجبوراً وہ فن تعمیر کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے کسی عمارتی ٹھیکیدار کے ماتحت قلیوں اور مزدوروں کے ساتھ مٹی ڈھونے لگا۔ تذلیل اور تحقیر اور غیض و غضب کا ایک طاقتور جذبہ اس کے رگ و ریشہ میں سما گیا۔ مزدوروں کے نام نہاد لیڈر خود تو غریبوں کے نام پر امیریاں کرتے تھے لیکن مزدوروں کی حالت نہ سنبھلتی تھی۔ پہلے پہل ہٹلر نے بھی مزدور لیڈروں کی ہمنوائی کی لیکن رفتہ رفتہ اسے کمیونسٹ اور ٹریڈ یونینسٹ اشتراکی لیڈروں سے سخت نفرت ہوگئی۔

انہیں دنوں وائنا کا ایک جرمن لیڈر ''کارل لوئجر'' ۔۔۔۔۔۔ یہودیوں کے خلاف

نسلی امتیاز کا مسلسل پروپیگنڈے کا رہا تھا ہٹلر کو کچھ تو اپنی طبعی افتاد کے باعث اور کچھ لوئجر کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنی ذلت اور یہودی سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کے خاتمے کا واحد راستہ جرمنوں کے احساس برتری کی بیداری اور تمام جرمن نسل کے اتحاد کی تکمیل میں نظر آنے لگا چنانچہ ہٹلر نے اسی خواہش کو بار بار اپنی تصنیف ''تزک ہٹلری'' میں دہرایا ہے۔

جسمانی محنت اور مشقت سے فرصت ملنے پر ہٹلر پوسٹ کارڈ سائز کے گتے کے ٹکڑوں پر نقش کاری کیا کرتا تھا۔

فارغ اوقات میں وہ اس قسم کی تصویریں فروخت کرکے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔لیکن اس سے بھی اس کی حالت نہ سنبھلی مجبور ہو کر 1913ء میں وہ میونچ روانہ ہو گیا اس کی جدوجہد اور مشقت کی زندگی تو یہاں بھی جاری رہی۔ لیکن اس کی حالت میں ایک تبدیلی بھی پیدا ہو گئی یہاں اس نے ایک کمرشل آرٹسٹ کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کو کچھ دل دلیا میسر آجاتا تھا۔

1914ء میں ہٹلر کی قسمت کا پانسہ پلٹا جنگ کا آغاز ہوتے ہی اس نے سجدہ شکر ادا کیا۔وہ جرمن فوج میں بھرتی ہو گیا آج تک وہ ایک آسٹرین، شہری اور غیر جرمن سمجھا جاتا تھا۔

1914ء سے لے کر 1918ء تک سپاہی کی حیثیت میں ہٹلر کا ریکارڈ سوائے اس کے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا کہ اسے کسی دلیرانہ کارنامہ کے صلے میں آئرن کراس کا تمغہ مل گیا تھا۔وہ کارپورل کے عہدہ تک پہنچ گیا 1912ء میں وہ دریائے ''سومے'' کے معرکہ کے اندر ناکارہ ہو کر ایک ہسپتال میں داخل ہو گیا اور جنگ کے اختتام تک وہیں رہا۔جب صلح ہو گئی تو وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہوا تھا۔

جنگ میں جرمنی کی شکست ہٹلر کے خیالی قلعوں کا انہدام تھا خود اس کے اپنے قول کے مطابق وہ اپنی ماں کی موت کے بعد اس موقع پر پہلی بار ڈھاڑیں مار مار کر رویا۔اس

کے تمام تصورات تتر بتر ہو چکے تھے۔اس کے سینہ میں اتحادیوں سے نفرت کا احساس لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔اسے اپنے اضطراب کا علاج سوائے سیاست کے اکھاڑے میں کودنے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔رفتہ رفتہ غور وفکر اور کافی تامل کے بعد اس نے اپنا نصب العین یہ بنا لیا کہ جرمن نسل کو جمہوریت، اشتراکیت اور یہودیت کی بلاؤں سے نجات دلائی جائے۔اس دوران میں وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ شامل رہا۔۔۔۔اور میونچ میں ہی مقیم رہا۔

میونچ کا شہر اس زمانہ میں ہر قسم کے سیاسی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ہٹلر تمام رائج الوقت سیاسی فلسفوں کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتا رہا اپنی افتادطبع کے باعث ہٹلر ان سیاسی فلسفوں سے نفوز تھا۔

1919ء میں ہٹلر نے گاٹ فرائیڈ فیڈر کا اقتصادیات کے متعلق ایک لیکچر سنا۔وہ فیڈر کی ندرت خیال سے بڑا متاثر ہوا۔فیڈر کا نظریہ اقتصادیات یہ تھا کہ دولت کی دو قسمیں ہیں، ایک دولت سودی سرمایہ داری کا نام ہے جس کے مالک یہودی ہیں۔اور وہ بغیر محنت یا مشقت کے محض عیاری، فریب کاری اور سودخواری سے جرمن مزدوروں کا خون چوس چوس کر موٹے ہو رہے ہیں۔سودی سرمایہ داری اپنی بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر جرمنی کا قومی مفاد قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔برعکس اس کے دولت کی ایک دوسری قسم وہ ہے جو محنت مشقت اور کفایت شعاری سے فراہم کی جاتی ہے ایسی دولت جرمنی کے قومی مفاد کے منافی نہیں بلکہ جرمنی کی آزادی کی ضمانت ہے یہودی سودخور سرمایہ دار چالاکی یہ کرتے ہیں کہ مزدوروں کا خون چوستے ہیں اور پھر ان کے انتقال سے بچنے کی خاطر جرمن مزدوروں کو جرمنی کے محب قوم دولت مندوں کے ساتھ لڑا دیتے ہیں۔

ہٹلر نے فیڈر کے اس اقتصادی نظریہ پر بالشویکی سوشلزم اور جرمن نیشنل سوشلزم کے مابین خط امتیاز کھینچ دیا۔جہاں بالشویکی سوشلزم سرے سے سرمایہ داری کو ختم کر دینے

کا مدعی تھا۔ وہاں جرمن نیشنل سوشلزم سرمایہ پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد کرنے کا خواہاں تھا جو جرمنی کے قومی استحکام کے لئے ضروری ہو۔

فیڈرکی جرمن ورکرز پارٹی ایک چھوٹی سی جماعت تھی۔ جس میں گنے چنے آدمی شامل تھے ہٹلر کو اس پارٹی میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو پہلے اس نے تامل کیا لیکن پھر یہ دعوت قبول کر لی وہ پارٹی کا ساتواں رکن تھا جلد ہی ہٹلر بہت سے غیر مطمئن جرمن فوجیوں کو بھی اس پارٹی کا رکن بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تجربہ نے ہٹلر پر ثابت کر دیا کہ وہ ایک موثر مقرر بھی ہے۔ جب وہ تقریر کرتا تو ایک بڑا ہجوم اس کی باتیں سننے کے لئے جمع ہو جاتا۔ ہٹلر پوری شدت سے اشتراکیوں جمہوریوں اور یہودیوں کے خلاف زہر اگلتا۔ وہ معاہدہ ورسائی کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتا۔ عوام جب تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیتے تو ہٹلر کی تشنہ روح اور مجروح وقار ایک عجیب قسم کی تسکین محسوس کرتے۔

ہٹلر کی ذاتی زندگی اور صلاح کے علاوہ اس کی کامیابی کا ایک اہم راز یہ بھی تھا کہ ہٹلر کا اضطراب اور جوش انتقام لاکھوں جرمنوں کی دلی کیفیتوں کا ترجمان تھا۔ جرمن فوجی جنہیں معطل کر کے ملکی زندگی سے خارج کر دیا گیا تھا ہٹلر پر جان چھڑکتے تھے۔ جرمن صنعتوں کے مالک جن کا کاروبار اشتراکیوں اور بیرونی دشمنوں کے اثر سے تباہ ہو رہا تھا۔ اپنی دولت ہٹلر کے قدموں پر نچھاور کر رہے تھے ہٹلر کے ”طوفانی رضا کاروں“ کے دستے ملک کے طول وعرض میں اپنی دہشت انگیزی کا سکہ بٹھا رہے تھے غرض پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی محرومی اور مایوسی کے دور میں نازیت کی ایک ایسی تحریک طاقت پکڑ رہی تھی جس کے نعرے سن کر ہر جرمن کے دل و دماغ میں ایک چنگاری سلگ اٹھتی تھی جو بالآخر بے پناہ شعلے بن کر بھڑکی اور ایک دن آتش فشاں جہنم کی صورت اختیار کر کے نہ صرف جرمنی بلکہ دنیا کی کئی اقوام اور کروڑوں انسانوں کو بھی بھسم کر گئی۔

8 نومبر 1923ء کو جرمنی میں سیاسی فسادات رونما ہوئے ہٹلر کو گرفتار کر کے بغاوت

کے الزام میں نظر بند کر دیا گیا۔ دوران نظر بندی میں ہٹلر نے ''تزک ہٹلری'' لکھنی شروع کی۔ 1923ء میں ہٹلر کو رہا کر دیا گیا۔ اور وہ پھر اپنی پارٹی کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ 30-1929 کے عالمگیر اقتصادی بحران نے ہٹلر کی پارٹی کو بڑی تقویت پہنچائی 32-1930ء میں ہٹلر کی نازی پارٹی جرمنی کی سب سے طاقتور سیاسی جماعت بن چکی تھی۔

1932ء کے عام انتخابات میں ہٹلر کی پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی جنوری 1933ء میں ہٹلر کو جرمنی کا آئینی وزیر اعظم چن لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہٹلر جمہوری ریاست کا تانا بانا توڑ پھوڑ کر مطلق العنان ڈکٹیٹر بن گیا۔ اس کے طوفانی دستوں نے ایک رات ہٹلر کے سیاسی دشمنوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

برسر اقتدار آتے ہی ہٹلر نے قومی تنظیم اور تربیت کا وہ عالی شان پروگرام شروع کر دیا جس نے چھ سال کے اندر جرمنی کی فوجی قوت کو دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی متحدہ عسکری قوت پر بھی بھاری کر دیا۔ ساری دنیا ہٹلر کی سطوت سے لرزہ بر اندام تھی۔ کبھی وہ بغیر مقابلہ کے رائن لینڈ پر قبضہ کر لیتا تھا۔ تو کبھی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر آسٹریا کا الحاق کر لیتا تھا۔ اور کبھی اس کی غضب ناک آنکھوں کا ایک اشارہ چیکوسلاو یکیا کو ریزہ ریزہ کر کے برطانیہ اور فرانس کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔

1939ء میں ہٹلر نے پولینڈ سے ڈان زگ کے جرمن شہر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ کے چھاتہ بردار وزیر اعظم مسٹر چیمبر لین کو بھی اب احساس ہو چکا تھا کہ ہٹلر کو اور آگے بڑھنے کا موقع دیا گیا تو وہ فرانس کا سر اور برطانیہ کی کمر توڑ کر ہی دم لے گا۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے ایک طرف پولینڈ اور دوسری طرف رومانہ اور بلقان کی دوسری ریاستوں کے تحفظ کی گارنٹی کا اعلان کر دیا۔

ہٹلر نے جب دیکھا کہ برطانیہ اور فرانس جرمنی کو محاصرے میں لینے کے لیے روس کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں تو ہٹلر نے پیش دستی کر کے خود روس سے پولینڈ کا بٹوارہ کر

لیا۔ روس نے پہلے برطانیہ اور فرانس سے اتحاد کرنا چاہا لیکن روس کی خواہش تھی کہ اسے لٹویا اسھونیا، اسٹونیا اور پولینڈ میں روسی فوجیں بھیج کر جرمنی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی اجازت دی جائے۔ برعکس اس کے برطانیہ اگر جرمنی کو بڑھنے نہ دینا چاہتا تھا تو روس کے پھیلاؤ کا بھی روادار نہ تھا طویل گفت وشنید اور پیچیدہ ساز باز کے بعد ہٹلر کا وزیر خارجہ فان ربن ڈراپ ماسکو پہنچا اور سٹالن کے وزیر خارجہ مسیو مولوٹوف کے ساتھ گفت وشنید کے بعد روس والمانیہ کے مابین معاہدہ کا اعلان کر دیا گیا۔

یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا 28 ستمبر 1939ء تک پولینڈ کا دار الحکومت وارسا ہٹلر کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ اور پولینڈ کے مشرقی خطوں پر روس کا قبضہ ہو چکا تھا۔

1940ء کے موسم بہار میں جرمنی نے ناروے پر حملہ کر دیا۔۔۔ ناروے کا ایک فوجی افسر میجر کوزلنگ، ہٹلر کے ساتھ مل گیا 10 جون 1940ء تک ناروے پر ہٹلر کا تسلط مکمل ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں 10 مئی 1940ء کو ہٹلری عساکر مغربی یورپ پر حملہ آور ہوئے 25 جون 1940ء تک ہالینڈ، بیلجیم، لکسمبرگ اور فرانس کی سلطنتیں ہٹلر کی مطیع ہو چکی تھیں۔ برطانوی افواج بمشکل جان بچا کر ڈنکرک کی بندرگاہ سے گھر کو بھاگ سکیں۔

1940ء کے آخر میں برطانوی افواج نے اطالوی طرابلس پر پیش قدمی شروع کر دی۔ 1941ء میں جرمن فوجیں اطولویوں کی امداد کو پہنچ گئیں مشہور جرمن سپاہ سالار فیلڈ مارشل فان رومیل ان فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ برطانوی فوجیں اسکندریہ تک مراجعت کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

اسی سال ہٹلر نے ہنگری، رومانیہ، یوگوسلاویا، بلغاریہ اور یونان کی فتح سے فارغ ہو کر یکلخت روس پر حملہ کر دیا۔ شروع شروع میں ہٹلر کی پیش قدمی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ شمال میں لینن گراڈ، وسط میں ماسکو اور جنوب میں یوکرین اور کریمیا کو فتح کرنے کے

بعد کوہ قاف تک جرمن فوجیں پہنچ گئیں۔

1941ء میں ہی برطانیہ اور روس نے ایران پر قبضہ کر لیا۔

1943ء میں روسیوں نے جوابی حملہ شروع کیا۔ 1944ء میں جرمن فوجوں کو روسیوں کے مقابلے میں شکستیں ہونے لگیں جون 1944ء میں امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں مغرب سے مقبوضہ فرانس پر حملہ آور ہوئیں دو ماہ کے اندر فرانس، بیلجیم اور ہالینڈ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن جب اتحادی افواج فرانس اور جرمنی کی سرحد پر سے سیگفریڈ لائن تک پہنچیں تو ان کو رک جانا پڑا۔ ہٹلر نے آخری بار اپنی قوت مجتمع کر کے آرڈینینس کے میدان پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ اتحادیوں کو ساٹھ ستر میل کے محاذ پر پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن اتحادی جلد ہی سنبھل کر پھر حملہ آور ہوئے۔ ادھر روس جرمن فوجوں کو شکست دیتا ہوا جرمن علاقے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ تیسری طرف اٹلی میں مسولینی کی فسطائی فوجیں پسپا ہوتی آ رہی تھیں۔

ہٹلر نے جب اپنی شکست کو یقینی سمجھا تو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ اور 30 اپریل 1945 کو خودکشی کر کے اپنی نعش چتا پر جلوا دی 8 مئی 1945ء کو جرمن فوجوں نے اتحادیوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

یہ تھا ایک عظیم المرتبت فلاسفر، ایک کامیاب انقلابی، ایک زبردست فاتح، ایک دانشمند مدبر اور ایک اولوالعزم سیاست دان کا حسرتناک انجام علامہ اقبال نے نپولین پر نظم لکھتے ہوئے ڈکٹیٹروں کے حشر کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس، قبر کی شب ہائے دراز

☆☆☆☆☆

دیباچہ مترجم

وہ مر کر بھی زندہ ہے

ہٹلر فنا ہو گیا لیکن اس کا فلسفہ آج بھی زندہ ہے چرچل، سٹالن اور روزویلٹ نے ہٹلر کے خلاف فتح پائی لیکن انگلستان روس اور امریکہ نے وہ دین قبول کر لیا جس کا پیغامبر ہٹلر تھا۔ جرمنی ضرور دوسری عالمگیر جنگ میں ناکام رہا لیکن ہٹلر کا بنیادی فلسفہ بظاہر آج دنیا کے تمام دوسرے سیاسی فلسفوں پر غالب آچکا ہے۔

افلاطون اور ہٹلر میں موازنہ

افلاطون کی تصنیف ''ریپبلک'' کے بعد انسانی تمدن کی تقریباً دو ہزار سال کی تاریخ میں ''تزک ہٹلری'' وہ دوسری کتاب ہے جس نے محض ایک عقلی نظام کی بناء پر ایک کامل ریاست کے ہر شعبہ کی تفصیلی تصویر پیش کی اور جس نے اتنی شہرت حاصل کی افلاطون نے اپنی ریاست کی بنیاد عالمگیر اور ازلی وابدی انسانی حاجتوں اور جذبات پر رکھی تھی ہٹلر نے فرد کی بجائے نسل کو تمدن کی بنا قرار دیا اور جرمن نسل کی خیر الامم فرض کرتے ہوئے سلطنت کا نقشہ تیار کیا افلاطون کو موقع ملا بھی تو وہ اپنی ریاست کے تصور کو عملی شکل نہ دے سکا۔ ہٹلر کو بظاہر ایسا موقع میسر نہ تھا۔ لیکن اس نے اپنی قوت عمل سے اپنے خواب کی تعبیر بھی پیش کر دی۔ یہ درست ہے کہ تعبیر ادھوری ثابت ہوئی لیکن اس سے خواب کی ندرت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ شاید افلاطون کی ریاست کی بنیادیں تجزیاتی زاویہ نگاہ سے زیادہ گہری ہیں لیکن ہٹلر کا خاکہ یقیناً بدرجہا زیادہ قابل عمل ثابت ہوا۔

ہٹلری نظام فکر کی خصوصیات

ہٹلری نظام فکر کی خصوصیات تین ہیں

1 اول وہ خیال اور عمل، تصور اور حقیقت مادہ اور روح کی بنیادی وحدت کا قائل ہے اس لیے اس کے نظام میں تشدد کو کھلے بندوں طریق کار کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

2 دوسرے وہ غیب اور مسلمان کی بنا وحی یا عقل کی بجائے خون اور نسل قرار دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ فکر کی انتہائی بلندیوں سے گرنے کے باوجود اس کے فلسفہ کا خطاب جرمنوں تک محدود رہا۔

3 دور حاضر کی نفسیاتی علمی اور تاریخی تحقیق کو ہٹلر نے جس ہمہ گیری اور خوبی سے اپنے نظام فکر سے سمیٹا ہے وہ قابل داد ہے۔

فلسفہ عمل و قوت

میں وحی کا معتقد اور عالمگیر دینی اخوت کا قائل ہونے کی حیثیت میں ہٹلر کے اصلی مفروضہ کو غلط سمجھتا ہوں۔لیکن اس کے نظام مفکر کی دوسری دونوں خصوصیتیں یقیناً فکر انسانی کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں بھاپ، بجلی، پٹرول، ریل، موٹر، ہوائی جہاز، آبدوز، ریڈیو، ٹیلی فون، تار اور اب ذراتی قوت کے انکشاف سے گذشتہ سو سال میں یورپ کے اندر جو اخلاقی تمدنی اور سیاسی تصورات نشوونما پاتے رہے ہٹلر کا فلسفہ ان کا نچوڑ پیش کرتا ہے زندگی اسے طاقت کا اظہار نظر آتی ہے دنیا کی ہر شے اور ہر عقیدہ طاقت کے سامنے حقیر ہے اس طاقت کے مندر میں دیوتا دن ہیں، یقیناً یہی ایجادات کرنے والے مٹھی بھر لوگ جو باقی دنیا پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں یہ بیسویں صدی کے برہمن اپنے دین کو نسل کا نام دے کر یہودیوں کو راکھشش اور دوسرے غیر جرمنوں کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔

مرد کار اور مرد افکار

ہٹلر مرد افکار ہی نہ تھا اس سے بڑھ کر وہ مرد کار بھی تھا ایک عرصہ تک اس کی سیاست اس کی فراست سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔روس پر حملہ سے پیشتر اسے اپنے ہر چھوٹے بڑے داخلی اور خارجی، سیاسی اقدام میں کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد بازی کا نقشہ اور رخ دونوں پلٹ گئے۔شاید وہ روسی قوت کا اندازہ نہ کر سکا۔شاید وہ اپنی طاقت غلط سمجھا شاید اس کا یہ نسلی عقیدہ غلط تھا کہ انگریز اور امریکہ، روس کے مقابلہ میں بالاخر اس کے

معاون ہوں گے۔ شاید وہ جمہوری فلسفہ کی گہرائی اور کہنہ تک نہ پہنچ سکا۔ بہر حال اس مرتبہ کسی جگہ غلطی ضرور کھائی۔ جلد ہی ٹھوکریں کھانے کی نوبت بھی آ پہنچی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عمل کی ایک چوک سے ہٹلر کے بنیادی تصورات بھی سب غلط ثابت ہو گئے یا مٹ گئے۔

یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

آج دنیا میں تین ہی قابل ذکر سلطنتیں باقی ہیں، انگلستان، روس اور امریکہ۔ ان تینوں نے ہٹلر کا یہ عقیدہ تسلیم کرلیا ہے کہ طاقت اور کامیابی ہی سچائی ہے دنیا میں مادی نتائج حاصل کرنا اوران سے مادی لذت حاصل کرنا ہی زندگی ہے جسے یہ تن کی سہولتیں اور لذتیں حاصل ہوگئیں اس نے نجات پالی۔ جو اپنے ٹولے کے ساتھ اس لوٹ کھسوٹ کے لیے آخری دم تک لڑے وہی بہادر ہے۔ خود ہٹلر کے اس دعویٰ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے یہی ملکوں کی بولی استعمال کی جارہی ہے کسی ایک انگریز، روسی یا امریکن مصنف یا فلاسفر نے ''تزک ہٹلری'' کا جواب نہیں لکھا ہاں انگریزی، روسی اور امریکن افواج نے جرمن عساکر کو میدان جنگ میں شکست ضرور دی۔ نظام ہٹلری اور دور ہٹلری کی کسی ایک نمایاں ہستی کو دین ہٹلری سے روگرداں نہیں کیا گیا۔ البتہ انہیں پھانسیاں دی گئیں اور دی جارہی ہیں کلام ہٹلری کی تفسیرات کا جواب لکھنے کے بجائے انہیں جلایا جارہا ہے۔ ان کی اشاعت بند کی جارہی ہے اس سے کیا ثابت ہوا ثابت یہ ہوا کہ ہٹلر کے دشمن کو اس کے خلاف کامیاب ہیں لیکن اس کے فلسفہ اور طریق کار کے سامنے لاجواب ہیں۔ دین ہٹلری کے پروہت گدی پر سے اتار ہی کیوں دیئے گئے ہوں لیکن دیوتا بدستور آسن پر براجمان ہیں۔ ممالک مغرب آج بھی طاقت کے پرستار ہیں۔ رومیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر ان کا دین اختیار کرلیا تھا۔ اور صدہا سال ان کے نام پر حکومت چلاتے رہے تھے۔ اینگلو سیکسن قبائل اور سقلابیوں نے ہٹلر کو چتا میں جلا دیا لیکن اس کی راکھ ان کی آنکھوں کا سرمہ ہے وہ ذہن اور عملاً اس کے پیغام کی امت

ہیں سینٹ پال نے جب عیسائیت کو یورپ میں مقبول بنانے کی خاطر کلیسا کے نئے مزاج میں سمویا تھا تو کئی تقریبات اور رسمیں یورپی وحشی قبائل کے تمدن سے لے کر اپنے نظام میں داخل کر لی تھیں یونہی اشتراکیت، جمہوریت اور سرمایہ پرستی نے دین تو ہٹلر کا اختیار کیا ہے لیکن اصطلاحات کئی اپنی پسند سے مقرر کر لی ہیں مثلاً آج جرمنی، یونان، فلسطین، اور طرابلس میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے نازی ازم نہیں بلکہ جمہوریت کہا جائے گا پولینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور چیکوسلاوکیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی نازی ازم نہیں بلکہ اشتراکیت ہے۔ جاپان، کوریا، فلپائن اور چین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ہرگز نازی ازم نہیں بلکہ سراسر سرمایہ تمدن کی حفاظت کے لیے کیا جا رہا ہے۔ گویا اعمال میں تمیز تو ہے لیکن کرنی کے اعتبار سے نہیں بلکہ کرنے والے کے فرق سے فلسفہ وہی ہٹلر کا ہے، طریق کار وہی ہٹلر کا ہے البتہ کرنے والا ہٹلر نہیں ''نسل'' کے واہمہ کی جگہ ''جمہوریت''، ''اشتراکیت'' اور ''سرمایہ'' کے خبط نے لے لی ہے۔ ورنہ بات وہی ہے کہ مٹھی بھر پڑھے لکھے ہوشیار اور مستعد بدمعاش خدا کی نیک مگر سادہ لوح اور غافل مخلوق کا ایمان لوٹنے اور خون چوسنے کے بہانے تراش لیتے ہیں بر سر اقتدار طبقہ کی سریلی بکواس مدہوش کر دیتی ہے باقی کام تشدد کر لیتا ہے اور کبھی سر بھی نہیں اٹھانے دیتا۔

تشدد کا پیغمبر

یہی وجہ ہے کہ تشدد کے اس پیغمبر کے صحیفہ کا اردو میں ترجمہ کرنے سے مقصد خالی جرمنی کی تاریخ کا ایک ورق پیش کرنا نہیں بلکہ آج خود ہمارے چاروں جانب دنیا میں جو فلسفہ، سیاست رائج ہے اس کے بانی اور اس کی تعلیمات سے مکمل طور پر واقف ہونا ہے تشدد کے اس پیغمبر نے ایک عالمگیر جنگ میں ہوش سنبھالا۔ دوسری عالمگیر جنگ لڑتے لڑتے دنیا سے روپوش ہوا۔ اور اب اس کی تلقین تیسری عالمگیر جنگ کی تیاری کروا رہی ہے یقیناً کسی تعلیم کا اتنے تھوڑے عرصہ میں ایسے بھیانک نتائج پیش کرنا ایک نہایت ہی قابل توجہ واقعہ ہے۔

سقلابی، طاطانی اور رحمانی

بحیثیت مترجم کے مفسر، یا نقاد کا منصب اختیار کرنا مناسب نہیں۔ کمزور، حساس اور اشتعال پذیر ہندوستانی شخصیتیں ہر پر زور پیغام سے بہت جلد متاثر ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ان کو تنبیہہ کرنے کی خاطر اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح فلسفہ اور فن کے معراج پر پہنچے ہوئے یونان کے افلاطون کی ''ریپبلک'' وحی سے خالی تھی۔ اس طرح ایجادات اور مسخرات کے حامل کامل، ہٹلر کی افواج قاہر موج اللہ اور اس کے رسول ؐ کی رحمت سے عاری ہیں۔ ہاں سقلابیوں اور طاطانیوں سے حق و باطل کی تمیز کے لیے رحمانیوں کی جنگ ہوئی تو ہمیں ان کے صحیفہ کی یہ واقفیت کام آئے گی۔ لہذا ہم ''تزک ہٹلری'' کے مطالعہ سے محض خلق خدا کے لیے دشمن کے ہتھیار اپنا سکتے ہیں اس کی سحر طرازی کے منتروں کو ہمیں ہم ملعون ہی سمجھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆

حصہ اول

باب اول :: میرے والدین

سپاہی کی تلوار اور ہل چلانے والا کاشت کار

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری جائے ولادت جرمنی اور آسٹریا کی حد اتصال پر واقع ہے برینو کا یہ چھوٹا سا قصبہ پہلے بھی قومی تاریخ میں ملی عصبیت کے نمونے پیش کر چکا ہے۔ جب نپولین کا اقتدار ہماری قومی عزت کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو اسی قصبہ کے ایک غیور کتب فروش نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اپنی حق گوئی کے پاداش میں آخر جان عزیز تک قربان کر دی۔ علاوہ بریں آسٹریا اور جرمنی کی حدود کا اتصال ہر وقت ہم نوجوانوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان دونوں ملکوں کا الحاق ہمارا قومی فرض ہے ایک نسل اور ایک خون کے لوگ ایک ہی سلطنت کے ماتحت ہونے چاہئیں جب ہم متحد ہو جائیں گے تو اس وقت ہمیں مقبوضات طلب کرنے کا اخلاقی حق ہوگا۔ سپاہی کی تلوار اور ہل چلانے والا کاشتکار ایک ہی زنجیر کی پہلی اور دوسری کڑی بن جائیں گے۔ میدان جنگ میں خون بہایا جائے گا تو اس سے ہماری آئندہ نسلوں کے چہرے پر سرخی آئے گی۔

میرا اولوالعزم باپ اور پیاری ماں

اس قصبہ میں میرے والدین انیسویں صدی کے اواخر میں آ کر مقیم ہوئے ابا ایک سرکاری دفتر میں بابو تھے۔ وہ اپنا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے سرانجام دیتے تھے اماں گھر کا کام کاج کرتی تھیں اور بڑی محبت سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی تھی۔ مجھے ان دنوں کے زیادہ واقعات یاد نہیں ابا جلد ہی یہاں سے تبدیل کر کے پاسو کے شہر میں بھیج دیئے گئے ان دنوں آسٹرین حکومت کے دفتری ملازمین اکثر تغیر و تبدیل کے چکر میں گرفتار رہتے تھے۔ چنانچہ ابا کو پاسو سے پھر تبدیل کر کے لنز کے مقام پر بھیج دیا گیا۔ یہیں ان کی پنشن ہوگئی لیکن ریٹائر ڈ ہو کر بھی انہوں نے محنت مزدوری سے ہاتھ نہ

اٹھایا۔

ابا ایک غریب کاشتکار کے بیٹے تھے۔انہوں نے تیرہ سال کی عمر میں ہی گھر کو خیر باد کہہ دیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے بہتیرا سمجھاتے رہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور سیدھا ملک کے دارالحکومت وائنا کا راستہ لیا۔ان کا ارادہ تھا کہ وہاں جا کر کوئی ہنر سیکھا جائے۔یہ واقعہ 1850ء کا ہے۔اس وقت ان کی جیب میں صرف تین روپے تھے انہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں لیکن جب تیرہ سال کا بچہ سترہ سال کا نوجوان ہوا تو وہ کاریگری کے امتحان میں کامیاب ہو چکا تھا۔وہ اسی پر قانع نہ ہو گئے اس زمانہ میں کساد بازاری اور ہر وقت کی تنگی ترشی نے ان میں عزم بالجزم پیدا کر دیا کہ ''ہم کچھ بن کر رہیں گے'' بچپن میں وہ سمجھا کرتے تھے کہ گاؤں کا پادری بننا ہی انسانی کمال کا معراج ہے۔ شہر میں آ کر ذرا آنکھیں کھلیں تو انہوں نے سرکاری ملازم بننے کی ٹھانی۔دنیا کی مصیبتوں اور ٹھوکروں نے انہیں زمانہ شباب میں ہی عمر رسیدہ لوگوں کا استقلال سکھا دیا تھا۔چنانچہ وہ جس لگن کو لے کر اٹھے تھے اس میں کامیاب ہو گئے۔تیئس سال کی عمر میں وہ سرکاری دفتر کے بابو بن چکے تھے گھر سے جاتے وقت وہ کہہ گئے تھے ''اب ہم آئیں گے تو کچھ بن کر ہی واپس آئیں گے'' آخر انہوں نے اپنی بات پوری کر دکھائی بات تو پوری کر دکھائی لیکن جب گھر واپس پہنچے تو گاؤں میں انہیں کوئی پہنچانے والا بھی باقی نہ رہا تھا۔ گاؤں خود ہی بدل چکا تھا۔

چھپن سال کی عمر میں انہیں پنشن ملی تو ان سے بیکار نہ بیٹھا گیا۔انہوں نے شمالی آسٹریا کے شہر بلچ میں کچھ زمین خرید کر خود کھیتی باڑی شروع کر دی غرض عمر کا ایک طویل حصہ دفتری ملازمت بسر کر کے آخر انہوں نے پھر اپنے باپ کے پیشہ کی طرف رجوع کر لیا۔

میرا بچپن

یہی زمانہ تھا جب میں نے ہوش سنبھالا اور خود منصوبے باندھنے کے قابل ہوا

میرے وقت کا بہت سا حصہ گھر سے باہر کودنے پھاندنے میں گذرتا تھا اسکول گھر سے بہت دور تھا راستے میں خوب فرصت ملتی تھی چوٹی کے نٹ کھٹ لڑکے میرے ہمجولی تھے ہماری شرارتوں سے اماں کو بڑی فکر رہا کرتی تھی گھر میں ہمارا پاؤں ٹکتا ہی نہ تھا۔ میں نے یہ سوچنے کی تکلیف تو کبھی گوارا نہ کی تھی کہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے ہاں ابا کا پیشہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

میں پیدائشی خطیب تھا

مجھے اب خیال آتا ہے کہ مجھ میں تقریر کا ایک فطری ملکہ ودیعت تھا جو اسی زمانہ میں ظاہر ہونے لگا۔ لڑکوں سے بڑے زور وشور کے مباحثے رہا کرتے تھے میں اپنی پارٹی کا ننھا سردار تھا۔ اسکول میں پڑھتا تو خوب تھا لیکن قابو میں نہ رہتا تھا میں خالی وقت میں لمچ کے گرجا گھر جا کر وہاں کے گویوں سے قوالی بھی سیکھا کرتا تھا۔ بار بار مذہبی رسوم کے شاندار مناظر دیکھنے سے میرے جذبات پر گہرے تاثرات نقش ہو گئے جس طرح کبھی ابا کو اپنے گاؤں کا مسکین پادری انسانی شوکت کا نمونہ نظر آیا تھا۔ اسی طرح میرے لیے بھی لمچ کا بشپ کچھ عرصہ منتہائے نظر بنا رہا۔ ابا میری فصاحت و بلاغت کے کچھ ایسے قائل نہ تھے۔ جب ان سے ذکر ہوا تو انہوں نے میرے لیے یہ پیشہ پسند نہ کیا میرے اصرار سے بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا ہاں میری الجھن سے انہیں بھی کچھ تشویش ضرور رہنے لگی۔

سب جرمن ایک ہی امت کے چشم چراغ ہیں

اسی دوران میں میری آرزوئیں ایک ایسے پیشے کی طرف راغب ہو گئیں جو میرے مزاج کے زیادہ قریب تھا ابا کی لائبریری دیکھتے دیکھتے چند کتابیں میری نظر سے گذریں جو جنگ سے تعلق رکھتی تھیں ان میں 71-1870ء کی جنگ جرمنی وفرانس کی ایک تاریخ بھی تھی یہ تاریخ چند ایسے باتصویر رسائل کا مجموعہ تھی جو اس جنگ سے تھوڑی ہی مدت بعد شائع ہوئے تھے مجھے اس کتاب سے ایسی وابستگی ہوئی کہ وہ اکثر میرے زیر مطالعہ

رہنے لگی میرے دل و دماغ میں جنگ کے نقارے بجنے لگے میں تھوڑے ہی عرصہ میں ہر اس شے کا عاشق ہو گیا جو کسی طرح جنگ و جدال سے تعلق رکھتی ہو۔

جرمنی اور فرانس کی جنگ کی کہانی پڑھ کر میرے دل میں نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگتے میں سوچتا تھا یہ جنگ لڑنے والے جرمن کیا دوسرے جرمنوں سے مختلف تھے اگر نہیں تو آسٹریا نے کیوں اس جنگ میں ان کا ساتھ نہ دیا میرے والد کس طرح اس جنگ میں شمولیت کی سعادت سے محروم رہے؟ کیا ہم جرمن نہیں؟ کیا سب جرمن ایک ہی امت کے چشم و چراغ نہیں؟ میرے ننھے دماغ میں یہ سوال پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھا جب مجھے بتایا گیا کہ ہم ان جرمنوں سے ہیں جو بسمارک کی قائم کردہ سلطنت میں شمولیت سے محروم ہیں تو میرے سینہ میں رشک کی چنگاری سلگ اٹھی یہ محرومی قسمت نا قابل برداشت تھی۔

میں شروع سے ہٹ کا پکا تھا

اسی اثناء میں مجھے تعلیم دلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میرے متعلق ابا کا اندازہ تھا کہ قدیم نصاب کی نسبت جدید تعلیم میرے لیے زیادہ مناسب ہو گی ڈرائنگ سے مجھے جو طبعی مناسبت تھی اسے دیکھ کر ان کی یہ رائے اور بھی پختہ ہو گیا اپنی ابتدائی جدوجہد کے پیش نظر ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بھی کسی سرکاری دفتر میں بابو ہو جائے انہوں نے جس مشکل سے دفتر کی ملازمت حاصل کی تھی اس سے ان کی نگاہ میں ایسی ملازمت کی قدر و قیمت حقیقت سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ انہیں آرزو تھی کہ میں ان کی عمر بھر کی خدمات سے فائدہ اٹھاؤں اور ان کے توسط سے انہیں کے نقش قدم پر چل کر ترقی کروں۔

انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں ان کی ہدایات کے مطابق چلنے سے انکار کروں گا ان کی رائے میں ان کا فیصلہ ایسا صحیح تھا کہ وہ اس کی بابت مجھ جیسے ”ناتجربہ کار“ اور ”غیر ذمہ دار“ نوجوان کے اعتراضات سننے کو بھی آمادہ نہ تھے مدت العمر کی جدوجہد نے ان

کی طبیعت میں جبر اور سختی کا رنگ غالب کر دیا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنی اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں نرمی یا شفقت سے کام لیں تو پدرانہ ذمہ داری کا حق ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔

اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی باوجود ابا کے مزاج کی سختی کے میں ان کی اس تجویز کی مخالفت سے باز نہ رہ سکا یہ ٹھیک ہے کہ بات بات کا دھنی اور ارادے کا پکا تھا لیکن بیٹا بھی تو آخر اسی باپ کا بیٹا تھا میری ضد اور ہٹ دھرمی بھی کچھ کم نہ تھی میں ہرگز وہ راستہ اختیار کرنے پر مائل نہ تھا جس پر مجھے خود ایمان نہ ہو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں دفتر کا بابو بننے کو تیار نہیں۔

ابا نے بہتیرا ڈرایا دھمکایا لیکن یہاں بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے وہ جتنا مجھے ملازمت پر مجبور کرتے اتنا ہی میں اس سے نفور ہوتا تھا یہ تصور کرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا تھا کہ ایک دن میں دفتر کے اندر اسٹول پر بندر کی طرح بیٹھا ہوں گا ساری عمر رجسٹروں کی خانہ پری کرتے کرتے گزر جائے گی۔

میں کتابوں کا کیڑا نہ تھا

میں کتابوں کا کیڑا نہ تھا ہمیں اسکول سے برائے نام کام ملتا تھا اس طرح مجھے گھر کی نسبت باہر کھلی ہوا میں زیادہ وقت بسر کرنے کا موقعہ مل جاتا تھا آپ خود ہی خیال کیجئے ایسے بچے کو دفتری ملازمت سے کیا مناسب ہو سکتی ہے۔

آج میرے سیاسی مخالفین میری بچپن کی زندگی کی چھان بین کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ''یہ چال باز ہٹلر روز اول سے ہی بڑا مغنی تھا'' میں خدا کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بچپن کے ایام اس طرح بسر کرنے کی توفیق عطا کی کہ آج ان دنوں کی یاد سے دل میں مسرت اور طبیعت میں استقلال کی لہر پیدا ہو جاتی ہے وہ اوائل عمر کے جنگل اور ٹیلے پہلا میدان جنگ تھا۔ جہاں میں نے لڑ کر زندگی کے معرکے سر کرنے کی تربیت حاصل کی۔

نقاش بننے کا شوق

اسکول میں داخل ہو کر بھی میری عادات میں کوئی فرق نہ آیا لیکن اب وہ وقت نزدیک تھا جب خیالی الجھنوں کو عملی مشکلات کی شکل اختیار کرنی تھی جب تک ابا کے ارادے محض ارادے ہی تھے میں اپنی رائے ظاہر کرنے میں ذرا احتیاط برت کر روز روز کے بکھیڑے میں ٹال مٹول سے کام لے سکتا تھا اس وقت تک میرے اطمینان کے لیے یہی تسلی کافی تھی کہ میرا اپنا ارادہ مصمم ہے لیکن جب میں بارہ سال کا ہو گیا تو مجھے خود بھی اپنے مستقبل کی بابت ایک تجویز سوجھی سر میں یہی دھن سما گئی کہ میں تو نقاش بنوں گا اس ارادے کا ظاہر کرنا تھا کہ صورت حالات بد سے بدتر ہو گئی اس سے تو کسی کو انکار نہ تھا کہ مجھے ڈرائنگ سے ایک گونہ طبعی مناسبت تھی جن اسباب کی بنا پر ابا نے مجھے جدید تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا تھا ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی لیکن یہ تو کبھی ان کے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ میں نقاش بننے کی بھی خواہش کر سکتا ہوں ایک روز جب میں نے پھر دفتر کا بابو بننے سے انکار کیا تو ابا نے پوچھا کہ میاں آخر تم کیا بننا چاہتے ہو؟ ۔۔۔۔ میں نے جو مدتا دیر سے من میں پکار رکھی تھی وہی بے اختیار اگل دی ابا سنتے ہی کچھ دیر کے لیے تو سناٹے میں آ گئے ”ارے کیا کہا تو نقاش بنے گا؟ میرا بیٹا ہو کر نقاشی کرے گا؟؟“

پہلے تو انہیں خیال ہوا میرے حواس قائم نہیں پھر یہ شک رہا کہ شاید وہ میرے الفاظ صحیح نہیں سمجھ سکے جب میں نے اپنے خیالات تفصیل سے بیان کیے اور سمجھایا کہ میں سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کر رہا ہوں تو انہوں نے اپنی مخصوص خشونت سے میری مخالفت کی وہ ایک رائے قائم کر چکے تھے اور میرے رجحانات ان کا ارادہ بدل نہ سکتے تھے۔

ابا مجھ سے ناراض ہو گئے

ابا کہتے تھے جب تک میں زندہ ہوں تجھے نقاش نہ بننے دوں گا اور میں بھی اتنے ہی زور سے اپنی ہٹ پر قائم تھا غرض جھگڑے نے مستقل صورت اختیار کر لی میں اپنی ”خو“ نہ چھوڑتا تھا اور وہ اپنی ”وضع“ پر قائم تھے۔

ابا سخت ناراض ہو گئے سچ تو یہ ہے کہ گو مجھے ان سے دلی محبت تھی لیکن میں بھی دل برداشتہ ہو چکا تھا انہوں نے صریح حکم دے دیا کہ میں نقاش بننے کا وسوسہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دوں میں نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا، اور برملا کہہ دیا کہ میں سوائے نقاشی کے اور کچھ نہ سیکھوں گا۔ اس بحثا بحثی میں تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے اختیارات پدری سے کام لینا شروع کر دیا یہاں میرے لیے سوائے خاموشی کے چارہ نہ تھا لیکن اپنی دھمکی میں نے بھی پوری کر دکھائی میرا خیال تھا جب میں اسکول میں کوئی ترقی نہ کروں گا تو ناچار انہیں میرا پسندیدہ شغل اختیار کرنے کی اجازت دینی پڑے گی۔

تاریخ میرا مرغوب مضمون تھا

نہ معلوم میرا قیاس صحیح تھا یا غلط۔ ہاں اسکول میں میرے تغافل کا نتیجہ ضرور جلد ہی ظاہر ہونے لگا۔ میں صرف انہیں مضامین پر دھیان دیتا تھا جو میرے مذاق کے مطابق تھے۔ بالخصوص میں ان مضامین میں تو پوری رغبت سے محنت کرتا تھا جو نقاش بننے کے لیے مفید مطلب ہو سکتے تھے اس کے سوا باقی تمام مضامین میرے نزدیک کسی کام کے نہ تھے۔ اس لیے میں نے ان سے کامل غفلت برتنی شروع کی۔ جب میرے متعلق اسکول کی رپورٹ گھر پہنچی تو حالت یہ تھی کہ جن مضامین میں ہم نے شوق سے کام کیا تھا وہاں تو ہمارا شمار چوٹی کے طالب علموں میں تھا۔ اور باقی کہیں معمولی اور کہیں اس سے بھی بدتر تاریخ و جغرافیہ میرے مرغوب مضامین تھے چنانچہ میں ان دونوں مضامین میں جماعت بھر میں اول تھا۔

جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے متعلق دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو مجھ پر قومی عصبیت پھوٹ پھوٹ کر طاری ہونے لگی۔ اور دوسرے مجھے تاریخ کی معنوی حقیقت کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔

نسبی اور نسلی تعصب کا احساس

اس وقت آسٹریا کی ریاست مختلف قوموں کی معجون مرکب تھی۔ان دنوں جرمنی میں رہنے والے جرمن یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے جو بھائی آسٹرین چڑیا خانے میں بستے تھے وہاں بھانت بھانت کی قوموں سے مل کر زندگی بسر کرنے کے باعث ان کی کیا گت بن رہی تھی۔ جرمنی اور فرانس کی جنگ میں جرمنوں کو جو شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ان کے باعث وہ یا تو اپنے آسٹرین بھائیوں کو بھول گئے اور یا انہیں حقیر شمار کرنے لگے ہیں۔انہوں نے یہ فراموش کر دیا کہ آسٹریا کے جرمن بہترین جرمن خون سے نہ ہوتے تو سوا پانچ کڑور باشندوں کی سلطنت کو اپنے قالب میں نہ ڈھال سکتے۔یہ ان کے اسی کارنامہ کا کرشمہ تھا کہ خود جرمنی کو بھی ساری آسٹرین سلطنت ایک جرمن ریاست خیال کرنے کا مغالطہ ہو گیا۔یہ ایک مہلک مغالطہ تھا۔تاہم اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مشرق میں بسنے والے جرمنوں کا یہ کارنامہ پکار پکار کر ان کی شرافت نسبی کی شہادت دے رہا ہے۔

جرمن میں رہنے والے جرمن نہ جانتے تھے کہ ان کے بھائی آسٹریا میں اپنی زبان، اپنے اسکول میں اپنی تہذیب کس جدوجہد سے بچا رہے ہیں، ہاں آج جب جرمنی خود عاجز ہو چکا ہے اور قوم کے لاکھوں جگر گوشے قوم کی گود سے بچھڑ کر غیروں کے دامن میں رسوائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔جن کی زندگی کا سہارا محض مادر وطن سے دوبارہ پیوستہ ہونے کی امید ہے۔جو اپنی زبان محفوظ رکھنے کی مقدس جدوجہد میں جانیں لڑا رہے ہیں۔آج اور صرف آج جرمنوں کو بحیثیت مجموعی احساس ہو رہا ہے کہ امت کی نسلی روایات کو برقرار رکھنا کس بار گراں کا ذمہ لینا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب کہیں اکا دکا ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں جنہیں مشرقی جرمنوں کی عظمت کا احساس ہو رہا ہے۔یہ انہیں جرمنوں کا دل گردہ تھا جو یکہ و تنہا محض اپنے بل بوتے پر صدیوں تک جرمن سلطنت کو ایشیا کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے سینہ سپر رہے۔جب جرمنی کو سمندر پار مقبوضات حاصل کرنے کا سودا سر پر سوار تھا۔لیکن اہل جرمن اپنے ہمسایہ میں بسنے

والے ایک خون اور ایک پوست کے بھائیوں سے لہو سفید کر چکے تھے۔ اس وقت یہی آسٹریا کے جرمن تھے جنہوں نے گرتے گرتے بھی مشرق میں جرمن تہذیب کا جھنڈا تھامے رکھا۔

سپاہی بزدل اور غدار

جیسے دنیا کے اور سب جھگڑوں میں دستور ہے آسٹریا میں جرمنوں نے اپنی زبان کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تو تین اقسام کے اشخاص سامنے آئے۔ اس جنگ میں کچھ تو سپاہی تھے۔ کچھ بزدلوں کی طرح جان بچاتے تھے اور کچھ غدار نا ہنجار تھے یہ تقسیم اسکولوں کے بچوں میں بھی چھپی نہ رہی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس لڑائی کے سخت ترین معرکے اسکول کی چار دیواری سے مخصوص تھے۔ یہی وہ گہوارہ ہے جہاں آنے والی نسل کے نونہالوں کی تربیت ہوتی ہے ساری کشمکش کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ چنانچہ ننھے منوں کو غیرت دلائی جاتی تھی کہ دیکھو جرمن نونہالو! کہیں بھول نہ جانا کہ تمہاری رگوں میں کس قوم کا خون گردش کر رہا ہے۔ اور دیکھو جرمن بچیو! یاد رکھنا تمہیں ایک روز کسی جرمن کی ماں بننا ہے۔

جن لوگوں کو بچوں کے فطری رجحانات کا کچھ تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ بچے کس جوش اور شوق سے اس قسم کی تحریکوں میں دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مخصوص رنگ میں، اور اپنے مخصوص حربے استعمال کرتے ہوئے نت نئے طریقوں سے داد شجاعت دی کبھی تو وہ غیر زبانوں کے گیت گانے سے انکار کر دیتے۔ کبھی وہ اپنے خرچ سے پیسے بچا کر قومی روایات برقرار رکھنے کیلئے چندہ دیتے۔ غرض جتنا انہیں جرمن قوم سے دور لے جانے کی کوشش کی جاتی، اتنے ہی زور کے ساتھ وہ اس کے پہلو سے لپٹتے تھے۔ دن رات جرمن مشاہیر کے چرچے ان کی زبانوں پر تھے جب کوئی غیر جرمن استاد کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکالتا، فوراً ان کے کان کھڑے ہو جاتے متحد الاواز ہو کر وہیں اس کی تردید کر دی جاتی جرمن لباس پہننا ممنوع تھا طالب علم یہی لباس پہن کر

اسکول آتے۔ پھر جب اس جرم کے لیے انہیں جسمانی سزا دی جاتی تو وہ اس پر فخر کرتے۔ مختصر یہ کہ بچے قومی وفاداری ہی کا ایسا نمونہ پیش کر رہے تھے جس سے عمر رسیدہ لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ ماحول تھا جس کے اندر میں نے بچپن سے ہی اس جہاد میں حصہ لینا شروع کیا جو ہماری قوم کو آسٹریا میں درپیش تھا۔ جب محبان ملت کے جلسے منعقد ہوتے تو ہم قومی نشان لگا کر اور قومی لباس پہن کر ان میں شریک ہوتے ہم ایک دوسرے سے ملتے تو جرمن طرز سے سلام کرتے جب قومی ترانہ گانے کا موقعہ ہوتا ہم آسٹرین ترانہ کے بجائے جرمن ترانہ الاپنے لگتے اور پھر خوشی سے اس کے لیے سزا برداشت کرتے۔ اس طرح جب ایک نام نہاد قومی سلطنت کے باشندے سوائے قومی زبان کے اپنی قومیت سے اور کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ اس وقت ہم نوجوانوں کو سیاسی تربیت مل رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار بزدلوں کی فہرست میں نہ تھا میں تھوڑے ہی عرصہ میں جرمن قومیت کا متوالا بن چکا تھا۔

بادشاہ سے عقیدت اور ملت کی وفاداری کا فرق

قومی عصبیت میرے اندر دن دونی رات چوگنی سرایت کر رہی تھی حتیٰ کہ جب میں پندرہ برس کا تھا تو بادشاہ سے انس اور قوم سے محبت کا فرق مجھ پر واضح ہو چکا تھا میں قوم کے عشق سے سرشار تھا مجھے بادشاہ سے دلچسپی نہ تھی میری اس ترجیح کی وجوہات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو آسٹرین شہنشاہوں کی کرتوتوں سے واقف ہیں۔

تمام دوسرے ممالک کے مقابلہ میں آسٹریا کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ یہاں تاریخ کا درسی نصاب کلہم تاریخ عالم پر مشتمل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کی اپنی علیحدہ تاریخ نہ ہونے کے برابر تھی اس ملک کی قسمت ہمیشہ سے جرمنی کے ساتھ وابستہ رہی ہے اس لیے آسٹریا کی تاریخ کو جرمنی سے جدا بیان کرنا محال تھا۔ آسٹریا کی علیحدہ تاریخ تو صرف اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب جرمن قوم دو ریاستوں میں بٹ گئی۔

جب 1918ء میں آسٹرین شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا تو وہاں کے جرمنوں نے بے اختیار جرمنی سے الحاق کی خواہش ظاہر کی۔ یہ خواہش ایک پوری قوم کی خواہش تھی۔ جو اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کو نہ بھولی تھی اور پھر اس سے وابستہ ہونا چاہتی تھی اس خواہش کا تجزیہ کریں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس کی وجہ وہی جرمنی اور آسٹریا کی تاریخ کی مشترکہ تدریس تھی آسٹریا کے جرمنوں کے دلوں میں فرداً فرداً نہال اخوت کے جو بیج ڈالے جا چکے تھے وہ ضائع نہ ہو سکتے تھے۔ خصوصاً جب قوم پر آفات اور مصائب کا ہجوم ہو تو وقتی مصلحتیں دبتے ہی مستقل مفاد کا ابھر آنا ایک فطری امر ہے۔

مطالعاتی تاریخ کا گر

ابھی تک ہمارے اسکولوں میں تاریخ پڑھانے کا نتیجہ سخت نا قابل اطمینان ہے بہت کم استاد سمجھتے ہیں کہ چند واقعات اور اوقات رٹ لینے کا نام مطالعہ تاریخ نہیں۔ طالب علموں کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ فلاں جنگ کس سن میں ہوئی تھی اور فلاں سپہ سالار یا کوئی اور دوسرا تیسرا کب پیدا ہوا تھا۔ ان کی بلا جانے فلاں بادشاہ کو کس دن تخت و تاج حاصل ہوا۔ یہ اہم اور ضروری باتیں نہیں۔

درس تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخی اہمیت رکھنے والے واقعات کے اسباب کو سمجھ کر ان طاقتوں کی تہ تک پہنچ جائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے نئے نئے کرشمے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ مطالعہ درحقیقت ایک فن ہے جس کا ملکہ یہ ہے کہ انسان اصل کو یاد رکھنے اور فروغ کر فراموش کرنے پر قادر ہو جائے۔ کیونکہ جب اصل ذہن میں محفوظ ہو تو اس سے ہر وقت فروغ کا استخراج ممکن ہے۔

غالباً میری زندگی کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ میرا تاریخ کا استاد جس طرح اس علم کو سمجھتا تھا۔ شاید بہت کم لوگ اس طرح اس مضمون کو سمجھتے ہوں گے علاوہ ازیں وہ جو کچھ خود سمجھتے تھے اسے سمجھا بھی سکتے تھے اور پھر اپنے پڑھائے ہوئے سبق کا امتحان لینے کا گر بھی جانتے تھے میرے اس استاد کا نام لیوپولڈ پوئے ٹش

تھا۔ وہ لنز کے جدید مدرسہ میں ملازم تھے۔ میں نے علم تاریخ کے استاد کے لیے جن اوصاف کو اوپر ضروری قرار دیا ہے وہ سب ان کی ذات میں جمع تھے وہ ایک معمر بزرگ تھے ان کی چال ڈھال میں ایک حاکمانہ شان تھی اس کے ساتھ ہی ان میں شفقت کی کمی بھی نہ تھی جب وہ تقریر کرتے تو انسان خود بخود ان کی طرف کھنچا جاتا جس جذبہ سے وہ خود پڑھاتے تھے وہی جوش ان کے شاگردوں میں بھی پیدا ہو جاتا تھا میں آج بھی اس قابل احترام ہستی کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے جب وہ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے تو ہم گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ ماضی کے سمے پھر ہماری آنکھوں تلے پھر جاتے تھے وہ عہد گذشتہ کے مدھم نقوش میں ایسی جان بھر دیتے تھے کہ ایک دفعہ تو ہمیں بے جان کتابوں میں جیتے جاگتے ہنگاموں کی سیر ہو جاتی تھی جب وہ ہم سے مخاطب ہو کر اپنا لیکچر شروع کرتے تو ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اور بعض اوقات تو ہماری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔

ہمارے یہ استاد صرف زمانہ حال کی مثالوں سے ماضی کی تفسیر ہی بیان نہ کرتے تھے بلکہ ماضی کی مثالوں سے حال کے لیے سبق آموز نکات اخذ کر کے ان کی وضاحت بھی کرتے تھے انہیں ان مسائل پر پورا عبور تھا جو ان دنوں ہمارے لیے باعث اضطراب تھے۔ جماعت کا نظام اور مضمون پر ہماری توجہ برقرار رکھنے کے لیے وہ ہماری قومی غیرت کو اکسا کر کام لیتے تھے۔ ان استاد کی طفیل تاریخ میرا مرغوب مضمون بن گئی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اندر ایک باغیانہ ذہنیت اور انقلابی رجحان پیدا ہو گیا۔ جرمن تاریخ پڑھ کر اور پھر ایسے استاد سے پڑھ کر اس حکومت سے بیزاری ایک طبعی امر تھا جو قوم کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھی۔ شہنشاہ وقت کا جرمن کش رویہ اور قوم فروشی کی سابقہ روایات اس کا دشمن بنانے کے لیے کافی تھیں۔

زمانہ بہترین استاد ہے

ہر بوجھ جرمنوں کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا تھا۔ ان کی جان و مال کو بے رحمی سے

چوس چوس کر آسٹرین سلطنت کے ٹھنٹھ کو سرسبز رکھنے کی لاحاصل کوششیں کی جاتی تھیں۔ ہمیں یہ تلخ احساس بے چین کیے دیتا تھا کہ اس مرگ رسیدہ جونک کو زندہ رکھنے کا باعث جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد ہے اس اتحاد سے بظاہر کم از کم یہی نظر آتا تھا جرمنوں کی جو گت بن رہی ہے اس پر جرمنی رضامند ہے آسٹریا کا بزدل شہنشاہ ابھی تک یہ ڈھونگ نباہنے کا خواہشمند تھا کہ آسٹرین سلطنت ایک جرمن حکومت ہے۔ ان حرکتوں سے وہ نفرت پھیلی جس نے بالآخر باغیانہ جذبہ کی صورت اختیار کر لی۔

جرمنی کو ابھی تک حقیقت حال کا احساس نہ تھا گویا وہ اندھے ہو چکے تھے کہ ایک نعش کو اپنی آنکھوں کے سامنے گلتا سڑتا دیکھتے تھے اور پھر اس میں رمق جان بحال کرنے کے درپے تھے۔ جرمنی اور آسٹریا کے اس منحوس اتحاد میں ہی جنگ عظیم اور ہماری قومی بربادی کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔

میں آگے چل کر اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالوں گا۔ فی الحال یہ کہنا کافی ہے کہ میں نے ہر سال ترقی عمر کے ساتھ ساتھ جو اصول استنباط کیے وہ مجھے آج تک بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ امتداد زمانہ سے میرے عقیدے اور بھی راسخ ہوتے گئے۔ یہ عقیدے حسب ذیل ہیں اول تو یہ کہ آسٹرین سلطنت کا پارہ پارہ ہونا جرمنی کی پہلی شرط ہے۔ دوسرے یہ کہ قومی عصبیت اور شہنشاہ کی وفاداری دو بالکل مختلف چیزیں ہیں تیسرے یہ کہ ہیبر برگ کا شاہی خاندان ایک دن ضرور جرمنی کی بربادی کا باعث ہوگا۔ ان عقیدوں کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے آسٹریا اور جرمنی سے جتنی محبت تھی آسٹرین شہنشاہیت سے اتنی ہی عداوت ہوگئی۔

تاریخ سے اس طرح استدلال کی جو عادت مجھ میں اسکول کی تعلیم سے راسخ ہوگئی تھی وہ پھر کبھی نہیں چھوٹی۔ دنیا کی تاریخ میرے لیے ایک خضر راہ ثابت ہوئی جس کی رہنمائی سے میں ہمیشہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب رہا ہوں میں تہیہ کر چکا ہوں کہ سیاسیات میں کبھی کسی دوسرے سے سبق نہ لوں گا بلکہ خود سیاسیات عالم کے سامنے

ہی زانوئے ادب تہہ کروں گا زمانہ بہترین استاد ہے۔

مجھے آرٹ سے بھی دلچسپی تھی

جہاں میں سیاسیات میں قبل از وقت دلچسپی لے رہا تھا وہاں میں نے آرٹ میں بھی اس طرح ابتدا کر دی تھی ان دنوں شمالی آسٹریا کے صدر شہر میں ایک تھیٹر تھا۔ یہ تھیٹر کچھ ایسا برا نہ تھا یہاں ہر قسم کے ناٹک دکھائے جاتے تھے جب میں بارہ سال کا تھا تو میں نے یہاں ایک ناٹک دیکھا۔ تھیٹر کے متعلق یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے کچھ ماہ بعد میں نے عمر میں پہلی مرتبہ راگ گھر میں حاضری سے لطف اٹھایا۔ مجھے فوراً سماع سے دلچسپی ہو گئی تب سے میں نے بار بار ان محفلوں میں شمولیت کا حظ اٹھایا۔ اب میں اپنے تئیں خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ ان دنوں کی مشق نے آج مجھ میں آرٹ کو سمجھنے کا صحیح مذاق پیدا کر دیا ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن ابا نے میرے لیے جو پیشہ انتخاب کیا تھا اس سے میری نفرت بڑھتی ہی گئی جوں جوں میں ہوش سنبھالتا تھا میری یہ رائے اور پختہ ہوتی جاتی تھی کہ میں دفتر کا بابو نہیں بنوں گا۔ اب تو اسکول میں بھی میری ڈرائنگ کی قابلیت تسلیم کی جا چکی تھی میرا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دھمکانے پھسلانے سے میری رائے تبدیل کرنے کی امیدیں پہلے سے بھی زیادہ بیکار تھیں میں نقاش بننا چاہتا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت میری خواہش کے خلاف مجھے دفتر کا بابو نہ بنا سکتی تھی۔ ہاں عجیب بات یہ تھی کہ میرا ذاتی رجحان اب خود بخود فن تعمیر کی جانب زیادہ ہوا جاتا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ میری فن تعمیر سے دلچسپی بھی نقاشی سے رغبت ہی کا نتیجہ ہے میں اس طرح آرٹ سے اپنی مناسبت بڑھ جانے پر خوش تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ایک دن فن تعمیر سے میری یہ دلچسپی نقاشی کو پس پشت ڈال دے گی۔

میں یتیم رہ گیا

اسی اثناء میں میرے لیے کسی پیشہ کو اختیار کرنے کا مسئلہ اس آسانی سے حل ہو گیا

جس کا خیال تک بھی نہ تھا میں تیرھویں سال میں تھا کہ ابا اچانک انتقال کر گئے وہ چنگے بھلے تھے موت نے انہیں بغیر طویل ایذا دیئے ہم سے جدا کر دیا ہمیں جو صدمہ پہنچا وہ ظاہر ہے ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں دفتر کا بابو بنا دیں تا کہ خود دنیا کی ٹھوکروں کا جو تجربہ ہوا تھا وہ اس سے محفوظ رہے۔ لیکن آخری عمر میں انہیں اپنی یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

پہلے پہل تو زندگی میں کوئی خاص تغیر رونما نہ ہوا۔ ابا کی خواہش کے مطابق میری تعلیم کی تکمیل اماں اپنا فرض خیال کرتی تھیں گویا وہ بھی مجھے دفتر کا بابو بنانا چاہتی تھیں لیکن میرا اب پہلے سے بھی زیادہ مصمم ارادہ ہو چکا تھا کہ میں ہرگز دفتر کا بابو نہیں بنوں گا۔ اسکول کا طریقہ تعلیم اور نصاب میرے مذاق سے اس قدر بعید تھا کہ میں اس طرف سے سراسر غافل ہو گیا۔

اسی دوران میں علالت نے میری مدد کی چند ہی روز میں میرے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا۔ خاندان میں جو شکر رنجی دیر سے چلی آتی تھی آخر اس کا خاتمہ ہوا۔ میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اماں کو صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے ہرگز کوئی ایسا پیشہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس کے باعث مجھے بند دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا پڑے اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ کم از کم ایک سال کے لیے مجھے اسکول سے اٹھا لینا چاہیے دیر سے جو تمنا میرے دل میں تھی وہ اب خود بخود اور غیر متوقع طور پر پوری ہو گئی اماں نے میری بیماری سے متاثر ہو کر مجھے اسکول سے اٹھا لیا اور فنی درسگاہ میں داخل کرانے پر بھی آمادہ ہو گئیں خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہونے تھے دو سال بعد اماں کی موت نے میری تمام تجاویز خاک میں ملا دیں۔ اماں وفات سے پہلے ایک طویل اور تکلیف دہ بیماری میں مبتلا رہیں۔ شروع سے ہی ان کی بچنے کی کوئی امید نہ تھی اگرچہ اماں کا اٹھ جانا دیر سے نظر آ رہا تھا پھر بھی مجھے اس سے سخت دھچکا لگا میں ابا کا احترام کرتا تھا لیکن اماں سے مجھے محبت تھی۔

مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا

تلخی ایام اور مفلسی نے جلد ہی مجھے کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔

خاندان کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ اماں کی بیماری پر خرچ ہو چکی تھی مجھے یتیمی کا جو وظیفہ ملنا شروع ہوا وہ ضروریات زندگی کے لیے بھی ناکافی تھی مجھے اپنی روٹی کسی نہ کسی طرح خود پیدا کرنی ہوگی۔

میں نے اپنے کپڑے ایک تھیلہ میں ڈالے اور ایک آہنی ارادہ دل میں لے کر وانا کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ جس طرح پچاس برس پہلے ابا نے خود اپنی تقدیر کی بنیاد تعمیر کی تھی میں بھی انہیں کے نقش قدم پر چلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ ''میں کچھ بن کر رہوں گا'' لیکن میں دفتر کا بابو کسی صورت بننا قبول نہ کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم :: وائنا میں مصیبتیں جھیلنا اور عبرت حاصل کرنا

مدرسے کا امتحان داخلہ

اماں کی وفات سے پیشتر ہی ایک طرح میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا میں اماں کی بیماری کے آخری دنوں میں فنون لطیفہ کی درسگاہ کا امتحان داخلہ دینے کی نیت سے وائنا گیا۔ میرے تیار کردہ نقاشی کے خاکوں کا ایک ضخیم گٹھا میری بغل میں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں ضرور اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اسکول کے زمانہ سے ہی میں ڈرائنگ کا بہترین طالب علم شمار ہوتا تھا اور اب تو میں نے مزید شق پیدا کر لی تھی غرض میں مطمئن تھا۔ مجھے اپنے کمال پر فخر تھا اور میں یقینی کامیابی کے تصور سے پھولا نہ سماتا تھا۔

تاریخی عمارات کا مجھ پر اثر ہے

ہاں ایک الجھن ضرور تھی مجھے نقاشی کی نسبت ڈرائنگ میں اور خاص طور پر عمارتی نقشہ نویسی میں زیادہ مہارت ہوتی جاتی تھی ساتھ ہی ساتھ فن تعمیر سے میرا لگاؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میرا میلان طبع نقاشی کی بجائے فن تعمیرات کی جانب زیادہ ہے۔ میرا قیام وائنا میں دو ہفتہ رہا۔ اس دوران میں یہ شوق اور بھی ترقی کر گیا۔ ابھی میری عمر پورے سولہ سال نہ ہوئی تھی یہاں کے عجائب گھر میں گیا تو تھا۔ نقاشی کے نمونے دیکھے لیکن میری تمام دلچسپی عجائب گھر کی عمارت نے ہی جذب کر لی صبح سے لے کر شام تک میں شاہی عمارات دیکھتا رہا۔ ہر جگہ مجھے عمارت کی ساخت کشش کرتی تھی۔ میں راگ گھر اور دیوان عام کے سامنے گھنٹوں بت بنا دیکھتا رہا۔ باغ عام دیکھ کر میں ایسا مسحور ہو گیا کہ گویا میری آنکھوں کے سامنے الف لیلہ کا کوئی منظر ہے۔

اپنا حقیقی میلان میں خود غلط سمجھتا تھا

اس خوبصورت شہر میں میری یہ دوسری آمد تھی میں بے صبری سے امتحان کے نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے کامیابی کا ایسا اعتماد تھا کہ فیل ہو جانے کی خبر مجھ پر بجلی کی طرح گری تاہم میں خود درس گاہ کے منتظم اعلی کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ آپ کیوں مجھے نقاشی سیکھنے کے لیے داخل نہیں کرتے انہوں نے جواب دیا جو خاکے میں نے پیش کیے تھے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مجھے نقاشی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ہاں عمارتی نقشہ نویسی سے ضرور گہری مناسبت ہے غرض وہ مجھے نقاشی کے لیے تو داخل نہیں کریں گے۔ البتہ عمارتی نقشہ نویسی کے لیے داخل کر لیں گے یہ سن کر کچھ دیر کے لیے تو میں بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ میں آج تک کبھی عمارتی نقشہ نویسی کے اسکول میں نہ گیا تھا۔ نہ ہی میں نے کہیں اور اس فن کی تعلیم حاصل کی تھی۔

جب میں منتظم اعلی سے ملاقات کے بعد باہر آیا تو میری امیدوں پر اوس پڑ چکی تھی عہد شباب میں یہ پہلا موقعہ تھا جب میں خود اپنے آپ پر جھنجھلا رہا تھا۔ اپنی استعداد کے متعلق جو کچھ میں نے ابھی سنا تھا اس سے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں دو چیزوں کے مابین تذبذب اور گومگو میں مبتلا ہوں یہ کیفیت مجھ پر عرصہ دراز سے طاری تھی لیکن نہ معلوم کیوں اور کس طرح۔

تھوڑے ہی دنوں میں مجھے خود بھی احساس ہونے لگا کہ مجھے ماہر عمارات بننا چاہیے لیکن اس راستہ میں کئی مشکلات تھیں اب میں ان دنوں کو کوستا جب میں نے اسکول میں کچھ مضامین غور سے پڑھے اور باقیوں کو نظر انداز کر دیا۔ عمارتی نقشہ نویسی کی جماعت میں شامل ہونے سے پیشتر ٹیکنیکل بلڈنگ اسکول میں جانا لازمی تھا۔ اور اس اسکول میں داخلہ سے پہلے مڈل اسکول سے فارغ التحصیل ہونے کا سرٹیفکیٹ دکھانا ضروری تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ مجھے نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ غرض بظاہر میرے لیے آرٹ کو بطور پیشہ اختیار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

مصیبت حوصلہ کے امتحان کا نام ہے

اماں کی وفات کے بعد اب میں تیسری مرتبہ وانا آیا۔اس دفعہ مجھے کئی سال یہیں رہنا تھا چونکہ میں پہلے بھی یہاں رہ گیا تھا۔اس لیے جلد ہی میرا اطمینان اور استقلال واپس لوٹ آئے۔وہی پرانی خود اعتمادی پھر میرے اندر پیدا ہوگئی میں نے یکسو ہو کر اپنا نصب العین تاک لیا۔میں ماہر تعمیرات بنوں گا زندگی میں رکاوٹیں اس لیے درپیش نہیں آتیں کہ پائے استقلال لغزش کھا جائے۔بلکہ اس لیے پیش آتی ہیں کہ ہم انہیں ہٹا کر اور بلندی پر پہنچیں میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ میں ان رکاوٹوں پر غالب آ کر رہوں گا۔میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت ابا کی تصویر رہتی تھی جو ایک موچی کے بیٹے ہو کر محض ذاتی ہمت سے دفتری بابو کے درجے تک پہنچے۔میری ابتدا تو اس سے بہتر حالت میں ہوئی ہے میرے لیے جدو جہد کے امکانات بھی بہتر ہیں ان دنوں مجھے زمانہ کی سختی کا شکوہ تھا لیکن آج میں اس حکیم مطلق کا شکر گزار ہوں کہ وہ میری بہتری کا سامان کر رہا تھا۔قسمت کی دیوی مجھے دونوں ہاتھوں میں دبا کر مسل دینا چاہتی تھی لیکن مشکلات کے ہجوم کے ساتھ ساتھ میرا ارادہ بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔آخر قوت ارادی نے فتح پائی۔

میں اپنی زندگی کے اس دور کے لیے ممنون ہوں۔یہ اسی دور کا اثر تھا جس نے مجھ میں پختگی پیدا کر کے مجھے ایسا گٹھا ہوا بنا دیا جیسا کہ میں آج ہوں میں اس لیے مزید ممنون ہوں کہ عیش و آرام مجھے کھوکھلا نہ کر سکے ماں کا دلارا اس کے آغوش محبت سے چھین کر مصیبتوں کی سوتیلی ماتا کے حوالے کر دیا گیا۔ان دنوں میں اس محرومی قسمت کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھا۔آج میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے مفلسی اور خرماں نصیبی کی دنیا بھی دیکھ لی یہیں میں نے ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا جن کی خاطر آئندہ مجھے جنگ کرنا تھا۔

شہروں میں کفن چور بستے ہیں

یہیں مجھے پہلی مرتبہ ان دو ہولناک خطرات کا علم ہوا جن کا مجھے خیال بھی نہ تھا یہ

خطرات جرمن قوم کے وجود کو لاحق تھے ان میں سے پہلے کا نام اشتراکیت اور دوسرے کا نام یہودیت ہے۔

اکثر لوگوں کو وائنا کے ذکر سے معصوم مسرتوں اور میلے تماشوں کے تصورات یاد آجاتے ہیں افسوس میرے حافظہ کے لیے یہ نام غم و درد کی ایک المناک داستان ہے آج بھی جب میں اس شہر کا ذکر کرتا ہوں تو میرے دماغ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں نے مفلسی کے پانچ سال اس کفن چوروں کے شہر میں بسر کیے میں اس پانچ سال کے عرصہ میں پہلے قلی بن کر اور پھر ایک معمولی نقاش کی حیثیت سے پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔ بھوک ہر وقت ستاتی تھی جو ٹکڑا میسر آتا تھا اس سے شکم سیری بھی نہ ہوئی تھی یہ فاقہ کشی ایک مستقل محافظ تھا جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا میں جو کچھ کرتا اس میں بھوک بھی شریک تھی اگر میں کوئی کتاب خریدتا تو پیٹ پر پتھر باندھ کر۔ اگر میں راگ گھر جاتا تو اگلے دن کا کھانا ملتوی رہتا۔ غرض میں ہر وقت فاقہ کشی کے اس بے رحم ساتھی سے مصروف پیکار رھتا۔ باوجود اس کے جتنا کچھ میں نے اس زمانہ میں سیکھا پہلے کبھی نہ سیکھا تھا۔ فن تعمیرات کے مطالعہ اور کبھی کبھی راگ گھر جانے (جس کی قیمت بھوک کے سکہ میں ادا کرنی پڑتی تھی) کے علاوہ کتابیں پڑھنا میرے لیے وال دسامان راحت تھا۔

کچھ کرلو نوجوانوں اٹھتی جوانیاں ہیں

میں نے ان دنوں بہت کچھ پڑھا۔ پھر جو پڑھا اس پر گہری غور وغوض کی کام سے فرصت کا جو وقت ملتا وہ مطالعہ کتب میں صرف ہوتا۔ اس طرح میں نے چند ہی سالوں کے عرصہ میں وہ سرمایہ علم جمع کرلیا جو میرے لیے آج بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔

صرف یہی نہیں میں نے اسی دوران میں زندگی اور دنیا کے متعلق واضح عقیدے قائم کرنے شروع کیے میرے عمل کی سنگین بنیادیں انہیں عقیدوں پر تھیں اس کے بعد میں نے آج تک ان عقیدوں کو تبدیل نہیں کیا صرف کہیں کہیں وسعت دی ہے۔

آج میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انسان اپنی تخلیقی بنیادیں عہد شباب میں ہی

کھڑی کر لیتا ہے تجربہ اور ایجاد طبع دو بالکل مختلف چیزیں ہیں تجربہ تو وہ دور اندیشی اور باریک بینی کا خاصہ ہے جو عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتا ہے برعکس اس کے ایجاد طبع فکر و تخیل کے گلزار میں جوانی کے موسم سے ہی ہر دم نئے شگوفے کھلاتی ہے یہ مانا کہ ان گلہائے تازہ کی افراط انہیں عمل کے گلدستہ کی شکل اختیار کرنے سے مانع رہتی ہے لیکن مستقبل میں یہی خیال آرائیاں تعمیر عمل کے لیے تجویزیں اور سامان دونوں لوازمات مہیا کرتی ہیں عمر رسیدگی ان ہی بکھرے ہوئے پھولوں سے حصول مقصد کی شاندار مالا پروتی ہے۔ بشرطیکہ بڑھاپے کی نام نہاد ''دانائی'' ان پھولوں کو کچل نہ ڈالے۔

اللہ نو دولتوں سے بچائے

اب تک میری زندگی ماں باپ کے سایہ میں بسر ہوئی تھی یہ زندگی ایسی ہی تھی جیسی میرے جیسے کسی اور لڑکے کی ہوتی کل کیا ہوگا اس کی فکر نہ تھی اور غریبوں کی کیسی بسر ہوتی ہے اس کا احساس نہ تھا میرا بچپن کا زمانہ معمولی درجہ کے خوشحال طبقہ میں گزرا ان لوگوں کو غریب مزدور کی دنیا سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اگرچہ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ متوسط الحال طبقہ اور غریب مزدوروں کے مابین ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جس کا لوگوں کو علم بھی نہیں یہ ٹھیک ہے کہ متوسط الحال طبقہ بھی کچھ ایسا امیر نہیں ہوتا لیکن جو لوگ غریبی کی حالت سے اٹھ کر کھاتے پیتے ہو جائیں انہیں ہمیشہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں ہم پھر اس پہلی حالت کو نہ پہنچ جائیں کہیں ہمیں مفلسوں کی فہرست میں شمار نہ کیا جائے کل جو لوگ ہمارے ساتھ تھے اور آج پیچھے رہ گئے ہیں وہ کہیں مسلط نہ ہو جائیں علاوہ ازیں قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے برے دنوں کی یاد نا پسند ہوتی ہے مزدوروں کی باہمی غیر متمدن حرکات اور درشت عادات سے نفرت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ یہ سب باتیں مغائرت کو دشمنی کی حد تک پہنچا کر رہتی ہیں غرض جو لوگ خوش حالی اور تمدن کی پہلی سیڑھی چڑھ جائیں انہیں اپنے پہلے ساتھیوں سے ذرا سا تعلق رکھنا بھی سخت

دشوار ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نو دولت لوگوں کی نسبت بالائی طبقوں کے خاندانی امیر زیادہ آسانی سے اپنے غریب ترین بھائیوں سے مل جل سکتے ہیں اور ان کے خیالات کا اندازہ کر سکتے ہیں نو دولت سے میری مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی ہمت کے بل بوتے پر دولت و عزت کے کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے جو پہلے اسے نصیب نہ تھا جدوجہد کی سختیاں ایسے لوگوں کے دلوں سے طبعی انسانی ہمدردی کا نقش مٹا دیتی ہیں انہیں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے اتنے شدت کے معرکے لڑنے پڑتے ہیں کہ اب جو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں وہ ان کے مصائب بھول چکے ہیں۔

اس نظر سے دیکھو تو میرے مقدر نے سازگاری کی زمانہ کی گردش نے مجھے پھر اسی غربت اور مالی تشویش کی دنیا میں دھکیل دیا۔ جہاں سے ابا نے اوائل عمر میں اپنے آپ کو نکالا تھا۔ معمولی خوشحالی سے قلب میں جو تنگی اور آنکھوں میں جو چکا چوند آ جاتی ہے وہ اس آزمائش میں پڑ کر مجھ سے دور ہو گئی مجھے پہلی مرتبہ مردم شناسی کا ملکہ حاصل ہوا بظاہر جو لوگ جاہل نظر آتے ہیں میں نے ان کی ویران شکلوں کے اندر پوشیدہ روح کو سمجھنا شروع کیا۔

امیروں کی دنیا جدا ہوتی ہے

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی وائنا کوان شہروں میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ جن کے باشندوں میں ایک طرف چوٹی کے امیر تھے تو دوسری طرف ہزارہا بندگان خدا سر چھپانے کو جھونپڑے اور پیٹ بھرنے کو روٹی کے ٹکڑے سے بھی لاچار تھے دولت کی چندھیا دینے والی چمک دمک اور غربت کی گھناؤنی رسوائی کا فرق پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہوتا تھا شہر کے مرکز اور اندرونی حلقہ میں اس عظیم الشان سلطنت کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا جو پانچ کروڑ بیس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی یہیں وہ مہلک کرشمے بھی نظر پڑتے تھے جو ایک حکومت کے ماتحت متعدد قوموں کے جمع ہو جانے کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں شاہی دربار

کی مسحور کن شان و شوکت میں وہ مقناطیسی قوت تھی جو سلطنت کے کونے کونے سے دولت اور ذہانت کو یہاں کھینچ لائی تھی اس کشش میں شاہان ہیز برگ کی اس خاندانی پالیسی سے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ ہر چیز کا مرکز اور مقصد اپنی ذات کو قرار دیتے تھے۔

مختلف اقوام کی اس معجون مرکب سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے ہر شئے مرکز سے وابستہ رکھنا از حد ضروری تھا چونکہ وائنا کو دار السلطنت ہونے کے علاوہ شاہی قیام گاہ کا مرتبہ بھی حاصل تھا اس لیے یہاں بڑے بڑے عہدہ داروں کی خوب بھیڑ رہتی تھی۔

وائنا خالی آسٹروی سلطنت کا سیاسی اور علمی مرکز ہی نہ تھا تجارت کا مرکز بھی یہیں تھا فوج کے اعلیٰ افسروں، سلطنت کے عہدہ داروں، فنون لطیفہ کے ماہروں اور علماء کے ہجوم کے علاوہ مزدوروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی سوداگروں اور نوابوں کی دولت کے پہلو بہ پہلو مفلسی کی ذلیل ترین خواریاں دکھائی دیتی تھیں باغ عام کے سامنے ہزارہا بیکار چکر کاٹتے رہتے تھے بڑے بازار سے آگے جائیں تو نالیوں کی گندگی اور گھٹا ٹوپ میں خانماں برباد لوگ ایک دوسرے پر ٹھسے ہوئے نظر پڑتے تھے۔

افلاس کا علاج سخاوت نہیں انصاف ہے

بیکاری اور مفلسی کے بڑھ جانے سے قوم کو جو مسئلہ درپیش تھا اس کا مطالعہ جس طرح وائنا میں کیا جا سکتا تھا غالباً جرمنوں کے اور کسی شہر میں نہ کیا جا سکتا تھا لیکن یہیں میں تنبیہہ کر دینا چاہتا ہوں کہ مفلسی اور بیکاری کی چکی میں پسے بغیر اس مسئلہ کو سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ جو شخص خود کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا وہ کیا بتا سکتا ہے کہ مصیبتیں دور کیسے کرتے ہیں یہاں تو جس پر خود نہیں بیتی وہ سطحی گفتگو اور جذباتی اوہام کے اظہار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ خالی سطحی گفتگو اور موہوم جذبات کے اظہار سے الٹا نقصان پہنچتا ہے سطحی گفتگو سے تو یوں نقصان پہنچتا ہے کہ ہم کبھی مسئلہ کی تہ تک نہیں پہنچتے اور موہوم جذبات سے یہ نقصان پہنچتا ہے کہ ہم اصل روگ دور کرنے کے بجائے واری

صدقے ہونے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں میں نہیں کہہ سکتا ان دونوں جرائم میں سے کونسا جرم زیادہ سنگین ہے ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو قسمت کی یاوری سے یا اپنی ہمت کے زور پر دولت مند ہو گئے ہیں اور اب انہیں قوم کے حرماں نصیب اور مفلس فرزندوں کی ذرہ بھر پروا نہیں اور دوسری طرف وہ سخی سرور ہیں جو تکبر اور بے تدبیری میں کسی طرح کم نہیں ۔لیکن ہمیشہ دور سے کھڑے ہو کر اپنی ''امیرانہ شائستگی'' اور ''بیچارے مردہ ہو جانے کے باعث یہ لوگ اپنے گناہ کا عشر عشیر بھی تصور نہیں کر سکتے'' یہی وجہ ہے کہ جب ان کی ''رحم دلی'' کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں کرتی اور لوگ ان کی ''نیک تجویزوں'' سے دل برداشتہ ہونے لگتے ہیں تو انہیں سخت تعجب ہوتا ہے اس وقت یہ اکٹھے بیٹھ کر غربا کی ''ناشکری'' اور ''احسان فراموشی'' کے گلے شکووں سے دل ٹھنڈا کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو ذرا دیر سے سمجھ آیا کرتی ہے کہ قومیں سخاوتوں سے پروان نہیں چڑھتیں نہ ہی یہاں ذاتی شکرانوں کی گنجائش ہے۔رعایات اور شفقت و عنایات کا کیا سوال ہے یہاں تو انصاف کی ترازو میں تول تول کر حقداروں کو ان کا حق واپس پہنچانے کا مسئلہ در پیش ہے۔

قوم کی فلاکت اور نکبت کا مطالعہ کرتے ہوئے میں مندرجہ بالا مغالطوں سے بچا رہا۔ کیونکہ میں خود شب و روز غربت کے ستائے ہوؤں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ غرض یہاں دور بیٹھ کر کسی مسئلہ کو محققانہ نظر سے دیکھنے والا معاملہ نہ تھا بلکہ یہاں تو جو کچھ آزمانا تھا اپنے تن پر آزمانا تھا اگر مسافر بچ کر منزل پر صحیح سلامت پہنچ جائے تو اس کے معنی ضروری نہیں کہ راستہ اچکوں سے محفوظ تھا۔

میں مزدوری پر مجبور رہوا

جب میں اس زمانہ کے واقعات یاد کرنے لگتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ذہن نے اس وقت جو تاثرات قبول کیے اب میں ان کا محض ایک نامکمل سا عکس پیش کر سکتا ہوں یہاں میں صرف انہیں مخصوص تاثرات کا ذکر کروں گا جو کسی نہ کسی طرح میری

ذات سے متعلق ہیں اور جن میں سے بیشتر میرے اندر انقلابات عظیم کا باعث ہوتے رہے یہیں میں چند ان نتائج کا بھی ذکر کروں گا جو میں نے اپنی زندگی کے اس عہد کے تجربات سے اخذ کیے۔

اگر اس دوران میں مجھے کام تلاش کرنے میں کبھی دقت پیش نہ آئی وجہ یہ تھی کہ میں کوئی کاریگر تو تھا نہیں کہ ایک کے سوا دوسرا کام نہ کر سکتا۔ مجھے تو جو کام ملتا اور جہاں ملتا میں کرنے کو تیار تھا مجھے فقط ہر روز روٹی کمانا تھا جہاں موقعہ ملا میں کام کرنے پر آمادہ تھا۔

غرض میری حالت یورپ کے ان خانہ ویرانوں کی سی تھی جو مسافت کی مٹی پاؤں سے جھاڑتے ہوئے امریکہ پہنچ جاتے تھے اور جن کے دل میں ایک آہنی عزم ہوتا تھا کہ ہم نئی دنیا میں اپنے لیے ایک نئی قسمت تلاش کریں گے اور ایک نئے گھر کی بنیاد یں ڈال کر رہیں گے یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اپنے ہنر، اپنی روایات اور اپنی عادات کو مفلوج کر دینے والی قیود اور تعصّبات کو پیچھے چھوڑ کر ہر وہ ملازمت کرنے کو تیار رہتے تھے جو انہیں میسر آجائے اور ہر وہ کام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جو انہیں مل جائے ان کے دلوں میں یہ عقیدہ روز بروز زیادہ راسخ ہوتا چلا جاتا تھا کہ جو محنت و مشقت ایمانداری سے کی جائے چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے کبھی عزت کو بٹہ نہیں لگتا۔ مختصر یہ کہ میرے سامنے جو نئی دنیا آگئی تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر رہوں گا اور اس کے بعد جو راہ اپنے لیے انتخاب کر لی ہے اس پر پورے استقلال سے آگے بڑھتا چلوں گا۔

مجھے بیروزگاری کا تجربہ ہوتا ہے

1 مجھے جلد ہی تجربہ ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی کام ہمیشہ مل سکتا ہے لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ جتنا جلد کام مل سکتا ہے اتنی ہی آسانی اور سرعت سے وہ چھن بھی جاتا ہے میں نے جو نئی زندگی شروع کی میرے لیے اس کا تاریک ترین پہلو یہ تھا کہ باقاعدہ روزگار کا سہارا نہ تھا۔

یہ درست ہے کہ کاریگر مزدور اس کثرت سے بے روزگاری کا شکار نہ ہوتے تھے جس تواتر سے اناڑی مزدوروں کو اس بلا کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔لیکن روزگار ان کا بھی محفوظ نہ تھا اگر ایک کو بیکاری اور کساد بازاری کے باعث فاقہ کشی کرنی پڑتی تھی تو دوسرا ہڑتالوں اور مالکان کارخانہ کے مزدوروں پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے کارخانے بند کر دینے کے سبب، روٹی کمانے سے عاجز رہتا تھا۔ یہ رزق کی ہر روز کی بے اعتباری،قوم کے تمدن اور مالی انتظام میں سب سے زیادہ چبھنے والا روگ تھا۔

بھولے بھالے دیہاتی شہر میں آ کر تباہ ہو جاتے ہیں

نوجوان گاؤں چھوڑ کر شہر اس لیے آتے ہیں کہ کام آسانی سے مل جائے گا اور محنت تھوڑی دیر کرنی پڑے گی کم وبیش ان کی یہ توقع پوری بھی ہو جاتی ہے انہیں شہر میں لانے کا سب سے بڑا سبب وہ جادو بھری کشش ہوتی ہے جو ہمیشہ بڑے بڑے شہروں کے ساتھ منسوب رہی ہے یہ خیال غلط ہے کہ جو نوجوان گاؤں سے چل کر شہر آ جاتے ہیں ان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ گھر ٹھہر کر کھیتی باڑی کریں برعکس اس کے تجربہ بتاتا کہ ہے وہ ترک وطن پر ہمیشہ تنومند اور اولوالعزم لوگ آمادہ ہوا کرتے ہیں میں ان تارکین وطن میں صرف ان اشخاص کو شمار نہیں کرتا جو امریکہ چلے جاتے ہیں بلکہ میں ان میں اس ملازم پیشہ نوجوان کو بھی شامل سمجھتا ہوں جو جانتا ہے کہ وہ شہر میں اجنبی ہو گا اور باوجود اس کے گاؤں چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اس میں ایک نامعلوم منزل کا راستہ اختیار کرنے کا حوصلہ اور جرات ہے۔ بالعموم شہر آتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ روپیہ ضرور ساتھ لاتا ہے اس لیے جب پہلے پہل روزگار نہیں ملتا تو وہ بددل نہیں ہوتا۔لیکن جب کام مل کر چھن جاتا ہے تو اس پر بہت برا اثر ہوتا ہے نئے سرے سے کام ملنا، اور پھر بالخصوص سردیوں میں اکثر ناممکن ہوتا ہے پہلے چند ہفتے جوں توں کٹ جاتے ہیں ٹریڈ یونین سے بے روزگاری کا الاؤنس مل جاتا ہے اس سے گزارہ ہوتا رہتا ہے لیکن جب گھر سے لائی ہوئی پونجی ختم ہو جاتی ہے اور طویل بے روزگاری کے باعث ٹریڈ یونین بھی الاؤنس بند کر دیتی

ہے اس وقت سخت کٹھن پڑتی ہے یہ نوجوان بھوک سے لاچار مارا مارا پھرتا ہے بچا کھچا اسباب کہیں گروی رکھ کر فروخت کر کے گزارہ چلاتا ہے لباس تار تار ہو جاتا ہے شکل و شباہت پر فلاکت کے آثار طاری ہو جانے سے مجلسی وقار میں بھی فرق آجاتا ہے آخر ان لوگوں سے ملاقات ٹھہر جاتی ہے جو اس کی جسمانی کلفتوں کے علاوہ اس کی روحانی دنیا میں بھی زہر کے قطرات ٹپکا دیتے ہیں رات کو سونے کے لیے جگہ نہیں ملتی اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اگر کہیں جاڑوں کا موسم ہوا تو بس جان پر ہی بن جاتی ہے یکا یک اسے پھر کام مل جاتا ہے لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وہی کیفیت گذرتی ہے پرانی داستان پھر ایک مرتبہ دوہرائی جاتی ہے یہی قصہ تیسری مرتبہ پیش آتا ہے شاید اب کے پہلے سے زیادہ سختی برداشت کرنی پڑتی ہے آہستہ آہستہ وہ اس مستقل تشویش کا خوگر ہو جاتا ہے اور آخر کار تو اذیت کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔

شریف انسان کمیونسٹ کیسے بن جاتا ہے

2 اس طرح جو شخص طبعاً محنتی ہو اسے بھی لاپروائی اور بے حسی کی لت پڑ جاتی ہے وہ ان بے اصول لوگوں کے ہاتھ میں آلہ کار بن جاتا ہے جو اسے اپنے غیر مستحسن مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اسے اتنی مرتبہ بغیر کسی قصور کے بے روزگاری کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اب وہ بے باک اور لاپروا ہو جاتا ہے۔ اس کی بلا سے کہ جس ہڑتال میں وہ شریک ہو رہا ہے آیا وہ مزدوروں کے حقوق حاصل کرنے کی خاطر قرار پائی ہے یا اس سے قوم کی تباہی کا خدشہ ہے اسے تو یہ بھی پروا نہیں، چاہے ساری دنیا کا نظام اور تمدن غرق ہو جائے، گو خود اس کی اپنی طبیعت ہڑتال پر مائل نہ ہو، پھر بھی اس میں حصہ لیتا ہے۔ کیونکہ اس کی قوت ارادی زمانہ کا سرد و گرم سہتے سہتے معطل ہو چکی ہے۔

میں نے مندرجہ بالا عمل کی ہزار ہا نظیریں دیکھیں جوں جوں ایسی مثالیں میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتیں میرے دل میں اس عظیم الشان شہر کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی جاتی تھی جو قوم کے نونہالوں کو ان کے گھروں سے اغواء کر کے غریب الوطنی

اور بیکسی میں اس بے رحمی سے کچل کچل کر پیس رہا تھا جب وہ گھر سے نکلتے تھے تو ان کے دلوں میں اعزہ و اقربا کی محبت ہوتی تھی لیکن اس کولہو میں دب کر ان کے خون سفید ہو جاتے تھے۔

محتاجی صبر کا زنگ ہے

میں وائنا میں ایسا پھنس چکا تھا کہ میں خود بھی اس چکر سے محفوظ نہ تھا میں ان تاثرات کو اپنے آپ پر محسوس کر رہا تھا ایک بات تو مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی وہ یہ کہ ہماری قسمت ہنڈولے کی طرح کشائش اور بیکاری کے مابین ڈگمگاتی رہتی تھی آمدن اور خرچ کے جوار بھاٹا میں اس سرعت سے تغیر ہوتے رہتے تھے کہ انسان کوئی با قاعدہ انتظام نہ کر سکتا تھا کفایت کی عادت ہی بگڑ جاتی تھی جسم بھی بھوک اور شکم سیری کے اتار چڑھاؤ کا عادی ہو جاتا تھا جب مل گئی تو خوب پیٹ بھر کر کھائی اور جب نہ ملی تو خالی ہی سو رہے۔ سچ تو یہ ہے بھوک با قاعدہ خرچ کے تمام انتظامات کچھ اس طرح درہم برہم کر دیتی ہے کہ روزگار مل بھی جائے تو آدمی کو سنبھلنا محال ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بے روزگار مزدور کو جب محرومی ستاتی ہے تو وہ خیالی پلاؤ پکا کر اپنی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے ہر وقت یہی سوچتا ہے کہ میں یوں پیٹ بھر کر کھاؤں گا رفتہ رفتہ یہ خواب ایک ایسی ہوش کی صورت پکڑ لیتا ہے کہ جہاں روزگار ملا وہیں ضبط کی باگیں یکلخت اور بے اختیار ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہیں جونہی تنخواہ جیب میں آئی خرچ کی ترتیب رکھنے کا ہوش کسے باقی رہتا ہے کل کی فکر کیے بغیر سب کچھ آج ہی لٹا دیا جاتا ہے چونکہ خرچ کی تقسیم کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس لیے ہفتہ وار میزانیہ میں فرق آنے لگتا ہے جس حادثہ کی تفصیل میں نے اوپر بیان کی ہے جب وہ پہلی مرتبہ پیش آتا ہے تو شاید سات دن کی کمائی پانچ روز میں ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تین روز میں ہی صفایا ہو جاتا ہے جوں جوں عادت راسخ ہوتی جاتی ہے پھر تو ایک دن کا گذارہ بھی مشکل ہوتا ہے اور انجام کار سب کچھ ایک ہی رات کے عیش و نشاط کی نذر ہو جاتا ہے۔

افلاس محبت کی قینچی ہے

3بسا اوقات گھر میں بیوی بچے ہوتے ہیں اکثر انہیں بھی ایسی زندگی بسر کرنے کی لت پڑ جاتی ہے بالخصوص اگر خاوند کا سلوک گھر میں اچھا ہے وہ بیوی بچوں سے اپنی عقل اور بساط کے مطابق محبت رکھتا ہے اور انہیں جو آرام پہنچا سکتا ہے پہنچانے کی کوشش کرتا ہے،تو اس کا اثر ان پر اور بھی جلد پڑتا ہے ہفتے بھر کی کمائی سارا کنبہ ایک دو دن کے اندر اللے تللے میں اڑا دیتا ہے۔ جب تک تنخواہ یاوری کرتی ہے سارے گھر والے خوب کھاتے پیتے ہیں اور جب ہفتہ کا اختتام ہوتا ہے تو اکٹھے فاقہ کشی کرتے ہیں اس وقت بیوی دیوانوں کی طرح ہمسایوں کے پاس ماری ماری پھرتی ہے کچھ وہاں سے قرض لیتی ہے کچھ دکاندار سے ادھار کرتی ہے اور اس طرح تنگی کے دن کاٹنے کی کوشش کرتی ہے دوپہر کے وقت سب تھکے ماندے ہوکر پھر اکٹھے دستر خوان پر بیٹھتے ہیں کبھی تھوڑی بہت میسر آجاتی ہے اور کبھی دن صاف ہی گزر جاتا ہے سارے گھر کو آنے والی تنخواہ کا انتظار رہتا ہے اسی کی باتیں کرتے ہیں اسی کے خرچ کرنے کی تجویزیں سوچتے ہیں جب بھوک ستاتی ہے تو آنے والی خوش حالی کے خواب دیکھ دیکھ کر دل بہلاتے ہیں غرض بچے بھی ابتدا سے ہی اس لعنت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

4 سب سے بری گھڑی وہ آتی ہے جب خاوند ہفتہ کی تنخواہ لاتے ہی لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے لگتا ہے اور بیوی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے اس بیچاری کو اور تو کچھ نہیں بچوں کی مامتا مجبور کرتی ہے گھر میں جھگڑے ہونے لگتے ہیں دلوں میں ناراضگیاں بیٹھ جاتی ہیں خاوند جب بیوی سے اچاٹ ہو جاتا ہے تو نشہ سے غم غلط کرتا ہے ہر ہفتے شراب لنڈھانے لگتا ہے اس وقت بیوی کے سامنے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی یا موت کا مسئلہ آجاتا ہے غریب وفادار کتے کی طرح اسکے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے تنخواہ کے روز اسے کارخانہ سے تلاش کر کے گھر لانے جاتی ہے کہ بچوں کیلئے تو کچھ روپے مل جائیں لیکن میاں ہیں کہ دوسرے یا تیسرے روز جیبیں خالی کر کے گھر آنکلتے ہیں اس

وقت ایک ایسا نقشہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر کلیجہ پھٹنے لگتا ہے مظلوموں کی فریادیں عرش الٰہی کے کنگرے ہلا دیتی ہیں۔

ذلت کے ماحول سے عزت کے متلاشی پیدا ہونے میں مشکل ہیں

میں نے یہ سب کچھ سینکڑوں بار اپنی آنکھوں سے دیکھا پہلے پہل میں بیزار ہو جاتا تھا تلملا اٹھتا تھا لیکن آہستہ آہستہ میں ان سب کی مجبوریوں سے واقف ہو گیا مجھے ان کی مصیبتوں کے گہرے اسباب سمجھ میں آنے لگے یہ غریب حالات کی ناسازگاری کے شکار تھے۔

ان دنوں رہائشی مکانات کی حالت بھی ابتر تھی وہاں میں بسنے والے مزدوروں کے گھر ایک عذاب الیم کا نقشہ تھے آج بھی جب کبھی میں ان دردناک کال کوٹھڑیوں، ان رات بسر کرنے کی جگہوں، ان بوسیدہ اور تنگ کبوتر خانوں ان تعفن، تاریکی اور غلاظت کے گھناؤنے مناظر اور وہاں کی سیاہ کاریوں کا تصور کرتا ہوں تو مجھ پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس دن کیسی ہو گی جب ہمارے تمہارے بھائیوں کی لاتعداد فوجیں جو ان ذلت مصیبت اور درد و ستم کے گڑھوں میں دبی ہوئی ہے ہوش میں آ کر غافل انسانوں پر جھپٹ پڑیں گی۔ آج دنیا ان کی پرواہ نہیں کرتی ایسا ہونا ناممکن خیال کیا جاتا ہے در حقیقت ہم ہی اس صورتحال کے لیے ذمہ دار ہیں اور ہم نے ہی آنکھیں میچ رکھی ہیں تردد کا تو کیا ذکر ہمیں احساس بھی نہیں کیا فطرت تمہیں اتنا بھی نہیں بتاتی کہ اگر تم نے وقت سے پہلے انصاف نہ کیا تو پھر قدرت کا انصاف تم سے انتقام لے کر چھوڑے گا؟

آج میں اللہ کا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسے اسکول کی تعلیم سے بہرہ ور کیا یہاں جو باتیں مجھے بھلی معلوم نہ ہوں انہیں میں نظر انداز نہ کر سکتا تھا یہاں کے گہرے سبق میرے دل پر نقش ہو گئے۔

افسوسناک حالات کے نتیجے بھی افسوسناک ہوتے ہیں

میں جن لوگوں کے مابین زندگی بسر کرتا تھا ان سے بالکل مایوس نہ تھا اگر ایک طرف میں ان کی زندگی کی ظاہری حالت دیکھتا تھا تو دوسری طرف ان اسباب پر بھی نگاہ دوڑاتا تھا جنہوں نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔ ان غریبوں سے بددل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس مصیبت اور بدبختی، اس غلاظت اور بے حرمتی کی پیداوار کو انسان نہیں کہا جا سکتا۔ یہ آفت رسیدہ تو افسوسناک حالات کے افسوسناک نتیجے ہیں چونکہ مجھے ذاتی طور پر ایسے ہی مصائب کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے جب میں قوم کی سختی اور رسوائی کی یہ چلتی پھرتی تصویریں دیکھتا تھا تو فقط آہ سرد بھر کر نہ رہ جاتا تھا نہیں نہیں یہاں خالی ترس کھانے سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

میں نے انہیں دنوں دیکھ لیا تھا کہ یہ زبوں حالی صرف دو طرح دور کی جا سکتی ہے۔ اول تو یہ کہ قوم میں باہمی ذمہ داری کا شدید احساس پیدا کر کے ان بنیادوں کی اصلاح کی جائے۔ جن پر سوشل ترقی کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ احساس پیدا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ بغیر کسی رحم کیے قوم کے جسم سے وہ تمام پھوڑے پھنسیاں کاٹ کر پھینک دینی چاہئیں جن کا علاج ناممکن ہے۔

کارخانہ فطرت کو دیکھو قدرت کو یہ تردد نہیں کہ اس کی موجودہ مخلوق برقرار رہے۔ اسے تو ساری لگن یہ ہے کہ ترقی کی رفتار قائم رکھنے کی خاطر مخلوق کی مختلف انواع میں سے بہترین نسل کی افزائش ہو اسی طرح انسانوں میں بھی موجودہ نسل کی حالت سنوارنے کا سوال کچھ ایسا اہم انہیں آدمی کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ جیسا کچھ وہ ایک مرتبہ بن جائے پھر ننانوے فیصدی اس کی اصلاح ناممکن ہوتی ہے ہمیں تو شروع سے یہ دھیان دینا چاہیے کہ آئندہ ترقی کے راستے کھول دیئے جائیں۔

قوم کو خیرات نہیں مساوات کی ضرورت ہے

مجھے وائنا میں اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے جو جدوجہد کرنی پڑی اسی کے دوران میں مجھے یہ سمجھ آ گئی کہ قومی معاشرت کی اصلاح بھیک بانٹنے سے نہیں کی جا سکتی

ایسی خیرات فضول ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے معاشرتی اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قوم کی تہذیب اور مالی انتظام میں جو بنیادی خلل ہے اسے دور کیا جائے۔ جب تک یہ خلل باقی ہے انسان کا تنزل ایک لازمی نتیجہ ہے خود یہ خلل اگر انسان کو ذلیل نہیں کرتا تو کم از کم ذلت کے راستے پر ضرور ڈال دیتا ہے کیا وجہ ہے کہ حکومت سے مزدور طبقہ کی دشمنی دور نہیں کی جا سکتی؟ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت اس زبوں حالی کے اسباب شناخت کرنے میں ڈگمگا رہی ہے جب تک حکومت کو پہلے یہ سمجھ نہ آ جائے کہ مزدور کیوں اس کے دشمن ہیں اس دشمنی کے اسباب کو پوری سختی کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ شناخت میں تذبذب کی وجہ فقط یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گناہ کے بوجھ سے منہ نیچے ڈالے ہوئے ہے۔ وہ گناہ یہ ہے اس زبوں حالی کو کیوں یہاں تک بڑھنے کی اجازت دی گئی۔ اس وقت یہی گناہ کا بوجھ ہے جس نے ارادہ کو معطل اور قوت عمل کو شل کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار کی بگ ہے وہ دودلے اور خوفزدہ ہو رہے ہیں انہیں وہ اقدام کرنے کی بھی جرأت نہیں جو خود ان کا وجود قائم رکھنے کے لیے لابدی ہے۔ نکمے اور نکھٹو لوگوں کو ایک دفعہ کا یہ پتھر کر کے سرے سے ختم کر دینے کے لیے جس اطمینان قلب اور قوت عمل کی ضرورت ہے وہ صرف اسی شخص کی شان ہے جس کا اپنا ضمیر اس زبوں حالی کے قصور سے پاک ہو۔

آسٹریا کی حکومت کو تو معاشرتی ذمہ داری اور قانون سازی کا احساس ہی نہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس لعنت کو قوم سے دور کرنے کے ناقابل تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس زمانہ میں مجھے جن لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا تھا میں ان کی مالی دقتوں سے زیادہ متاثر تھا یا ان کے بھونڈے اخلاق و رواج اور ذہنی افلاس سے میرا دل زیادہ بیٹھ جاتا تھا۔

بے سروسامانی بے حمیتی کی ماں ہے

جب کوئی مفلس وقلاش خانہ برباد کہہ دیتا ہے کہ بھئی ہمیں جرمن ہونے یا نہ ہونے

سے کیا فرق پڑتا ہے ہمیں تو جہاں سر چھانے کو جھونپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی مل گئی وہیں ہمارا وطن ہے اس وقت ہمارے کھاتے پیتے طبقہ کے لوگوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے وہ غیرت ملی کے جوش میں ابل اٹھتے ہیں اور قومی جذبہ سے اس بیگانگی کے اظہار کو بے حمیتی پر محمول کرتے ہوئے اسے سختی سے جھڑک دیتے ہیں۔ وہ اس قسم کی بکواس سن کر نہایت بیزار ہوتے ہیں۔

کیا ان لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ خود کیوں اس بے حمیتی کا شکار ہیں کیا وجہ ہے کہ قومی غیرت سے بہرہ ور ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے قوم و وطن کی عظمت۔ تمدن اور صنعت کی وہ نظریں دیکھی ہیں اور اس طرح بار بار دیکھی ہیں کہ اب وہ ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہیں کیا انہیں یقین ہے کہ اگر وہ ان تمام نعمتوں سے محروم رہتے تو پھر بھی انہیں قوم کے بلند مرتبہ ہونے کا احساس ہوتا؟ کیوں ہمارے فارغ البال طبقہ کو یہ ہوش نہیں کہ جب تک تم عامتہ الناس کو قوم کے جاہ و جلال اور تہذیب و تمدن کی پٹی نہ پڑھاؤ گے تب تک ان میں ہرگز قومی جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ ناموس ملت کی غیرت تبھی دل میں پیدا کی جا سکتی ہے جب ملت کی برتری اور تفوق ذہن نشین کرائے جا چکے ہوں۔

تعلیم کا نصاب بدلنا چاہیے

یہاں یہ کوئی جواب نہیں کہ دوسرے ملکوں کی بھی ایسی ہی حالت ہے اور وہاں کے مزدوروں کے جذبہ حب وطن میں تو کوئی فرق نہیں آیا اگر ایسا ہوتا بھی تو اس سے ہماری غفلت قابل معافی قرار نہ پا سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے مثال کے طور پر فرانسیسیوں ہی کو لو جسے تم تعصب کی تربیت کہتے ہو اور جسے فرانسیسی تمدن کی تعلیم کا نام دیتے ہیں، ذرا اس کا نصاب تو اٹھا کے دیکھو اس میں سوائے ہر پہلو سے فرانس کی عظمت ثابت کرنے کے اور کیا دھرا ہے فرانس کے نوجوان کو خالی سائنس ہی نہیں پڑھائے جاتے بلکہ جہاں وطن کی سیاسی اور تمدنی عظمت کا ذکر آتا ہے وہاں پورے تعصب اور مبالغہ سے کام لیا

جاتا ہے۔

اس قسم کی تعلیم میں فقط موٹے موٹے عقیدے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں ہاں ان عقیدوں کا پس منظر ضرور وسیع بنیادوں پر پھیلانا چاہیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان عقائد کو اس طرح بار بار دہرایا جائے جس سے وہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر جذبات حافظہ اور تمام دیگر قوائے ذہنی کو اپنی رنگ میں رنگ دیں۔

ہمارے کیا کہنے ہیں ہم نے خالی قوم کو قومی روح سے شناسا کرانے میں غفلت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ الٹے جو کچھ سکھایا وہ اور گمراہ کن ہے پھر اگر مصیبتوں اور بدبختیوں سے بچ کر دل کے کسی کونے میں قومی حمیت کی کچھ یاد باقی رہ جاتی ہے تو اسے وہ شیاطین مٹا دیتے ہیں جن کی ہمارے اندر کمی نہیں۔

ملت کی آئندہ نسلیں توجہ کی مستحق ہیں

اے اس کتاب کے پڑھنے والو ذرا ذیل کے حالات پر غور کرو۔

ایک تہ خانہ ہے اس تہ خانہ میں دو مرطوب کمرے ہیں ان کمروں میں ایک مزدور بمعہ اپنے خاندان کے کرایہ پر رہتا ہے خاندان سات آدمیوں پر مشتمل ہے ذرا فرض کرلو کہ ان میں سے ایک بچہ کی عمر تین سال ہے یہ وہ عمر ہے جب بچے گردوپیش کی دنیا سے اثرات قبول کرنے لگتے ہیں ذہین اور طباع لوگوں کے حافظہ میں اس عمر کے تاثرات کی یاد بڑے ہو کر بھی باقی رہتی ہے ہاں اب ذرا سنو کہ جگہ کی تنگی اور آدمیوں کی زیادتی کے باعث باہمی تعلقات خوشگوار نہیں رہتے جھگڑے ہونے لگتے ہیں ناراضگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان غریبوں کی نسبت یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ اکٹھے رہتے ہیں بلکہ ان کے متعلق تو یہ کہنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے سر پر چڑھ کر گزارہ کرتے ہیں چھوٹی چھوٹی سی بد مزگیاں جو وسیع گھروں میں خود ہی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا کر بھول جاتی ہیں وہ یہاں مستقل عداوتوں کا سامان بن جاتی ہیں جہاں تک بچوں کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بڑوں سے اچھے رہتے ہیں لڑائیاں تو ان میں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن جلد

ہی صفائی بھی ہو جاتی ہے برخلاف اس کے جب میاں بیوی میں ٹھنتی ہے تو وہ درشتی اور تلخی کا نقشہ کھنچتا ہے کہ خدا کی پناہ بچوں پر یہ نظارے دیکھ کر جو اثر ہوتا ہے اس کے نتائج بعد میں جا کر ظاہر ہوتے ہیں جب تک انسان خود اس ماحول میں رہ نہ چکا ہو وہ تصور نہیں کر سکتا کہ جس وقت میاں شراب کے نشہ میں بیوی سے بدسلوکی کرتا ہے اسے مارتا پیٹتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو ملزم ٹھہراتے ہیں اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے چھ سال کی عمر میں بچہ ان کمینہ حرکات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جن سے بڑے بوڑھوں کا کلیجہ بھی منہ کو آنے لگتا ہے۔

مکتبوں کی اصلاح کرو

قوم کا یہ ''نونہال'' جب ابتدائی سکول میں داخل ہوتا ہے اس وقت اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ سر جوؤں سے بھرا پڑا ہے غذا پوری نہ ملنے کے باعث تن میں سکت نہیں اور روح کو بد اخلاقی کا کیڑا لگ چکا ہے بمشکل لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے گھر آ کر سبق یاد کرنے کا کوئی امکان نہیں صورت حالات بالکل اس کے برعکس ہے ماں باپ خود تو اولاد کی گوشمالی کر کے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر تمیز سکھانے سے رہے۔ وہ الٹے ہر وقت بچوں کے سامنے اسکول اور وہاں کے استادوں کی غائبانہ توہین کرتے رہتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں دن رات بچے کے کان میں جو آوازیں پڑتی ہیں وہ ایسی ہیں جن سے اس کے دل میں خود فطرت انسانیہ کا احترام بھی باقی نہیں رہتا۔ یہاں تو ہر وقت انسان، اور انسان سے لے کر حکومت تک انسان کی ہر شے کی تذلیل کی جاتی ہے چاہے سلطنت کا ذکر ہو، چاہے معاشرت کی باتیں چھڑ جائیں، چاہے اخلاق کی گفتگو ہو اور چاہے مذہب کا بیان ہو یہاں سب کی مذمت کی جائے گی سب کو یکساں کوسا جائے گا تیرہ سال کی عمر میں جب یہ نوجوان فارغ التحصیل ہو کر واپس آتا ہے تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو کیا ہے حقیقی علمیت سے وہ کوسوں دور ہے بے اصولی کی گستاخی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس ننھی سی عمر میں وہ برے بھلے میں امتیاز کرنے

کا یوں مذاق اڑاتا ہے کہ انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔

سینما کی دیمک اور مغلط اخبارات

بھلا ایسا شخص زندگی میں کیا کام کر سکتا ہے جس کی نظر میں کوئی شے مقدس، جسے کبھی عالی ہمتی کا احساس نہیں ہوا۔ اور جو ہمیشہ انسانیت کی پستی کے مناظر ہی دیکھتا رہا ہے تین سال کی عمر سے سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے نافرمانی اور بغاوت اس بچہ کی رگ رگ میں اثر کر چکی ہے اس نے دنیا میں فقط خباثت اور بدمعاشی دیکھی ہے وہ ہر ایسے بلند کر دینے والے تاثر سے محروم رہا ہے جس سے اس کے دل میں ابھرنے کی امنگ ہوتی ہے یہ ہے آدمیت کا وہ شاہکار جو اب زندگی کی تگ و دو میں داخل ہوتا ہے۔

وہ بھی ویسی ہی عادات اختیار کر لیتا ہے جن کا نمونہ اس نے بچپن میں اپنے ابا جان کی ذات شریف میں ملاحظہ کیا تھا۔ آوارہ پھرتا ہے راتوں کو دیر سے گھر پہنچتا ہے اس دل شکستہ سے بھی بدزبانی کرتا ہے جس کی کوکھ سے وہ پیدا ہوا تھا خدا پر لعنتیں بھیجتا ہے اور دنیا کو صلواتیں سناتا ہے آخر جیل خانے کی ہوا کھاتا ہے یہاں رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔

کیا اب بھی ہمارے تن آسان امراء کو تعجب ہے کہ یہ قوم کا ''جگر گوشہ'' کیوں حب وطن سے عاری ہے۔

یہ اہل ثروت ہر روز دیکھتے ہیں کہ سینما اور تھیٹر، مغلط اخبارات اور فحش کتابیں قوم میں زہر پھیلا رہے ہیں اور پھر معصوم بن کر حیران ہوتے ہیں ۔۔۔ کہ عامۃ الناس کی اخلاقی حالت کیوں گرتی چلی جاتی ہے وہ حب قوم سے کیوں بیگانہ ہو رہے ہیں اگر لوگوں کی ابتدائی تربیت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کیا یہ سینما کی دیمک اور مغلظ اخبارات اور اس قسم کی دوسری چیزیں قوم کی عظمت کے سبق پڑھاتی ہیں؟

بچوں کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے

آخر مجھے اس نکتہ کی سمجھ آ گئی جو میں آج تک نہ سمجھ سکا تھا وہ یہ کہ کسی قوم کو ایک قوم بنا

دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرت کا صحیح انتظام کرو، تاکہ ہر فرد اس نظام کی گود میں پروان چڑھتے ہوئے تربیت حاصل کر سکے۔ یاد رکھو کہ جب تک بچے کے دل میں ماں کے آغوش اور اسکول کی چار دیواری سے ہی قوم کے تمدن، قوم کی خوشحالی، اور سب سے ضروری یہ کہ قوم کی سیاسی عظمت کا سکہ نہ بٹھا دیا جائے گا۔ تب تک وہ قوم کا رکن ہونے میں ہرگز کوئی فخر محسوس نہ کرے گا انسان اسی کی خاطر اپنا خون گرانے پر آمادہ ہوتا ہے جس سے اسے محبت ہو محبت اسی سے ہو سکتی ہے جس کا دل میں احترام ہو اور جب تک ایک چیز سے شناسائی بھی نہیں اس کا احترام کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

جوں ہی مجھے معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا میں نے اس کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا یہاں میرے سامنے ایک بالکل نئی دنیا آ گئی۔

کتابیں کائنات کا آئینہ ہیں

میں نے 10-1909ء کے سال میں اپنی حالت اس قدر سدھار لی تھی کہ مجھے قلی بن کر روٹی کمانے کی حاجت نہ رہی تھی اب میں ایک نقاش اور نقشہ نویس کی حیثیت میں کام چلاتا تھا۔ جہاں تک آمدنی کا تعلق ہے یہ پیشہ بھی غریبانہ سا تھا۔ ضروریات زندگی کا گذارہ بمشکل چلتا تھا باوجود اس کے میں مطمئن تھا کیونکہ یہ پیشہ میرے نصب العین کے قریب تر تھا۔ علاوہ ازیں اب میں رات کو گھر لوٹتا تو پہلے کی طرح تھکان سے نیم جان نہ ہوتا تھا ورنہ قبل ازیں تو یہ حالت تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی نیند نے بیہوش کر دیا۔ میرا موجودہ کام اس پیشہ سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا جو میں خود اختیار کرنا چاہتا تھا۔ مزید بریں اب میں اپنے وقت کا مالک آپ تھا۔ میں اپنے اوقات کی تقسیم پہلے کی نسبت بہتر طریقہ ترتیب دے سکتا تھا۔ نقاشی تو میں اس لیے کرتا کہ روزگار کا سہارا یہی تھا۔ لیکن کتابیں اس لیے پڑھتا کہ مجھے مطالعہ کا شوق تھا۔

اس طرح مجھے معاشرتی مسئلہ کی نسبت وہ علمی واقفیت بھی حاصل ہو گئی جس کے بغیر جو کچھ میں نے ذاتی تجربہ سے دیکھا تھا وہ ادھورا رہتا۔ اس مسئلہ کے متعلق مجھے جو کتاب

بھی مل جاتا میں اسے پڑھ کر چھوڑتا پھر جو کچھ پڑتا اس پر گہری غور وخوض کرتا۔ میرا خیال ہے جن لوگوں میں ان دنوں میرا اٹھنا بیٹھنا تھا وہ مجھے ایک انوکھا سا انسان خیال کرتے تھے۔

معاشرتی مسئلہ کی تحقیق کے ساتھ میں طبعاً فن تعمیر کا مطالعہ بھی پورے انہاک سے کر رہا تھا۔ فن تعمیر کو میں موسیقی کی طرح فنون لطیفہ کی ملکہ قرار دیتا ہوں اس کا مطالعہ میرے لیے مشقت نہ تھی بلکہ عین راحت تھی۔ چاہے میں کتنی رات گئے تک پڑھتا ہروں، یا نقشے بناتا رہوں، مجھے کبھی تھکن محسوس نہ ہوتی میرا دل کہہ رہا تھا کہ میرے سامنے ایک روشن مستقبل ہے میرا یہ خواب پورا ہو کر رہے گا چاہے مجھے برسوں اس کا انتظار کیوں نہ کرنا پڑے مجھے پکا یقین تھا کہ میں ماہر تعمیرات بن کر اپنے لیے نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

مطالعہ کس طرح کرنا چاہیے

میں اپنے پیشے کے لیے تیاری کرنے کے علاوہ ہر اس چیز میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا جو کسی طرح سیاسیات سے تعلق رکھتی ہو لیکن اس زمانہ میں میرا یہ طرز عمل میری نگاہ میں چنداں اہمیت نہ رکھتا تھا میرا خیال تھا کہ سیاسیات میں عملاً دلچسپی لینا ایک ایسا بنیادی فرض ہے جو ہر ذی ہوش شخص پر عائد ہوتا ہے جو لوگ اپنے گرد و پیش کے سیاسی حالات سے واقفیت نہیں رکھتے انہیں شکایات اور نکتہ چینی کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ غرض میں نے اس مرحلہ پر بھی سیاسی مسائل کے متعلق کتابیں پڑھنا اور عام مطالعہ کرنا جاری رکھا لیکن میرا مطالعہ عام پڑھے لکھوں کے کتابیں پڑھنے سے قطعاً مختلف تھا۔

میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بے اندازہ کتابوں پر کتابیں پڑھے جاتے ہیں اور صفحہ پر صفحہ الٹتے جاتے ہیں، اور باوجود اسکے میں انہیں صاحب مطالعہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ بہت کچھ "جانتے" ہیں لیکن ان کے ذہن میں چھانٹنے اور سجانے کی استعداد مفقود ہوتی ہے انہوں نے کتابوں سے جو سرمایہ علم جمع کیا ہے، وہ

اسے کوئی ترتیب نہیں دے سکتے۔ انہیں کتابوں کے مفید اور غیر مفید اجزاء میں تمیز کرنے کی سمجھ نہیں ہوتی۔ جہاں مطلب کی بات یاد رکھنی چاہیے وہاں غیر ضروری حصے چھوڑ جانے چاہئیں۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم پڑھنے کے بعد ہی انہیں بھلا دینا چاہیے۔ مطالعہ بذات خود کوئی مقصد نہیں یہ تو حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے کتابیں خالی اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ جو استعداد اور لیاقتیں پہلے سے انسان میں موجود ہوتی ہیں انہیں ذرا ہتھیاروں سے مسلح کر دیا جائے غرض ہر شخص جس منصب کے لائق ہوتا ہے وہ اسی کی مناسب سے اوزار اور سامان انتخاب کر لیتا ہے چاہے کسی کا منصب یہ ہو کہ وہ زندگی بھر فقط اپنا رزق پیدا کرتا رہے اور چاہے کسی کا منصب یہ ہو کہ وہ اس سے بلند تر انسانی آرزوؤں کی تسکین کرے۔ یہ ہے مطالعہ کا پہلا مقصد دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے متعلق ایک عام واقفیت حاصل ہو جائے دونوں میں سے چاہے کوئی صورت مدنظر ہو کتاب کے مضامین اسی ترتیب سے ذہن میں ٹھونس لینے چاہئیں جس ترتیب سے وہ کتاب میں مذکور ہیں مطالعہ سے حاصل کی ہوئی واقفیت کے ہر جزو کو ایک اینٹ تصور کرنا چاہیے جو اپنی حیثیت کے مطابق عمارت میں جہاں پھب جائے اسے وہیں لگا دو۔ گویا دماغ کے نگارخانے میں دنیا ایک بحیثیت مجموعی تصور قائم ہے اس میں ہر تازہ نقش کو وہی جگہ دینی چاہیے جہاں وہ ٹھیک بیٹھتا ہو نہیں تو ایسا مطالعہ فقط پریشانی دماغ کا سامان مہیا کرے گا یہ پریشانی افکار خالی بے فائدہ نہیں بلکہ جس بد نصیب کے گلے کا ہار ہو جائے اسے جہالت کے ساتھ خود پسندی کی بلا میں بھی گرفتار کر دیتی ہے ایسے شخص کو سچ مچ وہم ہو جاتا ہے کہ وہ خاصہ ''پڑھا لکھا'' ہے اور اس قابل ہے کہ دنیا کے مسائل کو سمجھ سکے اسے خیال ہوتا ہے کہ میں نے ''علم'' حاصل کیا ہے حالانکہ یہ ''علم'' اسے روز بروز زندگی کے حقائق سے دور لے جاتا ہے آخر کار اس غریب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو کہیں پاگل خانہ میں جا کر مرتا ہے اور یا پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کا علم کبھی ضرورت کے وقت کام نہیں آتا وجہ یہ کہ ان کے ذہن کی تربیت

روزمرہ کے فرائض سر انجام دینے کی غرض سے تو ہوئی ہی نہیں، ان کا علم تو کھوپڑی کی الماری میں اسی ترتیب سے بند پڑا ہے۔ جس ترتیب سے انہوں نے اسے کتاب سے پڑھ لیا تھا اگر کہیں جیتے جی اس علم کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو ان حضرات کو ساتھ ہی وہ کتاب اور اس کا صفحہ بھی بتانا چاہیے جہاں سے وہ اپنے کام کی بات ڈھونڈ نکالیں۔ میاں بدھو خود کبھی وہ مقام یاد نہ کر سکیں گے جہاں مطلوبہ واقفیت ان کی نظر سے گذری تھی اگر صفحہ نہ بتایا تو سارا مطالعہ اور علمیت دھری رہ جائے گی۔ وہ اس وقت گھبرا کر ادھر ادھر سے دوسری ہیچ و قسم نظیریں تلاش کریں گے اور یہ تو پکی سمجھے کہ آخر ان کا تجویز کردہ نسخہ سو فیصدی غلط ثابت ہوگا۔

اگر یہ بات سچی نہیں تو ہمارے یہ پارلیمنٹری تیس مار خاں جنہیں ملک کے بڑے بڑے عہدے ملے ہوئے ہیں کیوں ایسے ناکارہ ثابت ہوتے ہیں؟ اگر ان سیاسی لیڈروں کے دماغ خراب نہیں تو پھر ان کی نیتوں میں خلل ہے، اور وہ قوم کے دشمن ہیں۔

برعکس ان لوگوں کے جس شخص کو مطالعہ کا ملکہ حاصل ہے وہ کسی کتاب، رسالہ یا اخبار کو دیکھتے ہی بھانپ لے گا کہ اس میں میرے کام کی کیا بات ہے۔ یا واقفیت عامہ کے مسائل پر کہاں روشنی ڈالی گئی ہے وہ جو کچھ مطالعہ سے حاصل کرتا ہے اسے اپنے ذہن کے مرقع میں جس مسئلہ یا جس شے کے نقشہ سے متعلق پاتا ہے اسی کے ساتھ ٹانک لیتا ہے تاکہ جو تصور پہلے سے دماغ میں موجود ہے اسے حسب ضرورت اصلاح دے کر زیادہ درست اور مناسب حال بنا لیا جائے۔ اگر کہیں کوئی عملی مہم پیش آ جائے تو اس کا حافظہ فوراً یادداشت کے دفتر سے وہ مثل نکال کر سامنے رکھ دے گا جس میں سالہا سال کے مطالعہ نے متعلقہ اطلاعات جمع کر رکھی ہیں اس علم کی روشنی میں قوت فیصلہ فی الفور مسئلہ زیر بحث کا حل تلاش کر لے گی ورنہ کم از کم اس مسئلہ کی نوعیت تو ضرور معلوم ہو جائے گی۔

غرض، صرف ایسا مطالعہ ہی مطالعہ کہلانے کا مستحق ہے اور اسی مطالعہ پر وقت خرچ کرنا جائز قرار دیا جاسکتا ہے جس سے کوئی مطلب تو حاصل ہو۔

حافظہ کی تربیت کے اصول

مثال کے طور پر تقریر ہی کو لیجئے جو تقریر کرنے والا اپنے موضوع پر پورا عبور نہیں رکھتا وہ کسی مخالف کو جواب کیا دے گا اسے تو مبحث کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے تمام وسیلے نوک زبان ہونے چاہئیں تاکہ کہیں بند نہ ہونا پڑے بصورت دیگر چاہے رائے صائب اور درست بھی کیوں نہ ہو، خاموشی اختیار کرنی پڑے گی۔ بحث چھڑ چکی ہے لیکن حضرت کا علم حاضر نہیں اب بغلیں جھانک رہے ہیں مارے شرم کے منہ سے لفظ نہیں نکلتا اپنا دعویٰ ثابت کرنے اور مد مقابل کے رد کے لیے دلائل نہیں سوجھتے جب تک ایسے مقررین کا حلقہ ذاتی امور تک محدود رہتا ہے اس وقت تو کوئی خطرہ کی بات نہیں لیکن اگر قسمت انہیں قوم کا ترجمان بنا دے اور وہاں باوجود اتنی کتابوں کی سیاہی چاٹنے کے میاں بوجھ بجھکی زبان لال ہو جائے تو پھر بس آفت ہی ہوتی ہے۔

میں نے ابتدائے شعور سے درست طریقہ پر مطالعہ کی عادت ڈال رکھی ہے یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ ذہانت سے بہرہ ور ہوں، اور حافظہ بھی اچھا ہے اس لحاظ سے میرے لیے وائنا کا چند روزہ قیام بالخصوص مفید اور سبق آموز ثابت ہوا۔ یہاں مجھے نت نئے تجربات سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا کہ میں طرح طرح کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پڑتالنے کا عادی ہو گیا۔ میں ہمیشہ اصول کو واقفیت کی کسوٹی پر اور واقعات کو اصول کے معیار سے جانچتا رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ نہ تو میں ایسا برخود غلط تھا کہ دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے اپنی ہی عقل کے گھوڑے دوڑانے میں مصروف رہتا۔ اور نہ ہی میں رائے کا ایسا کچا تھا کہ واقعات کا سطحی رجحان مجھے اپنی رو میں بہالے جاتا۔

اشتراکیت سے میری پہلی ٹکر

ان دنوں کے روزمرہ تجربات نے مجھے معاشرتی مسئلہ کے علاوہ دو اور اہم مسائل

کے متعلق پوری پوری علمی تحقیق کرنے پر مجبور کردیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر اشتراکیت سے میری اس طرح اچانک ٹکر نہ ہو جاتی تو میں کب اس کے خصائص اور اصولوں کا مطالعہ شروع کرتا۔

میں جوانی میں جرمنی کی اشتراکی پارٹی کے متعلقہ بہت کم جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ بھی بیشتر غلط ملط جہاں تک اس تحریک کا مطالبہ تھا کہ تمام رعایا کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو جائے، اور الیکشن کی پرچیاں ایک بند کمرے میں جا کر پوشیدہ طور پر ڈالی جایا کریں، مجھے اس سے پورا اتفاق تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ شاہان ہیز برگ سے سخت نفرت تھی اور میرا خیال تھا کہ ان مطالبات کے پورا ہو جانے سے شاہی تسلط میں کمزوری واقع ہو جائے گی میرا دل گواہی دیتا تھا کہ چاہے آسٹرین سلطنت اغیار کو خوش کرنے کی خاطر جرمن عنصر کو قربان بھی کردے پھر بھی اس کا بچاؤ ناممکن ہے باوجودیکہ حکومت ایک عرصہ سے آہستہ آہستہ جرمنوں کو قوم سقلاب کے رنگ میں رنگ رہی تھی، پھر بھی سلطنت کے مستقل استحکام کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی وجہ یہ کہ قوم سقلاب میں تعمیری سیاست کی استعداد مفقود تھی۔ اور اگر تھی بھی تو بہت کم یہی حالات تھے جن کی بناء پر مجھے ہر اس تحریک سے ہمدری تھی جس کا مقصد اس غیر طبعی سلطنت کو ختم کرنا ہو۔ اس سلطنت کا تو پختہ ارادہ ہو چکا تھا کہ ایک کروڑ جرمنوں کو ان کے قومی خصائص سے عاری کر دیا جائے جوں جوں ملک میں ہفت زبانی کا دور دورہ ہوتا جاتا تھا، حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں بھی ہر قوم کا الگ الگ طوطی بولنے لگا، توں توں اس مینارہ بابل کی مثیل سلطنت کے خاتمہ کا وقت قریب پہنچتا جاتا تھا۔ یہ خاتمہ آسٹرین جرمنوں کا یوم نجات ہوگا۔ اس روز ہمارے لیے مادر وطن کے دامن سے پھر وابستہ ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

غرض مجھے جرمنی کی اشتراکی پارٹی کی عملی پالیسی سے کوئی اختلاف نہ تھا میری ان دنوں کی ناواقفیت اور سادہ لوحی کے باعث میرا خیال تھا کہ یہ بیچارے تو غریب مزدوروں کے معیار زندگی کو بلند کرنا چاہتے ہیں پھر کیوں نہ میں ان کی حمایت کروں۔

ہاں اشتراکیوں کی ایک بات مجھے نہ بھاتی تھی وہ یہ کہ ان لوگوں کو آسٹریا میں جرمن اقتدار قائم رکھنے سے خدائی بیر تھا سقلابیوں کی ذلیل قوم سے ان کی ساز باز افسوسناک تھی یہ انہیں ''رفیق'' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ بھی جب تک کوئی غرض وابستہ رہتی بخوشی ان کی خوشامدیں سنتے رہتے۔ ورنہ اپنے متکبرانہ انداز سے ان تنگ کر دینے والے عادی گداگروں کو وہی جواب دیتے جس کے یہ مستحق تھے۔

اس طرح میں سترہ سال کی عمر تک ''مارکس ازم'' کے لفظ سے بھی ناواقف تھا مجھے تو اشتراکیت اور سوشلزم کا باہمی فرق تک معلوم نہ تھا آخر استادِ فطرت نے اچانک ایک ایسا تازیانہ لگایا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں اور عامۃ الناس کو بہکانے کے لیے اشتراکیت نے جو بے مثال جال پھیلا رکھا تھا اس کا راز مجھ پر آشکار ہو گیا ابھی تک اشتراکی پارٹی سے میری شناسائی بس اتنی ہی تھی کہ میں ان کے بعض عام جلسوں میں ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہو جایا کرتا تھا مجھے اشتراکیت کے اصولوں یا اشتراکیوں کی ذہنیت کے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی یکا یک ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج مجھ پر ظاہر ہونے لگے۔ اس طرح چند ہی مہینوں میں مجھے ان کے متعلق وہ باتیں معلوم ہو گئیں جو بصورت دیگر شاید سالہا سال تک نہ کھلتیں۔ معاشرتی اصلاح اور ہمدردی بنی نوع کی آڑ میں ایک ایسا فتنہ برپا کیا جا رہا تھا جس کے استیصال میں ذرا بھی تاخیر کی جائے تو شاید روئے زمین سے نسل انسانی ہی مٹ جائے۔

ٹریڈ یونین

پہلے پہل مجھے تعمیر کے پیشہ میں اشتراکیوں سے واسطہ پڑا۔

جب میں نے یہ کام شروع کیا اسی روز سے مجھے تلخیوں کا سامنا ہونے لگا میرا لباس ابھی تک نسبتاً بہتر تھا میں گفتگو میں مقابلتہً محتاط تھا عادتاً بھی میں مستغنی المزاج تھا میں اپنی موجودہ زبوں حالی اور مستقبل میں ترقی کے امکانات پر غور کرنے میں اتنا مستغرق رہتا کہ مجھے گردوپیش کے فوری حوادث سے کوئی ایسی وابستگی نہ تھی میں مزدوری بھی اس

لیے کرتا تھا کہ فاقہ کشی کی نسبت نہ پہنچے، اور میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں، چاہے آہستہ آہستہ ہی سہی غرض جہاں تک میرا تعلق تھا میں تو شاید اپنے ساتھیوں میں کوئی دلچسپی لینے کی پرواہ بھی نہ کرتا۔ لیکن تیسرے چوتھے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے کسی ایک قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ مجھے ٹریڈ یونین میں شامل ہونے کے لیے نادری حکم دے دیا گیا۔

اس وقت تک مجھے ٹریڈ یونینوں کی بابت کچھ علم نہ تھا مجھے ان کے مفید یا غیر مفید ہونے کے متعلق رائے قائم کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ لیکن جب مجھے حکماً کہا گیا کہ تمہیں ٹریڈ یونین میں شامل ہونا پڑے گا تو میں نے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ مجھے اس یونین سے کوئی واقفیت نہیں اور بہر حال میں کسی کام میں جبراً شمولیت نہیں کرنا چاہتا۔ غالباً پہلی دلیل کا اثر تھا کہ مجھے اسی وقت نکال کر باہر نہیں کیا گیا شاید انہیں خیال ہوگا کہ چند روز میں اسے اپنے ڈھب پر لے آئیں گے اور پھر اس کی وحشت بھی دور ہو جائے گی لیکن اگر ان کا یہ خیال تھا تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا تھے دو ہفتے کے بعد میری قطعی رائے قائم ہوگئی کہ اگر میں پہلے ٹریڈ یونین میں شامل ہونے پر آمادہ بھی تھا ہو اب ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ میں نے ان چودہ روز میں اپنے ساتھی مزدوروں اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا دنیا کی کوئی طاقت مجھے کسی ایسی جماعت میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی جس کے نمائندے اس اثناء میں مجھ پر ایسا ناموافق اثر پیدا کر چکے ہوں۔

میرے دل میں شروع سے ہی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔

دوپہر کے وقت میرے کچھ ساتھی چھٹی کر کے قریب ترین شراب خانے میں چلے جاتے اور باقی وہیں جائے تعمیر کے قریب بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا لیتے تھے یہ کھانا اتنا قلیل ہوتا تھا کہ پیٹ بھی نہ بھرتا ہوگا موخر الذکر لوگ شادی شدہ تھے دوپہر کا کھانا ان کی بیویاں ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں لے کر آتی تھیں ہفتے کے آخر میں بتدریج ان لوگوں کی

تعداد بڑھتی جاتی تھی جو عمارت کے پاس ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے بعد میں مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی وجہ کیا تھی اس وقت وہ سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔

کمیونسٹوں سے بحث

میں کہیں الگ کنارے پر جا کر گرد وپیش کا مطالعہ کرتے ہوئے، یا اپنی محرومی قسمت کی بابت سوچتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا اور دودھ کا پیالہ زہر مار کر لیتا تھا۔ پھر بھی ان لوگوں کو کافی سے زیادہ باتیں میرے کانوں میں پڑ جاتی تھیں مجھے کئی دفعہ خیال ہوا کہ ان کی گفتگو کا کچھ حصہ میرے لیے مقصود ہوتا تھا تا کہ میں کسی فیصلہ پر پہنچ سکوں۔ لیکن میں جو کچھ سنتا تھا اس سے میرے دل میں مخالفت کا جذبہ اور بھی بھڑکتا تھا۔ یہاں تو ہر شے کی مٹی پلید تھی، قوم کی مذمت یوں کی جاتی تھی کہ سرمایہ داروں کی ایجاد ہے (یہ سرمایہ داری کا وظیفہ سنتے سنتے تو میرے کان پک گئے) مادر وطن کو اس لیے کوسا جاتا تھا کہ یہ اہل ثروت کے ہاتھوں میں غریبوں کو لوٹنے کے لیے آلہ کار ہے اختیارات قانونی کی اس لیے مخالفت ہوتی تھی کہ ان سے غرباء کو دبا کر رکھا جاتا ہے مذہب اس لیے برا ہے کہ اس سے لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے اور بالآخر ان کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا جاتا ہے اخلاق احمقانہ اور بزدلانہ بیچارگی کا اعتراف ہے دنیا کی کون سی چیز ہے جس پر وہ کیچڑ نہیں اچھالتے تھے۔

پہلے پہل تو میں چپ رہا لیکن پھر جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ اس طرح کب تک کٹے گی میں نے ان کی گفتگو میں حصہ لینا شروع کیا اور ان کے دعوٰں کی تردید کرنے لگا۔ تاہم مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک زیر بحث مسائل کے متعلق کچھ ٹھوس واقفیت حاصل نہ کی جائے میری یہ کوششیں قطعاً رائیگاں ثابت نہ ہوں گی غرض میں نے اس منبع کی تحقیق کرنے پر کمر باندھی جہاں سے میرے مخاطبین کو دعوٰی تھا وہ عقل سیکھ کر آتے ہیں میں کتاب پر کتاب اور پمفلٹ پر پمفلٹ پڑھنے لگا۔

اس دوران میں ہم وہیں عمارت کے پاس بیٹھ کر باہم بحث مباحثہ کرتے رہے روز

بروز میرے ساتھیوں کے مقابلہ میں میری واقفیت ان مسائل میں بڑھتی جاتی تھی جن کے متعلق انہیں ماہر ہونے کا دعویٰ تھا میرے مخالفین میں سے کچھ زیادہ خطرناک تھے جب ان کی قوت استدلال عاجز آ جائے تو ان کے پاس اس کی جگہ لینے کو ایک موثر تر حربہ بھی موجود تھا آخر ایک دن ایسا آیا کہ انہیں میرے خلاف اس حربہ سے کام لینا پڑا۔ یہ حربہ مار پیٹ اور ڈرانے دھمکانے پر مشتمل تھا میرے مخالفین کے لیڈروں میں سے چند ایک نے مجھے حکم دے دیا کہ یا تو میں خود عمارت سے باہر نکل جاؤں ورنہ مجھے زبردستی پہاڑ پر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا جائے گا۔ چونکہ میں اکیلا تھا اس لیے میں ان کا مقابلہ تو نہ کر سکتا تھا، لازماً میں نے پہلی صورت پر عمل درآمد کیا لیکن اس تجربہ سے مجھے آئندہ کے لیے کان ہو گئے۔

جب میں وہاں سے نکلا تو میرا سینہ نفرت سے کھول رہا تھا میں اس قدر جوش میں تھا کہ اس واقعہ کو اپنے ذہن سے خارج کرنا اور آئندہ کے لیے بھول جانا میری طاقت سے باہر تھا جب میرا غصہ ذرا دھیما ہوا تو جذبہ استقلال غالب آیا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو میں پھر تعمیر کا کام کروں گا۔ چند ہفتے بعد جب میری معمولی پونجی ختم ہو گئی اور فاقہ کشی نے مجھے اپنے بے رحم پنجہ میں دبوچنا شروع کیا تو میرا یہ ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ میرے لیے اور کوئی صورت ہی نہ تھی میں نے ایک دفعہ پھر کام پر جانا شروع کیا لیکن پھر اسی بناء پر وہاں سے نکلنا پڑا۔

اشتراکیت سے ملت کو خطرہ

اس وقت میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ ایک عظیم الشان قوم میں شمولیت کے مستحق ہیں؟ یہ سوال ایک نہایت سرگردان کر دینے والا سوال تھا۔ اگر اس کا جواب ہاں میں دیا جاتا تو قوم کی حفاظت میں جان لڑانے کے کوئی معنی نہیں رہتے تھے جب بہترین فرزندان ملت کی تگ و دو اور قربانیوں کا ماحصل یہی احمقوں کا مجمع ہے تو آخر قوم کی حمایت کس لیے کی جائے! برعکس اس کے اگر اس سوال کا جواب نفی میں دیا

جائے، یعنی یہ کہا جائے کہ یہ لوگ قوم میں شمولیت کے مستحق نہیں، تو پھر ماننا پڑے گا کہ ہماری قوم چند افراد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس ذہنی درد و کرب اور غور و عمق کے زمانہ میں میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت ان لوگوں کا نقشہ رہتا تھا جو اپنی قوم سے برگشتہ ہو چکے تھے ان کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا اور اسی تناسب سے ان کی وجہ سے پیدا ہونے والا خطرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

کمیونسٹوں کے اخبارات

اس واقعہ کے چند روز بعد جب میں نے ایک ایسا مظاہرہ دیکھا جس میں وائنا کے تمام مزدور شریک تھے تو مجھے بالکل نئے تاثرات کا احساس ہوا وہ چار چار کی قطاریں باندھ کر ایک لا متناہی جلوس کی شکل میں مارچ کر رہے تھے جلوس کیا تھا ایک انسانوں کا بنا ہوا اژدھا تھا جو میرے سامنے آہستہ آہستہ بل کھاتا ہوا گزر رہا تھا میں حیرت سے بت بن کر چپ چاپ کھڑا تقریباً دو گھنٹے تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر جب میں چوک سے گھر کو واپس لوٹا تو نفرت اور مایوسی کے اثر سے نڈھال ہو رہا تھا راستے میں ایک تمباکو کی دکان پر مزدوروں کا اخبار میری نظر پڑا۔ آسٹرین اشتراکیوں کی پرانی پارٹی کا سب سے بڑا ترجمان یہی اخبار تھے۔ ایک سستے قہوہ خانے میں جہاں عام لوگ مل بیٹھتے تھے اور جہاں میں اکثر اخبار پڑھنے چلا جاتا تھا، وہاں بھی یہ مزدوروں کا اخبار سامنے رکھا ہوتا تھا میں آج تک اس ذلیل چیتھڑے پر کبھی دو منٹ سے زیادہ توجہ منعطف نہ کر سکا تھا کیونکہ اس کا سارا انداز بیاں ہی میرے لیے سوہان روح تھا۔ مظاہرہ کو دیکھ دیکھ کر مجھ پر کچھ ایسی مایوسی طاری تھی کہ اس وقت میرے اندر ایک آواز پیدا ہوئی اس آواز نے مجھے اکسایا کہ تمباکو کی دکان سے اخبار خرید کر سارے کا سارا پڑھوں۔ غرض میں یہ اخبار گھر لے آیا اور باوجودیکہ اس کی بے اندازہ دروغ بافیوں سے ہر لحمہ میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا پھر بھی میں نے شام کا تمام وقت اس کے مطالعہ میں صرف کیا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ اس سیاست و فلسفہ کی مخلوط تحریک کی اندرونی اصلیت ان کے

عقائد کی تمام کتابوں کے مقابلہ میں اشتراکی روزناموں کے ذریعہ بدرجہا بہتر طور پر معلوم کی جاسکتی ہے۔

اس ترجیح کا سبب یہ تھا کہ اخبارات اور عقائد کی کتابوں میں کوئی مطابقت نہ تھی کتابوں میں اشتراکیت کے عقائد بیان کرتے ہوئے زورِ قلم، لفاظی اور شوکت بیان کی مدد سے حقوق آدمیت، محاسن انسانی اور حریت کا ڈھنڈورہ کچھ اس ڈھنگ سے پیٹا جاتا تھا کہ نبیوں کے ایمان اور دانشمندوں کی حکمت کا دھوکہ ہونے لگتا تھا۔ تصنع اور آورد کے بل بوتے پر الفاظ کا بنا ہوا ایک ایسا چمکدار گورکھ دھندہ تھا جس سے پڑھنے والا چندھیا کر جال میں پھنس جاتا تھا برخلاف اس کے روزنامہ اخبارات میں اس ''بنی نوع آدم کو نجات دینے والے مذہب'' کی تلقین ایک اور ہی وحشیانہ انداز میں کی جاتی تھی بہتان اور افترا پردازی کے لیے کوئی وسیلہ ایسا نہ تھا جس کا استعمال ممنوع ہو۔ کمینہ سے کمینہ حملے جائز تھے۔ ان اخبار نویسوں کو واقعات توڑ مروڑ کر پڑھنے والوں کو دھوکہ میں ڈالنے کی ایسی مہارت تھی کہ صحیح معنوں میں ''معجز رقم'' کہلانے کے مستحق تھے عقائد کی کتابیں ان بالائی اور متوسط طبقہ کے سادہ لوح لوگوں کے لیے تھیں جو اپنے آپ کو ذہین اور عالم شمار کرتے تھے اخبارات کا پراپیگنڈہ عامۃ الناس کو پھانسنے کی خاطر تھا۔

کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے

ان اخبارات و کتب کی تحقیق اور اشتراکیت کے مطالعہ نے میرے اندر میری قوم کی محبت نئے سرے سے بیدار کر دی۔ جو خلیج نا قابل عبور نظر آتی تھی وہی جوش الفت کو اکسانے کا باعث ثابت ہوئی۔

جب ایک دفعہ اس عظیم الشان نظام کو سمجھ لیا جائے جو عامۃ الناس کے دماغ مسموم کرنے کے لیے کھڑا کیا جا چکا ہے تو اس کے بعد کوئی احمق ہی اس زہر کا شکار ہونے والوں کو ملزم ٹھہرائے گا جوں جوں سال گزرتے گئے میں فکر معاش سے آزاد ہوتا گیا اور جوں جوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا گیا، ان اسباب کو بھی بہتر طور پر سمجھنے لگا جن کی وجہ

سے اشتراکی عقائد کو تسلط حاصل ہو رہا تھا اب مجھ پر ان وحشیانہ پابندیوں کا راز بھی کھل گیا جن کی بناء پر اشتراکی کتابوں اور اخباروں کے سوا باقی تمام کتب یا اخبارات کا مطالعہ ممنوع تھا، اور اشتراکی جلسوں کے سوا اور کسی جلسہ میں شمولیت کی اجازت نہ تھی۔ بے رحم اصلیت کی روشنی نے مجھ پر واضح کر دیا کہ ایسی متعصبانہ تعلیم کے لازمی نتائج کیا ہوتے ہیں۔

عوام کو متاثر کرنے کا نسخہ

عامۃ الناس کے قوائے ذہنی صرف انہیں محرکات سے متاثر ہوتے ہیں جو طاقتور اور اٹل ہوں ان کی مثال عورتوں کی سی ہے عورت کے بنیادی احساسات کبھی عقلی استدلال سے بیدار نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ موہوم جذبات سے اثر پذیر ہوتے ہیں یہ جذبات اس قوت کے پیاسے ہوتے ہیں جو اس کے وجود کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے یہی وجہ ہے کہ عورت کمزور مرد پر غالب آنے کی نسبت طاقتور مرد کی مغلوب بن کر رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔علی ہذا القیاس عامۃ الناس بھی درخواستیں کرنے والے کے مقابلہ میں حکم دینے والے کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو عقیدہ کسی مد مقابل کو برداشت نہ کرے وہ ان کے لیے زیادہ اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے برعکس اس کے جو عقیدہ انہیں ان کی اپنی رائے پر چھوڑ دے اس کی بابت انہیں لغزش کا دھڑ کا لگا رہتا ہے ان غریبوں کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ قوت انتخاب کو استعمال کیونکر کیا جائے اس لیے جب انہیں آزادی دی جائے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری رہبری میں کوتاہی کی جا رہی ہے انہیں عقلی غلامی کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی بلکہ انہیں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ ان کے آزادی رائے کے حق کو پامال کیا جا رہا ہے اور یہ سلوک ایک انسان کی شان کے خلاف ہے اگر عقیدہ میں کوئی خامی ہے تو وہ اسے ہرگز محسوس نہیں کر سکتے۔انہیں تو صرف بے رحم طاقت اور اس کے مصمم و عادی کی قاہرانہ شوکت نظر آتی ہے اور اس کے سامنے وہ ہمیشہ سر جھکا دیتے ہیں۔

اگر اشتراکیت کے مقابلہ میں کوئی اس سے سچا عقیدہ پیش کیا جائے اور اسے بھی ایسی ہی طاقت سے نفاذ کیا جائے تو کیسی ہی شدید ٹکر کیوں نہ ہو، بالاخر وہ سچا عقیدہ ضرور غالب آئے گا۔

دو سال سے کم عرصہ کے اندر میں اشتراکیت، اس کے اصول، اس کے طریقہ اور اس کی کارروائیوں سے پوری پوری واقفیت حاصل کرلی۔

تشدد سے افراد ہی کو نہیں جماعتوں کو بھی مرعوب کیا جا سکتا ہے

اب مجھ پر اس طریقہ کار کی بد معاشی بھی منکشف ہوگئی جس سے یہ تحریک کھاتے پیتے لوگوں کے خلاف ذہنی دہشت انگیزی کی مہم چلائی تھی ان کھاتے پیتے لوگوں میں ایسے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ اخلاقی طاقت تھی نہ روحانی سکت، اشتراکیوں کی چال یہ تھی کہ وہ اپنے مخالفین میں سے جس شخص کو سب سے زیادہ خطرناک سمجھتے، ایک مقررہ اشارے پر اس کے خلاف جھوٹ اور بہتان کا ایک طوفان برپا کردیتے۔ حتیٰ کہ دوسرے لوگ حواس باختہ ہو کر اس مظلوم شخص کو قربان کردینے پر آمادہ ہو جاتے۔ ان دوسرے لوگوں کو امید ہوتی تھی کہ اس قربانی کے بعد شاید خود انہیں چین سے بیٹھنے دیا جائے گا لیکن ان کی یہ امید ہمیشہ احمقانہ ثابت ہوتی کیونکہ انہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا جاتا۔

یہی چال بار بار چلی جاتی ہے حتیٰ کہ سنی سنائی کے اثر سے ان دیوانے کتوں کا خوف ہی ان کے شکار کو مفلوج کر ڈالتا ہے۔

چونکہ اشترا کیوں کو خود اپنے تجربہ کی بناء پر قوت کی قدر و قیمت معلوم ہو چکی ہے اس لیے وہ زیادہ تر انہیں لوگوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں جن میں انہیں جوانمردی کے نادر جوہر کی جھلک نظر پڑ جائے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مخالفین میں سے ہر بزدل کو اس کی دماغی قابلیت کے لحاظ سے کم و بیش آسمان پر چڑھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اگر ایک نادر روزگار دماغ رکھنے والا شخص ارادے کا کمزور ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں اس شخص

سے زیادہ ڈرتے ہیں جس کی ذہنی استعداد چاہے معمولی ہو، لیکن ہمت کا دھنی ہو۔ جس شخص میں ذہانت اور استقلال دونوں کی کمی ہو اس کی تو وہ ازحد تعریف کرتے ہیں۔

اشتراکیوں کو یہ ظاہر کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے کہ وہ امن و امان کے واحد ٹھیکیدار ہیں اگرچہ وہ ہر قدم پھونک کر رکھتے ہیں لیکن اپنا مقصد کبھی فراموش نہیں کرتے۔ غرض کبھی ڈرا دھما کے اور کبھی دن دہاڑے ڈاکہ ڈال کر، یہ لوگ یکے بعد دیگرے فتوحات پر فتوحات حاصل کئے جاتے ہیں ڈاکہ اس وقت ڈالتے ہیں جب عامۃ الناس کسی اور کام میں انہماک کے باعث اس کام سے توجہ ہٹانے پر آمادہ نہ ہوں، یا جب رائے عامہ کسی مسئلہ کو اتنا معمولی خیال کرتی ہو کہ اس پر فساد کر کے ایک کینہ پرور دشمن کو بھڑکانا پسند نہ کرے۔

ان چال بازیوں کی بنیاد انسانی کمزوریوں کے صحیح اندازے پر رکھی گئی ہے اس لیے ان کے استعمال سے کامیابی ایسی ہی یقینی ہے جیسے دو اور دو چار، سوائے اس کے کہ فریق مخالف بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھ جائے کمزور طبیعتوں کو بتا دینا چاہیے کہ یہاں تو زندگی اور موت کا سوال ہے۔

مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ تشدد سے نہ صرف افراد کو بلکہ مجمعوں کو بھی خوفزدہ کیا جا سکتا ہے یہاں پھر اشتراکیوں نے نفسیاتی اثرات کا اندازہ خوب ٹھیک لگایا تھا۔

جب تک کارخانوں، فیکٹریوں، جلسہ گاہوں اور عام مظاہروں میں اس قسم کے تشدد کا مقابلہ کسی زیادہ زبردست صورت میں نہ کیا جائے تب تک دہشت انگیزی کی کامیابی یقینی ہے۔

کمیونسٹوں کی لغت میں ظلم کے معنی

اگر کبھی ایسا مقابلہ کیا جائے تو پھر یہ جماعت مظلوم بن کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے کہ دیکھو ہم دن دیہاڑے مارے گئے جس حکومت کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں پھر اسی کے پاس فریادیں لے جاتے ہیں ان حرکات سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ جن

الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہیں ان میں اور اضافہ ہو جائے۔ اور یہ چپکے سے اپنا مطلب نکال لے جائیں ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ حکومت کے عہدہ داروں میں سے کوئی ایسا عقل کا اندھا ہاتھ آ جائے جو اپنے خوفناک مخالفین کو خوش کر لینے کی اس احمقانہ امید میں کہ شاید وہ آئندہ کسی موقعہ پر اسے یاد رکھیں، اب انہیں اس عالمگیر فتنہ کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے نجات دلا دے۔

عامۃ الناس، چاہے موافق ہوں یا مخالف، ان چالوں کی کامیابی سے ان کے ذہن پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جو خود نفسیات عامہ کا عملی تجربہ رکھتا ہو، نہ کہ جس کا علم محض کتابوں تک محدود ہو۔ اشتراکیت کے حامی ان کامیابیوں کو اپنی تحریک کے برحق ہونے کا ثبوت قرار دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مزید مدافعت کو بے سود خیال کرنے لگتے ہیں۔

جس قدر مجھے دہشت انگیزی کے طریقہ کار سے واقفیت ہوتی جاتی تھی، اتنی ہی میری ہمدردی اس انبوہ سے بڑھتی جاتی تھی جو اس دہشت انگیزی کا شکار ہو چکے تھے۔

مجھے ان دنوں جن آزمائشوں کا تجربہ ہوا میں ان کے لیے شکر گزار ہوں کیونکہ یہی وہ بھٹی تھی جس کی آگ نے میرے دل میں پھر میری قوم کی محبت کا چراغ روشن کر دیا۔ مجھ پر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ مکار لیڈروں اور ان کے گمراہ کیے ہوئے پیروؤں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

غریب محبّ وطن ہوتے ہیں

یہ پیرو غریب تو سادہ لوحی کا شکار تھے میں نے اپنے قومی معاشرتی نظام کے سب سے نیچے طبقے کی نفسیاتی خصوصیات بیان کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے اگر میں اس کے ساتھ ہی یہ واضح نہ کر دوں کہ مجھے پست ترین حیثیت کے لوگوں میں بھی ایک روشنی کی جھلک نظر آئی تو میں اس مبالغہ کی آمیزش رہے گی میں نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنے غریبانہ ماحول پر قانع تھے۔ انہیں کسی سے کوئی حرص نہ تھی۔ ان میں وفا، ایثار اور رفاقت کی نادر

خوبیاں تھیں ۔ایک نسل پیچھے کے مزدوروں میں تو یہ اوصاف بالخصوص پائے جاتے تھے بڑے بڑے شہروں کے غالب اثر کے ماتحت نئی نسل سے اب یہ باتیں مٹتی جا رہی تھیں لیکن ان میں بھی کئی ایسے تھے جن کے قلب ابھی تک صالح تھے اور جن پر روزمرہ کے رذیل ماحول کا سایہ نہ پڑا تھا اگر یہ لوگ جن میں سے اکثر کی نیتیں نیک اور طبیعتیں دیانتدار تھیں ایک ایسی سیاسی تحریک کے موید تھے جس کی باگ دوڑ ہماری قوم کے مشترکہ دشمنوں کے ہاتھ میں تھی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ یہ شریف مزدور اشتراکی مخترعہ پروازوں کی تعلیم کی بد معاشیوں سے آگاہ نہ تھے پھر قوم میں اور کوئی ایسا عنصر ہی نہ تھا جو مزدوروں کی فلاح و بہبود کی پروا کرتا۔ علاوہ ازیں معاشرتی حالات ایسے بن چکے تھے کہ جو لوگ شاید کبھی اشتراکیوں کے نزدیک بھی نہ پھٹکتے وہ پہلے مجبوراً اور پھر عادتاً ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے تھے آخر ایک دن ایسا آتا تھا جب مفلسی ان مزدوروں کو گھیر کر اشتراکیت کی صفوں میں داخل کر دیتی تھی ۔

سرمایہ دار احمق ہیں

بارہا سرمایہ دار مزدوروں کے جائز ترین انسانی مطالبات کے خلاف بھی مقابلہ کے لیے ڈٹ جاتے رہے ۔ان کی یہ حرکت کوتاہ اندیشی پر مبنی تھی ۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ منافی اخلاق تھی انہیں خود بھی اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیک طبیعت مزدور ٹریڈ یونین کا ابتدائی تصور ترک کر کے سیاسیات میں جا پھنسے ۔

لکھو کھہا مزدور شروع میں اشتراکیت کے مخالف تھے لیکن ان کے عذر ایک ایک کر کے توڑ دیئے گئے اور آخر کار انہیں سرخم تسلیم کرنا پڑا اس شکست کا باعث سرمایہ داروں کی ان جماعتوں کی حماقت تھی جو مزدوروں کے ہر معاشرتی مطالبہ کو ٹھکرا دیتی تھی انہوں نے اندھا دھند مزدوروں کی شرائط ملازمت کی اصلاح کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کارخانوں میں پیش آنے والے حادثات کے لیے مزدوروں کا بیمہ کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے بچوں سے مشقت لینے کی ممانعت کرنے سے انکار کیا انہوں نے مزدور

عورتوں اور خاص طور پر حاملہ عورتوں کی امداد کے لیے قانون بنانے سے انکار کیا یہ سب باتیں اشتراکیت کے لیڈروں کے لیے مفید مطلب تھیں وہ بخوشی ہر اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے تھے جس سے عامۃ الناس ان کے جال میں پھنس جائیں۔

ہمارے سرمایہ داروں کی جماعتوں نے اس وقت کی غلطیوں سے جو نقصان پہنچایا وہ ہرگز قابل تلافی نہیں انہوں نے جب ہر معاشرتی اصلاح کی مخالفت کی تو اس سے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے گئے ان کے اسی طرز عمل سے اشتراکیوں کو وہ ظاہری دلائل ہاتھ آ گئے جن کی بناء پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سوائے ان کے مزدوروں کا اور کوئی حامی ہی نہیں۔

ٹریڈ یونینوں کے وجود کی سب سے بڑی اخلاقی دلیل بھی یہی قرار پائی۔

غرض مزدوروں کی تنظیم اس وقت سے اشتراکیوں کی سیاسی فوج میں بھرتی دینے کا سب سے بڑا آلہ کار بن گئی۔

جب میں نے اس طرح گردوپیش کے معاشرتی حالات کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے طوعاً وکرہاً ٹریڈ یونینوں کے متعلق بھی کوئی ایک مستقل رویہ اختیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ میں ٹریڈ یونینوں کو اشتراکی پارٹی کا جزو لاینفک خیال کرتا تھا اس لیے میں نے ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ یہ رائے غلط تھی میں نے انہیں سرے سے ہی مذموم ٹھہرا دیا تھا لیکن اس اہم مسئلہ میں بھی قسمت نے یاوری کی اور مجھے ایک ایسا سبق سکھایا جس سے میں نے اپنی پہلی رائے تبدیل کر لی۔

طبقاتی رقابت یا طبقاتی مصالحت؟

جب میری عمر بیس سال ہوئی تو میں اس ٹریڈ یونین میں جو ملازموں کے معاشرتی حقوق کی حفاظت اور ان کے معاش کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کی خاطر قائم کی جائے اور اس ٹریڈ یونین میں جو کسی جماعت کے ہاتھ میں کھلونا بن کر طبقاتی جنگ کے اندر سیاسی آلہ کار کا کام دے، فرق کرنا سیکھ چکا تھا۔

ٹریڈ یونین تحریک کی زبردست اہمیت سے اشترا کی خوب واقف تھے۔ وہ اسے ایک حربہ سمجھتے ہوئے اس پر قابض ہو گئے اور بڑی کامیابی سے اس کا استعمال کرتے رہے۔ سرمایہ دار اس تحریک کی نوعیت سمجھنے سے قاصر رہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے رسوخ میں فرق آ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے نوابی افکار سے شاید اس تحریک کی طبعی نشوونما رک جائے گی اور وہ کوئی خلاف عقل قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گی لیکن یہ کہنا کہ ٹریڈ یونین تحریک فی نسہ قوم کے لیے مضر ہے، نہ صرف غلط ہے بلکہ فضول بھی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اگر ٹریڈ یونین کے ذریعہ ایک طبقہ کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جائے اور اس میں کامیابی ہو جائے تو یہ کوشش وطن و قوم کے منافی کیسے ہوئی بلکہ یہ تو صحیح معنوں میں خدمت قوم ہوئی اس لحاظ سے دیکھیے تو ٹریڈ یونینوں کا نظام وہ معاشرتی فضا پیدا کرتا ہے جو قومیت کا جذبہ پرورش کرنے کے لیے سازگار ہے جب یہ تحریک معاشرتی امراض کے مادی اور نفسیاتی جراثیم دور کر کے قوم کی رفاہ عامہ کا سامان کرتی ہے تو بہر حال اس سے پورا پورا تعاون ہونا چاہیے۔

یہ سوال خارج از بحث ہے کہ آیا ٹریڈ یونینوں کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے یا نہیں۔ جب تک ایسے آقا موجود ہیں جن میں معاشرتی احساس کا فقدان ہے اور جو انصاف و جواز کے غلط نظریوں پر کاربند ہیں۔ تب تک ان کے ملازمین کا بھی نہ صرف یہ حق ہے بلکہ ان پر واجب ہے کہ مفاد عامہ کو انفرادی لالچ اور تعدی سے بچانے کا انتظام کریں۔ وجہ یہ کہ آخر ملازمین بھی تو جسم قوم کا ایک عضو ہیں عامۃ الناس کی وفاداری اور اعتماد کا برقرار رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحت عامہ کا اہتمام۔

جو ذلیل آقا قومی کنبہ سے وابستہ ہونے کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں رکھتے وہ عامۃ الناس کے جذبات اعتماد اور وفاداری دونوں کے دشمن ہیں ان کا ذاتی طمع اور غیر ذمہ داری آئندہ بے چینی کے بیج بوتے ہیں ان امور کا تدارک یقیناً ملک کی بہی خواہی میں داخل ہے۔

یہاں یہ جواب کوئی جواب نہیں کہ ہر مزدور شخصاً اختیار رکھتا ہے کہ اگر اس کا آقا واقعی اس سے کوئی بے اضافی برتے، یا اگر وہ خود کسی ایسی بے انصافی کا وہم کرے، تو وہ بھی اپنی حفاظت کا بندوبست کر لے۔ بالفاظ دیگر وہ ملازمت ترک کر دے نہیں! یہ دلیل تو اصل موضوع سخن سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک چال ہے کیا معاشرتی بے اطمینانی کو دور کرنا قومی مفاد کے لیے ضروری ہے یا نہیں اگر ہے تو پھر اس کے لیے کوشش کا وہی واحد طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے کامیابی کی توقع ہے اکیلا مزدور طاقتور مالک کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے اس طرح یہ تو طے نہ ہوگا کہ حق پر کون ہے اگر حق کو معیار تسلیم کر لیا جاتا تو پھر جھگڑا کاہے کا تھا۔ یہاں تو سوال ہے طاقت کا اگر ایسا نہیں تو پھر جذبہ انصاف خود بخود اس تنازع کو کیوں نہیں نپٹا دیتا۔ یہ کھینچا تانی کی نوبت ہی کیوں پہنچتی ہے؟

میں پھر کہوں گا نہیں! جب لوگوں سے وہ سلوک کیا جاتا ہے جو حقوق معاشرت اور آداب شرافت دونوں کے خلاف ہے اور جب اس پر وہ مقابلہ کے لیے اٹھتے ہیں تو اس وقت بازی اس فریق کے ہاتھ رہتی ہے جس کا پلہ بھاری ہو۔ اس خرابی کو وہی حکام قانون بنا کر رفع کر سکتے ہیں جنہیں اس کے لیے آئینی اختیارات حاصل ہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ اس مقابلہ میں اکیلے اکیلے مزدوروں کیلئے کامیاب ہونے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ سب کے سب سر جوڑ بیٹھیں، اور متحد ہو کر آقا کے سامنے جائیں جہاں تک آقا کا تعلق ہے، یہ حضرت تو پہلے ہی جس صنعت یا تجارت کے مالک ہیں اس کے کلی مفاد اپنی ذات واحد میں لپٹے بیٹھے ہیں۔

اس طرح سے ٹریڈ یونینس کاروباری زندگی میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے، اس احساس کو راسخ کرنے کے لیے، نیز عملی نتائج کا راستہ صاف کرنے کی خاطر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ٹریڈ یونینوں کا یہ اثر اس مخاصمت کو دور کرتا ہے جس سے عوام میں ہمیشہ بے چینی اور شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اگر ٹریڈ یونینز یہ اشد ضروری منصب پورا نہیں کر رہیں تو اس کا گناہ ان لوگوں کے سر پر ہے جو معاشرتی اصلاح کے لیے قانونی کارروائی کرنے کے راستہ میں حائل ہوئے، یا جنہوں نے اپنے سیاسی رسوخ سے کام لیتے ہوئے ایسی اصلاح کو کالعدم بنا دیا۔

سیاست میں حصہ لینے والے سرمایہ داروں کو ٹریڈ یونینوں کی اہمیت کا احساس نہ ہوا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس اہمیت کا احساس کرنا چاہتے ہی نہ تھے چنانچہ اس غلطی سے اشتراکیوں کو جو موقعہ ہاتھ آیا انہوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور وہ مزدوروں کی تحریک کے واحد ٹھیکیدار بن بیٹھے۔ ان سرمایہ داروں نے اس پر بھی کوئی حیل وحجت نہ کی۔

کمیونسٹ دھوکہ باز ہیں

اس ترکیب سے اشتراکیوں نے گویا اپنے لیے ایک فولادی حصار تعمیر کر لیا۔ جب کبھی صورت حالات نازک ہوتی وہ اسی کی آڑ لے بیٹھتے۔ غرض تحریک کا اصل مطلب فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ نئی نئی متقصد آرائیاں ہونے لگیں اشتراکیوں کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ ٹریڈ یونینوں کے بنیادی نصب العین کے لیے جان کھپاتے پھرتے انہوں نے تو اوپر سے لے کر نیچے تک تمام تحریک پر مزے سے قبضہ جما لیا اور لگے اسے اپنی سیاسی مطلب برآریوں کے لیے استعمال کرنے۔

اشتراکیوں کے تجربہ کار ہاتھوں نے چند ہی سال میں ٹریڈ یونین تحریک کی کایا پلٹ کر رکھ دی جو نظام انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑا کیا گیا تھا اسے انہوں نے قوم کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ اپنی اس غرض کو پورا کرتے ہوئے انہوں نے مزدوروں کے مفاد کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی سیاسیات میں قاعدہ ہے کہ اگر ایک فریق پوری بے اصولی سے کام لے اور دوسرا فریق بے حس وحرکت ہو کر بے چارگی کے مخمصہ میں پھنسا رہے تو اقتصادی دباؤ ڈالنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ یہاں دونوں شرطیں پوری

تھیں۔

کمیونسٹ مزدور کو استعمال کرتے ہیں

موجودہ صدر کی ابتداء سے پہلے ہی ٹریڈ یونین تحریک اس مقصد کو فراموش کر چکی تھی جس کی خاطر اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی سال بسال اس تحریک میں اشتراکیوں کا نفوذ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس طبقاتی جنگ میں اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چال یہ تھی کہ بار بار حملے کر کے اس اقتصادی نظام کو فنا کر دیا جائے جو انسان نے اتنی محنت اور طویل مدت کے بعد کھڑا کیا ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ مطلب حاصل ہو جائے تو حکومت خود بخود برباد ہو جائے گی کیونکہ اس کی اقتصادی بنیادیں تو پہلے ہی کھوکھلی کی جا چکی ہوں گی مزدوروں کے حقیقی مفاد کی جانب اشتراکی روز بروز کم توجہ دینے لگے۔ حتیٰ کہ انکے عیار لیڈروں نے بھانپ لیا کہ اگر عامۃ الناس کے معاشرتی اور تمدنی مطالبات معرض بے توجہی میں ہی پڑے رہیں تو یہ امر خود ان کی فوری سیاسی اغراض کے لیے زیادہ مفید رہے گا۔ ورنہ اگر عامۃ الناس مطمئن ہو گئے تو پھر انہیں مجردسیاسی کشمکش کے لیے آلہ کار بننے میں کیا دلچسپی رہے گی۔

جب طبقاتی جنگ کے سرغنے عامۃ الناس کی بے چینی دور ہو جانے کا تصور کرتے تھے تو ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا تھا اس حربہ جنگ کا ہاتھ سے کھونا انہیں ایسا ناگوار تھا کہ وہ چھوٹی موٹی معاشرتی اصلاحات کی بھی مخالفت کرنے لگے حالات ایسے تھے کہ انہیں اپنی ان متضاد حرکات کو بجا ٹھہرانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

عامۃ الناس کو یہ پٹی پڑھائی گئی کہ وہ اپنے مطالبات کی تعداد اور انتہا دونوں میں اضافہ کرتے جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان مطالبات کو قبول کیے جانے کے امکانات کم سے کم تر ہوتے گئے۔ جو تھوڑی بہت اصلاحات نافذ کی جاتی تھیں وہ نظروں میں نہ جچتی تھیں ان حالات میں چاہے کسی قانون کے ذریعہ مزدوروں کے اہم ترین مطالبات تسلیم کیے جا رہے ہوں عامۃ الناس کو یہ منوانا نہایت آسان تھا کہ یہ تو ایک مضحکہ خیز اقدام ہے اس

شیطانی چال کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے جوش جہاد کو بغیر کسی شور وشر کے کمزور کر دیا جائے اور ممکن ہو تو ٹھنڈا ہی کر دیا جائے۔ اگر اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے کہ عامۃ الناس میں سوچنے سمجھنے کی استعداد کس قدر تھوڑی ہوتی ہے تو پھر ان الزامات کو جو کامیابی ہوئی اس پر کوئی تعجب محسوس نہیں ہوتا۔

سرمایہ دار مفلوج ہیں

سرمایہ دار اشتراکیوں کی غیر دیانتدارانہ چالوں سے سخت ناراض تھے لیکن وہ کسی عملی نتیجہ پر نہ پہنچتے تھے اور نہ ہی کوئی جوابی حملہ کرتے تھے حالانکہ جس طرح اشتراکی، مزدوروں کی زبوں حالی کی اصلاح سے گھبراتے تھے اس سے سرمایہ داروں کو سبق لینا چاہیے تھا اور اصلاحات میں ایسی سرگرمی دکھانی چاہیے تھی جس سے اشتراکیوں کا سب سے زبردست حربہ بیکار رہ جاتا لیکن ایسا کوئی اقدام نہ کیا گیا۔

سرمایہ دار اپنے مخالفوں پر پہلے حملہ کرنے کی بجائے خود ہی دبتے اور حیران ہوتے رہے۔ آخر کار انہوں نے کچھ قانون بنائے بھی تو وہ ایسے بعد از وقت اور بے معنی تھے کہ بالکل بے اثر ثابت ہوئے اور رد کر دیئے گئے غرض سرمایہ داروں کی مداخلت سے صورت حالات میں کچھ فرق نہ آیا ہاں بے چینی ور بھی بڑھ گئی۔

کمیونسٹوں کا لٹریچر ابلہ فریبی کا شاہکار ہے

فضائے سیاست اور انفرادی زندگی دونوں پر آزاد ٹریڈ یونینس چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں قوم کی اقتصادی آزادی، حکومت کی بنیادیں اور افراد کی حریت سب کو یہی زبردست اور بھیانک خطرہ درپیش تھا۔ یہی آزاد ٹریڈ یونینس تھیں جنہوں نے حریت کے نصب العین کی توہین کی اور جنہوں نے اخوت کے نام کو یہ نعرہ بلند کر کے بٹہ لگایا کہ ”اگر تمہیں ہمارا رفیق بننا منظور نہیں تو ہم تمہاری کھوپڑی پھوڑ دیں گے۔“

یوں مجھے ان حامیان بنی آدم سے تعارف حاصل ہوا۔ جوں جوں سال گزرتے گئے میرا اشتراکیت کا مطالعہ وسیع سے وسیع اور گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ لیکن جہاں تک

اس مسئلہ کی بابت میری بنیادی رائے کا تعلق ہے اس میں سر مو فرق نہ آیا۔

اشتراکیت کے ظاہری آثار کے متعلق جتنی میری واقفیت بڑھتی تھی اتنا ہی مجھے اسکے عقائد کی داخلی اصلیت معلوم کرنے کا زیادہ شوق ہوتا۔

خود اشتراکی پارٹی کی جانب سے جو کتابیں چھپتی تھیں وہ اس مقصد کے لیے کچھ زیادہ کارآمد نہ تھیں اقتصادی مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان کے بیانات جھوٹے اور ثبوت ناقص ہوتے تھے سیاسی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی روش مبنی بر اخلاص نہ تھی مزید بریں دوران استدلال میں ان لوگوں کے ٹال مٹول کے نت نئے طریقے میرے اندر گہری نفرت پیدا کرتے تھے انہیں دعویٰ تھا کہ ان کی موہوم عبارتیں، طمطراق والے فقرے اور ناقابل فہم ترکیبیں عظیم الشان خیالات کی حامل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ نہ ان کا کوئی مطلب ہوتا تھا نہ معنی۔ اس خلل دماغ کی بھول بھلیاں کو سمجھنا بھی کسی ایسے شخص کا کام تھا جو عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں رہتے رہتے ایک تنزل پذیر لکھنوی بن چکا ہو، تاکہ اس اینچ پینچ کلام کی سڑاند سے اسے ''واردات قلب'' سننے کی خوشبو آئے۔ ظاہر تھا کہ یہ مصنف ہماری قوم کے اس سادہ لوح گروہ کو تاک چکے ہیں جنہیں خیال ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جس کی کوئی بات سمجھ نہ آئے ضرور کوئی مہاپرش ہوگا۔

جب میں نے اس عقیدہ کی اصولی ناراستی اور بیہودگی کا مقابلہ اس کے مظاہر کی ٹھوس طاقت سے کیا تو بتدریج اس کے حقیقی مقاصد مجھ پر کھلنے لگے۔

اشتراکیت کی جڑ یہودی ہیں

انکشاف کے ان لمحات میں مجھے احساس ہوتا تھا کہ اس سازش کی تہ میں ضرور کوئی بھیانک راز کام کر رہا ہے میں کسی شیطانی ہاتھ کا تصور کر کے خائف ہو جاتا تھا میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا مذہب تھا جو خود غرضی اور نفرت کی پیداوار تھا اس کا طریق کار ایسا سوچ سمجھ کر تیار کیا گیا تھا کہ اس کی کامیابی سولہ آنے یقینی تھی لیکن اس کا تسلط نسل انسانی کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا دوسرا نام ہوگا۔

اشتراکیت کی داخلی ماہیت اور اس کے حقیقی مقاصد صرف قوم یہود کی اصلیت پہچان کر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

جس شخص نے بنی اسرائیل کی نسل کو جان لیا اس نے گویا اپنی آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹا دیا جس سے اشتراکیت کی حقیقت اور مقاصد ایک غلط رنگ میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت معاشرتی چیخ و پکار کی تاریکی اور دھند دور ہو کر مارکس ازم کا دیو دانت نکالے صاف سامنے نظر آجاتا ہے۔

یہودیوں سے میری شناسائی

آج میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے بلکہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ''یہودی'' کا لفظ پہلے پہل کب میرے ذہن میں کسی خاص تصور کا محرک ہونے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے گھر پر ابا کی زندگی میں کبھی یہ لفظ نہ سنا تھا۔ ابا پرانی طرز کے وضع دار آدمی تھے اگر ان کے سامنے کبھی یہ نام ہتک آمیز معنوں میں استعمال کیا جاتا تو وہ ضرور ایسا کرنے والے کو غیر تعلیم یافتہ اور رجعت پسند قرار دیتے۔ وہ اپنے دوران زندگی میں کم و بیش صلح کل بن چکے تھے۔ ہاں قومی معاملات میں وہ کٹر تھے اور اس کا مجھ پر بھی اثر ہوا دنیا کا جو نقشہ گھر میں میرے ذہن نشین کرایا گیا تھا وہ مجھے اسکول جا کر بھی تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت درپیش نہ آئی۔

مکتب میں ضرور میں نے ایک یہودی لڑکا دیکھا تھا ہم سب اس سے بچ کر رہتے تھے اس کی وجہ بھی صرف یہ تھی کہ اس کی کم گوئی اور بعض دوسری حرکات سے ہمیں ذرا ہوشیار رہنے کا خیال پیدا ہوا اس سے آگے میں نے یا میرے ہم جماعتوں نے اس سے متعلق کوئی خاص رائے قائم نہیں کی۔

میں چودہ پندرہ برس کا ہوں گا جب سیاسیات پر بحث کے دوران میں ''یہودی'' کا لفظ بار بار میرے کانوں میں پڑنے لگا اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا میں ان تلمیحات کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا تھا کیونکہ مذہبی بکھیڑوں سے میری طبیعت ہمیشہ

سے الجھتی ہے ان دنوں مجھے یہودیوں کے متعلق اس کے سوا اور کوئی خیال نہ تھا۔

لنز میں یہودی برائے نام تھے اور جو تھے انہوں نے صدیاں یہیں گزاری تھیں اس مدت مدید میں ان کی ظاہری شکل و شباہت پر یورپ کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ دیکھنے میں وہ بالکل دوسرے انسانوں کی طرح نظر آتے تھے حتیٰ کہ میں انہیں جرمن خیال کرتا تھا اس وقت مجھے یوں اپنے زبردست مغالطہ کا احساس نہ ہوا کہ میں مذہب کے ظاہری فرق کے سوا یہودیوں کے اور ہمارے مابین اور کوئی فرق نہ سمجھا تھا میرا خیال تھا کہ ان غریبوں کو صرف ان کے مذہب کی بنا پر تنگ کیا جاتا ہے اسی لیے پہلے تو میں ان کے بر خلاف باتوں کو ناپسند ہی کیا کرتا تھا لیکن پھر مجھے اس حرکت سے گھن سی آنے لگی مجھے کبھی فہم بھی نہ آیا تھا کہ بنی سام کی مخالفت کو ایک باقاعدہ مہم کی شکل دی جا سکتی ہے۔

میرے یہ خیالات تھے کہ میں وائنا آ گیا۔

جب میں پہلے پہل آیا تو یہاں کی عمارتیں دیکھ کر مجھ پر تاثرات کا کچھ ایسا ہجوم ہوا کہ میں گھبرا سا گیا۔ علاوہ ازیں مجھے جو مصیبتیں درپیش تھیں ان سے بھی دل بیٹھا جاتا تھا۔ غرض اس وسیع شہر میں جو بھانت بھانت کے باشندے بس رہے تھے مجھے ان کے مختلف تمدنی حلقوں میں تمیز کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ اس وقت وائنا کی بیس لاکھ آبادی میں سے دو لاکھ یہودی تھے لیکن مجھے کبھی ان کی جانب توجہ دینے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ میرے قیام کے شروع کے چند ہفتوں میں تو میری آنکھیں اور میرا ذہن نئے خیالات کے اُمڈتے ہوئے سیلاب سے ہی نپٹ نہ سکے۔ پھر بتدریج جب میں اپنے ماحول سے مانوس ہو گیا اور خیالات کی الجھن میں ترتیب آئی تو مجھے اپنی نئی دنیا میں برے بھلے کی تمیز کرنے کا بھی موقعہ ملا اسی سلسلہ میں یہود کا مسئلہ میرے سامنے آ گیا۔

میں پہلے یہودیوں کا دشمن نہ تھا

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے پہل جس طرح یہ مسئلہ میرے سامنے آیا اس سے مجھ پر کوئی خاص ناخوشگوار اثر ہوا۔ میں ابھی تک یہودیوں کے متعلق یہی خیال رکھتا تھا کہ

بس ان کا مذہب ہم سے مختلف ہے یہی وجہ تھی کہ جب ان پر کوئی حملہ کیا جاتا تھا تو میں سمجھتا تھا کہ اس کی بناء محض مذہبی اختلاف ہے، اور انسانی رواداری کا اصول مدنظر رکھتے ہوئے یہ حرکت مجھے ناپسند تھی وائنا کے جو اخبارات بنی سام کے خلاف لکھتے تھے میں ان کا طرز تحریر بھی ایک عظیم الشان قوم کی تمدنی روایات کے خلاف قرار دیتا تھا میرے حافظہ میں وہ مظالم تازہ ہو جاتے جو قرون وسطیٰ میں یہودیوں پر ڈھائے گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس قسم کے واقعات دہرائے جائیں بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ بنی سام کے خلاف لکھنے والے اخبارات صف اول کے اخبارات میں شامل نہ تھے ان دنوں مجھے اس کا سبب معلوم نہ تھا میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ان کی یہ روش حسد اور رقابت کا نتیجہ ہے مجھے کیا علم تھا کہ چاہے طرز عمل غیر دانشمندانہ ہی لیکن تہ میں خلوص کام کر رہا ہے۔

یہ دیکھ کر میری رائے اور پختہ ہوگئی کہ اعلیٰ درجہ کے اخبارات اس قسم کے حملوں کا جواب نہایت متانت سے دیتے، یا خاموشی سے ٹال جاتے۔ بالخصوص ایسے موقعہ پر خاموش رہنا تو میری نظر میں اصل ذی وقار ہستیوں کا طریق عمل تھا۔

کرایہ کے ٹٹو اخبارات

عالمگیر کہلانے والے اخبارات میں خاص توجہ سے مطالعہ کرتا۔ یہ اخبارات اپنے خریداروں کو جس قدر اطلاعات مہیا کرتے تھے اور جس غیر جانبدارانہ رویہ سے مختلف مسائل پر بحث کرتے تھے اس سے میں حیران رہ جاتا تھا میں ان کی سنجیدہ روش کا دلدادہ تھا لیکن طرز تحریر کا تصنع، مبالغہ اور ایچ پیچ مجھے پسند نہ تھے اس سے دل میں شک پیدا ہوتا تھا تاہم میرا خیال تھا کہ یہ سب کمزوریاں اس جگت راجدھانی کے غالب اثر کا نتیجہ ہیں۔

ان دنوں ان اخبارات کی لغزشوں سے درگزر کرنے کے لیے میں یہی وجہ کافی سمجھتا تھا کہ وائنا مجھے ایک جگت راجدھانی نظر آتا تھا ہاں وائنا کے اخبارات شاہی دربار کے قدموں پر لوٹنے میں جس ذلت کا مظاہرہ کرتے تھے اس سے اکثر مجھے نفرت پیدا

ہوتی۔ ہاف برگ کے محل میں کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی ہوتو اسے بڑھا چڑھا کر ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا تھا یہ ایک احمقانہ حرکت تھی بالخصوص جب اس مدح و توصیف کا موضوع دنیا کا وہ "سب سے عقلمند بادشاہ" ہوتا تھا "جس کی نظیر روز ازل سے لے کر آج تک پیدا نہیں ہوئی" تو مجھے اس پہاڑی مرغے کی چک پھیریاں یاد آجاتی تھیں جو بوقت معاشقہ اپنی شریک زندگی کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے۔ ان لایعنی قصیدوں کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تھی میں سوچا کرتا تھا کہ ایسا مسلک آزاد جمہوریت کے نصب العین پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہے میں شاہی دربار کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہ طریقہ قومی تمکنت کے منافی سمجھتا تھا۔ میں وائنا کے عظیم الشان عالمگیر اخبارات سے یوں تو رغبت رکھتا تھا لیکن ان کی یہ ایک حرکت مجھے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔

وائنا پہنچ کر جرمنی کے سیاسی اور تمدنی کوائف سے میری دلچسپی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب میں جرمنی کی نو اقبال سلطنت کے عروج کا مقابلہ آسٹریا کے زوال سے کرتا تو مجھے بے اختیار فخر محسوس ہوتا اور تعریف کرنے کو جی چاہتا اگرچہ جرمنی کی خارجی پالیسی دل خوش کر دیتی تھی لیکن اندرون ملک کے سیاسی حالات ہمیشہ ایسے قابل اطمینان نہ ہوتے تھے ان دنوں ولیم ثانی کے خلاف جو مہم جاری تھی وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی میری نگاہ میں ولیم فقط قیصر ہی نہ تھا، بلکہ جرمنی کا بحری بیڑا قائم کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر تھا قیصر جرمنی کو وہاں کی پارلیمنٹ میں تقریر کرنے کی ممانعت کی گئی تو مجھے سخت غصہ آیا کیونکہ جن لوگوں نے یہ ممانعت کی وہ میرے نزدیک کوئی ایسا اختیار نہ رکھتے تھے یہ پارلیمنٹری مرغے ایک ہی نشست میں کڑک مرغیوں کی طرح اتنا بیہودہ شور وغل بپا کرتے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کمزور سے کمزور بادشاہ بلکہ پورے شاہی خاندان کی صدیوں کی فرو گزاشتیں بھی ہیچ نظر آتی تھیں۔

خوشامدیوں کی صحافت

میں اس قوم کی حالت دیکھ دیکھ کر جلا جاتا تھا جہاں ہر دیوانے کو حق حاصل تھا کہ وہ

نکتہ چینی کرتا پھرے کئی پاگل پارلیمنٹ میں ''قانون ساز'' بن کر رعایا کا گلا کاٹتے تھے بلکہ خود پارلیمنٹ نامعقولوں کی ایک بے نظیر مجلس تھی اور پھر کمال یہ ہے کہ ایسی پارلیمنٹ تاجدار سلطنت کو سرزنش کی جرات کرے۔

مجھے وائنا کے اخبارات کی ایک حرکت دیکھ کر اس سے بھی زیادہ نفرت محسوس ہوتی تھی یہ اخبارات شاہی اصطبل کے ذلے ترین خچر کے سامنے بھی زمین بوس ہو کر کورنش بجالاتے رہتے اور اگر کہیں ٹٹو میاں نے جواب میں دم ہلا دی پھر تو بس انہیں وجد ہوتا جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ یہ اخبارات ہر اس معاملہ میں تشویش کا اظہار کرتے رہتے جس کا تعلق قیصر جرمنی سے ہو۔ اس طرح وہ ایک سنجیدہ ناصح کا چولا اوڑھ کر اپنی دشمنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے لیکن میری آنکھوں کے لیے یہ پردہ ناکافی تھا وہ منہ بنا بنا کر دعویٰ کرتے تھے کہ ''جرمنی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی ہرگز ہمارا مقصود نہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہمیں ایسا خیال پیدا ہو'' ان کا ایک بہانہ یہ بھی تھا کہ وہ نازک مسائل کو محض اس لیے چھیڑتے ہیں تاکہ آسٹریا اور جرمنی کے باہم حلیف ہونے کی وجہ سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ ادا ہو جائیں اور صحافتی راست بیانی کا معیار قائم رہے ہمارے زخموں کو چھپکے سے نکا کرنے کا یہ عذر تراش کر پھر وہ خوب نمک پاشی کرتے تھے۔

ان حرکتوں سے میرا خون کھولنے لگتا تھا الغرض اب میں وائنا کے مشہور اخبارات پڑھتے ہوئے روز بروز زیادہ محتاط رہنے لگا۔

مجھے یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ایسے موقعوں پر ایک بنی سام کا مخالف اخبار مقابلاً تاً زیادہ شائستگی کا ثبوت دیتا تھا۔

اخباری رواداری سے میری بیزاری

وائنا کے مشہور اخبارات میں جس نفرت انگیز انداز سے فرانس کی ثنا خوانی کرتے تھے اس سے میں اور بھی برہم رہنے لگا اس مزعومہ ''گہوارہ تمدن'' کی مدح میں جو فصیح و بلیغ

قصیدے لکھے جاتے تھے انہیں پڑھنے سے واقعی اپنے جرمن ہونے پر شرم آنے لگتی تھی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ یہ عالمگیر اخبارات عشق فرانس کے جس ذلیل جذبہ سے ملوث تھے اس سے تنگ آ کر میں نے انہیں پڑھتے پڑھتے پرے پھینک دیا اب میں اکثر اس مذکورہ بالا بنی سام کے مخالف اخبار کا مطالعہ کرتا تھا جو اگرچہ حجم میں چھوٹا تھا لیکن ایسے مسائل سبتاً زیادہ شائستگی سے بیان کرتا تھا میں اس کا یہودیوں کے خلاف زہر اگلنا پسند تو نہ کرتا تھا لیکن بار بار مجھے احساس ہونے لگا کہ اس کے دلائل پوری توجہ اور غور کے مستحق ہیں۔

بہر صورت یہ اس اخبار کے مطالعہ کا اثر تھا کہ مجھے اس شخص اور اس تحریک سے پوری واقفیت حاصل ہوئی جو ان دنوں وائنا کی قسمت کے مالک تھے یہ شخص ڈاکٹر کارل لوئجر تھا اور اس تحریک کا نام کرسچین سوشلسٹ تحریک تھا میں پہلے پہل وائنا آیا تو مجھے ہر دو سے اختلاف محسوس ہوا میرا خیال تھا کہ ایسا شخص اور ایسی تحریک دونوں رجعت پسند کہلانے کے مستحق ہیں۔

جب میں نے اس شخص اور اس کے کام کو بغور دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھ میں رتی بھر بھی انصاف ہے تو مجھے اپنی رائے تبدیل کر لینی چاہیے غرض میں نے پہلے سے زیادہ مستحکم دلائل کی بناء پر نظر ثانی کی تو آہستہ آہستہ میرا پہلا خیال بدل گیا اور میں کھلے بندوں ان کی تعریف کرنے لگا اس کے بعد آج تک میں ڈاکٹر کارل لوئجر کو جرمن نظم و نسق کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں جب کرسچین سوشلسٹ تحریک کے متعلق میری رائے تبدیل ہو گئی تو اس سے میری کئی غلط فہمیاں خود بخود دور ہو گئیں۔

باوجودیکہ میری طبیعت بنی سام کی مخالفت کے متعلق اپنی پہلی روش تبدیل کرنے پر ہرگز مائل نہ ہوتی تھی لیکن آخر کار یہاں بھی میری رائے میں تغیر آیا اس فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجھے بدر جہا زیادہ شدید کشمکش میں سے گزرنا پڑا عقل جذبات پر غالب تو آ گئی لیکن کڑے مقابلے کے بعد دو سال کے بعد جذبات بھی عقل کی پیروی پر آمادہ ہو گئے اور جو فیصلہ عقل نے کیا تھا اس کے مشیر اور محافظ کا کام دینے لگے۔

جب میرے اندر یہ کشمکش جاری تھی جس میں ایک طرف تو عقل تھی اور دوسری طرف وہ جذبات جو میرے طریق پرورش کا نتیجہ تھے ان دنوں مجھے وہ تجربات خوب کام آئے جو میں نے وائنا کی سڑکوں پر حاصل کیے تھے پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں پہلے کی طرح اس عظیم الشان شہر میں آنکھیں میچ کر نہ چلتا تھا بلکہ عمارات کے ساتھ ساتھ انسانوں کا مشاہدہ بھی کرتا تھا۔

مجھے مسئلہ صیہونیت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے

ایک روز میں اندرون شہر میں سے گزر رہا تھا کہ یکا یک میرا سامنا ایک ایسی مخلوق سے ہوا جس نے ایک لمبی عبا پہن رکھی تھی اور جس کے چہرے کی دونوں جانب سیاہ زلفیں لٹک رہی تھیں میرے دل میں معاً سوال پیدا ہوا کیا یہ یہودی ہے؟ یقیناً لنز میں تو ایسا لباس پہن کر باہر نہ نکلا کرتے تھے میں نظر بچا کر چپکے چپکے اس آدمی کو دیکھتا رہا جتنا میں اس کے نرالے چہرے پر نظر جما کر دیکھتا تھا اور جتنا میں اس کے خدوخال کا مطالعہ کرتا تھا اتنا ہی میرے دل میں شک پیدا ہوتا کہ کیا ایسا شخص بھی جرمن کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے!

میری ہمیشہ سے عادت تھی کہ میں اس قسم کے سوالات کا حل کتابوں میں تلاش کیا کرتا تھا چنانچہ اس مسئلہ کے لیے بھی میں نے یہی راستہ اختیار کیا اپنی عمر میں پہلی مرتبہ میں نے چند پیسے خرچ کرکے بنی سام کے خلاف پمفلٹ خریدے لیکن بدقسمتی سے ان سب رسالوں میں شروع سے ہی پڑھنے والے کو مسئلہ یہود کا واقف فرض کرلیا جاتا تھا اور اتنی بھی تکلیف گوارا نہ کی جاتی تھی کہ اسے یہ تو بتا دیا جائے کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ علاوہ ازیں ان پمفلٹوں کا طرز تحریر ایسا تھا جس سے میں از سر نو تذبذب میں پڑ گیا ان کے دعوے سطحی اور ثبوت غیر علمی تھے ہفتوں بلکہ مہینوں تک کے لیے میں دوبارہ اپنے پرانے خیالات پر واپس آ گیا یہ موضوع ایسا بے ڈھب تھا اور الزامات کا اثر اتنی دور تک پہنچتا تھا کہ میں کسی غیر منصفانہ نتیجہ سے محفوظ رہنا چاہتا تھا میں پھر پہلے کی طرح متفکر اور

مذبذب رہنے لگا۔

اب مجھے اس بات میں تو کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہاں محض خالی مذہبی اختلاف کا سوال نہیں بلکہ ایک علیحدہ قوم کا مسئلہ درپیش ہے جونہی میں نے اس معاملہ میں تحقیق شروع کی میرے دماغ میں وائنا کا جو نقشہ قائم تھا اس کا رنگ ہی بدلنے لگا اب میں جہاں کہیں جاتا میری نظر یہودیوں پر بالخصوص پڑتی تھی جتنا میں ان کا معائنہ کرتا تنا ہی مجھ پر واضح ہوتا جاتا کہ وہ دوسرے شہریوں سے قطعاً علیحدہ اور ایک مختلف قوم ہیں۔ بالخصوص اندرون شہر اور ڈینوب کی نہر کے شمالی مضافات میں تو ایسے لوگوں کی بھر مار تھی جو ظاہری شکل وصورت میں بھی جرمنوں سے کوئی مماثلت نہ رکھتے تھے۔

اگر اس حقیقت میں مجھے کوئی تھوڑا بہت شک باقی تھا تو وہ خود یہودیوں کے ایک گروہ کی حرکات نے دور کر دیا انہوں نے تحریک صیہونیت کے نام سے ایک عظیم الشان تحریک اٹھائی جس کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومیت پر زور دیا جائے اس تحریک کی وائنا میں ایک زبردست شاخ تھی۔

بظاہر تو یہ نظر آتا تھا کہ صرف یہودیوں کا ایک گروہ اس تحریک کا حامی ہے اور غالب اکثریت کو کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اس کے منکر ہیں لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ دکھاوے کا تغافل جان بوجھ کر اور محض دھوکہ میں ڈالنے کی نیت سے ہے۔

یہ ظاہرداری کا پردہ ان عقائد کے حجاب کے نتیجہ تھا جو اگر مغالطہ دینے کی صریح نیت سے نہیں تو فقط کام نکالنے کی غرض سے گھڑے گئے تھے میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ جو یہودی آزاد خیال کہلاتے تھے وہ بھی تحریک صیہونیت والوں کو اپنی نسل سے خارج قرار نہ دیتے تھے بلکہ کہتے تھ کہ ہیں تو یہ بھی ہمارے یہودی بھائی لیکن جس طرح یہ اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں اس سے کامیابی نہ ہوگی الٹا یہودیوں کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

الغرض ان کے باہمی اتحاد میں کوئی کسر نہ تھی۔

میں جلد ہی تحریک صیہونیت والے یہودیوں اور آزاد خیال یہودیوں کی اس جنگ زرگری سے متنفر ہو گیا۔ وجہ یہ کہ ان کا سارا اختلاف بناوٹ کا تھا یہودی جس اخلاقی وقار اور بے داغ قومی سیرت پر ناز کیا کرتے تھے اس قسم کی چالبازیاں اس کے بالکل برعکس تھیں۔

یہودی طاعون کے چلتے پھرتے جراثیم ہیں

ان کے ہاں اخلاقی اور جسمانی دونوں قسم کی طہارت کے کچھ اور ہی معنی رائج تھے اتنا تو ان کی شکل سے ہی نظر آ جاتا تھا کہ وہ پانی کے نزدیک جانے سے بھی ڈرتے ہیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ بعض اوقات ان کی شکل دیکھے بغیر بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی تھی اس عباؤں والی قوم کے جسم سے جو بدبو کے لپٹے نکلتے ہیں ان سے بارہا میری طبیعت متلی کرنے لگتی تھی علاوہ ازیں ان کے لباس سے پھوہڑ پن اور صورتوں سے رسوائی ٹپکتی تھی۔

یہ سارا حلیہ کچھ ایسا دلفریب نہیں لیکن اس سے بھی زیادہ برگشتہ کرنے والی بات یہ تھی کہ اس غلاظت کے تودے کے نیچے سے یکا یک وہ اخلاق خبیثہ کا کیڑا رینگتا ہوا سامنے آ جاتا تھا جو اس ''برگزیدہ قوم'' کا خاصہ ہے۔

زندگی کے بعض شعبوں میں یہودیوں کی کرتوتیں ابھی تک میرے لیے سربستہ راز تھیں مجھے آج تک ان کا کھوج لگانے کا موقعہ نہ ہوا تھا اب مجھے پتہ چلا کہ ان کارروائیوں کی اہمیت پوری توجہ کی متقاضی ہے کوئی سازش اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس میں کم از کم کسی ایک یہودی کا ہاتھ نہ ہو بالخصوص تمدنی عیوب کے متعلق تو یہ قاعدہ کلیہ اور بھی سچا ثابت ہوا۔ جب کبھی اس قسم کے پھوڑے پھنسیوں کو نشتر سے بغور کریدا جاتا تو جس طرح متعفن زخم میں ہمیشہ کرم ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی ذلیل یہودی نکلتا تھا جو اپنے یوں غیر متوقع طور پر افشاء ہو جانے سے ایک طرح بوکھلا کر رہ جاتا۔

جونہی میں نے ناٹک آرٹ لٹریچر اور اخبارات میں یہودیوں کی کرتوتوں کا پتہ چلا لیا اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ ان کے خلاف فرد جرم نہایت سنگین ہے اب میری نگاہ میں ان کی تمام چکنی چپڑی عذرداریاں کم وبیش فضول تھیں کسی شخص کو مسئلہ یہود میں ہمیشہ کے لیے کٹر بنا دینے کی خاطر یہی کافی تھا کہ وہ ایک دفعہ ان اشتہارات پر نظر ڈال لے جن میں سینما اور تھیٹر کے گھناؤنے خوان دعوت کا اعلان کیا جاتا ہے پھر ان مصنفین کے نام بھی پڑھ لے جن کی اس کوچہ میں دھوم مچی ہے مجھے یقین ہوگیا کہ یہود ایک طاعون ہیں ایک ایسا اخلاقی طاعون جس کے جراثیم عامۃ الناس میں وبا پھیلا رہے ہیں یہ طاعون اس عالمگیر اس سیاہ طاعون سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس نے آج سے صدیوں پہلے ساری دنیا میں تباہی مچا دی تھی میں یہ دیکھ کر گھلا جاتا تھا کہ اس طاعون کا زہر دن دونی رات چوگنی ترقی سے پھیلایا جارہا ہے یہ کچھ قدرتی بات ہے کہ اس قسم کے آرٹ کے مصنف اخلاقی اور ذہنی لحاظ سے جتنے پست ہوں اتنے ہی ان کے فن کے نمونے لاتعداد ہوتے ہیں بعض اوقات تو ان کمینوں کا حوصلہ یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ غلاظت کی پچکاری لے کر اپنی گندگی براہ راست دوسرے لوگوں کے منہ پر اچھالنے لگتے ہیں اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے اشخاص شمار میں ہمیشہ بکثرت پائے جاتے ہیں ہمیشہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فطرت جہاں ایک گوئٹے کو عالم وجود میں لاتی ہے اس کے مقابلہ میں مذکورہ وضع کے دس ہزار ٹھگ بھی پیدا کرتی ہے جو قلوب انسانی میں زہر پھیلانے کے لیے اخلاقی افعی کا کام دیتے ہیں اگرچہ یہ ایک ہولناک حقیقت ہے لیکن اس قسم کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ بظاہر قدرت نے بیشتر یہودیوں کو انہیں شرمناک کرتوتوں کے لیے پیدا کیا ہے۔

کیا یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو "برگزیدہ قوم کہنا چاہیے۔"

یہودی مار آستین ہیں

اب عام ثقافتی زندگی میں اس قسم کے من گھڑت اور ناپاک فنی نمونے پیش

کرنیوالوں کے نام پوری توجہ سے تحقیق کرنے لگا۔ اس تحقیق کے نتائج میری اس روش کی مزید تر دید کرتے تھے جو میں نے آج تک یہود کے متعلق اختیار کر رکھی تھی آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے دل کو کیسا ہی ناگوار کیوں نہ ہو آئندہ عقل اپنے نتائج خود اخذ کرنے کے لیے آزاد ہو گی۔

کیا وجہ ہے کہ دس میں سے نو حصے فحش کتابیں رکیک آرٹ اور عامیانہ ناٹک وہ قوم تصنیف کرتی ہے جس کی تعداد اس ملک میں ایک فیصدی بھی نہیں مذکورہ حقائق واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور واقعات کو کون جھٹلا سکتا ہے اصلیت جب خود سامنے آجائے تو اسے تعلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اب میں نے اسی حقیقت کی روشنی میں اپنے مرغوب طبع عالمگیر اخبارات کی بھی چھان بین شروع کی۔

میری نگاہ جتنی گہری جاتی اتنی ہی میرے دل میں ان اخبارات کی وقعت کم ہوئی جاتی جن کی میں پہلے تعریف کیا کرتا تھا ان کی طرز تحریر سے میری نفرت اور بھی بڑھ گئی میں ان کے عقائد کو سطحی اور بے بنیاد قرار دے کر ترک کر دینے کے لیے مجبور ہو گیا میری وہ پہلی رائے اب مجھے غلط نظر آنے لگی کہ ان کی اطلاعات اور محاک غیر جانبدار ہوتا ہے مجھے علم ہو چکا تھا کہ ان کے لکھنے والے یہودی ہیں۔

ہزارہا تفصیلات جن پر پہلے کبھی میں نے دھیان بھی نہ دیا تھا اب مجھے توجہ کے قابل نظر آنے لگیں کئی باتیں پہلے میں اور ہی روشنی میں دیکھا کرتا تھا اب میں ان کی تہ تک پہنچنے لگا اور ان کا اصل مطلب سمجھنے لگا۔

اخبارات کی آزادگی کی روش مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آنے لگی مجھ پر واضح ہو گیا کہ ان کا بعض مخالفین کو متانت سے جواب دینا اور دوسروں کے مقابلہ میں چپ سادھ لینا محض ناظرین کو دھوکہ میں ڈالنے کی غرض سے ہے۔ ان کی یہ عیاری قابل نفرت تھی ناٹکوں پر ان کی تنقید شاندار ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں ہمیشہ جرمنوں کی مذمت اور یہودی مصنفین کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔

ولیم ثانی کے خلاف ہلکی ہلکی چوٹیں اور فرانسیسی تہذیب وتمدن کی باقاعدہ ثنا خوانی مستقل مضامین تھے ادب لطیف کا حصہ عامیانہ مضامین سے پر اور اکثر شہوانیات پر مشتمل ہوتا تھا بحیثیت مجموعی ان اخبارات کی زبان میں غیر ملکیوں کا لہجہ پایا جاتا تھا عام رو یہ یہ تھا کہ جرمنوں کی تذلیل کھلے بندوں کی جاتی تھی، اور یقیناً جان بوجھ کر کی جاتی تھی۔

آخر وہ کیا اغراض تھیں جن کی بنا پر وائنا کے اخبارات نے ایسی پالیسی اختیار کر رکھی تھی؟ جوں جوں میں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی میرا شک بڑھتا ہی گیا۔

یہودی بدی کا سرچشمہ ہیں

اس مرحلہ پر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ میں جلد ہی ایک نتیجہ پر پہنچ گیا وائنا کے مختلف حلقوں میں قدم بقدم جو مسلسل واقعات رو پذیر ہو رہے تھے ان سب کا اصل مقصد سمجھنے لگا یہ سب ریشہ دوانیاں اخلاق و آداب کے چند مخصوص عام اصولوں کا نتیجہ تھیں یہودیوں کا ایک گروہ کثیر ان اصولوں پر کھلے بندوں عمل پیرا تھا اور اس لیے یہ اصول اہل یہود سے منسوب کیے جا سکتے تھے یہاں پھر میں نے بازاروں میں جو مشاہدات کیے تھے وہ میرے کام آئے مجھے تحقیق ہو گیا کہ بدی درحقیقت ہے کیا؟

ہمارے معاشرتی نظام کا ایک شعبہ عصمت فروشی بھی ہے اس پیشہ میں اور سفید نسل کے بردے فروخت کرنے میں یہودی جو پارٹ ادا کرتے ہیں اس کا مطالعہ جس طرح وائنا میں کیا جا سکتا تھا غالباً جنوبی فرانس کی چند بندرگاہوں کو چھوڑتے ہوئے مغربی یورپ میں کسی اور جگہ نہیں کیا جا سکتا لیوپولڈسٹاٹ کے بازار میں رات کو چلتے وقت چاہے انسان تجسس کرے یا نہ کرے اسے ہر موڑ پر چند ناگفتنی واقعات کا مشاہدہ ہوتا تھا جرمن ان واقعات سے قطعاً لاعلم تھے ہاں جنگ عظیم کے دوران میں انہیں مشرقی محاذ پر ایسے مشاہدات کا موقعہ ملا موقعہ کیا ملنا تھا وہاں تو ایسے مشاہدات سے بچنا ہی ناممکن تھا۔

اب مجھے تحقیق ہوا کہ یہ وہی بے حیا، بے شرم اور بے رحم یہودی ہیں جو اس عظیم الشان شہر کے فواحشات سے نفع کمانے میں بھی اپنی مخصوص پختہ کاری کا اظہار کرتے ہیں پہلے پہل تو میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا میرا جسم ٹھنڈا ہو گیا پھر جب میں اپنے آپے میں آیا تو میرے غصہ کی آگ بھڑک چکی تھی۔

ہمیں گمراہ کرنے والے یہودی ہیں

اس کے بعد مجھے مسئلہ یہود پر ہر پہلو سے روشنی ڈالنے میں کوئی مزید توقف نہ تھا۔ نہیں نہیں۔ اب تو میں ایسا کرنے پر تل چکا تھا۔ الغرض میں نے آرٹ اور ثقافت کے مختلف حلقوں اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہر جگہ یہود کا تعاقب شروع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں یکایک میں نے انہیں ایک ایسی جگہ دیکھ پایا جہاں مجھے ان سے ملاقات کی کوئی توقع نہ تھی۔ آخر کار مجھ پر یہ راز کھل ہی گیا کہ اشتراکیت کے کرتا دھرتا سب یہودی ہیں۔ اس انکشاف کے بعد مجھے سوچ بچار سے نجات ملی۔ میری ذہنی کشمکش ختم ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے ساتھی مزدوروں سے تعلقات کے دوران میں یہ دیکھ کر اکثر متعجب ہوا کرتا تھا کہ وہ ایک ہی مسئلہ کے متعلق کس قدر جلد جلد رائے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی چند دنوں میں اور کبھی تو چند گھنٹوں میں ہی ان کے خیالات کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جو لوگ انفرادی حیثیت میں باہم بول چال کے وقت اچھے خاصے معقول نظر آتے ہیں۔ جوں ہی وہ جماعتی رنگ میں کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو کیوں ان کے ہوش مارے جاتے ہیں۔ ان کی کیفیت دیکھ کر ایک دفعہ تو انسان قریب قریب مایوس ہو جاتا تھا میں ان سے گھنٹوں جھگڑتا رہتا۔ اور جب میں بزعم خود انہیں ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو جاتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لیکن دوسرے روز میں کیا دیکھتا کہ میری ساری محنت اکارت جا چکی ہوتی تھی۔ یہ خیال کرنے سے دل بیٹھ جاتا کہ اب انہیں پھر از سر نو قائل کرنا ہو گا۔ وہ ہمیشہ کولہو کے بیل کی طرح اپنی احمقانہ رائے کی طرف

بار بار واپس لوٹ آتے تھے۔

یہودی ہماری فطرت مسخ کرنے پر مامور ہیں

آخر کار اب مجھے ان کی مجبوریاں سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ اپنی حالت زار سے بیزار تھے اور جب سختیوں سے تلملا اٹھتے تو قسمت کو کوسنا شروع کر دیتے تھے انہیں اپنے آقاؤں سے نفرت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ آقا انہیں اپنی زندگی کے دوزخ میں بمنزلہ عذاب کے بے رحم فرشتہ کے نظر آتا تھا۔ سرکاری افسروں کو وہ اکثر گالیاں سناتے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ یہ افسر مزدوروں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ اخراجات زندگی بڑھ جاتے تھے تو وہ تنگ آ کر عام مظاہرے کرنے لگتے تھے۔ اور حقوق کے مطالبہ کے لیے بازاروں میں جلوس نکالتے تھے یہاں تک ان غریب مزدوروں کی تمام حرکات کے لیے کچھ نہ کچھ معقول وجوہات موجود تھیں لیکن جو بات احاطہ فہم سے باہر تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے جیسے دوسرے شہریوں کے متعلق کیوں ایسی شدید نفرت رکھتے تھے۔ وہ خود اپنی قوم کی تذلیل کیوں کرتے تھے وہ اپنی قومی عظمت کا مضحکہ کیوں اڑاتے تھے وہ کیوں اپنی قومی تاریخ پر پھبتیاں کہتے تھے وہ کیوں اپنی قوم کے اعلیٰ ترین مشاہیر پر گندگی اچھالتے تھے۔

اپنے ایک خون اور ایک پوست کے بھائیوں سے، اپنی جنم بھومی سے، اور اپنے گھر بار سے، ان کی یہ منافرت جتنی خلاف عقل تھی اتنی ہی ناقابل فہم بھی تھی۔ ان کا یہ طرز عمل تقاضائے بشریت کے منافی تھا۔

یہ مرض عارضی طور پر دور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسی شفا چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی مہمان ہوتی تھی۔ اس کے بعد جن اشخاص کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ ان کو قائل معقول کر لیا ہے۔ وہ پھر پہلے جیسے ہو جاتے تھے یہ خلاف فطرت روگ انہیں از سر نو چمٹ جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ اشتراکی اخبارات بالعموم یہودیوں کے زیر اثر ہیں۔ اول

اول میں نے اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی ۔ کیونکہ دوسرے اخبارات کا بھی یہی حال تھا تاہم اس سلسلہ میں ایک بات قابل توجہ تھی وہ یہ کہ جن اخبارات پر یہودیوں کا تسلط تھا ان میں سے کسی کی پالیسی قومی نہ تھی اگر چند ایسے اخبارات بظاہر قومیت کا ڈھونگ رچاتے بھی تھے تو ان کے نزدیک قومیت کا مفہوم وہ نہ تھا جو میری تربیت اور عقائد نے میرے دل پر نقش کر دیا تھا۔

ہر فساد کی بنا یہودی ہیں

اگر چہ دل تو مائل نہ ہوتا تھا پھر بھی میں نے طبیعت پر جبر کر کے مارکس ازم کے حامی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین پڑھنے شروع کیے اس مطالعہ سے میری پہلی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب میں نے ان لوگوں کے متعلق تحقیق شروع کی جو ان شر آمیز تحریرات کو شائع کرتے تھے پبلشر سے لے کر نیچے تک وہ سب کے سب کیا چھوٹے یا بڑے، کل یہودی تھے۔ میں نے مارکس ازم کے لیڈروں کے ناموں پر غور کیا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کلھم اسی ''برگزیدہ قوم'' کے افراد ہیں شاہی وزارت میں اشتراکیوں کے نمائندوں اور ٹریڈ یونینوں کے سیکرٹریوں سے لے کر بازار میں شورش کرنے والوں تک ہر جگہ وہی منحوس صورت سامنے آتی تھی ۔ میں ان ناموں کی فہرست کبھی نہ بھولوں گا۔ آسٹرلٹز ، داود، ایڈلر، ایلن بوژن، وقس علی ہذا، ایک بات تو مجھ پر بالکل واضح ہو گئی ۔ وہ یہ کہ جس اشتراکی پارٹی کے ادنیٰ ادنیٰ نمائندوں سے میں مہینوں سے جھگڑتا آ رہا تھا۔ اس کی قیادت ایک غیر نسل کے ہاتھ میں ہے ۔ آخر کار جب مجھے تحقیق ہو گیا کہ یہودی ہم جرمنوں میں شامل نہیں تو میرا دل مسرت سے اٹڈ آیا۔

یوں انجام کار مجھے پتہ چل گیا کہ ہماری قوم کو گمراہ کرنے والی ارواح خبیثہ کون ہیں ۔ مجھے وائنا میں آئے ۔ ایک ہی سال گزرا ہو گا کہ مجھ پر حسب ذیل حقیقت روشن ہو گئی ۔ کوئی مزدور اپنے پہلے عقائد پر اس طرح راسخ نہیں ہوتا کہ اگر اس کے سامنے زیادہ واضح اور بہتر دلائل اور تشریحات پیش کی جائیں اور وہ پھر بھی اپنی ہٹ چھوڑنے

پر آمادہ نہ ہو۔ رفتہ رفتہ میں مارکس ازم کے اصولوں کا ماہر ہو گیا۔ اور اس مہارت کی مدد سے خود اپنے عقائد لوگوں کو منوانے کا کام لینے لگا۔ میں قریب قریب ہر موقعہ پر کامیاب ہوتا تھا۔ ''عامتہ الناس کی اکثریت کو ان اوہام باطلہ سے رہائی دلائی جاسکتی ہے۔لیکن اس کے لیے پورے صبر، اور وقت کی ضرورت ہے۔''

برخلاف اس کے ایک یہودی کے عقائد پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ اور کبھی مٹائے نہیں مٹتے۔

یہودی ہمیشہ یہودی رہتا ہے

ان دنوں میری سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ میں یہودیوں پر بھی ان کے عقائد کی بیہودگی ثابت کرنے میں کوشاں رہا کرتا تھا۔ اپنے محدود حلقہ میں اس مغز کھپاتے کھپاتے میرا گلا بیٹھ جاتا اور سر درد کرنے لگتا۔ میرا خیال تھا کہ میں بالآخر ان پر مارکس ازم کے وہ نقائص تو ضرور واضح کردوں گا جو اس کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن میری کوششوں کا نتیجہ اس کے بالکل الٹ ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جونہی ان پر مارکس ازم کے اصول اور اس کے عمل کے تباہ کن اثرات منکشف ہوتے تھے وہیں ان کی ہٹ دھرمی اور پختہ ہو جاتی تھی۔

جتنا مجھے یہودیوں سے بحث کرنے کا اتفاق ہوتا اتنا ہی میں ان کے منطقی حیلوں سے واقف ہوا جاتا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنے مد مقابل کی ناسمجھی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن پھر جب وہ خود ایسے الجھ جاتے کہ چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تو اس وقت وہ یہ چال چلتے کہ بالکل معصوم اور ناواقف بن بیٹھتے اگر باوجود منطقی چالبازیوں کے پھر بھی ناکامی ہوتو وہ یہ ظاہر کرتے کہ گویا مخالف کے دلائل ان کی سمجھ سے باہر ہیں اور اس طرح ایک نئی بحث چھیڑ دیتے۔ آغاز پیش پا افتادہ اور مانی ہوئی باتوں سے کیا جاتا۔ پھر جب انہیں تسلیم کرلیا جائے تو یکایک ان کا اطلاق ایسے مسائل و معاملات پر ہونے لگتا جن کا شروع کی گفتگو سے دور کا واسطہ بھی تلخ ہوتا تھا۔

اگر اس عجیب حرکت پر توجہ دلائی جائے تو وہ پھر بھاگ نکلتے تھے غرض انہیں کبھی کسی ایک معین اصول کا پابند کرنا ممکن نہ تھا۔ جونہی ان مبلغین کو کہیں ہاتھ میں مضبوط طور پر پکڑنے کی کوشش کی جاتی۔ وہ چھلاوے کی طرح پنجہ سے نکل جاتے اور پھر از سر نو خم ٹھونک کر سامنے آ کھڑے ہوتے۔ اگر پاس دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوں تو شرماشرمی تمہاری بات ماننی ہی پڑ جائے اور تمہیں خیال ہو جائے کہ بس میدان مار لیا ہے تو دوسرے روز تمہارے لیے حیرانی کا سامان تیار رہتا تھا یہودی پہلے دن کی سرگذشت سے صاف مکر جائے گا۔ اور پھر وہی اپنی راگنی الاپنی شروع کر دے گا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں اگر تمہیں طیش نہ آ جائے اور تم اسے گزشتہ روز کی شکست یاد دلاؤ تو وہ متعجب ہو کر کہے گا مجھے تو یہی یاد ہے کہ میں نے کل بھی اپنے دعوے کی سچائی ثابت کر دی تھی۔ بعض اوقات تو غصہ اور حیرانگی کے باعث میری زبان بند ہو جاتی تھی میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا مجھے ان کی لفاظی سے زیادہ تعجب ہوتا تھا یا وہ چابک دستی دیکھ کر زیادہ حیرانی ہوتی تھی جس سے وہ اپنی دروغ گوئی پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں ان سے بیزار ہو گیا۔

بدکار سے بدآموز برا ہوتا ہے

تاہم ان تجربات کا ایک اچھا اثر بھی ہوا۔ جس قدر مجھے اشتراکیت کے لیڈروں اور مبلغین سے واقفیت ہوتی اتنی ہی میرے دل میں اپنی قوم کی محبت بڑھتی تھی۔ ان واعظان بدخصلت کی شیطانی مہارت دیکھ کر ان کے بدقسمت شکاروں کو کوئی الزام نہ دیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی بمشکل اس نسل کی منطقی بددیانتیوں سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ ایسی قوم کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش قطعاً فضول تھی۔ وہ تو منہ چڑھ کر جھوٹ بولتے تھے ابھی کچھ کہتے پھر اس کی تردید کر دیتے۔ اور دوران مباحثہ میں اپنے مطلب کے لیے ضرور ہوتی تو پھر اسی بات کو دوہرا دیتے۔ نہیں نہیں! یہودیوں سے جتنی واقفیت بڑھتی اتنا ہی مزدوروں کو قابل معافی محسوس کرتا تھا۔

میری رائے میں بدترین گنہگار مزدور نہ تھے بلکہ وہ لوگ تھے جو اپنے ایک خون اور

ایک پوشت کے بھائیوں سے اظہار ہمدردی کی پرواہ نہ رکھتے تھے وہ قومی کنبہ کے خون پسینہ ایک کردینے والے نونہالوں کو ان کی کمائی کے اس حصہ سے بھی محروم رکھتے تھے جو ازروئے انصاف انہیں ملنا چاہیے تھا ان کا فرض تھا کہ یہ حقوق ادا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ مزدوروں کو خراب کرنے والوں اور راہ بد پر لگانے والوں کو کچل کر رکھ دیتے۔

اصلاح کے لیے صرف عقل نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے

روزانہ تجربات سے مجبور ہو کر اب میں نے خود مارکس ازم کی تعلیمات کے سرچشمہ کی پوری پوری تحقیق کرنے کی ٹھانی۔ اس کی سابقہ کارگزاریاں بالتفصیل میرے سامنے تھیں۔ احتیاط سے مشاہدہ کرنے کے باعث اس کی روزانہ ترقی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ قوت متخیلہ پر تھوڑا دباؤ ڈال کر اس کے آئندہ لازمی نتائج کی پیشین گوئی بھی کی جا سکتی تھی اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا تھا وہ یہ کہ آیا ان عقائد کے بانی ان نتائج سے واقف تھے جو آج ان کی تعلیمات کے اثر سے ظاہر ہو رہے ہیں یا خود وہ بھی کسی مغالطہ کا شکار تھے میرے نزدیک دونوں ممکنات میں سے کسی ایک کو فی نفسہ کوئی خاص ترجیح حاصل نہ تھی۔

اگر دوسری بات سچی نکلتی تب تو ہر صحیح الذہن شخص کو فرض صرف یہ تھا کہ وہ اس نامبارک تحریک کا مقابلہ کرے۔ اور اس کے نتائج کا تدارک کرے۔ برخلاف اس کے اگر پہلی بات سچی ثابت ہوتی تو ماننا پڑے گا کہ آج جو فتنہ اقوام عالم کو لاحق ہو رہا ہے اس کے موجد یقیناً مجسم شیطان ہیں جس جماعت کی ریشہ دوانیاں یقیناً ایک روز تہذیب انسانی کا خاتمہ کر دیں گی اور اس دنیا کو تباہ و برباد کر دیں گی اس کا خاکہ ہرگز کسی انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ بلکہ ضرور کسی دشمن انسانی راکھشش کی ایجاد ہے۔

اگر صورت یہ ہو تو صرف ایک ہی علاج باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ فی الفور مقابلہ کی خاطر اٹھ کر اس جنگ میں ہر اس ہتھیار سے کام لیا جائے جو انسانی ہمت و ذہانت ہمارے لیے مہیا کرے یا کر سکے نتیجہ قسمت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے تقدیر جس کے

حق میں فیصلہ کر دے وہی کامیاب سمجھا جائے۔

غرض اب میں نے اس تحریک کے اصول سمجھنے کی خاطر اشتراکیت کی بابت واقفیت بہم پہنچانی شروع کی میں اس مقصد میں خود اپنی توقعات سے بھی پہلے کامیاب ہو گیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اب میں مسئلہ یہود میں گہری بصیرت حاصل کر چکا تھا۔ ورنہ قبل ازیں تو اس مسئلہ میں میرا علم فقط شد بد تھا۔ یہ صرف اس تازہ حاصل کردہ بصیرت کا نتیجہ تھا کہ میں فی الواقع حقیقت حال اور اشتراکیت کے بانیان دعوت کے دھوکہ میں ڈالنے والے اصولوں میں کوئی تمیز کر سکا۔ مجھے علم تھا کہ یہودی الفاظ کو محض زمانہ سازی اور اپنے خیالات پر پردہ ڈالنے کی نیت سے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حقیقی مقاصد اس کے اقوال سے معلوم نہیں کیے جا سکتے۔ بلکہ اس کے منشائے اصلی کو محض اپنی بصیرت سے سمجھا جا سکتا ہے اس انکشاف نے میرے اندر ایک ایسا انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ جس کا مجھے آج تک تجربہ نہ ہوا تھا۔ میں ایک نرم دل اور صلح کل انسان کے بجائے بنی سام کا کٹر دشمن بن گیا۔

کیا یہود کا مقابلہ ممکن بھی ہے؟

اس کے بعد میرے لیے صرف ایک تذبذب باقی رہ گیا۔ یہ میرا آخری تذبذب تھا۔ یہ آخری موقعہ تھا کہ مختلف خیالات کی کھینچا تانی نے مجھے گہرے تفکرات میں ڈال دیا۔

جب میں تاریخ عالم کی طول طویل داستان میں اس قوم یہود کی کارگذاریوں کا مطالعہ کرتا تو میں پریشان ہو کر اپنے آپ سے سوال کرتا کہ کہیں بعض ناقابل تحقیق وجوہات کی بنا پر جو ہم جیسی عاجز اور فانی مخلوق کی سمجھ سے باہر ہیں، تقدیر نے یہی اٹل فیصلہ تو نہیں کر رکھا کہ آخری فتح اس مٹھی بھر قوم کے نام لکھی جائے گی؟ کیا یہ دنیا کہیں اسی قوم کے حصہ میں تو نہیں آنی جو ہمیشہ سے ''ارض موعود'' کے بھروسہ پر جیتی آئی ہے؟ کیا ہمارا اپنی حفاظت کے لیے لڑنا کسی حقیقت پر بھی مبنی ہے یا محض ہمارا خیال ہی خیال ہے۔

تقدیر نے اس سوال کا جواب مجھے خود مہیا کر دیا۔ وہ یوں کہ تقدیر نے میری راہنمائی کی اور میں نے خالی الذہن ہو کر مارکس ازم کی تعلیمات اور سلسلہ میں یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا پورا پورا جائزہ لیا۔

مارکس ازم یہود کا فلسفہ ہے

مارکس ازم کا عقیدہ یہودیوں کی ایجاد ہے یہ عقیدہ فطرت کے قانون حفظ مراتب کو ترک کر کے اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے جبر و تشدد مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کی خواہش ہے کہ کثرت تعداد اور بے جان بوجھ کا اقتدار مسلم کر دیا جائے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی قدر و قیمت اور قوم و نسل کی بنیادی اہمیت یہاں کچھ وقعت ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ ان کی مخالفت کی جاتی ہے ایسا کرنے سے یہ عقیدہ نسل و تہذیب انسانی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اگر کائنات کا نظام مارکس ازم کی تعلیمات کے مطابق کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ نظم و نسق کی کوئی ایسی صورت برقرار نہ رہے جسے انسان کا دماغ تصور کر سکتا ہے ان کا قانون اس کارخانہ کو فنا کر دے گا جس کا بدل انسانی احاطہ علم سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کرہ ارض کے باشندے مٹ جائیں گے۔

میں نے یہود کے مقابلہ کا تہیہ کر لیا

اگر یہودی مارکس ازم کی تعلیمات کی مدد سے اس دنیا کے رہنے والوں پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی بادشاہت کا آغاز بنی آدم کا روز جنازہ ثابت ہو گا۔ اور یہ کرہ ارض جس طرح کروڑوں سال پہلے نسل انسانی کے بغیر فضاؤں میں گردش کرتا تھا اسی طرح پھر گردش کرنے لگے گا۔

ان وجوہات کی بنا پر آج مجھے یقین کامل ہو چکا ہے کہ میری کوششوں میں اس قادر مطلق کی امداد شامل حال ہے۔ جس نے یہ کائنات بنائی میرا یہود کے مقابلہ میں پاسبانی کے فرائض سرانجام دینا خود کارخانہ قدرت کی حفاظت میں جنگ لڑنے کے مترادف ہے۔

☆☆☆☆☆☆

باب سوم :: قیام وائنا سے اخذ کردہ سیاسی افکار کس عمر میں لیڈری اختیار کرنی چاہیے

تیس سال کی عمر سے پہلے کسی شخص کو عیاں طور پر سیاسیات میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو فطرت نے غیر معمولی سیاسی قابلیت بخشی ہو انہیں اس قاعدہ سے مسے رکھنا پڑے گا۔ کم از کم فی زمانہ میری رائے یہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص تیس سال یا اس کے لگ بھگ عمر کا نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس کی دماغی نشوونما زیادہ تو واقفیت بہم پہنچانے اور اس علم میں سے برے بھلے کی تمیز کرنے تک محدود رہتی ہے روزمرہ کے سیاسی مسائل کو جانچنے اور پھر ان کے متعلق کسی واضح روش اختیار کرنے کے لیے یہ واقفیت اس کی تحقیق لازمی ہے۔ جب انسان یہ مرحلہ طے کر لے تو پھر وہ گویا ایک ایسی شہ نشین پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں سے تمام سیاسی اونچ نیچ سامنے آ جاتی ہے پہلے اپنے ذہن میں علی الاطلاق اصولوں کا ایک خزانہ جمع کرنا چاہیے پھر ان اصولوں کو باہم ترتیب دینی چاہیے یہ ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ زندگی کے متعلق شخصی خیالات اور نظریات ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کر لیں۔ گویا ایک مکمل ضابطہ حیات بن جائے۔ ان مدارج کو طے کر لینے کے بعد یہ شخص ان دماغی ہتھیاروں سے مسلح ہو جائے گا جن کے بغیر ہر روز کے مخصوص سوالات کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ ازیں اب اس میں وہ اوصاف بھی پیدا ہو چکے ہوں گے جو سیاسی عقائد اختیار کرتے وقت استقلال اور تسلسل برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ ایسے شخص کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وہ مفاد امہ کی سیاسی رہبری میں اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے مطلوبہ لیاقت بہم پہنچا چکا ہے۔

ناتجربہ کاری میں قیادت کا بوجھ اٹھانے کے خطرات

مذکورہ بالا شرائط سیاسی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے پوری کر لینی چاہئیں اگر کوئی شخص اس تیاری کے بغیر سیاسیات میں داخل ہو جائے تو اسے دوگنہ خطرات لاحق رہیں گے۔ ممکن ہے وہ ابتدا میں کسی اصولی مسئلہ کے متعلق کوئی ایسا رویہ اختیار کر بیٹھے جو واقعات کی رو سے بعد میں جا کر غلط ثابت ہو اس وقت اس کے سامنے دو ہی راستے ہوں گے یا تو وہ اپنے سابقہ دعوے کو ترک کر دے اور یا اپنے پہلے سے بہتر علم اور اپنی پہلے سے پختہ عقل کے خلاف اور اپنے عقائد و استدلال کے برعکس اسی پرانی رائے سے چمٹا رہے گا۔ اول الذکر راستہ اختیار کرنے سے اس کے ذاتی وقار میں فرق آتا ہے جب وہ اس سابقہ روش کو چھوڑ دے گا جس کی آج تک وکالت کرتا رہا ہے تو لوگوں کی نظروں میں اس کا یہ طرز عمل متضاد سمجھا جائے گا۔ وہ خود بھی اپنے مقلدین سے پہلے جیسی وفاداری کی توقع نہ رکھ سکے گا۔ جہاں تک مقلدین کا تعلق ہے وہ نہایت آسانی سے اس تبدیلی رائے کا باسانی لیڈر کی جبلی کم عقلی پر محمول کر سکتے ہیں علاوہ ازیں قائد پہلے جن اشخاص کی مخالفت کرتا تھا اب مقلدین کو ضرور ان کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

برخلاف اس کے (جیسا کہ آج کل دستور ہے) اگر وہ موخر الذکر راستہ اختیار کرے تو آئندہ عامۃ الناس کے سامنے جو کچھ کہے گا وہ دل سے نہ کہے گا۔ جوں جوں اس کی یہ دورخی بڑھتی جائے گی اس کے دعوے سرسری اور بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے ذلیل سے ذلیل طریقے اختیار کرنے شروع کر دے گا۔ خود تو اپنے کہے کی خاطر آخری حد تک جانے کو تیار نہیں (جس بات پر دل سے یقین نہ ہو اس کے لیے کون جان دیتا ہے) لیکن اپنے مقلدین سے روز افزوں مطالبات کیے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قائد کے اخلاص میں جس قدر کمی آ جائے اتنا ہی کمبخت بغیر سوچے سمجھے مقلدین کے سر پر سوار ہوا چلا جاتا ہے انجام کار وہ قیادت کی بچی کھچی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑا کر سیاسی چالبازی کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے۔ غرض وہ ان لوگوں کی منڈلی میں شامل ہوتا ہے۔ جن کا واحد اصول یہ ہے کہ کسی اصول کی پابندی نہیں کرنی۔ اس کی

روش میں غرور اور تغیر کی رنگ آمیزی ہونے لگتی ہے اس کا دروغ گوئی کا ملکہ بے شری کی حد تک ترقی کر جاتا ہے۔

پیشہ ور ایم ایل اے

ایسا شخص کہیں پارلیمنٹ کا ممبر بن جائے تو ہر شریف انسان کی بدقسمتی ہے ایک بات روز اول سے ہی واضح ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک تمام سیاسی جدوجہد کا منتہائے نظر صرف یہ ہے کہ خود اس کا چمچہ رزق کہیں ہاتھ سے نہ پھسل جائے۔ اس کا اور اس کے خاندان کا ذریعہ معاش یہی ممبری ہے۔ جوں جوں اس پر اس کے بیوی بچوں کا بار بڑھتا جائے گا توں توں وہ اپنے حلقہ انتخاب کی نمائندگی اپنی ذات کے لیے مخصوص رکھنے کی خاطر زیادہ سختی سے لڑے گا۔ اسی بنا پر جو دوسرا شخص سیاسی قابلیت کا اظہار کرے، اسے وہ اپنا جانی دشمن تصور کرے گا۔ اگر کوئی نئی تحریک سر اٹھائے تو اسے وہ اپنے زوال کا پیش خیمہ خیال کرتے ہوئے ایک خطرہ قرار دے گا۔

یہ پارلیمنٹری حشرات الارض کیا کیا الجھنیں پیدا کرتے ہیں اس پر میں بعد میں مزید روشنی ڈالوں گا۔

لیڈری اور پختہ سیاسی اصولوں کا تعلق

یہ ظاہر ہے کہ تیس کی عمر تک پہنچ کر بھی انسان کو بہت کچھ سیکھنا باقی رہتا ہے۔ تاہم اب یہ سیکھنا اکثر و بیشتر محض سابقہ بنیادی عقائد کی توسیع پر مشتمل ہوتا ہے جو نئی بات حاصل کی جائے وہ ان پہلے بنیادی عقائد کے جسم میں بمنزلہ غذا کے جزو بدن ہو جائے گی۔ یہ ایک اصولی ضابطہ حیات قبل سے موجود ہے۔ اب صرف اس کے خاکہ میں رنگ بھرے جا رہے ہیں نیا علم حاصل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پرانے عقائد کو ترک کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مقصد فقط یہ ہے کہ انہیں عقائد کو زیادہ تفصیل سے پھیلایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رفقائے کار کو بھی یہ خیال نہ ستائے گا کہ آج تک ان کی رہبری غلط طور پر کی جاتی رہی ہے۔ برعکس اس کے جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے قائد کی نشو ونما

ایک مستقل نہج پر ہو رہی ہے۔ اور وہ نئے خیالات کو بھی اپنے ڈھنگ پر لا کر جذب کر لیتا ہے تو اس سے ان کا اعتماد اور بڑھ جائے گا اس ارتقا کی مثال بالکل جسمانی نشو و نما کی سی ہے غرض مقلدین کو اس کارروائی سے یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ جن عقائد پر ایمان رکھتے ہیں ان میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے ان کی نظروں میں اس ترقی کا ہر مرحلہ ایک تازہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ آج تک جن عقائد کی تقلید کرتے رہے ہیں وہ فی الواقع صحیح ہیں۔

ناکام قیادت کیلئے آبرومندانہ راستہ

جب کوئی لیڈر اپنے سابقہ علی الاطلاق اصولوں کی بابت تسلیم کر لے کہ ان کی بنا ہی غلط تھی۔ اس اس وجہ سے کے متعلق مزید وعظ و تلقین ترک کرنے پر مجبور ہو جائے تو ان حالات میں اس کے لیے صرف ایک ہی آبرومندانہ راستہ کھلا ہے۔ وہ راستہ یہ ہے کہ اسے اپنے غلط عقائد کے لیے پوری سزا برداشت کرنی چاہیے۔ اسے آئندہ کے لیے کسی سیاسی کارروائی میں پبلک طور پر حصہ نہیں لینا چاہیے۔ جب ایک دفعہ وہ اصولی غلط کر چکا ہے تو عین ممکن ہے پھر بھی کہیں ٹھوکر کھائے۔ بہر حال اب اسے اپنے ہم قوموں سے یہ توقع رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ پہلے کی طرح اس کی پشت پناہی جاری رکھیں۔

ہمارے آجکل کے لیڈروں کو یہ راستہ اختیار کرنا ہرگز پسند نہیں۔ اس کا ثبوت اس منڈلی کی عام بدعملیاں ہیں جو فی زمانہ اپنے آپ کو سیاسی قیادت پر مامور تصور کرتی ہے۔ ساری منڈلی میں ایک شخص بھی تو ایسا نہیں جو یہ کام سنبھالنے کے قابل ہو۔

میں نے لوگوں کو قائل کرنے کا ڈھب سیکھا

اگرچہ میں ان دنوں دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں سیاسی مسائل پر غور کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ پھر بھی میں نے کھلے طور پر سیاسیات میں حصہ لینے سے پوری احتیاط کے ساتھ احتراز کیا۔ جو امور ہمیشہ مجھ پر مسلط رہتے تھے یا جو سوالات میرے دماغ میں ہیجان بپا رکھتے تھے۔ ان کا ذکر میں صرف ایک محدود حلقہ کے سامنے کیا کرتا

تھا۔ ایسے محدود دائرہ کے اندر رہ کر مسائل پر بحث کرنے سے کئی فائدے تھے مجھے لوگوں کے سامنے جگتیں کرنے کا کوئی شوق نہ تھا برعکس اس کے میں اپنے گرد وپیش بیٹھنے والوں کے خیالات وعقائد کو ٹٹول کر انہیں آہستہ آہستہ اپنے ڈھب پر لانے کا لٹکا سیکھا لیا۔ اکثر ان کے خیالات وعقائد بالکل اور دقیانوسی ہوتے تھے اس طرح میں نے ہر ممکن طریقہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانی نفسیات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانی شروع کی۔ اس قسم کے مطالعہ کے لیے وائنا سے زیادہ مناسب مقام تمام جرمن قوم کے ہاں اور کہیں نہ تھا۔

آسٹریا کی سلطنت سیاست کی لیبارٹری تھی

ان دنوں سیاسی سوچ بچار کا دارہ جرمنی کی نسبت آسٹریا میں زیادہ وسیع تھا۔ علاوہ ازیں یہاں سیاسی مفاد کی رنگارنگی بھی زیادہ تھی ہاں جرمنی میں پرشیا ہمبرگ او ربحیرہ شمالی کے ساحلی علاقے اس قاعدہ سے مستثنے سمجھنے چاہیے۔ جب میں اس ضمن میں آسٹریا کا ذکر کرتا ہوں تو میری مراد اس عظیم الشان سلطنت کا وہ حصہ ہے جہاں جرمنوں کی آبادی غالب تھی۔ یہ حصہ اس سلطنت کا گہوارہ تھا۔ یہیں کے باشندے صدیوں سے سلطنت کی ثقافتی زندگی کا واحد سرچشمہ تھے۔ ورنہ آسٹریا کا سیاسی نظام قطعاً بوداتھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا، سلطنت کے وجود اور استحکام کا انحصار زیادہ سے زیادہ جرمنوں پر تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جرمن شہنشاہان ہیز برگ کی سلطنت میں روح رواں تھے۔

سلطنت میں دارالحکومت کی اہمیت

جو صوبے وراثتاً تاج شاہی سے وابستہ تھے وہ سلطنت میں قلب کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی قلب تھا جو تمام سیاسی اور ثقافتی نظام میں دوران خون قائم رکھتا تھا۔ اسی دوران خون سے اس نظام کی زندگی وابستہ تھی۔ اگر وہ قلب تھا تو وائنا دماغ اور قوت ارادی کا قائم مقام تھا۔ ان دنوں وائنا ایک ملکہ کی شان سے تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا۔ یہ اسی شہر کا حاکمانہ دبدبہ تھا۔ جس کے زور سے آسٹریا میں رہنے والی مختلف اقوام کی شیرازہ بندی قائم تھی۔ اس کا حسن تاباں دیکھ کر انسان اس تمام کلفت کو فراموش کر بیٹھتا

تھا۔ جو سلطنت بحیثیت مجموعی کہولت اور انحطاط کے آثار دیکھنے سے طبیعت پر طاری ہو جاتی تھی۔

اگرچہ اندرونی طور پر سلطنت کو مختلف اقوام کی خوفناک کشمکش گھن کی طرح کھا چکی تھی۔ پھر بھی دنیا کو اور بالخصوص جرمنی کو محض وائنا کی دلفریب تصویر ہی نظر آتی تھی۔ یہ دھوکہ اس لیے اور قوی ہو جاتا کہ بظاہر وائنا کی شان وشوکت انتہائے عروج تک پہنچ چکی تھی یوں تو آسٹریا کے قدیمی شہنشاہوں کی یہ راجدھانی ہمیشہ سے قابل احترام تھی لیکن اب اس شہر کا منتظم ایک ایسا شخص تھا جسے بندوبست اور عملداری کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ اس کی جانکاہیوں سے وائنا کے چہرے پر پھر ایک دفعہ ایام جوانی کی سی رونق آ گئی۔ یہ شخص مشرق میں رہنے والے جرمنوں کے اندر آخری بڑا آدمی تھا۔ سیاست دان ہونے کے جو معنی سرکاری حلقوں میں لیے جاتے ہیں ان معنوں میں وہ ''سیاستدان'' نہ تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر کارل لوئجر تھا۔ وائنا دارالحکومت اور شاہی قیام گاہ تو پہلے سے تھا۔ لیکن ڈاکٹر کارل لوئجر نے اس کے شہری نظم ونسق کو کیا اقتصادی لحاظ سے، اور کیا ثقافتی لحاظ سے، ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ تمام سلطنت کا قلب ایک نئی طاقت سے حرکت کرنے لگا۔ اس طرح اس شخص نے اپنے آپ کو اس زمانہ کے ''مدبروں'' سے ہزار درجہ بہتر ثابت کر دیا۔

مختلف قومیں ایک سلطنت میں نہیں رہ سکتیں

آسٹریا کا سیاسی نظام مختلف نسلوں سے مرکب تھا۔ اگر یہ نظام آخر کار تباہ ہو گیا تو اس سے مشرق میں رہنے والے جرمنوں کی سیاسی نا قابلیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ تباہی کا بیج خود صورت حالات کی ناپائداری میں مضمر تھا۔ ایک کروڑ انسان کسی ایسی سلطنت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ جس کے پانچ کروڑ باشندے مختلف اور باہم مخاصمت رکھنے والی قوموں پر مشتمل ہوں۔ ایسا ممکن ہونے کے لیے چند خاص شرطیں پہلے سے پوری ہونی چاہئیں اور ان شرطوں کا پورا کرنا بھی تبھی کارگر ہو سکتا ہے جب ان کا فائدہ اٹھانے کے

لیے وقت باقی ہو۔

آسٹریا میں رہنے والے جرمن نہایت عالی دماغ تھے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے اندر رہائش کے عادی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان ذمہ داریوں کو خوب محسوس کرتے تھے جو ایسی صورت حالات میں ان پر عائد ہوتی تھیں۔ آسٹریا کی سلطنت میں صرف جرمن ہی وہ قوم تھے جو بادشاہ کے قلیل مملوکہ علاقوں سے باہر بھی نظر دوڑاتے تھے اور تمام سلطنت کو بحیثیت مجموعی مدنظر رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سمت نے انہیں مادر وطن سے وابستہ نہ رہنے دیا تو اس افتاد کی وجہ سے انہیں ایک زبردست مہم درپیش آئی۔ انہوں نے اس مہم کو سنبھالنے کے لیے جیسی بن پڑی کوشش شروع کر دی۔ وہ مہم یہ تھی کہ ان کے بزرگ اہل مشرق سے لاتعداد معرکے لڑ کر جو میراث حاصل کر گئے تھے اسے قائم رکھا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آسٹریا میں رہنے والے جرمن اپنی ساری طاقت اس مہم پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے بہترین افراد کے دل و دماغ بار بار وطن میں بسنے والے بھائیوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ غرض گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے انہیں فقط اپنی بچی کھچی قوت سے کام نکالنا پڑتا تھا۔

مقابلتاً آسٹریا میں رہنے والے جرمنوں کی وسعت نظر زیادہ تھی۔ ان کے تجارتی مفاد قریب قریب اس معجون مرکب سلطنت کے تمام حلقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کم و بیش تمام اہم کاروبار ان کے ہاتھ میں تھے۔ سلطنت کے بیشتر اعلیٰ صنعتی ماہرین اور دفتری ملازم جرمن تھے۔ ملک کی خارجہ تجارت کا کچھ حصہ یہودیوں کے قبضہ میں تھا۔ لیکن باقی کے مالک جرمن تھے آسٹریا کی سلطنت کی سیاسی شیرازہ بندی کلیتۂ جرمنوں کے دم سے وابستہ تھی۔ آسٹرین جرمنوں کے عسکری فرائض انہیں ان کے خانگی علاقوں سے بہت دور دور تک لے جاتے تھے۔ فرض کیجئے ایک رنگروٹ کسی ایسی رجمنٹ کا تقرر ہرزوگووینا اور وائنا سے لے کر گالیشیا تک کہیں ہو جائے۔ ہیپز برگ کے شاہی خاندان کی افواج میں ابھی تک جرمن افسروں کا عنصر غالب تھا۔ علیٰ ہذا القیاس دفتری ملازمین

کے بالائی طبقوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ آرٹ اور سائنس دونوں جرمنوں کے قبضہ میں تھے۔ سوائے آرٹ کے ان کے نمونوں کے جن پر گمان ہوتا تھا۔ کہ کسی حبشی قبیلہ نے تیار کیے ہیں۔ باقی تمام صحیح فنی القا جرمنوں کا مرہون منت تھا۔ موسیقی، تعمیرات سنگ تراشی اور مصوری، ان سب فنون میں وائنا پوری سلطنت کو سیراب کرتا تھا۔ اور پھر بھی اس چشمہ کا منبع کبھی خشک ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی خارجی حکمت عملی بھی جرمن عنصر کے ہاتھ میں تھی۔ ہاں ہنگری کے باشندوں کی ایک قلیل تعداد ضرور اس میدان میں ساجھی تھی۔

تاہم اس سلطنت کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے تمام کوششیں بے سود تھیں۔ وجہ یہ کہ اس مقصد کی خاطر جن شرطوں کا پہلے سے پورا کیا جانا لازمی ہے وہ مفقود تھیں۔

مختلف اقوام کے باہمی نفاق پر قابو پانے اور ان کی تخریبی قوتوں کا انسداد کرنے کا صرف ایک ہی ممکن ذریعہ تھا۔ وہ ذریعہ یہ تھا کہ آسٹریا کی حکومت اور اس کے داخلی انتظام کو مرکزیت کے اصول پر لایا جاتا۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جس سے اس سلطنت کا وجود برقرار رکھا جا سکتا۔

جرمنی اور آسٹریا کی سیاسی ہیت تشکیل میں فرق

گاہ بگاہ تھوڑی دیر کے لیے روشنی کے آثار نظر آجاتے تھے۔ جن کے دوران میں حکام کے اعلیٰ حلقوں کو بھی مندرجہ بالا حقیقت کا احساس ہوتا۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر اس حقیقت کو بھول جاتے یا عمداً فراموش کر دیتے کیونکہ اس پر عمل درآمد کرنے میں کوئی مشکلات درپیش تھیں جس تجویز کا منتہائے نظر یہ ہو کہ سلطنت کو زیادہ متحد کر دیا جائے۔ وہ ضرور بے اثر رہتی تھی وجہ یہ کہ مرکز میں کوئی ایسی مضبوط طاقت نہ تھی جسے سلطنت کے تمام اجزاء کو یکجا رکھنے کے لیے کافی اختیارات حاصل ہوں۔ اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ آسٹریا کے حالات اس سلطنت سے قطعاً مختلف تھے جس کی بنیاد جرمنی میں بسمارک نے رکھی تھی جرمنی کو صرف یہی ایک رکاوٹ درپیش تھی کہ سیاسی روایات کو نئے

سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ ورنہ بسمارک کے زمانہ میں کل جرمنی کی تمدنی اساس پہلے سے ہی ایک تھی۔ جرمن سلطنت کے تمام اجزاء ایک ہی نسل اور قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر کچھ اجنبی عنصر تھا بھی تو بالکل مٹھی بھر۔

آسٹریا کی قومی تقسیم اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس سلطنت میں جتنے بھی ملک شامل تھے ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اپنی شاندار ماضی کی روایات پر ناز کر سکتا۔ صرف ہنگری کو اس قاعدہ سے مستثنےٰ سمجھنا چاہیے۔ اگر کسی ملک کی سابقہ روایات شاندار تھیں بھی تو انہیں امتداد زمانہ نے یا تو بالکل مٹا دیا تھا یا ایسا دھندلا کر دیا تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھیں علاوہ ازیں یہی وقت تھا کہ قومیت کے اصول کا چرچا ہونا شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو مختلف اقوام تاج ہیبز برگ کے ماتحت متحد تھیں ان میں قومی احساس پیدا ہونے لگا۔ ان نوانگیختہ قومی طاقتوں کو قابو میں رکھنا نہایت مشکل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کی حدود کے پہلو بہ پہلو ایسی قومی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں جن کے باشندے انہیں نسلوں سے تعلق رکھتے تھے جو خاندان ہیبز برگ کی سلطنت میں آباد تھیں رفتہ رفتہ آسٹریا کے اندر بھی ان نئی حکومتوں کا رسوخ جرمن عنصر کے اقتدار پر غالب آنا شروع ہو گیا۔

اس طرح ایک ایسی جنگ کا آغاز ہوا جس میں وائنا بھی زیادہ عرصہ تک عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ پہلے وائنا کے مقابلہ میں بوڈاپسٹ بھی برابر کا دارالحکومت قرار پایا۔ یہ ایک ایسا حریف تھا جو سلطنت کے باہم برسرپیکار اجزاء کو یکجا رکھنے کے بجائے ایک فریق کی حمایت پر تلا ہوا تھا۔ تھوڑا عرصہ بعد پراگ بھی بوڈاپسٹ کی طرح مساوی درجہ کا دارالحکومت بن گیا۔ انجام کار لیمبرگ، لچ وغیرہ وغیرہ سب اسی طوفان بےتمیزی میں دارالحکومت قرار پا گئے۔ یہ تمام شہر پہلے صوبائی مراکز تھے۔ اب ان میں سے ہر ایک بجائے خود دارالحکومت بنا دیا گیا تو اس سے جا بجا ایسے تمدنی اکھاڑے قائم ہو گئے جن پر اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا راگ کا مقولہ خوب صادق آتا تھا۔ یوں ہر جگہ کے قومی احساسات کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ایک محور حاصل ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مقامی قومیتوں

کا چرچا عوام میں بھی بڑھ گیا حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب مختلف مما لک کو سلطنت سے وابستہ رکھنے والے رشتہ و پیوند کے مقابلہ میں جداگانہ مفاد کی کشش غالب آ گئی جوں ہی صورت حالات یہاں تک پہنچی، اسی وقت سے آسٹریا کی تباہی ایک یقینی امر تھا۔

شہنشاہ جوزف ثانی کی وفات سے پہلے ہی نظر آ رہا تھا کہ حالات کیا شکل اختیار کریں گے جس سرعت سے یہ تبدیلی وقوع پذیر ہوئی اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ کچھ وجوہات تو خود سلطنت کی اندرونی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں اور باقی کا سبب آسٹریا کی خارجی حکمت عملی تھی۔

سلطنت کا شیرازہ بندی سے زبان کا تعلق

جب تک تمام اختیارات مرکز کے ماتحت لانے کے لیے مسلسل اوران تھک کوشش نہ کی جاتی اس وقت تک آسٹریا کی سلطنت کو مستقل طور پر مستحکم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی سب سے پہلے تو یہ اصول نافذ کرنا چاہیے تھا کہ تمام سلطنت میں ایک ہی زبان بطور سرکاری زبان کے استعمال کی جائے گی اس طرح مما لک محروسہ کی علامات اتحاد کو تقویت پہنچتی۔ علاوہ ازیں حکومت کے ہاتھ میں ایک ایسا اوزار آ جاتا جس کے بغیر سلطنت کی سیاسی یکجہتی قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح مکتبوں اور تعلیم و تدریس کے دوسرے اداروں سے رعیت کے اندر باہم وابستگی کا احساس پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ایسے مقاصد دس بیس سال میں پورے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ایسی کوششیں تو صدیوں کے پیمانے پر کی جاتی ہیں ان کی مثال ایسی ہیں جیسی نو آبادیات قائم کرنے کی۔ دونوں جگہ ہنگامی جوش و خروش کے بجائے مستقل ثابت قدمی زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام ملک کی حکومت اور نظم و نسق سختی سے ایک ہی نہج پر چلانا چاہیے تھا۔

میں نے ان اسباب اور وجوہات کے مطالعہ سے پوری عبرت حاصل کی جن کے باعث مذکورہ بالا ہدایات پر عمل نہ ہوتا تھا اور نہ کرایا جاتا تھا ہیبز برگ سلطنت کی تباہی کی

ذمہ داری انہیں لوگوں کے کندھوں پر ہے جن سے یہ فروگذاشت سرزد ہوئی۔

سلطنت کی بقا کے لیے نسلی وحدت کی اہمیت

آسٹرین سلطنت کو ایک قابل مضبوط حکومت کی سخت حاجت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سلطنت کے وجود کا انحصار ہی ایسی حکومت رپ تھا کسی اور سلطنت کو ایک قابل اور مضبوط حکومت کی اتنی ضرور ہرگز نہ ہوگی۔ ہیبز برگ سلطنت میں وحدت نسلی مفقود تھی تمام قومی حکومتوں کی عقلی بنیاد ہمیشہ اسی وحدت نسلی پر ہوا کرتی ہے جب یہ وحدت موجود ہوتو چاہے راج گدی کیسے ہی نا اہل اور نا لائق ہاتھوں میں کیوں نہ ہو پھر بھی نسلی وحدت سلطنت کو بچائے رکھے گی۔ اگر کسی سلطنت کی آبادی ہم جنس ہو تو ایسی قوم کا تقاضائے فطری از خود اسے انتشار سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح حکومت کا وجود قائم رہتا ہے بعض اوقات ایسی حکومتیں باوجود بے تدبیری اور بدانتظامی کے اتنے طول وویل عرصہ تک زندہ رہتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کئی دفعہ بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ اس سیاسی نظام میں تو نام کو بھی جان باقی نہ ہوگی۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسی مردہ میں از سرنو جان پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی لازوال طاقت برداشت کا ایسا اظہار کرتا ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔

مختلف نسلوں کو متحد کرنے کے طریقے

جس ملک کے باشندے ہم جنس نہ ہوں وہاں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے وہاں خون کا رشتہ تو ہوتا نہیں بس ایک حکومت کے ماتحت رہنے کا تعلق ہوتا ہے اگر حکومت میں کہیں کمزوری کے آثار ظاہر ہوں تو اس کا یہ اثر نہ ہوگا کہ سلطنت کے قوای تھوڑے عرصہ کے لیے خفتہ ہو جائیں بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت کے اندر رہنے والے مختلف احساسات خفتہ تھے وہ بیدار ہونے شروع ہو جائیں گے جب تک ان مختلف نسلی جسھوں پر ایک مرکزی حکومت حکمرنا رہے اس وقت تک ان کے علیحدگی کے احساسات پوشیدہ رہتے ہیں یہ خفتہ احساسات نہایت خطرناک ہوتے ہیں اس خطرہ کو کم

وبیش صرف اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ رعایا کو صدیوں کو یکساں ہی تعلیم یکساں ہی روایات اور یکساں ہی مفاد کو خوگر بنا دیا جائے۔ ایسی حکومتوں کی عمر جس قدر کم ہوا تنا ہی ان کے وجود کا انحصار مرکز کی لیاقت اور طاقت پر ہوتا ہے اگر کسی ہمچو قسم سلطنت کا قیام محض ایک زبردست شخصیت یا غیر معمولی قابلیت کے مالک انسان کا مرہون منت ہو تو اس صورت میں یہ حکومت بھی اپنے بانی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ گوایسے شخص کی ذاتی عظمت میں شک نہیں لیکن اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ یہ علیحدگی کے احساسات جن کا اوپر ذکر کر چکا ہوں صدیوں کی مشترکہ تعلیم و تربیت سے بھی کلیتہً رفع نہیں ہو جاتے۔ اس ترکیب کا اثر صرف اتنا ہوتا ہے کہ عارضی طور پر یہ احساسات خفتہ ہو جاتے ہیں جب بھی مرکزی حکومت میں کمزوری کے آثار ظاہر ہوں اسی وقت ان احساسات میں از سر نو بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ مشترکہ تعلیم اور مشترکہ روایات بالائے طاق دھری رہ جاتی ہیں علیحدہ قومیت کا احساس اپنی طاقت کے زور سے پھر اپنے جداگانہ راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

جو کچھ میں اوپر کہہ آیا ہوں، شاہان بینز برگ اس حقیقت سے غافل تھے۔ یہی غفلت وہ دردناک جرم تھا جس کی پاداش میں ان کا تخت و تاج چھن گیا۔

خاندان بینز برگ میں صرف ایک تاجدار ایسا تھا جسے قدرت نے آخری مرتبہ چراغ ہدایت دکھا کر اس کی رہنمائی کی۔ اس روشنی سے اسے اپنے **ملک** کا مستقبل تھوڑے عرصہ کے لیے صاف نظر آیا۔ اس کے بعد جلد ہی یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

غفلت کا وبال سخت ہوتا ہے

جوزف ثانی تھا تو جرمن قوم کا تاجدار لیکن رومن شہنشاہ کے نام سے مشہور رہے جب اس نے دیکھا کہ اس کا خاندان سلطنت کے ایک دور افتادہ گوشے میں منتقل کر دیا گیا ہے تو اسے سخت اندیشہ لاحق ہوا اس نے سوچا کہ وہ وقت قریب ہے جب ہمارا تخت و تاج تباہ ہو جائے گا اس انجام سے بچنے کے لیے یہ آخری موقعہ ہے آسٹریا تو بھانت بھانت

کی قوموں کو چڑیا خانہ ہے۔ اگر سر پر منڈلاتے ہوئے خطرات کی روک تھام کے لیے ابھی سے کوئی صورت نہ نکالی تو یہی چڑیا خانہ ہماری قبر بن جائے گا۔ بس ایک ہی علاج باقی ہے بزرگوں کی غفلت سے جو حالات بگڑ چکے ہیں ان کی اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیے جوزف ثانی کو ''بنی آدم کا رفیق'' بھی کہتے ہیں۔ اس نے مافوق البشر ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے مورثوں کی لاپروائیوں اور بے تدبیریوں کے نتائج زائل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے دس سال کے عرصہ میں وہ تمام خامیاں پوری کرنی چاہیں جو صدیوں کی پیداوار تھیں اگر قسمت اسے چالیس سال بھی اس طرح محنت کرنے کی مہلت دیتی، اور اگر دو نسلوں تک بھی وہ کام جاری رہتا جس کی اس نے ابتدا کر دی تھی تو شاید آسٹریا کی سلطنت بچ جاتی۔ ایسا ہونا معجزہ سے کم نہ تھا۔ یہ شہنشاہ دس ہی سال کی حکومت کے بعد مر گیا۔ اس کا جسم اور جان دونوں شل ہو چکے تھے اس کی تجویزیں بھی اسی کے ساتھ قبر میں داخل ہو گئیں اور آج تک اس کے مقبرہ میں اس طرح دفن ہیں کہ پھر کبھی دنیا میں ان کا ذکر تک نہیں آیا۔

اس کے وارثوں میں نہ تو یہ قابلیت تھی اور نہ اتنا استقلال تھا کہ وہ اس کام کو پورا کر سکتے جو انہیں درپیش تھا۔

طبقاتی رقابت قومی اتحاد کی دشمن ہے

تھوڑا ہی عرصہ بعد یورپ میں ایک نئے انقلابی دور کے آثار ہویدا ہونے لگے بغاوت کی چنگاریاں آسٹریا میں جگہ جگہ پھیل چکی تھیں جب اس آگ کے شعلے بلند ہوئے تو ان شعلوں کو ہوا دینے والی طاقتیں معاشرتی یا سیاسی بے چینی کی پیداوار نہ تھیں۔ بلکہ ان طاقتوں کی بنا سراسر مختلف نسلی حصوں کی قومی تمناؤں پر تھی۔

1848ء میں سارے یورپ کے اندر انقلابی تحریکات کا زور تھا۔ تمام یورپین ممالک میں انقلابی رجحانات کی بنا طبقاتی کشمکش پر تھی۔ صرف آسٹریا ایک ایسا ملک تھا جہاں اس انقلابی رو نے ایک نئی صورت اختیار کی یہاں انقلابی جدوجہد کی بنیاد نسلی

رقابت پر تھی۔ آسٹریان جرمن اس انقلابی تحریک کی اصلیت فراموش کر چکے تھے ممکن ہے انہوں نے شروع سے یہ اصلیت شناخت ہی نہ کی ہو یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اس انقلابی بغاوت میں حصہ لینے لگے۔ غرض انہوں نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلایا۔ ان کے اس طرز عمل سے پارلیمنٹری جمہوریت آسٹریا میں بھی جڑیں پکڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹری جمہوریت نے جلد ہی آسٹرین جرمنوں کا اقتدار ملیامیٹ کر دیا۔

بے تدبیری زوال کی ابتدا ہے

آسٹریا میں ایک نمائندہ پارلیمنٹ تو قائم کر دی گئی لیکن اس بنیادی شرط کو نظر انداز کر دیا گیا کہ تمام سرکاری کاروبار کے لیے ایک ہی زبان استعمال کی جائے۔ یہ فروگذاشت آسٹریا میں بسنے والے جرمنوں کے اقتدار پر پہلی ضرب کاری تھی۔ اس کے بعد سلطنت کا زوال تو اسی وقت سے یقینی تھا اب صرف دیا یا زود کا سوال تھا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض ایک تاریخی دلچسپی رکھتا ہے کہ ایک سلطنت کا خاتمہ کس طرح ہوا۔

سلطنت کا انتشار بتدریج ترقی پر تھا۔ اس انتشار کو دیکھ کر ایک طرف صدمہ ہوتا تو دوسری طرف عبرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ تاریخ نے آسٹریا کی موت کا فتوے دے دیا تھا۔ اب اس حکم کے نتائج ہزار ہا چھوٹی موٹی تفصیلات کی شکل میں ظاہر ہو رہے تھے زوال کی کھلی نشانیاں قوم کے سامنے آشکارا تھیں اگر باوجود اس کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد آنکھیں بند کر کے مزے سے چل پھر رہی تھی تو اس تغافل سے صرف یہ ثابت ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے آسٹریا کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں تفصیلات کا ذکر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہیں میں صرف ان واقعات کو بالتفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں جو ایک مثال کا کام دے سکتے ہیں اور اس لیے زمانہ حاضرہ کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں یہ واقعات ان وجوہات کے آئینہ دار ہیں جو قوموں اور سلطنتوں کے زوال کا باعث ہوا کرتی ہیں علاوہ ازیں ان واقعات کے مشاہدہ سے خود مجھے اپنے سیاسی عقائد کی بنیاد قائم کرنے میں بہت کچھ مدد

ملی۔

سلطنت کے جن شعبوں سے انحطاط کے واضح اور صریح آثار ظاہر تھے ان میں آسٹریا کی پارلیمنٹ بھی شامل تھی حالانکہ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جسے حکومت کے باقی تمام اعضاء سے زیادہ مستحکم ہونا چاہیے تھا تنزل کے آثار ایسے ہویدا تھے کہ کوتاہ بین اور سادہ لوح نگاہوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکتے تھے۔

برطانوی پارلیمنٹ کی ہر نقل کامیاب نہیں ہوسکتی

صاف ظاہر تھا کہ یہ اجتماعی مجلس انگلستان کی پارلیمنٹ کا چربہ ہے لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ تو اپنے ملک کی تاریخی جمہوریت کا نمونہ ہے برعکس اس کے آسٹریا میں یہ قابل تعریف نظام منتقل کرتے ہوئے خالی مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جس طرح برطانیہ میں پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں اسی طرح آسٹریا میں بھی ایک تو عامۃ الناس کے نمائندوں کا ایوان تھا اور دوسرا ایوان روسا۔ یہ دونوں ایوان اپنے اجلاس میں وائنا میں منعقد کرتے تھے دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارات تھیں برطانوی ماہر تعمیرات بیری نے جب دریائے ٹیمز کے کنارے پارلیمنٹ کے ایوانات تعمیر کیے تھے تو اس کے پیش نظر برطانیہ کی تاریخی روایات تھیں چنانچہ اس عالیشان عمارت میں بارہ سو محرابیں، طاقچے اور ستون ہیں۔ بیری نے ہر جگہ انگلستان کی تاریخی کی رعایت سے نقش و نگار اور مجسمے بنائے ہیں انہیں نقش ونگار اور مجسموں نے دارالعوام اور دارالامراء کو قومی شان وشوکت کا مندر بنادیا ہے۔

برخلاف اس کے وائنا کے معماروں کو پہلی دقت اسی مرحلہ پر پیش آئی یہاں کا ماہر تعمیرات قوم کا ولندیز تھا۔ جب وہ عامۃ الناس کے ان نئے نمائندوں کے لیے ایک مرمریں محل تیار کرچکا تو اس کی آرائش کے لیے اسے قدیم یونانی اور رومی تاریخ کا زیربار احسان ہونا پڑا۔ پارلیمنٹری جمہوریت کا یہ مقدس ناچ گھر تو بن کر تیار ہوگیا لیکن اس کی سجاوٹ کے لیے رومی و دیونانی مدبرین اور حکما کے مجسمے اور تصویروں کی محتاج

محسوس ہوئی۔ ہردو ایوانات کی پیشانی پر ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس تصویر کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کوئی شاعر ہجو لکھ کر طنز کے طور پر عین ممدوح کے دروازے پر لٹکا آئے تصویر میں ایک رتھ دکھائی گئی ہے جس کے اندر چار گھوڑے جتے ہوئے ہیں اور چاروں مختلف سمتوں کی جانب منہ کر کے دنیا کے چاروں کونوں کی طرف بھاگ رہے ہیں اس عمارت کی چار دیواری کے اندر جس قسم کی سرگرمی کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔ اس کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر کارٹون اور کوئی نہیں بنایا جا سکتا۔

سلطنت میں رہنے والی ''اقوام'' کو اعتراض تھا کہ اگر ایوان پارلیمنٹ کی آرائش میں آسٹریا کی تاریخی عظمت کا مظاہرہ کیا گیا تو یہ امر ہماری رنجش اور اشتعال کا باعث ہو گا۔ جرمنی میں بھی کچھ قسم واقعات پیش آئے۔ وہاں کی ریشتاغ یا پارلیمنٹ کا ایوان ویلٹ کی زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا۔ اس ایوان کو جرمن قوم کے نام سے منسوب کرنے کی نوبت اس وقت آئی جب جنگ عظیم کی بجلیاں سروں پر کڑک رہی تھیں اس وقت بھی منسوب کرنے کی رسم یوں ادا ہوئی کہ انتساب کا مضمون ایک تختی پر لکھ دیا گیا۔

پارلیمنٹ اور ڈکٹیٹر شپ

جب میں آسٹریا کے دارالعوام کی کارروائی سننے کی خاطر پہلی مرتبہ گیا تو اس وقت میری عمر ابھی بیس سال بھی نہ تھی میں اس پہلے تجربے سے ہی نہایت بدمزہ ہوا۔

میں پارلیمنٹ کو ہمیشہ سے بنظر حقارت دیکھتا ہوں لیکن مجھے اس ادارہ سے نفرت نہیں بحیثیت ایک ادارہ کے میں پارلیمنٹ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں تو سیاسی آزادی کا پرستار تھا۔ میں پارلیمنٹ کے سوا کسی اور طرز حکومت کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ مجھے ہیبز برگ کے شاہی خاندان سے خصومت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری نظروں میں کسی حالت میں بھی ڈکٹیٹر شپ کی وکالت کرنا ایک عقلی اور سیاسی جرم کے مترادف تھا۔

میری اس رائے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں برطانوی پارلیمنٹ کو ایک گونہ احترام کی نظر سے دیکھتا تھا میں ابھی بچہ ہی تھا کہ اخبارات دیکھ دیکھ کر غیر شعوری طور پر خود بخود

یہ احترام محسوس کرنے لگا اب یہ احترام یکلخت تو فراموش نہ ہو سکتا تھا۔ برطانوی دار العوام جس سنجیدگی سے اپنے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ اس سے میں نہایت متاثر تھا میرے اس تاثر میں آسٹریا کے اخبارات کو بھی دخل تھا۔ یہ اخبارات ایسے واقعات خوب مصالحہ لگا کر بیان کرتے تھے میں سوچتا تھا کہ عوام کی خودمختاری کے لیے پارلیمنٹ سے بہتر طرز حکومت اور کیا ہوگی۔

میں جن وجوہات کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ کی عزت کرتا تھا انہیں وجوہات کے سبب مجھے آسٹرین پارلیمنٹ سے دشمنی تھی یہاں کی پارلیمنٹ اپنی عظیم المرتبت دادی جان کی روایات کے مقابلہ میں قطعاً نااہل تھی اس کے علاوہ میں مندرجہ ذیل حقائق سے بھی متاثر ہوا۔

آسٹرین حکومت میں جرمنوں کے اقتدار کا انحصار اب اس امر پر رہ گیا تھا کہ وہ پارلیمنٹ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں جب تک ہر بالغ مرد وزن کو ووٹ نہ دیا گیا تھا اور جب تک الیکشن کی پرچیاں خفیہ طور پر ڈالنے کا دستور رائج نہ ہوا تھا اس وقت تک پارلیمنٹ میں جرمن نمائندوں کو اکثریت حاصل تھی۔ یہ اکثریت کچھ ایسی وزنی نہ تھی صورت حالات مخدوش تھی۔ جرمن عنصر کا جو حصہ اشتراکیت کا پیرو تھا وہ قومی مسائل میں اعتماد کے قابل نہ تھا اشتراکی ہمیشہ ان مسائل میں جرمنوں کی مخالفت کرتے تھے جو جرمن عنصر کے لیے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتے تھے انہیں ڈر تھا کہ کہیں دوسرے قومی گروہ ان سے بگڑ نہ جائیں اگرچہ اس وقت تک ہر بالغ شہری کو ووٹ کا حق نہ ملا تھا۔ پھر بھی اشتراکی پارٹی کو جرمن پارٹی نہ کہا جا سکتا تھا جب ہر بالغ شہری کو ووٹ کا حق دے دیا گیا پھر تو جرمنوں کی تعداد میں جو غلبہ حاصل تھا وہ بھی چھن گیا اب آسٹریا کی سلطنت سے جرمن تسلط دور کرنے کے لیے راستہ صاف تھا۔

نمائندگی کے نظام میں جرمنوں کو بحیثیت جرمنوں کے کوئی طاقت حاصل نہ تھی۔ رجمن عنصر کا جو حصہ اشتراکیت کا پیرو تھا وہ ہمیشہ دغا دے جاتا تھا میں ان حالات میں

اس نظام سے کیسے خوش رہ سکتا تھا۔ میرے اندر اپنی قوم کی حفاظت کا جو فطری احساس ودیعت تھا وہ مجھے اس نظام کی مخالفت پر مجبور کرتا تھا باوجود اس کے میں یہی سمجھتا تھا کہ پارلیمنٹری نظام فی نفسہ ان تمام نقائص سے جن کا میں ذکر کر چکا ہوں، اور کئی دوسرے نقائص سے مبرا ہے۔ ان نقائص کی علت خود آسٹریا کی حکومت میں مضمر تھی۔ مجھے اب بھی پختہ یقین تھا کہ اگر مجلس نیابت میں جرمنوں کی اکثریت بحال کر دی جائے تو پھر جب تک آسٹرین سلطنت کا وجود باقی ہے اس نظام کی مخالفت کی ضرورت نہ ہوگی۔

یہ تھے میرے خیالات جب میں پہلی مرتبہ ان لڑائی جھگڑے کے مقدس ایوانات میں داخل ہوا۔ ان ایوانات کی تقدیس بس ان کی عالیشان عمارات اور تابانی حسن تک ہی محدود تھی عمارت کیا تھی، جرمنوں کی سرزمین پر ایک یونانی عجوبہ کھڑا تھا۔

پارلیمنٹ ذہنی انتشار کی نمائش ہے

اندر داخل ہوتے ہی مجھے جو قابل نفرت نظارہ دکھائی دیا اس سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اس وقت ایک زبردست اقتصادی مسئلہ در پیش تھا۔ ''قوم کے نمائندے'' اس بحث میں حصہ لینے کی خاطر سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے ''ہر نمائندہ قوم'' کو حق حاصل تھا کہ جو جی میں آئے کہہ ڈالے۔

مجھے وہاں ایک ہی روز میں جو تجربہ حاصل ہوا وہ واپس آ کر کئی ہفتے غور کرنے کے لیے کافی تھا۔

مباحثہ کا ذہنی معیار نہایت پست تھا کئی دفعہ تو یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ بحث میں حصہ لینے والے حضرات کہنا کیا چاہتے ہیں کئی حضرات جرمن زبان کے بجائے اپنی سقلابی زبان یا مقامی بولیوں میں گوہر افشانی فرما رہے تھے۔ غرض آج تک جو کچھ اخبارات میں پڑھتے آئے تھے وہ آج اپنے کانوں سے سن لیا ایک پرشورش ہجوم تھا جس میں سب لوگ عجیب عجیب طریقوں سے ہاتھ اور منہ بنا کر ایک دوسرے کے خلاف گلا پھاڑ رہے تھے بیچ میں ایک بڈھے میاں بیٹھے تھے جن کی حالت دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا یہ غریب

مجلس کی وضعداری قائم رکھنے کی خاطر سو سو جتن کر رہا تھا۔ بیچارہ کبھی گھنٹی ہلاتا تھا۔ کبھی دوستانہ درخواستیں کرتا تھا کبھی وعظ و تلقین سے کام لیتا تھا اور کبھی دھمکیاں دینے پر اتر آتا تھا۔

میں یہ تماشہ دیکھ کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

کئی ہفتہ بعد میں پھر ایک مرتبہ پارلیمنٹ کی زیارت کرنے گیا اب کے ایک نیا ہی نظارہ تھا۔ انسان پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے ہال قریب قریب خالی تھا اراکین حضرات کہیں نیچے کمروں میں آرام فرما رہے تھے صرف چند ممبر اپنی جگہ پر بیٹھے تھے وہ بھی ایک دوسرے کے منہ کے پاس اپنا منہ لے جا کر جمائیاں لے رہے تھے ایک صاحب تقریر کر رہے تھے کرسی صدارت پر جناب نائب صدر جلوہ افروز تھے جب آپ ادھر ادھر جھانکتے تھے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ تنگ آئے ہوئے ہیں۔

اس تجربہ کے بعد میں نے تمام مسئلہ از سر نو سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ مجھے جب کبھی فرصت ملتی میں پارلیمنٹ دیکھنے چلا جاتا۔ اور وہاں خاموش بیٹھ کر پوری توجہ کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا رہتا۔ جہاں تک مباحثوں کو سمجھنا ممکن تھا میں ان پر بھی کان دھرتا۔ غرض اس معجون مرکب سلطنت میں جتنی مختلف اقوام شامل تھیں میں نے ان سب کے ''منتخب کردہ'' نمائندوں کی ذہانت و حماقت کا جائزہ لیا رفتہ رفتہ میں جو کچھ دیکھتا تھا اس کے متعلق میں نے اپنی رائے قائم کر لی۔

پارلیمنٹ اصولاً غلط ہے

میں نے اس مشاہدہ میں ایک ہی سال صرف کیا تھا کہ مجھے پارلیمنٹری نظام کے متعلق اپنے عقائد میں ردوبدل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب میں فقط پارلیمنٹری نظام کی اس مسخ شدہ صورت کا مخالف نہ تھا جو آسٹریا میں رائج تھی نہیں! اب میں سرے سے اس نظام ہی کو تسلیم نہ کر سکتا تھا۔ آج تک میرا خیال تھا کہ آسٹرین پارلیمنٹ کی تمام مہلک خامیاں جرمن اکثریت نہ ہونے کا نتیجہ ہیں اب مجھے احساس ہوا کہ پارلیمنٹری

نظام فی نفسہ اپنی اصلیت اور شکل دونوں کے اعتبار سے غلط ہے۔

میرے سامنے متعدد مسائل درپیش تھے میں نے جمہوریت کے اس اصول کا مطالعہ خاص غور سے کیا کہ تمام فیصلے کثرت آراء کے مطابق ہونا چاہئیں علاوہ ازیں میں نے ان ذات شریف کی عقلی اور اخلاقی حیثیت کی بھی پوری پوری تفتیش کر لی جو ''نمائندگان قوم'' کہلاتے تھے اور جن کے ہاتھ میں اس قومی ادارہ کی باگ ڈور سپرد تھی۔

اس طرح بیک وقت مجھے اس ادارہ سے بھی واقفیت ہوگئی، اور مجھ پر اس ادارہ کے چلانے والوں کی قلعی بھی کھل گئی چند ہی برسوں میں مجھے اس فرقہ کے متعلق صاف اور واضح حقائق معلوم ہو گئے جس کی پرستش کرتے وقت انتہا درجہ کی بے احتیاطی برتی جاتی ہے میری مراد پارلیمنٹ کے اراکین سے ہے ان دنوں میں نے اپنے ذہن میں ان لوگوں کے متعلق جو نقشہ قائم کرلیا وہ پھر میرے لیے پتھر کی لکیر ہو گیا کم از کم جہاں تک بنیادی خدوخال کا تعلق ہے میں نے پھر کبھی اس تصویر میں تبدیلی نہیں کی۔

یہاں پھر روزمرہ کی زندگی سے سیکھے ہوئے درس حقائق نے مجھے اصولوں کے گورکھ دھندے میں ہمیشہ کے لیے الجھ جانے سے بچالیا۔ بالعموم پہلی نظر میں پارلیمنٹری اصول کا گورکھ دھندا نہایت دلکش نظر آتا ہے حالانکہ دراصل یہ عقیدہ محض انحطاط انسانی کا آئینہ دار ہے۔

جمہوریت اشتراکیت کا پیش خیمہ ہے

جمہوریت کی جو شکل آج کل مغربی یورپ میں رائج ہے اسے مارکس ازم کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹری نظام کے بغیر مارکس ازم کا تصور بھی نا ممکن ہے۔ جمہوریت ہی وہ ٹٹی ہے جس کی آڑ میں اس عالمگیر طاعون کے جراثیم پرورش پا کر وبا پھیلانے نکلتے ہیں جمہوریت نے پارلیمنٹری نظام اختیار کرکے غلاظت و شہوات کی بھٹی گرم کر دی اس بھٹی کی آگ ہرگز کسی تعمیری کام کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

میں قسمت کا بے حد مشکور ہوں کہ اس نے مجھے یہ مسئلہ وائنا میں ہی سمجھا دیا ورنہ اگر

میں کہیں جرمنی میں ہوتا تو امکان غالب ہے کہ کسی سطحی حل سے ہی مطمئن ہو جاتا اگر میں یہ حقیقت برلن جا کر دریافت کرتا کہ پارلیمنٹ کا ادارہ سرے سے خلاف عقل ہے تو عین ممکن تھا کہ میں ایک انتہائی غلطی سے نکل کر دوسرے انتہائی مغالطہ میں پڑ جاتا کئی دوسرے لوگ ایسے ہی مغالطہ میں پھنس کر رہ گئے اور بظاہر ان کے پاس معقول دلائل کی بھی کمی نہ تھی ان کا خیال تھا کہ سلطنت اور رعایا کی نجات کے لیے فقط ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ شہنشاہ کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپ دیئے جائیں اس عقیدہ کے پیرو زمانہ کے روش سے بیگانہ تھے وہ عامۃ الناس کی آرزوؤں کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

شہنشاہیت جمہوریت سے بھی بدتر ہے

آسٹریا میں یہ مغالطہ اتنا آسان نہ تھا یہاں ایک غلطی سے نکل کر دوسرا بدتر تھا۔ کم از کم بادشاہ کو پارلیمنٹ پر ترجیح دینے کے لیے تو ہرگز کوئی وجہ نہ تھی یہ مسئلہ ایسا نہ تھا کہ خالی پارلیمنٹ کی مخالفت کرنے سے حل ہو جاتا اگر پارلیمنٹ ترک بھی کر دی جائے تو فوراً سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وائنا کی مخالفت اور اس کے تدارک کا صرف یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ تمام اختیارات تاجدار ہیز برگ کے ہاتھ میں چلے جاتے، یہ ایک ایسا نتیجہ تھا جو میرے لیے بالخصوص ناقابل برداشت تھا۔

آسٹریا میں پارلیمنٹری مسئلہ کا حل خاص طور پر مشکل تھا یہی وجہ تھی کہ مجھے اوائل عمر میں ہی اس معاملہ کی تہ تک جانا پڑا۔ شاید عام حالات میں میری یہ تحقیق ہرگز ایسی جامع نہ ہوتی۔

پارلیمنٹ شخصی ذمہ داری کا انکار ہے

پارلیمنٹری نظام کی ایک خصوصیت ایسی تھی، جس نے سب سے پہلے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا، مجھے اس خصوصیت پر غیر معمولی غور و خوض کرنا پڑا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ اس نمائندہ مجلس میں شخصی ذمہ داری کھلے بندوں مفقود تھی۔

پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون یا حکم نافذ کر دیتی، جس کے نتائج تباہ کن ثابت ہوتے ہیں اب ایسا کون ایک شخص ہے جسے آپ انفرادی طور پر اس لغزش کا ذمہ دار ٹھہرا سکیں؟ صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جسے سزا کا مستحق قرار دیا جا سکے۔ یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب کابینہ مستعفی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی حکمت عملی کے مہلک نتائج سے بری الذمہ ہو جاتا ہے پھر کیا ہم یہ قرار دیں کہ جب کوئی نئ پارٹی بنائی جاتی ہے یا پارلیمنٹ منتشر کر دی جاتی ہے تو اس سے ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے؟ ذمہ داری کو تو سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں کہ کسی ایک شخص کو ذمہ دار گردانا جائے۔

پارلیمنٹری حکومت میں ساری کارروائی کی بنیاد تمام اراکین کی مجموعی خواہشات پر رکھی جاتی ہے ایک ایک قدم ان کی رضامندی اور احکام کے مطابق اٹھایا جاتا ہے۔ پھر کسی معاملہ میں پارلیمنٹری حکومت کے قائدین کو کیسے ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے؟ کیا مدبرین سلطنت کا فرض یہ ہے کہ وہ تعمیری کام کرنے اور مفید تجاویز سوچنے کے بجائے ایک احمقوں کے گلے کو اپنی تدبیریں سمجھانے کی کوشش کرتے رہیں؟ کیا ان کے لیے یہی مصروفیت مناسب ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی خوشامدیں کریں ان سے درخواستیں کریں اور پھر ان کی نوابی حاصل کرنے کی فکر میں گھلتے رہیں؟

یہ اکثریت واقعی ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے؟

فرض کیجئے ایک سیاست دان عظیم الشان سیاسی تجویزیں سوچ سکتا ہے اور ان پر عمل درآمد کروانے کی لیاقت بھی رکھتا ہے کیا اب اس کے لیے یہ شرط بھی لازمی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی بات منوا لینے میں ویسا ہی ماہر ہو جیسا کہ کام کرنے کی استعداد رکھتا ہے؟

دونوں کے ذریعہ جو الیکشن کیے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایمانداری پر مبنی نہیں ہوتے اس طرح جو پارلیمنٹ بنتی ہے اس کے رجحانات محض اتفاقات پر انحصار رکھتے ہیں اگر کوئی سیاست دان ایسی مجلس کے اندر اپنی تجویز کے حق میں کثرت آراء حاصل نہیں کر سکتا تو کیا وہ اس ناکامی سے واقعی نا قابل اور نا اہل ثابت ہو جاتا ہے؟

یہ مجلسیں تو ہمیشہ ان عقائد کی طرفداری کرتی ہیں جن کو پہلے سے غلبہ حاصل ہو ان کے نزدیک کسی عقیدہ کی سچائی کا صریح ثبوت اس کی کامیابی ہے کیا کوئی ایک نظیر بھی ایسی مل سکتی ہے جہاں کسی پارلیمنٹری مجلس نے کسی مہتمم بالشان سیاسی عقیدہ کے رائج العام ہو جانے سے پہلے اس کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا ہو؟

کیا یہ صحیح نہیں کہ اس دنیا میں تمام مشاہیر کے کارنامے عامۃ الناس کے جمود کے خلاف ایک گونہ صدائے احتجاج کی نوعیت رکھتے ہیں؟

فرض کیجئے ایک سیاسی مدبر خوشامد درآمد سے پارلیمنٹری جتھے کو اپنی تجاویز کی حمایت پر آمادہ نہیں کر سکتا اب وہ کیا کرے؟ کیا وہ اس رضامندی کو حاصل کرنے کی خاطر کوئی قیمت ادا کرے؟

یا جب اس کے راستے میں دوسرے شہریوں کی احمقانہ ہٹ دھی حائل ہو، تو کیا وہ اپنی تجاویز کو عملہ جامہ پہنانے کا خیال چھوڑ دے۔ فرض کیجئے اسے یقین ہے کہ اس کی تجاویز قوم کی بقاء کے لیے لابدی ہیں۔ کیا اندریں حالات اسے گھر جا بیٹھنا چاہیے یا اپنے اختیارات پر قائم رہنا چاہیے؟

کیا ایسی صورت میں ہر دیانت دار شخص ایک کشمکش محسوس نہیں کرتا؟ ایک طرف اس کی سیاسی بصیرت آگے کھینچتی ہے تو دوسری تقوائے اور شرافت دامن پکڑتے ہیں۔

آخر ذاتی دیانتداری اور قومی فرائض میں سے کسے ترجیح دی جائے؟

کیا یہ درست نہیں کہ ہر شخص جس میں صحیح قائد کے اوصاف موجود ہوں وہ اس طرح ایک سیاسی گداگر بن کر اپنے تئیں ذلیل کرنے سے احتراز کرے گا؟

کیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح نہیں کہ ایسے حالات دیکھ کر ہر پولیٹکل لیموں نچوڑ کے دماغ میں سیاسیات کا ''کھیل'' کھیلنے کا سودا پیدا ہوگا؟ یہ تو اسے خوب معلوم ہے کہ آخری ذمہ داری کبھی انفرادی طور پر اس کے سر نہ آئے گی بلکہ آخری ذمہ داری تو ایسے گمنان ہجوم کے کندھوں پر ہے جس سے کبھی اس کے اعمال کی جواب طلبی نہیں کی جا

سکتی۔

پارلیمنٹ حفظ مراتب کی نفی ہے

پارلیمنٹری حکومت کا ایک اصول یہ ہے کہ تمام فیصلے کثرت آراء کے مطابق ہونے چاہئیں کیا یہ اصول بالاخر قیادت اور تقلید کے اصول کونسیاًمنسیاً نہ کر دے گا؟

کیا کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی کی ابتداء بہت سے آدمیوں کی رائے سے ہوئی تھی اور انفرادی دماغ اس سہرے کا حقدار نہیں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ انفرادی سوچ بچار کے بغیر بھی انسانی تہذیب آئندہ کے لیے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

کہیں حقیقت یہی تو نہیں کہ آج کل افراد کی تخلیقی قابلیتوں کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے؟

پارلیمنٹری اصول کے مطابق قانون سازی کا اختیار کثرت آراء کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے گویا شخصی اختیارات ترک کر کے افراد کی جگہ چند گمنام لوگوں کی ایک مقررہ تعداد جماعت کی صورت میں مسند حکومت پر بٹھا دی جاتی ہے۔

یہ طرز عمل صریحاً قانون حفظ مراتب کے خلاف ہے حفظ مراتب فطرت کا بنیادی قانون ہے البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عہد حاضر ایک انحطاط کا دور ہے اس لیے یہ لازمی نہیں کہ ضرور آج کل کے بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے نو دس ہزار امراء ہی فضیلت کے واحد ٹھیکہ دار قرار دیئے جائیں۔

پارلیمنٹری نظام ادنیٰ ذہنیت کی پیداوار ہے

جن لوگوں کا مطالعہ یہودی اخبارات تک محدود ہے وہ آسانی سے پارلیمنٹ کے تباہ کن اثرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہاں اگر وہ آزادانہ طریقہ سے سوچیں اور بطور خود واقعات کا جائزہ لیں تو پھر ممکن ہے کہ وہ بھی ان اثرات سے آگاہ ہو جائیں کیا وجہ ہے کہ فی زمانہ میدان سیاست میں ادنیٰ قابلیت کے انسانوں کا یہ ہجوم ہے؟ اس کا باعث

یہی پارلیمنٹری نظام ہے ہر شخص جس کے اندر قیادت کے صحیح اوصاف موجود ہوں وہ ان حالات کو دیکھ کر سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے احتراز کرے گا وجہ یہ ہے کہ یہاں کسی تعمیری کام کی استعداد رکھنے والے سیاسی مدبر کی تو گنجائش نہیں یہاں تو ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے سودا کرنا جانتے ہیں ایسا نظام کم ہمت لوگوں کے مزاج کے عین مطابق ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کشش صرف انہی پر اثر کرتی ہے۔

مکاری کی قسم کی ہوشیاری

ان سیاسی بھک منگوں کی وسعت نظر اور دائرہ علم جس قدر تنگ ہوتا اتنا ہی وہ خود اپنے سیاسی سرمائے کا ٹھیک ٹھیک تخمینہ لگانے میں خوب ماہر ہوتے ہیں چونکہ وہ اپنی حیثیت سے واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس نظام کو دل سے پسند کرتے ہیں، جہاں نہ تخلیقی استعداد کی ضرورت ہے نہ اعلیٰ درجہ کی قابلیت کی یہاں تو فقط وہ مکاری کی ہوشیاری درکار ہے جو شہروں کے دفتری بابوؤں کو طغرائے امتیاز ہوا کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان سیاسی بھک منگوں کے نزدیک یہ ادنیٰ درجہ کی مکاری بڑے سے بڑے سیاسی حکماء کی دانش پر بھی ترجیح رکھتی ہے اس کی بدولت انہیں اپنی قابلیت کے باوجود اپنی کرتوتوں کی ذمہ داری خود برداشت کرنے کا کوئی ڈر نہیں۔ انہیں شروع سے علم ہے کہ چاہے ان کے "تدبر" کے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں انجام وہی ہونا ہے جو قسمت نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے وہ فیصلہ یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں اپنا بوریا بندھنا اٹھانا پڑے گا۔ اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے دماغی قابلیت رکھنے والے کی خاطر میدان خالی کرنا ہوگا۔ زمانہ انحطاط کی یہ ایک اور خصوصیت ہوا کرتی ہے کہ جوں جوں انفرادی شخصیتوں کا معیار پست ہوتا جائے توں توں "ممتاز اور سربرآوردہ سیاست دانوں" کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ فرداً فرداً جس قدر سیاست دانوں کو کثرت آراء پر انحصار رکھنا پڑے اتنا ہی شخصی قابلیت کا معیار گرتا جائے گا۔ ہر وہ شخص جو صحیح سیاسی قابلیت کا مالک

ہے اسے مرغوں کی اس ذلیل پانی کے در پر امیدواری کرنے میں عار محسوس ہوگا۔ یہ لوگ اکثریت کے نمائندے ہیں اور اکثریت ہمیشہ احمقوں کے ہجوم کا دوسرا نام ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹری نمائندوں کو ایک اعلیٰ درجہ کے دماغ سے جیسی نفرت ہوتی ہے اور کسی شے سے نہیں ہوتی۔

للو اور کلو کی وزارتیں

اگر پارلیمنٹ کے ان ذلیل اراکین کا سردار بھی دماغی قابلیت کے لحاظ سے اسی کنویں کا مینڈک ہو جس میں وہ خود قید ہیں تو اس سے ان کو قلب کو بڑی تسکین رہتی ہے ایسے ہم چشموں کے باہمی بحث مباحثہ میں ہر ایک کے لیے اظہار قابلیت کا موقعہ ہوتا ہے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر ایک کو تسلی رہتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی چوٹی پر پہنچ جائے گا اگر آج کلو میاں برسر اقتدار ہیں تو کل حضرت للو کی باری کیوں نہ آئے۔

جمہوریت کی نئی آنچ ایک خاص عارضہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے جو کچھ دنوں سے خطرناک حد تک پھیل گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے نام نہاد سیاسی قائدین کی ایک بڑی تعداد بزدلی کے مرض میں گرفتار ہے۔ جب کبھی کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو۔ یہ لوگ اکثریت کی نئی کھڑی کر کے اس کی آڑ میں اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگتے ہیں اگر یہ چال کامیاب ہو جائے تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔

ان سیاسی کٹھوں کے ہتھکنڈے قابل دید ہوتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے کثرت آراء کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر عجیب عجیب خوشامدوں اور حیلے بہانوں سے کام نکالتے ہیں انہیں اپنے جرم میں کئی حصہ داروں کو بھی شریک رکھنا پڑتا ہے تاکہ جب کبھی ضرورت پڑے ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈالی جا سکے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد دلیر اور چال چلن والے اشخاص کے دلوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ادنیٰ اور ذلیل قسم کے لوگوں کے لیے ایسی دکانداری خاص جاذبیت رکھتی ہے

جو شخص اپنے اعمال کی ذمہ داری خود قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ ہمیشہ کسی اوٹ کی تلاش میں رہتا ہے وہ یقیناً لچوں اور بدمعاشوں کی فہرست میں داخل کیے جانے کے قابل ہے۔

قیادت تقلید کا نام نہیں

اگر کسی قوم کا رہنما اسی ذلیل طبقہ کے سیاسی لیڈروں میں شامل ہو تو اس کے مہلک نتائج جلد ہی ظاہر ہونے لگیں گے کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کا کسی کو حوصلہ نہ ہو گا اس وضع کے لوگ جرات کے ساتھ کوئی صاف صاف پالیسی اختیار کرنے کے بجائے بدنامی اور لعنت ملامت برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ایسا کوئی آدمی نہیں نکلتا جو ضرورت پڑنے پر ایک مقررہ اور واضح حکمت عملی کی خاطر اپنا رتبہ اور سیاسی زندگی بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کرے۔

ایک حقیقت ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے اور وہ یہ کہ کثرت آراء کبھی شخصی فرائض سر انجام نہیں دے سکتی کثرت آراء محض جہالت اور بزدلی کی آئینہ دار ہے ایک عقل مند کی رائے کے مقابلہ میں سو احمق کوئی وقعت نہیں رکھتے علی ہذا القیاس جن سیاسی مہمات کے لیے اخلاقی قوت اور استقلال کی ضرورت ہو وہاں سینکڑوں ڈرپوک بھی کام نہیں دے سکتے۔

خدمت قوم کے بیتاب شوقین

رہنماؤں کی انفرادی ذمہ داری کا بوجھ کم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کئی لوگ باوجود افسوسناک نا قابلیت کے اپنی ''لازوال قوتیں'' قوم کی خدمت میں خرچ کرنے کو بے تاب ہو جاتے ہیں جوں جوں ذمہ داری کا بوجھ کم ہوتوں توں ان حضرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ہنہیں خیال ہوتا ہے کہ ان کے لیے ''قوم کی خدمت'' کرنے کا وقت آ پہنچا ہے وہ توقعات کی شدت سے ایسے بے صبر ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی باری کا انتظار کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے یہ ''فدایان قوم'' ایک لمبی

قطار میں آگے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں ہر شخص ایک اداسی کے عالم میں کڑھتے ہوئے شمار کرتا رہتا ہے کہ اس پر سبقت رکھنے والوں کی تعداد کیا ہے اور آخر کار خود اس کے برسر اقتدار آنے میں کتنی گھڑیاں باقی ہیں جس عہدے پر ان کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں اس میں کوئی ذراسی تبدیلی بھی ہو تو وہ فوراً متوجہ ہوتے ہیں جو لوگ اس قطار میں ان پر سبقت رکھتے ہیں ان میں سے اگر کوئی ایک امیدوار بھی کسی بدنامی کا شکار ہو کر نکل جائے تو وہ ہزار ہزار شکر بجالاتے ہیں اگر کوئی شخص عہدہ داری کے مونڈھے پر زیادہ دیر بیٹھ جائے تو اس کی یہ حرکت قریب قریب اس مقدس عہدنامہ کی خلاف ورزی کے مترادف تصور کی جاتی ہے جس کی رو سے باہمی اتحاد قائم ہے انتظار کرنے والے اس ''غاصب'' کے خلاف ایسے مشتعل ہو جاتے ہیں کہ جب تک اسے ہمیشہ کے لیے خارج نہ کر آئیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب وہ نکل جاتا ہے تو اس کی آرام دہ مسند پھر وقف عام ہو جاتی ہے اب اسے ہرگز کبھی دوبارہ یہ موقعہ نہیں دیا جاتا بالعموم جو عہدہ دار ایک دفعہ اپنے عہدے سے معزول ہو جاتے ہیں وہ ازسر اسی قطار میں آکھڑے ہوتے ہیں ہاں اگر دوسرے امیدوار شور مچا کر باہر تک تعاقب کریں تو پھر مجبوری ہے۔

پارلیمنٹ سے طوائف الملوکی پھیلتی ہے

اس تمام کہانی کا نتیجہ کیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جس حکومت کے سرکاری عہدوں اور سرکاری مراتب میں ایسی جلد تبدیلی ہو وہاں عام بدامنی پھیل جانا ایک لازمی امر ہے ان حالات میں کوئی نازک حادثہ درپیش آجائے تو انجام سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ پارلیمنٹری اثرات صرف جاہل اور نالائق لوگوں ہی کو نہیں بگاڑتے بلکہ جو شخص صحیح معنوں میں قائد ہو وہ بھی دوسروں کی طرح اس بلا کا شکار ہو جاتا ہے کہا جا سکتا ہے کہ قسمت کہیں کسی لائق انسان کو قیادت پر مامور کر دے تو وہ اور زیادہ نشانہ بنتا ہے ادھر اس قائد کی برتری ثابت ہوئی اور ادھر اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوا۔ اگر ایسا قائد عام پارلیمنٹری صفوں سے نہیں اٹھا لیکن شومئی قسمت سے تمام پارلیمنٹری مخلوق کے ساتھ

مل جل کر رہنے کی کوشش کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی کمبختی آ گئی۔ جوں جوں وہ ان احمقان نامدار سے برابر کے درجہ پر ملاقات کی عادت بڑھاتا ہے توں توں ان کی دشمنی اور تیز ہوتی ہے وہ تو بس اپنی ہی منڈلی میں اٹھنا بیٹھنا چاہتے ہیں جو شخص ان کی محفلوں میں شریک ہو اور اس کی قابلیت دوسروں کے مقابلہ میں کھلم کھلا برتر ثابت ہو جائے۔ اس کے خلاف وہ فی الفور مخاصمانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں ان کی فراست جہاں دوسری باتوں میں ایسی کند واقع ہوئی ہے وہاں اس معاملہ میں غیر معمولی طور پر حساس ہے۔

اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ حاکم طبقہ کا ذہنی معیار روز بروز پست ہوتا رہتا ہے یہ نتیجہ نا قابل گریز ہے اس پستی کی رفتار مستقل ہے۔ اگر انسان خود ان لیڈروں کی فہرست میں شامل ہونے کے باعث آنکھوں پر پٹی نہ باندھ لے تو یہ قیاس کرنا قطعاً مشکل نہیں کہ قوم اور حکومت کو ایسی صورت حالات سے کتنا نقصان پہنچتا ہے۔

میں نے اوپر جو نقشہ کھینچا ہے آسٹریا کی پارلیمنٹری حکومت ہو بہو اس کا عکس تھی۔

پارلیمنٹ خوانچہ فروش سیاستدانوں کا بازار ہے

یہ درست ہے کہ آسٹریا کا وزیر اعظم خود شہنشاہ مقرر کرتا تھا لیکن اس کی تقرر کی اصلیت فقط اتنی تھی کہ پارلیمنٹ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ ہر وزیر کے انتخاب کے موقعہ پر ایک تازہ نیلام ہوتا تھا سودا کرتے وقت خوب کھینچا تانی ہوتی تھی غرض مغربی جمہوریت کی خصوصیتوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ جیسے وہ اصول تھے جن پر عمل کیا جاتا تھا ویسے ہی ان سے نتائج برآمد ہوتے تھے ایک عہدہ دار ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا آدمی مقرر کرنے کو جو وقفہ درکار تھا وہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ انجام کار اس تقرر اور معزولی کی مثال ایسی ہو گئی تھی جیسے بچے باری باری آنکھ مچولی کھیلتے ہیں ہر عہدہ میں جب تبدیلی ہوتی ہمیشہ نئے مدبر اپنے پیشرو سے بھی بدتر ثابت ہوتے۔ بہتر کوئی نہ آتا تھا۔ تاوقتیکہ آخر کار ہر جگہ انہیں ادنیٰ درجہ کے خوانچہ لگانے والے سیاست دانوں کا دور دورہ ہو گیا۔ ان لوگوں میں سبقت اور تدبر کا امتحان یہ ہے کہ کوئی شخص پارلیمنٹ میں ایک مخلوط پارٹی

کا اتحاد ٹوٹ جانے کے بعد دوسرا جتھا کس پھرتی سے تیار کرتا ہے الغرض خفیف اور نا چیز سیاسی سودوں کے طے کرنے میں عیاسی کا اظہار ان نمائندگان قوم کی واحد دلچسپی ہے۔

پارلیمنٹ جاہلوں کی مجلس ہوتی ہے

اس سلسلہ میں وائنا کا درس عبرت دیگر تمام مقامات سے زیادہ پر اثر تھا ایک خصوصیت کا تو میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایک دوسری خصوصیت یہ تھی جس نے مجھے اتنا ہی متاثر کیا جتنا کہ پہلی خصوصیت نے کیا تھا۔ وہ یہ کہ ان کے فرائض کے مقابلہ میں ان تمام ''نمائندگان قوم'' کی عملی و عقلی استعداد کچھ بھی نہ تھی حکومت مختلف اقوام سے مرکب تھی ان اقوام کے نمائندوں کی تنگ نظری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ نظر انداز نہ کی جا سکتی تھی انسان ان کرتبوں پر غور کرنے کو مجبور ہو جاتا تھا جن سے یہ ''شرافت کے نمونے'' قومی زندگی میں بار حاصل کرتے تھے۔

جس ڈھنگ سے ان معززین کے حقیقی جوہر ملک کی خدمت کے دوران میں کھلتے تھے اس کا پورا پورا مطالعہ اور امتحان کرنا ایک نہایت سبق آموز دلچسپی تھی اس تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کے طریق کار کا پورا پورا تجزیہ کیا جائے۔

جب پارلیمنٹری سرگرمیوں کے اندرونی کارخانہ کا راز معلوم کر لیا جائے اور جن شخصیتوں اور اصولوں کے بل بوتے پر یہ سارا نظام قائم ہے ان کو بغیر کسی رعایت کے حقیقت کی روشنی میں ننگا کر کے دیکھا جائے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیر انظر آتا ہے۔ پارلیمنٹری نظام کے حامی یوں تو ہر وقت حقیقت شناسی کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن لطف تب ہے کہ خود ان کے دعاوی کی تحقیق بھی حقیقت اور محض حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جائے حقیقت شناسی کے اصول پر رائے قائم کی جائے اور پھر اسی بناء پر فیصلہ بھی صادر ہو۔ جب ان معززین اور ان کی سرگرم زندگیوں کے اصولوں کی چھان بین کی جائے تو انسان نتائج دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اگر ہم پارلیمنٹری اصولوں کو حقیقت

شناسی کے معیار پر جانچیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ان سے بودا اصول شاید دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔

جمہور کوتہ اندیش ہوتے ہیں

اس نظام کی تحقیق کرتے وقت ہم ان ہتھکنڈوں کو نظر انداز کیے دیتے ہیں جن سے نمائندوں کا الیکشن کیا جاتا ہے ہم ان حرکتوں سے بھی درگزر کر لیتے ہیں جو عہدے تفویض کرتے وقت اور نئے نئے خطابات حاصل کرنے کے دوران میں سرزد ہوتی ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل انتخاب سرانجام پاتا ہے اس میں عوام کی خواہشات اور ضروریات کا دخل نہ ہونے کے برابر ہے ہر شخص جسے عامۃ الناس کی سیاسی ذہانت کا صحیح تخمینہ ہے وہ باآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ عامۃ الناس کی سیاسی ذہانت کا صحیح تخمینہ ہے وہ باآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ عامۃ الناس کی بصیرت ایسی اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی جس سے وہ خود بخود سیاسی کلیات قائم رکھ سکیں۔ نہ ہی ان میں یہ استعداد ہے کہ وہ اپنی رائے پر عمل درآمد کرانے کے لیے صحیح کارندے چن سکیں۔

رائے عامہ ہوتی نہیں بنائی جاتی ہیں

''رائے عامہ'' کی چاہے کوئی تعریف گھڑ لو۔ یہ بہر صورت ماننا پڑے گا کہ اس رائے میں ذاتی تجربہ یا شخصی بصیرت کو برائے نام ہی دخل ہے۔ ورنہ بیشتر رائے عامہ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ امور سلطنت کے متعلق عوام کو کس قسم کی ''واقفیت'' بہم پہنچائی جائے وہ واقفیت بہم پہنچانے کا انتظام جیسا پر اثر اور مستقل ہوگا ویسے ہی رائے عامہ کو اپنے سیلاب کے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ مذہبی حلقوں میں بھی دیکھ لو ہر فرقہ کے عقائد زیادہ تر تعلیم کا نتیجہ ہیں مذہب کی قدرتی پیاس جو ہر انسان کے اندر ودیعت ہے وہ تو اسی طرح خفتہ رہتی ہے جیسے کہ خود روح بظاہر مذہب کے جتنے چرچے ہیں وہ سکھانے پڑھانے کا اثر ہے علی ہذا القیاس عامہ الناس کے سیاسی عقائد بھی بالاخر دیکھا جائے تو ایسے ہی تاثرات کی پیداوار ہوتے ہیں یہی تاثرات ہیں جو بالالتزام انسان

کے جذبات اور قوائے عقلی کو اپنے ڈھنگ پر لے آتے ہیں۔شرط صرف یہ بات ہے کہ مافوق العادت مستقل مزاجی سے کام لیا جائے اور ان تاثرات کو ہر پہلو سے مکمل کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

پارلیمنٹ ذلیل اخبارات کا کھلونا ہے

سیاسی تعلیم وتربیت کا موثر ترین حربہ اخبارات کے ہاتھ میں ہے اس حربہ کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بہترین لفظ ''پراپیگنڈہ'' ہے۔عامۃ الناس کو سیاسیات کے متعلق ''واقفیت'' بہم پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی اخبارات ہیں گویا اخبارات تعلیم بالغاں کے اسکول ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہ تعلیمی سرگرمی حکومت کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ ان اسکولوں پر چند ایسی طاقتوں کا قبضہ ہے جن کا ایک حصہ نہایت ذلیل طبقہ سے تعلق رکھتا ہے میں بھی وائنا میں ایام جوانی ہی بسر کر رہا تھا کہ مجھے ان لوگوں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا جو عوام کی رہنمائی کرنے والی اس مشین کو چلاتے تھے ساتھ ہی ساتھ میں نے ان اشخاص کی بابت بھی تحقیق کر لی جو اس مشین کے ذریعہ پھیلائے جانے والے خیالات مہیا کرتے تھے۔پہلے پہل جب مجھے علم ہوا کہ سلطنت کے اندر یہ کیسی خطرناک طاقت ہے تو میں حیران رہ گیا اخبارات تھوڑے ہی عرصہ میں جو اعتقاد چاہتے تھے عوام میں رائج کر دیتے تھے ایسا کرتے ہوئے عوام کے اصلی اعتقادات اور ارادوں کو بالکل مسخ کر دیا جاتا۔اخبارات جب چاہتے کسی معمولی سے معمولی مسئلہ کو چند ہی روز میں بڑھا چڑھا کر ایک قومی اہمیت کا سوال بنا دیتے۔ضروری مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے لوگوں کو توجہ سے ہٹا کر پس پشت ڈال دیا جاتا۔

صحافت سفلوں کی پرورش کرتی ہے

اخبارات کے پاس کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ چند ہی ہفتوں میں گمنام لوگوں کے نام مشہور کر دیتے وہ پوری کامیابی کے ساتھ ثابت کر دیتے تھے کہ عوام کی امیدیں انہیں ناموں کے ساتھ وابستہ ہیں الغرض وہ ان ناموں کو ایسا ہردلعزیز کر دیتے کہ کوئی صحیح

معنوں میں قابل شخص شاید عمر بھر میں بھی ایسی نیک نامی حاصل نہ کر سکے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان حالات میں کیا جاتا جبکہ یہ نام قطعاً گمنام ہوتے تھے۔ اخبارات نے جب سے انہیں بانس پر چڑھانا شروع کیا اس سے ایک مہینہ پہلے کبھی ان کا ذکر بھی سننے میں نہ آیا تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسیات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں پرانی اور آزمائی ہوئی شخصیتیں عوام کے حافظہ سے فراموش کر دی جاتیں گویا وہ مر چکے ہیں حالانکہ وہ بالکل تندرست اور ان کے قویٰ پورے چاق و چوبند ہوتے تھے بعض اوقات ان لوگوں کو ایسی بری طرح بدنام کیا جاتا کہ گویا تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے نام ذلیل ترین کمینگی کے لیے ضرب المثل بن جائیں گے اخبارات نہایت برے راستہ پر ڈال سکتے تھے اس برائی کا احساس کرنے کے لیے بدمعاش یہودیوں کی ایک چال کی تحقیق کرنا لازمی تھا وہ چال یہ تھی کہ شریف اور باعزت لوگوں پر غلاظت اور کیچڑ اچھالا جاتا۔ انہیں گالیوں اور بہتانوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ بیک وقت ہزار در ہزار آوازیں ان کے خلاف ایک ایسا طوفان بے تمیزی بپا کر دیتی تھیں کہ گویا کوئی افسوں پڑھ کر پھونک دیا گیا ہے۔

ان راہزن ڈاکوؤں کو کسی حربہ کے استعمال سے عار نہ تھا۔ شرط فقط یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کے اپنے برے منصوبے پورے ہو جائیں۔

اخبار نویسوں کا ”پیشہ ورانہ وقار“ ایک ڈھونگ ہے

یہ لوگ خوامخواہ پوشیدہ سے پوشیدہ خاندانی رازوں کی چھان بین کرتے پھرتے تھے۔ جس آدمی کو انہوں نے اپنا نشانہ بنایا ہوتا جب تک اس کے خلاف کوئی مواد ہاتھ نہ آ جائے انہیں چین نہ پڑتا تھا۔ پھر چاہے وہ بات کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو یہ اس کی شہرت خراب کر کے ہی دم لیتے۔ اگر اس جاسوسی کا نتیجہ یہ نکلے کہ اس شخص کی ذاتی زندگی میں کوئی قابل اعتراض شے ہاتھ نہ آئے پھر بھی ان کی زبان برا بھلا کہنے سے بند نہ ہوتی تھی۔ وہ توقع رکھتے تھے کہ چاہے ہزار تردید کی جائے پھر بھی ہماری بدگوئی کچھ نہ کچھ اثر

تو ضرور کرے گی اکثر نتیجہ یہی ہوتا کہ ملزم غریب کے لیے اپنی صفائی کی کوشش جاری رکھنا محال ہو جاتا تھا۔ وہ یوں کہ ایک ایک الزام لگانے والے کے ساتھ کئی کئی تائید کرنے والے ہوتے۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد وہی بہتان تراشیاں بار بار دہرائی جاتی تھیں مزید بریں یہ بہتان لگانے والے کبھی ظاہر نہ کرتے تھے کہ ان کی نیت میں کسی ایسے مقصد کو دخل ہے جیسے کہ عام لوگوں کی دشمنی کے باعث ہوا کرتے ہیں حاشا وکلا یہاں تو جو بدمعاش اپنے معاصرین کو ایسی بے حیائی سے بدنام کرتا، وہ ساتھ ہی اپنے سر پر صاف گوئی کا سہرا بھی باندھ لیتا تھا۔ وہ اس طرح کہ کچھ تو چرب زبانی کام آتی تھی کچھ بحیثیت ایک اخبار نویس کے اپنے فرائض بیان کر کے اس کے متعلق بکواس کی جاتی تھی کچھ ایسی ہی دوسری فضول باتوں سے مطلب برآری کر لی جاتی۔ جب جلسوں اور کانفرنسوں کے موقعہ پر یہ بزدل گندی مچھلیاں کثیر تعداد میں جمع ہو جاتیں تو وہاں عزت کے ایک خاص قسم کے متعلق بہت سے منافقانہ چرچے ہوتے تھے ان لوگوں نے عزت کی اس قسم کا نام "اخبار نویسوں کا پیشہ ورانہ وقار" رکھا ہوا تھا بعد ازاں اس چنڈال چوکڑی میں باہم ایک دوسرے کی مدح وستائش کا ڈھونگ رچایا جاتا۔

یہ ہیں وہ حضرات جو نام نہاد "رائے عامہ" کے گھڑنے میں دو تہائی سے بھی زیادہ دخل رکھتے ہیں پھر اسی رائے عامہ کے انجرات سمٹ سمٹا کر پارلیمنٹ کی رادھا دیوی عالم وجود میں آتی ہے۔

پارلیمنٹ انسانی گمراہی کا مندر ہے

اگر کوئی شخص پارلیمنٹری طریق عمل کے تمام مرحلے بیان کرنے چاہے۔ اور اس کی کھوکھلی اور غلط بنیادوں کا پورا پورا کچا چھٹا لکھنے بیٹھے تو اس کے لیے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی، لیکن تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جائے اور سارے نظام کو فقط عملی پہلو سے دیکھا جائے، تو جو کچھ میں نے اوپر کہہ دیا ہے وہ بھی کافی ہے اس سے ایک سادہ سے سادہ اور بھولے سے بھولے انسان کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اگر اب وہ پارلیمنٹری ڈھونگ کو

حقیقت شناسی کی نگاہ سے دیکھیے تو اس کی بیہودگی کا احساس کرنا کچھ مشکل نہیں۔

پارلیمنٹری نظام انسانی گمراہی کی پیداوار ہے یہ نظام جتنا بیہودہ ہے اتنا ہی ضرر رساں بھی ہے ان حقائق کو سمجھنے کا بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ پارلیمنٹری جمہوریت کا مقابلہ جرمن وضع کی اصلی جمہوریت سے کیا جائے۔

پارلیمنٹ موقعہ پرستوں کا ہجوم ہے

پارلیمنٹری جمہوریت کی سب سے زیادہ قابل غور خصوصیت یہ ہے کہ چند لوگ ۔۔۔۔۔فرض کر لیجئے پانچ سو۔۔۔۔۔۔جن میں اب کچھ عرصہ سے عورتیں بھی شامل ہیں۔۔۔۔پارلیمنٹ کے نمائندے منتخب کر لیے جاتے ہیں اب انہیں اختیار ہے کہ ہر ایک بات میں اور کسی معاملہ میں جس طرح چاہیں قطعی فیصلہ صادر کر دیں۔عملاً دیکھا جائے تو یہی لوگ حکومت کے ادارے پر قابض ہیں اگر چہ وہ ایک کابینہ مقرر کر لیتے ہیں جو بظاہر امور حکومت کا انفرام کرتا ہے۔لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو کابینہ کا اپنا کوئی وجود نہیں اصلیت یہ ہے کہ نام نہاد وزارت پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔نہ ہی وزارت سے کوئی جواب طلبی کی جا سکتی ہے وہ یوں کہ فیصلہ کا انحصار وزارت پر تو ہے نہیں۔فیصلہ کا اختیار تو پارلیمنٹ کی اکثریت کے ہاتھ میں ہے کابینہ محض اکثریت کے ارادے پورے کرنے کے لیے ایک آلہ کار ہے۔کابینہ کی سیاسی قابلیت کا معیار لے دے کر یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے تئیں کہاں تک اکثریت کے منشاء کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔یا اکثریت کو کہاں تک اپنی تجویزیں منوا سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وزارت کو ایک حاکم کا اصلی مرتبہ ترک کر کے ایک گداگر کی طرح ہنگامی اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر اقدام سے پہلے کابینہ کو برسر اقتدار اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کی فکر لاحق رہتی ہے۔اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو پھر کابینہ کو اپنے حسب منشاء رجحان رکھنے والی نئی اکثریت قائم کرنے کی تجویزیں سوچنی پڑتی ہیں اگر ان دونوں میں سے کوئی کوشش کامیاب ہو گئی تب تو کابینہ

کچھ تھوڑے عرصے کے لیے اور حکومت کرتی رہتی ہے ورنہ اکثریت حاصل کرنے میں ناکامی ہو تو اس کا مستعفی ہونا لازمی ہے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فی نفسہ حکومت کی حکمت عملی درست تھی یا غلط۔

نتیجہ یہ ہے کہ عملاً کوئی ذمہ داری برقرار نہیں رہتی۔ ایسی صورت حالات سے کیا کیا نتائج بد پیدا ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا ہو تو مندرجہ ذیل نکات پر غور فرمائیے، جن کا سمجھنا نہایت آسان ہے۔

الیکشنوں سے مدبر پیدا نہیں ہوا کرتے

یہ عوام کے منتخب کردہ پانچ سو نمائندے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتے آئے ہیں۔ ان کی سیاسی قابلیتوں میں انتہائی درجہ کی تفاوت پائی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ سارے جتھے میں متضاد عناصر بھرے پڑے ہیں۔ بعض اوقات اس جتھے کا نقشہ نہایت افسوس ناک کیفیت پیش کرتا ہے۔ یقیناً کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قوم کے یہ منتخب شدہ نمائندے کوئی برگزیدہ روحیں ہیں۔ یا اول درجہ کا دماغ رکھتے ہیں۔ کون بے وقوف کہہ سکتا ہے کہ ووٹ کی صندوقچی میں پرچیاں ڈال کر یکلخت سینکڑوں مدبر پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ پرچیاں ڈالنے والے تو خود معمولی لیاقت کے مالک ہوتے ہیں اس احمقانہ واہمہ کی جتنی مذمت کی جائے تھوڑی ہے کہ تمام مرد و زن کو ووٹ کا حق دے کر غیر معمولی قابلیت کے انسان پیدا کیے جا سکتے ہیں اول تو جس عہد میں کسی قوم کے ہاں کوئی صحیح مدبر پیدا ہوا سے ایک نہایت مبارک زمانہ قرار دینا چاہیے۔ ایسے مدبر بیک وقت سینکڑوں کی تعداد میں نہیں اگ آیا کرتے۔ دوسرے ہر نمایاں قابلیت رکھنے والے شخص کے خلاف عامۃ الناس میں طبعاً ایک مخاصمت کا جذبہ پایا جاتا ہے کسی صحیح معنوں میں بڑے آدمی کو الیکشن کے ذریعہ تلاش کر لینے کی نسبت اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

تاریخ کے تمام ایسے واقعات جو عامۃ الناس کی معمولی سطح سے بلند سمجھے جاتے ہیں

اکثر و بیشتر کسی ایک شخصیت کی جواں ہمتی سے ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔

برعکس اس کے یہاں پانچ سو آدمی اکٹھے بیٹھ کر قوم کے اہم ترین معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں پھر ان پانچ سو کی ذہنی قابلیت کا معیار واجبی سے بھی کم ہے یہ لوگ کابینہ مقرر کرتے ہیں اور کابینہ اس کے صلے میں اس با توقیر مجلس کی رضامندی حاصل کرنے میں مہارت پیدا کرتا ہے۔

قانون سازی کے ہر مرحلہ پر اس کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے مقصد یہ کہ جس حکمت عملی پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ درحقیقت پانچ سو آدمیوں کی حکمت عملی ہے۔

سچ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ حکمت عملی بھی اپنے سرچشمہ ہی کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔

پارلیمنٹ ''ہرفن مولا'' لال بجھکڑوں کی انجمن ہے

آیئے ہم کچھ عرصہ کے لیے ان نمائندوں کی ذہنی قابلیت کو نظر انداز کیے دیتے ہیں اور خالی یہ دیکھتے ہیں کہ اس کام کی نوعیت کیا ہے جو ان کے سپرد کیا جاتا ہے یہ حقیقت مد نظر رکھنی چاہیے کہ جن مسائل پر بحث و تمحیص کر کے ان کا حل تلاش کرنا ہے وہ مختلف اور قسما قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں آپ خود ہی قیاس کیجئے کہ جو نظام حکومت ایسے معاملات پر فیصلہ صادر کرنے کا حق عامۃ الناس کی ایک بھیڑ کو سونپ دیتا ہے وہ کیسا نکما ہو گا۔ پھر طرفہ یہ ہے کہ اس ساری مجلس میں ان لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ ہو گی جنہیں وہ علم اور تجربہ حاصل ہو جو ایسے مسائل طے کرنے کے لیے لازمی ہے اہم سے اہم اقتصادی مسائل ایک ایسی عدالت کے اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں جس کے اراکین میں سے دسویں حصہ کو بھی بمشکل اقتصادی مبادیات پر عبور حاصل ہو گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آخری فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ابتدائی تربیت سے بھی نرے کورے ہیں۔ حالانکہ یہی تربیت مسائل زیر بحث پر رائے دینے کے قابل بنا سکتی ہے۔

یہی حال دوسرے تمام مسائل کا ہے ہمیشہ جاہلوں اور نالائقوں کی اکثریت ہر اقدام کا فیصلہ کرتی ہے۔ پارلیمنٹ کی تو جیسی ساخت ہے اس میں کوئی تبدیلی ہوتی نہیں لیکن فیصلہ طلب معاملات قومی زندگی کے نت نئے پہلو پیش کرتے ہیں سوچ سمجھ کر رائے دینے کا امکان تبھی ہوسکتا تھا اگر مختلف مسائل طے کرنے کا اختیار مختلف اراکین کو سونپا جاتا یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ ذرائع آمدورفت پر رائے دے سکتے ہیں وہی خارجی حکمت عملی پر بھی عبور رکھتے ہیں ایسا تو صرف تبھی ہوسکتا ہے جب تمام اراکین ہر فن مولا ہوں اور ان میں سے ہر شخص ایک مرد خدا کا مرتبہ رکھتا ہو۔ لیکن اس موقعہ پر یاد رکھنا چاہیے کہ مرد خدا تو کہیں ہر سو سال کے بعد ایک پیدا ہوتا ہے مرد خدا کا ذکر پارلیمنٹ میں با دماغ انسانوں کی بھی کمی رہتی ہے یہاں تو بس زنانی وضع کے نیم نر، تنگ نظر، بر خود غلط، گستاخ اور بدترین ذہنی عصمت فروش بھرے پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ ”معزز شرفا“ مسائل پر غور کرنے اور انہیں حل کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسے حیرت انگیز ہلکا پن کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسے دقیق مسائل ہوتے ہیں کہ جن پر کوئی بڑے سے بڑا عالی دماغ بھی سوچنے بیٹھے تو اسے خون پسینہ ایک کرنا پڑے۔ جن اہم اور نازک الجھنوں پر سلطنت کی آئندہ زندگی کا انحصار ہے ان کو سلجھاتے وقت ایک ایسا ماحول ہوتا ہے کہ گویا تاش کھیلنے بیٹھے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ قوم کی قسمت کے ناخدا بننے کے بجائے الگ بیٹھ کر تاش ہی کھیلیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اب کیا ہم یہ فرض کرلیں کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن طبعاً ہی ایسا غیر ذمہ دار پیدا ہوتا ہے؟ ایسا فرض کرنا تو بعید از قیاس اور خلاف انصاف ہوگا۔

پارلیمنٹ بددیانتوں کا تکیہ ہے

یہ نظام افراد کو ایسے معاملات پر رائے صادر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے جن کے متعلق انہیں کچھ قابلیت نہیں ہوتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انفرادی اخلاق گرتا چلا جاتا ہے کسی شخص کو یہ کہنے کی جرات باقی نہیں رہتی کہ ” صاحبان مجھے افسوس ہے ہم جن مسائل پر

گفتگو کر رہے ہیں ہمیں ان کے متعلق کچھ علم نہیں کم از کم میں اپنی بابت تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے زیر بحث معاملات میں کوئی دخل نہیں'' یہاں ایک اور آفت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا اعلان کر بھی دے تو اس سے صورت حالات میں کوئی زیادہ فرق پیدا نہیں ہوگا ایسی صاف گوئی اور دیانت داری کی قدر کون کرتا ہے جو شخص اس طرح کھلے کھلے حق بات کہہ دے اس کی بابت خیال کیا جائے گا کہ وہ ایک خاصا شریف گدھا ہے جسے یہ سارا کھیل خراب کرنے کی اجازت نہ دینی چاہیے۔ جن لوگوں کو نفس انسانی کے متعلق واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی اپنے ساتھیوں میں احمق مشہور ہونا پسند نہیں کرتا۔ بعض حلقے ایسے ہیں جہاں دیانت داری کو حماقت کا نشان تصور کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک فطرتاً ایماندار آدمی پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہو جائے تو وہ بھی آخر کار دوسروں ہی جیسا طرز عمل اختیار کرنے پر راغب ہو جاتا ہے یہ طرز عمل مفاد عامہ سے غداری کے مترادف ہے جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ شخصی طور پر کسی فیصلہ میں شرکت کرنے سے احتراز بھی کیا جائے گا تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق نہ آئے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیانت کا تھوڑا بہت خیال جو کبھی کبھار کسی نہ کسی شخص کا ضمیر بیدار کر دیتا ہے، وہ بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ انجام کار ایک نیک نیت رکن بھی یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے تو بدتر نہیں اگر میں ان کے طرز عمل میں شریک نہ رہوں تو ممکن ہے وہ کوئی اس سے بھی بری روش اختیار کر لیں۔

یہاں ممکن ہے فریق مخالف کی جانب سے جواب دیا جائے۔ وہ کہہ سکتے ہیں گو انفرادی طور پر ہر ایک رکن اتنا علم نہیں رکھتا کہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہونے والے متفرق مسائل پر صواب دید سے اظہار رائے کر سکے، لیکن تمام اراکین کا فیصلہ ان کی پارٹی کے تابع ہوتا ہے اور پارٹی ہر سیاسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے علاوہ بریں مسائل زیر بحث طے کرنے کے لیے پارٹی ماہرین کی خاص کمپنیاں مقرر کرتی ہیں ان ماہرین کو حاجت سے زیادہ علم ازبر ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ سے سازشی سیاست کو فروغ ہوتا ہے

پہلی نظر میں شاید یہ دلیل معقول دکھائی دے لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب ''اہم ترین مسائل کا فیصلہ کرنے کی عقل صرف چند آدمیوں میں پائی جاتی ہے تو یہ پانچ سو اشخاص کا انتخاب کس مقصد کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے؟''

ہمارے زمانہ کے جدید پارلیمنٹری نظام کا منتہائے نظر یہ نہیں کہ اچھے، واقف کار، اور ذہین نمائندوں کی کوئی مجلس قائم کی جائے۔ ہرگز نہیں، یہاں تو مقصد صرف یہ ہے کہ چند ایسے لاشے محض اشخاص کی منڈلی بن جائے جو اپنی رائے قائم کرنے کے لیے ہر وقت دوسروں کے محتاج ہوں۔ فرداً فرداً ایسے اشخاص کا احاطہ نظر جتنا تنگ ہو، اتنا ہی ان کی قیادت کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے آج کل اپنی حکمت عملی کا نفاذ کرایا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حکمت عملی کا مفہوم ہی بگڑ چکا ہے ان ہتھکنڈوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل اقتدار کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر تار ہلاتا رہتا ہے چونکہ وہ خود پوشیدہ ہے لہٰذا اس سے کبھی اس کے اعمال کی پرسش کی ہی نہیں جاسکتی۔ انہیں حالات کی برکت ہے کہ چاہے بچہ بچہ جانتا ہو کہ اصل فساد کی جڑ کون ہے، اور چاہے قوم کے لیے بحیثیت مجموعی اس شخص کے فیصلے کیسے ہی تباہ کن ثابت کیوں نہ ہوں، پھر بھی اسے کسی ایک فیصلہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تمام ذمہ داری کا بوجھ پارٹی کے کندھوں پر ہے۔

عملاً دیکھئے تو کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی ذمہ داری ایک ذاتی فریضہ کا نام ہے جو کام پارلیمنٹ میں بیہودہ بک بک کرنے والوں کے سپرد کر دیئے جائیں ان پر ہرگز ذمہ داری کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

پارلیمنٹ یہودی ذہنیت کا ترجمان ہے

پارلیمنٹری نظام نقطہ بجو کے ہم جنس لوگوں کے لیے جاذبیت رکھتا ہے، کیونکہ انہیں کھلے کھلے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ کوئی دیانت دار انسان جو اپنے افعال کی ذمہ

داری قبول کرنے پر تیار ہو ہرگز کسی ایسے نظام کی جانب راغب نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کی یہ شکل ایک ایسی نسل کے ہاتھ میں آلہ کار بنی ہوئی ہے جو چھپ چھپا کر اپنی مقصد برآری کرنا چاہتی ہے اس اخفاء کی وجہ یہ ہے کہ ان اندرونی مقاصد کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ یہ قوم ہمیشہ صاف گوئی سے گھبراتی رہی ہے یہ نسل آئندہ بھی اسی طرح بچ بچ کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کرے گی۔ یہ نظام خود بھی ایک یہودی کی طرح فریب کار اور بد باطن ہے۔ اس لیے اس نظام کی تعریف ایک یہودی ہی کرسکتا ہے۔

صاحب سیرت قیادت کی اطاعت سچی جمہوریت ہے

برخلاف اس قسم کی جمہوریت کے، ہم جرمنوں کی جمہوریت صحیح معنوں میں جمہوریت کہلانے کی مستحق ہے ہماری جمہوریت کی رو سے قائد ایک کھلے انتخاب کے ذریعہ چنا جاتا ہے پھر اس قائد کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام افعال اور فروگذاشتوں کی ذمہ داری قبول کرے۔ حل طلب مسائل کثرت آراء کے معیار سے فیصلہ نہیں کیے جاتے، بلکہ ان کا اہتمام شخصی طور پر کیا جاتا ہے۔ جو شخص یہ فیصلے صادر کرنے کی ذمہ داری سنبھالنا چاہے اسے اپنی تمام دنیاوی مملوکات کی ضمانت دینا پڑتی ہے حتی کہ اس کی جان بھی گرو ہو جاتی ہے۔

یہاں اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ایسی جان جوکھم میں پڑنے کے لیے تو کوئی ایک شخص ڈھونڈنا بھی محال ہو جائے گا اس اعتراض کا جواب حسب ذیل ہے:

ہم خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ ہماری جرمن جمہوریت کا داخلی مزاج خود بخود ہر ایسے بے اصول شخص کو علیحدہ رکھتا ہے جو محض روٹیوں کا دھندا کرنے کی فکر میں ہو۔ ایسے لوگ دماغی قابلیت کی رو سے ناکارہ اور اخلاقی لحاظ سے محض مکر و فریب کے پتلے ہوتے ہیں وہ کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے ہتھکنڈوں کی بدولت کسی نہ کسی طرح قوم پر مسلط ہو جائیں۔ جرمن جمہوریت کے ماتحت ان کی دال نہیں گل سکتی۔ اس دوررس ذمہ داری کا خوف

تمام جاہل اور نکمے آدمیوں کو بھگا دیتا ہے۔

اگر کہیں ایسا کوئی شخص چوری چھپے گھس بھی آئے تو اسے شناخت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسے بغیر کسی رعایت کے ہچوقسم الفاظ میں خطاب کیا جائے گا" ارے بدمعاش دور ہو جا! اپنے ناپاک قدموں سے اس مقدس منصب کی بے حرمتی مت کر یہ قیادت کا منبر ایک ایسی جگہ ہے جس کی شان گزشتہ اور آنے والی نسلوں کی نگاہوں میں مسلم ہے یہاں روزگار کے متلاشی بھرتی نہیں کیے جاتے یہاں تو اعلی سیرت کے انسانوں کی ضرورت ہے۔"

دو سال تک وائنا کی پارلیمنٹ کی سیر دیکھنے کے بعد یہ تھے میرے خیالات اس کے بعد میں نے پارلیمنٹ جانا ہی ترک کر دیا۔

پارلیمنٹ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے

رفتہ رفتہ آسٹرین سلطنت کے آخری دنوں میں پارلیمنٹری طرز حکومت ریاست کی طاقت گھٹنے کا ایک سبب بن گیا۔ جرمن عنصر کا اقتدار پارلیمنٹری طریق کار کے باعث روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں یہ اقتدار کم ہوتا توں توں دیگر مختلف اقوام کو باہم لڑا کر اپنا مطلب نکالنے والوں کی چالیں ابھرتی آتی تھیں جرمن مرکزی پارلیمنٹ کے ماتحت رہ کر سب سے زیادہ نقصان اٹھا رہے تھے حتی کہ گذشتہ صدی کے اواخر میں ایک سادہ لوح سے سادہ لوح انسان کو بھی نظر آ رہا تھا کہ اب آسٹریا کی سلطنت کو مجتمع رکھنے والی طاقتیں، انتشار کی قوتوں سے بسر آنے کے لیے کافی نہیں۔ صورت حالات اس کے بالکل الٹ ہے۔

حکومت اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے جو قوانین بناتی وہ روز بروز پہلے سے زیادہ پست ہمتی کا اظہار کرتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ اسی رفتار سے لوگوں کے دل حکومت کے احترام سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ نہ صرف ہنگری بلکہ وہ تمام دوسرے مختلف صوبے جن میں سقل اب نسل کے لوگ آباد تھے اپنے آپ کو اب اس شہنشاہیت سے علیحدہ

خیال کرنے لگے تھے جس نے ان سب کو ایک کر رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس بادشاہت کے کمزور ہونے میں اپنا کوئی نقصان نہ دیکھتے تھے وہ تو الٹے ضعف کے یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے تھے وہ اس انتظار میں تھے کہ یہ سلطنت آخر کب ٹکڑے ٹکڑے ہوگی۔ انہیں اس کے بحال ہونے کی کوئی تمنا نہ تھی۔

پارلیمنٹری سرکار زمانہ ساز بن جاتی ہے

اگر ابھی تک مکمل سرنگوئی میں کوئی کسر باقی تھی تو وہ صرف اس وجہ سے کہ ہر قسم کے گستاخانہ مطالبات کے سامنے جھک کر اور ذلیل ہو کر کسی نہ کسی طرح پگڑی بچالی جاتی تھی۔ یہ مطالبات پورا کرنے میں ہمیشہ جرمنوں کا سر مونڈا جاتا تھا۔ ملک بھر میں جہاں کہیں ضرورت ہو حکومت کے پاس مدافعت صرف ایک ہی حربہ تھا۔ وہ یہ کہ مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے بحیثیت مجموعی اس طرز عمل سے جرمنوں کو زیادہ نقصان پہنچ رہا تھا۔ بالخصوص جب سے شہزادہ آرچ ڈیوک فرنز و فرڈیننڈ ولی عہد مقرر ہوئے، تب سے تو چیک قوم کی طاقت بڑھانے کی پالیسی کو ایک منظم حکمت عملی کی شکل دے دی گئی حکومت کے نظم و نسق کے بالائی عہدوں سے لے کر نیچے تک ہر طرف چیک ہی چیک بھرے جا رہے تھے آسٹریا کے ولی عہد بہادر خود اس حکمت عملی کی پشت پناہ تھے جس کا انتہائی مقصد یہ تھا کہ جرمن عنصر کا اقتدار مٹا دیا جائے کم از کم اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شہزادہ اس حکمت عملی کا حامی تھا آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ شہزادہ کے اختیار کس قدر وسیع تھے سرکاری افسروں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے خالص جرمن اضلاع بھی اس پر خطر حلقہ میں شامل کر دیئے گئے جہاں مخلوط زبانیں رائج تھیں پھر اس حد بندی کو قطعی قرار دے دیا گیا جنوبی آسٹریا میں بھی یہی کارروائی روز افزوں تیزی کے ساتھ جاری تھی۔ حتیٰ کہ چیکوں کو خیال ہونے لگا تھا کہ وائنا ان کا سب سے بڑا شہر ہے۔

دین کو دنیا کے لیے استعمال کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا

خانوادہ ہیبز برگ کے اس نونہال کے خانگی حلقہ میں چیک زبان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ شہزادہ کی زوجہ ایک چیک نواب زادی تھی۔ شہزادہ سے اس کی شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ اسے شاہی اعزاز میں سے کوئی حصہ نہ ملے گا اور اس کی اولاد بھی تخت کی حقدار نہ ہو گی وہ ایک ایسے ماحول سے آئی تھی جہاں جرمنوں کے بر خلاف تاریخی مخاصمت چلی آتی تھی شہزادہ کے دماغ پر یہ خیال غالب تھا کہ وسط یورپ میں ایک سقلاب سلطنت قائم کی جائے اس سلطنت کی بنیادیں خالصتہً کیتھولک عیسائیت پر رکھی جائیں تا کہ آرتھوڈوکس عیسائیت کے پیرووں کے مقابلہ میں ایک سد سکندری قائم ہو جائے غرض جیسا کہ ہیبز برگ خاندان کا پرانا دستور تھا یہاں بھی مذہب کو ایک خالص سیاسی مقصد بر آری کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ جہاں تک جرمنوں کا تعلق تھا ان کے حق میں یہ پالیسی زہر قاتل کا اثر رکھتی تھی اس کے نتائج کئی پہلوؤں سے افسوس ناک ثابت ہوئے۔

خاندان ہیبز برگ اور کیتھولک عیسائیت دونوں اس انعام سے محروم رہے جس کی انہیں توقع تھی خاندان ہیبز برگ سے تو تاج شاہی چھن گیا اور کیتھولک عیسائیت ایک بڑی سلطنت ہاتھ سے گنوا بیٹھی مذہبی جوش کو سیاسی مصالح کی خاطر استعمال کرنے سے ایک ایسی رو پیدا ہو گئی جو اس حکمت عملی کے محرکین کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک

جب آسٹریا کی قدیم سلطنت میں ہر ممکن طریقہ سے جرمنوں کے خصائص مٹانے کی کوششیں ہونے لگیں تو اس کے جواب میں آسٹریا کے اندر سے ہی جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیے ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔

لبرل خیالات کی ابتداء انگلستان کے مشہور مانچسٹر سے ہوئی۔ ان خیالات کے اصول بانی میانی یہودی تھے۔ گذشتہ صدی کی نویں قرن کا ذکر ہے کہ آسٹریا میں لبرل خیالات عین عروج پر تھے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ عروج کے بعد اب زوال کا آغاز تھا جیسا

کہ قدیم آسٹریا میں قاعدہ تھا، لبرل تحریک کے خلاف جو ردعمل ہوا وہ معاشرتی حالات کی پیداوار نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد قومی رجحانات پر تھی خود حفاظتی کے طبعی احساس نے جرمن عنصر کو پوری قوت کے ساتھ مدافعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اقتصادی محرکات نے آہستہ آہستہ کہیں بعد میں جا کر اہمیت حاصل کی۔ پھر بھی ان کی اہمیت ثانوی ہی رہی۔ یوں تو سیاسی لحاظ سے ہر طرف ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا لیکن بتدریج دو سیاسی پارٹیاں نمایاں ہوئیں۔ پہلی میں قومیت کا رنگ غالب تھا۔ دوسری معاشرتی مسائل کی جانب زیادہ رجحان رکھتی تھی تاہم دونوں جماعتوں کی تنظیم نہایت دلچسپ اور مستقبل کے لیے سبق آموز تھی۔

اپنوں میں ہر دلعزیزی غیروں پر فتح کا نتیجہ ہوتی ہے

1866ء کی لڑائی آسٹریا کے لیے ذلت کا باعث ہوئی تھی اس جنگ کے بعد ایک عرصہ تک تاجداران ہیبز برگ میدان کارزار میں انتقام لینے کے منصوبے باندھتے رہے۔ فرانس کے ساتھ تعلقات اور بھی گاڑھے ہو جانے تھے لیکن میکسیکو کے بادشاہ میکسیمیلین کے حسرت ناک انجام نے رکاوٹ ڈال دی میکسیمیلین کی ناکام مہم کے لیے نپولین ثالث کو سب سے زیادہ ملزم گردانا جاتا تھا جب فرانسیسیوں نے میکسیمیلین کے ساتھ غداری کی تو اس سے آسٹریا میں سخت ناراضگی پھیل گئی۔ باوجود اس کے خاندان ہیبز برگ اب بھی موقعہ کی تلاش میں تھا۔ اگر 71-1870ء کی جنگ ایسی بے نظیر کامیابی پر منتج نہ ہوتی تو غالباً آسٹریا کا دربار سڈووا کی لڑائی کا بدلہ لینے کے لیے پھر کشت و خون کا کھیل کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا۔ جب جرمنی اور فرانس کی پہلی اطلاعات موصول ہوئیں تو اگرچہ یہ خبریں سچی تھیں لیکن معجزہ معلوم ہوتی تھیں ان پر اعتبار کرنا محال نظر آتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند بادشاہ'' نے سمجھ لیا کہ زمانہ کی انگلی کس طرف اشارہ کر رہی ہے چنانچہ جہاں تک اس کے امکان میں تھا اس نے حالات کی یہ ناموافقت بظاہر خوشی کے ساتھ برداشت کی۔

ان دو برسوں (71-1870ء) کی دلیرانہ جنگ نے ایک اس سے بھی بڑا معجزہ کر دکھایا۔ تاجداران ہیپز برگ کی پالیسی میں احساسات قلب کی بناپر تو کبھی کوئی تبدیلی ہوتی نہ تھی، یہاں تو ہمیشہ خارجی حالات کے دباؤ سے حکمت عملی میں ترمیم کی جاتی تھی ہاں مشرق میں بسنے والے جرمن جرمنی کی نوخاستہ سلطنت کی فاتحانہ شان وشوکت دیکھ دیکھ کر پھولے نہ ساتے تھے۔ جب انہیں اپنے باپ دادا کے خواب ایک عظیم الشان اصلیت کی شکل میں تعبیر ہوتے نظر آئے تو ان کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔

قومی عظمت، قومی اتحاد پر منحصر ہے

یہاں واضح ہو جانا چاہیے کہ اس دور کے بعد آئندہ کے لیے آسٹریا میں رہنے والے ہر جرمن کو احساس ہو چکا تھا کہ اگر دوبارہ ایک طاقتور سلطنت قائم کرنا ہے، اگر ایسی سلطنت کو دقیانوسی معاہدات سے مفلوج نہیں کرنا۔ اور اگر اس سلطنت کو بڑھاپے کے انحطاط سے نجات دلانا ہے تو اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے یہ راستہ اگرچہ افسوس ناک ہے لیکن اس سے مضر نہیں کسی قومی سلطنت کے قیام سے پہلے، تمام جرمنوں کو اسی طرح متحد کرنا پڑے گا جس طرح پرشیا نے کوئنگرٹیز کے میدان جنگ میں فتح پا کر سارے جرمنی کو متحد کیا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب آسٹریا میں رہنے والے، ایک ایک جرمن کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا، کہ خاندان ہیپز برگ کا تاریکی دور ختم ہو چکا ہے۔ مستقبل کی سلطنت اسی شہنشاہ کے سپرد کی جاسکتی ہے جو مردانگی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہو۔ اور جو دریائے رائن کا تاجدار کہلانے کا استحقاق رکھتا ہو۔ قدرت بجا طور پر شکریہ کی سزاوار قرار دی جاسکتی ہے کہ اس نے اس مقصد کے لیے فریڈرک اعظم کے خاندان کا ایک نونہال منتخب کیا۔ فریڈرک اعظم نے ماضی میں وہ کارہائے نمایاں سر انجام دیئے تھے کہ اب اس کا خاندان آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے عظمت کا درخشاں بن چکا ہے۔

حکومت سے بغاوت اور قوم سے بغاوت کا فرق

1870-71ء کی جنگ کے بعد خاندان ہیز برگ نے جان بوجھ کر مصمم ارادہ کرلیا کہ آہستہ آہستہ جرمن عنصر کو مٹا دیا جائے۔ یہ لوگ خطرناک ہیں ان کے دلی جذبات اور رجحانات کے متعلق اب کوئی دھوکہ باقی نہیں رہا۔ میں نے ''مٹانے'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ چیک پرستی کی حکمت عملی سے جو آخری نتیجہ برآمد ہونا تھا وہ مفہوم صرف اسی لفظ کے ذریعہ ادا ہوسکتا ہے اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جس قوم کو مٹا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا تھا اس میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی یہ ایک ایسی آگ تھی جس کی مثال جدید جرمن تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ قوم پرست اور محبان وطن باغی ہو گئے۔

یہ لوگ قوم یا حکومت کے باغی نہ تھے وہ اس طرز حکومت سے باغی تھے جس کے متعلق انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اس سے خود ان کی قوم تباہ ہو جائے گی جدید تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جرمنوں کی روایتی شہنشاہ پرستی اور ملک و ملت کی قومی محبت دونوں میں ایک کھلی ٹکر ہو رہی تھی۔

گذشتہ صدی کے آخری دس سال میں جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی جو تحریک آسٹریا سے اٹھی، اس نے صاف صاف اور غیر مبہم طور پر ثابت کر دیا کہ کوئی حکومت اپنے اختیارات کی حرمت اور بچاؤ کی وہیں تک حقدار ہے، جہاں تک یہ اختیارات قوم کے مفاد کی خاطر استعمال کیے جائیں یا کم از کم قومی مفاد کو نقصان نہ پہنچائیں۔

حکومت ایک ذریعہ ہے کوئی مقصد نہیں

حکومت کے اختیارات کبھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے اگر ایسا ہو تو ظالم سے ظالم حکومت کے خلاف بھی آواز نہ اٹھائی جا سکے گی اسے مقدس تسلیم کرنا پڑے گا۔

اگر کوئی حکومت اپنی طاقت کے اوزار قوم کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کرے تو اس وقت بغاوت کرنا نہ صرف ہر شہری کا حق ہے بلکہ اس پر فرض ہے۔

رہا یہ کہ آیا ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں؟ یا کب پیدا ہوتے ہیں تو اس کا جواب

اصولی نکتہ نوازیوں سے نہیں دیا جا سکتا اس کا فیصلہ صرف طاقت کر سکتی ہے، ایسے مسائل کی آخری کسوٹی کامیابی ہے۔

ہر حکومت چاہے وہ بدترین قسم کی حکومت ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اس نے قوم کے اعتماد سے ہزار طرح غداری کیوں نہ کی ہو، پھر بھی وہ یہی دعوے کرے گی کہ حکومت کا اقتدار قائم رکھنا ہمارا فرض ہے ایسی حکومت کے جو مخالفین قوم کی بقا کی خاطر لڑ رہے ہیں انہیں بھی وہی ہتھیار استعمال کرنے چاہئیں جو حکومت استعمال کرتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ ایسے راج کے خلاف کامیاب ہو سکتے ہیں اور اپنے لیے آزادی اور خود مختاری حاصل کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جس طاقت کو شکست دینا ہے، جب تک وہ قانونی ذرائع پر اکتفا کرے گی تب تک اس کا مقابلہ بھی اسی قسم کے ہتھیاروں سے کیا جائے لیکن اگر ستم گر غیر قانونی ذرائع استعمال کرے تو بغاوت کرنے والے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے میں نہ ہچکچائیں گے۔

امت کی حفاظت ،حکومت کی حفاظت پر مقدم ہے

ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسان کی زندگی کا اولین مقصد حکومت کا قیام نہیں ، بلکہ انسان کی زندگی کا اولین مقصد اپنی امت کو قائم رکھنا ہے۔

اگر کوئی ایسا خطرہ درپیش ہے کہ امت کو مٹا دیا جائے گا یا اس پر ظلم وستم ڈھائے جائیں گے تو ان حالات میں قانون کی پابندی محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جو طاقت برسر اقتدار ہے وہ تو ممکن ہے کہ محض مزعومہ ''قانونی وسائل'' پر اکتفا کرلے لیکن جن لوگوں پر ستم ٹوٹ رہے ہیں وہ ہر ممکن وسیلہ سے کام لیں گے ان کا خود حفاظتی کا طبعی احساس انہیں یقین دلا دے گا کہ ان کا طرز عمل بدرجہ اتم جائز ہے۔

تاریخ میں غیر ملکی غلامی کا جوا اتار پھینکنے یا ملکی ظلم وستم کا خاتمہ کرنے کے لیے شاندار جدوجہد کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مذکورہ بالا اصول کو تسلیم کیے بغیر جدوجہد کی یہ

مثالیں کبھی کامیابی کا منہ نہ دیکھتیں۔

کمزور کو زندہ رہنے کا حق نہیں

انسانی حقوق حکومت کے حقوق سے بالاتر ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی قوم اپنے انسانی حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور اس جدوجہد میں شکست کھاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قسمت کی ترازو میں پوری نہیں اتری وہ اس عالم خاکی میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

یہ دنیا امتوں کے قبضہ میں دینے کے لیے نہیں بنائی گئی جن کے دل کمزور ہیں۔

ظلم وستم ڈھانے والوں کے لیے نام نہاد ''قانون'' کی آڑ لے کر اپنی جان بچانا ہمیشہ آسان ہوتا ہے آسٹریا اس حقیقت کی ایک واضح اور موثر مثال تھی۔

بیبز برگ سلطنت میں قانونی اختیارات کے استعمال کی بنیاد تو پارلیمنٹ پر تھی اور یا شاہی خاندان پر چونکہ پارلیمنٹ میں غیر جرمن عنصر کی اکثریت تھی اس لیے اس کی روش جرمنوں کے خلاف تھی علی ہذا القیاس شاہی خاندان بھی جرمنوں کا دشمن تھا سلطنت کے تمام اختیارات انہیں دو طاقتوں کے ہاتھ میں تھے جرمن عنصر کی حالت کو ان دو طاقتوں کے ذریعہ سدھارنے کی کوشش حماقت کے مترادف ہوتی جو لوگ ''قانون'' کے ماتحت رہتے ہوئے دادرسی حاصل کرنے اور حکومت کے اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مشورہ دیتے تھے، وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکتے تھے وجہ یہ کہ قانونی وسائل تک محدود رہتے ہوئے کسی قسم کی مزاحمت کرنا ممکن نہ تھا۔ قانون کی پابندی کا مشورہ دینے والوں کی رائے پر چلنا، آسٹریا میں رہنے والے جرمنوں کی تباہی کا یقینی باعث ہوتا۔ اس تباہی میں کچھ ایسی دیر بھی نہ لگتی تھی اگر جرمن عنصر فی الحقیقت بچ گیا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آسٹریا کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔

طاقت اور تشدد کا رتبہ قانون سے بلند ہے

آنکھوں پر عینکیں لگا کر اصولی بحثیں کرنے والے قوم کے لیے جان قربان کرنے کو

تو تیار نہ تھے البتہ اپنے نظریات کی خاطر مارنے مرنے پر تل جاتے تھے۔

چونکہ انسان خود قانون گھڑ بیٹھتا ہے اس لیے اب اسے وہم ہونے لگتا ہے کہ وہ محض قانون کی خاطر جیتا ہے اگر اس کارگزاری سے اصول اور عقیدہ کی دنیا میں بسنے والے اور اپنے وہم کے بتوں کی پوجا کرنے والے بھوچکے رہ گئے لیکن جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک نے ایک سب سے بڑی خدمت یہ سرانجام دی کہ ایسی نامعقولیتوں کا خاتمہ کر دیا۔

جب خاندان ہیز برگ نے حملہ کرنے کی وہ تمام قوتیں استعمال کرتے ہوئے جو کہ ان کے قبضہ میں تھیں، جرمن عنصر سے دست بدست جنگ لڑنی چاہی تو جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی پارٹی نے بھی اس ''دوران عالیشان'' کو بغیر کسی نرمی کے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

یہی پارٹی تھی جس نے سب سے پہلے حکومت کے حالات کی چھان بین کی اور پھر ان کا چرچا کیا۔ ان کی اس کارگزاری سے لاکھوں باشندوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک نے جو عظیم الشان خدمات سرانجام دیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے وطن کی محبت کو اس شرمناک شاہی خاندان کے احترام کے پنجہ سے آزاد کر دیا۔

تحریکوں کے عروج و زوال کا مطالعہ سبق آموز ہے

پہلے پہل جب یہ پارٹی عالم وجود میں آئی تو کثیر تعداد میں لوگ اس کے پیرو ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ ایک وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ تحریک ایک بے پناہ سیلاب کی صورت اختیار کر جائے گی لیکن ابتدا میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں بعد میں ان کا تسلسل قائم نہ رکھا جا سکا جب میں وائنا گیا تو ان دنوں جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک چلانے والی جماعت کرسچین سوشلسٹ پارٹی کے سامنے ماند پڑ چکی تھی اس دوران میں کرسچین سوشلسٹ پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی سچ یہ ہے کہ جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی

تحریک چلانے والی جماعت اب نہ ہونے کے برابر تھی۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کا عروج و زوال اور اس کے پہلو بہ پہلو کرسچین سوشلسٹ پارٹی کی حیرت انگیز ترقی، یہ واقعات میرے مطالعہ کے لیے ایک مستند اور مستقل مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اس مشاہدہ نے میرے خیالات کی تکمیل پر گہرا اثر پیدا کیا۔

جب میں وائنا آیا تو ان دنوں میری تمام ہمدردی جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک اور صرف اسی تحریک کے لیے وقف تھی۔

جب میں دیکھتا تھا کہ اس جماعت میں قیصر جرمنی کے خاندان کا نام لے کر اعلان ''زندہ باد'' کہنے کی جرات ہے اور وہ عزم بالجزم کر چکے ہیں کہ اپنے تئیں جرمن سلطنت کا ایک ایسا جزو لاینفک تصور کریں گے جو محض عارضی طور پر اپنے موطن اصلی سے جدا کیا گیا ہے تو مجھ پر بڑا گہرا اثر ہوتا تھا میری رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی یہ جماعت اپنا زاویہ نگاہ عوام کے سامنے پیش کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اس سے میرے دل میں ان کی توقیر بڑھتی گئی اور ان پر میرا اعتماد پختہ ہوتا گیا میری نظر میں قوم کو بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ جرمنوں کے متعلق تمام مسائل کی بابت اپنے اصول لوگوں کے سامنے پیش کیے جائیں اور کبھی سمجھوتہ کر لینے کا خیال بھی دل میں نہ لایا جائے جو بات میری سمجھ سے باہر تھی وہ یہ تھی کہ ایسے شاندار آغاز کے بعد یہ تحریک ایسی جلد ختم کیوں ہوگئی علی ہذا القیاس یہ واقعہ بھی کچھ کم ناقابل فہم نہ تھا کہ کرسچین سوشلسٹ پارٹی نے اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنی زبردست طاقت کہاں سے پیدا کر لی۔ اس پارٹی کی ہردلعزیزی انہیں دنوں کمال عروج پر پہنچ چکی تھی۔

معاملہ فہمی اور مردم شناسی میں فرق

جب میں نے ان دونوں تحریکوں کا باہم مقابلہ کرنا شروع کیا تو تقدیر نے مجھے اس حیرت انگیز معمہ کو سمجھنے کے لیے بہترین ذرائع عطا کر دیئے تقدیر نے مجھے جس راستہ پر

ڈالا تھا وہ میرے حالات کی تنگی کے باعث اور بھی جلد طے ہو گیا۔

میں اپنے تجزیہ کی ابتداء ان دو اشخاص کے حالات سے کروں گا جو ان دونوں تحریکوں کے بانی مبانی لیڈر سمجھے جانے چاہئیں ان کے نام جارج فان شونررر اور ڈاکٹر کارل لوئیجر تھے۔

جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے یہ دونوں بزرگ نام نہاد پارلیمنٹری مشاہیر کی سطح اور معیار سے بہت بلند تھے باوجودیکہ چاروں طرف سیاسی بدکاریوں کی وباء پھیلی ہوئی تھی یہ لوگ بے داغ اور ناقابل ملامت زندگیاں بسر کرتے تھے ذاتی طور پر میں، پہلے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کے نمائندہ شونرر کو ترجیح دیتا تھا لیکن بعد میں بتدریج مجھے کرسچین سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر سے بھی ویسی ہی وابستگی ہو گئی۔

جب میں نے ان دونوں حضرات کی مخصوص قابلیتوں کا مقابلہ کیا تو میں نے حسب ذیل رائے قائم کی شونرر بنیادی مسائل پر غور کرنے میں ایک بہتر اور عمیق تر مفکر تھا آسٹرین حکومت کے یقینی زوال کے متعلق جو واضح اور صحیح قیاس اس نے قائم کیا تھا وہ اسی کا حصہ تھا اگر جرمنی ہیپز برگ سلطنت کے متعلق شونرر کی پیشین گوئی پر دھیان دیتا تو وہ تباہ کن عالمگیر جنگ جس میں جرمنی کو سارے یورپ سے لڑائی مول لینی پڑی کبھی وقوع پذیر نہ ہوتی۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں شونرر مسائل کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، وہاں انسانوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ اکثر ٹھوکر کھا جاتا تھا۔

ضرور نہیں کہ جو سمجھتا ہو، وہ سمجھا بھی سکتا ہو

برعکس اس کے ڈاکٹر کارل لوئیجر میں مردم شناسی کا ملکہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اسے انسانی طبع کی بابت گہری بصیرت حاصل تھی وہ اس امر میں نہایت محتاط تھا کہ لوگ دراصل میں جو کچھ ہیں وہ انہیں ہرگز اس سے بہتر تصور نہ کرتا تھا وہ اپنی تجاویز ہمیشہ انہیں عملی امکانات کے مطابق تیار کرتا تھا۔ جو انسانی زندگی اس کے سامنے پیش کرتی تھی بر

خلاف اس کے شوپنہار مصلحت اور خلاف مصلحت میں کوئی تفریق نہ کر سکتا تھا جرمنوں نے عالمگیر اتحاد کے اس علمبردار کے تمام خیالات اصولاً درست تھے لیکن اس میں یہ طاقت اور فہم وفراست نہ تھی کہ اپنے خیالات عوام تک پہنچا سکتا۔ وہ اپنے خیالات کو ایسی شکل میں پیش نہ کر سکتا تھا کہ عامۃ الناس جن کی سمجھ بوجھ ہمیشہ سے محدود رہی ہے اور ہمیشہ ایسی ہی رہے گی با آسانی ان خیالات کو سمجھ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ شوپنہار کا سارا علم محض ایک صاحب خبر کی دانش کی اہمیت رکھتا تھا وہ کبھی اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

طبع انسانی کے متعلق اس کی بصیرت کی یہی کمی تھی جس کے باعث اس نے بعض تحریکوں کے پس پشت کام کرنے والی طاقتوں کا اندازہ غلط لگایا۔ اس نے نظر انداز کر دیا کہ سماج کے پرانے اداروں میں امتداد زمانہ سے بذات خود ایک مخصوص قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

عوام کی پشت پناہی کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی

شوپنہار کو یہ تو احساس تھا کہ وہ جن مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں وہ ایک فلسفہ حیات کی نوعیت رکھتے ہیں لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسے عقائد کو صرف کسی قوم کے عامۃ الناس ہی رائج العام کر سکتے ہیں یہ عقیدے قریب قریب وہی نوعیت رکھتے ہیں، جو ایک مذہب کی ہوتی ہے۔

کھاتے پیتے لوگوں میں جدوجہد کا جذبہ نہایت کمزور ہوتا ہے بدقسمتی سے اس حقیقت کے متعلق شوپنہار کی واقفیت بالکل ادھوری تھی۔ کھاتے پیتے لوگوں کی اس کمزوری کے سبب ان کے کاروباری مفاد ہوتے ہیں افراد ہمیشہ اپنے کاروباری مفاد کو خطرہ میں ڈالنے سے جھجکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کاروباری جھمیلے انسان کے کام کرنے میں حائل رہتے ہیں بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک کسی ضابطہ حیات کے لیے عامۃ الناس یہ اعلان نہ کر دیتے، کہ ہم اس کے علمبردار بنیں گے اور جہاں کہیں اور جس حد تک ضرورت ہو، ہم اس کی خاطر مرنے مارنے کو تیار رہیں گے تب تک اس ضابطہ

حیات کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوسکتی۔

باشندگان ملک کے زیریں طبقہ کی اس اہمیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ معاشرتی مسئلہ کے متعلق واقفیت نہایت ناکافی رہی۔

ان سب باتوں میں ڈاکٹر کارل لوئجر کو شوئنزر کا عکس سمجھنا چاہیے، اسے انسانی طبائع کے متعلق گہرا علم تھا۔

یہی وجہ تھی، کہ وہ مختلف معاشرتی طاقتوں اور رجحانات کا صحیح اندازہ لگا سکتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ موجودہ اداروں کی قوت کا اندازہ کم لگانے کی غلطی سے بچا ہوا تھا۔ غالباً یہی وصف تھا جس کی مدد سے وہ ان اداروں کو اپنی حکمت کے حق میں استعمال کرنے میں کامیاب ہوا۔

تحریک کی کامیابی سے پہلے امراء کبھی ساتھ نہیں دیتے

اس نے خوب واضح طور پر اندازہ کرلیا تھا کہ ہمارے زمانہ میں بالائی طبقوں کی تاب مقاومت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ کسی نئی تحریک کے لیے اس وقت تک جنگ نہیں کرسکتے، جب تک کہ پہلے اس تحریک کو غلبہ حاصل نہ ہو چکا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی سیاسی جدوجہد کا سب سے بڑا پروگرام باشندگان ملک کے ان طبقوں کو موہ لینے پر مشتمل تھا جن کا اپنا وجود خطرہ میں تھا ڈاکٹر کارل لوئجر ان لوگوں کے قوائے جنگ کو مفلوج کرنے کے بجائے ان میں ایک عسکری جذبہ پیدا کر دیتا تھا جو ادارے قدیم سے جڑ پکڑ چکے تھے ان کی امداد ہر ممکن طریقہ سے حاصل کرنے میں اس نے کوئی توقف نہ کیا متصد یہ تھا کہ طاقت کے ان پرانے سرچشموں سے اپنی تحریک کے لیے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا ممکن ہے حاصل کیا جائے۔

علمائے دین کو تحریک کا مخالف نہیں بنانا چاہیے

یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے تو لوئجر نے اپنی جدید پارٹی کی معاشرتی بنیاد متوسط طبقہ پر رکھی یہ ایک ایسا طبقہ تھا جسے مٹ جانے کا خطرہ درپیش تھا اس طریقہ سے اس نے اپنے

پیروؤں کی ایک ٹھوس جماعت مہیا کر لی۔ یہ لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرنے پر آمادہ تھے۔ جم کر لڑنے کے لیے خوب حوصلہ رکھتے تھے لوئجر نے کیتھولک عیسائیت کے متعلق بھی کمال دانشمندانہ روش اختیار کی اس طرح نوجوان علمائے دین ایسی کثیر تعداد میں اور ایسے جلد مسخر ہو گئے کہ پرانی پارٹی کے علمائے دین یا تو عمل کے میدان سے بھاگ نکلے اور یا خون بھی اس امید پر پارٹی میں آ ملے کہ ہم بتدریج یکے بعد دیگرے کھوئے ہوئے مراتب حاصل کر لیں گے یہ موخر الذکر اقدام زیادہ دانشمندانہ تھا۔

لوئجر سے بہت بڑی بے انصافی ہو گی اگر ہم اس کے مخصوص اوصاف صرف مذکورہ بالا بیان تک مخصوص خیال رکیں وہ لڑائی کی چالیں سمجھنے میں ایک قابل ہستی تھا اس میں وہ تمام فطری خوبیاں موجود تھیں جو ایک بڑے مصلح کے لیے لازمی ہیں اس کی ان سب قابلیتوں کے ساتھ ایک خصلت ایسی بھی تھی جس نے اس کی جولانی طبع کے میدان کو محدود کر دیا تھا۔ فوری امکانات پر رائے قائم کرنے اور اپنی قابلیتوں کا اندازہ لگانے میں وہ کبھی اصلیت سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھاتا تھا۔

ڈاکٹر موصوف صحیح معنوں میں ایک بڑا آدمی تھا اس نے اپنے مقاصد معین کرتے وقت اس بات کا بڑی سختی سے خیال رکھا تھا کہ کوئی شق ایسی شامل نہ کر لی جائے جو نا قابل عمل ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ سلطنت آسٹریا کے قلب یعنی وائنا کو مٹھی میں لے لیا جائے، یہ وائنا ہی تھا جہاں سے اس معمر اور خستہ حال سلطنت کے بیمار اور تھکے ماندے جسم میں ہر جگہ زندگی کی آخری لہریں پہنچتی تھیں اگر قلب کی حالت درست کرنے میں کامیابی ہو جاتی، تو دوسرے اعضائے جسم کی اصلاح ہونا ایک لازمی نتیجہ تھا اصولاً یہ خیال بالکل درست تھا لیکن جس میعاد کے اندر اندر اس پر عمل درآمد ہو سکتا تھا وہ نہایت محدود تھی یہی ڈاکٹر لوئجر کا کمزور پہلو تھا۔

وائنا کی میونسپلٹی کا صدر ہونے کی حیثیت میں لوئجر نے جو کارنامے سرانجام دیئے وہ بہترین معنوں میں لازوال ہیں تاہم یہ سب کچھ آسٹریا کی بادشاہی کو بچا نہ سکتا تھا۔ اب

وہ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

دوراندیشی کے بغیر مصلحت شناسی کام نہیں آتی

یہاں لوئجر کے حریف شونیزر کی بصیرت زیادہ درست تھی ڈاکٹر لوئجر جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس میں تو وہ حیرت ناک طریقہ سے کامیاب ہوا لیکن اس کارگزاری سے اسے جس نتائج کی توقع تھی وہ برآمد نہ ہوئے برعکس اس کے شونیزر نے اپنے سامنے جو پروگرام رکھا تھا وہ اس میں تو ناکام رہا لیکن جن خطرات کا خدشہ تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلے افسوس ہے کہ ان خطرات کی اصلیت ایک نہایت ہولناک انداز میں درست ثابت ہوئی یوں یہ دونوں شخص اپنے منتہائی مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہے لوئجر آسٹریا کو نہ بچا سکا اور شونیزر آسٹریا میں بسنے والے جرمنوں کو زوال سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

ان دونوں پارٹیوں کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اس کا مطالعہ ایک ایسا سبق سکتا ہے جو خود ہمارے عہد کے لیے بدرجہ اتم نصیحت آموز ہے۔ بالخصوص یہ مطالعہ میرے رفقاء کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا وجہ یہ کہ کئی لحاظ سے موجودہ زمانہ کے حالات اس وقت سے مشابہت رکھتے ہیں اگر ہم ان واقعات سے عبرت حاصل کریں تو ہم ان غلطیوں سے بچ سکتے ہیں جن کے باعث مذکورہ بالا جماعتوں میں سے ایک پارٹی تو ختم ہوگئی اور دوسری سے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

میری رائے میں جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک آسٹریا میں ناکام رہنے کی مندرجہ ذیل تین وجوہات تھیں:

معاشرتی پروگرام کے بغیر تحریک میں انقلابی طاقت پیدا نہیں ہوسکتی

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس تحریک کے قائدین معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کے متعلق اپنے ذہن میں کوئی واضح تصور نہ رکھتے تھے۔ ایک نئی تحریک جس کی نوعیت اصلاً انقلابی ہو۔ اس کے لیے معاشرتی مسائل کے متعلق ایک واضح پروگرام پیش کرنا بالخصوص ضروری ہے شونیزر اور اس کے مقلدین کی اولین توجہات کھاتے پیتے لوگوں پر مرکوز تھیں اس کا

لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک نرم اور میانہ رو ہو کر رہ گئی جرمنوں کا کھاتا پیتا طبقہ اور بالخصوص اس طبقہ کے بالائی حلقے صلح پسند ہیں اور جہاں تک حکومت کے داخلی انتظام یا قومی معاملات کا تعلق ہے انہیں اپنے مفاد کنیۂ قربان کر دینے میں بھی عار نہیں یہ ضروری نہیں کہ وہ خود اس قربانی کا شعور یا احساس رکھتے ہوں بھلے دنوں میں یوں کہئے کہ اچھی حکومت کے دوران میں سوسائٹی کا یہ طبقہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باعث حکومت کے لیے بدرجہ اتم مفید ثابت ہوتا ہے لیکن جب حکومت خراب ہو تو یہی وصف وبال جان بن جاتا ہے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کو فی الحقیقت ایک سخت جدوجہد درپیش تھی اس جدوجہد میں تبھی کامیابی کا امکان ہو سکتا تھا جب یہ تحریک اپنی کوششیں عامۃ الناس کو تسخیر کرنے کے لیے وقف کر دیتی ایسا نہ کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک میں شروع سے ہی اس جوش کی کمی رہی جس کے بغیر ہنگامی دھوم دھام تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو جایا کرتی ہے۔

یہ جماعت تحریک کے آغاز میں ہی مندرجہ بالا اصول کی سچائی کا اندازہ واضح طور پر نہ لگا سکی۔ اس اصول پر عملدرآمد کرنے میں کوتاہی دکھائی گئی یہ ایک ایسی ابتدائی غلطی تھی جن کی تلافی بعد میں نہ کی جا سکتی تھی تحریک میں بہت سے اعتدال پسند، کھاتے پیتے لوگ بھی شامل کر لیے گئے داخلی حکمت عملی پر ان لوگوں کا تسلط روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ عامۃ الناس سے کوئی مزید معقول سہارا حاصل کرنے کے تمام امکانات مسدود ہو گئے۔ ان حالات میں ایسی تحریک خالی مباحثہ اور تنقید سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی تحریک میں نیم مذہبی جوش اور قربانی کا مادہ ختم ہو چکا تھا اس کی بجائے اب ''حکومت سے ایجابی تعاون'' کے چرچے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ صورت حالات کو تسلیم کر لیا جائے متنازعہ فیہ امور کے چبھتے ہوئے پہلو آہستہ آہستہ ہموار کر دیئے جائیں اور خاتمہ یہ ہو کہ ایک ذلت آمیز مصالحت کر لی جائے۔

یہ تھا جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کا انجام اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیڈروں

نے شروع میں ہی یہ نہ سمجھا کہ کامیابی کے لیے سب سے زبردست شرط اپنے مقلدین عامتہ الناس میں سے بھرتی کرنا ہے۔ غرض تحریک کھاتے پیتے لوگوں تک محدود ہوگئی تحریک کے وقار اور بلند پردازی کا معیار میانہ روی قرار پائی۔

الیکشن جیت کر انقلاب برپا نہیں کیے جا سکتے

ناکامی کی اس وجہ سے ہی زوال کی دوسری علت بھی معرض وجود میں آ گئی۔

جب جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک اٹھی تو آسٹریا میں رہنے والے جرمنوں کی حالت پہلے سے ہی نازک تھی ہر سال پارلیمنٹ کی مشین سے کام لیتے ہوئے آسٹریا میں بسنے والے جرمنوں کی آبادی ختم کی جا رہی تھی اس آخری وقت میں اگر جرمنوں کو بچانے کی کوئی امید ہو سکتی تھی تو وہ صرف اسی صورت میں کہ پارلیمنٹری نظام ختم کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔

یہاں جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کو ایک بنیادی اہمیت کے زبردست مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ اس تحریک کے حامیوں کو پارلیمنٹری نظام ختم کرنے کے لیے کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے کیا انہیں رائج العام محاورہ کے مطابق ''اندر سے جا کر نقب لگانی'' چاہیے تھی یا باہر رہتے ہوئے سرے سے پورے نظام پر حملہ کرنا چاہیے تھا؟

وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شکست کھا کر باہر نکلے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بحالت مجبوری اندر داخل ہوئے تھے۔

پارلیمنٹ جیسی طاقت پر باہر سے ضرب کاری لگانے کے لیے ناقابل شکست دلیری اور بغیر کسی پس وپیش کے قربانی کرنے والے جذبہ کی ضرورت تھی۔ ایسے معرکوں میں دشمن کو کبھی پہل کرنے کا موقعہ نہ دینا چاہیے۔ جوش وخروش سے بار بار پرزور حملے کیے جائیں گے حملہ کرنے والے بار بار پٹخنیاں کھائیں گے پھر بھی اگر ان کے دل مضبوط ہیں تو چاہے ہڈیاں ٹوٹ جائیں وہ گر گر اٹھیں گے کامیابی کا منہ دیکھنے کی سعادت ایک

طویل اور سخت جدوجہد کے بعد ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ جب کسی مقصد کے لیے عظیم الشان قربانیاں کی جائیں تو ان قربانیوں کا پکار خود نئے مددگار کھینچ لاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ ناقابل شکست جذبہ آخری کامیابی حاصل نہیں کر لیتا۔

ہاں اس منزل پر پہنچنے کے لیے ایک شرط لازمی ہے ایسے معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر عامۃ الناس کے سپوتوں کی شرکت درکار ہے یہاں جس عزم بالجزم اور جس استقلال کی ضرورت ہے وہ عام خلقت ہی کا حصہ ہے۔ کسی خونخوار جھگڑے کو انجام تک پہنچانا یہ عام لوگوں ہی کا حوصلہ ہو سکتا ہے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک ان عامۃ الناس کی حمایت حاصل نہ تھی اس لیے وہ پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی راستہ اختیار کر ہی نہ سکتے تھے۔

تحریکیں دلائل سے نہیں بلکہ جذبات کے بل پر کامیاب ہوتی ہیں

یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ ان کا یہ رویہ کسی اندرونی اخلاقی ہچکچاہٹ پر مبنی تھا اس کی تہ میں کوئی سوچی سمجھی تجویز کام نہ کر رہی تھی حقیقت یہ تھی کہ اس تحریک کے حامیوں کو پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی حل سوجھتا ہی نہ تھا جو لوگ اس زبردست مغالطہ میں گرفتار تھے ان کے پیش نظر محض عام خیالات اور موہوم تصورات تھے ان کو کچھ علم نہ تھا کہ جس طریقہ سے وہ اس نظام میں حصہ لینے کا ارادہ کر رہے ہیں جس کی وہ اصولاً مخالفت کر چکے ہیں اس سے کیا نتائج اور اثرات پیدا ہوں گے انہیں بحیثیت مجموعی خیال تھا کہ اس طرح انہیں عوام کے سامنے اپنے مقاصد کی وضاحت کرنے کا موقعہ مل جائے گی وہ ''قومی منبر'' پر کھڑے ہو کر ملت کو خطاب کر سکیں گے ساتھ ہی بظاہر عقل اس بات کو بھی مانتی تھی کہ جب فساد کی جڑ پر کلہاڑا چلایا جائے گا تو وہ باہر سے کھڑے ہو کر حملے کرنے کی نسبت زیادہ اثر پیدا کرے گا۔ انہیں یقین تھا کہ جب انہیں پارلیمنٹ کے اندر آزادی تقریر کے حقوق حاصل ہو جائیں گے تو اس سے ان کے حامیوں کی انفرادی

حیثیت زیادہ مضبوط ہو جائے گی اس طرح ان کے حملوں کی طاقت بڑھ جائے گی۔

ان سب باتوں میں حقیقت حال ان توقعات کے بالکل الٹ ثابت ہوئی۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کے حامی اب جن سامعین کو خطاب کرتے تھے ان کی تعداد پہلے سے زیادہ نہ تھی بلکہ پہلے سے کم تھی وجہ یہ کہ ہر رکن صرف اسی حلقہ کو خطاب کرسکتا تھا جو اس کی بات سننے کو آمادہ ہو یا جو اس کی تقریریں اخبارات میں پڑھ سکے۔

کثیر التعداد سامعین کے کانوں میں براہ راست آواز پہنچانے کی جگہ پارلیمنٹ نہیں بلکہ عام پبلک جلسہ ہے۔ یہیں ہزار ہا آدمی محض یہ سننے کے لیے آتے ہیں کہ کوئی تقریر کرنے والا کیا کہتا ہے، برعکس اس کے پارلیمنٹ کے اجلاس میں حاضرین کی تعداد بمشکل چند سو تک پہنچتی ہے۔ پھر ان میں سے بھی اکثر محض اپنا روزانہ حاضری کا الاؤنس کمانے کے لیے وہاں آتے ہیں انہیں کسی ''قومی نمائندہ'' سے روشنی حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر اجلاس میں ہمیشہ وہی لوگ بار بار آتے ہیں ان کا کوئی نئی شے سیکھنے اک شوق نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان کی ذہانت کا مسئلہ نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ان عاجزوں میں وہ قوت ارادی ہی مفقود ہے جو کچھ سیکھنے کی کوشش کرنے کے لیے درکار ہے۔

پارلیمنٹری چوہے اور پسو

''قومی نمائندوں'' میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی برتر سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو یا اپنے آپ کو اس سچائی کی خدمت کے لیے وقف کر دے نہیں! اس طبقہ امرا میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو یہ طرز عمل اختیار کرے۔ ہاں اگر یہ توقع ہو کہ کسی ایسی تبدیلی عقیدہ کا اعلان کرنے سے وہ اپنے حلقہ کی نمائندگی پر قابض رہے گا، اور پارلیمنٹ میں داخل ہو جائے گا، تو پھر دوسری بات ہے یہی وجہ ہے کہ جب آئندہ الیکشن میں پرانی پارٹی کی

گت بننے کا یقین ہو جائے تو اس صورت میں، اور صرف اسی صورت میں، یہ ''نیکی کے مجسمے'' کسی ایسی نئی پارٹی کی تلاش میں نکلتے ہیں جس کے لیے الیکشن میں بہتر امکانات ہوں۔ یاد رہے کہ جب اس تبدیلی عقیدہ کا اعلان کیا جائے گا تو ساتھ ہی اس کو جائز ٹھہرانے کی خاطر بلا مبالغہ اعلیٰ اخلاقی مقاصد کا ایک سیلاب بہ نکلے گا غرض یوں ہی جب کبھی کوئی موجودہ پارٹی عوام میں بدنام ہو جائے اور اسے کچل دینے والی شکست کا خطرہ درپیش ہو تو اس وقت ایک عام نقل مکانی شروع ہو جاتی ہے۔ پارلیمنٹری چوہے پارٹی کی کشتی سے پھدک کر نکل بھاگتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوتا کہ مسائل زیر بحث کے متعلق افراد کے علم میں کوئی اضافہ ہو گیا ہے اور اب اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی ہے ان قلابازیوں کے پس پشت محض وہ روشن ضمیری کام کرتی ہے جس سے یہ پارلیمنٹری پسو بروقت خطرے سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور پھر سے اڑ کر کسی دوسری پارٹی کے گرم بستر میں جا گھستے ہیں۔

ایسے سامعین کے سامنے تقریر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا بھینس کے آگے بین بجائی جا رہی ہے یقیناً اس مقصد کے لیے جو محنت اٹھائی جائے وہ ہرگز بارآور نہیں ہوتی۔ وجہ یہ کہ اس سے پیدا ہونے والے نتائج ہمیشہ منفی ہوتے ہیں۔

تحریکیں عوام کو قائل نہیں بلکہ مائل کرتی ہیں

اور یہی ہوا جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے حامیوں نے بولتے بولتے اپنے حلق خشک کر لیے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اخبارات یا تو انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کی تقاریر اس طرح مسخ کر دیتے تھے کہ استدلال کا تسلسل سرے سے ناپید ہو جاتا مطالب توڑ مروڑ دیئے جاتے تھے عوام کو اس نئی تحریک کے مقاصد کے متعلق بالکل غلط اندازہ ہوتا تھا۔ اہم بات یہ نہ تھی کہ اراکین فی الحقیقت ٹھیک ٹھیک کیا کہتے ہیں اہم بات یہ تھی کہ لوگ ان کے اقوال

کس صورت میں پڑھتے ہیں وہ صورت یہ تھی کہ تقاریر کے اقتباسات سیاق سباق سے نکال کر ایک بے سر پیر کی واہی تباہی بکواس کی شکل میں پیش کیے جاتے تھے اس شرارت کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ تقریر مجذوب کی بڑ نظر آئے جن سامعین کو صحیح معنوں میں خطاب کیا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد صرف پانچ سو پارلیمنٹری اراکین پر مشتمل تھی اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ایک نئی تحریک یا ایک نیا ضابطہ حیات

بدترین پہلو حسب ذیل تھا:

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک صرف اسی صورت میں کامیابی کی توقع رکھ سکتی تھی جب اس کے لیڈر آغاز کار سے ہی ذہن نشین کر لیتے کہ یہاں محض کوئی پارٹی قائم کرنے کا سوال نہیں بلکہ ہمیں تو ایک نیا ضابطہ حیات رائج کرنا ہے۔ صرف اسی ڈھنگ سے وہ اندرونی اخلاقی قوتیں بیدار کی جا سکتی تھیں جو ایک ایسی مہتمم بالشان جدوجہد کے لیے لازمی ہیں ایسی جدوجہد کے لیے بہترین ذہانت اور ناقابل شکست دلیری کے مالک لیڈر درکار ہیں اگر کسی ضابطہ حیات کو مسلط کرنے کی جدوجہد ایسے شجاع انسانوں کے ہاتھ میں نہیں جو ہر قربانی کے لیے آمادہ ہوں تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے پیرو حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا جو صحیح معنوں میں مجاہد ہوں اور نصب العین کی خاطر جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔ جو شخص خود اپنے وجود کی خاطر لڑتا ہے اس کے پاس قوم کی خدمت کرنے کے لیے کوئی معقول سرمایہ نہیں بچتا۔

تحریک کی بنیاد لالچ کی بجائے قربانی پر ہونا چاہیے

کامیابی حاصل کرنے کے لیے لوازمات سے مسلح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ نئی تحریک کے متعلق متعلقین کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ جہاں تک عزت واحترام اور شان و شوکت کی توقعات کا تعلق ہے ہم آنے والی نسلوں پر نظر رکھتے ہیں ہمارے رفقائے کار کو آج کوئی معاوضہ نہیں دیا جا سکتا برعکس اس کے اگر کوئی تحریک شروع سے

ہی عہدوں اور مراتب کی کثیر تعداد پیش کرتی ہے اور یہ عہدے اور مراتب آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جماعت میں نا اہل اراکین کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی آخر کار ایک دن ایسا آئے گا جب کامیابی کا منہ دیکھنے والی جماعت میں مطلب پرستوں کی بھر مار ہو جائے گی جن مجاہدین نے ابتدائی مراحل میں معرکے جھیلے تھے، اگر وہ اپنی جماعت کو اب دیکھیں تو شاید شناخت بھی نہ کر سکیں عین ممکن ہے کہ بعد کے آنے والے انہیں غیر مفید قرار دے کر باہر نکال پھینکیں اس کے بعد تحریک کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہ رہے گا جس کی تکمیل کرنی ہے۔

پارلیمنٹ عوامی تحریکوں کا قبرستان ہے

جونہی جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے حامیوں نے پارلیمنٹ کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کر لیا اس کے بعد ان کی حیثیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی اب وہ ایک ہر دلعزیز تحریک کے لیڈر اور سپاہی نہ تھے اب وہ خالی پارلیمنٹرین بن چکے تھے یوں گرتے گرتے تحریک اس وقت کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی سطح پر آ گئی اس میں وہ طاقت نہ رہی کہ قسمت کے تھپیڑے برداشت کرے اور بغیر کسی خوف و ہراس کے شہادت کی راہ پر گامزن ہو جائے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈر لڑنے کے بجائے اب باتیں بنانے اور گفت و شنید کرنے کے عادی ہو گئے تھے ان نو آموز پارلیمنٹرین حضرات کو جلد ہی احساس ہونے لگا کہ اپنے ضابطہ حیات کے بچاؤ میں جان لڑانے کے بجائے پارلیمنٹری فصاحت بلاغت کے ''روحانی ہتھیار'' سے کام لینا ایک زیادہ تشفی بخش اور کم پرخطر طریقہ کار ہے۔ پھر جنگ میں نتیجہ غیر متقین رہتا ہے اور بہترین صورت میں بھی کوئی ذاتی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔

جب انہوں نے پارلیمنٹ میں جا کر اپنی نشستیں سنبھالیں تو باہر ان کے پیرو معجزات معرض وجود میں آنے کی آس لگائے بیٹھے تھے قدرتی بات ہے کہ ایسے معجزات نہ تو ممکن تھے اور نہ معرض وجود میں آئے اس پر تحریک کے پیرو بے صبری کا اظہار کرنے لگے وجہ

یہ کہ وہ اپنے نمائندوں کے متعلق اخبارات میں جو کچھ پڑھتے تھے وہ اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا جس کی توقع رکھتے ہوئے انہوں نے ان نمائندوں کو الیکشن کے وقت ووٹ دیئے تھے ان کی اس مایوسی کے اسباب ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں بات یہ تھی کہ اخبارات کی مخالفانہ روش کے باعث جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کے نمائندوں اور صوبائی اسمبلیوں کے اندر محفوظ بیٹھ کر ''انقلابی سرگرمیاں'' جاری رکھنے کا چسکا پڑتا گیا۔ ویسے ہی بتدریج وہ عامۃ الناس کے سامنے پہلے کی طرح تحریک کے اصول واضح کرنے سے جھجکنے لگا کیونکہ اس کام میں زیادہ خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

تحریکوں کے لیے عام جلسوں کی اہمیت

عام پبلک جلسوں کی تعداد روز بروز کم ہونے لگی حالانکہ عامۃ الناس میں حقیقی اور پر اثر رسوخ پیدا کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے وجہ یہ کہ رسوخ براہ راست شخصی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے اس طریقہ سے عامۃ الناس کی ایک کثیر تعداد کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

پہلے تقریر کرنے والے شراب خانوں کی میزوں پر کھڑے ہو کر ہزاروں سامعین کو خطاب کیا کرتے تھے اب وہ ان میزوں کو خالی چھوڑ کر پارلیمنٹ کے ہال میں گھس گئے یہاں تقریروں کا رخ براہ راست عامۃ الناس کی جانب نہ تھا یہاں تو ان کے مخاطب چند نام نہاد ''چنے ہوئے نمائندے'' ہوتے تھے جب اس بدعت کا آغاز ہوا اس کے ساتھ ہی جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کی ہر دلعزیزی بھی رخصت ہو گئی تھوڑی ہی مدت بعد تنزل اس حد کو پہنچ گیا کہ جماعت کی حیثیت محض ایک کلب کی سی رہ گئی جہاں کبھی تو سنجیدگی سے اور کبھی لاابالیانہ رنگ میں ایک علمی انداز سے مسائل وقت پر بحث و تمحیص کی جاتی تھی۔

اخبارات عوام کے سامنے جو گمراہ کن تصویر پیش کرتے تھے اب اس کی تردید کے لیے پبلک جلسوں کے ذریعہ عامۃ الناس کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم نہ کیے جاتے

تھے۔حالانکہ یہی ایک ایسا طریقہ تھا جس سے ہر ایک نمائندہ اپنی جماعتی سرگرمیوں کی بابت صحیح حالات پیش کرسکتا تھا آخر اس غفلت کا انجام یہ ہوا کہ عوام جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے۔

بڑے بڑے انقلابات صرف قوت تقریر سے برپا ہوتے ہیں

عہد حاضر کے لٹریری پہلوانوں اور انشا پردازی کے نمائشی دعویداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا کے بڑے بڑے انقلابات کا اہتمام کبھی قلم گھسانے سے نہیں کیا گیا۔ نہیں! قلم کا کام صرف ان اصولی تصورات کا پیش کرنا ہے جو انقلاب کے محرک ہوا کرتے ہیں مذہب و سیاست کی تاریخ میں بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ قوت گویائی کے ساحرانہ اثر سے ایک سیلابی رو کی شکل اختیار کرتی رہی ہیں۔

عام خلقت کو متاثر کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت سے زیادہ کارگر حربہ اور کوئی نہیں دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ عامۃ الناس کے دلوں میں جگہ کر کے ابھرتی رہی ہیں جب مصائب کی بے رحم دیوی کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اس وقت انسانی جوش و اضطراب آتش فشاں لاوے کی طرح ابل کر ایک انقلابی سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے انقلاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ قوت گفتار کے شعلے اس آگ کو بھڑکاویں آج تک کوئی عظیم الشان تحریک حسین ولطیف لٹریچر پیدا کرنے والے شیریں بیاں انشا پردازوں اور حرم سراء میں بیٹھ کر ڈینگیں مارنے والوں کی بہادری سے جڑ نہیں پکڑ سکی۔

جب کسی قوم پر تباہی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں تو اس وقت صرف جذبات کی کڑکتی ہوئی بجلی میں ہی یہ طاقت ہوتی ہے کہ ان بادلوں کو چاک کر دے۔ یاد رہے کہ صرف وہی لوگ دوسروں کو جوش میں لا سکتے ہیں جن کے اپنے دل سینے میں درد سے تڑپ رہے ہوں کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کے الفاظ میں لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح پگھلا کر جس طرف وہ چاہیں ادھر موڑ لینے کی تاثیر ہوتی ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

وہ خود اپنے اندر جذبات کی بھٹی بھڑکا لینے کی استعداد رکھتے ہیں۔

جو شخص اپنے اوپر شدید جذباتی کیفیت طاری نہیں کرسکتا اور جو شخص قوت تقریر کا مالک نہیں، اسے قضا و قدر نے ہرگز اپنا ترجمان بنانے کے لیے پیدا نہیں کیا اس کی جدوجہد کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مشیت ایزدی کے پس پشت کام کررہی ہے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ میاں منشی اپنی سیاہی دوات سے ہی مشغلہ کیا کریں اگر انہیں مطلوبہ علم و عقل حاصل ہے تو اصولی مسائل کی چھان بین کرلیں انہیں قیادت کے لیے پیدا نہیں کیا گیا وہ اس کام کے لیے نہیں چنے گئے۔

تحریک کا رابطہ عوام سے کبھی نہ ٹوٹنا چاہیے

جو تحریکیں عظیم الشان مقاصد لے کر اٹھتی ہیں ان کو ایک بڑا خطرہ درپیش ہوتا ہے وہ یہ کہ کہیں عوام سے تحریک کا رابطہ نہ ٹوٹ جائے۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور ان کا حل تلاش کرتے وقت اس اصول کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تحریک کو ہر ایسے اقدام سے بچنا چاہیے جس میں خدشہ ہو کہ عوام پر ہمارا اثر کمزور پڑ جائے گا اس احتیاط کا باعث کوئی لیڈری کی ہوس نہیں اس کی وجہ فقط یہ سادہ سی حقیقت ہے کہ چاہے کوئی عقیدہ کیسا ہی بلند اور ممتاز کیوں نہ ہو، عملاً جب تک عامۃ الناس کی نتیجہ خیز طاقت شامل حال نہ ہو جائے تب تک اس کا حصول ناممکن رہتا ہے جب حصول مقصد کی خاطر نکلیں تو چاہے حالات کیسے ہی تلخ کیوں نہ ہوں، حقائق سے کبھی آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں اس دنیا میں مشکلات سے جان بچانے کی کوشش کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ جو مقاصد اور آرزوئیں لے کر اٹھے تھے ان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ انسان کو خود اپنے عزائم فتح کردینے کا احساس نہ ہو۔

جونہی جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈروں نے پارلیمنٹری اصول قبول کرتے ہوئے عامۃ الناس کو چھوڑ کر پارلیمنٹ کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ اسی وقت سے انہوں نے اپنا مستقبل ایک حقیر کامیابی کی خاطر قربان کردیا۔ انہوں نے جدوجہد میں آسانی کا

راستہ اختیار کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آخری فتح حاصل کرنے کے قابل نہ رہے۔

میں جب وائنا میں تھا تو دو مسائل پر گہری غور وخوص کیا کرتا تھا میری پختہ رائے تھی کہ جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک انہیں دو مسائل کا غلط اندازہ لگانے کے باعث ناکام رہی ورنہ اس وقت جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی مجھے یہی تحریک آسٹریا میں بسنے والے جرمنوں کی سیادت کی مستحق دکھائی دیتی تھی۔

جرمنوں کی عالمگیر اتحاد کی تحریک کے زوال کی دونوں وجوہات ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی تھیں بڑی بڑی تحریکوں کو چلانے کے لیے اندرونی طاقت کیسے حاصل کی جاتی ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب دریافت نہ کر سکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے انقلابات برپا کرنے میں عامۃ الناس کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا پورا پورا احساس نہ کیا گیا اس لا پروائی کے سبب معاشرتی مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی جا سکی۔ نچلا طبقہ کے لوگوں کے دل و دماغ پر تحریک کو مسلط کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناقص اور ناکافی تھیں عوام سے یہی بے توجہی تھی جس کی وجہ سے پارلیمنٹری سرگرمیاں اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا پارلیمنٹری مشاغل کا اثر یہ ہوا کہ عامۃ الناس کی قدر و قیمت کا احساس اور کم ہو گیا۔

عامۃ الناس انقلابی تحریکوں میں جس زبردست استقلال کا ثبوت دیتے ہیں اگر اس کا صحیح اندازہ کر لیا جاتا تو یقیناً معاشرتی مسئلہ کے متعلق کوئی مناسب روش اختیار کی جاتی ار پراپیگنڈہ کرنے کے لیے بھی کوئی بہتر طریقہ سوچا جاتا ایسا ہو جاتا تو پھر اپنی سرگرمیوں کا مرکز ڈھونڈنے میں پارلیمنٹ کا محتاج ہونے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی تحریک کی توجہات سڑکوں پر چلتے پھرتے عامۃ الناس اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر ہی مرکوز رہتیں۔

عوام کے مذہبی اعتقادات سے الجھنا مناسب نہیں

عامۃ الناس کی اہمیت کا احساس نہ کرنے سے ایک تیسری خرابی بھی پیدا ہوئی عام خلقت کو کسی خاص راستہ پر ڈالنے کے لیے پہلے برتر قابلیت رکھنے والے آدمیوں کی

ضرورت ہوتی ہے لیکن جب ایک دفعہ عوام حرکت میں آجائے تو پھر وہ قسمت کے چکر کی طرح خود بخود اپنا توازن اور قوت رفتار برقرار رکھتے ہوئے جارحانہ اقدام جاری رکھتے ہیں۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈروں نے کیتھولک عیسائیت کے مقابلہ میں ایک کٹھن جدوجہد کا بیڑا کیوں اٹھایا؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے عامتہ الناس کی روحانی سیرت کو ٹھیک طرح نہیں سمجھا۔

اس نئی پارٹی نے پاپائے روم کے خلاف جو شدید مہم شروع کر دی وہ مندرجہ ذیل وجوہات پر مبنی تھی:

جوں ہی خاندان ہیبز برگ نے آسٹریا کو ایک سقلابی ریاست بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا اس کے بعد اس منصوبہ کو پورا کرنے کی خاطر تمام ممکن کوششیں ہونے لگیں۔ شاہان ہیبز برگ نے اپنے اس نئے "ریاستی تصور" کی خاطر دینی اداروں کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ انہیں ایسی چالیں چلنے میں کسی قسم کی مذہبی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں متعدد ذرائع استعمال کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آسٹریا بھر میں سقلاب اقتدار قائم کرنے کی خاطر چیک پادریوں اور ان کے ماتحت علاقوں سے آلہ کار کا کام لیا جانے لگا۔ اس مقصد کے لیے حسب ذیل طریقہ کار اختیار کیا جاتا تھا۔

خالص جرمن ضلعوں میں چیک پادری مقرر کر دیئے جاتے تھے یہ پادری عیسائیت کے مفاد پر چیک قوم کے مفاد کو ترجیح دیتے تھے اسی طرح آہستہ آہستہ ان پادریوں اور ان کے ماتحت علاقوں کو جرمن اثر زائل کرنے کے لیے مستقل مرکز بنا دیا گیا۔ یہ کارروائی ثابت قدمی سے جاری رکھی گئی۔

بدقسمتی سے آسٹریا کے جرمن پادری اس کارروائی کا مقابلہ کرنے میں بالکل عاجز

ثابت ہوئے نہ صرف انہوں نے جرمنوں کی جانب سے اس قسم کا کوئی جوابی اقدام کرنے سے گریز کیا۔ بلکہ وہ چیکوں کے حملہ کا خاطر خواہ مقابلہ بھی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن عنصر آہستہ آہستہ پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس پسپائی کی رفتار مستقل تھی۔ جرمنوں کے یوں پیچھے دھکیل دیئے جانے کی دو وجوہات تھیں اول تو یہ کہ مذہبی عقائد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ جرمنوں کی مدافعت کمزور تھی یہ چالیں تو چھوٹے چھوٹے معاملات میں چلی جاتی تھیں لیکن بڑے بڑے مسائل کی خاطر جو چالیں اختیار کی جاتی تھیں وہ بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔

خاندان ہیپز برگ جرمنوں کے خلاف جو اقدام کر رہا تھا، بالخصوص اس سلسلہ میں اعلیٰ رتبہ کے پادریوں سے جو کام لیا جا رہا تھا اس کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا گیا۔ جرمنوں کے نمائندہ پادری پیچھے ہٹتے ہٹتے بالکل نیچے دب گئے۔ ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے یہی خیال پیدا ہوتا تھا کہ تمام عیسائی پادری جرمن باشندوں کے حقوق سے انتہائی لاپروائی برت رہے ہیں۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ کیتھولک عیسائیت نہ صرف جرمنوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتی بلکہ وہ جرمنوں کے دشمنوں کی ناجائز امداد کرتی ہے شونئرر کا خیال تھا کیتھولک عیسائیت کی قیادت کا جرمنی سے باہر ہونا اس تمام بے انصافی کی جڑ ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ عیسائیت کی جانب سے جرمنوں کے مطالبات کی جو مخالفت کی جاتی ہے اس کی توجیہہ کے لیے یہی ایک سبب کافی ہے۔

جیسا کہ ان دنوں آسٹریا میں ہر جگہ دستور تھا۔ یہاں بھی ثقافتی مسئلہ بالکل کھٹائی میں پڑ گیا۔ اگر جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈروں نے کیتھولک عیسائیت کی مخالفت شروع کر دی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ عیسائیت کو سائنس کی رو سے غلط سمجھتے تھے بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کو جس طرح جرمنوں کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے تھی اس میں کوتاہی برتی گئی تھی اس پر طرہ یہ کہ جرمنوں کے حقوق پر دست اندازی کرنے

والوں، بالخصوص سقلاب قوم کی جنبہ داری کی جاتی تھی۔

جارج شونزر ایسا آدمی نہ تھا جو کسی کو ادھورا چھوڑتا جب اسے یقین ہو گیا کہ جرمن قوم کو بچانے کی یہی ایک صورت ہے تو اس نے عیسائیت کے مقابلہ میں بھی اکھاڑے کے اندر کودنے سے گریز نہ کیا ''روما سے بیزاری'' کی تحریک مخالدین کا حصار توڑنے کے لیے خوفناک ترین حربہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس حربہ کا استعمال بھی سب سے زیادہ مشکل تھا شونزر سوچتا تھا کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جائے تو جرمنوں کے دو بڑے مذہبی فرقوں کا باہمی افسوس ناک تفرقہ ختم ہو جائے گا جرمن قوم اور جرمن سلطنت کی اندرونی طاقت اس فتح سے بے اندازہ بڑھ جائے گی۔

اس استدلال میں مقدمات اور نتائج دونوں غلط تھے۔

تحریک کے اصول اس کے مفاد سے علیحدہ نہیں ہوتے

یہ درست ہے کہ جرمن کیتھولک پادری اپنے قومی خصائص کی حفاظت کرنے میں غیر جرمن پادریوں اور بالخصوص چیک پادریوں کے مقابلہ میں نہایت کمزور تھے یہ بھی مانا کہ جرمن پادریوں کو جرمنوں کے قومی مفاد کی حفاظت کا خیال تک نہ تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر وہ شخص جو حقائق سے اندھا نہیں اسے اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ کمزوری خود ہم جرمنوں کی ایک قومی خصوصیت کی سزا تھی وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہم اپنی قومیت کو واقعاتی نظر سے دیکھتے ہیں گویا ہماری قومیت ہماری ذات سے کوئی علیحدہ شے ہے۔

جہاں چیک پادری اپنے قومی مفاد کو ایک ذاتی رنگ میں ملحوظ رکھتے تھے اور عیسائیت کو محض واقعات نظر سے دیکھتے تھے، وہاں جرمن پادری عیسائیت سے تو ذاتی عقیدے رکھتے تھے اور اپنے قومی مفاد کو فقط واقعاتی حیثیت دیتے تھے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہماری بدقسمتی کے باعث ہر روز ہزارہا مثالوں میں واضح ہوتی ہے۔

یہ عادت ہرگز عیسائیت کی مخصوص وراثت نہیں ہمارے اندر یہ ایک ایسا نقص ہے جو

تمام اداروں کو اور اصولی مقاصد کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے بالخصوص حکومت کے اداروں پر تو اس کا اثر اور بھی شدید ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سرکاری افسر احیائے ملت کی جدوجہد کے متعلق جو وتیرہ اختیار کیے ہوئے ہیں اسے دیکھئے پھر ذرا خیال کیجئے کہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے سرکاری افسر ایسے حالات میں کیا وتیرہ اختیار کرتے۔ کیا عقل میں آتا ہے کہ کسی دوسرے ملک کے فوجی افسر قومی تمناؤں کی جنبہ داری سے بے اعتنائی کریں۔ اور "حکومت وقت کا احترام" جیسے الفاظ کی پناہ لیں۔ گذشتہ پانچ سال سے ہمارے ملک میں یہی ہوتا آیا ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ اسے ایک قابل تحسین روش تصور کیا جاتا ہے یا آیئے ایک اور مثال لیں مسئلہ یہود کے متعلق ہمارے عیسائیت کے ہر وہ فرقے ایک ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو نہ صرف قومی ضروریات کے مطابق نہیں بلکہ مذہبی مفاد کے لیے بھی مضر ہے، اس کے برعکس کسی یہودی مولوی کو دیکھئے کہ وہ یہودیوں کے حقیر سے حقیر نسلی مفاد کے متعلق کیا روش اختیار کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے پادریوں کو چاہے وہ کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ کا، رویہ بھی ملاحظہ ہو۔

جہاں کہیں کسی اصولی عقیدہ سے سامنا ہو، جرمن یہی وتیرہ اختیار کرتے ہیں۔ "حکومت وقت کا احترام" "جمہوریت" "صلح پسندی" "بین الاقوامی اتحاد" ایسے تمام تصورات ہمارے لیے ایک محدود اور معصبانہ خبط کی شکل اختیار کر لیتے ہیں چاہے قوم کی حاجتیں کیسی ہی شدید کیوں نہ ہوں ہم ان حاجتوں کو ہمیشہ ایسے ہی عقائد کی ترازو میں وزن کریں گے۔

مفاد سے ہٹ کا اعتقاد کی پرستش حماقت ہے

قومی مطالبات کو اپنے ذہن میں پہلے سے جمائے ہوئے چند تصورات کی کسوٹی پر جانچنے کی یہ عادت نہایت قابل افسوس ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیز واقعاتی لحاظ سے اصول کے خلاف نظر آئے انسان اس کا ذاتی پہلو بھی نظر انداز کر جاتا ہے غرض وسائل مقاصد کو پس پشت ڈال جاتے ہیں اگر احیائے ملت کی خاطر ایک ضرر رساں اور

بری حکومت کو ختم کرنا لازمی ہو تو احیائے ملت کی ہر کوشش کی مخالفت کی جائے گی۔ کیونکہ اس سے حکومت کو ختم کرنا لازمی ہو تو احیائے وقت کے احترام میں خلل آتا ہے جو لوگ اس زاویہ نگاہ کی حمایت کرتے ہیں ان کی نظروں میں حکومت کا احترام کسی مقصد کے لیے ایک ذریعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ بذات خود ایک مقصد ہے انہیں اپنے اصولوں کے سوا باقی تمام چیزیں واقعاتی رنگ میں دیکھنے ک اایک ایسا خبط سا گیا ہے کہ وہ اس قسم کی بودی دلیلیں دے کر خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذلیل زندگی کا مصرف ثابت کر دیا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہے تو چاہے وہ شخص فریڈرک اعظم ہی کیوں نہ ہو، چاہے پارلیمنٹری اکثریت رکھنے والے مدبرین حقیر اور نالائق انسان ہوں اور چاہے ان کا درجہ اس سے بھی پست ہو، پھر بھی یہ لوگ شور وغوغا برپا کر دیں گے۔ ان خیالی اصولوں کی خاطر جھگڑا کرنے والوں کے نزدیک جمہوریت کا آئین قوم کی بہتری کی نسبت زیادہ مقدس ہے چاہے قوم تباہ ہو رہی ہو یہ شریف آدمی ان اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے بدترین ظلم وستم کرنے والی حکومت کی بھی حمایت ہی کریں گے۔ وجہ یہ کہ چاہے عارضی وقفہ کے لیے ہی سہی، کم از کم حکومت وقت کا احترام تو قائم ہے علی ہذا القیاس اگر بہترین فائدہ رساں حکومت ان کے نظریہ جمہوریت کے مطابق نہیں تو اس کی مخالفت کی جائے گی۔

اسی طرح جب قوم کسی بیرونی خونخوار فوجی طاقت کے ظلم وستم سے کراہ رہی ہو اور اس وقت مدافعت کا کوئی سامان کیا جائے تو جرمن صلح پسند چپ چاپ بیٹھے رہیں گے کیونکہ یہ مدافعت تو جسمانی طاقت کے بل بوتے پر ہوتی ہے اور جسمانی طاقت کا استعمال صلح پسند انجمنوں کے اصول کے خلاف ہے دوسری تمام قوموں کے سوشلسٹ چاہے اسے بین الاقوامی سنگٹھن کے نام پر لوٹ لیں اور مکر وفریب کا شکار بنائیں لیکن جرمن سوشلسٹ پھر بھی اسی برادرانہ محبت سے پیش آئے گا اسے کبھی اپنا مال واپس لینے یا اپنی حفاظت کرنے کا خیال تک نہ آئے گا وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ وہ ایک ۔۔۔۔ جرمن ہے۔

شاید ان حقائق کو بار بار مثالیں دے کر واضح کرنا ناگوار گزرے۔لیکن اگر اس مرض کا علاج کرنا ہے تو ہمیں ابتدا تشخیص سے کرنی چاہیے۔

جرمن مفاد کی حمایت اور حفاظت کرنے میں پادریوں کا ایک گروہ جیسا عاجز ثابت ہوا اس کی وجہ یہی کمزوری تھی جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

یہ طرز عمل کسی بد نیتی پر مبنی نہیں اس کے پس پردہ بالاتر طاقتوں کا احکام بھی کارفرما نہیں قومی استقلال اور ثابت قدمی کا یہ فقدان ہمارے طریقہ تعلیم کے نقائص کا نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ نوجوانوں میں ان کی جرمن قومیت کا ایک زندہ جذبہ پھونک دیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سے بعض کورے تصورات کو سجدے کروائے جائیں گویا محض تصورات بھی کوئی بت ہیں۔

الفاظ کے بتوں کی پرستش نہ کرنی چاہیے

موجودہ تعلیم نوجوانوں کو اس قسم کے خیالی تصورات کا پرستار بنا دیتی ہے جیسے ''جمہوریت'' ''بین الاقوامی سوشلزم'' ''صلح پسندی'' وغیرہ وغیرہ۔یہ تعلیم نہایت محدود اور تنگ نظر ہے اس تعلیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی بیرونی حقائق کو اپنے عقائد کی عینک لگا کر مشاہدہ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔نوجوانوں پر اس ذاتی رنگ کی تعلیم سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پہلے مذکورہ بالا نوعیت کے خیالات ذہن میں جما کر پھر زندگی کے متعلق بحیثیت مجموعی بنیادی اصول وعقائد قائم کرنے نکلتے ہیں برعکس اس کے ان کی اپنی جرمن قومیت کے تعلق ان کا رویہ ایام جوانی سے لے کر آگے تک ہمیشہ واقعاتی رہتا ہے جرمن صلح پسند جو ایک طرف ذاتی لحاظ سے اپنے جسم و جان کو اپنے اصولی عقائد کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے وہ دوسری طرف جب کبھی خود اس کی قوم کو خطرہ درپیش ہو تو چاہے وہ خطرہ کیسا ہی شدید کیوں نہ ہو۔اور چاہے اس خطرہ کو بیرونی طاقتوں نے غیر منصفانہ طرز عمل سے ہی کیوں نہ پیدا کیا ہو۔پہلے واقعاتی رنگ میں حق و باطل کی تحقیق کرے گا اور پھر کہیں آگے قدم بڑھائے گا وہ کبھی اپنی قومی کی صف میں پائمردی سے کھڑا نہ رہے گا وہ کبھی

محض خود حفاظتی کا احساس پیش نظر رکھتے ہوئے جنگ پر آمادہ نہ ہوگا۔

میں ایک مثال دیتا ہوں، جس سے واضح ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا عادت ہمارے مختلف مذہبی فرقوں میں کیسے ظاہر ہوتی ہے پروٹسٹنٹ فرقہ کی ابتدا اور روایات دونوں جرمن مقاصد پر مبنی ہیں، یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹ فرقہ جرمن مقاصد کی بہتر حفاظت کرتا ہے۔تاہم جہاں کہیں ایسے مفاد کا معاملہ درپیش ہو جو ان مقاصد یا روایات کے دائرہ میں شامل نہیں یا ان کے بر خلاف ہے، وہیں پروٹسنٹ فرقہ کی ترکی بھی تمام ہو جاتی ہے۔

غرض جب تک جرمن مقاصد کا تعلق اخلاقی پاکیزگی، قومی تعلیم، جرمنوں کی روحانیت، جرمن زبان یا جرمنوں کی مذہبی آزادی سے ہو تب تک پروٹسٹنٹ فرقہ ہمیشہ جرمن مقاصد کی حمایت کرے گا کیونکہ خود پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد انہیں مقاصد پر رکھی گئی ہے لیکن یہی پروٹسٹنٹ فرقہ قوم کو اس کے جانی دشمنوں کے پنجہ سے بچانے کی ہر کوشش کا سرتوڑ مقابلہ کرتا ہے، کیونکہ یہودیوں کے متعلق اس کا رویہ اندھا دھند اور سختی سے ہمیشہ کے لیے معین ہو چکا ہے حالانکہ یہی وہ مسئلہ ہے جو سب سے پہلے حل طلب ہے۔ورنہ جرمن عروج کی بحالی اور قوم کا وقار بڑھانے کی تمام کوششیں بیہودہ اور بے سود ثابت ہوں گی۔

موجودہ نظام تعلیم ناقص ہے

قیام وائنا کے دوران میں مجھے اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے کافی فرصت اور مواقع حاصل تھے میں تحقیق کے دوران میں کسی بدگمانی یا طرف داری سے متاثر نہ تھا پھر میں لوگوں کے ساتھ روزانہ میل ملاپ کے دوران ہزار ہا نظیروں کا امتحان لے کر اپنی قائم کردہ رائے کی تصدیق بھی کر لیا کرتا تھا۔

وائنا وہ نقطہ ماسکہ تھا جہاں زیادہ سے زیادہ قومیں جمع تھیں یہاں جو شخص آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہے وہ دیکھ سکتا تھا کہ ہمیشہ جرمن صلح پسند ہی وہ ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو

اپنے قومی مفاد کو واقعاتی رنگ میں دیکھتا تھا۔ برعکس اس کے آپ کبھی کوئی ایک یہودی بھی ایسا نہ ڈھونڈ سکتے تھے جو اپنی نسل کے متعلق ہچو قسم وغیرہ اختیار کرتا۔ مزید بریں مجھے یہ بھی دریافت ہوا کہ اگر بین الاقوامی اخوت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم کے لیے کبھی سوائے آوہ و واویلا کے انصاف کا مطالبہ نہ کیا جائے تو ان معنوں میں صرف جرمن سوشلسٹوں کو ہی اس اخوت کا احساس ہے چیک پول یا دوسری کسی قوم پر ایسے طرز عمل کے لیے حرف گیری کا موقعہ پیدا نہیں ہوتا قصہ مختصر میں انہیں دنوں سمجھ گیا تھا کہ سوشلزم اور صلح پسندی وغیرہ کے عقائد کی تعلیم اس برائی کی صرف ایک علت ہے سب سے بڑی علت ہمارے طریقہ تعلیم کا قطعاً غیر تسلی بخش نظام ہے یہ اسی نظام کے نقائص کا اثر ہے کہ ہم اپنے قومی مقاصد کے متوالے نہیں۔

اس لیے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈر کیتھولک فرقہ کے خلاف اعلان جہاد کے جواز میں جو پہلا اصولی عذر پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد تھا۔

میں جس مرض کا ذکر کر رہا ہوں اس کا ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ اپنی قوم کے مستغنی از دلائل حقوق شروع سے ہی جرمن نوجوانوں کے دلوں پر نقش کر دیئے جائیں لیکن ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ ایام طفولیت سے ہی بچوں کے دلوں و دماغ اس ملعون ''واقفیت'' کے زہر سے مسموم کر دیئے جاتے ہیں وہ اس خبط میں کچھ ایسے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اپنے ہست و بود کے مسائل میں بھی ''واقفیت'' کی الجھن سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے اگر تعلیم صحیح دی جائے تو نتیجہ یہ ہو کہ آئرلینڈ، پولینڈ اور فرانس کی طرح جرمنی میں رہنے والے کیتھولک بھی پہلے جرمن ہوں، اور پھر کچھ اور ان کا قومی جذبہ دیگر تمام احساسات پر غالب رہے لیکن یہ سب کچھ تبھی ہو سکتا ہے جب پہلے قوم کی حکومت میں بنیادی تبدیلی کر لی جائے۔

میرے دعویٰ کی مضبوط ترین دلیل وہ واقعات ہیں جو اس نازک مرحلہ پر رونما ہوئے جب کہ ہماری قوم کو تاریخ کی عدالت میں اپنی ہستی کا جواز ثابت کرنے کے لیے

آخری مرتبہ طلب کیا گیا۔اس وقت ایک زندگی اور موت کی کشمکش درپیش تھی۔

سیاسی تنظم کے ذریعہ دینی اصلاح ناممکن ہے

جب تک بالائی حلقے ٹھیک ٹھیک راہنمائی کرتے رہے تب تک تو قوم اپنے فرائض بدرجہ اتم پورے کرتے رہی تمام پادریوں نے بلا لحاظ کیتھولک یا پروٹسٹنٹ ہونے کے ہماری قوت مزاحمت کی تقویت کے لیے ہر ممکن کوشش کی یہ کوشش محض جنگ کی خندقوں میں ہی کارآمد نہ تھیں گھروں میں ان کا اثر اور بھی زیادہ ہوا۔ان دنوں اور بالخصوص جوش وخروش کی پہلی سرگرمی میں دونوں مذہبی فرقے متفق تھے۔دونوں جرمن سلطنت کو مقدس خیال کرنے میں ایک تھے۔دونوں اس سلطنت کی حفاظت اور مستقبل کے لیے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جہاں تک آسٹریا کا تعلق تھا جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کو اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیے تھا" کیا جب تک آسٹریا کا جرمن عنصر کیتھولک فرقہ کا پیرو ہے تب تک اسے زندہ رکھنا ممکن ہے یا نہیں" اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہو تو ایک سیاسی تحریک کو ہرگز مذہبی اور فرقہ ورانہ مسائل میں مداخلت نہ کرنی چاہیے ہاں اگر جواب نفی میں ہو تو پھر مذہبی اصلاح کی ایک تحریل چلانا جائز ہوسکتا تھا سیاسی پارٹی قائم کرنے کے کیا معنی۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ سیاسی تنظیم کے ذریعہ مذہبی اصلاح کی جاسکتی ہے اسے کچھ پتہ نہیں کہ مذہبی تصورات اور دینی عقائد کس طرح ترقی کرتے ہیں عیسائیت نے ان عقائد کو کیسے عملی شکل دی۔

کوئی انسان بیک وقت دو کام نہیں کرسکتا میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ کسی پارٹی کا کیا ذکر، دین کا قائم کرنا یا مٹا دینا تو ایک سلطنت کے قیام وزوال سے بھی زیادہ زبردست نتائج پیدا کرتا ہے۔

یہاں یہ کہنا کوئی جواب نہیں کہ ہمارے حملے محض فریق ثانی کے حملوں کے مقابلہ

میں بچاؤ کا سامان تھے۔

اپنے دشمنوں کو دین کے آڑ لینے کا موقعہ نہ دینا چاہیے

بیشک ہمیشہ بعض ایسے بے اصول بدمعاش بھی ہوتے ہیں جو مذہب کو سیاست کے کمینہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ایسے لوگ اکثر وبیشتر دین یا سیاست کو تجارت کے طور پر استعمال کرنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تاہم کسی مذہب یا مذہبی فرقہ کو ان بدمعاشوں کے افعال کا ذمہ دار ٹھہرانا ہرگز درست نہیں وہ تو جس طرح ہر اس شے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جس میں انہیں ہاتھ ڈالنے کا موقعہ مل جائے اسی طرح عیسائیت کا بھی غلط استعمال کررہے تھے۔

پارلیمنٹری دھوکہ بازوں اور نکمے بیٹھے رہنے والوں کو اس سے سنہرا موقعہ کب ہاتھ آنا تھا کہ انہیں اپنی سیاسی بداعمالیوں کے لیے کوئی اوٹ میسر آجائے۔ہاں یہ درست ہے کہ وہ اس قربانی کے بکرے سے تبھی کام لیتے ہیں جب معاملہ رفت گذشت ہو چکا ہو جن بداعمالیوں کے لیے یہ پارلیمنٹری گرگے ذاتی طور پر ذمہ دار ہیں جب ان کا الزام کسی مذہب یا مذہبی فرقہ کے سر منڈھ دیا جائے اور اس پر حملہ کیا جائے۔تو وہیں یہ فرقہ کمال مکاری وعیاسی سے یکلخت شوروغل برپا کر دیتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا ہم اس میں حق بجانب تھے۔چاروں طرف ڈھنڈورا پیٹا جانے لگتا ہے کہ میری ہی جادو بیانی کا اثر تھا کہ دین اور عیسائیت بچ گئے۔عامتہ الناس تو ہوتے ہی احمق ہیں ان کا حافظہ بھی کمزور ہوتا ہے جب تو تو میں میں ہونے لگتی ہے تو وہ اس افراتفری میں گھبرا کر شناخت نہیں کر سکتے کہ اصل فساد کا بانی کون ہے بسا اوقات انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ لڑائی شروع کہاں سے ہوئی تھی۔یوں مجرم داؤ دے کر نکل جاتا ہے۔

ایسے مکار خوب جانتے ہیں کہ ان کی بداعمالیوں کو مذہب سے دور کا علاقہ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ جب ان کا مخلص مگر سادہ لوح حریف بازی ہار جاتا ہے اور ایک دن نوع انسان سے ناامید ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے تو وہ بغل میں منہ چھپا کر خوب قہقہے

لگاتے ہیں۔

مذہب کے ناجائز استعمال سے مذہب کی عظمت میں فرق نہیں آتا

علاوہ ازیں فی نفسہ مذہب یا عیسائیت کو افراد کی بد اعمالیوں کے لیے ذمہ دار گردانا ایک اور پہلو سے بھی نامناسب ہوگا۔ اگر ہم اس نظام کی بین عظمت و وقعت کا مقابلہ فطرت انسانی کی کمزوریوں سے کریں تو ماننا پڑے گا کہ اور جگہوں کے مقابلہ میں یہاں بدی کی نسبت نیکی زیادہ ہے یقیناً کئی پادری اپنے مقدس پیشے کو اپنی سیاسی مقصد برآری کے لیے استعمال کرتے ہوں گے بدقسمتی سے کئی مذہبی مقتدا فراموش کر دیئے ہیں کہ انہیں سیاسی کھینچا تانی کی گڑبڑ میں اعلیٰ سچائیوں کا وکیل ثابت ہونا چاہیے نہ کے دروغ بانی اور بدگوئی کے مددگار رہنا چاہیے پھر بھی ہم ایسی ہر کالی بھیڑ کے مقابلہ میں ہزاروں روشن مثالیں پیش کر سکتے ہیں صحیح روحانی پیشوا اپنا منصب پورے بھروسہ اور شرافت سے سرانجام دیتے ہیں وہ ہمارے زمانہ کی عام گمراہی کے درمیان وہی حیثیت رکھتے ہیں جو آسمان کی تاریک فضاؤں میں نورانی ستاروں کو حاصل ہے۔

میں عیسائیت کو فی نفسہ برا قرار دینے پر تیار نہیں اگر کوئی بدمعاش پادری بن کر قانون اخلاق کے خلاف کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو میں محض اس کی اس حرکت کو اپنی مذکورہ بالا رائے تبدیل کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ تسلیم نہیں کرتا نہ ہی اگر عیسائیت کے لاتعداد پیرووں میں سے کوئی ایک اپنے ہم وطنوں سے غداری کرتا ہے اور ان پر دھبہ لگاتا ہے تو میں اس کے اس فعل کے لیے ایک لمحہ کے واسطے بھی عیسائیت کو ملزم گردانے پر آمادہ ہوں خاص طور پر اس لیے کہ موجودہ زمانے میں یہ عادت ایک مرض عام کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ آج کل بھی ایسے ہر ایک غدار کے مقابلہ میں سینکڑوں ایسے ہیں جن کی آنکھیں اس دور آلام کو دیکھ کر اپنی قوم کی خاطر خون کے آنسو بہاتی ہیں وہ ہماری قوم کے بہترین فرزندوں کی طرح شب و روز ہمہ تن متمنی ہیں کہ کب وہ دن آئے گا جب ہماری قسمت پھر کھلے گی۔

دین کی اصلاح صرف دینی شخصیتوں کا منصب ہے

اگر یہاں کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ ہمیں روزمرہ زندگی کے بے حقیقت مسائل سے واسطہ نہیں بلکہ ہمیں تو بنیادی مسائل و حقائق دین سے بحث ہے تو اس اعتراض کا جواب دینے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اس سے ایک سوال دریافت کیا جائے۔

''کیا تم یہ محسوس کرتے ہو کہ قضاو قدر نے تمہیں کائنات کی ہدایت وارشاد پر مامور کر دیا ہے؟'' اگر تم واقعی ایسا محسوس کرتے ہو تو جرأت سے کام لو صاف صاف مذہبی دعوت کا اعلان کرو۔ کسی سیاسی پارٹی کو کیوں اپنا آلہ کار بناتے ہو؟ اس طرز عمل سے تم اپنے منصب میں کوتاہی کر رہے ہو۔ جو شے موجود ہے لیکن بد ہے اسے چھوڑ دو۔ کوئی ایسی چیز لاؤ جو بہتر ہو اور آئندہ تک باقی رہے۔

اگر تم یہ جرأت نہیں رکھتے۔ یا اگر تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کیا نعم البدل پیش کرو گے تو سارا معاملہ جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دو بہر صورت و بہر کیف اگر تم میں یہ حوصلہ نہیں کہ نقاب اٹھا کر میدان میں آؤ تو پھر ایچ پیچ راستوں سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش بھی مت کرو۔

سیاسی جماعتوں کو دینی مسائل میں دخل در معقولات کا کوئی حق نہیں ہاں اگر ان عقائد میں کوئی ایسی بات ہو جو قومی فطرت سے مغائر ہو اور جس سے قوم کے نسلی رواج و اخلاق میں فرق آ جانے کا اندیشہ ہو تو پھر دوسری بات ہے۔

اگر بعض مذہبی مقتدا اپنی قوم کو زک دینے کی خاطر مذہبی رسوم یا دینی عقائد کا غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کے مخالفین کو ہرگز ان کی تقلید نہ کرنا چاہیے اور کبھی ایسے ہتھیاروں سے نہ لڑنا چاہیے۔ ایک سیاسی لیڈر کو ہمیشہ اپنی قوم کے دینی عقائد اور مذہبی عادات کی تقدیس کا احترام کرنا چاہیے۔ اسے کبھی ان عادات و عقائد کی مخالفت نہ کرنا چاہیے اور وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ ہرگز ایک مدبر کہلانے کا مستحق نہیں ہاں اگر اس میں مطلوبہ صفات موجود ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ایک مصلح ہو۔

اس کے سوا کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا تباہی کا پیش خیمہ ہوگا بالخصوص جرمنی میں تو یہ حقیقت اور بھی مسلم ہے۔

سیاست کی بنیاد معاشرتی مفاد ہیں، مذہب کی بنیاد ضمیر ہے

جب میں نے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک اور پاپائے روم سے اس کی مخالفت کا مطالعہ کیا تو مجھے پکا یقین ہو گیا کہ اس تحریک نے ایک بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے یہ لوگ معاشرتی مسئلہ کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہے، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ عامۃ الناس کا سہارا کھو بیٹھے۔ حالانکہ ایسی تحریکوں میں عوام کی سر بکف حمایت حاصل کیے بغیر کام نہیں چلتا جوں جوں وقت گزرتا گیا میرا یہ اندازہ اور بھی پختہ ہوتا گیا جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈر پارلیمنٹ میں داخل ہو کر عام خلقت کی زبردست قوت عمل سے محروم ہو گئے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے پارلیمنٹری نظام کے نقائص کا بار مفت میں اپنے کندھوں پر لے لیا۔ عیسائیت سے ان کی چھیڑ خانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادنیٰ اور اوسط درجہ کے کثیر تعداد باشندوں سے بگڑ گئی صرف یہی نہیں بلکہ اعلیٰ طبقوں کے کئی عناصر نے بھی جن میں بعض قوم کے بہترین اجزاء شمار کیے جانے کے لائق تھے ان سے قطع تعلق کر لیا غرض آسٹریا میں جرمنوں کے تمدنی جہاد کے عملی نتائج پر نظر ڈالی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے ایک لاکھ پیروؤں کو عیسائیت سے منحرف کر لیا۔ لیکن اس سے عیسائیت کو کیا نقصان پہنچا؟ عیسائیت کو ان گم کردہ راہ بھیڑوں پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس سے وہی پیرو چھوٹے جن کے دل پہلے ایک مدت سے اندر اندر ہی برگشتہ ہو چکے تھے اس وہابیت اور لوتھر کے تاریخی دور کی عظیم الشان وہابیت میں فرق یہ تھا کہ اس وقت تو عیسائیت کے بعض بہترین پیرو مذہبی اعتقادات کی بنا پر علیحدہ ہوئے تھے۔ برعکس اس کے اب وہی لوگ علیحدہ ہوئے جو پہلے ہی لاپرواہ تھے۔ اور جنہیں اب بھی خالی سیاسی مفاد کا ہی خیال تھا۔ اگر محض سیاسی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی یہ

نتیجہ جتنا افسوسناک تھا اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔

ایک دفعہ پھر ایک سیاسی تحریک جس سے جرمن قوم کی اس قدر امیدیں وابستہ تھیں یوں ہی ناکامی کا شکار ہوگئی وجہ یہ کہ اس تحریک کے چلانے والوں نے اپنی توجہات کو فقط حقائق اور محض حقائق پر سختی سے مرکوز نہیں رکھا۔ برخلاف اس کے وہ ان وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرے جہاں تحریک کی تباہی یقینی تھی۔

تحریک کو بیک وقت دو محاذ پر لڑنا نہیں چاہیے

اگر جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک عامۃ الناس کی نفسیات سے کما حقہ واقف ہوتی تو کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کیا جاتا اور سب باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو خالی نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ہی یہ مناسب نہیں کہ عوام کے سامنے دو یا دو سے زیادہ دشمن پیش کیے جائیں اس سے ان کی طاقت پیکار قطعاً تقسیم ہو جاتی ہے اگر اس تحریک کے لیڈر یہ نکتہ سمجھ جاتے تو وہ اپنی تمام قوت بغیر تقسیم کیے ایک ہی دشمن کے خلاف حملہ کرنے کی خاطر جمع کر لیتے ایک سیاسی جماعت کے لیے اس سے بڑا خطرہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کی باگ دوڑ ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو باوجودیکہ چپو پکڑنے کی لیاقت بھی نہیں رکھتے پھر ہر کشتی میں ٹانگ اڑانے کے شائق ہوں۔

مانا کہ مختلف فرقوں کے خلاف فی الحقیقت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے پھر بھی سیاسی لیڈروں کو ہرگز وہ سبق فراموش نہ کرنا چاہیے جو تاریخ کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کبھی کوئی خالص سیاسی جماعت ایسے ہی حالات میں اصلاح دین کی مہم سرانجام نہیں دے سکی آخر تاریخ کا مطالعہ اس لیے تو نہیں کیا جاتا کہ جب تاریخ کے سکھائے ہوئے اسباق پر عمل کرنے کا وقت آئے تو انہیں فراموش کر دیا جائے یا قابل اعتبار نہ سمجھا جائے یہ کہنا غلط ہے کہ اس خاص معاملہ میں حالات مختلف تھے اور اس لیے ان پر تاریخ کی دائمی سچائیوں کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا تاریخ کا مطالعہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ جو سبق یہاں سے سیکھے جائیں پھر ان کا اطلاق موجودہ زمانہ کے حالات پر کیا جائے جو کوئی ایسا نہیں کر سکتا

اسے سیاسی لیڈر ہونے کا دعویٰ ہرگز زیب نہیں دیتا وہ یا تو محض ایک سطحی شخص ہے اور یا وہ ایک برخود غلط سادہ لوح انسان ہے جس کے عملی معاملات میں نالائقی پر اس کی نیک نیتی پردہ نہیں ڈال سکتی۔

رہنمائی کا اصل راز کیا ہے؟

فن قیادت کیا ہے ہر دور کے صحیح معنوں میں بڑے بڑے ہر دلعزیز لیڈر اس فن کا اظہار کیسے کرتے رہے ہیں قوم کی توجہ کو ایک دشمن پر مرکوز کر دینا اور خیال رکھنا کہ کسی طرح یہ توجہ الگ الگ حصوں میں منقسم نہ ہو جائے۔ یہی اس فن کا ملکہ ہے عوام کی طاقت پیکار جس قدر کسی ایک مقصد پر متوجہ ہو جائے گی اتنا ہی اتحاد عمل کی مقناطیسی کشش سے متاثر ہو کر تحریک میں نئے رنگروٹ بھرتی ہوتے جائیں گے اس طرح حملہ کرنے کی قوت مزید ترقی کرتی جائے گی ایک قابل لیڈر کو ضرور یہ ڈھنگ آنا چاہیے کہ وہ مختلف دشمنوں کو ایک صف میں شامل کر کے دکھا سکے ورنہ اس کے کمزور اور مذبذب مقلدین کو مختلف دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا تو امکان غالب ہے کہ انہیں خود اپنا مقصد بنی برحق وانصاف ہونے میں شبہ پڑنے لگے گا۔

عامۃ الناس متلون مزاج ہوتے ہیں جب انہیں کسی ایسے معرکہ سے واسطہ پڑ جائے جہاں دشمن متعدد گروہوں پر مشتمل ہو تو ایسے حالات میں ان کی واقعاتی حس بیدار ہو جاتی ہے وہ سوچنے لگتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اور سب تو جھوٹے ہوئے اور ہم اور ہماری تحریک سچے ہوئے۔

اس قسم کے خیالات ان کی قوت پیکار مفلوج کر دینے کی طرف پہلا قدم ہوتے ہیں اگر دشمن متعدد ہیں اور مختلف گروہوں پر مشتمل ہیں تو ان سب کو اس طرح ایک ہی ظاہر کرنا ہوگا کہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آئیں مقبول عام تحریک کے پیروؤں کی بھیڑ کو ایک ہی دشمن دکھائی دے جس کے خلاف انہوں نے جنگ کرنی ہے۔

صحیح نصب العین اور کارگر طریقہ کار دونوں تحریک کی کامیابی کے لیے

ضروری ہیں

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے لیڈر اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک ناکام رہی۔انہوں نے اپنا نصب العین صاف صاف تاک لیا تھا ان کے ارادے صحیح تھے لیکن انہوں نے راستہ غلط اختیار کیا۔ان کی مثال اس پہاڑ پر چڑھنے والے سے دی جا سکتی ہے جس کی نگاہیں اس چوٹی پر جمی ہوئی ہیں جہاں اس نے پہنچنا ہے۔اس میں طاقت و استقلال کی بھی کمی نہیں لیکن وہ اس پگڈنڈی پر کچھ توجہ نہیں دے رہا جو اس کے پاؤں کے نیچے ہے گو اس کی نظر منزل مقصود سے نہیں ہٹتی لیکن وہ راستہ کی نوعیت اور ماہیت سے بالکل بے خبر ہے آخر کار وہ ناکام رہے گا۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے مقابلہ کی عظیم الشان تحریک نے اپنا منتہائے نظر حاصل کرنے کے لیے جو طریق عمل اختیار کیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا اس نے جو راستہ انتخاب کیا وہ خوب تھا لیکن اسے منزل مقصود کا صحیح تصور نہ تھا۔قریب قریب تمام مسائل جن میں جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک ناکام رہی ان کے متعلق کرسچین سوشلسٹ پارٹی کی پالیسی صحیح اور باقاعدہ رہی۔

انہوں نے عامۃ الناس کی اہمیت کا درست اندازہ لگایا اس طرح انہوں نے تحریک کے معاشرتی پہلو پر شروع سے ہی زور دے کر عام خلقت کے کثیر التعداد گروہ کی حمایت حاصل کر لی بالخصوص نچلے درجہ کے اوسط طبقہ اور کاریگروں کو اپنا مخاطب بنا کر انہوں نے ایسے مقلدین حاصل کر لیے جو وفادار، مستقل مزاج اور قربانی کرنے والے تھے کرسچین سوشلسٹ لیڈروں نے مذہبی اداروں سے ہر قسم کا جھگڑا چھیڑنے سے احتراز کیا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں کیتھولک عیسائیت کے طاقتور نظام کی حمایت حاصل ہو گئی یہ لیڈر وسیع پیمانہ پر پراپیگنڈا کی قدر و قیمت سے واقف تھے اپنے مقلدین کی عام بھیڑ کے روحانی احساسات کو جوش میں لانے کے لیے یہ لوگ صحیح معنوں میں ماہر فن تھے۔

یہ پارٹی آسٹریا کی سلطنت کو انتشار سے بچانے کے خواب کو عملی جامہ نہ پہنچا سکی اس

کی بڑی وجہ وہ نقائص تھے جو اس کے طریقہ کار میں پائے جاتے تھے علاوہ ازیں ان کے ذہن میں اپنے مقاصد کا ابھی صاف تصور موجد نہ تھا۔

کرسچین سوشلسٹ پارٹی جب بنی سام کی مخالفت کرتی تھی تو اس مخالفت کی بنا نسلی اصول کے بجائے مذہبی اصول پر رکھتی تھی اس غلطی کے باعث ایک دوسری غلطی بھی سرزد ہوئی۔

سیاسی اختلافات کی بنیاد نسل ہے نہ کہ مذہب

کرسچین سوشلسٹ پارٹی کے بانیوں کا خیال تھا کہ اگر وہ آسٹریا کو بچانا چاہتے تو انہیں اپنی اساس نسلی اصول پر نہ رکھنی چاہیے ان کی رائے تھی کہ ایسی پالیسی اختیار کرنے سے تو سلطنت بسرعت تمام منتشر ہو جائے گی پارٹی کے بڑے بڑے سردار یہی سمجھتے تھے کہ وائنا کی صورت حالات کے پیش نظر تمام ایسے اقدامات سے گریز کرنا چاہیے جن سے مختلف اقوام کے مابین تفرقہ پھیلنے کا ڈر ہو ساتھ ہی ساتھ ان کا خیال تھا کہ ہر اس کوشش کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جس سے اتحاد کی صورت پیدا ہو۔

ان دنوں وائنا اجنبی اقوام کی کثرت سے چھلنی ہو رہا تھا بالخصوص چیک تو ہر جگہ موجود تھے ان حالات میں ہر ایسی جماعت کو جو اصولاً جرمنوں کے خلاف نہ ہو اور پھر ان تمام قومی عناصر کو بھی اپنی صف میں شامل کرنا چاہیے زیادہ سے زیادہ رواداری ظاہر کرنے کی ضرورت تھی اگر آسٹریا کو بچانا مقصود تھا تو ان عناصر کی شرکت بھی لازمی تھی یہی وجہ تھی جسے مدنظر رکھتے ہوئے مانچسٹر کے لبرل خیالات کی مخالفت کر کے چھوٹے چھوٹے تاجروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں ان تاجروں میں سے زیادہ تر چیک تھے کرسچین سوشلسٹ پارٹی کا خیال تھا کہ ہم نے اپنی اس روش سے یہودیوں کے خلاف ایک ایسا نعرہ گھڑ لیا ہے جو مذہبی اہمیت کے باعث ان تمام اقوام کو متحد کر لے گا جو قدیم آسٹریا میں بس رہی تھیں۔

تاہم ظاہر تھا کہ یہودی، بنی سام کی اس قسم کی مخالفت سے کوئی خدشہ محسوس نہیں

کرتے ان کی بے فکری کے لیے یہی وجہ کافی تھی کہ اس کی مخالفت کی بنیاد خالی مذہب پر تھی اس کے یہ معنی تھے کہ اگر حالات بدترین صورت بھی اختیار کرلیں تو پسمہ کے پانی کے چند قطرے چھڑکوا کر ساری بلا دور کی جاسکتی ہے یہودی پھر حفاظت سے بیٹھ کر اپنا کاروبار چلا سکے گا اسے اپنی قومیت برقرار رکھنے میں کوئی دقت درپیش نہ آئے گا۔

تحریک کے نصب العین میں عام کشش ہونی لازمی ہے

ایسے سطحی اصولوں سے اس سارے مسئلہ کو کسی معقول طریقہ پر سمجھنا یا اس کا کوئی علاج کرنا ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی سام کی اس طرح مخالفت کی جانے کا کوئی مطلب نہ سمجھ سکے اس وجہ سے انہوں نے اس میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔ چونکہ تحریک کے لیڈروں نے اپنی بنیاد کسی صحیح عقلی اصول پر نہیں رکھی بلکہ محض جذباتی اپیلیں کرتے رہے، اس وجہ سے اس عقیدہ کی جاذبیت فقط تنگ نظر حلقوں تک محدود رہی دماغی قابلیت رکھنے والے لوگ ایسی پالیسی کے اصولاً مخالف تھے روز بروز ظاہر یہی نظر آتا تھا کہ یہ ساری تحریک صرف یہودیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ایک نئی کوشش ہے یا اس کا مقصد محض دوسری معاصر تحریکوں کا مقابلہ کرنا ہے اس طرح تمام جدوجہد میں کوئی ایسا نشان نہ رہا جس سے پتہ چلتا کہ اس کی بنیاد کسی اعلیٰ اور روحانی مقصد کی خاطر رکھی گئی تھی سچ تو یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ تحریک خلاف اخلاق اور قابل نفریں نظر آتی تھی یہ لوگ ہرگز ایسے نہ تھے کہ انہیں بیہودہ قرار دیا جاسکتا تحریک یہ احساس پیدا کرنے میں ناکام رہی کہ یہاں ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جو تمام بنی نوع آدم کے لیے زبردست اہمیت رکھتا ہے اور اس کے حل کیے جانے پر تمام غیر یہودی دنیا کی قسمت کا دارومدار ہے۔

بنی سام کی مخالف کے مسئلہ میں اس نیمے دروں نیمے بروں طریقہ سے ہاتھ ڈالنے کا انجام یہ ہوا کہ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

بنی سام کی یہ مخالفت بس نام ہی کی مخالفت تھی اس سے تو اگر بنی سام کی مخالفت کا

کوئی دعویٰ کیا ہی نہ جاتا تو اچھا ہوتا۔قوم کو اس دعویٰ سے یہ جھوٹی تسلی ہوگئی کہ نسلی دشمن قابو میں آ گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خود ان پر سواری کی جا رہی تھی۔

یہودیوں نے جلد ہی بنی سام کی اس قسم کی مخالفت کا علاج کر لیا انہوں نے محسوس کیا کہ ایسی مخالفت کے بند ہو جانے کی نسبت اس کا جاری رہنا ان کے لیے زیادہ مفید ہے۔

ساری تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی گئیں جو مختلف اقوام سے مرکب تھی جرمن عنصر کے محافظوں کو ابھی اس سے بھی بڑی قربانیاں کرنے پر مجبور ہونا تھا۔

وائنا میں کسی محب قوم ہونے کا دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ تھا ایسا کرنے میں ڈر محسوس ہوتا تھا کہ کہیں پاؤں تلے کی زمین نہ نکل جائے امید تھی کہ شاید قومیت کا مسئلہ نظر انداز کرنے سے ہیبز برگ سلطنت بچ جائے گی اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت بھی تباہ ہوگئی اور کرسچین سوشلزم بھی ختم ہو گیا قومیت ہی طاقت کا ایک سرچشمہ ہے جس سے کوئی سیاسی جماعت مطلوبہ قوت عمل حاصل کر سکتی ہے۔یہ تحریک اس سرچشمہ سے محروم تھی۔

ایک تحریک کو ماحول اور مقصد دونوں کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں

میں ان دونوں تحریکوں کا بنظر غائر مطالعہ کرتا رہا اور دیکھتا رہا کہ وہ کیسے پھلتی پھولتی ہیں ایک سے تو مجھے اس لیے دلچسپی تھی کہ میرا دل اس کا ہمنوا تھا دوسری سے مجھے یوں لگاؤ تھا کہ میں اس کے بانی کی دل سے عزت کرتا تھا یہ شخص میری نظروں میں آسٹریا کے اندر بسنے والے تمام جرمنوں کا ایک حسرتناک مرقع تھا۔

جب وائنا میونسپلٹی کے اس صدر کے جنازہ کا شاندار جلوس ٹاؤن ہال سے نکل کر چکر لگاتا ہوا باغ عام کی جانب چلا تو جو لاکھوں انسان کھڑے ہو کر اس دل پر اثر کرنے والے منظر کو دیکھ رہے تھے، میں بھی ان میں شامل تھا یہیں کھڑے کھڑے میرا دل بھر آیا

میرے فطری احساس نے مجھے صاف صاف بتایا کہ اس شخص کا سب کیا دھرا بیکار تھا۔ ایک ہونی تھی اس سلطنت کے بسرعت تمام اس کے زوال کی طرف لے جارہی تھی اگر ڈاکٹر کارل لوئجر جرمنی میں پیدا ہوتا تو ہماری قوم کے عظیم ترین قائدین میں شمار کیا جاتا اس کی اور اس کے مشقوں کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایک ان ہونی سلطنت میں پیدا ہوا۔

اس کی وفات سے قبل ہی بلقان میں آگ کے شعلے بھڑک چکے تھے اور ماہ بماہ پھیلتے جارہے تھے قسمت نے اس پر رحم کیا اسے وہ نظارہ دیکھنے سے بچالیا جس کے متعلق اسے تادم آخر امید تھی کہ میں اسے روکنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں نے اس علت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جس نے ایک تحریک کو تو ناکارہ کردیا اور دوسری کی ترقی روک دی۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری شروع سے جو رائے تھی وہ اب ایک پختہ عقیدہ کی صورت اختیار کر گئی ان دونوں تحریکوں کے راستہ میں ایک تو آسٹریا کی قدیم سلطنت کو مضبوط کرنے کی فی نفسہ مشکلات حائل تھیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے حسب ذیل مہلک ٹھوکر کھائی۔

معاشرت کی اصلاح اور جرمن نسل کا اتحاد

جہاں تک تحریک کے نصب العین کی بابت بنیادی تصورات کا تعلق تھا، جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک بالکل صحیح راستے پر تھی۔ یہ نصب العین جرمنوں کا احیاء تھا۔ لیکن اس تحریک نے جو ذرائع اختیار کیے وہ افسوسناک تھے تحریک محب قوم تھی مگر معاشرتی مسئلہ پر کوئی توجہ نہ دی گئی نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ بنی سام سے اس کی مخالفت نسلی مسئلہ کے صحیح اندازے پر مبنی تھی اور کسی مذہبی اصول کی محتاج نہ تھی تاہم یہاں پھر حقائق کو غلط طور پر سمجھا گیا اور ایک مذہبی فرقہ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں غلط چال چلی گئی۔

کرسچن سوشلسٹ تحریک گو جرمنوں کے احیاء کا محض ایک دھندلا سا تصور تھی پھر بھی بحیثیت ایک جماعت کے اس نے اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کے

ان سے ذہانت اور خوش اقبالی ظاہر ہوتی تھی کرسچین سوشلسٹ تحریک کے پیروؤں نے معاشرتی مسئلہ کی نوعیت کو صحیح سمجھا لیکن انہوں نے یہودیوں کے خلاف جدوجہد میں غلط اصول اختیار کیے وہ سیاسی طاقت کے سرچشمہ کی حیثیت سے قومیت کے تصور کی اہمیت سمجھنے میں قاصر رہے۔

کرسچین سوشلسٹ پارٹی نے جس ذہانت سے عامۃ الناس کی قدروقیمت جانچ لی تھی، اگر وہ اسی طرح نسلی مسئلہ کی اہمیت بھی شناخت کرلیتی اور ساتھ ہی اگر یہ جماعت محبِّ قوم بھی ہوتی یا برعکس اس کے اگر جرمنوں کی عالمگیر اتحاد کی تحریک نے جیسے نسلی مسئلہ کی اہمیت سمجھ لی تھی اور یہودیت کے مسئلہ اور قومیت کے تصور کے متعلق صحیح اندازہ لگایا تھا اسی طرح وہ کرسچین سوشلسٹ پارٹی کی عملی ذہانت بھی اختیار کرلیتی، اور بالخصوص سوشلزم کے متعلق انہیں جیسی روش پر گامزن ہوجاتی، تو پھر ایک ایسی تحریک اٹھتی جو میری رائے میں جرمنوں کی قسمت کا پانسہ پلٹنے میں کامیاب ہوجاتی۔

اگر ایسا نہ ہوسکا تو اس کا سارا الزام سلطنت آسٹریا کی ہیئت ترکیبی کے سر پر ہے۔

ان دنوں کی موجودہ جماعتوں میں سے مجھے کوئی ایک بھی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے ان عقائد کی علمبردار ہو۔ اس لیے میں اپنے تئیں کسی موجودہ تنظیم میں منسلک کرنے پر راغب نہ کرسکا۔ نہ ہی میرا جی چاہتا تھا کہ ان کی جدوجہد میں شریک ہوؤں اس وقت بھی مجھے تمام تحریکوں میں وہ چستی اور قوت مفقود نظر آتی تھی جو جرمن نسل کے فی الحقیقت صحیح اور ٹھوس قومی احیاء کے لیے لازمی تھی۔

میری وفاداری اور آرزوؤں کا مرکز شروع سے جرمنی تھا

ہیبز برگ سلطنت سے میری اندرونی نفرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی جس قدر میں خارجی حکمت عملی کے مسائل پر غور کرتا تھا اتنا ہی مجھے یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ نیم مردہ سلطنت ضرور جرمنوں کی تباہی کا باعث ہوگی مجھے روز بروز احساس ہو رہا تھا کہ جرمن قوم کی قسمت کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا بلکہ جرمنی میں ہوگا میرا یہ احساس محض سیاسی مسائل پر

ہی اطلاق نہ رکھتا تھا بلکہ ثقافتی سرگرمیوں کی بابت اور بھی صحیح تھا۔

قومی تمدن اور تہذیب کے مسائل کی طرح میدان ثقافت میں بھی آسٹریا کی سلطنت وہی بڑھاپے کا ضعف ظاہر کر رہی تھی کم از کم جہاں تک جرمن قوم کا تعلق تھا آسٹریا اب وہی ثقافتی اہمیت نہ رکھتا تھا آسٹریا کے فن عمارت پر یہ مقولہ بالخصوص حاوی تھا جدید عمارات میں سے کوئی بھی عظیم الشان کہلانے کی مستحق نہ تھی باغ عام کی تعمیر کے بعد وائنا میں جتنی عمارات بنی تھیں جب ان کا مقابلہ جرمنی کے جدید ترقی پسند نقشوں سے کیا جائے تو وہ کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔

اس طرح روز بروز میں ایک دوہری زندگی بسر کرنے لگا ایک طرف تو حقائق اور عقل یہ ترغیب دیتے تھے کہ جس طرح سختی برداشت کرتے ہوئے وائنا میں پیشہ ورانہ شاگردی کا زمانہ بسر کر رہا ہوں اسے جاری رکھوں مجھے اقرار ہے کہ بعد میں جا کر یہ پیشہ ورانہ شاگردی میرے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی دوسری طرف میرا دل اب کہیں اور ہی بس رہا تھا۔

مختلف نسلوں سے مرکب سلطنتیں پائدار نہیں ہوتیں

میں بے چین رہنے لگا جتنا میں اس سلطنت کے کھوکھلے پن اور اس کے یقینی زوال کا احساس کرتا تھا اتنا ہی مجھ پر یاس وغم طاری ہو جاتے تھے مجھے اب پختہ یقین ہو رہا تھا کہ یہ سلطنت مرتے مرتے بھی جرمنوں کے سر پر ہر قسم کی آفات لانے کا باعث ہوگی۔

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہیپز برگ سلطنت ہر اس جرمن کو دل شکستہ کرے گی اور اس کے راستہ میں روڑے اٹکائے گی جس میں صحیح عظمت کے نشان پائے جائیں ساتھ ہی ساتھ وہ جرمنوں کے خلاف ہر قسم کی سرگرمیوں کی امداد واعانت کرے گی آسٹرین سلطنت کا دار الحکومت بھانت بھانت نسلوں کی ایک عجیب معجون مرکب تھا۔ اس چڑیا خانے میں چیک، پول، ہنگرین، روتھیسین، سرب، کروٹ اور نہ معلوم کون کون قومیں بھری پڑیں تھیں ان سب کے ساتھ جابجا اور ہر جگہ وہ نسل انسانی کو تباہ کر دینے والے

جراثیم یعنی یہودی بھی موجود تھے مجھے یہ ساری ہیئت کذائی دیکھ کر گھن آنے لگتی تھی یہ عظیم الشان شہر مخلوط نسلوں کی بدطینتی کا ایک مرقع دکھائی دیتا تھا۔

میں بچپن سے جرمن زبان بولتا آیا تھا بویریا کے نچلے حصے میں مقامی طور پر یہی زبان رائج ہے میں اپنا لب ولہجہ کبھی نہ بھولا نہ ہی میں وہ زبان سیکھ سکا جو وائنا میں رائج تھی جرمن تمدن کے اس قدیم گھوارہ کا ستیاناس کر کے یہاں اجنبی قوموں کی جو غلط ملط بھیڑ پل رہی تھی اسے دیکھ دیکھ کر مجھے اس شہر میں رہتے جتنی مدت گزرتی، اتنی ہی میرے دل میں ان کی طرف سے نفرت بڑھتی تھی۔ یہ خیال کرنا کہ یہ سلطنت آئندہ اپنے وجود کو کسی طویل مدت تک قائم رکھ سکے گی محض ایک احمقانہ وہم تھا۔

آسٹریا کی مثال اس جڑت کاری کے قدیم نمونہ کی سی تھی جس میں مختلف رنگوں کے پتھر ایک مضبوط سیمنٹ کے ذریعہ جوڑ دیئے گئے ہوں اور اب امتداد زمانہ سے سیمنٹ کمزور ہو کر جڑت کاری کا یہ نمونہ خستہ ہو چکا ہو جب تک اسے نہ چھیڑا جائے تب تک وہ جیسا ہے بعینہ قائم رہے گا لیکن جس وقت اس پر کوئی ضرب پڑی وہیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا لہذا اب سوال صرف یہ تھا کہ وہ ضرب کب پڑتی ہے میرا دل جرمنی میں بس رہا تھا مجھے آسٹریا کی شہنشاہیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی اس لیے مجھے آسٹریا کے عالم انتشار میں خالی یہی نظر آتا تھا کہ جرمن قوم کی نجات کی طرف پہلا قدم اٹھ رہا ہے۔

جرمنی اور آسٹریا کا الحاق

ان سب باتوں نے مل کر میرے دل میں اس ملک میں جانے کی آرزو اور بھی شدید کر دی جس کے لیے میرا دل ایام جوانی سے ہی چپکے چپکے تڑپ رہا تھا۔

میں امیدیں باندھتا تھا کہ ایک دن میں فن عمارت میں اپنا نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا پھر کم وبیش جیسے قسمت نے اجازت دی اپنی لیاقت اپنے ملک کی خدمت میں وقف کر سکوں گا۔

ایک آخری وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس سرزمین میں جا کر رہنا اور کام کرنا چاہتا تھا جہاں

میرے دل کی پرانی تمنا بر لانے والی تحریک کی داغ بیل ڈالی جائے وہ تمنا یہ تھی کہ میں جس ملک میں پیدا ہوا اسے ہماری مشترکہ مادر وطن سے ملحق کر دیا جائے۔

کئی لوگ اس آرزو کی بیتابی کا تصور نہیں کر سکتے تاہم میں دو طرح کے لوگوں کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں اول وہ جو ابھی تک اس سعادت سے محروم ہیں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں دوسرے وہ جو اس مسرت کے مالک تھے لیکن اب بدقسمتی سے محروم ہو چکے ہیں میں ان تمام لوگوں کو مخاطت کرتا ہوں جو مادر وطن سے جدا کیے جا چکے ہیں اور جنہیں اپنی مقدس ترین وراثت بقرار رکھے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ وراثت ان کی قومی زبان ہے چونکہ وہ اپنی مادر وطن کے وفادار ہیں، اور اس سے محبت رکھتے ہیں، اس لیے ان پر ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں جب انہیں آبا ؤ اجداد کے گھر کی آغوش میں واپس جانے کی اجازت ملے گی یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف میرا روئے سخن ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری بات خوب سمجھتے ہیں۔

ایک جرمن ہونا اور پھر مادر وطن سے منسلک ہونے کے حق سے محروم رہنا اس کے معنی صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کے خود اپنے دل پر یہ واردات بیت چکی ہو کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ اس جبری ترک وطن میں گھر لوٹنے کی آرزو کیسے بیتاب کر دیتی ہے دل میں رہ رہ کر ایک ہوک اٹھتی ہے جب تک آبائی گھر کے دروازے نہ کھل جائیں کوئی خوشی اور اطمینان میسر نہیں ہوتا۔ جن کی رگوں میں ایک ہی خون رواں ہے وہ صرف اپنی مشترکہ سلطنت میں ہی امن وآرام محسوس کریں گے۔

میں نے وائنا میں بہت کچھ سیکھا

وائنا میرے لیے ایک کڑا مکتب تھا اس نے مجھے میری زندگی کے دقیق ترین سبق سکھائے ابھی میرا بچپن بمشکل ختم ہوا تھا کہ میں یہاں رہنے آیا جب میں یہاں سے گیا تو میں ایک سنجیدہ وفہمیدہ مرد بن چکا تھا میں نے وائنا میں ہی اپنے ضابطہ حیات کی بنیادیں قائم کیں بالخصوص سیاسی مسائل کا تجزیہ کرنا میں نے یہیں سیکھا۔ اس وقت میں

نے جو سیاسی خیالات اور ضابطہ حیات قائم کیا وہ پھر میں نے کبھی ترک نہیں کیا میں آج ہی اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ پیشہ ورانہ شاگردی کے ایام میرے لیے کیسے قیمتی تھے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اس دور کا **مفصل** تذکرہ بیان کیا ہے۔ تلخ حقیقت نے وائنا میں مجھے وہ سچائیاں سکھا دیں جو اب ہماری جماعت کے بنیادی اصول ہیں پانچ سال میں یہ جماعت ایک حقیر ابتدا سے ترقی کر کے آج ایک عظیم الشان مقبول عام تحریک بن گئی ہے اگر میں ایسی نوعمری کے زمانہ میں ذاتی عقائد کا ایک خزانہ جمع نہ کر لیتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آج یہودیت اور سوشلزم یا دوسرے الفاظ میں مارکس ازم، کے متعلق بحیثیت مجموعی میرا کیا رویہ ہوتا۔ میں معاشرتی مسئلہ کی بابت کیا روش اختیار کرتا۔

درست ہے کہ مادر وطن کے مصائب نے ہزاروں کو اس زوال کے اندرونی اسباب کا مطالعہ کرنے پر مائل کیا ہو گا لیکن اس سے ہرگز وہ مکمل علم اور گہری بصیرت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو ایک ایسے آدمی کے حصہ میں نہ آ سکتی تھی جس نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خاطر سالہا سال تک سخت جد و جہد کی ہو۔

☆☆☆☆☆☆

باب چہارم :: میونخ

مجھے آرٹ سے عشق تھا

آخر میں 1912ء کے موسم بہار میں میونخ جا پہنچا۔

مجھے یہ شہر ایسا مانوس نظر آتا تھا کہ گویا میں یہاں برسوں سے مقیم ہوں اس کی وجہ یہ تھی کہ فن عمارات کے مطالعہ کے دوران میں بار بار میری توجہ جرمن آرٹ کے مرکز کی جانب متوجہ ہوتی رہی تھی اگر کوئی شخص جرمنی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے ضرور میونخ کی سیر کرنے چاہیے میونخ گئے بغیر جرمن آرٹ کو سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔

جب میں ساری باتوں کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے میں نے جتنی مدت یہاں گزاری وہ میری زندگی کی مسرت اور اطمینان کی بہترین گھڑیاں تھیں میری کمائی نہایت قلیل تھی پھر بھی آخر میں نقاشی کی خاطر تھوڑا جیتا تھا۔ میں نقاشی تو اس لیے کرتا تھا کہ ضروریات زندگی مہیا کروں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے مطالعہ جاری رکھا مجھے کامل یقین تھا کہ میں اپنے سامنے جو نصب العین رکھا ہے انجام کار میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا روزمرہ کی زندگی میں کئی چھوٹی موٹی سختیاں پیش آتی تھیں میں ان سے گھبراتا نہ تھا میرا یہی یقین مجھے ان کے برداشت کرنے کا حوصلہ دیتا تھا۔

علاوہ بریں یہاں آتے ہی میں جیسے اس شہر کو پیار کرنے لگا ویسا لگاؤ مجھے کسی اور جگہ سے نہ تھا میں دل میں کہتا تھا ''یہ ایک جرمن شہر ہے! یہ وائنا سے کیسا مختلف ہے!!!'' جب میں اس مختلف نسلوں کے منارہ بابل کا تصور کرتا تو میرے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی تھی ایک اور خوشی کی بات یہ تھی کہ یہاں کے لوگ جرمن بولتے تھے یہ زبان وائنا کے روزمرہ کی نسبت خود میرے طرز گفتگو کے بہت زیادہ قریب تھی میونخ کے روزمرہ

سے میرے دل میں ایام شباب کی یاد تازہ ہو جاتی تھی خاص طور پر جب میں ان لوگوں سے گفتگو کرتا جو بویریا کے نچلے حصے سے یہاں آئے ہوئے تھے تب تو وہ یاد اور بھی شگفتہ ہو جاتی تھی ۔ ہزاروں چیزیں ایسی تھیں جنہیں میں دل سے چاہتا تھا، یا یہاں قیام کے دوران میں انہیں چاہنے لگا تھا تاہم جس بات نے میری توجہ کو سب سے زیادہ اپنی جانب منعطف کیا وہ وجہ یہ تھی کہ دیہاتیوں کی قومی تومندی اور شہر کا حسن مذاق دونوں مل جل گئے تھے یہ حقیقت مقامی عمارات سے بھی مترشح تھی ۔ میرا دل اس شہر سے ایسا وابستہ ہو چکا تھا کہ مجھے دنیا کی کسی اور جگہ سے یہ لگاؤ نہیں غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ میونچ آج تک میری شخصی ترقی کے ساتھ متعلق رہا ہے اور شاید آئندہ بھی متعلق رہے ۔ جوں ہی میں یہاں داخل ہوا اور دیوان خاص کو دیکھا بس میرا سینہ مسرت واطمینان سے اٹد آیا اگر کوئی شخص بھی بنیا پن کی خصلتوں سے مبرا ہے اور احساس حسن رکھتا ہے تو وہ یقیناً دیوان خاص کی عظیم الشان عمارت میں ایک کشش محسوس کرے گا ۔

ذاتی رشتوں کی طرح بین الاقوامی تعلقات میں بھی احتیاط برتنی چاہیے

اپنے پیشہ کے کاروبار کے علاوہ مجھے سیاسی واقعات کی رفتار کے مطالعہ سے بے انتہا دلچسپی تھی بالخصوص جن سیاسی واقعات کا تعلق خارجی حکمت عملی سے ہو ان میں تو مجھے اور بھی زیادہ شغف تھا میں خارجی حکمت عملی کا مطالعہ کرتے ہوئے جرمنی کی دوسری اقوام سے اتحاد کی پالیسی کو زیر نظر رکھتا تھا ۔ ابھی میں آسٹریا میں ہی تھا کہ مجھے یہ پالیسی سرتاپا غلط معلوم ہونے لگی تھی پھر بھی وائنا میں مجھے صاف صاف اندازہ نہ تھا کہ جرمن سلطنت اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کس قدر دور نکل چکی ہے وائنا میں میرا خیال تھا کہ برلن کے ارباب اختیار جس قوم سے اتحاد کیے بیٹھے ہیں اس کی کمزوریوں سے بھی واقف ہوں گے غالباً انہیں احساس ہو گا کہ وقت پڑنے پر یہ ساتھی کتنا ناقابل اعتبار ثابت ہونے والا ہے شاید میرے ان خیالات کی وجہ یہ ہو کہ میں جرمنی کی غلطی کے ارتکاب کے لیے کوئی

عذر ڈھونڈنا چاہتا تھا میں سمجھتا تھا کہ جرمنی کے افسران سب حقائق سے خبردار ہیں لیکن کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر عامۃ الناس میں ان کا ذکر نہیں کرتے ممکن ہے وہ اس خیال میں ہوں کہ بسمارک نے جو سلسلہ اتحاد قائم کیا تھا اسے برقرار رکھنا چاہیے اس سلسلہ کے توڑنے سے جو بیرونی ممالک تاک لگائے بیٹھے ہیں انہیں موقعہ مل جائے گا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں پھر یہی وجہ کیا کم ہے کہ خود ہمارے اندر جو بغلی گھونسے موجود ہیں وہ اس طرح خوفزدہ رہیں گے۔

جب مجھے جرمنی کے باشندوں سے میل ملاپ کا موقعہ ملا تو میں یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ میرے تمام مفروضے غلط تھے میں کیا بتاؤں مجھے یہ دیکھ کر کتنا تعجب ہوا کہ واقف کار حلقوں میں بھی کسی کو ہیبز برگ شہنشاہیت کی اصلی حالت کا علم نہ تھا۔ بالخصوص عامۃ الناس میں تو یہ وہم پھیلا ہوا تھا کہ آسٹریا جس سے ہمارا اتحاد ہے وہ بھی کوئی ایسی طاقت ہے جو ضرورت کے وقت کسی حساب کتاب میں شمار ہوگی اور اپنے عساکر میدان میں لے آئے گی عام خلقت کی کثرت ابھی تک آسٹریا کو ایک جرمن ریاست تصور کرتی تھی انہیں خیال تھا کہ اس سلطنت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ اس وہم میں تھے کہ جرمنی کی طرح آسٹریا کی طاقت کا اندازہ بھی اس کی کروڑوں رعایا سے لگایا جا سکتا ہے اول تو انہیں یہ احساس نہ تھا کہ آسٹریا اب ایک جرمن ریاست نہیں دوسرے وہ یہ نہ جانتے تھے کہ آسٹریا کی اندرونی حالت اسے بسرعت تمام تباہی کی طرف دھکیلے لیے جا رہی ہے۔

سیاسی مدبروں کے فیصلے ہمیشہ مدبرانہ نہیں ہوتے

اس وقت مجھے پیشہ ور مدبروں کی نسبت آسٹرین سلطنت کے حالات کا بہتر علم تھا یہ مدبر ہمیشہ اندھے ہوتے ہیں اب بھی وہ اندھا دھند بربادی کے راستے پر گامزن تھے عام لوگوں کی رائے محض سرکاری دعوؤں کی صدائے بازگشت تھی سرکاری حلقے اپنے ''اتحادی'' کی گوسالہ سامری کی طرح پرستش کرتے تھے وہ اس کے سامنے سربسجود تھے شاید انہیں خیال تھا کہ وہ اپنی خوش اخلاقی اور شائستگی سے فریق ثانی کی بددیانتی بے اثر

کر دیں گے، یہی وجہ تھی کہ آسٹریا کی جانب سے انہیں جو کچھ کہا جاتا تھا وہ اسے تسلیم کر لیتے تھے۔

میں ابھی وائنا ہی تھا کہ سرکاری تقریروں اور وائنا کے اخبارات کے متضاد بیانات دیکھ کر مجھے آگ لگ جاتی تھی۔ باوجود اس کے جہاں تک ظاہری حالت کا تعلق تھا وائنا ابھی ایک جرمن شہر ہی سمجھا جاتا تھا اگر کہیں وائنا یا بالفاظ دیگر جرمن آسٹریا سے نکل کر سقلاب صوبوں میں جائیں تو وہاں اور کیفیت نظر آتی ہے پریگ کے اخبارات پر ایک ہی نظر ڈالی جائے تو اتحاد ثلاثہ کا سارا پول کھل جاتا تھا پریگ میں اس سیاست کے شاہکار کے لیے سوائے پھبتیوں اور طعنوں کے اور کچھ نہ تھا ابھی صلح کی رنگ رلیاں ہی منائی جا رہی تھیں، اور دونوں شہنشاہ ایک دوسرے کی پیشانیوں پر بوسے دے رہے تھے، کہ ان اخبارات نے صاف صاف اس اتحاد کی مخالفت شروع کر دی وہ کہتے تھے کہ جوں ہی زبانی جمع خرچ کا وقت گزرا اور عملی اشتراک کا موقع آیا وہیں یہ شیخ چلی کے خواب ختم ہو جائیں گے۔

چند سال بعد جب اس اتحاد کا پہلا امتحان ہوا تو جرمنی میں سخت غیض وغضب کا اظہار کیا گیا اٹلی نہ صرف اتحاد ثلاثہ سے نکل گیا بلکہ اس نے دشمنوں کے ساتھ سازباز کر لی باقی کے دونوں ساتھی ٹڑوں ٹوں رہ گئے۔ جب تک کسی شخص کی آنکھوں پر سرکاری مدبروں جیسا پردہ نہ پڑا ہو وہ کیسے اعتبار کر سکتا تھا کہ جدھر آسٹریا ہو اٹلی بھی اس طرف کا ساتھ دے گا آسٹریا میں اس حقیقت کا خوب احساس تھا۔

بین الاقوامی اتحاد حکومتوں کے مابین نہیں بلکہ قوموں کے درمیان ہوتے ہیں

آسٹریا کی سلطنت میں محض ہیپز برگ خاندان اور آسٹرین جرمن اس اتحاد کے حامی تھے ہیپز برگ خاندان کا یہ رویہ تو اس کے اپنے مفاد اور ضروریات کا نتیجہ تھا باقی رہے جرمن وہ بیچارے سیاسی جہالت اور نیک نیتی کا شکار تھے انہیں خیال تھا کہ اتحاد ثلاثہ کے

ذریعہ وہ جرمنی کی بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور اس کے استحکام اور مضبوطی میں مدد دے رہے ہیں اس طرح جرمنی کی قوت مدافعت میں اضافہ ہو جائے گا انہیں کیا علم تھا کہ وہ جرمن سلطنت کی امداد کرنے کے بجائے اسے ایک ایسی مرگ رسیدہ حکومت کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں جو اپنے ہمراہ اپنے ساتھی کو بھی اپنی قبر میں لے ڈوبے گی سب سے بڑھ کر یہ وہ اس اتحاد کی حمایت میں خود ہیبز برگ خاندان کی جرمنوں سے مخالفت کی پالیسی کا شکار ہو گئے وہ یوں کہ اس اتحاد کے باعث ہیبز برگ خاندان کو یقین ہو چکا تھا کہ جرمن سلطنت ان کے خانگی معاملات میں دخل نہ دے گی غرض اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ آرام سے اور بغیر کسی خطرہ کے جرمن عنصر کو ختم کر دینے کی خانگی حکمت عملی انجام دے سکتا تھا ایک تو جرمن حکومت کے ''واقعاتی'' زاویہ نظر کا یہی تقاضا تھا کہ اس قسم کے معاملات کے متعلق کبھی کوئی شکایت نہ کی جائے پھر اگر وہ کبھی آسٹریا میں سقلاب اقتدار قائم کرنے کی مذموم پالیسی کے خلاف احتجاج کرے بھی تو اسے ہمیشہ یہ اتحاد یاد دلا کر خاموش کیا جا سکتا تھا۔

جب جرمن سلطنت خود ہیبز برگ ریاست پر اعتماد کر رہی تھی تو آسٹریا میں رہنے والے جرمن کیا کرتے؟ اور وہ مقابلہ کرتے تو انہیں جرمن سلطنت کے سامنے غدار ثابت کیا جاتا ان کے بھائی بندوں کے سامنے ان کی توہین ہوتی حالانکہ وہ اپنی جرمن روایات برقرار رکھنے کی خاطر اپنے فرقوں سے قربانیاں کر رہے تھے۔

آسٹریا میں رہنے والے جرمنوں کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد یہ اتحاد کس کام آ سکتا تھا اگر اتحاد ثلاثہ سے جرمنی کو کوئی فائدہ پہنچتا تھا تو اس کے لیے پہلی شرط یہ تھی کہ آسٹریا میں جرمن اقتدار برقرار رکھا جاتا۔

آسٹریا میں بسنے والی مختلف قوموں کے اندرونی مسائل کے متعلق جرمنی کے مدبرین اور عوام کا رویہ نہ صرف احمقانہ تھا بلکہ دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ اتحاد کسی ٹھوس بنیاد پر قائم ہے اسی اتحاد پر انہوں نے قوم کے ساتھ کروڑ افراد کی

سلامتی، ان کے مستقبل، اور زندگی کی بازی لگا رکھی تھی ساتھ ہی ساتھ اسی اتحاد کی بدولت وہ اپنے حلیف کو اجازت دے رہے تھے کہ وہ نہایت باقاعدگی اور پورے عزم سے سال بسال اس اتحاد کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا رہے ایک دن ایسا بھی آنا تھا جب وائنا کے مدبرین کے ساتھ ایک رسمی معاہدہ کے سوا اس اتحاد میں کوئی جان باقی نہ رہنی تھی جہاں تک کسی ٹھوس حمایت کا تعلق ہے اس اتحاد نے جرمنی کے حق میں بے سود ثابت ہونا تھا۔

نا قابل اعتماد دوستوں سے تنہائی بہتر ہے

جہاں تک اٹلی کا تعلق تھا وہاں تو شروع سے یہی کیفیت تھی۔

جرمنی کے باشندوں نے قوموں کی تاریخ اور نفسیات کا غور سے مطالعہ نہ کیا تھا ورنہ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یقین نہ کرتے کہ اٹلی اور آسٹریا کی حمایت میں ایک سپاہی بھیجنے کی بھی جرأت کرتی تو ملک میں انقلاب ہو جاتا۔ ان دونوں سلطنتوں کے مابین ایسی نفرت تھی کہ اٹلی معرکہ کارزار میں آسٹریا کا دشمن بننے کے سوا اور کوئی پوزیشن اختیار کر ہی نہ سکتا تھا میں وائنا میں بارہا اس گہری حقارت کے مظاہرے دیکھ چکا تھا جس سے آسٹریا اور اٹلی ''متھ'' تھے خاندان ہیپز برگ صدیوں سے اٹلی کی آزادی کے خلاف ایسے جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا کہ چاہے کیسی ہی صفائی قلب برتی جاتی وہ جرائم کبھی معاف نہ کیے جا سکتے تھے طرہ یہ ہے کہ حکومت سے لے کر عامۃ الناس تک کسی میں یہ صفائی قلب بھی موجود نہ تھی اٹلی آسٹریا سے دو طرح کا تعلق رکھ سکتا تھا یا جنگ اور یا اتحاد موخر الذکر صورت میں اول الذکر منصوبہ کے لیے مزے سے تیاری کی جا سکتی تھی۔

بالخصوص جب آسٹریا اور روس کے باہمی تعلقات کی یہ حالت تھی کہ دونوں سلطنتوں کے لیے جنگ کے سوا کسی اور طریقہ سے باہمی تنازعوں کا فیصلہ کرنا روز بروز زیادہ ناممکن ہوتا جا رہا تھا تو ایسے وقت میں آسٹریا سے اتحاد کرنا جتنا خطرناک تھا اتنا ہی لایعنی بھی تھا جرمنی کی یہ حرکت ثابت کرتی ہے کہ اس کی پالیسی منطق اور دور اندیشی دونوں سے

جاری تھی۔

آخر یہ اتحاد قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ وہ مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا یعنی اکیلا رہنے سے جرمنی جیسے ترقی کر سکتا ہے اس کی نسبت کسی بہتر مستقبل کا انتظام کیا جا سکے جرمنی کا مستقبل تبھی بہتر ہو سکتا تھا جب جرمن قوم کی ضروریات زندگی مہیا کی جاتیں۔

ضبط تولید خلاف وضع فطرت ہے

سوال صرف یہ تھا کہ جہاں تک ہماری نظر کام کرتی ہے قوم کی زندگی مستقبل قریب میں کیا شکل اختیار کرے گی؟ یورپ کی اقوام میں اس وقت جو باہمی توازن قائم ہے اس کے اندر جرمنی کی ترقی اور سلامتی کا قصر تعمیر کرنے کے لیے کیا اقدام مفید ثابت ہوگا؟ جرمنی کی خارجہ حکمت عملی جن اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے تھی اگر ان کا صاف صاف تجزیہ کیا جاتا تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے:

ہر سال جرمنی کی آبادی میں نو لاکھ نفوس کا اضافہ ہوتا ہے اس نئے شہریوں کی فوج کی ضروریات پورا کرنا ہر سال پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے اس کا انجام سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ زبوں حالی اور فاقہ کشی کے خطرہ کا ابھی سے علاج ہونا چاہیے اس ہولناک آفت سے بچنے کے چار طریقے ہو سکتے تھے۔

1 فرانسیسیوں کی تقلید کرتے ہوئے ہم بھی مصنوعی طور پر نئے بچوں کی پیدائش پر قابو رکھ سکتے ہیں یوں آبادی میں اضافہ نہ ہوگا۔

جب کسی قوم پر آفت آ جائے، آب و ہوا، نا مساعد ہو، زمین زرخیز نہ ہو، تو خاص حالات میں قدرت خود بعض نسلوں اور بعض ملکوں کی آبادی بڑھنے نہیں دیتی۔ ایسے موقعوں پر فطرت جیسی دانشمندی کا ثبوت دیتی ہے ویسے ہی وہ بے رحم بھی ہوتی ہے وہ تو الدو تناسل کی قوت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی برعکس اس کے وہ نوزائیدہ مخلوق کو ایسے کڑے امتحان اور مصیبتوں سے دوچار کرتی ہے کہ جو کوئی طاقت یا صحت کے ترازوں میں پورا نہ اترے وہ فی الفور عدم آباد روانہ کر دیا جاتا ہے جو کوئی زندگی کے ان

ہزاروں امتحانوں اور مصیبتوں کو جھیل کر باقی بچے وہ پھر توالدوتناسل کا مجاز ٹھہرتا ہے غرض انتخاب کا عمل ازسرنوشروع ہو جاتا ہے افراد کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کرتے ہوئے فطرت جوں ہی کسی کو زندگی کی آزمائشوں کے ناقابل پاتی ہے وہیں اسے واپس بلا لیتی ہے اس طرح نسل کی طاقت اور نوع انسانی کی ترقی ہر بار نئی منزلیں طے کرتی جاتی ہے یوں ہی رفتہ رفتہ ارتقاء کا سلسلہ اپنی حدکمال تک پہنچ جاتا ہے۔

غرض ایک طرف اگر افراد کی تعداد گھٹی ہے تو ساتھ ہی ان کی طاقت میں اضافہ بھی ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بحیثیت مجموعی نسل کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

برعکس اس کے جب انسان خود اپنی تعداد گھٹانے کے درپے ہوتو انجام بالکل الٹ ہوتا ہے انسان کو قدرت کا مرتبہ حاصل نہیں وہ آخر پھر انسان ہی تو ہے وہ سلطان عقل سے بھی بڑھ کر قدم رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے سے توالدوتناسل ہی کو روکتا ہے افراد اپنی تنگ نظری کے باعث اس طرز عمل کو زیادہ قرین انسانیت سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے قدرت توالدوتناسل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی وہ افراد کو زندگی کے کڑے سے کڑے امتحانوں کے ذریعے آزماتی ہے اس کثرت میں سے بہترین عناصر کو چن کر انہیں آئندہ زندہ رہنے اور نسل قائم رکھنے کا تمغہ عطا کرتی ہے انسان توالدوتناسل کو روکتا ہے چاہے کچھ ہو جائے جو بچہ پیدا ہو چکا ہے وہ اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح رضائے الٰہی کی اصلاح کر کے میں کوئی بڑا عقلمندی اور رحم دلی کا کام سرانجام دے رہا ہوں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ آخر میں نے ایک صیغہ میں تو فطرت پر اپنی برتری کا سکہ جما دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ ہمیشہ فطرت ہی پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں خدائے ذوالجلال کی یہ بوزنہ مخلوق یہ تصور کر کے مسرور ہوتی ہے کہ ہم نے آبادی کی تعداد میں کمی کر لی اگر اسے بتایا جائے کہ اس طرح شخصی انحطاط کی ابتدا کر رہے ہو تو یقیناً اسے یہ سن کر خوشی نہ ہوگی جوں ہی توالدوتناسل کے راستے میں روڑے اٹکا کر مصنوعی طور پر پیدائشوں کی تعداد کم کی جاتی ہے اسی وقت زندگی کی

جد و جہد جو صرف تندرست اور مضبوط افراد کو زندہ رکھتی ہے ختم ہو جاتی ہے اب اس کی جگہ یہ خبط پیدا ہو جاتا ہے کہ ''بیچاری کمزور اور بیمار مخلوق'' کو بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا جائے اس طرح اولاد آدم کو یہ ایسے راستہ پر ڈال دیا جاتا ہے جہاں ہر آئندہ نسل پہلی نسل سے زیادہ بدبختی کا شکار ہوتی جائے گی فطرت کی رضا کو نظر حقارت سے دیکھنے کی یہی سزا ہے۔

اگر اسی پالیسی کو جاری رکھا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی نکل سکتا ہے کہ ایسا کرنے والی قوم آخر کار اس دنیا سے اپنا وجود ختم کر دے یہ درست ہے کہ انسان کچھ عرصہ کے لیے فطرت کے ازلی و ابدی قوانین کی خلاف ورزی کر سکتا ہے لیکن جلد یا بدیر اسے اپنے کیے کی سزا بھی مل جاتی ہے کوئی طاقتور نسل اس کمزور نسل کو نکال کر باہر کر دے گی۔ قدرت کی پوشیدہ طاقتیں افراد کا لحاظ کرنے والے نام نہاد انسانی احساسات کا تیا پانچا کر کے از سر نو فطرت کے قوانین بحال کر دیں گی ان قوانین کا تقاضا ہے کہ کمزور کو مٹا کر اس کی جگہ طاقتور کو دے دی جائے۔

جو حکمت عملی قوم کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے پیدائش کی رفتار روک کر آبادی کم کرنا چاہتی ہے وہ قوم کا مستقبل تباہ کر رہی ہے۔

قوم کی عظمت ملک کی ارضی وسعت پر انحصار رکھتی ہے

2 ایک اور حل یہ ہے کہ خود ملک کے اندر ہی نئی بستیاں آباد کی جائیں یہ تجویز ہمارے زمانہ میں بار بار پیش کی جاتی ہے اور اسے بہت کچھ سراہا بھی جاتا ہے اس تجویز کو پیش کرنے والوں کی نیتیں نیک ہیں لیکن اکثر لوگ اس کے معنی غلط سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ناقابل تصور آفتیں رونما ہوتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ کسی حد تک زمین کی زرخیزی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اضافہ محدود ہے اور لامحدود نہیں بنایا جا سکتا زمین کو زرخیز بنا کر کچھ عرصہ تک جرمنی کی زائد پیدائش کے ساتھ توازن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں فاقہ کشی کی نوبت نہ آئے

گی پھر بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی کا معیار پیدائش کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بلند ہو رہا ہے سال بسال ہمارے کھانے کپڑے کی ضروریات زیادہ ہوتی جا رہی ہیں سو سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد کی ضروریات اس کے مقابلہ میں عشیر عشیر بھی نہ تھیں لہذا یہ تصور کرنا غلط ہو گا کہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرنے سے آبادی کے اضافہ کرنے سے آبادی کے اضافہ کی ضروریات بھی پوری کی جاسکیں گی نہیں یہ علاج بس ایک حد تک ہی کارگر ہے زمین سے جتنی زیادہ پیداوار ہو گی کم از کم اس کا ایک حصہ تو معیار زندگی بلند ہو جانے سے پیدا ہونے والی ضروریات میں صرف ہو جائے گا مزید برآں اگر بالفرض ضروریات کم سے کم کر دی جائیں اور ساری طاقت زراعت پر ہی مرکوز کر دی جائے پھر بھی کبھی نہ کبھی تو ہم اس حد تک پہنچ کر رکنے پر مجبور ہو جائیں گے جس سے آگے زمین کی زرخیزی نہیں بڑھائی جاسکتی ہم کتنی ہی محنت سے کام کریں زمین کی پیداوار اس حد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکے گی غرض ایسے حیلوں سے ہم زبوں حالی کے روز بد کو چند دنوں تک ملتوی بھی کر دیں تو پھر آخر ایک دن تو ہمیں اس کا سامنا کرنا ہی پڑے گا اس کی ابتداء تو یوں ہو گی کہ وقتاً فوقتاً جب کبھی فصل نہ ہو گی قحط پڑنے لگیں گے ۔ جوں جوں آبادی بڑھتی جائے گی ان قحطوں کے درمیان کا وقفہ کم ہوتا جائے گا آخر کار کبھی کبھار فصل اچھی ہو گئی تو قحط سالی سے نجات ملے گی ورنہ ہمیشہ قحط ہی رہے گا ایک دن ایسا بھی آجائے گا جب اچھی فصل ہونے پر بھی قحط سے نجات نہ ملے گی قوم فاقوں مرنے لگے گی یہ ایک ایسا موقعہ ہو گا کہ یا تو فطرت فیصلہ کرلے گی کہ جینے کا حقدار کون ہے ورنہ انسانی خود مصنوعی طور پر اپنی تعداد بڑھنے سے روکے گا اس سے نسل اور جنس کو جن ہولناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا وہ اوپر بیان کیے جا چکے ہیں ۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ روز ایک نہ ایک دن تمام نوع بنی آدم کو پیش آنا ہے پھر اس سے کوئی اکیلی قوم کیونکر بچ سکتی ہے؟

زمین کا مالک وہ ہے جو طاقت سے اس پر قبضہ کرلے

بظاہر اعتراض معقول نظر آتا ہے لیکن ہمیں حسب ذیل حقائق بھی نگاہ میں رکھنے چاہئیں۔

بیشک ایک دن ایسا آئے گا جب آبادی کی **مسلسل** افزائش کے مقابلہ میں زمین کی پیداوار بڑھانے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی بنی آدم کو اس روز اپنی افزائش نسل روکنے کی ضرورت لاحق ہوگی اس وقت یا تو فطرت اپنے قوانین عمل میں لائے گی اور یا ممکن ہے کہ انسانی خود اس انتظام کو سنبھالے شاید مطلوبہ توازن قائم رکھنے کے لیے ہماری نسبت فطرت کے وسائل بہتر ثابت ہوں لیکن یہ مسئلہ تمام بنی نوع آدم کو درپیش ہوگا برعکس اس کے اب صرف وہی قومیں اس دقت میں پھنسی ہوئی ہیں جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مطلوبہ اراضی حاصل کرنے کی طاقت یا جرأت سے عاری ہیں آجکل کی صورت حالات میں کرہ ارض کے وسیع قطعے ایسے ہیں جن پر زراعت نہیں ہوتی ان قطعوں کو بس ہل چلنے کا انتظار ہے یہ یقینی امر ہے کہ فطرت نے یہ علاقے کسی ایک قوم کے لیے وقف نہیں کر رکھے کہ چاہے وہ اب انہیں استعمال نہ بھی کر رہی ہو پھر بھی انہیں آنے والی ضروریات کے پیش نظر محفوظ رکھ چھوڑے۔ یہ علاقے ان قوموں کی انتظار کر رہے ہیں جن میں ان پر تسلط حاصل کرنے کی طاقت اور زراعت کرنے کی ہمت موجود ہو۔

فطرت کسی سیاسی حد بندی کی قائل نہیں اس نے تو دنیا پر زندگی کے بیج بو دیئے ہیں اور اب مزے سے بیٹھ کر مختلف طاقتوں کی باہمی کشمکش کی سیر دیکھ رہی ہے جو کوئی زیادہ سے زیادہ دلیری اور محنت کا اظہار کرے وہی اس کا فرزند دلبند ہے اور اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہوگا۔

جو قوم فاتح نہیں بنے گی، اسے ایک دن مفتوح بننا پڑے گا

اگر کوئی قوم داخلی بستیاں آباد کرنے میں لگی رہے گی اور دوسری قومیں نئے نئے علاقے ملحق کر کے تمام کرہ ارض پر اپنے مقبوضات میں **مسلسل** اضافہ کر رہی ہیں تو ایک دن ایسا بھی آئے گا جب دوسری قومیں تو اپنی آبادی میں اضافہ کر رہی ہوں گی اور اس

کو اپنی آبادی گھٹانی پڑے گی یہ دن آخر ضرور آئے گا اگر کسی قوم کا علاقہ رقبہ میں کم ہے تو اس کے لیے یہ دن جلد ہی آ جائے گا بدقسمتی سے دنیا کی بہترین قوام یا بالفاظ دیگر مہذب ترین اقوام اپنی اندھا دھند صلح پسند کے باعث داخلی بستیاں آباد کرنے میں لگی رہیں اور نئے علاقوں پر قبضہ کرنے سے احتراز کرتی رہیں حالانکہ بنی آدم کی ترقی انہیں اقوام سے وابستہ ہے برعکس اس کے ادنیٰ درجہ کی اقوام نے تمام کرہ ارض پر بستیاں آباد کرنے کے لیے وسیع علاقوں پر تسلط حاصل کرلیا اس مقابلہ سے حسب ذیل نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

جو اقوام معیار تہذیب کے لحاظ سے برتر رتبہ کی مالک ہیں لیکن دست درازی سے جھجکتی ہیں وہ اپنی آبادی کی ضروریات کے مقابلہ میں علاقہ کی قلت کے باعث اپنی افزائش محدود کرنے پر مجبور ہو جائیں گی برخلاف اس کے جو اقوام تہذیب کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ پر ہیں لیکن وسیع علاقوں کی مالک ہیں وہ اپنی آبادی میں بیشمار اضافہ کرتی جائیں گی بالفاظ دیگر اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو ایک دن دنیا بنی آدم کے اس حصہ سے بھر جائے گی جو تہذیب و تمدن میں کم رتبہ ہونے کے باوجود طاقت و ہمت میں برتر ہوگا۔

بزدلوں کی دردمندی سے دلیر مردوں کی بیدردی بہتر ہے

چاہے یہ حالت کتنا ہی عرصہ گزرنے کے بعد درپیش آئے لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب دو ہی صورتیں باقی رہ جائیں گی یا تو دنیا پر ہمارے جمہوریت کے موجودہ تصور کے مطابق حکومت ہوگی اور ہر فیصلہ کثرت تعداد کی مالک نسلوں کے حق میں ہوگا یا تمام عالم پر فطرت کی تقسیم اقتدار کا راج ہوگا۔اور وہ قومیں غالب ہوں گی جو ایثار نفس کی قائل نہیں اور ایک سنگدل ارادہ کی مالک ہیں۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ بنی آدم کو اس دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے نہ ایک دن ایک خوفناک کشمکش میں مبتلا ہونا پڑے گا انجام کار صرف خود حفاظتی کا احساس غالب آئے گا۔جس وقت حفظ نفس کے شعلے بلند ہوئے یہ نام نہاد دردمندی ویسے ہی پگھل جائے گی جیسے موسم بہار کی دھوپ سے برف پگھل جاتی ہے سچ پوچھو تو یہ دردمندی اور

انسانیت ہے بھی کیا محض فریب نفس اور احمقانہ و نامردانہ بزدلی کا ایک مجموعہ انسان کی موجودہ عظمت مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے اگر ہمیشہ کے لیے امن قائم ہو گیا تو انسان کا انحطاط لازمی ہے۔

مطالبات منوانے چاہئیں کم نہیں کرنے چاہئیں

ملک کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے کا چرچا ہم جرمنوں کے لیے مہلک ہے اس سے یہ عقیدہ اور پختہ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک ایسا علاج دریافت کر لیا ہو جو ہماری طبع صلح پسند کے عین مطابق ہے یوں ہم ایک نیم مردہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اگر اس تعلیم کا ہماری قوم پر کچھ اثر ہو گیا تو ہم دنیا میں جس مرتبہ کے مستحق ہیں اسے حاصل کرنے کی تمام کوششیں ختم ہو جائیں گی جونہی ایک اوسط جرمن قائل ہو گیا کہ اس ترکیب سے اس کے روزگار اور مستقبل کا انتظام ہو سکتا ہے وہیں اس ملک کے اہم ترین مطالبات پورا کرنے کی تمام کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ جب قوم اس روش پر قانع ہو جائے تو کسی درحقیقت مفید خارجی حکمت عملی کی کہاں گنجائش رہے گی۔ جرمن قوم کا مستقبل بھی ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے گا۔

جوں ہی ہم اس داخلی بستیاں آباد کرنے کے نظریہ کے نتائج سے واقف ہو جاتے ہیں ہم ایک دوسری حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ ہماری قوم میں مسموم ذہنیت پھیلانے والے زیادہ تر یہودی ہیں وہ اپنے شکار سے خوب واقف ہے وہ جانتا ہے کہ انہیں ریب کاری سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے یہ سادہ لوح مخلوق ہر اس مشورہ کو ایک سنہری ایجاد سمجھ کر ممنوعیت سے قبول کر لے گی جس سے انہیں فطرت کو داؤ دے کر زیر کر لینے کی امید دلائی جائے وہ زندگی کی سخت اور بے رحم کشمکش سے بچنا چاہتے ہیں انہیں توقع ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر آرام سے بیٹھے بیٹھے انجام کار دنیا کے مالک بن جائیں گے وہ سوچتے ہیں کہ جب کبھی موقع ملا تو ہم بھی اپنے کارنامے دکھائیں گے۔

اس بات پر جتنا زور دیا جائے کم ہے کہ ملک کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے سے صرف معاشرتی تکالیف کا علاج کیا جا سکتا ہے نئی بستیاں آباد کرنے کے لیے سب سے ضروری اور پہلی شرط یہ ہے کہ اراضی کو سٹہ بازوں کے ہاتھ سے نجات دلا کر آزاد کیا جائے اس طرح قوم کے مستقبل کا انتظام ہرگز نہیں کیا جا سکتا قوم کے مستقبل کے لیے تو نیا علاقہ حاصل کرنا لازمی ہے۔

اگر ہم کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں تو جلد ہی ہم اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں سے آگے زمین کی زرخیزی کام نہیں دے سکتی ساتھ ہی ساتھ ایک حد تک پہنچ کر آگے ہماری آبادی بڑھنے کی بھی گنجائش نہ رہے گی۔

آخر میں حسب ذیل نتیجہ کے سوا اور کوئی چارہ نہیں

قومی علاقہ محدود ہے اس علاقہ کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے کی گنجائش مزید محدود ہے ان حالات میں توالدو تناسل میں رکاوٹ ہونا لازمی امر ہے جہاں یہ دونوں باتیں مل جائیں وہاں کسی قوم کی سیاسی اور عسکری حیثیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

ملک کی وسعت، سلطنت کے دفاع میں کارآمد ہے

قومی علاقہ کی وسعت قومی کی خارجی حفاظت میں بہت کچھ دخل رکھتی ہے کسی قوم کے پاس جتنا وسیع علاقہ ہوا اتنا ہی اس کے مدافعت کے انتظامات بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں وسیع علاقوں کی مالک حکومتوں کے مقابلہ میں جس قوم کا علاقہ محدود ہو اس کے خلاف عسکری نتائج زیادہ جلدی، زیادہ آسانی، زیادہ ہمہ گیری اور زیادہ فیصلہ کن انداز سے پیدا کیے جا سکتے ہیں علاوہ بریں قومی علاقہ کی وسعت خود کسی حد تک اس امر کی ضمانت ہے کہ کوئی بیرونی طاقت بغیر سوچے سمجھے حملہ کی جرأت نہ کرے گی وجہ یہ کہ اس صورت میں لڑائی طویل ہو گی اور فیصلہ کن فتح حاصل کرنے سے پہلے ایڑی چوٹی کا زور خرچ ہو جائے گا۔ جب اتنی بڑی مہم کا بیڑا اٹھانا ہو تو ایسے جارحانہ اقدام کے لیے غیر معمولی اسباب درکار ہوں گے یہی وجہ ہے کہ کسی حکومت کے علاقہ کی وسعت قومی

حریت و آزادی کی حفاظت کو مقابلۃً آسان بنا دیتی ہے برعکس اس کے سلطنت کا رقبہ قلیل دیکھ خواہ مخواہ حملہ آور کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

سچ کے بیان کرنے کو بھی سلیقہ چاہیے

حقیقت یہ ہے کہ جرمنی کے نام نہاد محب قوم طبقے آبادی کی افزائش اور قومی علاقہ کی قلت کے تناسب کو متوازن رکھنے کی پہلی دونوں صورتوں کے مخالف تھے لیکن اس مخالفت کے حق میں جو دلائل دیئے جاتے تھے وہ میرے مذکورہ بالا استدلال سے مختلف تھے پیدائش کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کرنا بعض اخلاقی جذبات کی بناء پر ناموزوں خیال کیا جاتا تھا ملک کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے کی تجاویز نہایت غصہ سے رد کی جاتی تھیں کیونکہ شک کیا جاتا تھا کہ اس طرح بڑے بڑے زمینداروں پر زد پڑے گی یہ حملہ کہیں ذاتی جائیداد کی سراسر مخالفت کا پیش خیمہ نہ ہو ملک کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے کی تجویز جس رنگ میں پیش کی جاتی تھی اس کے مدنظر بڑے بڑے زمینداروں کے شکوک حق بجانب بھی تھے۔

بہرصورت ملک میں نئی بستیاں آباد کرنے کی تجویز جس طرح رد کی گئی اس سے کوئی ذہانت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس طرح عامۃ الناس پر جو اثر ہوا اس کا خیال ہی نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں جو عذر گھڑا گیا وہ بات کی تہ کو نہیں پہنچتا۔

اب صرف دو ہی طریقے باقی رہ گئے تھے جن سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک اور روزگار مہیا کیا جا سکتا تھا۔

3 ایک صورت تو یہ تھی کہ نیا علاقہ حاصل کرنے کی فکر کی جائے جہاں ہر سال بڑھتی ہوئی آبادی کا ایک حصہ رہائش کی خاطر بھیج دیا جایا کرے

4 ایک اور صورت یہ تھی کہ ملک کی صنعت اور تجارت کو اس طرح منظم کیا جائے کہ برآمد کی مقدار بڑھ جائے یوں بیرونی منڈیوں میں جو نفع حاصل ہو اس سے قوم کی پرورش کے لیے سامان خرید اجائے۔

غرض مسئلہ یہ تھا کہ ملک کے علاقہ کو وسعت دی جائے یا غیر ملکی نو آبادیاں حاصل کرنے اور تجارت کے فروغ پر توجہ دی جائے دونوں امکانات پر غور کی گئی ان کا تجزیہ کیا گیا اور مختلف دلائل پیش کر کے ان کے حسن و قبح پر نظر دوڑائی گئی۔ انجام کار آخری تجویز کو اختیار کیا گیا حالانکہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ علاقہ حاصل کرنے کی تجویز سب سے زیادہ معقول تھی۔

کاشتکار قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہے

زائد آبادی کے لیے نیا علاقہ حاصل کرنے کی تجویز میں کئی فائدے ہیں بالخصوص اگر ہم حال اور مستقبل دونوں کو نگاہ میں رکھیں تو یہ فوائد اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اول تو اس حکمت عملی پر جتنا زور دیا جائے کم ہے جس سے قوم کی بنیادیں کاشتکاروں کے تنومند طبقہ پر رکھی جاسکیں ہماری موجودہ طرز معاشرت کی کئی خرابیاں محض دیہاتی اور شہری آبادی میں تناسب قائم نہ رہنے کا نتیجہ ہیں آجکل جو معاشرتی امراض پھیل رہے ہیں ان سے کسی قوم کو محفوظ رکھنے کے لیے چھوٹے اور درمیانہ درجہ کے کاشتکار ہمیشہ بہترین تریاق ثابت ہوتے رہے ہیں علاوہ بریں یہی ایک ایسا علاج ہے جو قوم کی خانہ داری کے اندر رہتے ہوئے قوم کے نان شبینہ کی ضمانت دے سکتا ہے اگر ایک دفعہ یہ شرط پوری ہو جائے تو آج کل صنعت اور تجارت کو جو غیر فطری برتری حاصل ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے بجائے اس کے صنعت و تجارت بھی قوم کی عام خانہ داری میں اپنی مناسب جگہ پر آجائیں مانگ اور بہم رسانی کے مابین ایک توازن قائم ہو جائے قوم اپنی معاش کے لیے صنعت و تجارت کی محتاج نہ رہے، بلکہ انہیں امدادی شعبوں کی حیثیت دے دی جائے صنعت و تجارت کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ قوم کی پیداوار اور خرچ کے مابین توازن قائم رکھیں جب یہ فرض ٹھیک طرح ادا کریں تو کم و بیش قوم کی معاش دوسرے ممالک کی محتاج نہیں رہتی قوم کی معاشی حاجت مندی دور ہو جائے تو یہ اس کی آزادی اور خود مختاری کی ضمانت ہے بالخصوص جب قوم کی تاریخ میں کوئی نازک وقت آ

جائے تو اس وقت یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

طاقت کے بغیر انصاف محروم رہتا ہے

واضح رہے کہ توسیع ملک کی یہ پالیسی کامرون میں پوری نہیں کی جا سکتی یہ تو بس یہیں یورپ کے اندر پایہ تکمیل تک پہنچنی چاہیے یہ بات ذرا ٹھنڈے دل سے اور آنکھیں کھول کر سوچنے والی ہے یقیناً اس قادر مطلق کی تقسیم کا تقاضا یہ نہیں کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں اس دنیا کی اراضی پچاس گنا زیادہ حاصل ہو آج جب کوئی شخص اس صورت حال پر غور کرنے بیٹھے تو اسے موجودہ سیاسی حد بندی کی پرواہ نہ کرنی چاہیے سوچنا تو یہ ہے کہ پوری سختی سے انصاف کیا جائے تو کیا ہونا چاہیے اگر اس زمین پر سب کے لیے کافی جگہ ہے تو ہم کیوں اس حصہ سے محروم رہیں جو ہمارے وجود کے لیے لازمی ہے ہمیں اپنا جائز حصہ ملنا چاہیے۔

کوئی شک نہیں کہ لوگ خوشی سے جگہ نہ دیں گے یہی وہ موقعہ ہے، جہاں حفظ نفس کا حق بروئے کار آتا ہے جب مشکل کو خوش فہمی سے حاصل کرنے کی کوشش رد کر دی جائیں تو جو شئے دوستی کا ہاتھ پھیلانے سے نہیں ملی وہ ضرور مکے کے زور سے چھینی جائے گی جس طرح ہماری موجودہ نسل صلح پسندی کی حماقتوں میں پھنسی ہوئی ہے اگر ہمارے آباؤ اجداد بھی اپنے سیاسی فیصلوں کا انحصار اسی نہج پر رکھتے تو آج ہمیں جو قومی علاقہ حاصل ہے غالباً اس کا تیسرا حصہ بھی ہمارے قبضہ میں نہ ہوتا شاید وہ جرمن قوم ہی نہ ہوتی جسے یورپ میں اپنے مستقبل کی فکر کرنی پڑتی نہیں آج اگر ہم جرمن آسٹریا اور مشرقی پرشیا کے مالک ہیں تو یہ محض زندگی کی جدوجہد میں ہمارے آباؤ اجداد کے عزم و استقلال کا نتیجہ ہے ہمارے سیاسی اور نسلی محروسہ علاقے سے ہمیں جو اندرونی طاقت حاصل ہے وہ بھی اسی عزم بالجزم کی مرہون منت ہے یہ اسی طاقت کا اثر ہے کہ آج ہمارے لیے زندگی کے سانس لینا ممکن ہے۔

سلطنت کا استحکام مقبوضات سے ہے

ابھی ایک اور وجہ بھی باقی ہے کہ جس کا تقاضا تھا کہ یہی حال اختیار کیا جاتا یورپ کی معاصر حکومتوں میں سے اکثر و بیشتر کی مثال ایک مخروط سے دی جا سکتی ہے جو اپنے قاعدے پر کھڑا ہو۔ ان حکومتوں کو یورپ کے جس علاقہ پر تسلط حاصل ہے وہ ان کے مقبوضات، خارجی تجارت وغیرہ وغیرہ کے مقابلہ میں اس قدر تھوڑا ہے کہ خیال کرنے سے ہنسی آتی ہے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مخروط کی چوٹی تو یورپ میں ہے اور قاعدہ باقی ساری دنیا میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حالت اس سے قطعاً مختلف ہے اس کا قاعدہ تو براعظم امریکہ میں ہے اور باقی تمام دنیا سے محض چوٹی کے ذریعے تعلقات ہیں یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جو استحکام حاصل ہے وہ اور کسی کو حاصل نہیں علی ہذا القیاس یورپ کی اکثر و بیشتر مقبوضاتی حکومتوں کی کمزوری کا روگ بھی اسی اصول میں مضمر ہے۔

برطانیہ اور امریکہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں

اس دعویٰ کو رد کرنے کے لیے انگلستان کی مثال نہیں دی جا سکتی یہ ٹھیک ہے کہ اگر برطانوی سلطنت کے نقشے کو محض ایک چھچھلتی ہوئی نظر سے دیکھیں تو انگریز اور سیکسن اقوام نے بذات خود جو ایک دنیا آباد کر رکھی ہے وہ با آسانی نگاہ سے چوک جاتی ہے لیکن انگلستان کی پوزیشن کا مقابلہ یورپ کی کسی اور سلطنت سے نہیں کیا جا سکتا وجہ یہ کہ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دونوں مل کر ایک ہی زبان اور ایک ہی ثقافت کی ایک وسیع بستی ہے۔

جنگ کرو اور مقبوضات حاصل کرو

غرض جرمنی کے لیے حصول اراضی کی معقول پالیسی صرف یہی تھی کہ یورپ میں تازہ علاقہ حاصل کیا جاتا مقبوضات جب تک اس قابل نہ ہوں کہ وہاں یورپ کے رہنے والے کثیر تعداد میں جا کر آباد ہو سکیں تب تک اس مقصد کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ انیسویں صدی میں ایسے مقبوضات پر امن ذرائع سے حاصل کرنے کی کوئی مزید

گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

اس قسم کے مقبوضات حاصل کرنے کے لیے وسیع عسکری جدوجہد درکار تھی۔

غرض یورپ میں تازہ علاقہ حاصل کرنے کیلئے عسکری جدوجہد کرنا باہر مقبوضات حاصل کرنے کے لئے جنگ مول لینے کی نسبت زیادہ آسان رہتا۔

اس قسم کے ارادہ کا تقاضا تھا کہ قوم کی تمام طاقتیں بغیر کسی قسم کے ادھر ہی منعطف کر دی جاتیں ایسی حکمت عملی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر فرد و بشر کی ساری طاقت کا درکار ہے یہاں ہچکچا ہچکچا کر، نیمے بروں نیمے دروں کی روش سے کام نہیں چلتا۔ جرمن سلطنت کے سیاسی قائدین کو بس اسی مقصد کی دھن لگی رہنی چاہیے تھی سیاسی اقدامات میں اس مقصد یا اس مقصد کو حاصل کرنے کی سبیل نکالنے کے سوا اور کسی امر کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا جرمنی کو علم ہونا چاہیے تھا کہ ایسی منزلیں بغیر جنگ کے طے نہیں ہو سکتیں۔ جنگ کی آمد کا سامنا اطمینان اور استقلال سے گریز کرنا چاہیے تھا۔

روس سے دشمنی اور انگریز سے دوستی

اتحاد کا سارا نظام اسی زاویہ نگاہ سے جانچا اور مقرر کیا جانا چاہیے تھا اگر یورپ میں دنیا علاقہ حاصل کرنا تھا تو ایسا کرنے کے لیے زیادہ تر روس پر چھاپہ مارنا لازمی تھا جرمنی سلطنت کو پھر وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس پر کبھی زمانہ قدیم کے جرمن نائٹ چلتے رہے تھے اس دفعہ اس مہم کا مقصد یہ ہونا تھا کہ جرمن تلوار جرمن کھیتی باڑی کی خاطر علاقہ حاصل کر کے قوم کے لیے نان شبینہ مہیا کرے۔

ایسی حکمت عملی کے لیے سارے یورپ میں صرف ایک ہی اتحاد ممکن تھا میری مراد انگلستان سے ہے۔

جرمنوں کی اس نئی مقدس جنگ میں عقب کی حفاظت کا صرف یہی ایک طریقہ تھا کہ انگلستان سے اتحاد کیا جاتا ہماری اس مہم کے حق میں ایسی دلیلیں تھیں جو ہمارے آباؤ اجداد کے عزر جواز سے زیادہ زبردست تھیں ہمارے صلح پسندوں میں کون ایسا ہے جو

مشرقی سرحد پر پیدا ہونے والے گیہوں کی روٹی کھانے سے انکار کرے کیا انہیں علم نہیں کہ اس سرزمین پر سب سے پہلے جو ہل چلا تھا اس کا نام ''تلوار'' ہے

انگلستان کی دوستی حاصل کرنے کے لیے جو قربانی بھی کرنی پڑتی وہ تھوڑی تھی مقبوضات اور بحری طاقت کی امنگیں ترک کر دینی تھیں انگریزی مصنوعات سے مقابلہ کرنے کی کوشش چھوڑ دینی تھی۔

یہ مقصد حاصل کرنا تھا تو اس کے لیے ایک صاف اور واضح حکمت عملی لازمی تھی اس حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کا خیال دماغ سے نکال دیا جائے۔ مقبوضات حاصل کرنے کی خواہش اور بحری طاقت کے ولولے ترک کر دینے تھے حکومت کے تمام وسائل بری افواج پر مرکوز کر دینے چاہئیں تھے اس حکمت عملی کی خاطر کچھ عرصہ تک نفس کشی اختیار کرنی پڑتی ایک روشن اور زبردست مستقبل کے لیے یہ عارضی قربانی کچھ بڑی نہ تھی۔

ایک وقت ایسا تھا کہ جب انگلستان اس تجویز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سے گفت و شنید پر آمادہ ہو جاتا انگلستان اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جرمن آبادی کی مسلسل افزائش جرمنی کو یورپ میں انگلستان کی مدد سے کوئی حل تلاش کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر انگلستان نے یہاں امداد سے جی چرایا تو پھر جرمنی بغیر انگلستان کی امداد کے دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں اپنی دقت کا حل تلاش کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

غالباً یہی بڑی وجہ تھی جسے مدنظر رکھتے ہوئے اس صدی کی ابتدا میں لندن نے جرمنی کے قریب تر ہونے کی کوشش کی اس وقت جرمنی میں پہلی دفعہ اس رویہ کا اظہار کیا گیا جو بعد میں نہایت افسوسناک طریقہ سے نمایاں ہوا لوگوں نے اس وقت یہ بدمزہ جذبہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ اس طرح تو ہم انگلستان کے مفاد کی خاطر آگ میں کودنے پر مجبور ہوں گے گویا کوئی اتحاد بغیر ادل بدل کے کسی اور بنیاد پر قائم کیا جا سکتا ہے انگلستان ایسا باہمی سودا کرنے پر تیار تھا لیکن انگلستان کے مدبرین میں اتنی عقل تھی کہ وہ ساتھ ہی اپنی

خدمات کی قیمت بھی طلب کرنا چاہتے تھے۔

بین الاقوامی اتحاد جنگ کی غرض سے ہوتے ہیں

ذرا فرض کر لیجئے کہ 1904ء میں ہماری خارجی حکمت عملی بھی اسی ہوشیاری سے چلائی جاتی جس طرح جاپان نے اپنا مطلب نکالا ایسی حکمت عملی سے جرمنی کو جو فائدہ حاصل ہوتے ان کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔

جنگ عظیم کبھی وقوع میں نہ آتی 1904ء میں جو خون بہتا وہ اس کا دسواں حصہ بھی نہ ہوتا جو 1914ء سے لے کر 1918ء تک بہایا گیا پھر آج جرمنی کو دنیا میں کیا بڑا مرتبہ حاصل ہوتا؟

بہرصورت ان حالات میں آسٹریا کے ساتھ اتحاد کرنا تو ایک صریح حماقت تھی۔

یہ آسٹریا کی حکومت کا مردہ جرمنی کا ساتھ اس لیے وابستہ نہ ہوا تھا کہ جنگ کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا جائے اس کا منتہائے نظر تو یہ تھا کہ ہمیشہ امن قائم رہے۔اس امن کا ناجائز فائدہ یوں اٹھایا جائے کہ آسٹریا میں بسنے والے جرمن عنصر کو آہستہ آہستہ لیکن مسلسل طور پر تباہی کے گھاٹ اتارا جائے۔

اس اتحاد کو لایعنی قرار دینے کی اور وجہ بھی تھی جس حکومت میں اتنی طاقت اور استقلال بھی نہ ہو کہ وہ خود اپنی حدود کے اندر جرمن اقتدار کو ختم کرنے کی کوششیں روک سکے اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ بیرونجات میں جرمن مفاد کی حفاظت میں کوئی عملی قدم اٹھانے پر آمادہ ہو گی خود جرمنی میں قومی جذبہ ایسا پر جوش نہ تھا، اور وہ سنگ دلی مفقود تھی جو اس بیہودہ ہیبز برگ ریاست سے ایک کروڑ جرمنوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی طاقت چھین لینے کے لیے درکار تھی ان حالات میں ہیبز برگ حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ جرمنوں کے کسی عظیم الشان دلیری کے کام میں حصہ لے گی بعید از قیاس تھا قدیم جرمنی نے مسئلہ آسٹریا کے متعلق جو روش اختیار کی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر ساری قوم کا مقدر بھی خطرہ میں ہو تو اس کے اندر کہاں تک جدوجہد کا حوصلہ تھا۔

تقدیر ناگزیر ہے

بہر حال آسٹریا میں جرمنوں پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے انہیں ہر گز جاری رہنے اور سال بسال بد سے بدتر ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی بحیثیت ایک اتحادی کے آسٹریا کے تبھی تک قدر و قیمت تھی جب تک وہاں جرمن عنصر موجود تھا لیکن یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا۔

جنگ کے امکان سے جیسا خوف محسوس کیا جاتا تھا ویسا کسی اور چیز کا ڈر نہ تھا انجام کار ایک نہایت ناموافق وقت پر لڑائی کا سامنا کرنا پڑا اس کے سوا کوئی جائے مفر نہ رہی انہوں نے قسمت کا ڈورا کاٹ دینا پڑھا تھا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈورا ان کے لیے پھانسی کا پھندا بن گیا وہ امن عالم قائم رکھنے کے خواب دیکھ رہے تھے، لیکن آنکھ کھلی تو اپنے تئیں ایک عالمگیر جنگ میں گرفتار دیکھا۔

یہ امن عالم کے خواب دیکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ مستقبل میں جرمنی کی ترقی کے لیے مذکورہ بالا تیسری صورت پر غور تک نہ کی گئی یہ حقیقت تسلیم کی جاتی تھی کہ نیا علاقہ صرف مشرق میں ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے یہ معنی تھے کہ آئندہ جنگ کرنی پڑے گی مگر وہاں تو ہر قیمت پر امن قائم رکھنے کا خبط سمایا ہوا تھا کبھی جرمنوں کی خارجی حکمت عملی کا اصول ہوا کرتا تھا کہ جرمن قوم کی بقا کے لیے تمام ممکن ذرائع جائز ہیں اب وہ اصول یوں تبدیل کر دیا گیا کہ امن عالم ہر ممکن ذریعہ سے قائم رکھنا چاہیے اب ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا میں اس نکتہ پر مفصل بحث پھر کسی جگہ جاری رکھوں گا۔

صنعت سازی، عالمگیر تجارت، بحری طاقت اور مقبوضات

ابھی چوتھی صورت باقی تھی اس کا تقاضا تھا کہ صنعت سازی، عالمگیر تجارت بحری طاقت اور مقبوضات کا بیڑا اٹھایا جائے۔

یقیناً ترقی کا یہ راستہ زیادہ آسانی اور جلدی سے طے کیا جا سکتا تھا کسی علاقہ کو آباد کرنا ایک سست رفتار عمل ہے جو کبھی کبھی تو کہیں صدیوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے باوجود اس

کے یہ طوالت ایک اندرونی استحکام کا باعث ہوتی ہے یہ کام فوری جوش و خروش کے ہنگامہ سے سر انجام نہیں دیا جا سکتا یہاں بتدریج اور مستقل سرگرمی کی ضرورت ہے یہ سرگرمی صنعتی ترقی سے قطعاً مختلف ہے صنعتی سرگرمی تو اشتہار دے کر چند ہی سال میں بڑھائی جا سکتی ہے تاہم اس طرح جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ باقی رہنے والے نہیں ہوتے وہ تو ایک بے بنیاد سی چیز ہوتی ہے جیسے پانی کا بلبلا ایک بحری بیڑا بنا لینا کسی علاقہ میں کاشتکاروں کو آباد کرنے اور باڑیاں قائم کرنے کے مشکل کام کی نسبت بہت آسان ہے تاہم ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موخر الذکر کے مقابلہ میں اول الذکر کو تباہ کرنا بھی زیادہ آسان ہے۔

یہ راستہ اختیار کرتے وقت جرمنی کو اتنا تو ضرور علم ہوگا کہ جلد یا بدیر جنگ لڑنی ہی ہو گی یہ تو بچے ہی یقین کر سکتے تھے کہ نیک نفسی کے میٹھے اور چرب اعلان، صلح پسندی کی مسلسل قسمیں کھانا اور مختلف اقوام کے مابین ''دوستانہ مقابلہ'' کے راگ الاپنا ان باتوں سے مٹھائی حاصل کی جا سکتی ہے جنگ کی نوبت ہی کاہے کو آئی ہے۔

نہیں جب ہم نے یہ راستہ اختیار کر لیا تو انگلستان سے کبھی نہ کبھی ضرور ٹھننی تھی جب انگلستان نے ایک متشدد اور خود غرض وحشیانہ پن کے ساتھ ہمارے پر امن دخول کی پالیسی کا مقابلہ کرنا شروع کیا تو اس پر ہمارا ناراض ہونا حماقت تھی اگر ہماری پالیسی ہمارے اپنے معصومانہ مفروضات سے متجاوز نہ تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ہاں یہ درست ہے کہ اگر ہمارے ساتھ یہی سلوک ہوتا تو ہم ہرگز ایسی حرکت نہ کرتے اگر روس سے علاقہ چھیننے کی پالیسی پر عمل کرنے کی یہی صورت تھی کہ انگلستان کو اتحادی بنایا جاتا تو مقبوضات اور عالمگیر تجارت کا تقاضا تھا کہ روس کی امداد سے انگلستان کی مخالفت کی جائے یہ پالیسی اختیار کرنی تھی کہ تو پھر اس کے تمام مستلزمہ نتائج کو ذہن میں رکھنا ضروری تھا پہلی بات تو یہ ہے کہ آسٹریا سے جتنی جلد ہو سکتا چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے تھا۔

جس نظر سے بھی دیکھا جاتا اس صدی کے آغاز میں آسٹریا کے ساتھ اتحاد قائم رکھنا ایک کھلی حماقت تھی۔

''امن عالم'' کا نعرہ ایک ڈھونگ ہے

روس کے ساتھ انگلستان کے خلاف اتحاد کرنے کے خیال کسی کو نہ تھا علی ہذا القیاس روس کے خلاف انگلستان کو اتحادی بنانے کی فکر بھی کسی کو نہ تھی وجہ یہ کہ دونوں صورتوں میں جنگ لازمی نتیجہ تھی۔ جنگ سے بچنے کے لیے ہی تجارت اور صنعت کی پالیسی انتخاب کی گئی تھی انہیں یقین تھا کہ تجارت کے ذریعہ دنیا کو فتح کرنا ایک ایسا حربہ ہے جو ہمیشہ تشدد کی جگہ کام دے سکتا ہے پھر بھی وقتاً فوقتاً اور بالخصوص جب کبھی انگلستان کی جانب سے گاہے گاہے ناقابل فہم تنبیہات موصول ہوتی تھیں تو اس اصول کے کارگر ہونے کے متعلق شبہات پیدا ہو جاتے تھے۔ بحری بیڑا تعمیر کیے جانے کی یہی وجہ تھی اس سے یہ مفقود نہ تھا کہ انگلستان پر حملہ کیا جائے، یا اسے تباہ کر دیا جائے اس کا مقصد خالی یہ تھا کہ امن عالم کے مذکورہ بالا تصور اور ''دنیا کو پر امن طریقہ سے فتح کرنے کے اصول'' کی حفاظت کی جائے یہی وجہ تھی کہ یہ بیڑا کیا بلحاظ تعداد اور وزن کے اور کیا بلحاظ ہتھیار بندی کے منکسرانہ حدود کے اندر پابند تھا خیال یہ تھا کہ اس طرح امن پسندی کا ایک تازہ ثبوت مہیا ہو جائے گا۔

انگریز ہوشیار بھی ہے اور دلیر بھی!

تجارتی ذرائع سے دنیا کو پر امن طور پر فتح کرنے کی بک بک، اس حماقت کا مکمل ترین نمونہ تھی جو کبھی کسی حکومت کی حکمت عملی کو ڈھالنے والے اصول کا درجہ حاصل کر سکی جب اس پالیسی کو قابل عمل ثابت کرنے کے لیے انگلستان کو بطور مثال کے پیش کیا جاتا تھا تو یہ حماقت گدھا پن کے درجہ تک پہنچ جاتی تھی ہمارا تاریخ کو عقائد کی طرح رٹ لینا، اور تاریخ کے متعلق پروفیسروں کے خیالات، ان دونوں باتوں نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اس سے صاف ثبوت ملتا ہے کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے کس طرح تاریخ

''پڑھ'' لیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تجارتی ذرائع سے دنیا کو پرامن طور پر فتح کر لینے کے نظریہ کے خلاف انگلستان کی مثال ایک دلیل قاطع کی حیثیت رکھتی ہے انگلستان نے اپنی تجارتی فتوحات کے لیے جس وحشیانہ پن سے راستہ صاف کیا غالباً کسی قوم نے نہ کیا ہوگا انگلستان نے یہ فتوحات تلوار کے بل بوتے پر حاصل کیں پھر اس نے جس سنگ دلی سے اپنی فتوحات کی حفاظت کی وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے کیا یہ برطانوی تدبر کی خصوصیت نہیں کہ وہ سیاسی طاقت سے اقتصادی مفاد اور اقتصادی اقتدار سے سیاسی قوت حاصل کرنے کی گر سے خوب واقف ہے یہ تصور کرنا کتنی بھاری غلطی تھی کہ انگلستان اپنے اقتصادی پھیلاؤ کی خاطر اپنا خون دینے کی جرات نہ کرے گا اگر انگلستان کے پاس قومی فوج نہ تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اصل چیز یہ نہیں کہ موقع پڑنے پر فی الفور کتنی فوجی طاقت موجود ہو گی اصل چیز یہ ہے کہ جو کچھ عسکری طاقت میسر ہو اسے استعمال کرنے کا ارادہ اور استقلال کیسا مضبوط ہے انگلستان ہمیشہ وہ ہتھیار حاصل کر لیتا رہا ہے جن کی اسے ضرورت ہو وہ ہمیشہ وہ حربے استعمال کرتا رہا ہے جو فتح کے لیے ضروری تھے جب تک پہاڑے کے ٹٹوؤں سے کام نکل سکتا تھا انگلستان کرائے کے سپاہی بھیجتا رہا۔ جب کبھی کامیابی کے لیے ساری قوم کے بہترین خون کی حاجت ہوئی، انگلستان نے یہ خون زیادہ سے زیادہ اور گاڑھی سے گاڑھی مقدار میں دینے سے ہرگز گریز نہیں کیا وہ ہمیشہ ایسی قربانی کے لیے آمادہ رہا ہے پھر ہر موقع پر جنگجوئی کا حوصلہ، زبردست استقلال اور وحشیانہ ذرائع کا استعمال، ان میں کبھی سرمو فرق نہیں آیا برطانیہ کے عسکری اقدامات میں یہ سب باتیں موجود رہی ہیں۔

فریب سے عظمت وسطوت کی تعمیر ناممکن ہے

جرمنی میں مکتبوں اخبارات اور مزاحیہ جرائد کے ذریعہ انگریز کا ایک ایسا تصور قائم کیا جا چکا تھا جس سے انجام کار سخت دھوکہ ہونا لازمی تھا یہ حماقت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل طور پر جرمنوں کے ہر طبقہ میں سرایت کر گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اندازہ لگانے میں وہ غلطی کی

جس کے لیے آخر ہمیں سخت سزا بھگتنی پڑی۔ لوگوں کو کچھ ایسا دھوکہ ہو چکا تھا کہ وہ انگریزوں کو ایک ہوشیار دکاندار، لیکن ساتھ ہی بے اندازہ بزدل خیال کرتے تھے بدقسمتی سے ہمارے تاریخ پڑھانے والے بلند پایہ اور پیشہ ور استاد اپنے شاگردوں کے ذہن پر یہ سچی بات نقش نہ کرتے تھے وہ یہ کہ سلطنت برطانیہ جیسا عالیشان نظام خالی دھوکہ بازی اور فریب کاری سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر معدودچند اساتذہ یہ فرض سرانجام دیتے بھی تھے تو یا تو ان کی پرواہ نہ کی جاتی تھی، اور یا انہیں خاموش کرا دیا جاتا تھا مجھے خوب یاد ہے کہ فلانڈرز کی جنگ میں جب پہلی بار انگریز ناميوں سے آمنے سامنے ہونے کا اتفاق ہوا تو میرے ساتھی سپاہیوں کے چہروں پر کیسی حیرت برس رہی تھی تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان سپاہیوں کو احساس ہونے لگا کہ سرکاری اعلانات اور مزاحیہ اخبارات میں انگریزوں کا جو نقشہ کھینچا جاتا تھا یہ اسکاٹ لینڈ کے ٹامی اس سے قطعاً مختلف ہیں۔

اسی موقعہ پر میں نے پراپیگنڈا کی مختلف اقسام کے کم و بیش کارگر ہونے کے متعلق اپنی رائے قائم کی یہ رائے ابھی محض ابتدائی تصورات پر مشتمل تھی۔

فقط دیانت اور تجارت سے بھی دنیا مسخر نہیں کی جا سکتی

تاہم جھوٹ بولنے والوں کا اس غلط بنائی سے جو مقصد تھا انہیں تو اس سے غرض تھی انگریزوں کا جو حلیہ وہ پیش کرتے تھے وہ غلط ہی ہو لیکن اس سے یہ تو ثابت کیا جا سکتا تھا کہ دنیا کو پرامن ذرائع سے تجارتی وسائل اختیار کرتے ہوئے تسخیر کرنا ممکن ہے۔ انگریز جس طریقہ سے کامیابی حاصل کر چکے ہیں ہمیں اس میں کیوں ناکامی ہوئی ہے۔ ہم تو ان سے زیادہ دیانتدار ہیں پھر دغا بازی انگریزوں کا خاصہ ہے ہم اس عیب سے بھی پاک ہیں۔ یقیناً ہم انگریزوں سے بازی لے جائیں گے ہمارے ان خصائل کے باعث ہمیں چھوٹی چھوٹی قوموں کی ہمدردی اور بڑی قوموں کا اعتماد حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔

ہمیں یہ احساس نہ تھا کہ جب ہم خود اپنی دیانتداری پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس سے

دوسری اقوام سخت بیزار ہوتی ہیں باقی کی دنیا ہماری اس روش کے متعلق یہ رائے قائم کرتی ہے کہ عیارانہ فریب کاری کا اچھا نمونہ ہے جب جرمنی میں انقلاب برپا ہوا تب دوسری اقوام ہماری ذہنیت دیکھ کر حیران رہ گئیں یہاں تو خلوص حماقت کی حد تک پہنچ چکا تھا بلکہ اس سے بھی آگے۔

اگر ایک دفعہ ہم یہ ذہن نشین کر لیں کہ دنیا کو پر امن تجارتی ذرائع سے تسخیر کرنے کی حماقت کس طرح سر پر سوار تھی تو پھر یہ سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ حماقت کا دوسرا نمونہ یعنی اتحاد ثلاثہ کس طرح عالم وجود میں آیا۔ آخر کس حکومت سے اتحاد قائم کیا جانا تھا؟ آسٹریا کے ساتھ اتحاد کا مطلب یہ تھا کہ ہم یورپ میں بھی عسکری وسائل سے کوئی علاقہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت اتحاد ثلاثہ کی اندرونی کمزوری کی خاص وجہ تھی۔ بسمارک کی قابلیت کا مدبر ہنگامی ضروریات کے پیش نظر اس قسم کی دفع الوقتی کر سکتا تھا، لیکن اس کے پھوہڑ جانشینوں کے لیے یہ حرکت کہاں جائز تھی؟ بالخصوص اب تو وہ بنیاد ہی اٹھ چکی تھی، جس پر بسمارک نے اتحاد ثلاثہ قائم کیا تھا۔ بسمارک کے زمانہ میں آسٹریا کو پھر ایک جرمن ریاست قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد تو بتدریج ہر بالغ مرد و زن کو ووٹ کا حق مل جانے کے باعث یہ ملک ایک چڑیا خانہ بن چکا تھا۔ اس نقار خانے میں جرمن عنصر کی آواز کون سنتا تھا۔

نسلی حکمت عملی کی نظر سے دیکھو تو آسٹریا کے ساتھ یہ اتحاد سوائے تباہی کے اور کیا تھا اس کے معنی فقط یہ تھے کہ جرمن سلطنت کی سرحد کے قریب ایک جدید سقلاب دولت پروان چڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ وقت گزرنے پر یہ نئی طاقت جرمنی کے متعلق جو رویہ اختیار کرتی، وہ یقیناً دوسری حکومتوں مثلاً روس کے رویہ سے مختلف ہوتا۔ اس اتحاد کے واحد حامی یعنی آسٹرین جرمن اپنا اقتدار کھو کر باقاعدگی کے ساتھ اہم سرکاری عہدوں سے باہر نکالے جا رہے تھے۔ اندریں حالات اس اتحاد کا روز بروز کمزور کھوکھلا ہونا ایک لازمی امر تھا۔

بین الاقوامی معاہدات میں مستقبل کو فراموش نہ کرنا چاہیے

1900ء کے لگ بھگ جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد بھی اسی مرحلے تک پہنچ چکا تھا جہاں آسٹریا اور اٹلی کا اتحاد تھا۔

یہاں پھر ایک ہی دوسرا راستہ کھلا تھا۔ یا تو ہیبز برگ خاندان کی جنبہ داری کی جاتی، اور یا آسٹریا میں جرمن عنصر پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے اس کے خلاف احتجاج برپا کیا جاتا۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص ایسا یک طرفہ راستہ اختیار کرے اسے ضرور کھلی جنگ میں حصہ لینا پڑتا ہے۔

نفسیاتی زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو میثاق ثلاثہ جیسا معاہدہ جو محض موجودہ صورت حالات قائم رکھنے تک محدود ہوا کچھ زیادہ اہم ثابت نہیں ہو سکتا برعکس اس کے اگر کسی معاہدہ پر دستخط کرنے والے فریقین کو توقع ہو کہ وہ اس کے ذریعہ توقع مملکت کا عملی نتیجہ حاصل کر سکیں گے تو پھر اس معاہدہ کی باہم متحد رکھنے والی کشش اس آرزو کے نشوونما کے ساتھ ساتھ پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی وہی اصول عائد ہوتا ہے جو دنیا میں ہر جگہ منطبق کیا جا سکتا ہے۔ استحکام حاصل کرنا ہو تو مدافعت کو چھوڑو، اور جارحانہ اقدام کی فکر کرو۔

کئی حلقے اس حقیقت سے واقف تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں قوم کے نام نہاد ''نمائندے'' شامل نہ تھے۔ 1912ء میں ہی لوڈن ڈروف نے جو اس وقت ایک کرنیل اور عسکری جنرل اسٹاف کا ایک رکن تھا۔ اتحاد کے یہ کمزور پہلو ایک معروضہ کی شکل میں پیش کیے لیکن مدبرین وقت نے اس معروضہ کو ہرگز قابل اعتنا خیال نہ کیا۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ عقل کی استعداد محض عام لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے، اور مدبرین کا طبقہ اس سے قطعاً عاری ہے۔

یہ تو جرمنی کی خوش قسمتی تھی کہ جب 1914ء کی جنگ چھڑی تو اس کی ابتداء آسٹریا سے ہوئی۔ خاندان ہیبز برگ مجبور تھا کہ وہ اس میں حصہ لے۔ ورنہ اگر جنگ کسی اور شکل

میں شروع ہوتی تو جرمنی نے اکیلے ہی رہ جانا تھا۔ہیپز برگ سلطنت ہرگز کبھی کسی ایسی جنگ میں شرکت نہ کرتی جس کے آغاز کا ذمہ دار جرمنی ہوتا۔بعد میں اٹلی کی جس حرکت پر اتنا لعن طعن کیا گیا۔وہ آسٹریا سے پہلے ہی سرزد ہوئی تھی۔بالفاظ دیگر اگر جرمنی کسی اپنے مفاد کی بنا پر اعلان جنگ کرتا تو آسٹریا غیر جانبدار رہتا۔اگر وہ ایسا نہ کرتا تو جوں ہی جنگ شروع ہوتی وہاں انقلاب رونما ہو جاتا۔سقلابی عنصر جرمنی کی مدد کرنے کی نسبت تاج ہیپز برگ کو تباہ کر دینا زیادہ پسند کرتا آسٹریا کے ساتھ اتحاد سے پیدا ہونے والے ان تمام خطرات اور خرابیوں کو اس وقت کوئی نہ سمجھتا تھا۔

دوستی قائم کرنے سے پہلے دوست کے دشمنوں کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے

اول تو آسٹریا کے دشمن بہت زیادہ تھا۔وہ اس دن کے انتظار میں تھے جب انہیں اس پیرانہ سال سلطنت کا ورثہ آپس میں تقسیم کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ جرمنی کے بھی مخالف ہو گئے۔وجہ یہ کہ آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی ہر ایک کو توقع اور آرزو تھی۔لیکن جرمنی کے باعث ان کی تمنا پوری ہونے میں نہ آتی تھی۔جرمنی آسٹریا کو بچائے ہوئے تھا لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وائنا پہنچنا ہے تو برلن کو بھی پائمال کرنا پڑے گا۔

دوسرے اس اتحاد میں شامل ہو کر جرمنی نے دیگر اتحاد قائم کرنے کے بہترین اور زرین موقع ہاتھ سے کھو دیئے۔اب روس اور حتیٰ کہ اٹلی سے بھی اتحاد کے امکانات کی جگہ کشیدگی بڑھنے لگی۔حالانکہ روما میں آسٹریا کی جتنی مخالفت تھی اتنی ہی جرمنی سے موافقت تھی آسٹریا کی مخالفت ہر اطالوی کے سینہ میں دبی ہوئی تھی اور وقتاً فوقتاً زور سے بھڑک اٹھتی تھی۔

چونکہ تجارت اور صنعت سازی کی حکومت عملی اختیار کی جا چکی تھی اس لیے اب روس سے لڑنے کی کوئی وجہ باقی نہیں تھی ان حالات میں روس اور جرمنی کو لڑانے کی خواہش

صرف ان ممالک کے دشمنوں ہی کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی حقیقت یہ ہے کہ محض یہودی اور مارکس ازم کے پیرو ہی ان دونوں ممالک کے مابین مخالفت پھیلانے کے خواہشمند تھے۔

تیسرے اس اتحاد کے باعث جرمنی کے تحفظ کو ایک مستقل خطرہ لاحق تھا۔ جو طاقت بسمارک کی بنائی سلطنت کی مخالفت ہو وہ جرمنی کے اتحادی آسٹریا کی سلطنت میں سے حصے بانٹنے کا لالچ دے کر دوسری حکومتوں کا ایک پورا جتھا جرمنی کے مقابلہ پر لا سکتی تھی یہ انعامات ایسے بیش بہا تھے کہ خواہ مخواہ منہ میں پانی بھر آتا تھا۔

اس طرح تمام مشرقی یورپ، بالخصوص روس اور اٹلی کو آسٹریا کے خلاف میدان میں لے آنا ممکن ہو چکا تھا۔ اگر جرمنی کا اتحادی، آسٹریا ایسا تر نوالہ نہ ہوتا۔ تو شاہ ایڈورڈ کی زیر قیادت جو عالمگیر جتھہ بندی وجود میں آئی وہ کبھی رونما نہ ہوتی۔ یہی بات تھی جس نے اتنی بھانت بھانت کی حکومتوں کو باوجودیکہ ان کے مفاد مختلف تھے پھر ایک حملہ آور فوج کی شکل دے دی۔ ہر رکن کو توقع تھی کہ اگر وہ جرمنی کے خلاف عام ہلہ میں اشتراک کرتا ہے تو اس عوض اسے آسٹریا کے حصے بخرے کر کے صاحب دولت بننے کا موقع مل جائے گا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ترکی بھی آسٹریا کے ساتھ جرمنی کے اس منحوس اتحاد میں شریک تھا۔ اس سے جرمنی کو اور بھی زیادہ خدشہ لاحق تھا۔

یہودیوں کا بین الاقوامی ساہوکارہ جرمنی کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی مقصد برآری کے لیے کسی ایسی چاٹ کی ضرورت تھی جس کے لالچ میں دوسری حکومتیں جرمنی سے برسرپیکار ہو جائیں یہ چاٹ اسے آسٹریا کی سلطنت کی شکل میں میسر آ گئی بین الاقوامی سوہوکارہ کے یہ کرتا دھرتا اس لیے جرمنی کے دشمن تھے کہ اس نے ابھی تک ان کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم نہ کیا تھا جس طرح انہیں دوسری حکومتوں کی مالیات پر قبضہ حاصل تھا۔ غرض یوں اس جتھے کو باہم متفق مضبوط اور دلیر بنا لیا گیا دلیری کیا تھا محض کثرت تعداد کے زور سے رستم کو زیر کر لینے کے حوصلے ہو گئے تھے۔

خود حفاظتی پہلا فرض ہے

میں ابھی آسٹریا میں ہی تھا کہ میں تاج ہیپز برگ کے ساتھ اتحاد سے متنفر ہو چکا تھا۔ میں اس اتحاد سے سخت متوحش تھا۔ میں اس پر مسلسل غور کرتا رہتا تھا یہ اسی سوچ بچار کا نتیجہ تھا کہ میں نے مذکورہ بالا نتائج اخذ کیے۔

ان دنوں میری ملاقات کا حلقہ محدود تھا میں نے اس حلقہ میں کئی مرتبہ رائے ظاہر کی کہ یہ معاہدہ ایک منحوس معاہدہ ہے جس سلطنت کی خود اپنی تباہی لکھی جا چکی ہے اس کے ساتھ اتحاد کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اگر جرمنی بروقت علیحدہ نہیں ہو جاتا تو وہ خود بھی برباد ہو جائے گا۔ میرے اس پختہ عقیدہ میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ باوجودیکہ جنگ عظیم کے طوفان نے عقل کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ جوش اور ولولوں کا دور دورہ کر دیا تھا، اور جن لوگوں نے ٹھنڈے دل سے محض واقفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے رائے قائم کرنی تھی، وہ بھی اسی حالت میں تھے میں پھر بھی اپنے خیال پر قائم رہا۔ خندقوں میں بھی میری رائے بدستور رہی اور جب کبھی موقعہ ملتا رہا میں اس کا اظہار کرتا رہا۔ میرا عقیدہ تھا کہ اگر تاج ہیپز برگ کا ساتھ چھوڑنے سے جرمنی کے اپنے مخالفین میں کمی ہو جائے تو یہ کوئی برا سودا نہ ہو گا۔ جس لکھو کھہا جرمنوں نے ہاتھ میں تلوار لی تھی۔ وہ ایک خبیث شاہی خاندان کو قائم رکھنے نہ نکلے تھے بلکہ ان کے پیش نظر تو جرمن قوم کی نجات تھی۔

جنگ سے پہلے کبھی کبھی ایسا موقعہ ہوتا تھا کہ جرمن عوام کا کم از کم ایک حصہ آسٹریا سے اتحاد کی سیاسی دانش کے متعلق قدرے مشکوک نظر آتا تھا وقتاً فوقتاً جرمنوں کے قدامت پسند حلقے تنبیہہ کرتے رہتے تھے کہ اس اتحاد کی اہمیت کو زیادہ مبالغہ نہ دو۔ ان دنوں تو ہر معقول بات سے لاپروائی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ تنبیہہ بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی جاتی تھی عام خیال ہی تھا کہ تسخیر عالم کے لیے صحیح قدم اٹھایا جا چکا ہے اس ترکیب سے قربانی کم کرنی پڑے گی اور کامیابی بے اندازہ نصیب ہو گی۔

ملت کی شوکت حکومت کی عظمت سے وابستہ ہے

یہاں پھر غریب ''ناواقف'' عوام کیا کر سکتے تھے وہ تو صرف چپ چاپ کھڑے رہ کر یہی دیکھ سکتے تھے کہ ان کے ''نمائندے'' کس طرح سیدھے تباہی کے گڑھے کی جانب بڑھ رہے ہیں اور ان کی پیاری قوم کس طرح مست ہو کر ان کے پیچھے پیچھے جا رہی ہے۔

اگر ہم غور کریں کہ دنیا کو ''تجارتی خول'' کے پرامن ذرائع سے فتح کرنے کی یہ حماقت کس طرح عوام پر مسلط کی گئی اور امن عالم کو برقرار رکھنا کیسے قومی نصب العین بن گیا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کی بنیادیں اس خلل پر استوار تھیں، جو جرمنوں کے تمام سیاسی افکار پر مدت سے طاری تھا۔

جرمنی میں دستکاری اور صنعت نے فاتحانہ ترقی کی۔ جرمن حرفت نے حیران کر دینے والی ترقی کی۔ ہماری تجارت روز افزوں عروج پر تھی۔ ان سب باتوں نے ہمیں فراموش کر دیا کہ کامیابی کی پہلی شرط ایک طاقتور حکومت ہے۔ برعکس اس کے کئی حلقوں نے یہ عقیدہ پھیلانا شروع کر دیا کہ حکومت کا وجود ہی مذکورہ بالا سرگرمیوں کا مرہون منت ہے حکومت تو ایک اقتصادی ادارہ ہے اور اسے اقتصادی مفاد کے مطابق ہی قائم رہنا چاہیے۔ حکومت اقتصادی ڈھانچہ کی محتاج ہے ایسی صورت حالات کی تعریف کی جاتی تھی اسے ایک موزوں اور صحیح انتظام قرار دیا جاتا تھا۔

حکومت کیوں قائم کی جاتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کوئی نفسہ کسی خاص اقتصادی تصور یا کسی خاص اقتصادی اتار چڑھاؤ سے واسطہ نہیں حکومت دو فریقین کے باہمی عہد و معاہدے سے نہیں بنتی۔ حکومت کے لیے کسی معین قطعہ ارض کی ضرورت نہیں حکومت اقتصادی مفاد کی خاطر قائم نہیں کی جاتی۔ حکومت ان جانداروں کی ایک مشترکہ جماعتی تنظیم ہے جن کی جسمانی اور روحانی فطرت ہم جنس ہو۔ ان کی تنظیم کا مقصد یہ ہو کہ اپنی جنس کو قائم رکھنا ہے انہیں اس

طرح منظم کر دیا گیا ہو کہ قدرت نے ان کی خاص نسل یا نسل کی شاخ کے سپر د جو فرائض کیے ہیں ۔انہیں سر انجام دیا جائے ۔یہی اور صرف یہی ایک حکومت کا منشاءمقصد ہے ۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو کثیر ذرائع درکار ہیں ان میں سے ایک اقتصادی سرگرمی بھی ہے ان ذرائع کی حیثیت محض فروعی ہے ۔اقتصادی سرگرمی کبھی کسی حکومت کا سرچشمہ یا مقصد نہیں ہوا کرتی یہ دوسری بات ہے کہ کسی حکومت کی بنیاد شروع سے ہی غیر فطری اور غلط احساس پر رکھی گئی ہو ۔یہی حقیقت ثابت کرتی ہے کسی حکومت کے وجود کے لیے کوئی خاص معین قطعہ ارض لازمی نہیں ۔ یہ شرط محض انہیں قوموں کے لیے لازمی ہے جو اپنے ہم جنسوں کی قوت لایموت اپنی محنت سے پیدا کرتی ہیں وہ کشمکش حیات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کام کرتے ہیں جو لوگ جونکوں کی طرح انسانی نظام معاشرت کا لہو پی کر دوسروں سے کام نکلواتے ہیں اور اس کے لیے مختلف بہانے تراش سکتے ہیں وہ بغیر کسی معین قطعہ ارض کے بھی اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں یہ مقولہ خاص طور پر اس نکھٹو جونکوں کی قوم پر عائد ہوتا ہے جو ہمارے عہد میں بالخصوص بنی نوع آدم کے دیانتدار طبقوں کا شکار کر رہی ہے ۔میری مراد قوم یہود سے ہے ۔

نکھٹو جونکوں کی قوم

یہودیوں کی حکومت کبھی مکانی حدود کی بارکش نہیں ہوئی ۔ وہ تمام دنیا پر پھیل رہی ہے ۔اس کی کوئی سرحد نہیں اس کی رکنیت ہمیشہ صرف ایک نسل کے اندر محدود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسری حکومتوں کے اندر ایک اپنی حکومت قائم رکھتے ہیں ان کی یہ چال عیاری کی نادر ترین مثال ہے کہ وہ یہودی سلطنت کو مذہب کا چولہ اوڑھا کر اپنے تئیں اس رواداری کا مستحق ثابت کرتے ہیں جو آریا نسل ہمیشہ مختلف مذاہب کی نسبت ظاہر کرنے پر آمادہ رہتی ہے غور کرو تو شرع موسوی یہودی نسل کی حفاظت کے قانون کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شریعت معاشرتی سیاسی اور اقتصادی علوم کے ان تمام موضوعات پر حاوی ہے جو اس کے اصلی مقصد سے متعلق ہیں ۔

حکومت نسلوں کے انتظامی پیکر کا نام ہے

انسانی گروہوں کو جماعتی شکل دینے کی بنیادی علت کیا ہے یہ علت انسان کا وہ فطری احساس ہے جو اسے اپنی جنس کی حفاظت پر اکساتا ہے غرض حکومت ایک نسلی پیکر ہے وہ کوئی اقتصادی نظام نہیں۔ ان دونوں صورتوں کے مابین اس قدر زبردست تفاوت ہے کہ اسے ہمارے موجودہ مدبر ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے انہیں خیال پیدا ہو گیا کہ اقتصادی نظام کی بناء پر حکومت قائم کی جا سکتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہمیشہ ان قوی کے استعمال سے قائم کی جاتی ہے جو جنس اور نسل کو قائم رکھنے والی قوت ارادی کے اجزا ہیں یہ قوی تبھی زندہ رہ سکتے ہیں اور کام دے سکتے ہیں جب مردانہ اوصاف کا ظہور رہو انہیں تجارتی خودغرضی سے کوئی واسطہ نہیں حفظ جنس کا ہمیشہ یہی تقاضا ہوتا کہ افراد اپنے تئیں قربان کردینے پر آمادہ رہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع ''اسے جینا نہیں آتا جسے مرنا نہیں آتا''

حکومت نسل اور سیرت کے اتحاد سے بنتی ہے

نسل کو باقی رکھنا ہو تو افراد کی قربانی لازمی ہے غرض حکومت قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ایک سنگھٹن کا احساس پہلی شرط ہے اس احساس کی بنیاد نسل و سیرت کی وحدت کو ہر قیمت پر بچانے کے عزم بالجزم پر ہوتی ہے جو قوم اپنے علاقہ میں آباد ہے اس کے اندر یہ احساس مردانہ اوصاف پیدا کرے گا برعکس اس کے جو نکھٹو قوم دوسروں کا لہو چوس کر زندہ رہتی ہے اس کے اندر یہ احساس بدترین، دغابازی اور مکاری کے فنون کی صورت میں رونما ہوگا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہمیں فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ خصائص ان کی فطرت میں مضمر ہیں دوسروں کا لہو چوس کر زندہ رہنے والی نکھٹو قومیں جن مختلف سیاسی بھیسوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں وہ سب ان کی داخلی فطرت کے خارجی مظاہر پر مشتمل ہیں کم از کم اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ ابتدا میں کسی حکومت کی بنیاد ان مردانہ اوصاف کے بغیر نہیں رکھی جا سکتی۔ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے جو لوگ زندگی کی جدوجہد میں

ناکام رہیں انہیں غلامی سزا ملتی ہے۔ اس طرح ان کے متعلق جلد یا بدیر مٹ جانے کا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کشمکش کے نازک دور میں مردانہ خصلتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کا خون پی کر موٹی ہونے والی جونکوں کے دام فریب میں پھنس جاتے ہیں اس جال میں پھنسنے کی وجہ بھی ان کے ذہنی قوی کی کمزوری نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ جرأت و استقلال کے فقدان کے باعث مارے جاتے ہیں اس کمزوری کی حقیقی اصلیت کو چھپانے کی خاطر اسے ''نرم دلی'' کا نام دیا جاتا ہے۔

طاقت یا عظمت کے لیے دولت شرط نہیں

کسی حکومت کے قیام اور بقا کے لیے جن فضائل کی ضرورت ہوتی ہے انہیں اقتصادی حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ کسی حکومت کی اندرونی طاقت اور اس کا اقتصادی پھیلاؤ شاذ و نادر ہی بیک وقت ظہور میں آتے ہیں برعکس اس کے کثیر مثالیں ایسی دی جا سکتی ہیں جہاں اقتصادی خوشحالی حکومت کے آنے والے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اگر انسانی جماعت بندیوں کی بنیاد فی الحقیقت اقتصادی طاقتوں پر ہی منحصر ہوتی تو پھر حکومت کے اقتدار کا زمانہ بھی وہی ہوتا جب اقتصادی خوشحالی کا دور دورہ ہوتا۔ صورت حالات اس کے برعکس نہ ہوتی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جس ملک کی اپنی تاریخ برعکس ثبوت مہیا کر رہی ہو۔ وہاں یہ عقیدہ کیسے رائج ہو سکتا ہے کہ حکومتیں اقتصادی طاقتوں سے بنا اور قائم رہا کرتی ہیں پرشیا کی تاریخ بالخصوص صاف صاف ثابت کرتی ہے کہ حکومتیں قوموں کے اخلاقی جوہر سے بنا کرتی ہیں نہ کہ اقتصادی حالات سے اقتصادی سرگرمیاں اخلاقی خوبیوں کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہیں اور جب تک قوم میں سیاسیات کی تخلیقی استعداد باقی رہے تب تک جاری رہتی ہیں۔ اس کے بعد اقتصادی نظام بھی زوال پذیر ہو جاتا ہے یہ صورت حالات ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خوفناک انداز سے رونما ہو رہی ہے۔ بنی نوع آدم کے مادی مفاد فقط شجاعانہ خصلتوں کے سایہ میں ہی ترقی کر سکتے ہیں جونہی مادی مفاد

زندگی کا اولین مقصد بن جائیں وہ خود اپنے جڑ کاٹنے لگتے ہیں۔

دولت طاقت سے اور طاقت قربانی سے پیدا ہوتی ہے

جب کبھی جرمنی کی سیاسی قوت بالخصوص عروج پر تھی، انہیں دنوں یہاں کی اقتصادی حالت بھی بہتر تھی۔ جوں ہی محض اقتصادی مفاد قوم کے مطمع نظر قرار پائے اور انہوں نے برتر مقاصد کو پس پشت ڈال دیا، وہیں حکومت ختم ہوگئی اور اقتصادی تباہی کے آنے میں بھی دیر نہ لگی۔

اگر ہم اس سوال پر غور کریں کہ حکومت کی تخلیق اور بقا کے لیے کون سے طاقتیں فی الحقیقت درکار ہیں تو ہم مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچیں گے افراد کو مشترکہ فلاح و بہبود پر قربان کردینے کی استعداد اور رضامندی ان خصائص کو اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں ثبوت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں مادی مفاد کی خاطر قربان کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا بالفاظ دیگر وہ کسی مقصد کی خاطر تو مرنے کو تیار ہے لیکن کسی کاروبار کی خاطر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں۔ انگریزوں نے جس طرح جنگ عظیم میں اپنی وکالت کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں عامۃ الناس کی نفسیات پر قابو پانے کا کیسا ملکہ ہے۔

انگریز پراپیگنڈا کا استاد ہے

ہم اپنے روزگار کی خاطر لڑ رہے تھے لیکن انگریز کہتے تھے کہ وہ ''حریت'' کی خاطر جنگ کرتے ہیں اور حریت بھی پھر اپنی نہیں نہ نہ! وہ بیچاری تو چھوٹی قوموں کی آزادی کی خاطر لڑتیت تھے جرمن ان کی اس ڈھٹائی پر ہنستے تھے اور ناراض ہوجاتے تھے ان کی اس حرکت سے ثابت ہوتا تھا کہ ہمارے نام نہاد مدبرین کی سیاسی قابلیت جنگ سے بل بھی کیسی تنزل پذیر ہوچکی تھی ان مدبرین کو خاک علم نہ تھا کہ وہ کیا طاقت ہے جو انسان کو خود اپنی مرضی اور جوش سے موت کا سامنا کرنے پر آمادہ کردیتی ہے۔

1914ء کی جنگ میں جب تک جرمن قوم کا ایمان یہ رہا کہ وہ اپنے عقائد کی خاطر لڑ رہے ہیں تب تک وہ ختم ٹھونک کر کھڑے رہے جوں ہی انہیں بتایا گیا کہ وہ نان شبینہ کی

خاطر جنگ کر رہے ہیں نہ ہیں انہوں نے جدوجہد سے دستبردار ہونا شروع کر دیا۔

ہمارے صاحب دماغ ''مدبر'' لوگوں کے جذبات میں یہ انقلاب دیکھ کر سخت حیران ہوئے ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب انسان کو خالص مادی مقاصد کی خاطر لڑنے کو کہا جائے تو وہ حتی الوسع موت سے بچنے کی کوشش کرے گا۔

موت اور کسی کامیابی سے مادی فائدے حاصل کرنا یہ دونوں تو متضاد تصورات ہیں کمزور سے کمزور عورت بھی اپنے بچے کی جان خطرے میں دیکھ کر جرات کی دیوی بن جاتی ہے امت کی حفاظت اور امت کو پناہ دینے والی وطن یا حکومت کی حفاظت ہی ایسی چیزیں ہیں جن کی خاطر انسان ہمیشہ دشمن کی تلوار کا سامنا کرنے پر آمادہ ہوتا رہا ہے۔

حکومت نسلی مفاد کا آلہ کار ہے

ذیل میں ایک ایسی حقیقت بیان کی جاتی ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی:

آج تک کبھی کوئی حکومت خالی تجارتی اسباب سے اور محض تجارتی مقاصد کو صلح پسندی کے ذریعہ پورا کرنے کی خاطر قائم نہیں ہو سکی۔ حکومتیں ہمیشہ نسلی جتھہ کو برقرار رکھنے کے احساس سے عالم وجود میں آتی ہیں چاہے یہ احساس شجاعت کی شکل میں ظاہر ہو اور چاہے مکاری وعیاری کا چولا اوڑھ لے۔ پہلی صورت کی مثال آریہ حکومتیں ہیں جو محنت اور ثقافتی ارتقاء کی بنیادوں پر قائم ہیں دوسری مثال یہودی بستیوں کی ہے جو دوسروں کا خون پی کر زندہ رہتی ہیں جونہی کسی قوم یا حکومت کے اقتصادی مفاد، نسلی یا ثقافتی احساسات پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں وہیں غلامی اور مظلومی مسلط ہونے لگتی ہے۔

سلطنت کی بنیاد شجاعت پر ہے

جنگ سے پہلے جرمنی میں خیال پھیلا ہوا تھا کہ پر امن ''تجارتی دخول'' اور نو آبادیات قائم کرنے کی پالیسی سے جرمن دنیا کو مسخر کر سکتے ہیں اس خیال سے ظاہر ہوتا تھا کہ جن حقیقی اوصاف سے حکومتیں قائم کی جاتی ہیں اور برقرار رکھی جاتی ہیں وہ جرمنی میں رو بہ انحطاط ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فراست، قوت ارادی اور عملی

استقلال جو ان اوصاف کا خاصہ ہے وہ بھی تنزل پذیر ہے جنگ عظیم اور اس سے جو نتائج رونما ہوئے وہ سب اسی انحطاط کا قدرتی انجام تھے۔ جرمن قوم کا یہ رویہ مرض عام کی صورت میں پھیلا ہوا تھا جرمنی خود ایک ایسی عظیم الشان سلطنت تھی جو محض جنگجوئی کی حکمت عملی سے معرض وجود میں آئی تھی پرشیا جرمن سلطنت کو زندہ رکھنے والا قلب تھا آخر یہ پرشیا شاندار اور شجاعانہ کوششوں سے پروان چڑھا تھا۔ اسے مالی یا اقتصادی عہد و پیان نے تو ترقی نہ دی تھی خود جرمن سلطنت اس قیادت کا عالیشان انعام تھی جو سراسر طاقت اور عسکری شجاعت کی حکمت عملی پر گامزن رہی تھی۔

یہودی موت کے جراثیم ہیں

پھر ایسی جرمن قوم کے سیاسی احساسات کیوں اس طرح تنزل پذیر ہو گئے؟ یہاں صرف انحطاط کی کوئی ایک نشانی نہ تھی بلکہ تمام سیاسی پیکر میں ہی مرض کی علامات خطرناک طور پر رونما ہو رہی تھیں وہ قوم کے جسم کو ناسور کی طرح کھائے جا رہی تھیں ایسے نظر آتا تھا کہ کسی پر اسرار ہاتھ نے اس تندرست جسم میں ایسا زہر داخل کر دیا گیا ہے جو رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے یہی وجہ ہے کہ عقل اور خود حفاظتی کا بنیادی احساس بھی مفلوج ہو گیا ہے۔

میں 1912-14ء کے دوران میں اتحاد ثلاثہ کی حکمت عملی سے متعلقہ مسائل اور جرمن سلطنت کی اقتصادی پالیسی پر مسلسل غور کیا کرتا تھا۔ ایک بار پھر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس معمہ کا حل وہ طاقت ہے جس سے میں وائنا میں روشناس ہو چکا ہوں فرق صرف یہ ہے کہ وہ پہلی روشناسی ایک دوسرے زاویہ نظر سے تھی یہ طاقت مارکس کی تعلیمات کا ضابطہ حیات اور تمام قوم میں اس کا منظم عمل تھا۔

میں اپنی زندگی میں دوسری مرتبہ پھر اس تباہی کی تعلیم کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ تاہم اس دفعہ میرے مطالعہ کا متحرک میرے ذاتی ماحول کے تاثرات نہ تھے۔ بلکہ اس دفعہ میں جرمنی کی سیاسی زندگی کے عام حالات کے مشاہدہ سے اس طرح راغب ہوا تھا میں

نے اس عالم نو کے عقائد کی کتابوں میں پھر ایک مرتبہ غوطہ لگایا۔

اس کے ممکن نتائج کا اندازہ لگانے کی کوشش کی میں نے مارکس ازم کے عقیدہ کے اصولوں اور سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی معاملات میں اس کی سرگرمیوں کے اثرات کا باہم مقابلہ کرنا شروع کیا۔

اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اپنی توجہ ان کوششوں کی طرف منعطف کی جو اس عالمگیر وباء کے استیصال کے لیے جاری تھیں۔

میں نے بسمارک کے بنائے ہوئے خاص قوانین کا مطالعہ کیا میں نے ان قوانین کا ابتدائی تصور، ان پر عمل درآمد اور اس کے نتائج سب کچھ دیکھا رفتہ رفتہ میں نے خود اپنی رائے قائم کرنے کے لیے ایک بنیاد مہیا کر لی۔ یہ بنیاد چٹان کی مانند مضبوط ثابت ہوئی ہے اس کے بعد بحیثیت مجموعی مجھے اس مسئلے کے متعلق کبھی اپنی روش تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی میں نے قوم یہود اور مارکس ازم کے باہمی تعلق کا بھی مزید اور زیادہ عمیق تجزیہ کیا۔

مارکس ازم شروع سے قوم کے وجود کے لیے خطرہ تھا

جن دنوں میں وائنا میں مقیم تھا میں جرمنی کو ایک نا قابل شکست پہلوان تصور کرتا تھا۔ تاہم ان دنوں بھی مجھے وزنی شکوک تشویش میں ڈال دیا کرتے تھے میں اپنے دل میں اور اپنے ملاقات کے محدود حلقہ میں جرمنی کی خارجی حکمت پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا میری رائے میں مارکس ازم کا علاج ایک نہایت سطحی انداز سے کیا جاتا تھا حالانکہ یہ اس وقت جرمنی کا سب سے اہم مسئلہ تھا میں اس سطحیت پر بھی نکتہ چینی کیا کرتا تھا میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ خطرے کو دیکھ کر پھر کیسے اندھا دھند آگے بڑھے جاتے تھے مارکسازم اپنے مقاصد الاعلان بیان کرتا تھا اگر یہ مقاصد عملی جامہ پہن لیں تو اس کے نتائج نہایت اہم ہونگے۔ میں ان ابتدائی دنوں میں بھی اپنے اردگرد کے لوگوں کو متنبہ کرتا تھا آج بھی میں تب سے زیادہ زور کے ساتھ اپنے مخاطبین کو متنبہ کرتا ہوں یہ

مطمئن کرنے والا نعرہ قطعاً غلط ہے کہ ''ہمیں کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا'' یہ بے خبری اور بے تدبیری کی نشانی ہے ایسی ہی دماغی بیماری پہلے بھی ایک زبردست سلطنت کو تباہ کر چکی ہے جرمنی ان قوانین پر عمل سے کیسے بچ سکتا ہے جو اور تمام انسانی جماعتوں پر حاوی ہیں۔

مارکس ازم بغلی گھونسہ ہے

میں نے 1913ء سے 1914ء میں پہلی مرتبہ اپنی رائے مختلف حلقوں کے سامنے پیش کی اب ان میں سے کچھ لوگ نیشنلسٹ سوشلسٹ تحریک کے رکن ہیں میری رائے یہ تھی کہ جرمن قوم کا مستقبل تبھی شاندار بنایا جا سکتا ہے جب پہلے یہ معمہ حل کر لیا جائے کہ مارکس ازم کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے میری رائے میں اتحاد ثلاثہ کی تباہ کن حکمت عملی مارکس ازم کی تعلیمات کے پراگندہ کر دینے والے اثرات کا نتیجہ تھی خطرناک بات یہ تھی کہ یہ تعلیم صحیح سیاسی اور اقتصادیات نظریات کی جڑیں کاٹ رہی تھی جو لوگ اس چھوت کا شکار ہو چکے تھے وہ اکثر خود یہ نہ سمجھتے تھے کہ ان کے مقاصد اور اعمال اس ضابطہ حیات کا نتیجہ ہیں وہ کھلے بندوں اس کی تردید کرتے تھے۔

جرمن قوم کا اخلاقی اور روحانی انحطاط ایک مدت سے شروع ہو چکا تھا ہاں جیسے کہ اکثر ہوا کرتا ہے جن لوگوں پر اس زوال کی زد پڑ چکی تھی وہ بیشتر اس حقیقت سے بے خبر تھے انہیں علم نہ تھا کہ کونسی طاقتیں ان کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں بعض اوقات وہ علامات کا علاج کر کے مرض دور کرنا چاہتے تھے چونکہ کوئی شخص اصل مرض سے واقف نہ تھا اور نہ ہی واقف ہونا چاہتا تھا اس لیے مارکس ازم سے مقابلہ کرنے کا طریقہ ویسا ہی کارگر تھا جیسے کسی نیم حکیم کا نسخہ ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب پنجم :: جنگ عظیم

''صلح پسندانہ رقابت''

مجھے ایام جوانی کی سرخوشی میں ایک ہی تردد سے آزردگی رہا کرتی تھی میں سوچتا میری پیدائش ایک ایسے زمانہ میں ہوئی جب دنیا کھلم کھلا فیصلہ کرچکی ہے کہ سوائے دکانداری اور سرکاری ملازمت کے شہرت عام اور بقائے دوام کا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ ایسے نظر آتا تھا گویا تاریخی مشاہیر کی فہرست پر اب ہمیشہ کے لیے تمت کی مہر ثبت ہوچکی ہے مستقبل میں اب ترقی کی صرف ایک شاہراہ باقی ہے اور وہ ہے اقوام عالم کے مابین '' صلح پسندانہ رقابت'' یہ ''صلح پسندانہ رقابت'' کیا بلا تھی ایک دوسرے کو دھوکہ بازی سے لوٹنا اور خود حفاظتی کے لیے کبھی تشدد کی نوبت نہ آنے دینا۔ ہر قوم تجارت کا ڈھونگ رچا رہی تھی اس ''تجارت'' کے دوران میں ایک دوسرے کی منڈیاں غصب کرلی جاتیں گاہک چھین لیے جاتے اور ''مراعات'' حاصل کی جاتیں اس کارروائی کے دوران میں خاصہ ہنگامہ پرور لیکن بےضرر، شوروغل بھی مچایا جاتا تھا۔ صورت حالات کا یہ رجحان بظاہر مستقل تھا عوام بھی اسی رنگ میں رنگے تھے یوں دکھائی دیتا تھا کہ یہ دنیا اب تک سوداگروں کی منڈی ہی بنی رہے گی اس ایوان تجارت میں جن لوگوں کی یادگار منانے کے لیے ان کے مجسمے نصب کیے جائیں گے وہ کون ہونگے؟ بقائے دوام کے اولین مستحق تو وہ نفع خور ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ عیار ثابت کیا اس کے بعد ان سرکاری افسروں کی باری آئے گی جو زیادہ سے زیادہ بےضد ثابت ہوئے۔ سوداگروں کی نمائندگی انگریز کریں گے سرکاری افسروں کی نیابت جرمن سرانجام دیں گے رہے بیچارے یہودی تو وہ مالکانہ حقوق کے لیے حقیقت منصب پر اکتفا کریں گے انہیں ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ وہ نفع نہیں کما سکتے اور پھر بھی ٹیکس ادا کرتے ہیں پھر وہ

غیر زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں یہ بھی تو ایک کمال ہے۔

میں ''میاں صلح کل'' نہ تھا

میں اپنے جی میں سوال کیا کرتا تھا کہ میں آج سے سو سال پیشتر کیوں پیدا نہ ہوا۔ جب جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اور ایک انسان دکان کا مالک ہوئے بغیر بھی کارآمد ہو سکتا تھا۔

میں کڑھتا تھا کہ میں اس کرہ ارض پر بہت دیر سے پہنچا نہ معلوم میں کس ناکردہ کوتاہی سے اس محرومیِ قسمت کا سزاوار ٹھہرا میرا دل اس ذلت اور مایوسی پر کباب ہو کر رہ جاتا کہ میری زندگی کی گھڑیاں امن اور سکون میں ہی کٹ جائیں گی میں بچپن میں چاہے کچھ تھا لیکن ''میاں صلح کل'' تو ہرگز نہ تھا مجھے امن کا نظام بنانے کی تمام کوششیں اکارت تھیں۔

اسی دوران میں دور افق پر بجلی کی چمک کی طرح بوئر وار چھڑ گئی۔ میں ہر روز اخباروں کے مطالعہ میں غرق رہتا۔ جنگ کی خبریں اور اعلانات میں اسی شوق سے پڑھتا تھا جس طرح بھوکا روٹی پر لپکتا ہے میری خوشی کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا میں مسرور تھا کہ گو لڑائی مجھ سے کوسوں دور ہے تاہم زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مردانہ طاقت آزمائی کے مشاہدہ کرنے کا موقع تو ملا۔

جب روسیوں اور جاپانیوں میں ٹھنی تو میں ہوش سنبھال چکا تھا اور خود مسائل پر رائے قائم کر سکتا تھا اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو میں اپنے قومی مفاد کے پیش نظر جاپانیوں کی جنبہ داری کرتا میرا خیال تھا روسیوں کو شکست ہوئی تو اس سے آسٹریا میں سقلابیوں کے اقتدار میں کمی آ جائے گی۔

طوفان سے پہلے سکون کی گھڑیاں

متذکرہ صدر واقعات کے کئی سال بعد میں میونچ پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ جسے میں زوال کا اضمحلال تصور کیا کرتا تھا وہ تو خالی طوفان سے پہلے سکون کی چند گھڑیاں تھیں

آئندہ رونما ہونے والے ہنگامے اس وقت بھی کروٹیں لے رہے تھے جب میں وائنا تھا منحوس دھوئیں کے گھٹا ٹوپ میں کہیں کہیں کوئی چنگاری چمکتی لیکن پھر بجھ جاتی آخر جنگ بلقان بھڑک اٹھی یورپ میں چاروں جانب بدگمانی پھیلی تھی جو جھکڑ چلنے والا تھا ابھی اس کا پیش خیمہ چند ہلکے ہلکے ہلکورے محسوس ہوئے انتظار کی گھڑیاں اب لوگوں پر گراں تھیں خطرہ سامنے تھا آنے والی تباہی کا احساس اتنا شدید تھا کہ بے صبری سے انتظار کی نوبت پہنچ چکی تھی لوگ کہتے تھے جب قسمت کا لکھا ٹل نہیں سکتا تو پھر جو کچھ ہونا ہے قضاؤ قدر جلد ہی کیوں نہیں ہو لینے دیتے۔ زمین پر آسمان سے بجلی گرنے والی تھی زبردست طوفان کی ابتداء رعد کی کڑک سے ہوئی پھر طوفان شروع ہو گیا۔ آسمانی بجلیوں کی کڑک جنگ عظیم کی گولہ باری کے دھماکوں سے ساتھ ہمنوا ہوگئی۔

جس روز شہزادہ فرانز فرڈی نینڈ کے قتل کی اطلاع میونچ پہنچی میں سارا دن گھر میں ٹھہرا رہا تھا۔ اس لیے تفصیلات معلوم نہ کر سکا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ پہلے تو میں ڈرا کہ قاتل کوئی آسٹروی جرمن طالب علم نہ ہو خاندان ہیپز برگ کے تخت کا یہ وارث سقلابیوں کا ایسا حمایتی تھا کہ آسٹروی جرمن اس کے خلاف برانگیختہ ہو چکے تھے وہ سلطنت کی جرمن آبادی کو اس مار آستین سے نجات دلانا چاہتے تھے میرے خوف کی وجہ یہ تھی کہ اگر قتل واقعی کسی جرمن نے کیا ہے تو اس کے نتائج بد قوم کو بھگتنے پڑیں گے جرمنوں پر ظلم وستم کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا اس سختی کی وجہ جواز دنیا کو قائل کر دے گی جلد ہی مجھے اصل قاتلوں کے نام معلوم ہو گئے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ تو سرب ہیں میں انتقام قدرت کی ستم ظریفی پر حیران رہ گیا کہ سقلابیوں کا سب سے بڑا حمائتی کس طرح سقلابی محبان وطن ہی کی گولی کا نشانہ بنا۔

سلطنت کا مرتبہ بادشاہ سے بڑا ہونا چاہیے

وائنا کی حکومت نے جس لب ولہجہ اور انداز سے الٹی میٹم بھیجا اس کے لیے الزام نہیں دیا جا سکتا اس حکومت کے منصب اور حالات میں دنیا کی اور کوئی حکومت ہوتی تو اسے

بھی ایسا ہی کرنا پڑتا۔ آسٹریا کی جنوبی حدود پر سربیا ایک انتھک دشمن تھا۔ جو ہر وقت ہماری بادشاہی کو تنگ کرنے پر آمادہ تھا۔ اس نے تب تک چین نہ لینا تھا جب تک آسٹری سلطنت تباہ نہ ہو جاتی۔ آسٹریا کو معقول وجوہات کی بناء پر خطرہ تھا کہ یہ نازک وقت بڈھے شہنشاہ کی موت کے ساتھ ہی آ جائے گا اگر ایسا ہوا تو ڈر تھا کہ اس وقت شہنشاہیت مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی گذشتہ چند برسوں سے شہنشاہ فرانس جوزف کی ذات ہی آسٹروری سلطنت کا جسم و جان بن چکی تھی عوام کی نظروں میں تو ان بزرگوار کی موت کو خود سلطنت ہی کی موت تصور کیا جاتا۔ سچ یہ ہے کہ سقلابیوں نے بڑی چالاکی سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ آسٹرین سلطنت کا وجود ہی شہنشاہ معظم کی نادار اور ہمہ گیر قابلیت کا ایک کرشمہ ہے جادوگر مرا تو جادو بھی ٹوٹ جائے گا۔ ہف برگ میں یہ خوشامد پرستی خود مقبول تھی۔ اس کا کچھ خیال نہ تھا کہ شہنشاہ نے واقعی جو خدمات انجام دی ہیں اس قصیدہ خوانی کو ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس شیریں بیانی کی تہ میں جو زہر یلا ہل پوشیدہ تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ کوئی خیال نہ کرتا تھا کہ اگر سلطنت کا وجود ہی ایک دانائے روزگار شہنشاہ کی انتظامی قابلیتوں کا مرہون منت ہے تو جس روز موت کے فرشتے نے اس کے محل کے دروازے پر دستک دی اس دن سلطنت کا کیا حشر ہو گا۔ شاید یہ غفلت بھی تجاہل عارفانہ تھی۔

آسٹرین سلطنت کا تو بغیر اس کے تاجدار محترم کے تصور بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ یہی نظر آتا تھا کہ میریا تھریسا کا جو انجام ہوا تھا وہی المناک داستان پھر دہرائی جائے گی۔

جنگ سے بچنا ممکن نہیں

وائنا کی حکومت کو جنگ شروع کرنے کا الزام دینا اور کہنا کہ جنگ رک سکتی تھی بے انصافی ہے جنگ تو اٹل تھی ہاں شاید ایک دو سال کے لیے اسے ملتوی کر دینا ممکن تھا جرمن اور آسٹرین مدبرین کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ امتحان کی گھڑی ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار انہیں نہایت ناسازگار حالات میں تلوار

اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ جنگ روکنا چاہتے تھے انہیں جنگ روکنے کے نتائج برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے تھا۔ ان نتائج کا ایک تقاضا تو یہ تھا کہ آسٹریا سے دست برداری اختیار کی جاتی جنگ اس کے بعد بھی نہ رک سکتی تھی ہاں اس جنگ میں تمام اقوام عالم ہمارے خلاف صف بستہ نہ ہوتیں شاہان ہیپز برگ کا خاندان مٹ جاتا جرمنوں کے لیے صرف یہ فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا کہ آیا وہ شاہان ہیپز برگ کا خاندان برقرار رکھنے کی کوشش کریں یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے قسمت کو اپنا کام کرنے دیں۔

آج جو لوگ سب سے زیادہ بلند نعرے لگاتے ہیں اور اسباب جنگ کا اندازہ لگانے میں اپنی دانشوری کا ادعا کرتے ہیں، درحقیقت انہیں ریشہ دوانیاں جنگ کی سب سے بڑی مہلک وجہ تھیں۔

سالہا سال سے جرمن اشتراکی جمہوری پارٹی روس سے جنگ چھیڑنے کی خفیہ سازشوں میں مصروف تھی مرکزی جرمن پارٹی اپنے مذہبی مقاصد کے پیش نظر آسٹرین ریاست کو جرمن حکمت عملی کا محور بنانا چاہتی تھی اب ان حماقتوں کا خمیازہ بھگتنے کا وقت آ پہنچا تھا جو کچھ ہوا وہ تو یوں ہی ہونا تھا۔ ہونی سے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ جرمن حکومت کا اگر کچھ قصور تھا تو یہ کہ محض حفظ امن کی خاطر اس نے بار بار جنگ شروع کرنے کے اچھے مواقع ہاتھ سے گنوا دیئے دنیا بھر میں امن قائم رکھنے کے معاہدہ میں اپنے تئیں پھنسا لیا۔ اور آخر کار اس عالمگیر اتحاد کا شکار ہوئی جو جرمنوں کی حفظ امن کوششوں کا مخالف تھا۔ اور عالمگیر جنگ شروع کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اگر وائنا کی حکومت اتنا سخت الٹی میٹم نہ بھیجتی تب بھی اس سے کچھ فرق نہ پڑتا۔ البتہ رائے عام ضرور بگڑ جاتی عوام تو اس الٹی میٹم کو بھی ضرورت سے زیادہ نرم قرار دیتے تھے بہر حال وہ اسے ظالمانہ یا حد سے متجاوز ہرگز نہ سمجھتے تھے اگر آج کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو یا وہ ایک سادہ لوح انسان ہے جس کا حافظہ کام نہیں کرتا اور یا وہ جان بوجھ کر

جھوٹ بولتا ہے۔

جنگ ایک سعادت ہے

1914ء کی جنگ ہرگز عوام پر ٹھونسی نہ گئی تھی حقیقت یہ ہے کہ عوام خود جنگ کے خواہاں تھے۔

ہر طرف جو بے یقینی پھیلی ہوئی تھی اسے ایک مرتبہ دور کر دینے کی خواہش عام تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو بیس لاکھ جرمن نوجوانوں اور مردیوں اپنی خوشی سے فوج میں بھرتی ہو کر اس مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ قربان کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے۔

میرے لیے تو لڑائی کا اعلان یوم نجات تھا مجھے اس افسردگی سے چھٹکارا ملا جو میرے ایام جوانی کو پژمردہ کر رہی تھی مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی شرم نہیں ہوتی کہ میں اس وقت جذبات کی رو میں بہہ گیا میں نے گھٹنے ٹیک کر آسمان کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ مجھے اس زمانہ میں زندگی بسر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

آزادی کی جنگ اب شروع ہو چکی تھی اور اس پیمانہ پر شروع ہو چکی تھی جس کی مثال اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہ تھی جوں ہی قسمت نے اپنا کام شروع کیا اسی وقت سے بچہ بچہ کو یقین ہو گیا کہ اب آسٹریا اور سربیا کے مستقبل کا سوال نہیں بلکہ جرمن قوم کا وجود داؤ پر لگ چکا ہے۔

مدتوں آنکھیں بند رکھنے کے بعد اب قوم کو آئے ہوئے واقعات صاف دکھائی دینے لگے یہی وجہ تھی کہ جب یہ زبردست معرکہ شروع ہوا تو پہلے تو فوری جوش کا مظاہرہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی قوم کو احساس ہوا کہ غصہ کے ابال سے کام نہ چلے گا۔ جلد ہی جوش نے ذرا ٹھنڈے ہو کر ایک مستقل اور پختہ عزم کی صورت اختیار کر لی حالات کی نزاکت سمجھنا نہایت ضروری تھا عوام کو ابھی کچھ علم نہ تھا کہ جنگ کتنا طول کھینچے گی عام خیال تھا کہ اگر عکس سے پہلے پہلے سپاہی گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے اور مزے سے اپنا روز کا کام شروع کر دیں گے امن کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا۔

جنگ نسبی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے موقع ہے

انسان جو چاہتا ہے اسی کی توقع رکھتا ہے اور اسی کا معتقد ہوتا ہے لوگوں کی غالب اکثریت ایک عرصہ سے سیاسی مسائل کے عدم تعین اور ہر روز کی تشویش سے تنگ آ چکی تھی یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی آسٹریا اور سربیا کی جنگ ملتوی ہونے کا امکان تسلیم نہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ بھی عام خیال تھا کہ جلد ہی دنگل کا نتیجہ برآمد ہو جائے گا میں بھی لاکھوں مخلوق کے ساتھ یہی آرزو رکھتا تھا۔

جوں ہی سراجیو کے حادثہ کی اطلاع میونچ پہنچی میرے ذہن میں دو خیالات آئے ایک تو یہ کہ جنگ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں دوسرے یہ کہ ہیز برگ حکومت اپنے معاہدہ کی پابندی پر مجبور ہو جائے گی مجھے خوف ہوا کرتا تھا کہ کہیں اس معاہدہ کی وجہ سے جرمنی خود کسی ایسے جھگڑے میں نہ پھنس جائے جس کا آسٹریا سے براہ راست واسطہ نہ ہو ایسی صورت میں مجھے ڈر تھا کہ آسٹرین حکومت اپنے داخلی سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے حلیف کی امداد سے معذوری نہ ظاہر کر دے۔ لیکن اب ایسا کوئی خدشہ نہ تھا یہ بڑھیا سلطنت لڑنے پر مجبور تھی چاہے اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔

جنگ کے متعلق میرا اپنا زاویہ نگاہ بھی بالکل واضح تھا مجھے یقین تھا کہ یہ خالی سربیا سے آسٹریا کے مطالبات تسلیم کروانے ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ خود جرمنی اور جرمن قوم کی حیات و ممات، اس کی آزادی اور مستقبل، اس کی ہستی برقرار رکھنے کا سوال ہے بسمارک نے جس کام کی ابتداء کی تھی وہ ہر قیمت پر جاری رہنا چاہیے ہمارے آباؤ اجداد نے ویسن برگ، سیڈان، اور پیرس کے معرکوں میں داد شجاعت دیتے ہوئے جس خون کی قربانی دی تھی آج جرمن نوجوانوں نے ثابت کرنا تھا کہ ہماری رگوں میں بھی وہی خون کھول رہا ہے اگر ہم نے یہ جنگ جیت لی تو ہماری قوم دنیا کی بڑی قوموں میں سب سے آگے ہو گی۔ پھر وہ وقت بھی ہو گا جب جرمن سلطنت اپنے بچوں کے منہ سے ٹکڑا چھینے بغیر امن عالم کا محافظ بننے کا دم بھر سکے گی۔

جنگ حق و باطل کی پل صراط ہے

بچپن اور جوانی سے مجھے اکثر تمنا رہی تھی کہ موقعہ ملے تو ثابت کروں کہ میرا قومی جوش خالی ڈینگ ہی نہیں۔ بسا اوقات مجھے نعرے لگانا گناہ محسوس ہوتا تھا گو میں اپنے اس احساس کے لیے دلیل نہ دے سکتا تھا نعرہ لگانے والے کو تب تک نعرہ لگانے کا حق نہیں پہنچتا جب تک وہ حق و باطل کی پل صراط پر اپنا حق نہ ثابت کر لے۔ جہاں سوانگ بھرنے والوں کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور جہاں قسمت کی دیوی قوموں اور شخصیتوں کے خلوص کی بے رعایت آزمائش کرتی ہے لاکھوں جرمن نوجوانوں کے ساتھ جب مجھے اس پل صراط کی طرف اجازت ملی تو میرا دل مسرت سے اُمڈ آیا میں نے جرمنی کا قومی ترانہ اور قومی نعرہ بارہا اپنی زبان سے ادا کیا تھا اب مجھے یہ ترانہ گانے اور نعرہ لگانے کا حق ثابت کرنے والے امتحان میں شمولیت کا موقعہ ملا تو میں نے محسوس کیا کہ میں قبل از وقت اپنے حقوق استعمال کرنے کا گناہ بھی ادا کر رہا ہوں۔

یہ مجھے شروع سے ہی معلوم تھا کہ جنگ میں شامل ہونا ہے تو کتابوں کو طلاق دینا ہوگا اب میری جگہ وہاں تھی جہاں میرے ضمیر کی آواز نے مجھے طلب کیا تھا۔

جنگ اقوام عالم کا شجاعانہ دنگل ہے

آسٹریا سے میری ہجرت زیادہ تر سیاسی وجوہات کی بنا پر تھی۔ اب جنگ چھڑ گئی تو مجھے اپنے سیاسی عقائد کے منطقی نتائج پر عمل کرنے کا موقعہ مل گیا میں ہیبز برگ شہنشاہیت کے لیے لڑنے سے منکر تھا لیکن میں اپنی جرمن نسل اور جرمن سلطنت کے لیے جان تک دینے پر آمادہ تھا۔

3 اگست 1914ء کو میں نے ملک معظم لجوگ ثالث شاہ بویریا کی خدمت میں ایک ضروری درخواست پیش کی کہ مجھے بویریا کی ایک رجمنٹ میں بھرتی ہونے کا موقعہ دیا جائے ان دنوں محکمہ وزارت ایسی پیش کشوں کے طومار تلے دبا ہوا تھا۔ اس لیے جب اگلے روز مجھے جواب ملا کہ میری عرض منظور ہوگئی ہے تو میں اور بھی خوش ہوا میں نے

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ الفاظ میری اس وقت کی مسرت بیان نہیں کر سکتے جب میں نے پڑھا کہ مجھے ایک بویرین رجمنٹ میں طلب کیا گیا ہے چند ہی روز میں وہ وردی میرے زیب تن تھی جو پھر چھ برس تک اتارنے کی نوبت نہ آئی تھی۔

اب میری زندگی کا وہ دور شروع ہوا جو ہر جرمن کی طرح میرے لیے سب سے زیادہ قابل یادگار ہے اس زبردست کشمکش کے تقاضوں نے ماضی کی ہر یاد ہمارے ذہن سے محو کر دی۔ آج اس زمانہ کو دس سال گذر چکے ہیں پھر بھی جب میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں تو دل ایک مست کر دینے والے فخر سے لبریز ہو جاتا ہے مجھے جنگ کے وہ ابتدائی ہفتے یاد آ جاتے ہیں جب اقوام عالم کے شجاعانہ جنگ میں مجھے بھی حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

گولیوں کی سرسراہٹ اور توپوں کی گرج

جب وہ نظارے یاد آتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے گویا ابھی کل کی بات ہے جب کبھی میں اپنے آپ کو اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، کبھی ایسی ہی کوئی اور یاد من میں چٹکیاں لیتی ہے آخر وہ دن بھی آ پہنچتا ہے جب ہمیں محاذ جنگ پر روانہ ہونا تھا۔

ان دنوں اکثر جرمن سپاہیوں کی طرح مجھے ایک ہی فکر لاحق تھی وہ یہ کہ کہیں ہمارے محاذ جنگ پر پہنچنے سے پہلے ہی جنگ ختم نہ ہو جائے بار بار مجھے یہی خیال ستاتا تھا فتح کا ہر اعلان تلخی کا ایک اثر چھوڑ جاتا تھا جب مزید فتوحات کی خبر آتی تو یہ تلخی اور شدید ہو جاتی۔

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب مجھے میونخ سے محاذ جنگ پر جانا تھا میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دریائے رائن دیکھا۔ ہم مغرب کے رخ سفر کر رہے تھے اس تاریخی جرمن دریا کے سامنے ہمیں اپنے روائتی دشمن کا مقابلہ کرنا تھا جب سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور تاریخی یادگاریں نظر پڑیں تو ساری فوج نے ایک آواز ہو کر گانا شروع کیا ع رائن دریا کے پار چلو مجھے اس وقت ایسے محسوس ہوا گویا میری روح تن میں سما نہیں سکتی۔

اگلی رات کی خنکی اور ہلکی بارش کا نظارہ ہم نے فلائنڈرز میں دیکھا رات کے سناٹے میں ہم مارچ کرتے رہے صبح کی روشنی کے ساتھ ہی آہنی گولوں کی ایک خوش آمدید نے ہمارا استقبال کیا گولے ہمارے مابین پھٹتے تھے اور پرنم زمین میں دھنس جاتے تھے ابھی گولے کا دھما کہ ختم نہ ہوا تھا کہ دوسو زبانوں نے ہمنوا ہو کر موت کے اس پہلے پیغام کی خوشی میں نعرہ لگایا اس کے بعد گولیوں کی سرسراہٹ اور توپوں کی گرج کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کے گانے کی آوازیں آنے لگیں ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے ہماری رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی آخر ہم وہاں پہنچے جہاں قریب ہی جنگ ہو رہی تھی کھیت اور شلغم اور چقندر کی کیاریاں ہمارے پیچھے رہ گئی تھیں۔ دور سے ایک گیت کی لے سنائی دی ایک پلٹ کے ساتھ دوسری پلٹن ہمنوا ہوتی جا رہی تھی ملک الموت نے اپنا کام شروع کیا تو ہم نے بھی جرمنی کا قومی ترانہ گانا شروع کر دیا۔ ہم سے سن کر یہی گیت ہمارے پاس والوں نے بھی گانا شروع کر دیا اور یوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

جنگ دلیری اور بزدلی کی کشمکش کا نام ہے

چار دن خندقوں میں بسر کر کے ہم واپس لوٹے ہمارے قدم تک اب بدل چکے تھے سترہ سترہ سال کے لڑکے عمر رسیدہ سپاہی دکھائی دیتے تھے میری رجمنٹ کا نام لسٹ رجمنٹ تھا اس رجمنٹ کو پوری فوجی تربیت نہ ملی تھی لیکن اس کے سپاہی تجربہ کار مردان میدان کی طرح جان دینا جانتے تھے۔

یہ تو ابھی ابتداء تھی اسی حال میں سال کے بعد سال گزرنا شروع ہوا جنگجوئی کی خواہش کی جگہ خوف نے لینی شروع کی آہستہ آہستہ شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہر وقت کے موت کے خطرہ نے منچلے پن کی جگہ ڈر پیدا کرنا شروع کر دیا ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہم میں سے ہر ایک کے اندر حفظ جان اور ادائیگی فرض کی خواہشات میں کشمکش ہو رہی تھی مجھے اس اضطراب کا بھی تجربہ ہوا جب موت چاروں جانب اپنا شکار بے رحمی سے تلاش کرتی

دکھائی پڑتی تو تن ناتواں کے اندر ایک گمنام شے بغاوت کر کے اٹھتی اور عقل کے نام سے اپنا تعارف کرواتی لیکن یہ دراصل خوف تھا جو بھیس بدل کر انسان کو ورغلانا چاہتا تھا محتاط رہنے کی یہ خواہش جتنی سرگرم، واضح اور دلنشین ہوتی جاتی اتنے ہی زور سے اس کا مقابلہ کیا جاتا۔ حتیٰ کہ یہ اندرونی کشمکش ختم ہوئی اور فرض کی پکار نے فتح پائی میں 1915-16 کے موسم سرما میں اس اندرونی اضطراب سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ قوت ارادی نے ثابت کر دیا کہ اس کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ میں شروع میں ہنستے کھیلتے لڑنے جاتا تھا اب خاموشی اور عزم بالجزم میری عادات میں داخل ہو چکے تھے دل کی یہ حالت اب مستقل تھی قسمت نے اب میرا آخری امتحان لیا اور میں بقائی ہوش و حواس کامیاب نکلا۔ نوجوان رضاکار اب تجربہ کار سپاہی بن چکا تھا۔

ایک فوجی سپاہی بکبکاروں کی اسمبلی کے مسخروں سے بہتر ہوتا ہے

یہ تبدیلی ساری فوج میں ہر جوان پر اپنا اثر کر چکی تھی ہر وقت بر سر جنگ رہنے سے نوجوان بھی عمر رسیدہ نظر آنے لگے تھے ان کے جسم جفاکش اور دل سخت ہو گئے تھے اب وہ ہر قسم کی آزمائش میں استقلال اور پائمردی سے جمے رہتے تھے۔

اس فوج کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اب اڑھائی سال کی مسلسل جنگ کے بعد ہی لگایا جا سکتا تھا ایک لڑائی کے بعد پھر دوسری لڑائی اپنے سے زیادہ تعداد اور بہتر اسلحہ والے دشمن کے مقابلہ میں جمے رہنا بھوک اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنا یہ تمام امتحانات اس لاثانی فوج کے راستہ میں آئے لیکن وہ ہر مرحلہ پر کامیابی سے آگے بڑھتی گئی۔

جنگ عظیم میں جرمن فوج کی دلیری کی داستانیں آئندہ ایک ہزار سال تک تاریخ کے لیے مایہ ناز رہیں گی ماضی کے دھندلکے میں بھی ان فولادی خود پوش قطاروں کی تصویر روشن اور نمایاں رہے گی جو کبھی پیچھے نہ ہٹتے تھے اور جن کے قدم کبھی لغزش نہ کھاتے تھے جب تک جرمن نسل زندہ ہے اپنے ان آباؤ اجداد کی یاد ہمارے لیے سرمایہ

فخر و سر بلندی رہے گی۔

میں تب ایک سپاہی تھا اور سیاسیات میں دخل دینا میرا کام نہ تھا۔ اس کے لیے ابھی وقت بھی سازگار نہ تھا میرا آج بھی عقیدہ ہے کہ ان دنوں کسی فوجی اصطبل میں خادم کے طور پر کام کرنا اسمبلی کا ممبر بننے کی نسبت قوم کی بہتر خدمت سر انجام دینا تھا یوں تو میں ان اسمبلی کے مسخروں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن اس امتحان کے وقت میں جب ہر شریف انسان یا تو دشمن کے مقابلہ میں مصروف تھا اور یا خاموش کوئی اور فرض ادا کر رہا تھا میں ان بیکاروں کا وجود ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا مجھے ان سیاسی مکوڑوں سے سخت گھن تھی اگر میرا بس چلتا تو میں ان سب کی ایک بیگار پلٹن بنا دیتا۔ جہاں یہ دل بھر کر شور مچاتے رہتے لیکن شرفاء کی زندگیاں تنگ نہ کر سکتے۔

ان دنوں مجھے سیاسیات کی پروا نہ تھی لیکن بعض مسائل ایسے تھے جن کا اثر نہ صرف ساری قوم پر پڑ رہا تھا بلکہ سپاہی بھی ان کے نتائج سے محفوظ نہ تھے ان مسائل پر میں اپنی رائے قائم کرنے سے باز نہ رہ سکتا دو باتیں ایسی تھیں جن سے مجھے سخت نفرت رہا کرتی تھی اور جن کو میں اپنے قومی مفاد کے لیے مضر خیال کرتا تھا۔

”قلم کے سرکنڈے پر پھدکنے والے بازیگر“

فتوحات کا پہلا دور ختم ہوا تو ہمارے اخبارات میں سے بعض آہستہ آہستہ عوام کا جوش ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں کرنے لگے شروع شروع میں کئی لوگوں کو اس کا احساس تک نہ ہوا یہ شرارت ہمدردی، ہوا خواہی اور تشویش کے پردے میں پھیلائی جاتی تھی عوام کو بتایا جاتا کہ فتوحات کی خوشیاں زیادہ اہتمام سے منانا قبل از وقت ہے ایک زبردست قوم کو ایسے چھچھورے پن سے باز رہنا چاہیے جرمن سپاہیوں کا استقلال اور بہادری تو مسلمہ امور ہیں ان پر خوشیاں منانا چہ معنی؟ علاوہ ازیں دنیا کی رائے عامہ فتح کے ان جشنوں کی خبریں سنے گی تو کیا کہے گی؟ کیا وحشیانہ خوشیاں منانے سے دنیا کی رائے عامہ ہم سے متنفر نہ ہو جائے گی؟ برعکس اس کے ہم نے متانت کا مظاہرہ کیا تو

اسے ضرور پسند کیا جائے گا۔ یہ اخبار کہتے جنگ ہرگز جرمنوں نے شروع نہیں کی تھی اور اب ہم اقوام عالم کے مابین امن قائم کرنے پر رضامندی ظاہر کریں تو اس میں شرم کی کوئی بات نہیں اندریں حالات فوج کے بہادرانہ کارناموں کو نامناسب خوشی کے اظہار سے ملوث کرنا ہرگز قرین مصلحت نہیں۔ باقی کی دنیا اس طرح ہم سے بدگمان ہو جائے گی جب کوئی فاتح انکسار اور خاموشی سے اپنی کامیابی بھول کر مضے امامضے اپرعمل کرتا ہے تو اس کی بڑی قدر ہوتی ہے ان کی تنبیہہ کا لب لباب یہی ہوتا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ان خر دماغوں کو ان کے لمبے کانوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کسی خندق میں لے جاتے اور پھانسی کے پھندے سے ان کی ناپاک زندگیاں ختم کر دیتے تاکہ قوم کے فاتحانہ جوش و خروش میں ان قلم کے سرکنڈے پر پھدکنے والے بازیگروں کے جادو سے کوئی منحوس خلل نہ پڑتا۔ لیکن ہوا یہ کہ سارے اخبارات ''نامناسب'' اور ''غیر سنجیدہ'' انداز سے فتح کی خوشیاں منانے کے خلاف لکھنے لگے۔

بعض دیوانگیاں فرزانگی سے اچھی ہوتی ہیں

کسی کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ جب عوام کا جوش ایک مرتبہ ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر ضرورت محسوس ہرنے پر اسے کسی جتن سے نہیں بھڑکایا جا سکتا۔ عوام کا جوش تو ایک دیوانگی ہے اور اسے جنون کی حالت میں ہی زندہ رکھا جا سکتا ہے اگر یہ جنون نہ ہو تو جنگ کی وہ سختیاں جو عام حالات میں انسانوں کا کچومر نکال دیں قوم کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟

مجھے عوام کی ذہنیت سے بخوبی واقفیت تھی میں جانتا ہوں کہ عوام کو سرگرم عمل رکھنے کے لیے جس جوش کی ضرورت ہے وہ ''فراخدلی'' اور ''نفاست پسندی'' سے پیدا نہیں کیا جا سکتا مجھے تو یہی غلط نظر آتا تھا کہ عوام کا جنون اور بھڑکانے کی تدبیریں کیوں اختیار نہیں کی جاتیں پھر یہ عوام کا جوش حد اعتدال پر لانے کی حکمت میری سمجھ میں کیسے آ سکتی تھی۔

دوسری بات جس سے مجھے چڑ تھی وہ یہ تھی کہ اشتراکیت کو برداشت کیا جا رہا تھا اور اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ کیا جاتا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ قوم کو اشتراکی دباؤ کی اصلیت کا علم ہی نہیں۔ لوگ اس مغالطہ میں گرفتار تھے کہ جنگ کے دوران میں جماعتی رقابتیں ملتوی کرنے سے اشتراکیت بھی سچ مچ نرم اور معتدل ہوگئی ہے۔

''علمائے کرام'' کی ذہنی پینک

یہاں جماعت کا کیا سوال تھا یہاں تو عقیدہ اور اصول ہی مختلف تھا اس عقیدہ کی تصنیف ہی انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے ہوئی تھی اشتراکیت کے ضرر سے اس لاعلمی کا سبب یہ تھا کہ ہماری یہودیوں سے پر یونیورسٹیوں میں مسئلہ کا یہ پہلو چھیڑا ہی نہ جاتا تھا رہے ہمارے سرکاری دفاتر کے افسر تو ان کا خیال تھا کہ جو مضمون یونیورسٹی کے نصاب میں شامل نہ ہو اس کا مطالعہ ہی بیکار ہے۔ انقلاب کی یہ زبردست رو ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ہلاکت خیز سیلاب کی شکل اختیار کر رہی تھی لیکن ہمارے علماء اپنی پینک سے چونکنے میں ہی نہ آتے تھے یہی وجہ ہے کہ سرکاری کام ہمیشہ شخصی کام سے پیچھے رہ جاتے ہیں ان فضلائے کرام کا تو اصول ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل جو شئے ہم دیکھتے ہی نہیں وہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہے اگست 1914ء میں خیال کیا جاتا تھا کہ جرمن مزدور مارکس ازم کی نوعیت کی اشتراکیت کے پیرو ہیں یہ قطعاً غلط تھا جب مصیبت کا وقت آیا تو جرمن مزدور نے ایک جھٹکے سے اپنے تئیں مارکس ازم کے زہریلے چنگل سے رہا کر لیا ایسا نہ ہوتا تو جرمن مزدور کبھی اس رضامندی سے جنگ میں شریک نہ ہوتے اب اپنی حماقت سے یہ سمجھا جانے لگا کہ مارکس ازم ہی قومیت پرستی کی شکل اختیار کر چکا ہے اس مثال سے واضح ہے کہ ہمارے حکام نے کبھی مارکس کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرنے کی تکلیف ہی نہ فرمائی تھی اگر انہوں نے ایسا مطالعہ کیا ہوتا تو کبھی ان سے یوں فاش غلطیاں سرزد نہ ہوتیں۔

مزدوروں کو مارکس ازم سے بچایا جا سکتا ہے

مارکس ازم کا منتہائے مقصود ہمیشہ سے تمام غیر یہودی سلطنتوں کی تباہی اور بربادی رہا ہے۔ اس کے منتہائے مقصود ہمیشہ یہی رہے گا مارکس ازم نے عرصہ سے جرمن مزدوروں میں اپنی عیاری کا جال پھیلا رکھا تھا لیکن جولائی 1914ء میں جرمن مزدور یہ تمام ایندھن توڑ کر وطن کے لیے کمر بستہ ہو گئے یہ سب کچھ مارکس ازم کی آنکھوں کے سامنے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ رو پذیر ہو گیا چند ہی دنوں میں قومی غداری کا یہ جادو دھواں بن کر اڑ گیا اور یہودی سازشیوں نے دیکھا کہ وہ اکیلے رہ گئے ہیں ان کے پیرو ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے چھ سال سے جرمن قوم جس حماقت اور پاگل پن کے تانے بانے میں جکڑی ہوئی تھی وہ یکلخت ہی ٹوٹ گیا۔ جرمن مزدوروں کو ورغلانے والوں کے لیے یہ ایک نہایت ہی منحوس دن تھا لیکن جوں ہی مکار اور سازشی یہودی لیڈروں کو خطرہ کا احساس ہوا انہوں نے منافقت اور دھوکہ کی ٹوپی اوڑھ کر، بغیر کسی کے پچھانے قوم کی بیداری کی تحریک میں حصہ لینے کا سوانگ بھر لیا۔

یہ وقت تھا کہ یہودیوں کی اس تمام منڈلی کے خلاف قدم اٹھایا جاتا جو وباء کے جراثیم کی طرح قومی زندگی میں اثر کر رہے تھے یہ قدم نتائج سے لاپرواہو کر اٹھنا چاہیے تھا کسی آہ و زاری یا گڑگڑانے کو مطلق خیال بھی نہ لانا تھا اگست 1914ء میں جرمن مزدوروں نے دیکھ لیا کہ بین الاقوامی اتحاد کے چرچے سراسر بے بنیاد اور جھوٹی بکواس ہے۔ چند ہی روز بعد ان کے کانوں نے اتحاد کے ان لایعنی نغموں کی بجائے امریکنوں کے بنائے ہوئے بم اپنے سروں پر پھٹتے سنے۔ یہ تھے بین الاقوامی اتحاد کے تحفے اب جب کہ جرمن مزدور قومیت کے راستہ پر لوٹ کر آرہا تھا اگر حکومت کو عوام کا کچھ بھی درد ہوتا تو اسے چاہیے تھا کہ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی جذبہ کی مخالفت کرنے والی ہر طاقت کو بے رحمی سے ختم کر دیتی۔

قوم کے انمول لال جب محاذ جنگ پر گردنیں کٹا رہے تھے تو کیا گھر والوں کو یہ طاعونی چاہے ختم کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے **ملک معظم**

حضور قیصر جرمنی نے ان پیدائشی مجرموں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور یوں انہیں موقع بہم پہنچایا کہ اپنے کھوئے ہوئے اوسان پھر قائم کر لیں۔

اس طرح ان سانپ کے بچوں نے پھر اپنا زہر پھیلانا شروع کیا اب وہ اپنا کام زیادہ احتیاط لیکن ساتھ ہی بڑھی ہوئی تباہ کاری سے کرتے تھے نیک نیت جرمن ان سے ملاپ کے خواب لے رہے تھے اور یہ عادی مجرم انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔

تذبذب شکست کا پیش خیمہ ہے

میں طبعاً حکومت کی مذبذبانہ روش سے مطمئن نہ تھا لیکن یہ تو مجھے کبھی خیال نہ تھا کہ اس غفلت کے نتائج اتنے ہولناک ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا بھی کیا جا سکتا تھا کیا بڑے بڑے لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا جاتا۔ باقیوں پر مقدمات چلائے جاتے اور یوں قوم کو ان سے نجات دلائی جاتی۔ شرارت کا خاتمہ کرنے کے لیے پوری سختی سے فوجی انتظامات کئے جاتے تمام سیاسی جماعت بندیاں ختم کر دی جاتیں جرمن پارلیمنٹ کو ضرورت ہوتی، تو بنوک سنگین سیدھی راہ پر لایا جاتا اگر پارلیمنٹ کو فی الفور ختم ہی کر دیا جاتا اور بھی اچھا ہوتا۔ جس طرح آج کل کی جمہوری حکومت جب ضرورت محسوس کرتی ہے تو سیاسی جماعتیں ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان دنوں بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ قوم کا وجود معرض خطر میں ہے اگر ایسے ہی اقدامات کیے جاتے تو ان کے لیے پوری وجہ جواز تھی ان تجاویز کو سن کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خیالات بھی کبھی ہتھیاروں سے ختم کیے جا سکتے ہیں کیا کسی ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کو جسمانی قوت سے جھٹلایا جا سکتا ہے؟

ان دنوں میں اس سوال میں بار بار ہر پہلو سے غور کیا کرتا تھا میں نے تاریخ سے ہجو قسم مثالوں کا مطالعہ کیا ایسی مثالیں جو مذہبی اختلافات سے پیدا ہوئی تھیں انہیں میں نے اور بھی غور سے جانچا آخر کار میں حسب ذیل بنیادی نتیجہ پر پہنچا۔

اعتقادات کو محض تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا

خیالات اور فلسفیانہ عقائد کے ایسے نظام جن کی بنیاد روحانیت پر استوار کی گئی ہو چاہے سچے ہوں چاہے جھوٹے، ایک درجہ تک نشوونما پا جائیں تو پھر انہیں محض جسمانی قوت سے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایک شرط پر ایسا کیا جا سکتا ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ غالب قوت کے استعمال کے ساتھ ہی ایک ایسا ہمہ گیر فلسفہ اور ضابطہ حیات بھی سامنے ہو جس میں ایک تازہ زندگی بھڑک رہی ہو۔

روحانی تصور پر مبنی اخلاقی قوت کی امداد کے بغیر محض جسمانی طاقت کے استعمال سے کبھی کسی عقیدہ یا اس کی تبلیغ کو نہیں روکا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ جسمانی طاقت اتنی زبردست اور مستعد ہو کہ یہ خاص عقیدہ رکھنے والے ایک ایک شخص کو چن چن کر مار ڈالے اور ان کی روایات کا بھی خاتمہ کر دے۔ بالعموم جو سلطنت ایسا رویہ اختیار کرتی ہے اسے عارضی طور پر یا مستقل طور پر سیاسی لحاظ سے قابل ذکر سلطنتیں اپنی برادری سے خارج کر دیتی ہیں علاوہ ازیں قتل عام کا یہ جلادانہ طریقہ خود اس ظالم سلطنت کی رعایا کے انصاف پسند طبقات کو بھی بغاوت پر آمادہ کر دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جس سختی کا کوئی روحانی مقصد نہ ہو وہ اخلاقی طور پر قابل اعتراض ہے اور تمام خلقت کے انصاف پسند طبقات ہمیشہ اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ جو عقائد غیر منصفانہ طور پر مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے عوام ان کی جانب بھی روز بروز زیادہ مائل ہو جاتے ہیں کئی لوگ محض اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ وہ روحانی عقائد کا جسمانی طاقت سے کچلا جانا برداشت نہیں کر سکتے۔

یوں جوں جوں سختی بڑھتی ہے مظلوم عقائد کے پیروؤں کی تعداد بھی ترقی کرتی جاتی ہے غرض ایک عقیدہ کو ختم کرنا تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب قتل و غارت کا ایک وسیع اور منظم پروگرام بنایا جائے ایسا کرنے کا نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم یا سلطنت کے بہترین عناصر تباہ ہو جاتے ہیں اس خونریزی کا انتقام قدرت یوں لیتی ہے کہ ایسے کلی داخلی قتل عام کے ساتھ ہی قوم کی طاقت بھی ختم ہو جاتی ہے پھر اگر مظلوم عقیدہ چند لوگوں تک محدود نہیں تو سمجھ

لیجئے کہ یہ طریقہ کارنا کام رہنے کی پیشین گوئی شروع میں ہی کی جاسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پھلنے پھولنے والی ہر مخلوق کی طرح عقائد کا خاتمہ بھی ان کے نشوونما کے ابتدائی مدارج میں ہی ممکن ہے جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس کی قوت مدافعت بھی بڑھتی جاتی ہے حتی کہ ایک عقیدہ کی عمر پوری ہو چکتی ہے تو نئے عقیدے اس کی جگہ لے لیتے ہیں ان نئے عقیدوں کی تہ میں بھی دراصل وہی پرانا عقیدہ ہوتا ہے جو اب کسی اور غرض سے نئے روپ میں جنم لیتا ہے۔

تشدد تبھی کارگر ہوتا ہے جب اس کی پشت پر کوئی عقیدہ ہو

نتیجہ یہ کہ کسی عقیدہ پر روحانی بنیاد کے بغیر حملہ کر کے اسے ختم کرنے یا اس کے نظام کو مٹانے کی کوشش بالعموم مقصد کے بالکل الٹ اثر کرتی ہے اس کی وجہ حسب ذیل ہے:

اگر کسی عقیدہ کے رواج کو تشدد سے روکنا ہے تو تشدد مستقل اور منظم ہونا لازمی ہے بغیر استقلال اور تنظیم کے اس طریقہ کار سے کام نہ چلے گا۔ اگر تشدد میں تذبذب شامل ہو گیا کچھ عرصہ رواداری سے کام لیا اور پھر تشدد استعمال کرنے لگے تو یوں نہ صرف جس عقیدہ کے خلاف کوشش جاری ہے اسے سنبھلنے کا موقعہ مل جائے گا بلکہ جور و استبداد کے ہر دور کے بعد وہ لوگ اس عقیدہ کو اختیار کرتے جائیں گے جنہیں یہ ظلم وستم ناگوار محسوس ہو رہا ہے عقیدہ کے قدیم پیرو اپنے سینے میں زیادہ تلخی محسوس کریں گے اور یوں اپنی عقیدت میں زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے غرض تشدد استعمال کیا جائے گا تو کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ مسلسل تشدد جاری رہے۔ یہ تسلسل تبھی ممکن ہے جب تشدد کی پشت پر روحانی اعتقاد کام کر رہا ہو ہر وہ تشدد جس کی بنا روحانی اعتقاد پر نہ ہو ہمیشہ مذبذب اور غیر یقینی رہتا ہے ایسا تشدد پائدار نہیں ہوتا پائدار تشدد انہیں لوگوں کا حصہ ہے جو کسی ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کے دل سے معتقد ہوں جو تشدد ان شرائط سے عاری ہو وہ محض افراد کی شخصیت اور قابلیت پر منحصر ہوتا ہے اس لیے اس میں تسلسل نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے ہر ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ، چاہے وہ مذہبی

ہو چا ہے سیاسی، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ سیاست اور مذہب کے ڈانڈے کہاں جدا ہوتے ہیں، اپنے مخالف عقائد کی تباہی سے زیادہ خود اپنے عقائد کی ترفیع کے لیے برسر کار رہتا ہے یوں عقائد کی جنگ میں بھی مدافعانہ پہلو اختیار کرنے کے بجائے جارحانہ انداز سے لڑی جائے تو زیادہ کامیابی ہوتی ہے جارحانہ جدوجہد میں منزل مقصود ہمیشہ سامنے رہتی ہے برعکس اس کے محض مخالف عقائد کو ختم کرنے کی کوشش میں یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ منزل مقصود کہاں ہے اور کیسے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ جارحانہ اقدام کا قائل ہو اس کا پروگرام بھی زیادہ واضح ہوتا ہے اور اس کا طریق کار بھی زیادہ قوی اور فیصلہ کن ہوتا ہے برعکس اس کے مدافعانہ ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کا نہ پروگرام واضح ہوتا ہے اور نہ اس کا طریق کار اتنا قوی اور فیصل کن تشدد سے روحانیت کے کسی عقیدے کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش صرف اسی حالت میں مدافعانہ ہوتی ہے جب تشدد کرنے والے خود ایک جدید روحانی عقیدہ کے مبلغ اور علمبردار نہ ہوں۔

ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ کسی ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کو تشدد سے مٹانے کی ہر وہ کوشش ناکام رہے گی جس میں تشدد کا استعمال ایک بالکل نئے ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کو نافذ کرنے کے لیے نہ ہو جب اصل جنگ دو ضوابط حیات اور دو ہمہ گیر فلسفوں میں ہو تو تب اور صرف تب، فتح اس فریق کی ہوتی ہے جو مستقل بغیر کسی رعائت کے، اور غالب، تشدد استعمال کر سکے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو مارکس ازم کے خلاف جدوجہد میں آج تک نظر انداز کیا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اشتراکیت کے خلاف بسمارک کے بنائے ہوئے قوانین ناکام رہے۔ چاہے کچھ ہوتا ان قوانین کی ناکامی تو خود ان کی نوعیت میں مقدر تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان قوانین کے پس پشت کوئی ایسا ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ نہ تھا جس کی ترویج کے لیے یہ قوانین کام آتے یہ تو ایک طفلانہ وہم تھا کہ محض ''حکومت کے اختیارات'' یا''

قانون اور امن'' کا نام لے کر ایک موت وحیات کی جنگ لڑی جا سکتی ہے ایسی جنگ تو کسی روحانی عقیدے کے نام پر ہی لڑی جا سکتی ہے ان طفلانہ اوہام کا ارتکاب محض اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے والے احمقوں سے ہی ممکن تھا۔

چونکہ اشتراکیت کے خلاف قانون سازی کی اس مہم کی تہ میں کوئی روحانی عقیدہ کا م نہ کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بسمارک کو ان قوانین کا استعمال ان لوگوں کی مرضی پر چھوڑنا پڑا جو خود مارکس کی تعلیمات کی پیداوار تھے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس آہنی وزیراعظم نے اشتراکیت کے خلاف اپنی کوششوں کی باگ دوڑ کھاتے پیتے لوگوں کی بنائی ہوئی جمہوریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دی تو ہنسی آتی ہے گویا بکری کو گھاس کا محافظ مقرر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایسا ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ ہی موجود نہ تھا۔ جس کی بنیاد جد اہوتی اور جس کے مریدان صادق مارکس ازم کی جگہ اسے نافذ کرنے پر تلے ہوتے، تب اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا یوں اشتراکیت کے خلاف بسمارک کی مہم حسرت ناک طور پر ناکام رہ کر ختم ہوگئی۔

اعتقادی نزاع کا طبقاتی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں

بدقسمتی سے جنگ عظیم کی ابتدا اور اس کے دوران میں بھی حالات کچھ پہلے سے زیادہ مختلف نہ تھے۔

میں بار بار غور کرتا کہ حکومت وقت کو اشتراکی جمہوریت کی جانب اپنا رویہ بدلنا چاہیے کیونکہ مارکس ازم اسی فلسفہ کی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے ہر بار مجھے احساس ہوتا کہ اشتراکی جمہوریت کا فلسفہ ترک کیا جائے تو اس کی جگہ لینے کو دوسرا کوئی فلسفہ موجود ہی نہیں کوئی ایک تحریک بھی ایسی نظر نہ پڑتی تھی جس سے توقع کی جا سکتی کہ اشتراکی جمہوریت کا فلسفہ ترک کرنے کے بعد جو ہزارہا مزدور بغیر لیڈروں کے رہ جائیں گے انہیں کشش کر سکے۔ اور کامیابی سے اپنے دامن میں سمیٹ لے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک شخص جو ابھی ابھی بین الاقوامیت کا کٹر پیرو تھا۔ اور جس نے حال ہی میں اپنی طبقاتی

جماعت سے رشتہ توڑا ہے اب فی الفور کھاتے پیتے لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جائے یہ مختلف طبقاتی جماعتیں ٹھیک تو نہیں لیکن کھاتے پیتے لوگ مجلسی زندگی میں خود اس طبا قاتی فرق کو بڑی وقعت دیتے ہیں وہ اس فرق کو صرف انہیں حالات میں نظر انداز کرتے ہیں جب انہیں ایسا نہ کرنے سے کسی سیاسی نقصان کا اندیشہ ہو اگر وہ اس حقیقت کا انکار کریں تو اس کے معنی ہیں کہ وہ نکمے ہی نہیں کمینے بھی ہیں اندریں حالات کوئی مزدور کیسے اپنا طبقاتی امتیاز ترک کر کے ان کی طبقاتی سیاست کی حمایت کر سکتا ہے۔

بالعموم عوام کو احمق نہیں سمجھنا چاہیے وہ سادہ لوح ضرور ہیں لیکن احمق نہیں ہوتے سیاسیات میں تو بارہا ایسا ہوتا ہے کہ دماغی قابلیت کی نسبت جذباتی احساس، حقیقت حال کا بہتر اندازہ کر لیتا ہے اگر کوئی شخص عوام کے بین الاقوامی رجحانات سے ان کی جذباتی حس کو غلط ثابت کرنا چاہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امن پسند جمہوریت بھی تو حماقت کا کچھ تھوڑا ثبوت نہیں حالانکہ اس کے زیادہ تر حامی کھاتے پیتے لوگ ہیں جب تک ہر روز لاکھوں شہریوں کو ورغلانے کے لیے اشترا کی جمہوری اخبارات موجود ہیں، تب تک سرمایہ داروں کو مزدوروں پر اپنی عقلی فضیلت جتلانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کو ایک ہی اصطبل سے گھاس مہیا ہوتی ہے گو کھلانے کے برتن ضرور جدا ہیں۔ سائیس دونوں کا ایک ہی ہے یعنی یہودی۔

واقعات کو کبھی جھٹلانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے اگر چہ الیکشن کے موقعہ پر بڑے زور وشور سے طبقاتی اختلافات کا رشتہ عقائد کے مسائل کے ساتھ جوڑا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقات کی تفاوت کا عقائد پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ یہ درست ہے کہ ہماری قوم کا ایک غالب حصہ طبقاتی لحاظ سے گستاخ ہو چکا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری جانب محنت مشقت کرنے والے مزدوروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے باوجود اس کے ہمارے پڑھے لکھوں کی دانشمندی کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ

انہیں اب تک یہ احساس نہیں کہ جن اسباب سے مارکس ازم پھیل رہا ہے ان کی موجودگی میں کھاتے پیتے لوگوں کا وقار دوبارہ کیسے قائم ہو سکتا ہے۔

مزدور اور سرمایہ دار کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے

یہ کھاتے پیتے لوگوں کی جماعتیں جو خود اپنے آپ کو اس نام سے پکارنے میں فخر محسوس کرتی ہیں اب ہرگز کبھی مزدور عوام کو اپنی اطاعت پر آمادہ نہ کر سکیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مزدور اور سرمایہ دار کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ فرق کچھ تو قدرتی ہے اور کچھ مصنوعی۔ دونوں فریقوں کو ایک ہی لگن ہے اور یہ لگن ہے ایک دوسرے سے لڑنے کی اس لڑائی میں فتح اسی فریق کی ہو گی جو تازہ دم ہے یہ تازہ دم فریق ہے مارکس ازم۔

1914ء میں اشتراکی جمہوریت کے خلاف جدوجہد کی ابتدا کرنا ایک خاصی قابل عمل تجویز تھی لیکن اشتراکی جمہوریت کی جگہ لینے کو دوسرا کوئی نظام موجود نہ تھا اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ جدوجہد کتنا عرصہ جاری رکھنی ہو گی اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

جنگ سے کئی سال پیشتر سے میری یہی رائے تھی یہی وجہ تھی کہ میں اس وقت کی کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ ہوا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں میری یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی صاف نظر آ رہا تھا کہ یوں اشتراکی جمہوریت کا مقابلہ ناممکن ہے صحیح معنوں میں مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو خالی پارلیمنٹری پارٹی ہی نہ ہوتی ایسی کوئی تحریک اس وقت موجود نہ تھی۔

میں اس کمی کا ذکر اکثر اپنے بے تکلف ساتھیوں سے کیا کرتا تھا اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آئندہ سیاسیات میں کام کرنا چاہیے جیسا کہ میں پہلے بھی اپنے دوستوں کو کئی مرتبہ بتا چکا ہوں یہی سبب تھا جس نے جنگ کے بعد مجھے اپنے پیشے کے علاوہ پبلک میں کام کرنے پر آمادہ کیا مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ فیصلہ بڑی غور و فکر کے بعد کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ششم :: جنگ اور پراپیگنڈا

سیاسیات کی بنیاد پراپیگنڈا پر ہے

میں نے سیاسی واقعات کی رفتار کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ محسوس کیا کہ سیاسیات کی بنیادی پراپیگنڈے پر ہے میں نے یہ بھی دیکھا کہ کمیونسٹ اس حربہ کے ماہر کامل ہیں وہ اس سے کام بھی خوب لیتے ہیں غرض مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ پراپیگنڈا کا صحیح استعمال بجائے خود ایک مستقل فن ہے ہمارے کھاتے پیتے طبقات سے اٹھنے والی سیاسی پارٹیوں کو اس فن سے واجبی ہی واجبی آشنائی تھی صرف کرسچین سوشلسٹ پارٹی اس حربہ سے کچھ ٹھیک کام لیتی رہی بالخصوص لوئجر کی راہنمائی میں انہوں نے پراپیگنڈا کا صحیح استعمال کیا۔اس پارٹی کی کامیابی کا بڑا سبب یہی تھا۔

ہمیں دراصل جنگ عظیم کے دوران میں پتہ چلا کہ پراپیگنڈے کا جال ذرا ڈھب سے پھیلایا جائے تو کیا عظیم الشان نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں بدقسمتی سے اور سب معاملات کی طرح یہاں بھی دشمن ہم سے بازی لے گیا۔ہم نے اول تو پراپیگنڈے سے کام ہی نہ لیا اور جو لیا تو وہ نہ لینے سے بدتر تھا جرمنوں کا محکمہ اطلاعات بری طرح ناکام ثابت ہوا۔یہ ناکامی ہر جرمن سپاہی کے سامنے صاف عیاں تھی میں نے اسی ناکامی سے متاثر ہو کر پراپیگنڈے کے علم پر پوری توجہ اور ہر پہلو پر غور کرنے کی ٹھان لی مجھے تجربہ سے یہ فن سیکھنے کا بخوبی موقع ملا شومئ قسمت دیکھئے دشمن نے ہمیں اس کتاب سے وہ سبق پڑھایا جو کبھی فراموش نہ ہو گا۔دشمن اس قابلیت سے ہماری کوتاہی کا فائدہ اٹھاتا رہا کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے مخالفین نے اس موقع پر جس خوبی سے پراپیگنڈے کا جال پھیلایا میں نے اسے عبرت حاصل کرنے کے لیے بہترین مکتب تصور کیا بدنصیبی کے باعث ہمارے ملک کی ذی استعداد ہستیاں اس مکتب سے کوئی سبق

سیکھنے کو تیار نہ تھیں، وہ ایسی باتوں سے بالاتر تھے وہ ایسی طبع رسا کے مالک تھے کہ انہیں کسی استاد کی حاجت ہی نہ تھی کم از کم انہیں کچھ سیکھنے کی طلب صادق تو ہرگز نہ تھی۔

اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ کیا سرے سے ہمارا کچھ پراپیگنڈا ہوتا بھی تھا تو مجھے بصد افسوس نفی میں جواب دینے کے سوا چارہ نہ ہو گا۔ پراپیگنڈا کے نام پر جو کچھ کیا جاتا تھا وہ شروع سے ہی ایسا ناکافی اور بر خود غلط تھا کہ اس سے فائدہ کی نسبت نقصان زیادہ پہنچا۔ ہمارے پراپیگنڈے کا مواد ناکافی تھی۔ اس کی نفسیاتی بنیاد غلط تھی جرمن پراپیگنڈے کی جانچ پڑتال کرنے والا ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا ہماری قوم نے تو یہ ابتدائی سوال بھی قطعیت کے ساتھ طے نہ کیا تھا کہ پراپیگنڈہ بجائے خود کوئی مقصد ہے یا حصول مقصد کا ایک ذریعہ۔

پراپیگنڈا محض حصول مقصد کا ذریعہ ہے

پراپیگنڈا فقط حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کا اندازہ ہمیشہ ان مقاصد کی روشنی میں کرنا چاہیے جن کے حصول کے لیے یہ ذریعہ اختیار کیا جائے۔ پراپیگنڈا کا انتظام ایسا ہونا چاہیے جو حصول مقصد کے لیے کارگر ہو۔ یہ واضح ہے کہ خود مقاصد کی اہمیت قومی حالات کے پیش نظر سے بڑھتی رہتی ہے اس حالات میں نفس پراپیگنڈا کے لوازمات بھی اسی لحاظ سے بدلتے رہنے چاہئیں جنگ عظیم کے دوران میں ہم جس نصب العین کی خاطر میدان کارزار میں اترے وہ انسانیت کا بہترین اور بلند ترین نصب العین تھا ہم اپنے ملک کی حریت اور استقلال کی خاطر سر بکف تھے ہم نے مستقبل میں اپنی بہبودی اور خوشحالی کے تحفظ کی نیت سے تلوار اٹھائی تھی ہم اپنی قومی غیرت کی لاج رکھنے گھر سے نکلے تھے مخالف کچھ ہی کہیں، جرمنوں کی قومی آن کا بھی وجود ہے اگر نہیں تو ہمیں اس کا وجود قائم کرنا ہو گا جس قوم کی آن نہیں اس قوم کی حریت اور استقلال چند روز کے مہمان ہیں عدل برتر کا تقاضا ہے کہ بے غیرت نسلیں منصب آزادی سے محروم کر دی جائیں جو غلامی پر رضامند ہے وہ عزت کا سزاوار نہیں کیونکہ غلام بھی ذی عزت

ٹھہریں تو دنیا عزت سے نفور ہو جائے۔

صالح تصورات صالح امتوں کے وجود سے وابستہ ہیں

جرمنی بقائے نفس کی خاطر برسر پیکار تھا اس حالت میں جرمنی کے جنگی پراپیگنڈا کا مقصد جذبہ جہاد کا استحکام اور رغلبہ مجاہدین کا اہتمام ہونا چاہیے تھا جب قومیں زمین پر زندہ رہنے کی خاطر پنجہ آزما ہوں، جب زندگی اور موت کی ترازو ہچکولے کھا رہی ہوں تب انسانی رواداری اور حسن و قبح کی نازک تمیز میں فرصت ضائع کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے یہ خیالی بندشیں ہوا میں معلق نہیں۔ انہیں قائم کرنے کی خاطر خاک کے عاجز پتلے کا تخیل درکار ہے اگر انسان مٹ گیا تو اخلاق کس کے سہارے زندہ رہے گا تنہا فطرت تو برے بھلے کی تمیز سے عاری ہے یہ سعادت تو صرف چند ہی قوموں بلکہ نسلوں کے حصے میں آئی ہے صالح تصورات صالح امتوں کے دم قدم سے باقی ہیں اگر یہ امتیں روئے زمین سے محو ہو گئیں، تو حسن و خیر اور انسانیت بھی اپنے علمبرداروں کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ جائیں گے، بلند پایہ اصول، ان اصولوں کو وضع کرنے والی اور نافذ رکھنے والی نسلوں کی زندگی ہی سے وابستہ ہیں۔

جہاد کے اصولوں کو اخلاق کے اصولوں پر ترجیح حاصل ہے

جب کوئی قوم اپنی بقاء کے لئے جنگ میں مصروف ہو تو اس قسم کے اصول محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان اصولوں کی پیروی سے قوم کے جذبہ جہاد میں خلل پڑ رہا ہو تو فوراً اس کا تدارک کرنا چاہیے دوران جنگ میں کسی اصول کے جائز و ناجائز ہونے کی صرف ایک ہی کسوٹی ہے اور وہ یہ اس کی تقلید یا ترک سے جنگ میں کامیابی کہاں تک قریب ہو گی۔

جہاں تک ہمدردی انسان کے مسئلہ کا تعلق ہے میں مشہور جرمن جرنیل مولٹکے کے قول کا معتقد ہوں اس نے کہا تھا جنگ میں اولین فرض یہ ہے کہ اپنے حسب منشاء فیصلہ جلد از جلد حاصل کیا جائے سب سے بڑا ہمدرد انسانیت وہ ہے جو لڑائی میں شدید ترین

طریقے اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح جنگ جلد ختم ہو جاتی ہے جب ایسے استدلال کے مقابلہ میں لوگ حسن و قبح اور خیر و شر کے بلند بانگ و عادی کے تذکرہ چھیڑ بیٹھیں تو انہیں صرف ایک ہی جواب دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں کسی قوم کی کوشش برے بھلے کے امتیاز کی پابند نہیں کی جا سکتیں غلامی سے بدتر اور کوئی حالت نہیں یہ سب مانتے چلے آئے ہیں اور آئندہ بھی ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا کیا آج جرمنی جس ذلت میں گرفتار ہے اسے خانقاہ و مدرسہ کے فضول کائیں کائیں کرنے والے یہ منحوس کوے ''مستحق'' خیال کرتے ہیں؟ پھر جنگ میں فتح حاصل کرنے کی خاطر ان اصولوں کو توڑنا اچھا، یا اصولوں کی پیروی میں شکست کھا کر اس حالت کو پہنچنا بہتر؟ میں یہ سوال یہودیوں سے نہیں دریافت کر سکتا، کیونکہ وہ تو خود تہذیب و ثقافت کا یہ نچوڑ کشید کر کے ان کی خوشبو دنیا میں پھیلانے والے ذات شریف ہیں ان کا تو وجود ہی خلافت الٰہی کے جانشین بشریت پر رسوائی کا دھبہ ہے۔

ثابت ہوا کہ انسانیت حسن و خیر کے تصورات کو جنگ میں کچھ دخل نہیں اس لیے تصورات دوران جنگ میں پراپیگنڈا کو جانچنے کے لیے معیار بھی نہیں بن سکتے۔

شدید ترین ہتھیار بہترین ہتھیار ہوتے ہیں

دوران جنگ میں پراپیگنڈا خالی حصول مقصد کا ایک ذریعہ تھا یہ مقصد جرمن قوم کی بقائے نفس کے لیے جدوجہد میں کامیابی پر مشتمل تھا اس لیے پراپیگنڈا کے مفید یا غیر مفید ہونے کا معیار صرف یہی مقصد قرار پا سکتا تھا ایسے موقع پر شدید ترین ہتھیار انسانیت کے قرین ترین ہوتے ہیں ہاں ایک شرط ہے وہ یہ کہ ان ہتھیاروں کے استعمال سے فتح کی گھڑی قریب آنے کا یقین ہو آج کے دن وہی طریقہ کار ''بھلا'' بھی ہے اور ''سندر'' بھی جس سے قوم کی حریت اور وقار بچ جائے اس زندگی اور موت کی دوڑ میں جنگی پراپیگنڈا کا اہتمام صرف اسی روشنی میں ہونا چاہیے تھا۔

اگر مبینہ ارباب اقتدار کو متذکرہ صدر حقائق کی سمجھ ہوتی تو جنگی پراپیگنڈے کی شکل

یا استعمال کے متعلق انہیں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ وہ جنگی پراپیگنڈے کو بھی بطور ایک ہتھیار کے شکل دینے اور اسی طرح اس سے کام لیتے۔ جنگی پراپیگنڈا آخر ایک ہتھیار نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں جو اس کا استعمال جانتے ہوں یہ ان کے ہاتھ میں ایک خوفناک ترین حربہ ہے۔

دوسرا فیصلہ کن سوال یہ تھا کہ پراپیگنڈے کا روئے سخن پڑھے لکھے ذہین طبقات کی جانب ہونا چاہیے تھا یا ان طبقات کی طرف جو زیادہ ذہین نہیں؟

اشتہار دینے کے گر

پراپیگنڈے کا روئے سخن ہمیشہ عوام الناس کی کثرت کی جانب ہونا چاہیے ذہن طبقات یا جن طبقات کو آج کل ذہین کہا جاتا ہے پراپیگنڈے کے محتاج نہیں ان کے سامنے تو مسائل علم واستدلال کی روشنی میں پیش ہونے چاہئیں پراپیگنڈا علم واستدلال سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ ایک بازاری اشتہار فنون لطیفہ سے میرا یہ قول اشتہار کی ظاہری صورت سے متعلق تھا ورنہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اشتہار کی اس ظاہری صورت کی تیاری کے لیے بھی علم واستدلال درکار ہے بازاری اشتہار تیار کرنے والے کا کمال یہ ہے کہ رنگوں کی آمیزش اور اشتہار کے اچھوتے خط وخال عوام کے لیے جاذب نظر ثابت ہوں فرض کیجیے فنون لطیفہ کی ایک نمائش ہونے والی ہے اس نمائش کے چرچا کی خاطر ایک اشتہار جاری کیا جاتا ہے کیا اس اشتہار کا مصرف نمائش کی اہمیت ثابت کرنے کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ ہرگز نہیں یہ اشتہار اس مصرف کو جس حد تک پورا کر سکے اتنا ہی ہم اس کو ایک کامیاب اشتہار سمجھیں گے اشتہار تو عوام کو نمائش کی طرف بلانے کی غرض سے شائع کیا گیا ہے اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اشتہار خود نمائش کی خوبیاں بھی پیدا کر لے تو آپ کی عقل پر رونے کا مقام ہے اشتہار کبھی نمائش کے ایوان میں سجائی ہوئی اشیاء کی جگہ نہیں لے سکتا وہ تو ایک دنیا ہی دوسری ہے، اگر فنون لطیفہ کے نمونوں کا مشاہدہ مطلوب ہے تو نمائش گھر کے اندر تشریف لے جائیں۔ اشتہار پر اپنا وقت ضائع نہ کیجیے

آپ کا مقصد فقط نمائش گھر کی سیر سے پورا نہ ہوگا فن کا مشتاق تو نمائش کے ایک ایک نمونے کو پہروں دیکھتا رہے گا تب کہیں وہ ان کی اصلی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکے گا۔یہی حال پراپیگنڈا کا ہے۔

پراپیگنڈے کا مقصد تعلیم دینا نہیں تائید حاصل کرنا ہے

پراپیگنڈا افراد کے علم میں اضافہ کا نام نہیں، تو عوام کی توجہ مخصوص مسائل پر مرکوز کرنے کا نام ہے یہ کام پراپیگنڈا ہی کر سکتا ہے۔

ایسی حالت میں پراپیگنڈے کا فن یہ ہے کہ ایک مسئلہ عوام کے سامنے اس وضاحت اور شدت کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اکثریت کو کسی واقعہ کا یقین آ جائے کسی ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے یا کسی صورت حال کے مبنی بر عدل و انصاف ہونے میں شک باقی نہ رہے لیکن یہ فن بجائے خود کوئی مقصد نہیں اس کی حیثیت وہی بازار کے اشتہار جیسی ہے یہ تو عوام کی توجہ مرکوز کرنے کا حیلہ ہے پراپیگنڈا افراد کی علمی تشنگی بجھانے سے قاصر ہے۔اگر کسی مسئلہ پر کسی شخص نے کوئی علمی رائے قائم کی ہے، یا وہ فرد واقعی مطالعہ کے بعد ایسی رائے قائم کرنے کا مشتاق ہے تو اس کا راستہ جدا ہے پراپیگنڈا تو علم و استدلال کی نسبت تخیل و جذبات کے ساتھ زیادہ واسطہ رکھتا ہے۔

پراپیگنڈے کا اسلوب عوامی ہونا چاہیے پراپیگنڈا کی ذہنی سطح ایسی ہونی چاہیے کہ جن لوگوں سے خطاب ہے ان میں کم سے کم ذہین کی ذہنی سطح بھی اس سے نیچی نہ ہو اس طرح پراپیگنڈا اپنے مخاطبین میں سب سے زیادہ کند ذہن شخص کے دماغی معیار کے مطابق ہوگا۔ جب ساری قوم کو پراپیگنڈا کے دائرہ کے اندر لانا ہو، جیسا کہ جنگی پراپیگنڈے کے موقع پر حاجت ہوتی ہے تب پہلی احتیاط یہ کرنی چاہیے کہ علم و فضل کا ثقل غریب سننے والوں کے لیے دردسر ثابت نہ ہو۔

اگر پراپیگنڈا اس علم و فضل کی چاشنی کم ہے اگر اس کا روئے سخن عوامی جذبات کی طرف ہے تو نتائج ضرور فیصلہ کن ہوں گے درحقیقت فیصلہ کن نتائج پیدا ہونا یا نہ ہونا ہی

پراپیگنڈے کی اصلی کسوٹی ہے چند ذہانت اور فن کے پتلے اگر چہ گندہ لیکن ایجاد بندہ کی راگنی پر بیٹھے سر دھنتے رہیں تو اس سے کیا حاصل؟

جذبات کو بھڑکانا اور تخیل کو اکسانا ہی پراپیگنڈا ہے

پراپیگنڈے کا فن کا کمال یہی ہے کہ عوام کا جذبات بھڑکا کر ان کے تخیل کو راستہ پر لگا دیا جائے اس کے لیے حاجت رہتی ہے وہ ٹھیک نفسیاتی اسلوب تلاش کرنے کی جو عوام کی توجہ اپنی طرف کر لے اور قوم کی اکثریت کے دلوں کو موہ لے آج ہماری قوم کے اندر جن لوگوں کی ذہانت کی چونچ بڑی تیز سمجھی جاتی ہے، وہ اس گر سمجھنے سے غافل ہیں یہ غفلت ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ چاہے ان کی ذہانت کی چونچ تیز ہو لیکن آنکھوں پر غرور اور جہالت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

جب ایک دفعہ ذہن نشین ہو جائے کہ پراپیگنڈے سے عوام کو مائل کر کے ان کی اکثریت کو قائل کرنا اصلی منشاء ہے تو پھر مندرجہ ذیل قواعد کا استخراج آسان نظر آتا ہے۔

پراپیگنڈا کا اہتمام اس طرح کرنا کہ گویا قعا قسم کے علوم پڑھانے کا ارادہ ہے غلطی ہوگی۔ عوام غریب کی استعداد قبول محدود ہے ان کی سمجھنے کی قوت کمزور ہے، وہ بہت جلد بھول جاتے ہیں ان حالات میں اگر پراپیگنڈا سے کوئی اثر پیدا کرنا ہے تو چند اشد ضروری باتیں چن لی جائیں اور جہاں تک ہو سکے لے کر کے فقیر کی طرح انہیں الفاظ میں ان کو بار بار دہرایا جائے یہ نعرے استقلال کے ساتھ اس وقت تک دہراتے رہنا چاہیے جب تک ہر فرد ان کا مطلب خوب سمجھ جائے یہ اصول ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے اگر قاعدے کیلئے وضع کرنے اور عقلی اصول سمجھانے کی کوشش شروع کر دی تو پراپیگنڈا بے اثر رہے گا عوام اول تو یہ ثقیل غذا ہضم نہ کر سکیں گے دوسرے جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ اسے یاد رکھنے میں لاچار ثابت ہوں گے یہی وجہ ہے کہ جتنا پراپیگنڈا کا موضوع وسیع ہو اتنا ہی یہ ضروری ہوتا ہے کہ نفسیاتی لحاظ سے کارگر نقشہ تدبیر پھیلایا جائے ایسی صورت میں پوری غور و فکر کے بعد بہترین اسلوب اختیار کرنے سے ہی کام نکل سکتا ہے۔

حقائق سے منہ موڑنا اچھا پراپیگنڈا نہیں

مثال کے طور پر دشمن کی قومی بزدلی کا ٹھٹھا اڑانا ایک بنیادی غلطی تھی آسٹریا اور جرمنی کے مزاحیہ اخبارات نے پراپیگنڈا کا مطلب ہی یہ سمجھ رکھا تھا کہ دشمن کو بزدل قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جائے یہ ایک اصولی غلطی تھی وجہ یہ کہ جب ہمارے سپاہیوں کو دشمن سے مقابلہ کا اتفاق ہوا تو ان پر روشن ہو گیا کہ دشمن بزدل نہیں، یوں اس غلطی سے مہلک نتائج پیدا ہوئے جب جرمن سپاہی کو ذاتی مشاہدہ سے کھل گیا کہ کس فولادی حریف کا سامنا ہے تو اس نے محسوس کیا کہ جو لوگ دشمن کو بزدل اور مسخرا بیان کرتے تھے، وہ مجھے دھوکہ دے رہے تھے غرض یہ پراپیگنڈا سپاہی کے دل کو ابھارنے اور سہارا دینے کے بجائے اس کا اعتماد متزلزل کر دینے کا باعث بنا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر سپاہیوں کے جی چھوٹ گے۔

برعکس اس کے انگریزوں اور امریکنوں کا جنگی پراپیگنڈا نفسیاتی لحاظ سے رمز شناس ثابت ہوا۔ وہ تو کہتے تھے جرمن وحشی چنگیز ہیں، اس طرح وہ اپنے سپاہیوں کو میدان جنگ کی ہولناکیوں کے لیے تیار کر رہے تھے لڑائی پر جانا کچھ خالہ جی کے گھر کی سیر تھوڑی ہے ان سپاہیوں کو میدان جنگ میں خوفناک ترین ہتھیاروں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا تھا تو وہ یہ سوچ کے اپنے دل کی ڈھارس بندھاتے تھے کہ ہمارے ملک کا پراپیگنڈا سچا تھا اس طرح اپنی حکومت پر ان کا اعتماد اور زیادہ پختہ ہوتا تھا جرمنوں کے جنگی ہتھیاروں سے بپا ہونے والی بڑی سے بڑی تباہی ان کے لیے فقط ایک مزید ثبوت تھا کہ واقعی یہ وحشی اور چنگیز قوم ہے حالاں کہ خود اتحادیوں کے اسلحہ کچھ جرمنوں سے کم چنگیزی یا کم وحشیانہ نہ تھے لیکن یہ چھننے کی فرصت کہاں دی جاتی تھی اس طرح برطانوی سپاہی کو شبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کے ملک سے آنے والی خبریں کبھی غلط بھی ہو سکتی ہیں جرمنوں کے ہاں معاملہ بالکل الٹ تھا آخر کار تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جرمن سپاہی اپنے ملک سے آئی ہوئی ہر اطلاع کو فضول اور سراسر دھوکہ خیال کرنے لگے تھے

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جرمن حکومت ہر اس گدھے کو جس پر پہلے نظر پڑ جائے پراپیگنڈا کا اہل تصور کر لیتی تھی۔ گدھے میاں اپنی ''خاص قابلیتوں'' کا چرچا کرتے، جھومتے جھامتے بلا تکلف ایک عدد اعلیٰ عہدے کے تھان پر گھاس چھیلنے کو متمکن ہوتے تھے کوئی نہ سوچتا تھا کہ پراپیگنڈا کے لیے قوم کے بہترین دماغ درکار ہیں۔

پراپیگنڈا میں رواداری کی گنجائش نہیں

غرض جرمنی کے جنگی پراپیگنڈا کا نظام ایک بے نظیر مثال تھا، جس کو دیکھ کر یہ عبرت حاصل کی جا سکتی تھی کہ پراپیگنڈا میں کیا کچھ نہ کرنا چاہیے کہا جاتا تھا کہ یہ پراپیگنڈا روشنی پھیلانے کی غرض سے کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس سے کوئی روشنی نہ پھیلتی تھی وجہ یہ کہ نفسیاتی لوازمات کی روشنی پھیلانے کے اہتمام میں سراسر نظر انداز کیا جاتا تھا۔

جن لوگوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور جن کی قوت مشاہدہ جواب نہ دے چکی تھی وہ ساڑھے چار سال تک دشمن کے پراپیگنڈا کے سیلاب کے تھپیڑے کھا کھا کر اس علم کی بابت بہت سے کارآمد اسباق سیکھ گئے۔

بدترین مصیبت یہ تھی کہ ہماری قوم اس شرط اول سے غافل تھی جو ہر قسم کے پراپیگنڈے کے لیے لازم ہے وہ یہ کہ جس مسئلہ کے متعلق پراپیگنڈا کرنا ہو اس کے ہر پہلو کے متعلق بالکل یک طرفہ رویہ اختیار کر لینا ضروری ہے یہ رویہ جان بوجھ کر اور مستقل طور پر یک طرفہ ہونا چاہیے ہمارے ہاں آغاز جنگ سے ہی اس سلسلے میں اتنی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ صرف اعلیٰ حکام کو ان کے لیے ذمہ دار گردانا کافی معلوم نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر فرض کیجئے ایک نئی قسم کا صابون ایجاد ہوا ہے اور آپ اس کا اشتہار دینا چاہتے ہیں اب آپ اس اشتہار کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ جس کی ابتدا مقابلہ پر بکنے والے دوسری قسم کے صابون کی تعریف سے شروع ہو بلاشبہ اس اشتہار کے مصنف کی عقل پر سر پیٹ لینے کو دل چاہے گا یہی اصول اس قسم کے سیاسی اشتہارات

میں بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

پراپیگنڈا کا مفہوم یہ نہیں کہ کسی منصف کی عدالت میں فریقین کے دعوے ناپ تول کر پھر ان کا مناسب فیصلہ تحریر کرنا ہے کسی کا حق فراموش نہ ہو جائے یہاں تو جن حقوق کی وکالت پر آپ مامور ہیں صرف انہیں پر زور دینا ہے پراپیگنڈا حقیقت حال کی با ضابطہ تفتیش کا نام نہیں نہ ہی یہاں واقفیت کی تلاش کرنا ہے سچ سے صبر تجاوز نہ ہو اور انصاف کے خیالی قواعد کے مطابق مد مقابل کے حق میں جو بات ہے اس کا بھی تذکرہ ضرور کیا جائے پراپیگنڈا کو تو فقط سچائی کے اس پہلو سے غرض ہے جو اس کے منشاء کے موافق ہے۔

یہ بحث کرنا ایک بنیادی غلطی تھی کہ جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری کس فریق پر ہے گو نتیجہ کے طور پر اعلان یہی کیا جاتا تھا کہ صرف جرمنی ہی اس گناہ کا مجرم نہیں بغیر لمبی چوڑی بحث چھیڑنے کے جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری سر سر دشمن کے سر پر ڈال دینی چاہیے تھی۔

پراپیگنڈا دلیل بازی نہیں

اس تذبذب اور دودلی کا نتیجہ کیا نکلا؟ عوام الناس کی اکثریت نہ تو مدبرین پر مشتمل ہے اور نہ وہ غریب بین الاقوامی قانون کے پروفیسر ہیں وہ ہر معاملہ پر عمل کی مدد سے رائے قائم کرنے کے قابل بھی نہیں وہ تو گھڑی تولہ گھڑی ماشہ عمر رسیدہ بچوں کا ایک ہجوم ہے جو ہمیشہ دو قسم کے خیالات کے مابین بھٹکتا رہتا ہے جس روز ہمارے پراپیگنڈا میں ہلکا سا اشارہ بھی اس امر کا پایا گیا کہ کسی حد تک ہمارے دشمن کا دعویٰ بھی مبنی بر انصاف ہے اس روز گویا ہم نے خود اپنے دعویٰ کی سچائی کو جھٹلانے کی بنیاد رکھ دی عوام الناس کی اکثریت یہ نہیں دیکھ سکتی کہ دشمن کا قصور کہاں ختم ہوتا ہے اور ہمارا قصور کہاں سے شروع ہوتا ہے وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے منہ سے اقرار گناہ کر رہے ہیں ایسی حالت میں وہ پہلے مذبذب اور پھر بدگمان ہو جاتے ہیں بالخصوص جب دشمن ایسی غلطی کا مرتکب نہ ہو

اور سارا الزام ہمارے ہی سر تھوپے، تب تو عوام کی یہ بدگمانی اور بھی بڑھ جاتی ہے اس قول کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوگا کہ بالآخر کار ہماری اپنی قوم دشمن سے پراپیگنڈے کا یقین کرنے لگی اور ہمارے پراپیگنڈے سے بیزار ہوگئی وجہ یہ کہ دشمن مستقل اور مسلسل طور پر ایک ہی دعوے دہراتا چلا گیا ہماری قوم کو "حقیقت حال" سے جو مجنونانہ الفت ہے اس کے باعث یہ مرض اور بھی بڑھ گیا ہر شخص اسی احتیاط میں مبتلا تھا کہ دشمن سے بے انصافی نہ ہو۔۔۔۔ چاہے اپنی قوم اور سلطنت کو کیسا ہی نقصان کیوں نہ پہنچ جائے یا ان کا بیڑا ہی غرق ہو جائے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عوام الناس کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ برسر اقتدار لوگ مسئلہ کو اس زاویے سے دیکھنے میں قاصر رہے ہیں۔

پراپیگنڈا پیچیدہ نہیں سادہ ہونا چاہیے۔

ہر قوم کی غالب اکثریت کے خیالات اور مزاج زنانہ ہوتا ہے ان کی سرگرمیاں جذبات کی پابند ہوتی ہیں نہ کہ عقل کی ان کے جذبات بھی سادہ اور مستقل ہوتے ہیں نہ کہ پیچیدہ ان کے جذبات میں درجوں کی ترتیب نہیں پائی جاتی وہ تو صرف نفی یا اثبات، محبت یا نفرت، برے یا بھلے، سچے یا جھوٹے کی موٹی موٹی تمیز جانتے ہیں کسی ح تک یہ اور کسی حد تک وہ، ایسے گورکھ دھندوں سے ان کی جان جاتی ہے انگریزوں کا پراپیگنڈا بالخصوص اس حقیقت کو خوب بجھا ہوا تھا وہ جو سمجھتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے وہ کوئی بات ادھوری نہ کرتے تھے اس سے تو شک پیدا ہو جانے کا خدشہ تھا۔

عوام کے جذبات عامیانہ ہوتے ہیں انگریز اس سچائی کو خوب جانتے تھے ثبوت اس کا وہ بے رحمی اور ظلم کے قصے ہیں جن کی اشاعت ان کی مستقل پالیسی تھی یہ داستانیں وقت کے خونیں واقعات کے عین مطابق ہوتی تھیں یہ وہ حیلے تھے، جن سے انگریز محاذ پر لڑنے والوں کے اوسان قائم رکھتے تھے چاہے فی الواقع ان کو زبردست شکستوں کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑ رہا ہو، وہ بڑی چالاکی اور پوری شدت کے ساتھ اپنے سپاہیوں

کے حوصلے بلند رکھنے کی مہم چلاتے تھے ہمارے خلاف اس طرح نفرت بھڑکا کر وہ اپنا اتحاد بھی مضبوط کرتے تھے اس کے علاوہ وہ جرمنی کو بار بار جنگ چھیڑنے کا مجرم قرار دیتے تھے، حالانکہ یہ ایک ننگا اور بے بنیاد جھوٹ تھا پھر بھی جس اعتماد سے وہ اس کا اعلان کرتے تھے، وہ عوام کو قائل کرنے کا بے خطا نسخہ تھا وہ خوب جانتے تھے کہ عوام اپنے جذبات میں انتہا پسند ہوتے ہیں اس طرح ایک دن ایسا بھی آیا، جب لوگ سچ مچ اس سفید جھوٹ پر یقین کرنے لگے۔

اس قسم کے پراپیگنڈا کے موثر ہونے کا یہ زبردست ثبوت ہے کہ ساڑھے چار سال کے بعد بھی دشمن نے اس کو جاری رکھا حتی کہ خود جرمنی میں لوگ اس الزام سے عاجز آ کر ہمتیں ہارنے لگے۔

اگر ہمارے پراپیگنڈا نے اس قسم کے نتائج پیدا نہ کیے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہمارا گول مول پراپیگنڈا اپنے ذو معنی ہونے میں ہی اپنی تاثیر ضائع کر چکا تھا اس کا نفس مضمون بھی عوام کو مطلوبہ حد تک متاثر کرنے کے نا قابل تھا ہمارے نالائق مدبرین کے سوا دنیا میں اور کون یقین کر سکتا تھا کہ صلح کا خالص شربت پلا کر میدان جنگ میں وطن کے نام پر سر کٹانے والا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔

پرستاران فن اور کاریگران ذہن پراپیگنڈا کے لیے بیکار ہیں

غرض ہمارا یہ پراپیگنڈا فضول ہی نہیں بلکہ مضر بھی تھا

پراپیگنڈا کے محکمہ میں کیسی ہی قابل ہستیاں کیوں نہ بھرتی کر لی جائیں اگر مذکورہ بالا بنیادی اصول نظر انداز کئے گئے تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا پراپیگنڈے کے موضوعات محدود ہونے چاہئیں اور ان کو بار بار دہرانا چاہیے دنیا کے ہزار دوسرے کاروبار کی طرح یہاں بھی استقلال کی کامیابی کی پہلی اور سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔

پراپیگنڈے کے انتظام میں ''پرستاران فن'' اور ''کاریگران ذہن'' کے لیے کوئی گنجائش نہیں پرستاران فن تو بڑی خیرہ چشمی سے پراپیگنڈے کے زبردست اثرات کو''

ادب برائے ادب‘‘ اور ’’فن برائے فن‘‘ کے اصول کے ماتحت محض ٹی پارٹیوں کے حلقے تک محدود کر دیں گے ’’کاریگران ذہن‘‘ سے خدا بچائے ان لوگوں کا دماغی ذائقہ ہر روز نئی غذا چاہتا ہے وہ زندگی کی عام روش سے اکتا چکے ہوتے ہیں انہیں فطرت کے حسب معمول کا دستور پسند نہیں اس لیے وہ ہمیشہ نت نئے چٹخارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ان لوگوں کا دل ہر شے سے جلد ہی بھر جاتا ہے وہ ہر گھڑی تبدیلی کے مشتاق رہتے ہیں وہ اپنے اردگرد کے ان لوگوں کی ضروریات کا بھی اندازہ نہیں کر سکتے جو ان کی طرح گرگٹ نہ ہوں ہمدردی کا تو ذکر ہی کیا یہ ’’کاریگران ذہن‘‘ ہمیشہ پراپیگنڈے کا پیغام پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ یہ تو بہت ہلکا ہے، اور باسی ہو چکا ہے۔ وہ ہر لحظہ جدید کی لذت کے متلاشی رہتے ہیں انہیں ذوق تغیر چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا اس لیے وہ عوام کو ٹھیک طور پر متاثر کرنے کی ہر کوشش کے جانی دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

اگر پراپیگنڈے کی کوئی کوشش ان کی ہدایات کے مطابق چلائی جائے تو جلد ہی نہ اس کا سر رہتا ہے نہ پیر سارا نظام جدت کوشی کی حرص میں درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یکسانیت تکرار اور مستقل مزاجی پراپیگنڈا کی جان میں

پراپیگنڈا کا مقصد یہ نہیں کہ ان بزرگوں کے الٹائے ہوئے جذبات کو گاہے گدگدا کر اور گاہے سہلا کر ان کی تسکین قلب کا سامان کیا جائے پراپیگنڈا کا مقصد تو عوام کو کسی بات کا یقین دلا دینا ہے عوام کی قوت فہم ست ہوتی ہے انہیں بات سمجھنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے صرف بار بار دہرا کر ہی کوئی خیال ایک ہجوم کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

پراپیگنڈے کے پیغامات کے موضوع میں ہر تبدیلی کی تان ایک ہی موضوع پر آ کر ٹوٹنی چاہیے بنیادی نعروں پر کئی پہلوؤں اور مختلف زاویوں سے تشبیہیں دے کر روشنی ڈالنی چاہیے لیکن ختم ہمیشہ ایک ہی نعرہ پر کرنا چاہیے صرف یہی طریقہ ہے جس سے پراپیگنڈا ایک وضع پر استوار اور قوی الاثر رہ سکتا ہے۔

ان اصولوں کی پیروی کرنے اوران پر سختی سے کار بند رہنے سے ہی آخر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے پراپیگنڈا کے ان خطوط کی پابندی یکساں توجہ سے کرنی چاہیے البتہ اختصار بھی مدنظر رہے اگر استقلال سے کام لیا جائے تو ایک دن اچانک غیر متوقع اور حیران کن کامیابی نصیب ہوگی۔

اشتہار چاہے تجارتی ہو یا سیاسی اس کی کامیابی یکسانیت، تکرار اور مستقل مزاجی سے پیشکش پر منحصر ہوتی ہے۔

پراپیگنڈا کا موضوع محدود ہونا چاہیے

اس نقطہ نگاہ سے بھی ہمارے دشمنوں کا پراپیگنڈا قابل رشک تھا اس کے موضوعات محدود تھے یہ موضوعات عوام کے مزاج کے مطابق ہوتے تھے اور انتھک استقلال سے ان کو بار بار دہرایا جاتا تھا ایک دفعہ جب انہیں یقین ہوگیا کہ بنیادی طور پر موضوع اور اسلوب بیان کا انتخاب ٹھیک ہوا ہے، تو پھر ساری جنگ کے دوران میں وہ ذرہ بھر تبدیلی کے بغیر انہیں موضوعات اور اسالیب پر قائم رہے۔ شروع شروع میں ان کی یہ گستاخانہ ضد محض منہ پھٹ حماقت تصور کی گئی پھر ہمیں طیش آیا اور گھبراہٹ محسوس ہوئی آخر میں وہ جو کچھ کہتے تھے ہمیں ماننا پڑا۔

انگلستان میں ایک اور نکتہ بھی دریافت کرلیا گیا وہ یہ کہ اس روحانی ہتھیار کا استعمال صرف وسیع پیمانے پر ممکن ہے اسی صورت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے گو اس طرح خرچ زیادہ آتا ہے لیکن نفع میں اصل بمعہ سود وصول ہو جاتا ہے۔

انگریز پراپیگنڈا کو ایک اہم ترین حربہ مانتے تھے ہمارے ہاں یہ کام بے روزگار لیڈروں کو ملازمت دینے کا آخری سہارا سمجھا جاتا تھا یا جو شرمیلے دلیر میدان جنگ سے جان بچانا چاہتے تھے وہ اس گھونسلے میں آرام سے بیٹھ کر چوگا چگتے تھے۔

بحیثیت مجموعی ہمارے پراپیگنڈا کے نتائج صفر کے برابر تھے۔

☆☆☆☆☆☆

باب ہفتم :: انقلاب

کامیابی کے ساتھ کامیابی کا چرچا کرنے کی بھی ضرورت ہے

1915ء میں دشمن نے ہمارے سپاہیوں کے اندر اپنا پراپیگنڈا شروع کیا۔ 1916ء میں یہ پراپیگنڈا شدید تر ہو گیا 1918ء کی ابتداء میں اس نے ایک بے پناہ طوفان کی شکل اختیار کر لی اس تبلیغی مہم کے نتائج اب بتدریج ظاہر ہو رہے تھے ایک دن وہ بھی آیا جب ہمارے سپاہیوں نے بالکل اسی طرح سوچنا شروع کر دیا جیسا دشمن چاہتا تھا کہ وہ سوچیں جرمنوں کی طرف سے کوئی جوابی پراپیگنڈہ نہ ہو رہا تھا۔

ان دنوں عسکری حکام ہمارے قابل اور اولوالعزم سپہ سالار کے زیر قیادت پراپیگنڈا کے محاذ پر بھی جنگ کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ تھے وہ خواہشمند تو تھے لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس وہ ذرائع نہ تھے جن سے وہ اپنی آرزو کو عملی جامہ پہنا سکتے علاوہ ازیں اگر عسکری حکام ذہنی تربیت کا بوجھ بھی سنبھال لیتے تو ایک نفسیاتی غلطی ہوتی پراپیگنڈا موثر ہونے کے لیے اس کا اہتمام قوم ہی کی جانب سے ہونا چاہیے تھا سپاہی چار سال سے مافوق العادت شجاعت کا ثبوت دے رہے تھے وہ قوم کی خاطر ہر قسم کی محرومیاں برداشت کر رہے تھے اگر ان میں پراپیگنڈا کامیاب بنانا تھا تو اس کا انتظام قوم ہی کی جانب سے موزوں تھا لیکن قوم کیا کر رہی تھی؟ کیا قوم کی لاپروائی صرف حماقت کا نتیجہ تھی یا اس میں غداری کو بھی دخل تھا!

1918ء کے موسم گرما کے عین وسط میں جب جرمن افواج دریائے فارن کے جنوبی کنارہ سے پسپا ہوئیں تو جرمن اخبارات نے جو پالیسی اختیار کی وہ صرف خلاف مصلحت نہ تھی بلکہ مجرمانہ حد تک احمقانہ بھی تھی میں روز افزوں جھنجھلاہٹ سے ان دنوں اپنے آپ سے ایک سوال کیا کرتا تھا ایک ہمارے اندر ایسی کوئی ہستی نہیں جو ہمارے

جانباز سپاہیوں میں بے دلی پھیلانے کی اس تخریبی مہم کو ختم کر دینے کی جرات رکھتی ہو۔

جرمن کی شکست جب تک من نہ اتر جائے کارگر نہیں ہوتی

جب 1914ء میں ہماری افواج نے فرانس پر حملہ کیا اور ہمیں فتح پر فتح حاصل ہو رہی تھی تو وہاں کیا ہوا جب اسی سویز کے محاذ پر اٹلی کی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں تو وہاں کیا ہوا۔ پھر جب 1918ء کے موسم بہار میں جرمن لشکروں نے دوسری مرتبہ ہلہ کر کے فرانس کے مرکزی محاذ پر قبضہ کرلیا اور ہماری دور مار توپیں پیرس پر گولہ باری کر رہی تھیں، تو وہاں کیا ہوا۔

ان تمام مواقع پر پسپا ہونے والی فوجوں کے پست حوصلے ازسر نو قائم کئے گئے حب الوطنی کے شعلے بھڑک اٹھے ان اقوام کے پراپیگنڈے اور عوام پر اثر انداز ہونے کی حیرت انگیز قابلیت نے ٹوٹی ہوئی صفوں میں ایک نئی جنگی روح پھونک دی۔ ان کے سپاہیوں کے دلوں میں آخری فتح کا یقین کامل اتار دیا گیا۔

اسی اثنا میں ہماری قوم نے اس سلسلہ میں کیا کیا؟ کچھ نہیں! بلکہ اس سے بھی بدتر!! مجھے بار بار غصہ آتا تھا میں غضبناک ہو جایا کرتا تھا جب میں تازہ اخبار دیکھتا تو مجھے احساس ہوتا کہ عوام اور سپاہیوں پر ان اخبارات کا اثر قتل عام کا مرتکب ہو رہا ہے ایک اور خیال سے بھی مجھے الجھن ہوتی تھی میں سوچتا تھا قدرت اگر موجودہ کندہ ناتراش اور جاہل مجرمین و مذبذبین کے بجائے جرمنوں کے پراپیگنڈے کا اہتمام مجھے سونپ دیتی تو شاید ساری جنگ کا انجام مختلف ہوتا۔

ان ایام میں پہلی مرتبہ مجھے تقدیر کے خلاف گلہ محسوس ہوا میں یہاں محاذ جنگ پر کسی کالے یا گورے کی گولی کا نشانہ بن سکتا ہوں حالانکہ ایک دوسرے منصب پر میں مادر وطن کی بہتر خدمت کر سکتا تھا اب مجھ میں اتنی خود پسندی پیدا ہو چکی تھی کہ مجھے یقین تھا میں پراپیگنڈا کا گر سمجھ چکا ہوں اگر یہ کام مجھے سونپا جائے تو میں اسے کر سکتا ہوں۔

لیکن میں تو ایک گمنام شخص تھا میں تو آٹھ کروڑ کی قوم میں فقط ایک فرد تھا اس لیے

میری بہتری اسی میں تھی کہ جو منصب اور فریضہ مجھے سونپا گیا ہے وہاں چپ چاپ جیسی تیسی بن آئے اپنا کام کرتا چلا جاؤں۔

اشتہار بھی ہتھیار ہے

1915ء کے موسم گرما میں پہلی مرتبہ دشمن نے ہماری خندقوں پر اشتہار پھینکے ان اشتہارات میں اسلوب بیان کی تھوڑی بہت تبدیلی سے ایک ہی قصہ بار بار پیش کیا گیا تھا وہ قصہ یہ ہوتا تھا کہ جرمنی میں تیزی کے ساتھ یہ وبا پھیل رہی ہے یہ عالمگیر جنگ لا متناہی ثابت ہوگی جرمنوں کی فتح کا امکان ہر روز کم ہوتا چلا رہا ہے جرمنی کے عوام صلح چاہتے ہیں عسکریت کے پجاری اور قیصر عوام کی یہ خواہش پوری کرنے پر آمادہ نہیں دنیا جرمن عوام کی اس مجبوری سے واقف ہے اس لیے دنیا کی تمام سلطنتیں جرمنی کے عوام کے خلاف نہیں لڑ رہیں وہ تو صرف اس اکیلے شخص یعنی قیصر کے خلاف برسر پیکار ہیں جو حقیقی مجرم ہے جب تک امن عامہ اور عالمگیر صلح کا یہ دشمن ختم نہیں ہو جاتا صلح کا کوئی امکان نہیں تاہم جنگ ختم ہو جانے کے بعد دنیا کی جمہوریت پسند اور وسیع المشرب اقوام عالمگیر صلح کی خاطر جرمن قوم کو لیگ آف نیشنز میں بطور رفقائے کار قبول کر لیں گی جوں ہی پرشین عسکرت کے پجاری اقتدار کے ہٹائے جاتے ہیں جرمن قوم کو عالمگیر برادری میں شامل کر جائے گا۔

ان دعاوی کے ثبوت اور وضاحت کی خاطر دشمن کے پراپیگنڈا کے اشتہارات اکثر ان خطوط سے اقتباسات اور حوالے بھی دیا کرتے تھے جو جرمن سپاہیوں کو ان کے گھروں سے آتے تھے یہ حوالے اور اقتباسات ان دعاوی کی تائید کرتے تھے۔

بحیثیت مجموعی ہم دشمن کو ان کوششوں کا مذاق اڑاتے تھے اشتہارات کا مطالعہ کیا جاتا پھر ان کو فوجی صدر مقام پر بھیج دیا جاتا اور جب تک ہوا کے تازہ جھونکے ان اشتہارات کی نئی قسط ہماری خندقوں میں نہ پھینکے ہم ان کو قطعاً فراموش کر دیتے بالعموم یہ اشتہارات ان ہوائی جہازوں کے ذریعہ پھینکے جاتے تھے جو اس مقصد کے لیے خاص

طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

دشمن پھوٹ ڈالتا ہے

اس پراپیگنڈا کا ایک پہلو خاص طور پر قابل توجہ تھا وہ یہ کہ محاذ جنگ پر جہاں بویریا کے صوبے سے تعلق رکھنے والے سپاہی متعین تھا، وہاں دشمن کا پراپیگنڈا کرنے والے پرشیا کے خلاف جذبات بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے کہا جاتا تھا کہ جنگ شروع کرنے اور جاری رکھنے کی ذمہ داری پرشیا کے سر پر ہے پرشیا ہی اس گناہ کا مجرم ہے بریریاوالوں سے تو کسی کی کوئی دشمنی ہی نہیں لیکن جب تک بویریا کے باشندے خود ہی پرشیا کے مفاد کی ملازمت میں ہیں، اور پرشیا کی بلا اپنے سر لے رہے ہیں تب تک بویریا کے باشندوں کی بھی کون مدد کرسکتا ہے۔

1915ء میں اس مسلسل پراپیگنڈا کا ہمارے سپاہیوں پر واقعی اثر ہونے لگا۔بویریا سے آنے والے سپاہیوں کے جذبات پرشیا کے خلاف برانگیختہ ہو چکے تھے یہ بات صاف نظر آرہی تھی پھر بھی ارباب حکومت نے اس کے تدارک پر مطلق توجہ نہ دی یہ بات صرف غافلانہ جرم سمجھ کر نظر انداز کرنے والی نہیں لویریا زوداس جرم کی سخت سزا پرشیا کے باشندوں کے ساتھ ساری جرمن قوم نے برداشت کرنی تھی غرض دوراندیشی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو خود بوریریا کے باشندے اس غفلت کے نتائج سے محفوظ نہ تھے۔

اسی طرح ایک عرصہ سے وطن سے آنے والے خطوط کا اثر بھی محسوس ہورہا تھا اب دشمن کو یہ ضرورت نہ تھی کہ وہ اشتہار چھپوا کر ان خطوط کا ڈھنڈورا پیٹتا۔وطن سے آنے والے اس خطرہ کا بھی کچھ علاج نہ کیا گیا علاج کیا بھی گیا تو یہ کہ حکومت نے انتہائی احمقانہ انداز میں چند مرتبہ تنبیہہ کردی۔سارا محاذ جنگ اس زہر سے مسموم ہورہا تھا جولا پرواہ عورتیں گھروں میں تیار کرکے اپنے خاوندوں کو بھیج رہی تھیں ان غریبوں کو کیا علم تھا کہ ان کی ان تحریروں سے دشمن کی فتح کا دن قریب آرہا ہے یا ان کو کیا پتہ تھا کہ اس

طرح وہ محاذ جنگ پر خود اپنے شوہروں، بیٹوں، بھائیوں کے مصائب میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہیں، یا ان مصائب کو طول دے رہی ہیں، جرمن ناقصات العقل کے لکھے ہوئے یہ خطوط ہمارے لاکھوں سپاہیوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے۔

مساوات کے بغیر قائم نہیں رہتی

اس طرح 1916ء میں ہی اثار ہزیمت ظاہر ہو رہے تھے سارے محاذ جنگ پر شکایات اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی بے اطمینانی کی کئی وجوہات تھیں اکثر یہ شکایات جائز ہوتی تھیں سپاہی تو بھوک میں بھی صابر و شاکر تھا گھر پر اس کے اعزہ واقربا تکلیف میں دن کاٹتے تھے۔ برعکس اس کے بعض دوسرے گھروں میں دعوتوں اور جشن کے چرچے رہتے تھے خود محاذ جنگ پر بھی جیسا چاہیے تھا ویسا مساوات کا سلوک نہ ہوتا تھا۔

جنگ کے ابتدائی مراحل میں بھی بعض اوقات سپاہی حرف شکایت زبان پر لاتے تھے لیکن زیادہ تر یہ نکتہ چینی داخلی امور تک محدود ہوتی تھی جو شخص دو گھڑی پہلے بے اطمینانی سے بڑبڑا رہا تھا وہی ادائے فرض کا وقت آنے پر اس خاموشی سے اپنا کام کر دیتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں چند منٹ پہلے جس رسالہ میں بے چینی کے آثار نظر آ رہے تھے، وہی اب اپنے حصے کی خندوق کی حفاظت میں جان لڑا رہا ہے گویا جرمنی کی قسمت اس چند سو گز زمین سے وابستہ ہے جس میں توپ کے گولوں نے گڑھے کھود دیئے ہیں اور چاروں طرف کیچڑ ہو رہا ہے ابھی تک جرمنی کی قدیم عظیم الشان فوج میدان میں تھی یکا یک میرے ذاتی حالات میں ایک تبدیلی ایسی واقع ہوئی جس نے مجھے بچشم خود اس قدیم فوج اور وطن کی حالت میں فرق دیکھنے کا موقع مہیا کر دیا۔ ستمبر ۱۹۱۶ء کے آخیر ایام میں وہ لشکر جس کے اندر میں بھی شامل تھا سومے کے معرکہ میں حصہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ ہمارے لیے یہ معرکہ زبردست معرکوں کے ایک سلسلہ کی ابتدا تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا گویا جنگ کی جہنم سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ ہفتوں ہم توپ کے گولوں کی بارش میں ثابت قدمی سے ڈٹے رہے کبھی کبھار ہم تھوڑا پیچھے ہٹ جاتے لیکن پھر اتنا ہی آگے بڑھ جاتے

ہم کبھی میدان نہ چھوڑے تھے۔

جنگ خالہ جی کا گھر نہیں

۷۔اکتوبر ۱۹۱۶ء کو میں زخمی ہو گیا۔لیکن خوش قسمتی سے اتنی طاقت تھی کہ اپنے پاؤں چل کر اپنی صفوں میں واپس گیا۔یہاں سے ایمبولنس ٹرین کے ذریعہ مجھے جرمنی بھیج دیا گیا۔

مجھے گھر چھوڑے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ان دنوں کے حالات میں یہ ایک لامتناہی مدت محسوس ہوتی تھی۔میں تصور کرنا بھی بھول گیا تھا۔کہ جرمن وردی کے بغیر کیسے نظر آتے ہیں۔ہرمیز کے مقام پر ایک درمیانی عارضی ہسپتال تھا۔یہاں جب میں نے ایک جرمن نرس کی آواز سنی تو بے اختیار بڑبڑا اٹھا۔وہ میرے قریب ایک زخمی سے باتیں کر رہی تھی۔دو سال کے بعد میں نے پہلی مرتبہ عورت کی آواز سنی تھی۔اچانک یہ اجنبی آواز سن کر میں حیران رہ گیا۔

ہماری ایمبولنس ٹرین جرمنی کی سرحد سے جتنی قریب ہوتی جاتی اتنا ہی ہم میں سے ہر ایک کی بے تابی بڑھتی جاتی۔راستہ میں ہم ہر اس مقام کو پہچانتے جاتے تھے۔جہاں آج سے دو سال پیشتر ہم نوجوان رضا کاروں کی حیثیت میں گزرے تھے۔برسلز، لودیان، لیج آخر کار جرمن مکانات کی مخصوص ساخت سے ان کو پہچان کر ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔گھروں کی چھتوں پر تکونے چھجے اور کھڑکیوں کے خوب صورت بلبتے ہم سے مانوس تھے۔ہم گھر پہنچ چکے تھے۔یہ ہمارا وطن ہے۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء میں یہ سرحد عبور کرتے وقت ہم جوش سے دیوانے ہو گئے تھے۔لیکن آج خاموش اور گہرے جذبات سے ہمارے سینے لبریز تھے۔ہر فرد مسرور تھا۔کہ تقدیر نے پھر اس سرزمین کی زیارت کا موقعہ دیا جس کی حفاظت کی خاطر اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ہر ایک اپنی پرنم آنکھیں اپنے ساتھیوں سے چھپانا چاہتا تھا۔لڑائی پر روانہ ہونے کے قریباً دو سال بعد برلن کے قریب بیلٹز کے ہسپتال میں داخل ہوا۔

بزدلی کا تدارک لازمی ہے

ایک دنیا بدل گئی تھی ۔کہاں تو سومے کے میدان جنگ کا کیچڑ اور کہاں اس عالیشان عمارت میں یہ اجلے بستر ۔پہلی مرتبہ کمرہ میں داخل ہوتے وقت تو بے اختیار ایک جھجک محسوس ہوتی تھی ۔اس نئی دنیا سے بتدریج اور آہستہ آہستہ مانوس ہونا ہی ممکن تھا۔لیکن بدقسمتی سے یہ دنیا بعض دوسری باتوں میں بھی مختلف تھی ۔

میدان جنگ میں فوج کا جذبہ یہاں مفقود تھا۔یہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی ۔ یہاں پہلی مرتبہ میں اس حرکت سے متعارف ہوا۔جس کی محاذ جنگ پر کبھی کسی کو جرات نہیں ہوئی تھی ۔یعنی اپنی بزدلی پر خود فخر کرنا۔محاذ جنگ میں بھی شکایات اور بڑبڑاہٹ تو سننے میں آئی تھی ۔لیکن اس میں نافرمانی پر اکسانے کی نیت کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ یقیناً ذاتی خوف وہراس کو یہ پردہ کبھی نہ پہنچایا جاتا تھا۔ ہرگز نہیں۔محاذ جنگ پر ایک بزدل بہرصورت ایک بزدل ہی سمجھا جاتا تھا۔اس لیے کوئی دوسرا کردار ممکن نہ تھا۔اس قسم کی کمزوری پر ہ جوان اظہار نفرت کرتا۔اس طرح سچی دلیری پر چاروں جانب تحسین ومرحبا کہی جاتی ۔لیکن یہاں ہسپتال میں اس معاملہ پر ذرا مختلف تھا۔بلند آہنگ دعویدار اچھے سپاہیوں کا مذاق اڑانے میں مصروف تھے۔کم ہمت اور بزدل بھگوڑوں کی شان میں قصیدے تصنیف ہوتے تھے ۔ہتک عزت کی اس تحریک کی رہنمائی دو بدبخت انسانی نما مخلوق کے نموے کر رہے تھے۔ان میں سے ایک کو تو فخر تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ خاردار تاروں کے جال سے زخمی کرلیا تاکہ اسے ہسپتال بھیج دیا جائے ۔اگرچہ اس کا زخم معمولی تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ دیر سے یہاں ہے ۔اور ابھی غیر معین مدت تک یہیں رہے گا۔جس فریب سے وہ ایمبولینس میں بیٹھ کر یہاں آ گیا تھا شاید اسی قسم کی کوئی بدمعاشی اسے یہاں رکھنے کے انتظام کے متعلق بھی کر لی گئی تھی ۔اس وبائی چوہے کو یہاں تک جرات ہو چکی تھی کہ وہ اپنی چالاکی کو اپنی دلیری سمجھ رہا تھا۔اور بے حیا کی بلا دور اس وہم میں بھی مبتلا تھا کہ ایسی دلیری شہیدوں کی موت مرنے سے بہتر ہے۔کئی

اس کی باتیں سن کر چپ ہو رہتے تھے۔ لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو اس کی سنتے سنتے منڈیا ہلانے لگتے تھے۔ اس کی تائید کرتے تھے۔

مجھے گھن محسوس ہوتی تھی کہ اس قسم کے باغیانہ خیالات پھیلانے والے کو ایسی جگہ کیوں رہنے کی اجازت ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ ہسپتال کے افسروں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کون ہے۔ درحقیقت وہ جانتے بھی تھے باوجود اس کے کوئی تدارک نہ کرتا تھا۔

ہر کلرک کوئی یہودی تھا اور یہودی ایک کلرک

جوں ہی میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ میں نے برلن جانے کے لیے چھٹی حاصل کی۔

ہر جگہ انتہائی قحط کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دارالحکومت کی لاکھوں مخلوق بھوک کے عذاب میں گرفتار تھی۔ سپاہی جن ہوٹلوں یا مہمان خانوں میں ٹھہرتے وہاں ہر جگہ وہی ہسپتال والی گفتگو پر تکلف ہو رہی تھی۔ ایسا دکھائی پڑتا تھا گویا شرارت پھیلانے والوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لی عمداً ایسے مقامات پر اپنے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔

میونخ میں صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔ جب میں صحت یاب ہو کر ہسپتال سے چلا آیا تو مجھے میونخ میں ایک ریزرو بٹالین کے اندر متعین کر دیا گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا گویا کسی اجنبی شہر میں آ گیا ہوں۔ ہر جگہ غصہ، بے اطمینانی اور شکایات کا زور تھا۔ کسی حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ چھوٹے درجہ کے فوجی افسر جنہوں نے ابھی محاذ جنگ دیکھا بھی نہ تھا وہاں سے واپس آنے والے سپاہیوں سے مناسب سلوک کے ناقابل تھے۔ دوسری طرف پرانے سپاہیوں میں بھی خندقوں کے اندر رہتے رہتے کچھ مخصوص عادتیں پڑ گئی تھیں ریزرو افواج کے افسران خصوصیتوں کا اندازہ نہ کر سکتے تھے۔ برعکس اس کے جو افسر جنگ دیکھ آیا وہ ان خصوصیتوں کو ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہیڈ کوارٹر کے فوجی افسروں کی نسبت سپاہی محاذ جنگ سے آنے والے افسروں

کی زیادہ عزت کرتے تھے ۔ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے عام فضا افسوس ناک تھی ۔ جان بچانے کو ذہانت اور فرض شناسی کو کمزوری یا کٹر پن کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔تمام سرکاری دفتروں کا عملہ یہودیوں پر مشتمل تھا ہر یہودی ایک کلرک تھا اور ہر کلرک کوئی یہودی ۔ میں برگزیدہ قوم کے جنگجوؤں کو یہاں کثرت سے دیکھ کر محاذ جنگ پر ان کی قلت یاد کیے بغیر نہ رہ سکا۔

کاروباری میدان میں حالات اس سے بھی زیادہ خراب تھے ۔یہاں تو یہودیوں کے بغیر کام نہ چلتا تھا۔وہ قوم کے مساموں سے جونکوں کی طرح خون چوس رہے تھے ۔ جنگ کے کاروبار کے لیے تجارتی کمپنیاں چلانے کا ایک نیا دستور رواج پکڑ رہا تھا۔اس ترکیب سے قومی تجارت کا گلا گھونٹ کر آزاد کاروبار ختم کیا جا رہا تھا۔

یہودی قوم کولوٹ رہے تھے

کہا جاتا تھا کہ سب کاروبار ایک مرکز کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔اس پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔۱۹۱۶۔۱۷ء میں ہی ساری قومی پیداوار یہودی سرمایہ کے پنجہ میں آ چکی تھی ۔

ان سب باتوں سے لوگوں کو جو طیش محسوس ہوتا تھا اس کا نشانہ کس کو بنایا جاتا تھا۔یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر جلد تدارک نہ کیا گیا تو قومی زوال اور انتشار کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔

یہودی قوم کو لوٹ رہے تھے۔یہودی استبداد کے پیچ اور سخت کس رہے تھے ۔لیکن عوام کو پرشیا کے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا۔جس طرح محاذ جنگ پر اس زہریلے پروپیگنڈہ کی کوئی روک تھام نہ تھی ۔اسی طرح یہاں گھر میں بھی سرکار اس کا تدارک کرنے سے غافل تھی۔کوئی سوچتا تھا کہ پرشیا کی شکست بویریا کے عروج کے باعث کس طرح ہو گی ۔اگر پرشیا نے ہزیمت اٹھائی تو پھر بویریا کہاں بچے گا۔

اس طرز عمل سے مجھ پر گہرا اثر ہوا مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہودی عوام کی توجہ اپنی ذات سے ہٹانے کے لیے یہ چال چل رہے ہیں۔پرشیا اور بویریا کے باشندے آپس

کے جھگڑے میں الجھے ہوئے تھے اور یہودی دونوں کی آنکھوں میں خاک جھونک ان کی ناک تلے بیٹھے دونوں کا گھر لوٹ رہے تھے۔ بویریا تو پرشیا کو برا بھلا کہنے میں مصروف رہا۔اور یہودیوں نے انقلاب برپا کر کے ایک ضرب سے بویریا اور پرشیا دونوں کوختم کر دیا۔

میں ایک جرمن کوکھ سے پیدا ہونے والے باشندوں کے درمیان یہ نفرت انگیز تفرقہ نہ دیکھ سکا۔اس لیے میونچ پہنچنے کے فوراً بعد میں نے پھر محاذ جنگ پر حاضر ہونے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ میں اوائل مارچ ۱۹۱۷ء میں اپنی پرانی رجمنٹ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ہم محاذ جنگ پر تعینات تھے۔

نحوست کے کووں کا شور مدھم پڑ رہا تھا

۱۹۱۷ء کے اواخر میں ایسا دکھائی پڑتا تھا کہ گویا محاذ جنگ پر بددلی کی بدترین گھڑیاں گزر چکی ہیں۔روس کی شکست کے بعد ساری فوج میں ایک نئے حوصلے اور امید کی روح دوڑ گئی۔ بتدریج ہر ایک کو پختہ یقین ہو چلا تھا کہ آخری فتح ہماری ہو گی۔ ہماری صفوں میں ازسر نو گنگناہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔نحوست کے کووں کا شور مدھم پڑ رہا تھا۔مادر وطن کے مستقبل پر ہمارا ایمان تازہ ہو رہا تھا۔

۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں اٹلی کو بھی شکست ہو گئی۔ اس خبر کا اثر حیرت انگیز تھا۔ ثابت ہو گیا کہ جرمن روسیوں کے علاوہ دوسرے دشمنوں کا محاذ بھی توڑ سکتے ہیں۔اس ہمت افزا اعتقاد سے محاذ جنگ پر ہزار ہا سپاہی سرشار ہو گئے۔ وہ اب اطمینان سے ۱۹۱۸ء کے موسم بہار کا انتظار کرنے لگے۔صاف نظر آ رہا تھا کہ دشمن کے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔موسم سرما میں لڑائی معمول کی نسبت دھیمی رہی۔ یہ جھکڑ چلنے سے پہلے فضا میں پیدا ہونے والا سکون تھا۔

غداری بدترین آفت ہے

عین اس وقت جب کہ اس لامتناہی جنگ کوختم کرنے کے لیے آخری یلغار کی تیاری

ہو رہی تھی ذرائع نقل وحمل کی طویل قطاریں سپاہیوں اور گولہ بارود کو محاذ پر پہنچا رہی تھیں افواج کو آخری حملہ کے لیے ترتیب دی جا رہی تھی' ہاں عین اس وقت میں دوران جنگ میں جرمنی کے ساتھ سب سے بڑی غداری کا ارتکاب کیا گیا۔

جرمنی جنگ نہ جیت جائے ۔عین اس وقت جبکہ فتح جرمنوں کے پاؤں چومنے والی تھی جرمنی کے قلب میں خنجر بھونک دینے کی سازش کی گئی۔ یہ ضرب عقب سے لگائی جانی تھی۔تا کہ جرمن موسم بہار کا حملہ نہ کر سکیں۔ اس طرح جرمنوں کی کامیابی ناممکن بنا دی جائے۔گولہ بارود کے کارخانوں میں ایک عام ہڑتال کا بندوبست کیا گیا۔

اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو جرمنی شکست کھا جاتا۔اشتراکی جمہوری پارٹی کا اخبار ''آگے بڑھو'' کی خواہش پوری ہو جاتی ۔اس اخبار کی تمنا تھی کہ وہ اس مرتبہ جرمن کامیاب نہ ہوں۔ گولہ بارود کے بغیر جرمنوں کا محاذ چند ہی ہفتوں میں ٹوٹ جاتا حملہ کرنے کی تمام تجاویز پر پانی پھر جاتا۔اتحادیوں کے بچاؤ کی یہی صورت تھی ۔پھر بین الاقوامی سرمایہ داری کے ٹھیکے دار جرمنی پر بھی قابض ہو جاتے۔ مارکس ازم کے حامیوں نے قومی غداری کے لیے داخلی طور پر جو سازش کھڑی کی تھی اس کا مدعا حاصل ہو جاتا۔مدعا یہ تھا کہ اقتصادیات کی قومی بنیادیں مٹا کر بین الاقوامی سرمایہ داری کا نظام کھڑا کر دیا جائے۔ ایک فریق کی احمقانہ سادہ دلی اور اعتماد اور دوسرے فریق کے ناگفتنی دغا کے باعث آخر یہ مدعا پورا ہو کر رہا۔

گولہ بارود کے کارخانوں میں ہڑتال کروانے سے جس فیصلہ کن کامیابی کی توقع تھی وہ حاصل نہ ہو سکی۔توقع تو یہ تھی کہ محاذ جنگ پر گولہ بارود ختم ہو جائے گا۔ برعکس توقعات کے ہڑتال اتنی دیر جاری نہ رہ سکی جس سے فوج پر تباہی آ جاتی ہاں اخلاقی طور پر جو صدمہ پہنچا وہ مہلک تھا۔

پہلا سوال تو یہ پیدا ہوا کہ جب قوم فتح کی خواہاں نہیں تو فوج کس کی خاطر برسرپیکار ہے ۔یہ عظیم الشان قربانیاں اور محرومیاں کس واسطے برداشت کی جا رہی ہیں ۔جب اہل

وطن کامیابی سے بچنے کی خاطر ہڑتالیں کررہے ہوں کیا سپاہیوں کو اس وقت بھی سر کٹاتے رہنا چاہیے؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ اس حرکت کا دشمن پر کیا اثر ہوا؟

دیوالمانیہ نے روسی جن کو مار گرایا

۱۸۔۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں اتحادیوں کے سر پر مایوسی کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔وہ چار سل سے دیوالمانیہ کے ساتھ زور آزمائی کررہے تھے۔اور آج تک اس کا لنگر نہ اکھاڑ سکے تھے۔وہ ایک ہاتھ سے ان کے خلاف اپنا بچاؤ کرتا رہا تھا۔اور دوسرے ہاتھ سے کبھی مشروق اور کبھی جنوب کے محاذ پر دشمنوں کے خلاف تلوار چلاتا رہا تھا۔آج وہ ان دشمنوں کو غالب آچکا تھا۔اب اس کا عقت محفوظ تھا۔وہ مغرب کے محاذ پر اپنے حریفوں سے نپٹنے کے لیے بالکل آزاد تھا۔یہ دن دیکھنے کے لیے خون کی ندیاں بہادی گئی تھیں۔لیکن آخر کار دیوالمانیہ جو آج تک مغربی محاذ پر محض اپنی سپر سے کام لیتا رہا تھا اب اپنی تلوار کے جوہر یہاں بھی دکھا سکتا تھا۔دشمن یہ محاذ توڑنے میں بار بار ناکام رہ چکا تھا۔اب جرمنوں نے حملہ کرنا تھا۔دشمن کا کلیجہ دہل رہا تھا۔وہ لرزہ براندام تھا۔اسے جرمنوں کی کامیابی سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

پریس اور لندن میں کانفرنس پر کانفرنس ہورہی تھی۔دشمنوں کے پراپیگنڈہ میں بھی ہچکچاہٹ پیدا ہورہی تھی۔اب یہ ثابت کرنا ذرا مشکل تھا کہ جرمنوں کا کامیابی کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔اتحادیوں کی محاذ دانائی سے کام لے کر دم بخود تھا۔ان کے سپاہی تک خاموش تھے۔ان کی حکومتوں کے گستاخانہ جوش وخروش میں کمی آچکی تھی۔ایک ناگوار حقیقت ان پر آشکار ہورہی تھی جرمن سپاہی کے متعلق ان کی رائے بھی تبدیل ہوچکی تھی۔آج تک انہیں سمجھایا گیا تھا کہ جرمن سپاہی تو ایک ایسا احمق کالٹھ ہے جس کی تباہی یقینی ہے۔لیکن آج ان کا مقابلہ اس جوانمردسے تھا جس نے ان کے روسی حلیف کو مار گرایا تھا۔جرمنوں کے عسکری حکام نے حالات سے مجبور ہوکر صرف مشرقی محاذ پر

جارحانہ اقدامات اختیار کرنے کی جس پالیسی پر شروع سے عمل کیا تھا۔ اب اتحادیوں کو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ گویا جرمنی کی وہ پالیسی تدبر کا شاہکار تھی۔ جرمن تین سال سے متواتر روسی محاذ کے ساتھ اپنا سر ٹکرا رہے تھے۔ پہلے واپسے نظر آتا تھا گویا کامیابی کی کوئی صورت ہی نہیں۔ ان بے نتیجہ کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ آخرکار روسی جن محض اپنی کثرت افواج کے بل پر ہی غالب آ جائے گا۔ جرمنی کا اتنا خون بہہ جائے گا کہ وہ نڈھال ہو کر رہ جائے گا۔ واقعات بھی دشمن کی ان امیدوں کا ساتھ دیتے معلوم ہوتے تھے۔

حریف کی امیدوں پر پانی پھر گیا

ستمبر ۱۹۱۴ء کے اوائل میں ٹینن برگ کی لڑائی کے بعد جنگی قیدیوں کی لامتناہی قطاریں جرمنی میں داخل ہوئیں۔ اس کے بعد تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ جوں ہی ایک فوج کو شکست دے کر ختم کیا جاتا ایک دوسری فوج اس کی جگہ لینے کو آ جاتی۔ زار روس کی غیر معمولی وسیع سلطنت سپاہیوں کا ایک غیر مختتم خزانہ تھی۔ جنگ کی دیوی کے سامنے بھینٹ چڑھانے کو تازہ بتازہ شکار موجود رہتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ جرمنی اس قسم اک مقابلہ کب تک جاری رکھ سکتا ہے۔ کیا ایک دن ایسا نہ آ جائے گا جب جرمنوں کی فتح یابی کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ لیکن روس کے پاس پھر بھی آخری لڑائی کے لیے افواج باقی ہوں گی؟ پھر کیا ہوگا؟ انسانی ہمت کے اندازے کے مطابق جرمنی پر روس کی فتح میں تاخیر تو کی جا سکتی تھی لیکن بالآخر اس سے بچاؤ محال دکھائی دیتا تھا۔

روس سے جو امیدیں وابستہ تھیں آج سب خاک میں مل گئیں۔ اتحادیوں کے جس حلیف نے باہمی مفاد کی نگہداشت میں سب سے زیادہ خون قربان کیا تھا آج اس کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ زمین پر منہ کے بل پڑا تھا۔ اس کا انتھک دشمن بالآخر غالب آ چکا تھا۔ اتحادیوں کے سپاہی جو آج تک اندھے اعتماد میں سرشار رہا کرتے تھے آج ناامیدی اور خوف سے لرز رہے تھے۔ انہیں آنے والے موسم بہار کا دھڑکا کھائے

جا رہا تھا۔ جب جرمن مغربی اتحاد پر اپنی تمام قوت جمع نہ کر سکتے تھے تب تو یہ اتحادی سپاہی جرمنوں کی صفیں توڑنے میں ناکام رہ چکے تھے۔ آج شجاعت کے پتلوں کے اس حیران کن ملک کی غیر منقسم افواج سے سابقہ تھا کامیابی کی امید کون کر سکتا تھا۔ جرمن مغربی محاذ پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں جمع کر رہے تھے۔

جنوبی ٹیرول میں اطالوی جرنیل کڈورنا کی فوجوں نے جس بری طرح ہزیمت اٹھائی تھی آج فلانڈرز کے محاذ پر اتحادی سپاہیوں کے مایوس چہرے اس کی شہادت دے رہے تھے۔ وہاں کے واقعات کا اثر یہاں محسوس ہو رہا تھا۔ یا تو وہ کبھی فتح پر ایمان رکھتے تھے۔ یا آج آنے والی شکست سے ڈرنے لگے۔

جو غیروں سے نہ ہوا تھا اپنوں نے کر دیا

یہ عالم تھا۔ سردی کی ان راتوں میں جب اس عظیم الشان حملہ کرنے کے لیے بڑھنے والی جرمن فوجوں کی چاپ سنائی دینے کا گمان ہوتا تھا' جب خوف سے لرزہ براندام ہو کر فیصلہ کی گھڑی کا انتظار ہو رہا تھا' عین اس وقت جرمنی میں ایک بھیانک روشنی چمکی جس کی کرنوں نے دشمن کی صفوں میں توپ کے گولوں سے پیدا ہو جانے والے اندھیرے سے اندھیرے گڑھوں میں بھی اجالا کر دیا۔ ہاں عین اس وقت جبکہ جرمن لشکروں کو عظیم الشان حملہ کرنے کے لیے آخری ہدایات دی جا رہی تھیں جرمنی میں عام ہڑتال پھوٹ پڑی۔

پہلے تو دنیا حیرت سے گنگ رہ گئی پھر دشمن کے پراپیگنڈہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آخری گھڑی آنے سے پہلے وہ اس نئی داستان کو لے اڑا۔ اتحادی سپاہیوں کے ڈوبتے ہوئے حوصلے بحال کرنے کے لیے اچانک ایک نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ فتح کا امکان اب یقین کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ آنے والے واقعات کے متعلق پریشانی اور تشویش کو اٹل یقین سے بدل دینا ممکن ہو چکا تھا۔ جن رسالوں کو جرمنوں کے ان حملوں کا سامنا تھا جن کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے' اب ان رسالوں کے دل میں یہ اعتماد پیدا

کیا جا سکتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ جرمن حملوں کی دلیری سے نہیں بلکہ مدافعت کرنے والوں کے صبر سے وابستہ ہے۔ جرمنوں کو دل بھر کر فتوحات کر لینے دو۔ ان کے وطن کو اب فاتح فوج درکار نہیں۔ وہاں انقلاب کا انتظار ہو رہا ہے۔

برطانوی، فرانسیسی اور امریکی اخبارات نے اپنے ناظرین میں یہ خیال پھیلانا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے پراپیگنڈہ کا اہتمام بھی بڑی قابلیت سے کیا جا رہا تھا۔ یہ پراپیگنڈہ محاذ جنگ پر سپاہیوں کے حوصلے قائم کر رہا تھا۔

''جرمنی کے سر پر انقلاب منڈلا رہا ہے''۔ ''اتحادیوں کی فتح ناگزیر ہے''۔ وہ انگریز سپاہی جن کو ٹامی کہہ کر پکارا جاتا تھا اور وہ فرانسیسی سپاہی جن کا نام پوئلو رکھ چھوڑا ہے ان کو ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر دوائی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہماری رائفلیں اور گن مشینیں آج بھی آگ برسا سکتی تھیں۔ لیکن اب اس بارش کا نتیجہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کی جگہ سینہ سپر مقابلہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس مقابلہ کے پیچھے ایک مستقل اعتماد کی جھلک تھی۔

یہ گولہ بارود کے کارخانوں میں ہڑتال کا پھل تھا۔ تمام دشمن ممالک کو اب پھر فتح کا یقین ہو گیا۔ ان کے عزائم پختہ ہو گئے۔ اتحادیوں کی صفوں میں مفلوج کر دینے والی جس مایوسی کا دور دورہ تھا اب وہ رفع ہو گئی۔ اس طرح یہ ہڑتال ہزارہا جرمن سپاہیوں کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس بزدلانہ ہڑتال کے قابل نفرت کرتا دھرتا انقلاب کے بعد جرمنی میں بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں کے امیدوار بن بیٹھے۔

مدمقابل کو گرتے گرتے سہارا مل گیا

آغاز میں جرمن سپاہی ان واقعات کے اثر سے محفوظ رہے۔ لیکن دشمن تو ان توقعات سے ایک مستقل اثر قبول کر چکا تھا۔ اب اس کی قوت مدافعت ایک ایسی فوج جیسی نہ تھی جس کی آنکھوں کے سامنے شکست دکھائی دے رہی ہو۔ اس نے فتح کے لیے ہر قربانی ادا کرنا کا عزم بالجزم کیا تھا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ انسانی عقل کے ہر اندازے

کے مطابق جرمنوں کی ہزیمت یقینی ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ مغربی محاذ جرمنوں کے حملہ کے سامنے مدافعت کے چند مہینے کسی نہ کسی طرح گزار دے۔ اتحادی ممالک کی پالیمنٹوں نے بھی بہتر مستقبل کا احساس کرتے ہوئے اس پراپیگنڈہ کے لیے بڑی بڑی رقوم منظور کر دیں جس سے جرمنی کا داخلی اتحاد پارہ پارہ کرنا مطلوب تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے مغربی محاذ پر جرمنوں کے پہلے دونوں حملوں اور پھر آخری حملہ میں بھی حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ان حملوں میں شرکت کے تاثرات میری زندگی کے عظیم ترین تاثرات ہیں۔ میں ان تاثرات کو عظیم ترین اس لیے کہتا ہوں کہ اب آخری مرتبہ جنگ نے مدافعت چھوڑ کر جارحانہ پہلو بدلا۔۱۹۱۴ء کی طرح آج ہم پھر حملہ آور تھے۔

تین سال تک خندقوں اور کھائیوں کے جہنم میں مصیبتیں جھیلنے کے بعد جب دشمن سے حساب چکانے کا وقت آ گیا تو ہر جرمن سپاہی نے اطمینان کا سانس لیا۔ایک مرتبہ پھر فوج کے مختلف بٹالین جوش سے تالیاں بجا رہے تھے۔جو جھنڈے کامیابی کی مقدس یاد کے لیے وقف ہو چکے تھے آج ان پر آخری مرتبہ پھولوں کے ہار چڑھائے گئے۔ ایک دفعہ پھر مارچ کرنے والے سپاہیوں کی لامتناہی قطاروں سے حب وطن کے گیت آسمان کی طرف بلند ہوئے۔رب العزت نے آخری مرتبہ اپنے ناشکرگزار بندوں پر رحمت کی بارش کی۔

شہدائے جنگ اور کفن چور

۱۹۱۸ء کے موسم گرما کے عین وسط میں سارے محاذ پر ایک حبس کی کیفیت تھی۔وطن میں خانہ جنگیوں نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔آخر بات کیا تھا۔محاذ جنگ پر سپاہیوں کی مختلف ٹکڑیوں میں اس موضوع کے خوب چرچے تھے۔''اب جنگ بے فائدہ ہے۔کسی بیوقوف کو فتح کی امید باقی ہو سکتی ہے۔قوم جنگ سے بے تعلق ہو چکی ہے۔صرف بادشاہ اور سرمایہ دار جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں''۔ یہ تھے وہ خیالات جو وطن سے ہمارے

پاس بھیجے جاتے تھے۔ پھر سپاہیوں میں اس سوال پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا۔

شروع شروع میں تو کوئی ان باتوں کی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ بھئی عام رائے دہندگی کا اختیار مل جانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ ہم چار سال سے اس غرض کے لیے تو سربکف نہیں تھے۔ اس قسم کے دعوے ان مقاصد کو نظر انداز کر دیتے تھے جنہیں لے کر شہدائے جنگ گھروں سے نکلے تھے۔ ان کفن چوروں کی یہ بزدلانہ حرکت شہیدوں کی قبروں کو ٹھوکر لگانے کے مترادف تھی۔ فلانڈرز کے محاذ پر جب ہمارے سپاہی یقینی موت کے منہ میں جا رہے تھے تو کیا اس وقت ان کیلبوں پر یہ نعرہ تھا کہ ''حق عام رائے دہندگی۔ زندہ باد''۔ ہرگز نہیں وہ تو پکار رہے تھے کہ:

سارے جہاں سے اچھا ہے جرمنی ہمارا!

دیکھنے میں تو یہ معمولی فرق دکھائی دیتا ہے' لیکن ذرا اس کی اہمیت پر غور فرمائیے! یہ لوگ جو آج عام رائے دہندگی کے نعرے لگا رہے ہیں لڑائی کے وقت کون سے بلوں میں گھسے ہوئے تھے۔ ہم محاذ جنگ پر رہنے والے تو اس سیاستدانوں کے ہجوم سے نا آشنا ہیں! جب مخلص جرمن بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے تو ان پارلیمنٹری شرفائیں سے تو بہت کم ذات شریف وہاں دکھائی پڑتے تھے۔

ان پرانے سپاہیوں کو جنہوں نے محاذ جنگ پر لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ حضرت ایبرٹ' شائیدیمین' بارتھ' لاسک نحت وغیرہ وغیرہ کے تصنیف کردہ عقائد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم حیران تھے کہ یک لخت پیچھے رہنے والوں نے فوج کی پرواہ کیے بغیر خود ہی تمام حاکمانہ اختیارات کیوں سنبھال لیے۔

آغاز سے ہی اس مسئلہ کے متعلق میرا ایک مخصوص اور واضح عقیدہ تھا۔ جن بد بخت پارٹی باز لیڈروں کے جتھے نے عوام سے غداری کی تھی ان میں سے تہ دل سے نفرت کرتا تھا۔ بڑی دیر سے جان چکا تھا کہ اس ملعون ٹولی کو قومی مفاد کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کو تو فقط اپنی جیبیں بھرنے کی پرواہ تھی۔ میری رائے میں انسب کو تختہ دار پر کھینچنا چاہیے تھا۔

وہ جرمنی کا امن قربان کرنے بلکہ خود جرمنی کی شکست برداشت کرنے کو بھی تیار تھے تا کہ ان کی غرضیں پوری ہوسکیں ان کی آرزوؤں کا خیال کرنا تو محنت کشوں کے مفاد کو چوروں کی ایک ٹولی کی خاطر قربان کرنے کے مترادف ہوگا۔ ان کی خواہش پوری کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جرمنیکو قربان کر دیا جائے۔

فوج کی اکثریت کی رائے بھی ابھی تک یہی تھی۔ برعکس اس کے وطن سے جو کمکی افواج آکر ہم میں شامل ہو رہی تھیں ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی حتیٰ کہ ان کی آمد تقویت کے بجائے کمزوری کا سبب بن رہی تھی۔ بالخصوص نوجوان رنگروٹ تو اکثر بالکل ہی نکمے تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ کیا یہ لوگ اسی قوم کے فرزند ہیں جس نے اپنے نونہال یاپرس کے گردنواح کی لڑائیوں میں بھیجے تھے۔

سیلاب آتش سے وضو

اگست اور ستمبر میں پست ہمتی کی علامات زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں۔ حالانکہ ان مہینوں میں دشمن کے جارحانہ حملوں کی سختی ہماری سابقہ مدافعانہ لڑائیوں کی شدت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی۔ دشمن کے اس حملے کے مقابلہ میں ہمارا حافظہ سومے اور فلانڈرز کے بھیانک معرکے ہمیشہ زیادہ ہولناک قرار دے گا۔

ستمبر کے اواخر میں میرا رسالہ تیسری مرتبہ پھر اسی مقام پر جا پہنچا جہاں ہم نے نوجوان رضا کاروں کی حیثیت سے حملہ شروع کیا تھا۔ اس یاد سے دل پر کیا گزرتی تھی یہاں ہم نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۱۴ء میں سیلاب آتش سے وضو کیا تھا۔ ہم نوجوانوں کی رجمنٹ جس کے دلوں حب وطن سلگ رہی تھی اور لبوں پر رجزیہ گیت جاری تھے اس طرح سے میدان جنگ میں اتری گویا کسی محفل رقص میں حصہ لینے جا رہے تھے۔ مادر وطن کی حریت اور استقلال کے تحفظ کی خاطر یہاں عزیز ترین خون بے دریغ بہایا گیا تھا۔

۱۹۱۷ء میں ہم نے زمین کے اس مقدس ٹکڑے پر دوبارہ قیام کیا۔ کیا ہمارے

بہترین ساتھی اس خاک میں مدفون نہ تھے؟ ان میں سے اکثر تو وہ بچے ہی تھے۔ یہ وہ سپاہی تھے جن کی آنکھیں جوش عشق سے دمک رہی تھیں۔ اور حال یہ کہ وہ وطن کی خاطر موت کے منہ میں برضاؤ رغبت داخل ہو گئے تھے۔ جب ہم اس مقدس مقام پر پہنچے جہاں ہم نے کھڑے ہو کر ''تادم مرگ وفاداری اور فرض شناسی'' کا حلف اٹھایا تھا تو ہم میں سے جو بڑی عمر کے سپاہی شروع سے اس رجمنٹ میں شامل رہے تھے ان کے دل بھر آئے تھے۔ تین سال گزرے اسی رجمنٹ نے حملہ کر کے یہ علاقہ فتح کی تھی۔ اب ایک جان گداز کشمکش میں ہم اسی علاقہ میں مدافعت پر مامور کیے گئے تھے۔

انگریزوں نے تین ہفتے تک توپوں سے گولہ باری کر کے فلانڈرز پر اپنے بڑے حملے کی تیاری جاری رکھی۔ ہمیں ایسے محسوس ہوتا تھا گویا شہیدوں کی روحیں قبروں سے نکل کر وہاں پھر ایک مرتبہ زندہ ہو گئیں۔ ہماری رجمنٹ کیچڑ میں خندقیں کھود کر وہیں ڈٹ گئی۔ چاروں طرف توپ کے گولوں سے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ زمین میں سوراخ ہو رہے تھے۔ لیکن بہادر اپنے موریچوں سے ٹلنا چھوڑ ہلنے تک کا نام نہ لیتے تھے۔ ہاں روز بروز ان کی تعداد کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر ۳۱ جولائی ۱۹۱۷ء کو انگریزوں کا حملہ شروع ہوا۔

اگست کے شروع میں ہماری جگہ دوسری فوجیں آ گئیں۔ ہمیں ستانے کے لیے واپس بھیج دیا گیا۔ رجمنٹ میں سپاہیوں کی چند ہی کمپنیاں باقی رہ گئی تھیں۔ یہ سپاہی جب کیچڑ سے لتھڑے لڑکھڑاتے ہوئے واپس لوٹے تو انسانوں کی نسبت بھوتوں سے زیادہ مشابہ نظر آتے تھے انگریز چند سو گز زمین اور مٹ کے سوا اس حملہ سے اور کوئی انعام حاصل نہ کر سکے۔

پاؤں تلے زمین نکل گئی!

اب ۱۹۱۸ء کا موسم خزاں تھا۔ اور ہم تیسری مرتبہ اسی علاقہ میں کھڑے تھے جس پر ۱۹۱۴ء میں ہم نے حملہ کیا تھا۔ کامینز کا گاؤں جہاں سے ہم نے پہلے حملہ شروع کیا تھا

آج میدان کارزار کے حلقہ میں شامل تھا۔ گردو پیش کے ماحول میں بہت کم تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں سپاہیوں میں بڑی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اب وہ سیاسیات پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اور سب مقامات کی طرح وطن سے آنے والا زہر یہاں بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ نووارد سپاہی تو اس زہر سے سراسر مسموم ہو چکے تھے۔ وہ وطن سے تازہ تازہ آئے تھے۔

۱۳۔۱۴۔ اکتوبر کی درمیانی شب کو انگریزوں نے پائیرس کے جنوب میں زہریلی گیس چھوڑ کر حملہ کی ابتدا کی۔ انہوں نے پیلی گیس استعمال کی جس کے اثرات سے تب ہم ناواقف تھے۔ کم ازکم کسی کو اس کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس رات مجھے اس کا تجربہ ہونا تھا۔ وردک کے جنوب میں ایک ٹیلے پر ۱۳ اکتوبر کی رات کو ہم پر کئی گھنٹے تک زہریلی گیس کے گولوں کی زبردست بارش کی گی کبھی کم اور کبھی زیادہ یہ گولہ باری ساری رات جاری رہی۔ آدھی رات تک ہ میں سے کئی سپاہی ناکارہ ہو چکے تھے۔ بعض تو ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گئے۔ صبح کے قریب مجھے بھی درد محسوس ہونے لگا۔ پندرہ پندرہ منٹ کے بعد درد میں اضافہ ہوا جاتا تھا۔ سات بجے صبح کے قریب میں نے لڑکھڑاتے ہوئے وہ آخری خط افسروں تک پہنچا دیا جو اس جنگ میں محاذ سے واپس لے جانا میری قسمت میں لکھا تھا۔ اس وقت میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ چند ہی گھنٹوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ گویا میری آنکھیں دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ مجھے کچھ بجھائی نہ دیتا تھا۔

مجھے پامیرینیا کے قصبہ پاسے واک میں ایک ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ میں یہیں تھا کہ مجھے جرمنی میں انقلاب بپا ہو جانے کی خبر ملی۔

آسمان پھٹ پڑا

ایک عرصہ سے فضا نامعلوم طور پر ناخوشگوار تھی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ آئندہ چند ہفتوں میں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ جس قسم کی ہڑتال موسم بہار میں کی گئی تھی شاید ویسی ہی ہڑتال دوبارہ کی جائے گی۔

کہا جاتا تھا کہ بحری بیڑے میں بے چینی پھیل گئی ہے۔وہاں سے مسلسل بری افواہیں آ رہی ہیں۔بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ چند بے یارومددگار نوجوان اس خبط میں مبتلا ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ ہسپتال میں سب لوگ جنگ کے خاتمہ کے متعلق باتیں کرتے تھے۔اور امید کرتے تھے کہ اب جلد ہی جنگ ختم ہو جائے گی۔لیکن یہ کسی کو خیال نہ تھا کہ فی الفور ہی ایسا فیصلہ ہو جائے گا۔میں اخبار پڑھنے کے ناقابل تھا۔

نومبر میں عام اضطراب ترقی کر گیا۔اسی حالت میں ایک روز یکلخت اور بغیر کسی اطلاع کے آسمان پھٹ پڑا۔ملاح موٹر لاریوں میں بیٹھ کر آئے۔اور انہوں نے ہمیں بغاوت کرنے کی ترغیب دی۔قوم کے وجود کو آزاد' خوبصورت اور باوقار بنانے کی اس مہم کے سرغنہ کچھ یہودی لونڈے تھے۔ان میں سے کوئی محاذ جنگ پر اپنا فرض ادا کرنے نہ آیا تھا۔امراض خبیثہ کے ایک ہسپتال کی مدد سے پورپے وطن بھاگ آئے تھے۔اب وہ سرخ رنگ کے چیتھڑے گاڑنے یہاں چلے آئے تھا۔

کچھ دنوں سے میری حالت بہتر ہو رہی تھی۔میری آنکھوں کی جلن اور درد میں اب افاقہ تھا۔رفتہ رفتہ مجھے آس پاس کی چیزوں کے دھندلے خاکے بھی دکھائی دینے لگے۔۔اب یہ امید ہو سکتی تھی کہ میری بینائی اس حد تک ٹھیک ہو جائے گی جس سے میں بعد میں کوئی پیشہ اختیار کر سکوں۔دوبارہ نقاشی کے قابلہونے کی تو اب کوئی امید باقی نہ تھی۔غرض میں اس سانحہ کے رونپذیر ہونے کے وقت روبصحت تھا۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ غداری کا مظاہرہ مقامی حدود تک محدود ہے۔میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی یہی سمجھا کر قائل کرنا چاہا۔ہسپتال کے بوریا کے صوبہ سے تعلق رکھنے والے ساتھی بالخصوص میری باتوں پر توجہ دیتے تھے۔وہ انقلاب کی حمایت کی کوئی نیت نہ رکھتے تھے۔مجھے یقین آتا تھا کہ میونچ میں بھی اس دیوانگی کا اثر پھیل سکتا ہے۔میرا خیال تھا کہ وہاں خاندان ڈٹل باش کے نوجوانوں کا رسوخ چند یہودیوں کی خواہشات سے زیادہ موثر ثابت ہو گا۔میں بے اختیار اب بھی یہی یقین رکھتا تھا کہ یہ

سارا ہنگامہ بحری بیڑے کی بغاوت تک محدود ہے چند ہی روز میں یہ بغاوت دبا دی جائے گی۔

میں نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی زندگی کی سب سے زیادہ حیران کن خبر سنی۔ بار بار وہی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جسے میں ایک مقامی ہنگامہ تصور کیے بیٹھا تھا در حقیقت وہ ایک عام انقلاب ہے۔ اس کے ساتھ ہی محاذ جنگ سے یہ شرمناک سناؤنی پہنچی کہ ہتھیار ڈالنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ ہیں! یہ بھی ممکن ہے!!۔

میں رو پڑا؟

۱۰ نومبر کو مقامی پادری نے آ کر ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس تقریر سے ہمیں حقیقت حال کا پتہ چلا۔

تقریر سنتے وقت مجھے گھبراہٹ کا دورہ پڑ رہا تھا۔ بے چارہ پادری تخت و تاج سے بادشاہ کی دستبرداری کا ذکر کرتے وقت لرز رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمارا وطن اب ایک جمہوریہ بن گیا ہے۔ ہمیں قادر مطلق سے دعا کرنی چاہیے کہ اس جدید نظام سلطنت کو اپنی رحمت سے محروم نہ رکھے۔ آنے والے دنوں میں ہماری قوم پر اس کی نگاہ کرم رہے۔ پادری اپنی تقریر میں شاہی خاندان کی خدمات کی مختصر توصیف سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ان خدمات کا ذکر کیا جو خاندان شاہی نے پومیرینیا کے لیے سرانجام دی تھیں۔ انخدمات کا ذکر کیا جو شاہی خاندان نے پرشیا کے لیے سرانجام دیں۔ ان خدمات کا ذکر کیا جو خاندانشاہی نے سارے جرمنی کے لیے سرانجام دیں۔ اور یہاں پہنچ کر پادری نے رونا شروع کر دیا۔ حاضرین جلسہ پر گہری افسردگی چھا گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت کوئی آنکھ خشک نہ تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے ہاتھ سے توضبط کا دامن چھوٹ گیا بڈھے پادری نے پھر اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم یہ طویل جنگ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جنگ میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہم فاتحین کے رحم و کرم پر ہیں۔ مستقبل میں ہمارے وطن کو بھاری بوجھ برداشت کرنے ہوں گے۔ ہم

متارکہ کی شرطیں قبول کر رہے ہیں اب ہمارا بھروسہ کل کے دشمن کی فیاضی پر ہے۔میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا اور کچھ سننا ناممکن ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرہ میں واپس آیا اور نڈھال ہو کر اپنے بستر پر گر پڑا۔ مجھے چاروں جانب تاریکی چھائی ہوئی محسوس ہوئی۔میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا میں تکیہ اور کمبل کے درمیان منہ چھپا کر لیٹ گیا۔

جس روز میں نے اپنی ماں کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہائے تھے تب سے لے کر آج تک میری آنکھ کبھی گیلی نہیں ہوئی تھی۔میرے بچپن میں جب کبھی مجھے فلک ستاتا میری تاب مقاومت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی۔ساری جنگ کے دوران میں موت کئی مخلص دوست اور ساتھی ہماری صفوں سے چھین لے گئی۔لیکن میں نے حرف شکایت لبوں تک لانا بھی گناہ سمجھا۔کیا وہ جرمنی کے لیے جانیں فدا نہ کر رہے تھے۔اس جناتی جنگ کے آخری ایام میں جب میں زہریلی گیس کے لپیٹے میں آ گیا۔اور میری آنکھوں پر اس کا اثر ہونے لگا تو ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جانے کے خوف سے ہمارے اوسان خطا ہو گئے لیکن اس وقت بھی میرے ضمیر نے فی الفور مجھے للکارا: اے قابل رحم بد بخت تیرے جیسے ہزاروں دوسرے فرزندان وطن تجھ سے بدتر مصیبتیں جھیل رہے ہیں کیا تو اپنی اس بدنصیبی پر واویلا مچائے گا۔غرض میں نے قسمت کا لکھا خاموشی سے برداشت کیا۔ مجھے احساس تھا کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔قومی مصائب کے مقابلہ میں انفرادی مصائب کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

کیا قربانیاں اکارت جائیں گی

وہ سب کچھ اکارت تھا۔وہ قربانیاں اور دکھ جھیلنا اکارت تھا۔ان گنت مہینے بھوک پیاس برداشت کرنا اکارت تھا۔ جب موت کے ڈر سے روح کانپتی تھی تب فرض شناسی کے خیال سے مورچوں پر ڈٹے رہنا اکارت تھا۔اداے فرض کی کوشش میں بیس لاکھ جوانوں نے سر کٹانا اکارت تھا۔ذرا ان لاکھوں سپاہیوں کا تو خیال کرو جو مادر وطن کے

اعتماد پر گھروں سے باہر نکل پڑے اور پھر واپس نہ آئے۔ ان شہیدوں کی قبریں پھٹ جانی چاہئیں تا کہ ان کی روحیں خون اور کیچڑ سے لتھڑی ہوئی وطن واپس آئیں۔ اور ان قابل نفرت غداروں سے بدلہ لیں جنہوں نے وطن کی خاطر انسان کی سب سے بڑی قربان ضائع کر دی۔ کیا اگست اور ستمبر ۱۹۱۴ء میں سپاہی اس لیے جان پر کھیل گئے تھے۔ کیا اسی سال کے موسم خزاں میں رضا کاروں کے رسالوں نے اپنے پیشروؤں کی تقلید اسی لیے کی تھی۔ وہ سترہ سترہ سال کے نونہال کیا اسی غرض سے فلانڈرز کی مٹی میں مل گئے تھے۔ جرمن ماؤں نے مادر وطن کی خاطر جب بھرے ہوئے دلوں سے اولاد کو رخصت کیا تھا اور ان کے بچے لوٹ کر نہ آئے تھے تو کیا اس وقت اس قربانی کا یہی ثمرہ ان کے پیش نظر تھا۔ کیا یہ سب کوششیں فقط اسلیے تھیں تا کہ قابل نفرت مجرموں کی ایک ٹولی مادر وطن پر مسلط ہو جائے۔

پگھلا دینے والی گرمی اور اندھا کر دینے والی برف باری میں کیا جرمنی سپاہی اسی مقصد کے لیے جدو جہد کر رہے تھے۔ کیا بھوک پیاس، سردی، راتوں کی بے خوابی، اور دنوں کی سفر کی تھکن اسی غرض سے برداشت کی تھی۔ توپوں کی گولہ باری کے جہنم میں کیا اسی لیے دن گزارے تھے۔ زہریلی گیس کے حملوں میں سانس گھٹ جانا اور تڑپنا اسی لیے تھا۔ ٹلنا چھوڑ ملنے کا نام نہ لینا ہر دم مادر وطن کو دشمن کے حملے سے بچانے کے لیے ڈٹے رہنا۔ ان شجاعت کے پتلوں کی لوح مزار پر تو حسب ذیل کتبہ زیب دیتا تھا:

''مسافر! جب تو جرمنی پہنچے تو اہل وطنکو بتا کہ ہم مادر وطن اور اپنے فرض سے اخلاص کا حق ادا کرتے ہوئے یہاں پڑے ہیں''۔ اور اہل وطن نے کیا کیا؟

میرے اندر نفرت کا تنور کھولنے لگا

پھر کیا صرف ان قربانیوں کو ہی مدنظر رکھنا ہے۔ کیا جرمنی کی تاریخ کا کوئی تقاضا نہیں؟ کیا جرمنی کا ماضی بے حقیقت ہے؟ کیا ہم آج بھی ماضی کی روایات میں فخر محسوس کرنے کے مستحق ہیں؟ ہم اپنی اس حرکت کے لیے آئندہ نسلوں کے سامنے کیا وجہ

جواز پیش کریں گے؟

یہ چوروں کی ٹولی کیسی قابل نفرت اور بے حیا ہے!

جو زہرہ گزار واقعات رونما ہو چکے تھے۔ جوں جوں ہم انکے متعلق مزید اطلاعات فراہم کرتا ہوں توں توں میرے بدن میں آگ سی لگ رہی ہے۔ ان المناک سانحات کے مقابلہ میں میری آنکھوں کا درد کیا حیثیت رکھتا تھا۔

اس کے بعد ایک دن اور ایک رات گزارنا میرے لیے دوبھر تھا۔ صرف دشمن پر بھروسہ کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا ایک ایسا مشورہ تھا۔ جو صرف مجرم اور دروغ گو ہی دے سکتے تھے۔ بے تابیکی ان راتوں میں میرے اندر ایک نفرت کا تنور کھولنے لگا۔ یہ نفرت اس بزدلانہ واردات کے ارتکاب کرنے والوں کے خلاف تھی۔

آنے والے دنوں میں میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہ بات اب آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔ میرا ذاتی مستقبل جس کی مجھے آج تک اتنی فکر تھی اس کی مجھے اب ذرا پروا نہ تھی۔ ایسی بنیادوں پر کسی عمارت کھڑی کرنے کی امید فضول تھی۔ آخر کار مجھ پر ہویدا ہونے لگا کہ یہ ہونی شدنی تھی۔ گو اسے ماننے کو جی نہ چاہتا تھا لیکن مجھے ہمیشہ اسی کا دھڑ کا لگا رہتا تھا۔

شہنشاہ ولیم ثانی پہلا جرمن تاجدار تھا جس نے مارکس ازم کے لیڈروں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ گروہ ان لچوں پر مشتمل ہے جنہیں وضع داری کا کوئی خیال نہیں۔ جب وہ ایک ہاتھ بڑھا کر شہنشاہ سے مصافحہ کر رہے تھے تو اس وقت بھی ان کا دوسرا ہاتھ کمر میں خنجر ٹٹول رہا تھا۔

یہود کے سات سمجھوتہ کا کوئی امکان نہیں۔ یہ تو صاف صاف مرنے یا مار ڈالنے والی لڑائی ہے۔

جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے تبھی فیصلہ کر لیا کہ اب میں سیاسیات میں حصہ لوں گا۔

☆☆☆

باب ہشتم :: میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

گمنامی راہنمائی کے راستہ میں رکاوٹ ہے

میں نومبر کے اخیر میں میونچ واپس آ گیا۔ سیدھا اپنی رجمنٹ کے ٹھکانے پر پہنچا جس کا انتظام اب سپاہیوں کے پنچایت کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ چونکہ مجھے یہ نظام ناپسند تھا اس لیے جس قدر جلد ہو سکا میں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی میرا زمانہ جنگ کا یار وفادات نسٹ شمڈٹ میرے ہمراہ تھا۔ ہم ٹران سٹائن آ گئے۔ اور کیمپ ٹوٹنے تک یہیں مقیم رہے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں ہم پھر میونچ لوٹ آئے۔

یہاں کی صورت حال موجودہ نہج پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ واقعات کا اٹل میلان یہ تھا کہ انقلاب کا احاطہ اور وسیع ہو جائے گا۔ آئزنر کی موت سے یہ تبدیلی اور بھی تیزی سے واقع ہوگئی۔ آخر کار ہر جگہ پنچایتیوں کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ چاروں جانب یہودیوں کا راج تھا۔ اگر چہ بالاخر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی لیکن دراصل انقلاب بپا کرنے والوں کا بنیادی مقصد یہی صورت حال پیدا کرنا تھا۔

ان دنوں میں دماغ میں ان گنت تجویزیں آیا کرتی تھیں۔ میں سارا سارا دن بیٹھا یہی سوچتا رہتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر تجویز اس پتھر پر سر پٹخ کر رہ جاتی کہ میں بالکل گمنام تھا۔ میں نتیجہ خیز عمل کے لیے پہلی ضروری شرط ہی پوری نہ کر سکتا تھا۔ میں یہ وضاحت بعد میں کروں گا کہ جو سیاسی پارٹیاں اس وقت موجود تھیں میں ان میں سے کسی میں شامل ہونا کیوں پسند نہیں کرتا تھا۔

میونچ میں سوویٹ انقلاب اپنے طبعی مراحل طے کر رہا تھا۔ اسی دوران میں مرکزی پنچایت میری سرگرمیوں سے ناراض ہوگئی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو میری گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے۔ مجھے گرفتار کرنے کے لیے تین کارندے پہنچے لیکن جب میں نے اپنی رائفل اٹھا کر گولی مارنے کی دھمکی دی تو تینوں بھاگ نکلے۔

میونخ کمیونسٹوں سے آزاد کروایا جا چکا تھا تو اس کے چند ہی روز بعد مجھے ایک تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا گیا۔ یہ کمیشن نمبر دو کی پیدل رجمنٹ میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی سرگرمیوں پر نگرانی رکھے۔ نیم سیاسی سرگرمیوں سے میرا یہ پہلا واسطہ تھا۔

سماجی انقلاب پارٹی

ایک ہفتہ بعد مجھے لیکچروں کا ایک سلسلہ سننے کا حکم موصول ہوا۔ ان لیکچروں کا اہتمام فوجیوں کی خاطر کیا گیا تھا۔ اور مقصد ایسے بنیادی اصول ذہن نشین کروانا تھا کہ جن پر ایک سپاہی کے سیاسی عقائد مبنی ہونے چاہئیں۔ مجھے اس تنظیم کا فائدہ یہ ہوا کہ سپاہی بھائیوں سے ملنے کا ایک موقع ہاتھ آیا۔ وہ بھی میری طرح سوچتے تھے۔ میں ان سے حقیقت حال کے متعلق بے تکلف تبادلہ خیالات کرسکتا تھا۔ کم وبیش ہم سب متفق تھے کہ نومبر کے غدر میں حصہ لینے والے مادر وطن کو ان فوری خطرات سے بچانے کے اہل نہیں جو اس وقت جرمنی کے سر پر منڈلا رہے تھے اس میں اشتراکی جمہوری پارٹی بھی شامل تھی اور اعتدال پسند پارٹیاں بھی۔ ہم سب کی یہ رائے تھی کہ اگر کھاتے پیتے طبقہ کے قوم پرستوں کی نیتیں سوفیصدی ٹھیک ہوں تب بھی جو نقصان ہو چکا ہے وہ اس کی تلافی کرنے کی استعداد سے محروم ہیں۔ یہ نقصان پورا کرنے کے چند لوازمات درکار تھے جن کے بغیر یہ کام نہ ہوسکتا تھا۔ کھاتے پیتے طبقہ کے قوم پرست ان لوازمات سے عاری تھے۔ ہم نے اس وقت جو رائے قائم کی تھی وہ آنے والے برسوں میں صحیح ثابت ہوئی۔

ہم اپنے محدود حلقہ میں ایک نئی پارٹی قائم کرنے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے اس وقت ہمارے سامنے وہ موٹے موٹے اصول تھے جن پر بعد میں جرمن مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم جو نئی تحریک چلانا چاہتے ہیں اس کے نام ہی میں عوام کے لیے ایک کشش ہونی چاہیے۔ اگر یہی شرط پوری نہ ہوئی تو ہماری سب کوششیں اکارت جائیں گی۔ اسی تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے سماجی انقلاب پارٹی کا نام پسند کیا' یہ نام چننے

کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری جماعت جن اصولوں پر سماج کو کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بالکل انقلابی ہیں۔

دولت، مزدوروں کی محنت کا دوسرا نام ہے

اس کے علاوہ ایک اور اس سے بھی زیادہ بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے ابتدائی عمر میں اقتصادی مسائل کا جو مطالعہ کیا تھا وہ زیادہ تر سماجی حالات سے براہ راست پیدا ہونے والے اقتصادی تقاضوں تک محدود تھا۔ جب میں نے بعد میں جرمنی کی اتحاد ثلاثہ کی پالیسی کا مطالعہ کیا تو اقتصادیات کے متعلق میرے علم میں مزید وسعت پیدا ہوئی اس پالیسی کی بنا اقتصادی صورت حال کے سراسر غلط اندازے پر مبنی تھی مستقبل میں جرمن قوم اپنا رزق کہاں سے حاصل کرے گی اس مسئلہ کے حل کی بابت بھی خیالات الجھے ہوئے تھے۔ سارے استدلال کی بنیاد اس تصور کو اندھا دھند قبول کرنے پر رکھی گئی تھی کہ سرمایہ اور دولت تو بس مزدوری یا محنت کا دوسرا نام ہے چونکہ محنت اور مزدوری پر ایسے تمام حالات کا اثر پڑتا ہے جن سے انسان کو کام کرنے میں سہولت ہو یا رکاوٹ پڑے۔ اس لیے سرمایہ بھی انہیں حالات کے تابع ہے یہ حالات حکومت اور قوم کے عروج و زوال کے پابند ہیں۔ لہذا سرمایہ بھی حکومت یا بالفاظ دیگر قوم کے اقتدار کی عظمت اور آزادی کا محتاج ہے۔ اس لیے جب قومی مفاد سے سرمایہ اور دولت کے رشتہ پر غور کرنے بیٹھیں تو یہ پہلے سے فرض کر لینا چاہیے کہ سرمایہ دار بے چارے تو خود اپنے بچاؤ اور ترقی کی خاطر قوم اور حکومت کے وفادار ہیں"۔

اگر یہ تصور قبول کر لیا جائے تو سرمایہ سے متعلق حکومت کے فرائض واضح اور آسان دکھائی دیتے ہیں۔ حکومت کو اس سے زیادہ کچھ نہیں آنا چاہیے۔ کہ سرمایہ کو سلطنت کے ماتحت رکھے سرمایہ کو قومی مفاد پر غالب آنے کا موقعہ نہیں ملنا چاہیے۔ غرض سرمایہ کی بابت حکومت کی سرگرمیاں حسب ذیل حدود کے اندر رہنی چاہئیں۔ ایک طرف تو حکومت کا فرض ہے کہ ملک کے اقتصادی نظام کو زندہ اور آزاد حالت میں قائم رکھے۔

دوسری جانب مزدوروں کے سماجی حقوق کی نگہداشت بھی حکومت کے ذمہ ہے۔

سرمایہ کی دو قسمیں

قبل ازیں میں سرمایہ کی دو جداگانہ اقسام کا فرق ٹھیک طرح نہ سمجھتا تھا۔ ایک تو وہ سرمایہ ہے جو کارآمد محنت مزدوری سے پیدا کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ کی ایک قسم اور بھی موجود ہے۔ سرمایہ کی یہ دوسری قسم سراسر سٹہ بازی کی پیداوار ہے۔ مجھے آج تک کبھی اس فرق پر غور کرنے کی اکساہٹ ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ غور کرنے کا موقعہ تو تب ملتا جب کسی وجہ سے میری توجہ ادھر مبذول ہوتی۔

میں نے لیکچروں کے جس سلسلہ کا اوپر ذکر کیا ہے۔ اس میں سے ایک لیکچر دینے والے کا نام الفریڈ فیڈر تھا۔ اس شخص کے خیالات نے مجھے پہلی مرتبہ وہ اکساہٹ محسوس کروائی جس سے میری توجہ سرمایہ کی دو علیحدہ انواع کی جانب مبذول ہوگئی۔

میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس شخص سے سٹہ بازی اور سود خوری کے لیے استعمال کیے جانے والے سرمایہ کا حال سنا۔ اس نے ان اصولوں کی بھی وضاحت کی جن پر اس قسم کے سرمایہ دار کے کاروبار کا دارومدار ہے۔ فیڈر کا پہلا لیکچر سنتے ہی میرے دماغ میں فی الفور خیال آیا کہ مجھے ایک نئی پارٹی قائم کرنے کے لیے وہ مطلوبہ وجہ جواز مل گئی ہے جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

فیڈر کی خوبی میری نگاہ میں یہ تھی کہ وہ بغیر لگی لپٹی رکھے سٹہ بازی اور سود خوری سے پیدا ہونے والے سرمایہ کے دوغلے مزاج کا پردہ پوری شدت سے چاک کر دیتا تھا۔ فیڈر کا دریافت کردہ انکشاف یہ تھا کہ اس قسم کا سرمایہ ہمیشہ سود کا دوسرا نام ہوتا تھا۔ بنیادی طور پر فیڈر کے دعاوی ایسے معقول تھے کہ جو لوگ اس پر نکتہ چینی کرتے تھے وہ بھی اصولاً اس کے خیالات کی سچائی تسلیم کرتے تھے۔ انہیں صرف یہ شک تھا کہ ان اصولوں پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ گویا دوسرے لوگ یہ اس کی کمزوری خیال کرتے تھے۔ لیکن مجھے جو فیڈر کے خیالات کا یہی پہلو اس کی برتری کا قائل کرتا تھا۔

حق کی تلاش اور اس پر عمل دو علیحدہ فعل ہیں

جو شخص ایک اصولی پروگرام پیش کرتا ہے یہ اس کا فرض نہیں کہ وہ اس پر عمل کے مختلف راستے بھی بیان کرے۔ اس کا منصب محض ایک مسئلہ کا عقلی حل تلاش کرنا ہے۔ لہٰذا وہ تو صرف منزل متعین کرے گا۔ راستہ ڈھونڈنا اس کے ذمہ نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا اس کے خیالات بنیادی طور پر درست ہیں یا غلط۔ رہی یہ بات کہ ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا آسان ہے یا مشکل۔ اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ جب ایک اصولی یا عقلی حل تلاش کرنے والا عمل کی گنجائش اور مصلحت اندیشی کی الجھنوں میں پھنس جاتا ہے تو پھر وہ حق مطلق کی تلاش سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کے خیالات ان لوگوں کی رہبری میں قاصر رہ جاتے ہیں۔ جو اصول رہنما یا عقلی روشنی کے متلاشی ہوں۔ اس کی تحقیق کے نتائج بھی شب و روز کی زنجیر میں گرفتار عامیوں کا مشغلہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ کسی تحریک کا اصولی پروگرام بنانے والے کو فقط نصب العین پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ پھر سیاسی لیڈروں کا فرض ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کا راستہ دریافت کریں۔ غرض نظری لائحہ عمل کا خاکہ تیار کرنے والا صرف ازلی و ابدی حقائق ملحوظ رکھے گا۔ برعکس اس کے سیاسی لیڈروں کی سرگرمیاں ہمیشہ عملی گنجائش اور حالات کے تقاضاؤں کے ماتحت سچائی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

سیاسی لیڈر اور سیاسی فلاسفر کا فرق

اصول تلاش کرنے والے کی عظمت اور اس کے خیالات کی فی نفسہ سچائی پر مضمر ہے۔ سیاسی لیڈر کی رتری کا معیار یہ ہے کہ وہ جن اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا خواہاں ہے انکی روشنیمیں کہاں تک واقعات کو کامیابتک پہنچنے کے لیے ٹھیک طرح استعمال کرتا ہے۔ از خود واقعات کے متعلق اس کا اندازہ کہاں تک صحیح ہے۔ ہم اس سیاسی لیڈر کو بڑا کہیں گے جس کی تجویزیں اور کوششیں بارآور ہوں۔ ہم پوچھیں گے کہ کیا وہ اپنا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ برعکس اس کے ایک سیاسی فلاسفر

کے نصب العین کا حصول تو کبھی پ؛ایہ تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل ان سچائیوں اور منزلوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جہاں انسان کی کمزور اور ناقص قوتوں کی رسائی محال ہے۔ انسانی کردار کی عظمت ان بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش میں مضمر ہے۔ جنکو وہ عقل کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن جن کی چوٹیوں پر تدبیر کی کمند ڈالنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ جتنا کوئی عقیدہ اصولاً سچا ہے اتنا ہی وہ زبردست وہگا۔ جس قدر کوئی عقیدہ زبردست ہوگا اتنا ہی اس پر عمل سے احاطہ کرنا دشوار ہوگا۔ کم از کم جہاں تک زبردست عقیدوں کے بروئے کار لانے کا انحصار پر تدبیر ہے وہاں تو انسانی عجز کا یہی حال ہ اہذا ایک سیاسی فلاسفر کا مرتبہ اس کی تجاویز کی کامیابی پر منحصر نہیں۔ اس کے مرتبہ کی پہچان تو یہ ہے کہ اس نے کہاں تک حق مطلق کا انکشاف کیا اور اسکے خیالات کا انسانیت کے ارتقاء پر کیا اثر ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتو ہم بانیان مذاہب کو عظیم ترین انسان کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ انکی اخلاقی تعلیمات پر کبھی سو فیصدی عمل نہ ہو سکے گا۔ سو فیصدی کا کیا ذکر' ان تعلیمات کا ناقص نمونہ پیش کرنا بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ حتیٰ کہ جس مذہب کو ہم "دین شفیق" کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بھی درحقیقت اپنے عالی نفس بانی کے منشاء کو محض ایک دھندلا عکس ہے۔ اندریں حالات اگر دین عیسیٰ کی عظمت کے لیے کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو یہی کہ اس دین نے انسانی تہذیب' انسانی اور انسانی خوبیوں کا صحیح راستہ دکھایا۔ اگر اس راستہ پر چلنے میں کوئی کمی رہ جائے تو یہ عیسائی مذہب کا قصور نہیں۔

ایک سیاسی فلاسفر اور ایک سیاسی لیڈر کے فرائض کا یہی باہمی امتیاز ہے کہ جس کی وجہ سے ان دو مختلف فرائض کو سرانجام دینے کی قابلیتیں شاذ و نادر ہی کسی ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں۔ چھوٹے درجہ کے سیاسی لیڈر تو بالخصوص کبھی اس سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ بسمارک نے ایک دفعہ ازراہ انکسار کہا تھا کہ سیاسیات حصول ممکنات کے فن کا نام ہے۔ ان چھوٹے درجہ کے سیاسی لیڈروں کی سرگرمیاں بھی کبھی ممکنات کے دائرہ سے

تجاوز نہیں کرتیں۔اس قماش کے سیاسی لیڈر بلند خیالات سے جس قدر محترز رہیں اتنا ہی ان کی کامیابی آسان ہو جاتی ہے۔یہ کامیابی جلد حاصل ہوتی ہے اور مادی لحاظ سے اس کے منافع بھی بالعموم زیادہ ٹھوس ہوتے ہیں۔لیکن ان وجوہات کی بنا پر ایسی کامیابی کی انجام بخیر نہیں ہوتا۔اکثر ایسی کامیابی اپنے مہم کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ان سیاسی مدبرینکی کارگزاری آئندہ نسل کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی وجہ یہ ہے کہ ایسی عارض کامیابی تو حاصل ہی اہم مسائل کو پس پشت ڈال کر کی جاتی ہے۔غور و فکر کا معیار اتنا پست رکھا جاتا ہے کہ ایسی غور و فکر کے نتائج آئندہ نسلوں کے حالات پر حاوی نہیں ہوتے۔

چھاچھ کے پیالے اور تمباکو کی چلم کا پیمانہ

ایسے نصب العین کی پیروی کرنا جو آئندہ نسلوں کے مفاد کا بھی خیال رکھے کچھ زیادہ پر منفعت کاروبار نہیں۔جو شخص یہ مہم سر کرنے نکلتا ہے اسے شاذونادر ہی عوام کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے۔عوام سیاسی اقدار کو ہمیشہ چھاچھ کے پیالے اور تمباکو کی چلم کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی عوام کچھ ایسی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ اس کا فائدہ تو آنے والی نسلوں کو پہنچے گا۔اور وہ بھی معلوم نہیں کب تک۔

جہالت اور غرور قریبی رشتہ دار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ادنیٰ سطح کے سیاسی مدبرین مستقبل کی بہتری ان تمام تجاویز سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہیں۔جن پر عمل ذرا مشکل ہو۔ دراصل اس گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔کہ انہیں اپنی ہنگامی ہر دلعزیزی ضائع ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ایسے سیاسی مدبرین ابن الوقت ہوتے ہیں۔وہ مستقبل کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔چھوٹے حوصلہ کے لوگوں کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی وہ تو وقت گزارنے میں مگن رہتے ہیں اب کی اب کے ساتھ اور تب کی خدا جانے۔

تعمیر جذبہ رکھنے والے سیاسی فلاسفر کی پوزیشن اس سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔اس کی کارگزاری تو مستقبل کے پلڑے میں تلتی ہے وہ آنے والے زمانہ کے خواب دیکھتا

ہے۔ روایتی قاضی جی کی طرح دنیا کے اندیشہ سے دبلا رہتا ہے۔ سیاسی مدبرین کی قابلیت ممکنات کا اندازہ کرنے کی مہارت میں مضمر ہے۔ بانیان سیاست دیوتاؤں کو صرف اس لیے بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ناممکنات کی تمنا اور مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں شہرت سے محروم رہتے ہیں۔ ہاں اگر ان کی تعلیمات باقی رہنے والی ہیں تو وہ آنے والی نسلوں سے ضرور خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔

مدتوں بعد ارتقائے انسانیت کے دوران میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاسی مدبر اور سیاسی فلاسفر دونوں کے جوہر ایک ہی ہستی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسی شخصیت میں دونوں قابلیتوں کی آمیزش جتنی مکمل ہو گی۔ اتنا ہی اس کا سیاسی کام زیادہ دشوار ہو گا۔ ایسا شخص جن مقاصد کے لیے سرگرم عمل ہوتا ہے' وہ ہر بوالہوس کے دل میں جگہ نہیں پا سکتے وہ تو ایسے ایسے مطالبات میں ہاتھ ڈالتا ہے جن کی تڑپ اکا دکا سینہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کی زندگی غیرت اور محبت کی کھینچا تانی میں ہلکان ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اس کے معاصرین اس پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا اپنا قلب آنے والی نسلوں کی دردخواہی سے بے چین رہتا ہے۔ آنے والی نسلیں ہی اس کی صحیح قدر بھی پہچانتی ہیں۔

آنے والے زمانہ کے لیے کسی شخص کی خدمات جس قدر بلند مرتبہ ہوں گی اتنا ہی وہ اپنے معاصرین کی ناقدر شناسی کا شکار ہو گا۔ اسی تناسب سے اس کی جدوجہد زیادہ مشکل ہو گی۔ اسی اندازے کے مطابق اس کی کامیابی کا امکان بھی کم ہو گا۔ کوئی ایسا شخص صدیوں کے بعد کامیاب ہو جائے تو وہ کبھی کبھار اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی آنے والی شہرت کا ہلکا سا عکس جیتے جی بھی دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ اکثر ایسی عظیم شخصیتیں اپنی قربانیوں کے پھل سے محروم رہتی ہیں۔ اگر معاصرین کبھی ان کے لیے پھولوں کے ہار بھی لے آئیں تو یہ نوبت جنازہ اٹھنے کے وقت ہی آتی ہے۔

ارادہ کے دھنی لوگ وہ ہوتے ہیں جو معاصرین کی قدردانی سے محروم رہ کر بھی اپنے

خیالات اور اعتقادات کے لیے خم ٹھونک کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ آئندہ نسلوں کے سینے ایسی ہی شخصیتوں کی یاد سے معمور رہیں گے۔ تب ہر فرد یہی محسوس کرے گا کہ اس خادم قوم کے معاصرین نے اس کی جو بے قدری کی تھی اب وہ گویا اس کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ ان بلند ہستیوں کی وفات کے بعد ان کی زندگی اور خدمات کا مطالعہ رقت' شکر گزاری اور مدح خوانی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جب کسی قوم پر کٹھن گھڑی آتی ہے۔ تب نا امیدی کی تاریکی میں ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ایسے ہی نفوس عالیہ کی یاد ہوتی ہے۔ ان کے تذکرہ سے مایوس قوم میں نئی اولوالعزمی اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔

سود کی غلامی سے نجات

اس فہرست میں نہ صرف تمام بلند مرتبت سیاسی مدبر شامل ہیں جو صحیح معنوں میں ایسا کہلانے کے مستحق ہیں بلکہ ہر اعلیٰ پایہ کا مصلح بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ مثلاً فریڈرک اعظم' کارٹن لوتھر اور رچرڈ ویگنر۔

گوالفریڈ فیڈر کے پہلے لیکچر کا عنوان تھا: ''سود کی غلامی سے نجات'' جوں ہی میں نے یہ لیکچر سنا مجھے اسی وقت یہ یقین ہو گیا کہ اس لیکچر میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ جرمن قوم کے مستقبل کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر قوم کی اقتصادی زندگی کو ایک دفعہ سٹہ بازی سے پیدا ہونے والے سرمایہ سے پاک کر دیا جائے تو پھر جرمنی کے تجارتی کاروبار کو بین الاقوامی اثرات سے بچایا جا سکے گا۔ یعنی جرمنی کے تجارتی پروگرام پر بین الاقوامی جوئے بازوں کا کوئی قابو نہ رہے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس طریقہ پر چلنے سے فی نفسہ سرمایہ کو نقصان نہ پہنچے گا۔ ورنہ سرمایہ بالکل مٹا دیا جائے گا تو ہمارے قومی استقلال کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ جرمنی کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ مجھ پر آئینہ کی طرح روشن ہو گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ بین الاقوامی سرمایہ کے خلاف ہماری جدوجہد کچھ ایسی دشوار نہ ہو گی قوم کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے جو نعرہ مطلوب تھا وہ فیڈر نے مجھے مہیا کر دیا۔

یہاں پھر بعد کے واقعات سے میری اس وقت کی رائے کی تصدیق ہوئی ہمارے کھاتے پیتے طبقہ کے سیاست دانوں میں سے کوئی احمق آج تک اس موضوع پر ہمارا مذاق اڑانے کی جرات نہیں کرتا۔ یہ بزرگ اگر دل کی بات منہ پر لے آئیں تو حقیقت ہے کہ وہ سمجھ چکے ہیں کہ بین الاقوامی سٹہ بازی سے پیدا ہونے والا سرمایہ جنگ کا سب سے بڑا باعث تھا۔ اب جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی بلائے زمانہ امن کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا ہے۔

سودخواری اور سرمایہ بازی لعنت ہیں

جرمن قوم نے حریت اور اقتصادی آزادی کے لیے جو جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ اس کے پروگرام میں بین الاقوامی سرمایہ بازی اور سودی قرضے کے خلاف جہاد اہم ترین مد ہے۔

جو لوگ اپنے آپ کو عملی مصلحتوں کے ماہرین ظاہر کر کے اعتراض کیا کرتے ہیں ان کے لیے حسب ذیل جواب کافی ہے۔ سودی سرمایہ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے خلاف موہوم اقتصادی نتائج بد کے تمام خدشات لایعنی ہیں۔ پہلے تو یہ سوچنا چاہیے کہ جن اقتصادی اصولوں پر آج تک عمل درآمد ہوتا رہا ہے وہ جرمن قوم کے حق میں کون سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ جس اقتصادی مرض سے جرمن قوم کا وجود خطرہ میں ہے جب اس کے لیے کوئی نیا علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ تو اس قسم کے اعتراضات سننے میں آتے ہیں کہ جو اس وقت کیے جاتے تھے۔ جب ریل پہلی دفعہ ایجاد ہوئی تھی مثال کے طور پر بویریا کے طبی کالج کے ماہر حکیموں نے ریل کے سفر کے خلاف مشورہ دیا تھا دانش مندوں کی اس مجلس نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا ان میں سے ایک خدشہ بھی پورا نہ ہوا۔ نہ تو بھاپ کے گھوڑے پر سواری کرنے والوں کو دوران سر کا عارضہ لاحق ہوا۔ نہ ہی آس پاس کھڑا ہونے والوں میں کوئی بیماری پھیلی۔ حتیٰ کہ ریل کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے شروع شروع میں لائن کی دونوں طرف جو پردے کھڑے کیے گئے تھے وہ

بھی بالآخر اتار دیے گئے۔ ہاں جو پردے ''ماہرین'' کی عقل کے پردے تھے وہ آج بھی بدستور باقی ہیں۔ ''ماہرین'' کسی فن کے ہوں ان کی عقل پر یہ پردے ہمیشہ پڑے رہتے ہیں۔ ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے ہر اصول حقیقت کسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے حصول کو مقصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود کوئی مقصد فرض کرلیا جائے تو وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتا ہے۔ میں ہوں یا نیشنلسٹ سوشلسٹ پارٹی کا کوئی دوسرا رکن ہمارے نزدیک مقصد فقط مادر وطن اور قوم کی سربلندی ہے۔ باقی تمام اصول صرف حصول مقصد کے ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہماری جدوجہد کا منشاء یہ ہے کہ ہماری نسل بھوکوں نہ مرے۔ ہماری قوم کو پھولنے پھولنے اور بڑھنے کے وسائل مہیا ہوں ہمارے بچے پیٹ بھر سکیں۔ ہماری قوم کا خون غیروں کی آمیزش سے محفوظ رہے۔ مادر وطن کی حریت اور استقلال بحال ہو جائے۔ مختصر یہ کہ خالق نے ہماری قوم کو جس مشیت کے لیے پیدا کیا ہے وہ پوری کی جائے۔

عقیدت اور فکر کی تمام قوتیں' اخلاقی اور علم کی ساری طاقتیں صرف اسی مقصد کے لیے وقف رہنی چاہئیں۔ ہر معاملہ کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح کوئی اصول ہمارے گلے کا ہار نہ بن جائے گا۔ ہر اقدام کا فیصلہ روزمرہ کی زندگی کی عملی ضروریات کے پیش نظر کیا جائے گا۔

یوں گوٹ فریڈ فیڈر کی رائے نے مجھے ایک ایسے مسئلہ کی بنیادی تحقیق کرنے پر مجبور کیا جس پر اا ج تک میں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔ نہ اس سے قبل میں اس مسئلہ سے شناسا تھا۔

اس یہودی بچہ کارل مارکس کی اصل شرارت

میں نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ پھر مطالعہ شروع کیا۔ اب مجھے پہلی دفعہ ٹھیک پتہ چلا کہ اس یہودی بچہ کارل مارکس کی ساری زندگی اسی جدوجہد کا اصل مفہوم اور مقصد کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی کتاب ''سرمایہ'' میری سمجھ میں آئی۔ اس روشنی میں یہ مسئلہ

بھی حل ہو گیا کہ جمہوری اشترا کی اقتصادیات کے قومی نظام کی ہر صورت کی مخالفت کیوں کرتے ہیں اس جنگ سے ان کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی سٹہ بازی سے پیدا ہونے والے سرمایہ کا اقتدار دنیا پر پوری طرح مسلط ہو جائے۔لیکچروں کا یہ سلسلہ ایک اور پہلو سے بھی میرے لیے بڑا اہم ثابت ہوا۔

ایک روز میں نے بھی اپنا نام بحث میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں لکھوایا۔ایک اور صاحب بھی بحث میں حصہ لے رہے تھے۔ان کو زعم تھا کہ یہودیوں کی حمایت میں بڑی دور کی کوڑیاں لائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہودیوں کی حمایت میں ایسی لمبی چوڑی تقریر شروع کر دی۔حاضرین کی غالب اکثریت نے میرے خیالات کی تائید کی۔اس سارے قضیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی روز بعد مجھے میونچ کے ایک رجمنٹ کا ''اتالیق'' مقرر کر دیا گیا۔

ان دنوں سپاہیوں میں اطاعت کا جذبہ ذرا ڈھیلا پڑ چکا تھا۔درمیانی عرصہ میں کچھ دیر کے لیے فوجیوں کی پنچایتوں کا راج قائم ہونا نے کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ گزٹ آرنرز کی بے سوپاسقہ گردی کے دوران میں عسکری نظم و اطاعت کی جگہ ایک نئی اصطلاح گھڑی گئی تھی۔رضا کارانہ اطاعت اس رضا کارانہ اطاعت کی جگہ فوجی ضبط و نسق از سرنو بڑی احتیاط سے ہی قائم کیا جا سکتا تھا۔سپاہیوں میں حب وطن اور قومیت کے جذبات پھر سے بیدار کرنے کی ضرورت تھی۔میرے آئندہ فرائض انہیں دو مقاصد کی تکمیل پر مشتمل تھے۔

میں نے تقریریں شروع کر دیں

میں نے بڑی مستعدی اور خوشی سے اپنا کام شروع کر دیا۔اس سلسلہ میں مجھے سامعین کی خاصی تعداد کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔یوں تو مجھے ہمیشہ ہی سے خیال تھا کہ میں تقریر کا طبعی ملکہ رکھتا ہوں لیکن تجربہ سے میرا وہ خیال پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔سپاہی ایک چھوٹے سے ہال میں جمع ہو جاتے۔میری آواز اب ایسی سلجھ چکی تھی کہ میں جو کچھ

بیان کرتا ہال کے ہر کونہ میں بیٹھنے والے خوب سمجھ جاتے تھے۔

مجھے اس سے بہتر اور کیا کام مل سکتا تھا۔ قومی اداروں میں فوج مجھے دل سے عزیز تھی۔ اب میرے لیے موقعہ تھا کہ فوج سے سبکدوش ہونے سے قبل اس ادارے کی کچھ مفید خدمت بجالا سکوں۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ میری تقریریں کامیاب رہتی تھیں۔ میرے لیکچروں سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہم وطن، قوم اور وطن کے آغوش میں واپس لوٹ آئے۔ میں نے ان سپاہیوں کی حمیت قومی کا جذبہ بحال کر دیا۔ یہ فریضہ بجالا کر میں نے ملک کا عام نظام بحال کرنے میں مدد دی۔

یہیں مجھے کئی ایسے ساتھیوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا جو ہمارے ہم خیال تھے۔ انمیں سے کئی اس پہلے جتھے کے ممبر بن گئے۔ جس سے یہ تحریک آگے پھیلی۔

☆☆☆

باب نہم :: جرمن مزدور پارٹی

سپاہی انقلابیوں کے ہتھے نہ چڑھے

ایک روز مجھے اپنے افسران اعلیٰ کی جانب سے ایک انجمن کی طرف سے تحقیقات کرنے کا حکم ملا۔ تحقیق یہ کرنا تھا کہ یہ کس قسم کی انجمن ہے۔ بظاہر یہ ایک سیاسی انجمن معلوم ہوتی تھی۔ انجمن کا نام جرمن مزدور پارٹی تھا۔ عنقریب ہی اس انجمن کا جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔ جلسہ میں گولفریڈ فیڈر نے تقریر کرنا تھا۔ مجھے حکم ملا کہ میں شرکت کروں اور صورت حالات کے متعلق حکام بالا کے سامنے ایک رپورٹ پیش کروں۔

عسکری حکام کو ان دنوں سیاسی انجمنوں کے متعلق جو تجسس رہتا تھا اس کی معقول وجوہات تھیں۔ انقلاب کے بعد سپاہیوں کو سیاسیات میں عملی حصہ لینے کی اجازت مل چکی تھی۔ اس اجازت کا استعمال زیادہ تر فوجی کرتے تھے۔ جنہیں سیاسیات کا ذرہ بھر تجربہ نہ تھا۔ اعتدال پسند پارٹی اور جمہوری اشتراکی پارٹی تسلیم تو نہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی مرضی کے خلاف آخر واقعات نے انہیں یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ سپاہیوں کی ہمدردیاں انقلابی پارٹی سے ہٹ کر قومی بیداری اور قوم پرستی کی تحریک کی جانب مائل ہو رہی ہیں۔ جب انہیں اس ناگوار حقیقت کا احساس ہوا تو لاچار ہو کر انہوں نے فوج سے حق رائے دہندگی بھی چھین لیا۔ اور سیاسی سرگرمیوں کی بھی ممانعت کر دی۔

اعتدال پسندوں اور کمیونسٹوں کی پالیسی یہ تبدیلی خاص سبق آموز تھی۔ سچ یہ ہے کہ اگر وہ سپاہیوں کے شہری حقوق بعجلت ختم نہ کرتے تو چند ہی برسوں میں اس حکومت کا ٹاٹ الٹ دیا جاتا۔ جو نومبر ۱۹۱۸ء میں قائم ہوگئی تھی۔ ایسا ہو جاتا تو قوم کی ذلت اور بے حرمتی کی گھڑیاں ستا جلد ختم ہو جاتیں۔ ’’شہری حقوق‘‘ سے مراد وہ سیاسی حقوق تھے جو انقلاب کے بعد فوجیوں کو عطا کیے گئے تھے۔ ان دنوں سپاہی بالکل تلے ہوئے تھے کہ قوم کو ایسے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے مار ہائے آستین سے نجات دلانے کے لیے

جنہوں نے ملک کے اندر دشمن کے ایجنٹ کے فرائض سر انجام دیے تھے وہ قدم اٹھائیں جو اس مقصد کے لیے بہترین ہو سکتا تھا۔ کسر صرف اتنی رہ گئی کہ الیکشن میں نام نہاد قوم پرست پارٹیوں نے نومبر ۱۹۱۸ء کا انقلاب بپا کرنے والے مجرموں کی خیالی پلاؤ پکانے کے حق میں بڑے جوش سے ووٹ دیے نتیجہ یہ نکلا کہ فوج قومی احیاء کی خاطر کچھ کرنے سے عاجز رہ گئی۔ یوں تجربہ ثابت ہو گیا کہ کسی خیالی اصول کو اندھا دھند قبول کر کے اس کی پیروی کرنے کا کیا مہلک انجام ہوتا ہے۔

قوم پرستی کا جذبہ فوج کے لیے ضروری ہے

کھاتے پیتے متوسط طبقہ کا ذہن ایسا لکیر کا فقیر بن چکا تھا کہ وہ بے چارے رفتار زمانہ سے یکسر بیگانہ تھے وہ ابھی تک سچ مچ اس وہم میں گرفتار تھے کہ آج بھی پہلے کی طرح جرمن فوج پھر ایک مرتبہ قوم کے لیے ایک حصار کا کام دے سکتی ہے۔ برعکس اس کے کہ اعتدال پسند پارٹی کا مقصد وحید یہ تھا۔ کہ فوج میں سے قوم پرستی کا ڈنک نکال دیا جائے حالانکہ جب کسی فوج میں قوم پرستی کا جذبہ نہیں رہتا تو پھر وہ چاہے ملک کے اندر کوتوال شہر کے فرائض انجام دیتی رہے۔ لیکن بطور ایک عسکری تنظیم کے کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی۔ بعد کے واقعات سے یہ حقیقت حرف بحرف صحیح ثابت ہو گئی۔

شاید ہمارے نام نہاد قوم پرست لیڈر اس مغالطہ میں گرفتار تھے کہ قوم پرستی کے علاوہ فوج کی ترقی کسی دوسرے رخ پر بھی ممکن ہے۔ یہ مغالطہ اس وجہ سے ممکن تھا کہ دوران جنگ میں وہ خود سپاہی بننے کی بجائے زبانی جمع خرچ میں مصروف رہے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ تو عظمت رفتہ کی یاد ستاتی تھی وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ کہ ایک دن ایسا بھی تھا کہ جب جرمن سپاہی دنیا کے جنگجوؤں کی صف اول میں شمار ہوتا تھا۔

ایک نئی پارٹی

میں نے اس پارٹی کے جلسہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ آج تک مجھے اس پارٹی

کے حالات کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اس روز شام کو جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو پچیس تیس حاضرین موجود تھے۔ جن کی اکثریت غریب طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ جلسہ میں ایک سابق شراب خانہ کے گاہکوں کے بیٹھنے والے کمرہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس شراب خانہ کا نام سٹرنکری بری یوری تھا۔ آج یہ عمارت ہماری تحریک کے لیے ایک تاریخی اہمیت حاصل کر چکی ہے۔

فیڈر کے لیکچر کا مضمون تو پہلے سے مجھے معلوم تھا کیونکہ لیکچروں کے جس سلسلہ کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ میں اس میں اس کا لیکچر سن چکا تھا۔ اس لیے میں نے پوری توجہ سے انجمن کے کوائف کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس مطالعہ کوائف سے مجھ پر جو اثر ہوا نہ وہ اچھا تھا اور نہ برا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان دنوں جو بہت سی دوسری انجمنیں بنائی جا رہی تھیں۔ انہیں میں ایک انجمن یہ بھی تھی۔ ان دنوں ہر شخص جو صورت حالات سے برگشتہ ہو کر موجودہ پارٹیوں سے بدگمان ہو جاتا۔ وہ ایک نئی پارٹی بنا بیٹھتا۔ یہی وجہ تھی کہ چاروں جانب نئی انجمنیں قائم ہو رہی تھیں۔ اور پھر ہنگامہ یا نتیجہ کے اسی تیزی سے ختم بھی ہو جاتی تھیں۔ بالعموم ایسی انجمنوں کے بانی بہت سے لوگوں کو کسی تحریک یا جماعت چلانے کی غرض سے جمع کرنے کے لیے اصولوں سے سراسر ناواقف ہوتے تھے۔ ان انجمنوں کے ختم ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ صورت حالات کے تقاضوں پر قابو پانے کی قابلیت مفقود تھی۔ ان کی اس کوتاہی پر قائم کرنے کو جی چاہتا تھا۔

میری پہلی سیاسی تقریر

قریباً دو گھنٹہ تک جلسہ کی کارروائی دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ جرمن مزدور پارٹی بھی بس دوسری انجمنوں جیسی ہی ایک انجمن ہے۔ جب فیڈر نے لیکچر ختم کیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں انجمن کا مطالعہ بخوبی کر چکا تھا۔ اور جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص سوال کرنا چاہے اسے مذاکرہ کا آغاز کرنے کی

اجازت ہے۔ یہ سن کر میں بھی ٹھہر گیا۔ بحث بغیر کسی قابل ذکر واقعہ کے جاری تھی کہ یکا یک پروفیسر صاحب نے اٹھ کر گوہر افشانی شروع کردی۔ فیڈر نے جو کچھ کہا تھا پہلے تو انہوں نے اس کے متعلق شک کا اظہار کیا۔ فیڈر نے ایسا جواب دیا کہ پروفیسر صاحب کا منہ بند کر دیا۔ یہاں پروفیسر نے یک لخت رخ بدلا اور کہا کہ بحث کی بنیاد ''حقائق'' کی نقاب کشائی کرنے سے قبل پروفیسر نے اس نئی انجمن کو بڑی تاکید سے مشورہ دیا کہ بویریا کو پرشیا سے جدا کر دینے کا مطالبہ پارٹی کے پروگرام میں ایک اصولی شق کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ پروفیسر بڑی خود یقینی کے انداز میں اصرار کر رہا تھا کہ اس طرح آسٹریا کے جس خطہ میں جرمن آبادی کی اکثریت ہے اسے بویریا سے ملحق کرنا آسان ہو جائے گا۔ یوں امن کا نظام چلانا زیادہ سہل رہے گا۔ پروفیسر نے ایسی ہی کئی اور مبالغہ آمیز باتیں بھی کہہ ڈالیں۔ اس مرحلہ پر میں نے بھی بولنے کی اجازت حاصل کی۔ جب میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو اس قماش کی فضلاء کی بابت جو کچھ میرے دل میں آئی کہہ ڈالی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معزز پروفیسر بھیگی بلی بن کر مہ سے ایک لفظ نکالے بغیر کمرہ سے بھاگ گئے۔ میں بول رہا تھا سامعین ہمہ تن گوش تھے ان کے چہرے تحیر کی تصویر تھے۔ جب میں ب بخیر کہہ کر جلسہ سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک شخص نے جلدی سے میرا تعاقب کر کے مجھ سے اپنا تعارف کروایا میں نام تو پورا نہ سن سکا البتہ اس نے میرے ہاتھ میں ایک پمفلٹ دے دیا جو کوئی سیاسی رسالہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مجھ سے درخواست کی کہ میں اس رسالہ کو ضرور پڑھوں۔

میں نے بخوشی رسالہ لے لیا۔ مجھے خیال ہوا کہ جلسوں میں فضول مارے مارے پھرنے کے بجائے اس رسالہ سے انجمن کے متعلق تمام کوائف معلوم ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں میں نے اس شخص سے جو کہ شکل وشباہت سے مزدور نظر آتا تھا اچھا اثر قبول کیا تھا۔ اس کے بعد میں ہال سے واپس چلا آیا۔

مجھے پوچھے بغیر پارٹی کا ممبر بنالیا گیا

ان دنوں میں دوسری پیدل رجمنٹ کی بارکوں میں مقیم تھا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس پر انقلاب اپنے واضح نقوش چھوڑ گیا تھا۔ میں دن بھر باہر رہتا۔ یا تو میں ہلکے ہتھیاروں والی اکتالیس نمبر کی پیدل رجمنٹ کی قیام گاہ پر چلا جاتا۔ یا میں ایسے جلسوں اور لیکچروں میں شرکت کرنے روانہ ہو جاتا جو فوج کے کسی دوسرے شعبہ میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔ میں اپنی اقامت گاہ پر صرف رات بسر کرنے آتا تھا۔ ہر روز صبح آنکھ پانچ بجے ہی کھل جاتی تھی۔ میرے چھوڑے سے کمرہ میں ننھی ننھی چوہیاں کھیلنے چلی آتی تھیں۔ مجھے عادت بھی ہوگئی تھی ک میں ان کی حرکتیں دیکھ کر دل بہلاتا۔ میں خشک روٹی کے چند ٹکڑے یا بچے کھچے کنارے فرش پر پھینک دیتا تھا اس خوان نعمت سے لطف اندوز ہو کر ان ننھی جانوں کا رقص اور کھیل کود دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی محرومیاں برداشت کی تھیں کہ میں فاقہ کے معنی خوب سمجھتا تھا۔ اس ننھی ان مخلوق کو پیٹ بھر کر جو سرور حاصل ہوتا ہوگا میں اس کا پورا تصور کر سکتا تھا۔

جس جلسہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس سے اگلے روز صبح پانچ بجے میں اپنے بستر میں جاگ رہا تھا۔ اور چوہوں کے کھیل اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ نیند لوٹ کر آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ایکا ایکی مجھے وہ پمفلٹ یاد آیا جو جلسہ میں ایک مزدور نے مجھے دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ تھا۔ اس کا مصنف وہی مزدور تھا۔ اس رسالہ میں س نے بیان کیا' کہ کس طرح اس نے کمیونسٹوں کے لفظی گورکھ دھندے میں ایک دفعہ پھنس کر اپنی جان وہاں سے چھڑائی اور کس طرح اس کا اعتقاد قوم پرستی کے نصب العین پر دوبارہ قائم ہوا۔ اسی بنا پر رسالہ کا عنوان بھی ''میری سیاسی بیداری'' رکھا گیا تھا۔ میں نے مطالعہ شروع ہی کیا تھا کہ پمفلٹ نے میری توجہ جذب کر لی۔ میں نے پورا رسالہ دلچسپی سے پڑھا۔ یہاں جو سرگزشت بیان کی گئی تھی وہ دس سال قبل کی میری روئیداد سے مختلف نہ تھی۔ تب جو کچھ مجھ پر گزری تھی اس کا تجربہ

اب اس مزدور کو ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے اپنے احساسات تازہ ہو گئے۔ اس روز دن میں کئی مرتبہ مجھے اس پمفلٹ کا خیال آیا اور میں نے اس میں جو کچھ پڑھا تھا میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ لیکن بالآخر میں نے یہ موضوع دماغ سے محو کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس بات کو اب ایک ہفتہ گزرا ہوا کہ مجھے ایک پوسٹ کارڈ ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مجھے جرمن مزدور پارٹی کا ممبر بنالیا گیا ہے۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ اس اطلاع نامہ کا جواب تحریر کروں۔ نیز اگلے بدھ کے روز پارٹی کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں بھی شامل ہو جاؤں۔

ممبر حاصل کرنے کی اس ترکیب سے تو میں سٹپٹا گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر اظہار ناراضگی کی اجائے ایک قہقہہ لگایا جائے۔ آج تک میرا ارادہ کسی موجودہ پارٹی میں شامل ہونے کا نہ تھا۔ بلکہ میں خود ایک پارٹی قائم کرنے کی تجاویز سوچا کرتا تھا۔ رکنیت کی جس قسم ی دعوت آج مجھے موصول ہوئی تھی اس قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

پہلے میں نے تحریری جواب بھیجنے کا ارادہ کیا۔ پھر تجسس کی خواہش نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تاریخ مقرر پر جلسہ میں شامل ہونا چاہیے۔ تاکہ ان بھلے آدمیوں کو میں خود اپنے زاویہ نگاہ سے آگاہ کرسکوں۔

پارٹی کا دوسرا اجلاس

بدھ بھی آ گیا۔ آج کا جلسہ پھر ایک شراب خانہ میں منعقد ہونا تھا۔ جس کا نام ''الٹے روزن بڈ'' تھا۔ اور جو ہرن سٹراسے کے بازار مں واقع تھا۔ ایسے دکھائی دیتا تھا کہ شراب خانہ میں کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا گاہک ہی آتا ہوگا۔ ۱۹۱۹ء میں یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی خوراک کی کمی تھی۔ یہ خوراک ادنیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاہکوں کی کشش کا کوئی سامان نہ تھا۔ بہرحال اس شراب خانہ کا تو میں نے نام بھی آج پہلی مرتبہ سنا تھا۔

میں داخل ہوا تو گاہکوں کے بیٹھنے کے کمرہ میں روشنی کا انتظام بھی ٹھیک نہ تھا۔ ایک گاہک تک موجود نہ تھا بغلی کمرہ تک پہنچنے کا دروازہ میں نے مشکل سے تلاش کیا۔ یہاں ''مجلس مشاورت'' منعقد ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک دھندلے گیس لیمپ کی روشنی میں چار نوجوان ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک پمفلٹ کا مصنف تھا اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے جرمن مزدور پارٹی کے ایک جدید رکن کی حیثیت سے خوش آمدید کہا۔

جب مجھے بتایا گیا کہ پارٹی کے ''صدر اعظم'' ابھی تشریف نہیں لائے تو میں دبک کر رہ گیا۔ بہر حال میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ فی الحال میں اپنے خیالات ظاہر نہ کروں گا۔ آخر صاحب صدر پہنچ گئے یہ وہی صاحت تھے جنہوں نے فیڈر کی تقریر کے موقع پر سٹرنکر بری یوری کے شراب خانہ میں جلسہ کی صدارت فرمائی تھی۔

میں کارروائی شروع ہونے کے انتظار میں تھا۔ میرا تجسس کا شوق ازسر نو بیدار ہو چکا تھا۔ اس سارے ہنگامہ کی تہہ میں جو لوگ کام کر رہے تھے مجھے اب ان کے نام موجود ہو چکے تھے۔ انجمن کے قومی صدر اعظم کا اسم گرامی مسٹر ہرر تھا۔ ضلع میونچ کے صدر کا نام انٹن ڈرکسلر تھا۔

سابقہ جلسہ کی کارروائی پڑھ کر سنائی گئی۔ سیکرٹری پر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور ہوئی۔ خزانچی صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی انجمن کھ پاچ روپے کی نقد رقم موجود تھی۔ خزانچی کو بھی یقین دلایا گیا کہ اسے ارکین کا اعتماد حاصل ہے۔ یہ قرارداد روئیداد میں درج کرنے کا فیصلہ ہوا۔ صدر نے جوابی خطوط کے مسودات پیش کیے۔ ایک خط کیل کے شہر سے آیا تھا دوسرا ڈسن ڈروف سے آیا تھا۔ اور تیسرا برلن سے بھیجا گیا تھا۔ حاضرین نے تینوں خطوط کے جوابات سے اتفاق رائے کا اظہار کیا۔ اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے خطوط پڑھے گئے۔ ان کی تعداد بھی تین ہی تھی۔ ایک کیل سے دوسرا ڈسن ڈروف سے اور تیسرا برلن سے۔ حاضرین بیرونجات سے خطوط موصول

ہونے پر بہت خوش نظر آتے تھے۔ خطوط کی یہ تعداد روزافزوں تعداد جرمن جمہوری پارٹی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا پورا اور بہترین ثبوت تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد تازہ کے جوابات کی تفصیلات پر دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

یہ تمام کارروائی بے انتہا صبر آزما تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا گویا سبزی منڈی کی بے نتیجہ گپ شپ سن رہے ہیں کیا مجھے بھی اسی خرافات انجمن کی رکنیت کی دعوت دی جا رہی تھی؟

اس کے بعد جدید اراکین کا مسئلہ زیر غور آیا۔ یہ گویا مجھے جال میں پھانسنے کا حیلہ تھا۔

پارٹی رہنمائی کی محتاج تھی

میں نے سوالات پوچھنے شروع کیے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں تو سوائے چند عام اصولوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی پروگرام ہے' نہ کوئی پمفلٹ ہے۔ کوئی شے مطبوعہ نہیں۔ ممبر شپ کا کوئی کارڈ نہیں۔ حتیٰ کہ پارٹی کی مہر بھی نہیں۔ سوائے نیک نیتی اور نیک ارادوں کے باقی کچھ نہیں۔

اب میرا جی ہنسنے کو نہ چاہتا تھا۔ کیا یہ بے سروسامان اضطراب اس چاروں طرف پھیلی ہوئی یاس کامل اور پریشانی مطلق کی شہادت نہ دے رہا تھا جو تمام سیاسی پارٹیوں کے پروگرام خیالات اور سرگرمیوں کی نسبت قوم میں پھیل چکی تھی۔ یہ انجمن بنانے کی کوشش بظاہر مضحکہ خیز تھی۔ لیکن جو نوجوان اس کوشش میں مصروف تھے ان کے جذبات ایک اندرونی پکار کو لبیک کہہ رہے تھے۔ یہ آواز عقل کے راستہ سے نہیں بلکہ ضمیر کے واسطہ سے ان نوجوانوں کو بتا رہی تھی کہ پارٹی بازی کا جو نظام آج تک چلا آیا ہے۔ اس میں اب یہ سکت نہیں کہ جرمن قوم کو پھر سے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ نہ ہی پارٹی بازی کا یہ نظام ملت المانیہ کے ان نقصانات کی تلافی کر سکتا ہے جو آج تک قو کے داخلی امور پر قادر رہنے والوں نے اسے پہنچائے ہیں۔ پارٹی کا منشور جن اصولوں پر مشتمل تھا

میں نے جلد جلد ان کا مطالعہ کیا۔ یہ اصول ٹائپ شدہ صفحات پر درج تھے۔ یہاں پھر میں نے محسوس کیا کہ آرزو بھی ہے اور جستجو بھی لیکن جو جدوجہد درپیش ہے اس کی نوعیت کا کچھ علم نہیں۔ میں خود بھی کبھی وہی جذبات محسوس کر چکا ہوں جن کے ماتحت یہ لوکام کر رہے ہیں۔ آج قوم کو ایک ایسی تحریک کی تلاش تھی جو صرف ایک پارٹی ہی نہ ہو۔ آج تک ہم سیاسی پارٹیوں کا جو مطلب سمجھتے آئے ہیں اب اس قسم کی پارٹیوں کا وقت لد چکا ہے۔

اس روز شام کو جب میں فوجی بارکوں کے اندر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو میں اس انجمن کے متعلق ایک واضح رائے قائم کر چکا تھا۔ میری زندگی کا مشکل ترین مسئلہ میرے سامنے تھا کیا میں اس پارٹی میں شامل ہو جاؤں یا انکار کر دوں؟

عقل ہر پہلو سے مجھے انکار کی رغبت دیتی تھی۔ لیکن میرے جذبات نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ جتنا میں اس انجمن کی حماقتوں کی وجہ سے توجہ دینا چاہتا تھا۔ اتنا ہی میرا دل اس کی طرف جھکتا جاتا۔ اگلے کئی روز تک مجھ پر یہی اضطرابی کیفیت طاری رہی۔

پارٹی میں اصلاح کی گنجائش تھی

میں نے موافق ومخالفت دلائل پر غور کرنا شروع کیا۔ سیاسیات میں عملی حصہ لینے کا فیصلہ تو میں نے عرصہ سے کر رکھا تھا۔ یہ بات بھی مجھ پر واضح تھی کہ میری خواہشات کی تکمیل ایک نئی تحریک کے ذریعہ ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن آج تک مجھے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو آج تک ایک کام شروع کرتے ہیں۔ اور دوسرے روز اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دھندے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ایک نئے کام مساپیبب بب کا فیصلہ میرے لیے اس قدر مشکل تھا کہ نئی تحریک یا تو میرے تمام خوابوں کی تعمیر ثابت ہونی چاہیے۔ یا پھر بہتر ہے کہ اسے شروع ہی نہ کیا جائے۔ میں خوب جانتا تھا کہ میں نے ایک دفعہ شرکت کا فیصلہ کر لیا تو پھر ہمیشہ کے لیے پابند ہو جاؤں گا۔ ایک مرتبہ آگے بڑھا تو پھر پیچھے نہ ہٹوں گا۔ میں

فضول کوئی کھیل نہ کھیلنا چاہتا تھا۔ میں تو صدق کامل سے ایک نصب العین کے لیے وقف ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے شروع سے ایسے لوگوں کے خلاف ایک طبعی نفرت کا احساس رہا ہے جو ہر شے میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ لیکن کوئی کام انجام تک نہیں پہنچاتے۔ مجھے ایسے ہر دیگی چمچوں سے گھن آتی ہے۔ میرے نزدیک اس قماش کے اشخاص تو اگر کچھ کرنے کی نسبت کچھ نہ کریں تو ہزار درجہ بہتر ہو۔

مجھے اب ایسے محسوس ہوتا تھا گویا تقدیر خود میری راہنمائی کر رہی ہے۔ میرا مصمم ارادہ تھا کہ جو بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں پہلے سے ملک میں موجود ہیں میں ان میں ہرگز شامل نہ ہوں گا۔ میں اپنے اس فیصلہ کی وجوہات بعد میں بیان کروں گا۔ گنتی کے ممبروں والی اس مضحکہ خیز انجمن میں بے مثال خوبی بھی تھی۔ وہ خوبی یہ تھی کہ ابھی اس نئی تنظیم میں 'جماعت بندی'' کی کرختگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی کی گنجائش تھی۔ ایک فرد کی شخصی کوششوں کے لیے بھی یہاں جگہ تھی۔ میں یہاں کوئی نتیجہ خیز عمل کر سکتا تھا۔ اگر تحریک ابھی تک چھوٹے پیانے پر تھی تو اسی وجہ سے اس کو جدھر چاہیں ادھر موڑنا اور آسان تھا۔ تحریک کی نوعیت اپنی مرضی کے مطابق ڈھالی جا سکتی تھی۔ اس کے اغراض و مقاصد ابھی تشنۂ تکمیل تھے۔ اس کی راہ ابھی معین کرنی تھی۔ جو موٹی موٹی سیاسی پارٹیاں پہلے سے موجود تھیں ان میں سے کسی پارٹی میں یہ سب باتیں ممکن نہ تھیں۔

میں جتنا اس مسلہ پر غور کرتا اتنا ہی میری رائے یہ ہوتی جاتی کہ قوم کو اس کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے اس قسم کی تحریک جو فی الحال ابتدائی حالت میں ہو مفید ترین ثابت ہو سکتی ہے۔ پارلیمنٹری سیاسی پارٹیاں کبھی یہ کام سر انجام نہ دے سکتی تھیں۔ کیونکہ اول تو وہ بوسیدہ خیالات میں جکڑی ہوئی تھیں دوسرے ان کے مفادات موجودہ نظام کے ساتھ وابستہ تھے۔ اور اس لیے وہ مروجہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔ ہمیں ایک جدید ضابطہ حیات درکار تھا۔ ایک نیا انتخابی نعرہ ہماری ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہتا۔

البتہ ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا خاصی ٹیڑھی کھیر تھا۔ اس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے میری قابلیت کی سند کیا تھی؟

ضرورت ہے سند یافتہ بدھوؤں کی

اگر میں مفلس تھا۔ اگر میں ذرائع سے محروم تھا تو میں اسے برداشت کر سکتا تھا لیکن میری کامل گمنامی ایک ایسی رکاوٹ تھی جس کو دور کرنا زیادہ مشکل تھا۔ میں اس لاکھوں کی تعداد میں بسنے والی مخلوق میں شامل تھا جن کی زندگی اور موت کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ ان کے ہمسایوں کو بھی ان کے وجود کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک دقت یہ بھی تھی کہ میں نے مدرسہ کی تعلیم باقاعدہ حاصل نہ کی تھی۔

نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ ہر اس شخص کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جس نے مدرسہ میں تعلیم پا کر ڈگری حاصل نہ کی ہو۔ اور ''علم'' کی مطلوبہ مقدار اس کے اندر ٹھونسی نہ گئی ہو۔ یہ سوال کبھی نہیں پوچھا جاتا کہ کوئی انسان کیا کر سکتا ہے۔ بلکہ دریافت تو یہ کیا جاتا ہے کہ کیا تم نے پڑھا کہاں تک ہے؟ پڑھے لکھے لوگ ہر اس بدھو کی قدر کرتے تھے جس کے پاس بہت سی علمی ڈگریاں ہوں۔ جس نوجوان کے پاس یہ قیمتی دستاویزات نہ ہوں اس کی قدر نہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو۔ میں ان حالات میں خوب تصور کر سکتا تھا کہ پڑھی لکھی مخلوق میرا استقبال کیسے کرے گی۔ اس سلسلہ میں اگر مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی تو صرف اتنی کہ میں انسان کو جو کچھ سمجھتا تھا وہ حقیقت میں اس سے بھی زیادہ ذلیل ثابت ہوا۔ جو لوگ اس قاعدہ کلیہ سے مستثنےٰ ہیں وہ اپنی خصوصیت کی بنا پر مقام رکھتے ہیں انسانوں کا ایک گروہ ساری عمر مکتبی ذہنیت ہی کا پابند رہتا ہے۔ اگر دوسرا گروہ حقیقت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ میں ان دونوں گروہوں میں تفریق تو ہمیشہ سے کرتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ فرق مجھ پر اور بھی واضح ہوتا گیا۔

میں پارٹی کا ساتواں رکن تھا

دو دن کی گہری سوچ بچار اور الجھن کے بعد میں نے آ کر یہ قدم اٹھا لینے کا فیصلہ کیا

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ مجھے ایسا کرنا چاہیے۔

یہ میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ میرے لیے اب واپس جانے کا کوئی راستہ باقی نہ تھا۔

جرمن مزدور پارٹی نے مجھے رکنیت کی جو پیش کش کی تھی وہ میں نے قبول کر لی تھی۔ مجھے رکنیت کی عارضی سند دے دی گئی تھی۔ میں اس پارٹی کا ساتواں ممبر تھا۔

☆☆☆

باب دہم :: دوسری جرمن سلطنت کی تباہی کی وجوہات

عروج وزوال کی داستانوں سے عبرت حاصل کرو

پستیاں ہمیشہ بلندیوں کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہیں۔عروج کا کمال ہی زوال کی ابتدا ہوتا ہے۔کہاں سے گرے تھے اور کس جگہ جا کرا ٹکے۔ان دونوں حیثیتوں کا فرق ہی انحطاط کی تفصیل بیان کرتا ہے۔قوموں اور سلطنتوں کی سرگزشت بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہے۔سلطنتوں اور قوموں کی تاریخ سمجھنا چاہتے ہو تو پہلے یہ معلوم کرو کہ آغاز میں ان کی کیا حالت تھی۔اہم ترین دریافت طلب امر یہ ہے کہ زوال شروع ہونے سے قبل عروج کے انتہائی کمال کی حد کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

مشاہدہ کا ذوق رکھنے والی آنکھ صرف زوال کی ان مثالوں کی اہمیت تسلیم کرے گی جہاں غیر معمولی عروج کے امکانات باقی ہی تھے کہ قبل ازوقت انتہائی زوال شروع ہو گیا۔دوسری جرمن سلطنت کی تباہی ایک تڑپا دینے والی چوٹ تھی۔اس چوٹ کی تڑپ ان دلوں کو زیادہ محسوس ہوتی ہے جو اس پر غور کر سکتے ہیں اور اس کے درد کا شعور رکھتے ہیں۔دوسری جرمن سلطنت کی تباہی اور بلندی پر پہنچنے کے بعد واقع ہوتی جس کا تصور بھی مصیبت اور ذلت کے موجودہ زمانہ میں ناممکن ہے۔

قیصر کی سلطنت ایک عظمت کبری تھی

دوسری جرمن سلطنت مسحور کن شان وشکوہ کے ماحول میں قائم ہوئی تھی۔ساری قوم اس کی کامیابی سے سرشار ہو کر فخر سے جوش میں وجد کر رہی تھی یکے بعد دیگرے بے مثال فتوحات حاصل ہوئیں۔سلطنت میدان جنگ میں عدیم النظیر شجاعت کے صدقے عطا ہوئی اور اسی حیثیت میں ان شجاعتوں کے بیٹوں اور پوتوں کو ورثہ میں ملی۔ اہل جرمنی خوب جانتے تھے کہ ان کی سلطنت کسی عاقلانہ سیاسی گفت وشنید کا نتیجہ نہ تھی۔ نہ ہی یہ سلطنت پارلیمنٹری سرگرمیوں کے راستہ حاصل کی گئی تھی۔ یہ سلطنت دنیا کے

دوسرے خطوں کے سیاسی اداروں سے مختلف تھی۔ اس سلطنت کو جو خصوصیت دنیا کے بیشتر ملکوں کے سیاسی نظام سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اس کا قیام زیادہ شریفانہ ذرائع کا مرہون منت تھا۔ یعنی یہ سلطنت دماغی ہتھکنڈوں کے بجائے خون بہا کر حاصل کی گئی تھی۔ رہی یہ بات کہ جرمن قوم کا یہ احساس کہاں تک شعور طور پر ان کے ذہن میں صاف تھا۔ تو یہ ایک غیر متعلق امر ہے۔ جب دوسری جرمن سلطنت کی نیویں استوار ہو رہی تھیں تو یہ اس وقت فضا میں بلند ہونے والا نغمہ پالیمنٹری مباحثوں کی چیخ پکار پر مشتمل نہ تھا۔ اس وقت تو جنگ کی بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ تصادم کے دھماکے ہو رہے تھے۔ پیرس محاصرے میں تھا۔ اس ماحول میں سیاست کی ایک منزل طے ہوئی۔ جرمن نوابوں اور جرمن عوام نے باہمی تعاون سے ایک آنے والی سلطنت کی بنیادیں رکھیں۔ تاج شاہی کا نشان پھر زندہ کیا گیا۔ بسمارک کی قائم کردہ ریاست بھگوڑوں اور بزدلوں کی غداری یا غارت گری کا پھل نہ تھی۔ یہ ریاست تو محاذ جنگ پر لڑنے والے فوجی رسالوں کا شاہکار تھی۔ غرض دوسری جرمن سلطنت کی پیدائش ایسے حالات میں ہوئی جن کی دنیا میں اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھر اس سلطنت کی تربیت جنگ کی آگ سے گزر کر ہوئی تھی۔ ان خصوصیات کے باعث اس سلطنت کی تاریخ تصویر کے گرد عظمت کا ایک ہالہ کھینچ گیا جو پرانی پرانی سلطنتوں کو بھی نصیب نہ تھا۔

یہ تو اس عظمت کبری کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد ترقی کا ایک بے مثال دور شروع ہوا۔ بیرونی دنیا میں جرمنی کو جو خودمختاری حاصل تھی اس کے باعث گھر میں ایک بے مثال دور شروع ہوا۔ ملک کی آبادی بڑھ گئی۔ قوم کی دولت میں اضافہ ہوا۔ ہماری فوج سلطنت اور قوم کے وقار کی محافظ قرار پائی۔ پہلی جرمن سلطنت اور دوسری جرمن سلطنت کے مابین حد امتیاز یہی فوج تھی۔

ہمیشہ زوال کی کوئی وجہ ہوتی ہے

آج دوسری جرمن سلطنت اور جرمن قوم کا زوال اس پستی کو پہنچ چکا ہے کہ ہماری

زبانیں بھی گونگی ہوگئی ہیں۔ ہمارے ہوش و حواس ایسے سلب ہوئے ہیں کہ ہم زوال کے اسباب اور اس کی نوعیت پر غور وفکر کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ قوم جرمن سلطنت کی عظمت رفتہ کا تصور کرنے کی قابلیت بھی کھو چکی ہے۔ موجودہ مصائب کے پیش نظر ماضی کی شان وشوکت اور مرتبہ خواب وخیال معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لی جائے تو قوم کی بے حسی کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں۔ قوم ایسی بے حس ہو چکی ہے کہ جب وہ ماضی کی عظمت یاد بھی کرتے ہیں تو اس میں بعد کے زوال عظیم کے جراثیم تلاش کرنا بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ زوال کے ابتدائی آثار تو عرصہ سے نشوونما پا رہے ہیں۔ خیال رکھیے یہ میں اس سلسلہ کلام میں صرف ان اشخاص کا تذکرہ کر رہا ہوں جن کے نزدیک جرمنی فقط رہائش کا ٹھکانہ یا اور معاش کا بہانہ نہیں۔ یہی لوگ موجودہ صورتحال سے بیزار ہیں۔ ورنہ دوسرے قماش کے لوگ تو موجودہ حالات کا دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے جرمنی کی ہی درگت بنتے دیکھنے کی آرزو دل میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔

آنے والے زوال کے آثار ان کے ابتدائی ایام میں بھی واضح تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ بہت کم لوگوں نے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال اگر ہم نے تب غفلت برتی تو آج اس کی چھان بین پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔

جس طرح جسمانی بیماریوں کا علاج بھی تشخیص کے بغیر ہی ممکن ہے اسی طرح سیاسی امراض کا علاج بھی تشخیص کے بغیر ناممکن ہے۔ مرض کی علامتیں ہمیشہ با آسانی دریافت ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ برعکس اس کے مرض کے داخلی اسباب کا سمجھنا کا خاصا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر الناس صرف علامتوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات غلطی سے علامات ہی کو مرض کے اسباب کا قائم مقام قرار دے لیتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ علامات میں انہماک کے باعث اسباب کا سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ ہماری قوم کی اکثریت آج کل جرمنی کے زوال کا احساس اقتصادی

ابتری اور اس کے نتائج سے کرتی ہے۔ یہ بھی نہ ہی علامت کو سبب سمجھنے والی غلطی کی ایک مثال ہے۔ عوام ان اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی، طاقتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اس کے زوال کا حقیقی باعث ہیں۔ عوام میں سے اکثر نہ تو وہ شعور رکھتے ہیں اور نہ احساس، جو ان طاقتوں کا صحیح اور پورا اندازہ کرنے کی لائی لازمی ہے۔

اگر عوام سطحی علامتوں ہی کو جرمنی کے زوال کا سبب سمجھ رہے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت تک صورت حالات میں کوئی اصلاح نہ ہو سکنے کی وجہ میری رائے میں یہ ہے کہ قوم کے ذہین طبقے بھی جرمنی کے زوال کو ایک اقتصادی سانحہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خیال کرتے ہیں کہ اقتصادی علاج سے مادر علاج کا زوال دور کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی اس وقت تک کوئی امید نہیں جب تک یہ نہیں سمجھ لیا جاتا کہ اقتصادی طاقتوں کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ اور اصل اہمیت اخلاقی اور سیاسی طاقتوں کو حاصل ہے۔ جب یہ سمجھ میں آ جائے گا تبھی ان خرابیوں کے اسباب کا صحیح اندازہ ہو گا جو آج کل پیدا ہو چکی ہیں۔ جب تشخیص صحیح ہو گی تو پھر مرض کے علاج کا نسخہ اور دوائی ڈھونڈنا بھی مشکل نہ ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے زوال کے اسباب کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی سیاسی تحریک اس زوال کو دور کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے یہ تحقیق خاص طور پر لازمی ہے۔

جنگ میں شکست زوال کے اسباب کا نتیجہ ہے ان کا باعث نہیں

جب ماضی کی چھان بین جرمنی شکست کے اسباب تلاش کرنے کی غرض سے کی جائے تو خارجی علامتوں کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے سے بچنا چاہیے۔ یہ خاری علامتیں تو عیاں ہیں لیکن ان علامتوں کی تہہ میں دوسری طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ جنگ میں ناکامی کو بڑی آسانی سے موجودہ مصائب کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے عام لوگ زوال کی اس توجیہ کو قبول کرنے کی جانب زیادہ گامزن ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جن تکلیفات

میں وہ گرفتار ہیں ان کا اصل سبب جنگ میں ناکامی ہے۔ ممکن ہے کئی لوگ نیک نیتی سے اس احمقانہ استدلال کے قائل ہوں لیکن اس خیال کو رواج دینے کے لیے بیشتر وہ لوگ ہیں جو سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ آج کل ان جھوٹ بولنے والوں میں اکثر سرکاری اصطبل سے گھاس چرنے والے شامل ہیں۔ آج کل ان جھوٹ بولنے والوں مس اکثر سرکاری اصطبل سے گھاس چرنے والے شامل ہیں۔ انقلاب کے حامی تو بار بار قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ جنگ میں فتح یا شکست کا عوام پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ انہوں نے عامتہ الناس کو پوری ذمہ داری سے کہا تھا کہ اقوام عالم کی اس عظیم جنگ میں کامیابی کی ضرورت فقط بڑے بڑے سرمایہ داروں کو ہے۔ جنگ کے نتیجہ میں جرمن عوام اور جرمن مزدوروں کے کسی قسم کے مفاد وابستہ نہیں۔ امن عالم کا وعظ کرنے والے یہ مہاتما ہمیشہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "عسکریت" کچل دی گئی تو جرمنی تباہ نہ ہوگا۔ بلکہ جرمن قوم کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ کیا یہی حلقے ہمارے دشمنوں کے گن نہ گاتے تھے۔ اور کیا لوگ اس جانکاہ کشمکش کا سارا الزام جرمنی پر نہ دھرتے تھے؟ اگر انہوں نے عوام سے یہ وسوسے نہ پھیلا دیے ہوتے تو قوم کیسے اس وہم کا شکار ہو سکتی تھی۔ کہ جنگ میں شکست کا جرمنی کے سیاسی مستقبل پر کوئی ناگوار اثر نہ ہوگا؟ کیا یہ نہیں کہا گیا تھا کہ جرمن قوم کی خانگی حریت اور بین الاقوامی آزادی کے لیے انقلاب بپا کرنا لازمی ہے؟ کیا انقلاب کی مدح میں لچھے دار قصیدے پیش کر کے جرمن افراج کی فاتحانہ یلغار کے راستے میں روڑے نہیں اٹکائے گئے تھے؟

اے جھوٹ بولنے والے ذلیل بدمعاشو! کیا میں سچ نہیں کہہ رہا؟

اب جرمنی کے زوال کا سبب فوج کی شکست کو قرار دینے کی جرات اس بے حیائی کے بغیر ممکن نہیں جو یہودیوں ہی کا خاصہ ہے۔ برلن سے آگے بڑھو کے نام سے جو اخبار نکلتا تھا اس نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ جرمن افواج کو شان سے پھریرے اڑاتے ہوئے وطن واپس جانے کی اجازت بھی نہ ملنی چاہیے۔

باوجود ان حرکتوں کے آج یہ لوگ ہمارے زوال کا باعث عسکری شکست کو قرار دے رہے ہیں۔

ان جھوٹوں کے ساتھ بحث میں الجھنا تو بالکل بے کار ہے۔ یہ لوگ ابھی جو کچھ کہتے ہیں ایک منٹ بعد اس کی تردید کرنے لگتے ہیں۔ میں تو ان کا تذکرہ بھی نہ کرتا اگر کئی ناسمجھ لوگ ان کی سکھائی ہوئی باتیں طوطے کی طرح دہرانے کی عادت میں گرفتار نہ ہوتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان ناسمجھ لوگوں کی نیت میں ہمیشہ فتور نہیں ہوتا۔ میں اوپر جو کچھ لکھ چکا ہوں اس کا خطاب میرے فوجی بھائیوں سے بھی تھا کیونکہ آج کل زبان سے کچھ کہا جائے تو اسے توڑ مروڑ کر اس کا مطلب ہی بدل دیا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ جرمنی کے زوال کا باعث جنگ میں ناکامی ہے تو اسے حسب ذیل جواب دینا چاہیے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے مستقبل کے لیے جنگ میں ناکامی کا اثر افسوس ناک ہے۔ لیکن جنگ میں ناکامی بجائے خود تو کوئی سبب نہیں۔ یہ ناکامی بھی بعض اسباب کا نتیجہ ہے۔ یہ سمجھ دار اور ہوش مند آدمی جانتا تھا۔ کہ اس زندگی اور موت کی لڑائی کا انجام بخیر نہ ہوگا۔ تو اس کے بعد تباہی آئے گی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ذہن وقت پڑنے پر کام کرنے سے جواب دے گئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو پہلے تو جنگ کی اس اہمیت پر شک ظاہر کرتے تھے۔ اور بالاخر اس کا بالکل کھلا انکار کرنے لگے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل اندر سے شکست کے متمنی تھے جب ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی تو اب ان کا اچانک ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو دشمن کے ساتھ ان کی اپنی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ تباہی کا اصل سبب ایسے ہی لوگ ہیں نہ کہ جنگ میں ناکامی اگرچہ وہ ساری مصیبتوں کا باعث جنگ میں شکست کو قرار دینا چاہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جنگ میں شکست بھی انہیں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہوئی۔ اب یہ کہتے ہیں کہ شکست کا باعث نااہل قائد تھے۔ یہ غلط ہے۔ دشمن بھی

آخر بزدل نہ تھا۔ وہ مرنا جانتا تھا۔ جنگ کے پہلے ہی روز سے دشمن کی تعداد جرمن افواج سے زیادہ تھی ۔لڑائی کے میدان مین اس کے ساز و سامان کی ہر کمی کو پورا کرنے کے لیے کرہ ارض کے حربی کارخانے اور آلات کے ذخیرے اس کے ہاتھ میں تھے۔

آج دنیا بھر کو اقرار ہے کہ سپاہیوں کی شجاعت سے قطع نظر درحقیقت جنگ کے چار برسوں میں سارے جہان کے خلاف جرمنوں کی فتوحات بہتر قیادت کے طفیل تھیں جرمن فوج کی تنظیم اور قیادت انسانی کمال کی معراج تھی اس تنظیم کا سہرا صرف جرمنوں کی عسکری قیادت کے سر تھا اگر کچھ کمزوریاں بھی تھیں تو ان کا تدارک انسانی طاقت کے احاطہ سے باہر تھا۔آج ہماری رسوائی کا سبب یہ نہیں کہ فوج ناکام ثابت ہوئی ۔فوج کی ناکامی بعض دوسروں کی کوتاہیوں کا نتیجہ تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ فوج کی تباہی سے ایک اور تباہی ایسی آئی کہ جس کے آثار زیادہ نمایاں ہیں۔

بیرونی کمزوریاں ہمیشہ اندرونی کمزوریوں کا عکس ہوتی ہیں

اس دعویٰ کا ثبوت حسب ذیل ہے:

کیا جنگ میں شکست سے ہمیشہ سلطنت اور قوم کی ایسی تباہی لازم ہوتی ہے؟ کیا جنگ میں ناسازگاری قسمت کا پہلے کہیں اور بھی یہی نتیجہ نکلا؟ کیا کبھی قومیں جنگ میں شکست اور صرف فوجی شکست سے واقعی برباد ہوئی تھیں اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ جنگ میں شکستوں کا باعث یا تو داخلی انحطاط ہوتا ہے یا بزدلی' اور یا خامئی کردار جنگ میں شکست ہمچوقسم کوتاہیوں کے لیے سزا کا نام ہے۔اگر ایسی حالت تو تو جنگ میں شکست احیائے قوم کا سبب بن جاتی ہے' اور ملت کے لیے تازیانہ ہمت و کوشش ثابت ہوتی ہے۔ جنگ میں شکست قوم کی موت کا نام نہیں ۔اس دعویٰ کے حق میں تاریخ سے لاتعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

بدبختی تو یہ ہے کہ جرمنی کی عسکری ہزیمت کوئی ایسی آفت نہیں جس کے ہم مستحق نہ تھے۔ یہ تو ابدی مکافات قدرت کی جانب سے عقوب کا نزول ہے۔ایک ایسا عذاب

ہے جس کے ہم سزاوار ہیں۔ ہم اس شکست کے مستحق ہی نہیں، مستوجب تھے۔ یہ شکست **مسلسل** اندرونہ انحطاط کے بعد خارجی انتشار کا ظہور تھا۔ انحطاط کی نشانیاں عیاں تھی۔لیکن قوم کی اکثریت نے ان کو شناخت کرنے میں غفلت کی۔ انہوں نے شترمرغ کی طرح تہیہ کر رکھا تھا کہ ہم صرف وہی کچھ دیکھیں گے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔

آؤ ہم ذرا ان علامات کو دیکھیں جو اس وقت جرمنی میں نمودار تھیں جب جرمن قوم نے شکست قبول کر لی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ کئی حلقوں میں انتہائی بےشرمی سے مادروطن کی رسوائی کا خیر مقدم کیا گیا؟ کیا یہ طرز عمل کسی سزا کا مستحق نہ تھا؟ کیا کچھ لوگ ایسے نہ تھے جنہوں نے اس حد سے بھی تجاوز کیا اور جو فخر کرتے تھے کہ انہوں نے محاذ جنگ کو کمزور کرنے اور شکست کو دعوت دینے میں حصہ لیا ہے؟ غرض یہ ذلت ہمارے سروں پر دشمن نے مسلط نہیں کی۔ بلکہ یہ ہمارے اپنے ہم وطنوں کی کرتوت ہے۔ اگر بعد میں وہ خود بھی مصیبت بھگت رہے ہیں تو کیا وہ اس مصیبت کے مستوجب نہیں۔ کیا تاریخ میں کبھی پہلے بھی ایسی کوئی مثال ہے جب کسی قوم نے اپنے آپ کو جنگ چھیڑنے کا مجرم تسلیم کیا ہو، حالانہ اس کا اپنا ضمیر اور علم اس بہتان کی تائید نہ کرتا ہو۔ اور اس کے ضمیر اور علم کا فیصلہ زیادہ صحیح بھی ہو؟

نہیں اور ہرگز نہیں! شکست کے بعد جرمن قوم کے ردعمل سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے زوال کا سرچشمہ کہیں اور تھا۔ فقط کسی عسکری یلغار کی ناکامی یا کچھ مورچوں کا چھن جانا شکست کا باعث نہ تھا قوم کی تباہی اگر فقط محاذ جنگ پر شکست کا نتیجہ ہوتی تو پھر جرمن ملت اس شکست کا سامنا ایک بالکل مختلف جذبہ سے کرتی۔ اس سانحہ کے باعث جو تکلیفات برداشت کرنا پڑیں۔ ان کا مقابلہ یا دانت پیس کر کیا جاتا اور یا غم سے نڈھال ہو کر۔ گردش تقدیر یا زمانہ کے اتفاق نے جس دشمن کو فتح دی تھی قوم کا دل اس کے خلاف غم وغصہ کے جذبات سے لبریز رہتا۔ جس طرح کبھی اطالعی سینٹ کے اراکین نے قوم کا وقار برقرار رکھنے کی خاطر دشمن کے ہاتھوں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، اسی عزم و

استقلال سے جرمن شکست خوردہ افواج کی واپسی پر جرمن ملت ان کا استقبال کرتی ۔ فوج کو تلقین کی جاتی کہ دیکھنا سلطنت کے ساتھ تمہاری وفاداری میں رتی بھر فرق نہ آئے ۔ اگر عقل اور سنجیدگی کے تقاضاؤں سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے کے فیصلہ کی نوبت بھی آجاتی تو دل مستقبل میں انتقام لینے کی امید سے تڑپ رہا ہوتا ۔

جنگ میں شکست محض ناسازی تقدیر کا نتیجہ ہوتی تو اس کا سامنا مذکورہ بالا انداز سے کیا جاتا ۔ شکست کی تقریب پر خوشیاں نہ منائی جاتیں ۔ رقص نہ کرنے والی ۔ بزدلی پر فخر کا اظہار نہ ہوتا ۔ اور شکست کو نشان عزت فرض نہ کیا جاتا ۔ محاذ جنگ سے لوٹنے والی فوجوں کا تمسخر نہ اڑایا جاتا ۔ اور ان کے جنڈے کی بے حرمتی نہ کی جاتی ۔ پاجی پن کا مظاہرہ نہ ہوتا جسے دیکھ کر ایک انگریز فوجی افسر کرنل ری پنگ ٹن نے حقارت سے کہا تھا کہ ہر تیسرا جرمن ایک غدار ہے ۔ نہیں گندی نالیوں کا بہاؤ ایک سیلاب کی شکل اختیار نہ کر سکتا ۔ گزشتہ پانچ سال میں اس طوفان بدتمیزی نے بیرونی دنیا میں جرمن قوم کے وقار کو بالکل ملیا میٹ کر دیا ہے ۔

صاف ظاہر ہے کہ جنگ میں ناکامی کو جرمنے کے انتشار کا سبب قرار دینا کتنا بڑا فریب ہے نہیں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جرن قوم میں روگ کی جو معتدد علامتیں اور ان کے جو اسباب پیدا ہو چکے تھے ۔ جنگ میں شکست بھی انہیں کا نتیجہ تھی ۔ قوم میں اپنے آپ کو بچانے کی حس مردہ ہو چکی تھی ۔ قوم اخلاق اور ملی روایات کو گھن لگ چکا تھا ۔ جنگ تو ان خرابیوں سے پیدا ہونے والی تباہی کی وہ پہلی علامت تھی ۔ جسے سب نے دیکھا ۔ بنیادی خلل کئی سال پہلے سے ملت اور سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا ۔

چھوٹے جھوٹ کی نسبت بڑا جھوٹ زیادہ کامیاب رہتا ہے

یہ دروغ باغی کی کامل مہارت رکھنے والی یہودنوں اور ان کے ساتھ مل کر لڑنے والے ان کے رفقاء یعنی کمیونسٹوں کی عیاری ہے کہ وہ زوال کی ذمہ داری سراسر اس آدمی کے سر پر تھوپ رہے ہیں جو اکیلا شخص تھا جس نے مافوق العادت عزم سے تباہی کو

روکنے کی کوشش کی تنہا اس کی دوراندیشی نے آنے والی تباہی کا احساس کیا۔ کامل شکست اور ذلت کی گھڑی میں قوم کو بچانے کی سعی کرنے والا بھی وہی تھی۔ عالمگیر جنگ میں شکست کی ذمہ داری لیوڈن ڈروف کے کندھوں پر ڈالنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ان کے حریفوں ٗمیں سے جو ایک شخص مادر وطن سے غداری کرنے والوں کو انصاف کا مزا چکھانے کی طاقت رکھتا ہے اس کی اخلاق تاب مقاومت کو بھی بہتان تراشی سے مفلوج کر دیا جائے۔ ان کی تمام حرکتوں کے پیچھے فقط ایک اصول کام کر رہا تھا۔ جس کی سچائی کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اصول یہ ہے کہ جتنا بڑا کوئی جھوٹ ہو اس کا یقین دلانا ہی اتنا آسان ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ کسی قوم کو گمراہ کرنے کی یہ ترکیب زیادہ کارگر اور سہل ہے۔ کہ ان کے اعمال یا خیالات کو گمراہ کرنا کافی نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کے جذبات کو بھی غلط ڈھب سے برانگیختہ کر دیا جائے۔ جذبات میں سرسری گمراہی پیدا کرنے پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ گمراہی کا جذبہ دل کی انتہائی گہرائیوں تک اتار دیا جائے۔ کسی چھوٹے موٹے جھوٹ کے لیے یہ سب کچھ کرنا مشکل ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی بہت بڑے جھوٹ کے لیے سارا سینہ تباہ کر دینا اور احساسات کو مسخ کر دینا زیادہ آسان ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں چھوٹے چھوٹے جھوٹ تو عوام خود بھی بول لیتے ہیں۔ لیکن بہت بڑا جھوٹ بولنے سے انہیں شرم آتی ہے۔ کسی دروغ عظیم کو تصنیف کرنے کی تجویز ان کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ کوئی ایسا بھی بے حیا ہو سکتا ہے جو حقیقت کو بالکل ہی مسخ کر دے۔ اس جرم کے ارتکاب کے ثبوت میں ان کے سامنے واضح حقائق پیش ہو جائیں تب بھی تھوڑا بہت شک اور تذبذب ہمیشہ ان کے دل میں باقی رہتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ثبوت میں پیش ہونے والے واقعات کی توجیہ ضرور کسی دوسرے طریقہ سے بھی ممکن ہو گی۔ غرض پوری بے حیائی کے بعد بہت بڑا جھوٹ بولا جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہتا ہے چاہے بعد میں جھوٹ ثابت بھی ہو جائے۔ دنیا میں دروغ دوئی کے تمام ماہر فن کذب کے تمام سازش

اس حقیقت سے واقف ہیں یہ لوگ جھوٹ کے ذریعہ بدترین مقاصد پورے کرنا خوب جانتے ہیں۔

دروغ اور بہتان کا استعمال کرنے میں یہودی زمانۂقبل تاریخ سے سب پر سبقت رکھتے ہیں۔ کیا ان کا وجود ہی اس دروغ عظیم پر مبنی نہیں کہ وہ ایک مذہبی فرقہ ہیں۔ درآں حالیکہ وہ ایک نسلی امت ہیں۔ اور نسل بھی کیسی نسل بنی نوع انسان کے ایک بہت بڑے مفکر یعنی شوپن ہارنے یہودیوں کے متعلق ایک ہمیشہ یادگار رہنے والا فقرہ کہا۔ یہ قوم ایک گہری اور سچی حقیقت کا اظہار ہے۔ ان نے کہا تھا ''یہودی کذاب اعظم کے خطاب کے مستحق ہیں'' جو لوگ اس قوم کی صحت سے واقف نہیں یا اس کو ماننے پر آمادہ نہیں وہ کبھی حقیقت حال کے انکشاف میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے۔

زوال کو بھی کمال کا زینہ بنایا جا سکتا ہے

یہ تو جرمن قوم کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کا پرانا رنگ اتنی جلدی ایک فوری اور خوفناک تباہی کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ اگر صورت حالات کی وہی پہلی جیسی کیفیت برقرار رہتی تو یہ درست ہے کہ قوم کے انحطاط کی رفتار زیادہ سست ہوتی۔ لیکن ایسے بتدریج زوال سے جو تباہی آتی پھر اس کے تدارک کی بھی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مرض مزمن ہو جاتا۔ تباہی میں تعجیل اور اس کی شدت کا فائدہ یہ پہنچا کہ بہت سے دلوں میں زوال کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ محض کوئی اتفاق نہ تھا کہ طاعونسیاہ کا علاج تو انسان نے جلد دریافت کر لیا تھا۔ لیکن تپ دق کا علاج آج تک دریافت نہ ہوا تھا۔ طاعون سیاہ موت کا ایک ایسا خوفناک سیلاب تھا۔ جس نے ساری انسانیت کو لرزہ براندام کر دیا۔ برعکس اس کے تپ دق آہستہ آہستہ اثر کرتی ہے۔ اسی وجہ سے مقدم الذکر سے ڈر پیدا ہوتا ہے اور موخر الذکر سے لاپروائی نتیجہ یہ ہے کہ طاعون سیاہ کے مقابلہ میں انسان اپنی ساری طاقتیں بروئے کار لے آیا تھا۔ اور تپ دق کے دارک میں غفلت برتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ طاعون سیاہ پر بہت جلد قابو حاصل کر

لیا گیا تھا اور تپ دق آج بھی انسان پر غالب ہے۔

اقوام کی امراض بھی اسی اصول کے ماتحت بڑھتی ہیں اگر بیماری کی نوعیت خوفناک نہ ہوتا باشندے آہستہ آہستہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو کر اس کا شکار بن جاتے ہیں۔ اس لیے جب تقدیر پر خود انحطاط کی رفتار میں مداخلت کر کے اس کو تیز کر دے' اور یوں جس پر تباہی آنی ہے اسے قبل از وقت مرض کے انجام دے دوچار کر دے تو یہ درحقیقت اس کی خوش قسمتی ہو گی۔ اگرچہ بظاہر تلخ اور ناگوار محسوس ہو گی۔ اس قسم کی تباہی کا نتیجہ اکثر یہ نکلتا ہے کہ فوراً علاج کی تلاش' اور عزم راسخ سے مرض کے تدارت کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔

قدرت کی جانب سے ایسی خاص تنبیہ سے بھی اس صورت میں فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب وبال کے اندرونہ اسباب پہلے سے تشخیص ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ بنیادی اسباب اور ان سے پیدا ہونے والے فروعی حادثات میں تمیز کی جائے۔ مرض کے جراثیم جتنا عرصہ قوم کے جسم میں موجود رہیں' اور ان کو قوم کے گوشت پوست کا جزو بننے کا جتنا زیادہ موقع دیا جائے اتنا ہی مرض کے اسباب اور ان کے نتائج میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زہریلے مادے امتداد زمانہ سے قوم کے بدن میں اس طرح سرایت کر جائیں کہ ان کو شناخت کرنا ناممکن ہو جائے۔ وہ جزو بدن ہی تسلیم کر لیے جائیں۔ یا ان کو ایک ایسی برائی سمجھا جانے لگے جس سے چھٹکارا محال ہے۔ اس طرح ان جراثیم سے نجات حاصل کرنے کے لیے شدید قدم اٹھانا سرے سے غیر ضروری تصور کر لیا جاتا ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم سے قبل طویل المدت تک ملک میں امن رہا۔ اس دوران میں جگہ جگہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک دو خرابیوں کو چھوڑ کر باقی شناخت کرنے یا ان کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش نہ کی گئی۔ جن خرابیوں کی تحقیق کی بھی گئی وہ زیادہ تر قوم کی اقتصادی زندگی سے متعلق تھیں۔ اور اس وجہ سے ان پر افراد کی نگاہ زیادہ پڑتی

تھی۔ ورنہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں کئی خلل ایسے بھی تھے جن کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

لامحدود صنعتی کارخانہ داری ایک لعنت ہے

انحطاط کی کئی نشانیاں ایسی تھیں جن پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے تھا۔ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے حسب ذیل نکات کے قابل توجہ ہیں:

جنگ سے پہلے جرمنی کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ سیاسیات اقتصادیات اور فکر و عمل کے ہر شعبہ میں نان شبینہ مہیا کرنے کا سلسل روز بروز زیادہ اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ بدقسمتی سے جن لوگوں کے سپرد اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ وہ اس کے واحد صحیح حل سے جی چراتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی آسان ٹوٹکے سے ان کا مقصد پورا ہو جائے۔ مزید علاقہ حاصل کرنے کی تجویز ترک کر دی گئی۔ اس معقول تجویز کی جگہ یہ احمقانہ جنون پیدا ہوا کہ دنیا کو تجارت سے مسخر کر لیا جائے۔ اس غلط فیصلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک خطرناک لامحدود صنعتی کارخانہ کا شکار ہو گیا۔

یہ راستہ اختیار کرنے کا سب سے پہلا اور مہلک ترین نتیجہ یہ تھا کہ کاشتکار طبقات کو ضعف پہنچا۔ جوں جوں شہری رقبوں میں کنگال اور بے گھر مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی توں توں کاشتکاروں کا زوال بدتر صورت اختیار کرتا گیا۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ ملک وقوم کی بہتری کے لیے مزدوروں اور کاشتکاروں کے مابین جو تناسب قائم رکھنا ضروری تھا اس میں فتور آ گیا۔

غریبوں اور امیروں کے درمیان جو دیوار حائل تھی وہ اب اور اونچی ہو کر ہر ایک کے سامنے آ گئی۔ عیش اور افلاس اس قدر قریب قریب آباد تھا کہ ان کی ہمسائیگت سے پیدا ہونے والے نتائج کا افسوسناک ہونا یقینی تھا۔ احتیاج اور بے روزگاری نے قوم کے اندر خلل عظیم پیدا کر دیا بے چینی اور بے زاری چاروں جانب پھیل گئی۔ قوم سیاسی طبقات میں بٹ گئی۔ تاجرانہ فارغ البالی کے باوجود عام بے اطمینانی بڑھتی ہی گئی۔ آخر

کا رو ہ صورتحال پیدا ہو گئی جب ہر ایک کو یقین تھا کہ معاملات موجودڈگر پر زیا دہ دیر نہیں چل سکتے البتہ یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ ہو گا کیا۔

شخصیت اور ملکیت کا رشتہ منقطع نہیں ہونا چاہیے

ہر طرف پھیلے ہوئے اضطراب کی یہ تو وہ نشانیاں تھیں جو دکھائی دے رہی تھیں۔ان سے بدتر آثار وہ تھے جو قوم میں صنعتی کارخانہ داری پھیل جانے سے ہویدا ہوئے۔

جیسے جیسے تجارت حکومت پر قابض ہوتی گئی اس کے ساتھ ہی روپیہ ایک ایسا خدا بن گیا جس کی پرستش اور اطاعت ہر شخص پر واجب تھی آسمان پر بسنے والے خدا تو پرانے ہوتے جا رہے تھے۔ان کو طاق پر رکھتے ہوئے لکشمی دیوی کی پوجا کا رواج عام ہو چکا تھا۔اس طرح زوال کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اس کے لیے خاص طور پر نقصان رساں تھا کہ امتحان کی گھڑی سر پر کھڑی تھی' اور قوم ہمیشہ سے زیادہ پاکیزہ و بلند خیالات کی حاجت تھی۔پر امن ماحول میں نان شبینہ کمانے کا حق حاصل کرنے کے لیے جرمنی کی کوشش کر رہا تھا اسے تلوار کے زور سے کامیاب بنانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے تھا۔سیاہ بختی یہ تھی کہ روپیہ کے اقتدار کو وہاں سے بھی منظوری اور پشت پناہی حاصل ہو گئی جہاں سے اس کے استیصال کا بندوبست ہونا چاہیے تھا۔نئے ساہوکارہ کے نمائندوں کو رؤسا کا مرتبہ عطا کر کے حضور تو قیر نے غلطی کی۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطرہ تو بسمارک سے بھی نہ سمجھا تھا۔یہ اعتراض قابل سماعت ہے۔بہر صورت عملی نتیجہ یہ نکلا کہ روپیہ کے سامنے تمام محاسن اخلاق ثانوی حیثیت دیے جانے لگا۔صاف ظاہر تھا کہ اگر اس پر کچھ عرصہ مزید عمل درآمد ہوتا رہا تو ساہوکار رئیسوں کے مقابلہ میں تلوار کے دھنی شرفاء بھی کم مرتبہ سمجھے جائیں گے۔

میدان جنگ کے اندر نام پیدا کرنے کی نسبت ساہوکارہ میں کامیابی زیادہ آسان ہے۔اس لیے کسی سچے مجاہد ملت یا اعلیٰ سیاسی مدبر کے لیے یہ امر کسی پہلو سے باعث فخر نہ تھا کہ ایک یہودی ساہوکار اس کا ہم مرتبہ قرار پا کر اس کے پہلو میں مسند نشین ہو۔

جو ہر حقیقی کبھی سستے تمغے اور خطابات حاصل کرنے کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ تو ایسے موقعہ پر کورنش بجا لا کر عطائے شمار بقائے شمار کہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ سرکار کی اس روش سے اعلیٰ خاندانی روایات قائم رکھنے کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکتی تھی۔ رئیسوں کے خاندان روز بروز ان نسلی خصائص سے عاری ہونے لگے جن پر ان کا وجود مبنی تھا۔ نتیجہ یہ نکلا اس قماش کے شرفاء درحقیقت کمینہ کہلانے کے زیادہ مستحق تھے۔ مخصوص اور مستقل اقتصادی مفاد بتدریج اشخاص کے قبضہ سے نکال کر ملک کے سارے اقتصادی نظام کو مشترکہ سرمایہ والی کمپنیوں کے ماتحت لانے سے قوم کے اندر شدید اقتصادی انتشار رونما ہو گیا۔

اس طرح مزدور بے ضمیر نفع خوروں کی سودا بازی کا نشانہ بن گئے۔ شخصیت سے ملکیت کا رشتہ منقطع ہونے کی وبا عام پھیل گئی۔ سٹہ بازوں کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ اور انہوں نے دھیرے دھیرے قومی زندگی کے ہر پہلو پر کامل تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا۔

سرمایہ داری اور کمیونزم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے

جنگ سے پہلے جرمنی کا اقتصادی نظام مشترکہ سرمایہ والی کمپنیوں کے عالم گیر انتقال حصص کے چکر کی طفیل بین الاقوامی بازیچہ گاہ بن چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ چند جرمن کارخانہ داروں نے اس خطرہ کو روکنے کی پوری کوشش کی' لیکن آخرکار ان کو بھی روپے کی بھوکی سرمایہ داروں کے مشترکہ حملہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے' کیونکہ اس کشمکش میں سرمایہ کاروں کو ان کے سگے برادران نسبتی یعنی کمیونسٹوں کی امداد بھی حاصل تھی۔

جس طرح کمیونسٹ جرمنی کی اقتصادی زندگی کو بین الاقوامی سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جرمنی کی آہنی صنعتوں کے خلاف مسلسل شورش بپا ہونے لگی۔ تاہم کمیونسٹوں کے انقلاب میں جو کامیابی حاصل تھی وہ اس شورش کے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کافی ثابت نہ ہوئی۔ آج جبکہ میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں۔ سرکاری ریلوے پر کمیونسٹوں کی یلغار کارگر ہو چکی ہے۔ عنقریب یہ ریلوے بین

الاقوامی سرمایہ داروں کے قبضہ میں دی جائے گی۔ یوں کمیونسٹوں کی بین الاقوامی جمہوریت کی تحریک اپنی منزل مقصود کی جانب ایک اور قدم بڑھا چکی ہے۔

جب جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کے بڑے بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں نے رائے ظاہر کی تھی کہ صرف تجارت جرمنی کو پھر اس کے پاؤں پر کھڑا کر سکتی ہے۔ اس ایک مثال سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جرمن قوم تجارت کا شکار بنانے کی سازشیں کس حد تک خطرناک ترقی کر چکی تھیں۔ ایک طرف تو فرانس از سر نو اپنے تعلیم عامہ کے نظام کو قوم پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوششوں میں منہمک تھا۔ اور دوسری طرف جرمنی میں اس قسم کی احمقانہ بکواس سے تلقین کی جا رہی تھی کہ قوم کی زندگی کا دارومدار تجارت پر ہے' نہ کہ اخلاق اور روحانیت پر۔ جنگ کے بعد سٹی نیز نے جو اعلان جاری کیا تھا اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ ان تمام بسیار گو بے وقوفوں نے جنہیں ''سیاسی مدبر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جو خوبی تقدیر سے انقلاب کے بعد جرمنی پر مسلط ہو چکے ہیں' فی الفور اس اعلان کو مشعل ہدایت بنا لیا۔

جنگ سے پہلے جرمنی کے انحطاط کی بدترین علامتوں میں سے ایک یہ تھی کہ ہر کام ادھورا کیا جاتا تھا۔ اس ادھورے پن کی وجہ سے وہ بے یقینی تھی جو چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بے یقینی اس پست ہمتی کا نتیجہ تھی جو مختلف اسباب کی بنا پر قوم میں نفوذ کر چکی تھی۔ جرمنی کا تعلیمی نظام اس پست ہمتی کو فروغ دینے والی درس گاہ تھا۔

جنگ سے پہلے جرمنی کا تعلیمی نظام بے اندازہ نقائص سے بھرپور تھا۔ یہاں فقط دماغی علوم سکھائے جاتے تھے۔ اور اس کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ عملی استعداد کی تربیت کی جانب کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ انفرادی کردار کو جس حد تک انسانی کوشش سے پختہ کرنا ممکن ہے' اس کی بھی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے' قوت ارادی کو مضبوط بنانے اور قوت فیصلہ کو نکھارنے کا تو کوئی اہتمام ہی نہ تھا۔ اس طریقہ تعلیم کا اثر یہ تھا کہ ''مولانا'' قسم کے آدمی تیار ہو رہے تھے۔ جنہیں ہر وقت یہی دھن سمائی رہتی تھی

کہ ہر قسم کا علم ''چاٹا'' کریں۔ اور جنگ سے پہلے دنیا میں جرمنوں کی قدر اور استعمال بھی اسی اندازہ سے کیا جاتا تھا۔ جرمن پسند تو کیے جاتے تھے کیونکہ ان سے کام خوب لیا جا سکتا تھا' لیکن ان کے کردار کی اس خامی کے باعث ان کا کچھ احترام نہ تھا۔ اس حقیقت میں چشم عبرت کے لیے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے کہ اجنبی ممالک کے اندر جانے کا اتفاق ہو تو تمام قوموں کے مقابلہ میں جرمنی سب سے پہلے اپنی قومیت بدلنے پر آمادہ ہو جاتے تھے ان ایام کی ایک رائج الوقت ضرب المثل بھی نہایت پر معنی ہے۔ اس ضرب المثل کا مفہوم یہ تھا کہ ''مودب انسان چاہے کوئی جرمنی میں ہر جگہ سے مزے کی زندگی گزار سکتا ہے''۔

وفا شعاری اور خوشامد ایک چیز نہیں

اس قسم کے آداب مجلس کے مفروضہ تقاضاؤں کے ماتحت شاہی دربار کے لیے جو رسوم و رواج وضع کیے گئے وہ انتہائی مہلک تھے۔ ان قواعد کی رو سے **ملک معظم** کے حضور میں کسی بات کی تردید ممنوع تھی جہاں بادشاہ پسندیدگی کا اظہار کرے وہیں ہاں میں ہاں ملا دی جائے۔ حالانکہ بادشاہ کی مصاحبت وہ منصب تھا جہاں غلامانہ ذہنیت کے مقابلہ میں مردانہ متانت کی زیادہ حاجت تھی۔ شاہی دربار میں خوشامد پیشہ وار کاسہ لیسوں اور عہدے کے بھوکوں کو زیب دیتی ہے۔ جو **ذلیل** انسان یا دیانت دار شہروں سے میل ملاپ پر' شاہی دربار کے اعلیٰ حلقوں کے طواف کو ترجیح دیں انہیں بھی ہی مسلک پھبتا ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ ''عاجز'' مخلوق چاہے اپنے آقا اور رازق کے سامنے کتنا ہی گڑگڑائے لیکن دوسرے انسانوں کے لیے ہمیشہ بے اندازہ غرور کا اظہار کرتی ہے۔ یہ مغرور کس بے حیائی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف وہی بادشاہ کے سچے وفادار ہیں۔ یہ نودولتے' یا نودولت بننے کے امیدوار اپنی حیثیت سے تجاوز کر کے جن حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں ان میں سے یہ گھمنڈ سب سے زیادہ قابل نفرت ہے کہ وہی بادشاہ کے واحد خیر خواہ ہیں۔

بادشاہوں اور بادشاہتوں کے زوال کا پیش خیمہ اسی قماش کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی صحبت کا نتیجہ سوائے نحوست کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی اصول کا سچا معتقد ہو تو چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ کبھی اس اصول کے نمائندوں کے سامنے زمین پر ناک رگڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جو شخص سنجیدگی سے کسی ادارہ کو قائم رکھنا چاہتا ہو اور اس کا حقیقی خیر خواہ ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس ارادے کے نمائندوں میں کچھ نقائص یا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو وہ ان خرابیوں اور نقائص کے باعث اس ادارے سے اپنی وفاداری اور خیر خواہی میں فرق نہیں آنے دیتا۔ نہ ہی وہ بادشاہ کے بعض جمہوری دوستوں کی طرح ان عیوب کا چرچا ساری دنیا کے سامنے کرتا پھرتا ہے۔ وہ تو خود ملک معظم اور تاجدار وقت کے پاس جا کر اسے صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کرے گا۔ خلل کے تدارک کی ترغیب دے گا۔ وہ یہ تسلیم نہ کرے گا کہ بادشاہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چاہے نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ برعکس اس کے کہ جس وضع کے آدمی کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ تو بادشاہت کو خود بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رکھنا بھی اپنا فرض تصور کرے گا۔ وہ اس کوشش میں اپنی ذات کو خطرہ میں ڈالنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ اگر بادشاہت کے نظام کی قدر و قیمت محض بادشاہ کی ذات پر موقوف ہوتی ہے تو اس سے بدتر کوئی نظام حکومت نہ تھا۔ ہم مانیں یا نہ مانیں' یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مجسم دانش و حکمت اور صاحب کردار بادشاہ شاذ و نادر ہی گزرے ہیں۔ پیشہ ور کاسہ لیس اور بدقماش لوگ ضرور اس حقیقت سے منکر ہیں۔ لیکن دیانت دار افراد جو کہ قوم کی اصلی طاقت ہیں کبھی یہ مفروضہ تسلیم نہ کرے گا کہ سارے بادشاہ لازماً دانا ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیانتدار افراد تاریخ اور حق کو حق سمجھ کر دیکھتے ہیں' چاہے اس کا اثر بادشاہوں پر ہی کیوں نہ پڑتا ہو۔ سازگاری تقدیر سے اگر کسی قوم کو واقعی کوئی عظیم بادشاہ یا کوئی بڑا آدمی میسر آ جائے تو اسے دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو خاص عنایت کا مورد سمجھنا چاہیے۔ ورنہ شکر کرنا چاہیے کہ قسمت نے بدترین حکمران ان پر مسلط نہیں کر

دیا۔

بادشاہ بھی قوم کا ایک خادم ہوتا ہے

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بادشاہت کی اافادی حیثیت کسی ایک بادشاہ کی ذات پر موقوف نہیں ہوسکتی۔ ملک کسی فریڈرک اعظم جیسے غازی یا ولیم اول جیسے دانا کے سر پر تاج رکھ دے تو دوسری بات ہے۔ایسا تو کہیں صدیوں کے بعد ہوسکتا ہے۔ ہر روز ممکن نہیں بادشاہت کا اصول بادشاہ کی ذات پر ترجیح رکھتا ہے' کیونکہ کسی ادارے کی قدر و قیمت خود اس ادارے کے اندر مضمر ہوتی ہے۔اس لیے بادشاہ کو بھی قوم کے خدام ہی کے زمرہ میں شمار کرنا چاہیے۔وہ بھی مشین کا ایک پرزہ ہے۔اس پر بھی اپنا فرض ادا کرنا واجب ہے۔اسے بھی اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر اپنی طبیعت پر قابو پانا لازم ہے۔ اگر اصول کو کچھ اہمیت نہ دی جائے اور سب کچھ فقط ''ذات مقدس'' ہی کا کرشمہ فرض کرلیا جائے تو پھر کسی نکمے تاجدار کو معزول کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔

بحالات موجودہ اس حقیقت پر زور دینا نہایت ضروری ہے کیونکہ جن اسباب نے ماضی قریب میں بادشاہت کا تخت الٹا تھا۔وہ اب پھر نمودار ہورہے ہیں یہ لوگ بھولے بن کر عجب بے حیائی سے ''اپنے بادشاہ'' کا تذکرہ چھیڑتے ہیں کیا ان کا یہ ''اپنا بادشاہ'' وہی شخص نہیں جس سے انہوں نے چند برس پہلے نازک ترین مرحلہ پر غداری کی تھی۔ جو کوئی ان کے راگ میں ان کے سر کے ساتھ سر نہ ملائے اسے فی الفور ''بے حمیت جرمن' کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ یہ الزام تراشنے والے وہی بھگوڑے ہیں جو ۱۹۱۸ء میں میدان چھوڑ گئے تھے اور جنہوں نے اپنے کندھے پر لال بلے چپکا لیے تھے۔تب ان کا عقیدہ تھا کہ دلیری کی بجائے دانائی بہتر ہوتی ہے۔قیصر پر کیا بیتے گی اس کی انہیں کچھ پرواہ نہیں۔انہوں نے ''صلح پسند شہریوں'' کا روپ دھار لیا تھا۔یا وہ ایسے روپوش ہو گئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ایکا ایکی بادشاہت کے یہ وکیل ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے۔پر جھجک جھجک کر اور جانچ جانچ کر بادشاہ کے یہ ''خادم'' اور ''مشیر''

نمودار ہوئے تاکہ بادشاہت کی زبانی خدمت کا بار از سر نو اپنے کندھے پر اٹھالیں۔ انہیں یہ جرات تبھی ہوئی کہ جب دوسروں نے بادشاہ کے مخالفوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر انقلاب کو کچل دیا۔ اور ان کا راستہ صاف کر دیا۔ تب یہ پھر اپنی جگہ آموجود ہوئے۔ اور حسرت سے مرغن قورمہ کی خوبصورت چینی قابیں یاد کر کے بادشاہ کی وفاداری میں ہلکان ہونے لگے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک ایک روز پھر لال بلوں کو عروج حاصل ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ کے قصیدہ خوانوں کا یہ ہجوم ایسے کم ہو گیا کہ جیسے بلی کو دیکھ کر چوہوں کو جلوس بکھر جاتا ہے۔

ایسی صورت حال پیدا ہو جانے کی ذمہ داری اگر بادشاہوں پر نہ ہوتی تو بادشاہ ہمدردی کے مستحق تھے۔ لیکن خود بادشاہوں کو بھی تو ہوش ہونا چاہیے کہ ایسے حامیوں کی وجہ سے تخت چھن تو سکتا ہے لیکن گیا ہوا راج واپس ہاتھ نہیں آ سکتا۔

اس قماش کی وفاداری غلط ہے اور سراسر ہمارے نظام تعلیم کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے نظام تعلیم کی اس خامی سے ہمیں بالخصوص نقصان پہنچا ہے۔ ایک طرف تو مختلف بادشاہوں کے درباروں میں اہ ماتم کے قابل تکلفات رائج تھے اور دوسری طرف بادشاہت کے نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ جب بادشاہوں کے سنگھاسن ہی ڈگمگانے لگے تو یہ تکلفات از خود ختم ہو گئے۔ خوشامدیے اور جی حضوریے کبھی اپنے آقاؤں کی خاطر جان دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بادشاہوں کی تباہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ نہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ سیکھنے کی دقت گوارا کرتے ہیں۔

غلط نظام تعلیم کا ایک اور نتیجہ بھی تھا کہ ہر شخص ذمہ داری سنبھالنے پر جھجکتا تھا۔ زندگی کے اہم اور کھلے مسائل سے نپٹنے میں بھی کمزوری دکھائی جاتی تھی۔

اس وبا کی ابتدا پارلیمنٹری اداروں سے ہوئی جہاں ذمہ داری سے فرار کی عادت خاص طور پر ایک راسخ کی جاتی تھی۔ بدقسمتی سے یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل گیا۔ قومی امور کی سرانجام دہی پر تو اس کا نمایاں اثر ہوا۔ ہر جگہ ذمہ داری سنبھالنے سے

گریز کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب کام ادھورے چھوڑ دیے گئے۔ یا ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش میں مذبذبانہ روش اختیار کی جاتی رہی۔ شخصی ذمہ داری کو ہر ڈھب سے گھٹانے کی سعی ہوتی تھی۔

کئی ضرر رساں عیب قومی زندگی میں گھر کر چکے تھے۔ ان بیماریوں کے علاج میں حکومت سے سخت کوتاہی سرزد ہوئی۔ اگر ہم اس کوتاہی پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ادھورے قدم اٹھانے اور ذمہ داری قبول کرنے سے فرار کے نتائج کیسے مہلک ہو سکتے ہیں۔ ایسی متعدد بیماریوں اور عیوب کی نشوونما کی تفصیلات میں سے صرف چند ایک کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی صحافت ایک شر عظیم ہے

صحافی حلقوں کا دستور ہے کہ اخبارات کو سلطنت کا ایک بنیادی ستون کہا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ صحافت کی طاقت بے پناہ ہے۔ اس طاقت اندازہ میں جتنا مبالغہ کیا جائے کم ہے۔ صحافت بالغوں کے نظام تعلیم کا نام ہے۔ اخبارات پڑھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ لوگ جو کچھ پڑھتے ہیں اس ربلا کم وکاس تیقین کر لیتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو کسی بات کا یقین نہیں کرتے۔ اور تیسرے وہ لوگ کہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ اور پھر اس تجزیہ کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

تعداد کے اعتبار سے پہلا گروہ سب سے بڑا ہے کیونکہ اس قوم میں عوام شامل ہیں ذہنی لحاظ سے یہ طبقہ قوم کے سادہ لوح افراد پر مشتمل ہے۔ ان گروہوں کی تقسیم پیشہ کے لحاظ سے نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ذہانت کی استعداد کو مدنظر رکھ کر لی گئی ہے پہلے گروہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو پیدائشی طور پر اپنی رائے خود قائم کرنے کے اہل نہیں۔ یا یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ لیکن اس کو استعمال کرنے کی عادت نہیں سیکھی۔ یا کسی حد تک جہالت اور کسی حد تک طبیعت کی افتاد کے باعث جو کچھ مطبوعہ پڑھتے ہیں اس پر جھٹ سے

یقین لے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے افراد بھی اسی گروہ میں شمار کرنے چاہئیں جو اگرچہ غوروفکر کی استعداد رکھتے ہیں لیکن محض کاہل ہونے کے باعث دوسروں کی فکر کے نتائج شکریہ سے قبول کرلیتے ہیں۔ اور منکسر المزاجی کے باعث سمجھتے ہیں کہ دوسروں نے جو کچھ سوچا ہوگا آخر مکمل غوروخوض کے بعد ہی سوچا ہوگا۔ ان سب لوگوں پر صحافت کا اثر بے اندازہ ہوتا ہے۔ قوم کا غالب حصہ اسی پہلے گروہ پر مشتمل ہے۔ ان میں یا تو یہ مادہ ہی نہیں ہوتا کہ جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا جائے اس میں جھوٹ اور سچ کی تمیز کریں۔ یا وہ خود یہ تکلیف برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لیے روزمرہ مسائل جو درپیش آتے ہیں ان کے متعلق ان کی رائے ہمیشہ خارجی اثرات کا عکس ہوتی ہے۔ اگر اطلاعات عامہ کا نظام سچائی اور سنجیدگی پر استوار ہوتا ہے تو اس گروہ کی خصلتوں سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن جب یہ کام دروغ گولیوں کے ہاتھ میں ہو تو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

دوسرا گروہ تعداد میں بہت کم ہے۔ اس گروہ میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جو قبل ازیں پہلے گروہ میں شامل تھے۔ لیکن مسلسل تلخ مایوسیوں کے تجربہ کے بعد اب کسی مطلوبہ اطلاع پر یقین کرنے کو آمادہ نہیں۔ انہیں سب اخبارات سے نفرت ہو چکی ہے۔ یا تو وہ اخبارات پڑھتے ہی نہیں اور یا انہیں اخبار پڑھ کر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اخبارات جھوٹ کا پلندہ ہیں اور دروغ بافیوں کی گٹھڑی ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو قابو میں لانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ انہیں تو سچ پر بھی اعتماد نہیں اس وجہ سے وہ کسی تعمیری کام کے اہل نہیں ہیں۔

تیسرے گروہ کی تعداد سب سے تھوڑی ہے۔ اس میں وہ ذہین لوگ شامل ہیں جنہیں طبعی استعداد اور تعلیم نے اپنی رائے خود قائم کرنا سکھا دیا ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر خود غوروفکر کرتے ہیں اور جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا احتیاط سے تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ مضمون نگار کے خیالات کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر کسی اخبار کا مطالعہ نہیں کرتے۔ مقالہ

نگاروں کو ایسے لوگوں کے معیار کے مطابق مضمون لکھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔اخبار نویس اس نوع کے قارئین کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اخبارات جو گند گی اچھال سکتے ہیں اس کا اس تیسرے گروہ پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔وہ ہر اخبار نویس کو ایک ایسا پاجی سمجھتے ہیں جو کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے۔یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس قسم کے قارئین کی اہمیت محض ان کی ذہانت کے پیش نظر ہ۔ورنہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔فی زمانہ عقل و دانش بے اثر ہیں۔اور ساری طاقت اکثریت کے ہاتھ میں ہے۔آج کل تو تمام معاملات میں عوام کے ووٹوں کی پرچیوں سے طے ہوتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت اس گروہ کے ہاتھ میں ہے جس کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔یہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ تعداد پہلے گروہ کی زیادہ ہے جو ہر دعویٰ پر یقین کر لینے والے سادہ لوح عام کا ایک ہجوم ہے۔

آزادی صحافت ایک عدیم الوجود سنہری چڑیا ہے

یہ ایک قومی فرض اور سرکاری مفاد کا اولین تقاضا ہے کہ قوم کو جاہل جھوٹے اور بدنیت معلمین کے پنجہ میں پھنسنے سے بچایا جائے۔لہٰذا سرکار پر واجب ہے کہ عوام کو معلومات فراہم کرنے والے نظام کی نگرانی کرے۔اور اس ضمن میں ہر قسم کے جرائم کے ارتکاب کی روک تھام کرے۔اس سلسلہ میں صحافت خاص توجہ کی مستحق ہے کیونکہ عوام پر اس کا زبردست اثر ہے۔نیز دیگر تمام اثرات سے مقابلہ میں صحافت کا رسوخ زیادہ ہے۔دوررس ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صحافت کا اثر ہنگامی نہیں، بلکہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔صحافت کی زبردست اہمیت کا راز اس کی تلقین کے تسلسل، یکسانیت اور تکرار میں مضمر ہے۔صحافت کے مسئلہ کا حل کرنے میں سرکار کو اس مقولہ عمل کرنا چاہیے کہ تمام ذرائع کا منتہائے مقصود ایک ہونا چاہیے۔سرکار کو آزادی صحافت کا نام رکھنے والی عدیم الوجود سنہری چڑیا کی تلاش میں سرگرداں ہونا چاہیے۔نہ ہی باتیں بنانے والوں کے فریب میں پھنس کر اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت کرنی چاہیے۔نہ قوم کو کسی نیک یا

مفید اقدام سے محروم رکھنا چاہیے۔ بلکہ پوری بے رحمی سے اور بغیر کسی جھجک کے عوام کو معلومات فراہم کرنے کے اس وسیلہ پر پورا قابو رکھنا چاہیے۔ اور قوم و سلطنت کے فائدے کے لیے استعمال میں لانا چاہیے۔

آیئے ذرا اس خوان نعمت کا جائزہ لیں جو جنگ سے قبل جرمن صحافت اپنے قارئین کے لیے بچھایا کرتی تھی۔ کیا یہاں کی ہر غذا بدترین زہر سے مسموم نہ ہوتی تھی؟ جب دوسری قومیں آہستہ آہستہ لیکن پورے عزم کے ساتھ جرمنی پر جھپٹنے کے لیے جنگی تیاریاں کر رہی تھیں۔ تو کیا یہاں مکروہ ترین امن پرستی کے وعظ نہیں کیے جاتے تھے کیا خود سرکار کے اقتدار اعلیٰ کی بابت عوام کے دلوں میں دوران امن ہی کے ایام میں صحافت نے شکوک و شبہات پیدا نہ کر دیے تھے؟ اس طرح سرکار کو سرکاری حقوق کا بچاؤ کرنے سے لاچار نہ کر رکھا تھا۔ کیا یہ جرمن صحافت نہ تھی جس نے ہمارے عوام کو مغربی جمہوریت سے ایسا مانوس کر رکھا تھا۔ کہ بالآخر ہماری جذبات کی ماری ہوئی قوم اپنا مستقبل بھی لیگ آف نیشنز کو سپرد کرنے پر آمادہ ہو گئی؟ کیا یہ صحافت قوم میں اخلاقی انحطاط پیدا کرنے کا آلہ کار نہ تھی؟ کیا اخلاق اور حیا کا تمسخر نہ اڑایا جاتا تھا؟ ایسی باتوں کو ایک گزرے ہوئے زمانہ کی یادگار اور بے ہودہ قرار نہ دیا جاتا تھا؟ کیا ان ہی ترغیبات کا اثر نہ تھا کہ ہماری قوم بھی "تجدد" کا شکار ہو گئی تھی؟ کیا اخبارات نے **مسلسل** ریشہ دوانیوں سے سرکاری اقتدار کی جڑیں ایسی کھوکھلی نہ کر دی تھیں کہ انجام کار دشمن کی ایک ہی ضرب سے حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا؟ کیا اخبارات ہر ایسی تحریک کو پوری قوت سے مخالفت نہ کرتے تھے جس کا مقصد یہ ہو کہ سرکار کو کامل سرکاری اختیارات استعمال میں لانے کی اجازت دے دی جائے؟ کیا وہ **مسلسل** تنقید سے فوج کی شہرت کو داغدار نہ کرتے تھے؟ عام جبری لام بندی میں روڑے نہ اٹکاتے تھے؟ اور عسکری اخراجات میں تخفیف کا مطالبہ نہ کرتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ تا آنکہ ان کی سازشیں پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں۔

نام نہاد آزاد خیال صحافت کا کام یہ تھا کہ جرمن قوم اور سلطنت کی قبر کھود کر تیار کرتی رہے۔ جھوٹ بولنے والے کمیونسٹ اخبارات کا تذکرہ تو فضول ہے۔ جھوٹ ان کا مایہ حیات ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید یہ ہے کہ قوم کی بنیادوں میں دراڑ پیدا کی جائے اور اس طرح ملت کو بین الاقوامی سرمایہ داروں اور ان سرمایہ داروں کے سرمایہ داروں یعنی یہودیوں کا غلام بنا دیا جائے۔

عوام کے ذہن اس طرح سراسر مسموم کیے جانے کی اس مہم کا تدارک سرکار کیا کر رہی تھی؟ کچھ بھی نہیں بالکل کچھ بھی نہیں!!! توقع یہ تھی کہ دبک کر بیٹھ رہنے کی روش سے طاعون راضی ہو کر ٹل جائے گا۔ خوشامد سے اخبارات کے "بلند مرتبہ" کا اعتراف کر کے ان کی "اہمیت" تسلیم کر کے صحافت کے "معلمانہ منصب" کا چرچا کر کے غرض ہر طرح کی حماقتوں سے اس بلائے بے درمان کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہودی یہ تمام تحفے ایک پر معنی مسکراہٹ سے قبول کر لیتا تھا اور جواب میں شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔

سرکاری مسائل تذبذب سے طے نہیں ہوتے

سرکار کی اس ذلت آمیز شکست کی وجہ سے صرف یہ نہ تھی کہ خطرہ کا احساس نہ کیا جا رہا تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جاتا تھا ادھورا اٹھایا جاتا تھا اور جو تجویز اختیار کی جاتی تھی وہ نکمی اور بے اثر ہوتی تھی۔ کسی میں یہ جرات ہی نہ تھی کہ مستعدی سے کوئی بنیادی علاج کرے۔ ہر شخص کسی نہ کسی پہلو سے زمانہ سازی میں کوشاں تھا۔ بجائے افعی کا سر کچلنے کے، اسے مجروح کر کے اور بھی غضب ناک بنا دیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر خرابی کی جوں کی توں رہ اور اخبارات کی قوت بجائے گھٹنے کے الٹے ہر برس بڑھتی ہی چلی گئی۔

صحافت پر یہودیوں کا قبضہ تھا اور وہ آہستہ آہستہ قوم کا ستیاناس کر رہی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حکومت جو قدم اٹھاتی تھی اس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ نہ اس کے پیچھے کوئی پختہ

ارادہ ہوتا تھا۔ اور نہ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد۔ صورت حال کا سرکاری اندازہ بالکل ناکافی تھا۔ نہ انہیں اس کشمکش کی شدت کا پورا احساس تھا۔ نہ انہوں نے صحیح وسائل اختیار کیے اور نہ ہی انہوں نے عملی اقدام کا کوئی نقشہ بنایا۔ وہ عارضی پھاہے دھر کا کام چلانا چاہتے تھے۔ جب کوئی بہت چبھتا ہوا ڈنگ لگ جاتا تو پھر وہ ایک یا دو صحافی سنپولیوں کو چند ہفتوں یا مہینوں کے لیے نظر بند کر دیتے تھے۔ لیکن باقی کے زہریلے قبیلے کو چھٹی دے دی جاتی تھی کہ وہ چین سے اپنا کام کرتا رہے۔

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو یہودیوں کے مکارانہ حلے غیر معمولی تھے اور دوسری طرف سرکاری حکام یا تو بے وقوف تھے اور یا بالکل بھولے یہودی ایسے ذہین تھے کہ وہ بیک وقت تمام اخبارات پر حملہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ جب صحافت کے ایک بازو پر کوئی آفت آتی تو دوسرا بازو اس کی پشت پناہ بن جاتا تھا۔ کمیونسٹ اخبارات ہر مقدس چیز پر ذلیل ترین اسلوب سے کیچڑ اچھالتے ہیں۔ ریاست اور حکومت پر حملے کرتے تھے۔ قوم کے مختلف طبقات کو آپس میں لڑا دیتے تھے۔ ریاست اور حکومت پر حملے کرتے تھے۔ قوم کے مختلف طبقات کو آپس میں لڑا دیتے تھے۔ برخلاف اس کے کھاتے پیتے لوگوں کے جمہوری اخبارات حقیقت پسندی اور اعتدال کا بھیس بدل کر سامنے آتے تھے۔ قبضہ ان اخبارات بھی یہودیوں کا تھا۔ ایسے اخبارات کے انداز بیان میں تلخی یا سختی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ نادان صرف ظواہر پر قیاس کرتے ہیں اور کسی شے کے اصلی اور عمیق معنی تک پہنچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ جب نادان کو کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ہوت وہ اسے باہر سے دیکھ لینا کافی سمجھتا ہے۔ اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ان اخبارات نے اس انسانی کمزوری کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور وہ اپنے اس علم کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی خوب جانتے تھے۔

انسان فطرت کا مالک یا اس پر حاکم نہیں بلکہ اس کے تابع ہے

ایسے احمقوں کے نزدیک فرانکی فرٹر سی ٹنگ کی قسم کے اخبارات بڑے ''پروقار'' اور قابل احترام تھے کیونکہ وہ کبھی اپنے دل کی بات سیدھی اور سچی طرح نہ کہتے تھے۔ وہ کسی شکل میں جسمانی طاقت کو استعمال کرنے کے حامی نہ تھے بلکہ ذہنی ہتھیاروں سے لڑنے کی شرافت کا چرچا متواتر کرتے رہتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ ذہن سے لڑنے کی یہ تجویز سب سے زیادہ ان طبقات میں مقبول تھی جو بالکل ذہین نہ تھے۔ یہ بھی ہمارے ناقص نظام تعلیم کا ایک نتیجہ تھا۔ یہ نظام تعلیم نوجوانوں کو فطرت کے جبلی احکام سے سرکشی کا سبق دے کر ان کے اندر ''علم'' کی ایک مطلوبہ مقدار ٹھونس دیتا ہے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ علم تو انسانی استعداد کی معراج کے کمال کا نام ہے نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کسی شے کا علم رکھنے کا مطلب کیا ہے۔ حصول علم کے لے خالی نیک نیتی اور محنت کافی نہیں۔ یہاں تو کسی شے کو اندرونی طاقت سے سمجھ لینے کی قابلیت درکار ہے۔ گویا کسی مسئلہ یا کسی شے کی علت واسباب اور اس کی لم سے واقف ہو جانا علم کی منزل مقصود ہے۔ ہر انسان کی نگاہ اس منزل پر رہنی چاہیے۔

ذرا میں اپنے مفہوم کی وضاحت کر دوں۔ انسان کو اس مغالطہ میں نہ رہنا چاہیے کہ اسے فطرت کا مالک یا اس پر حاکم بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اوندھے نظام تعلیم نے یہ خبط عام کر دیا ہے انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ساری قلمروئے فطرت قانون مجبوری کی پابند ہے اور اسی طرح خود انسان بھی ابدی جدوجہد اور کشمکش کے اصول کے تابع ہے۔ جس کائنات میں سورج اور ستاروں کو ان کے خط گردش سے ذرا ٹلنے کی اجازت نہیں، جہاں طاقت ور ہمیشہ کمزوروں پر غالب ہیں اور جہاں وہ ہر شے جو اس اصول سے تجاوز کرے جس کا اسے پابند بنایا جا سکتا ہے تباہ ہو جاتی ہے۔ وہاں بنی نوع انسان کے لے کوئی علیحدہ قانون نہیں ہو سکتا جس عقل کل کے ماتحت یہ ساری کائنات کام کر رہی ہے۔ انسان کو بھی اسی دانش برتر کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ وہ اس حکمت کے غالب اصولوں کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو کبھی ان کی فرماں برداری

سے آزاد نہیں کر سکتا۔

ذہنی ارباب نشاط

یہودی اپنے جن اخبارات کو ''علمی صحافت'' کا نام دیتا ہے وہ سماج کے ان حلقوں کے لیے سامان مطالعہ مہیا کرتے ہیں جنہیں ذہنی ارباب نشاط کہا جاتا ہے۔ فرانک فرٹر سٹی ٹنگ یا برلی نرگی بلٹ قسم کے اخبارات اسی قماش کے لوگوں کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر اور انداز بیان اسی گروہ کی مناسبت سے معین کیے جاتے ہین۔ انہں حلقوں میں ان کو رسوخ حاصل ہے وہ کوئی ایسا اسلوب تحریر اختیار نہیں خرتے جسے ان کے قارئین غیر مہذبانہ محسوس کریں۔ مریض کے حلق میں زہر انڈیلنے کے لیے اس سے زیادہ دل پذیر ڈھنگ اختیار کیے جاتے ہیں دلکش لہجہ اور خوش نما الفاظ سے قارئین کو دھوکے میں ڈال کر یہ یقین دلا دیا جاتا ہے۔ کہ ایسے اخبارات کی پالیسی محض اخلاق حسنہ کی پیروی علم کی طلب اور حقائق حق پر مبنی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عیارانہ بھیس محض اس کی مخالفت کا احساس دبانے کے لیے پہنا جاتا ہے جو یہودیوں یا ان کے اخبارات کے خلاف پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

وقار اور تمکنت کے اس ڈھونگ سے خام ذہن قارئین کو بہ آسانی قائل کر دیا جاتا ہے۔ کہ بعض دوسرے اخبار جس ''افراط وتفریط' کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسی سنگین نہیں خہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا ضروری ہو۔ قانونی قدم اٹھانے سے تو الٹا آزادی صحات میں فرق آ جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ آزادی صحافت ایک ایسا ردیلا کا طلسمی تعویذ ہے جس کی پناہ لے کر قوم کے ذہن کو مسموم کرنے والے اور رائے عامہ کو دھوکہ دینے والے اخبارات ہمیشہ قانونی سزا سے بچ جاتے ہیں۔ حکام ان ڈاکوؤں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں اسی بنا پر متامل رہتے ہیں۔ حکام کو تو ہر وقت یہی خوف کھائے جاتا ہے۔ کہ کہیں 'معزز اخبارات'' کہ ہمدردیوں سے محروم نہ ہو جائیں یہ ڈر بے بنیاد بھی نہیں۔ کیونکہ گھٹیا اخبارات اس برادری کے کسی رکن کے خلاف

کبھی کوئی اقدام اٹھایا جائے تو باقی سارے اس کی امداد کو دوڑتے ہیں۔ وہ اس کی پالیسی کی حمایت نہیں کرتے۔ یہ تو فقط آزادی صحافت اور رائے عامہ کی حریت کو محفوظ رکھنے کے خواہاں ہوتے ہی۔ یہ وہ نعرہ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جب یہ نعرہ ''شریف اخبارات'' کے ہونٹوں سے بلند ہو تو اس میں کیا تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض قوم کے خون میں زہر سرایت کرتا رہا۔ رائے عامہ کے اندر ایک اچھوت پھیلتی رہی اور حکومت کو روکنے کے لیے کوی موثر قدم نہ اٹھا سکی۔ جو مضحکہ خیز انتظامات کیے گئے وہ بھی انتشار کی ان قوتوں کی جھلک دکھا رہے تھے جو سلطنت کے ٹکڑے اڑادنے پر تلی ہوئی تھی۔ جب کوئی ارادہ ہر اس ہتھیار سے جو اس کے قبضہ میں ہو اپنی حفاظت نہیں کرتا تو گویا وہ اپنی موت کو خود دعوت دیتا ہے۔ ہر ادھورا اقدام اس اندرونی انحطاط کی بیرونی علامت ہے جو دیر یا زور ظاہری تباہی بھی لی ہی آتا ہے۔

اگر ہماری موجودہ نسل کی رہنمائی صحیح طور پر کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس خطرہ پر قابو پا سکتی ہے۔ یہ نسل کچھ ایسے امتحانات سے گزر چکی ہے کہ ہر وہ شخص جس کی اعصابی قوت اس امتحان کی نذر نہیں ہوگئی اب ضرور پہلے سے زیادہ مضبوط اعصاب رکھتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ جب اس بدنام اور بدنام کن صحافت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی یا سرکار نے رائے عامہ کے بنانے اور بگاڑنے کی اس مشین پر قبضہ کر لیا تاکہ اجنبیوں اور قوم کے دشمنوں کو اس میں خوئی دخل نہ رہے تو یہودی اپنے تمام اخبارات کے ذریعے زبردست ہنگامہ پیدا کریں گے۔ وہ اپنے محفوظ چھتے رپ ہاتھ ڈالا جانا ہرگز خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ جب ایسا موقعہ آیا تو ہمیں اس سے نپٹنا' اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ آسان ہوگا۔ بارہ انچ لمبے توپ کے گولے کی چیخ ایک ہزار یہودی صحافت کے اژدھاؤں کی پھنکار سے زیادہ وحشت ناک ہوتی ہے۔ اس لیے جو کان میدان جنگ کا غلغلہ سن چکے ہیں اب ان اخبارات کا غوغا اثر نہیں

کرسکتا۔

بقائے نسل کا مقدس جذبہ کوئی مال تجارت نہیں

جنگ سے پہلے جرمنی میں اہم قومی مسائل کو جس تذبذب اور کمزوری سے حل کیا جاتا تھا اس کی ایک اور مثال حسب ذیل ہے۔ اگر ایک طرف قوم کو اخلاقی اور سیاسی گھن کھا رہا تھا تو دوسری طرف قوم کی جسمانی صحت پر بھی کئی برس سے زہریلی چھوت کا شکار ہو رہی تھی۔ بڑے شہروں میں خاص طور پر آتشک کا زور تھا۔ اس کے ساتھ ہی قریب قریب ملک کے ہر حصہ میں تپ دق نے موت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

قوم ان دونوں بیماریوں کا ہولناک شکار ہو رہی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی میں اس عذات کا رخ موڑنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کی سکت ہی نہ تھی۔

بالخصوص آتشک کے سامنے تو عوامی اداروں نے اور سرکار دونوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ صورت حال کی اصلاح کے لیے فی الواقع جو کچھ کیا جا رہا تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر انتظامات کی حاجت تھی۔ ایسی زبردست لعنت کا مقابلہ کرنے کے لیے محض مشکوک تاثیر والی کوئی دوائی ایجاد کر کے اس کا اشتہار دینا کافی نہ تھا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تشہیر کا اہتمام بہت خوب تھا۔ یہاں ایک دفعہ پھر ضرورت یہ تھی کہ مرض کی علامتوں کا علاج کرنے کی بجائے اس کے اسباب دور کیے جاتے۔ اس مرض کا بنیادی سبب عشق کے پاکیزہ جذبوں کا ناپاک استعمال تھا۔ عصمت فروشی سے پیدا ہونے والی تباہی قوم کو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ختم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ عصمت فروشی ہماری روحانیت کے دامن کو یہودیت کے اثر سے داغدار کر رہی تھی۔ تو الد تناسل کے طبعی اور جبلی جذبہ کی یہ تجارت دیر یا بازو دآنے والی نسلوں کا قلع قمع کر دے گی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تندرست اور سعید الفطرت بچوں کی جگہ قوم کی آغوش میں ایک ایسی انسان نما مخلوق کا ہجوم ہو جائے گا۔ جن کی پیدائش اقتصادی جمع خرچ کے تخمینوں کی مرہون منت ہوگی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ روز بروز نکاح کی شرط اول اور بنیادی احساس اقتصادی جمع خرچ

کے تخمینے قرار پاتے چلے جارہے ہیں۔

عشق نے ان پابندیوں سے بیزار ہو کر اپنے لیے نئی راہیں ڈھونڈ نکالی ہیں۔ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح یہاں بھی کچھ عرصہ تک تو فراغت سے فطرت کی نافرمانی کرنا ممکن ہے لیکن دیر یا زود قدرت کے شدید انتقام کا سامنا کرنا ہوگا۔ انسان کو تب اس حقیقت کا ہوش آتا ہے جب وقت ہاتھ سے نکل چکتا ہے۔

تقاضائے فطرت کے مطابق ازدواج کی بنیادی شرائط پوری کرنے سے مسلسل انحراف کے نتائج کیسے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ہمارے رؤسا کے خاندان میں دیکھی جاسکتی ہے۔ رؤسا کے خاندان میں ہم صاف صاف اور بالمشافہ توالد و تناسل کی ان عادات کے اثرات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو اقتصادی جمع خرچ کے تخمینوں اور سماجی رسوم کی پابندی پر مبنی ہوتی ہیں۔ سماجی رسول کی پابندی سے تو پیدائشی نقاہت' خاندانی وصف بن جاتا ہے' اور اقتصادی جمع خرچ کے تخمینوں سے خون میں کھوٹ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ حضور نواب صاحب کے خاندان کا نام زندہ رکھنے کے لیے منڈی کے ہر یہودی دوکاندار کی لڑکی نواب صاحب کے نور چشم کا جوڑ سمجھی جانے لگتی ہے۔ اس جمع خرچ کا پورا حساب اولاد کے چہرے پر لکھا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ خاندانی اوصاف میں بالکل ابتری پھیل جاتی ہے۔ ہمارے متوسط الحال طبقے بھی آج کل یہ کھیل کھیلنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کا بھی یہی انجام ہوگا۔

ان ناخوشگوار حقائق کو بعجلت تمام بڑی طمانیت کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ گویا آنکھیں میچ لینے سے حقیقت حال کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج ہمارے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کے باشندے اپنے جذبہ عشق کی تسکین کے لیے عصمت فروشی کی جانب روز افزوں رجوع کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہوانی امراض کی چھوت روز بروز پھیلتی جارہی ہے۔ عوام کے اندر ان امراض کی چھوت وسیع پیانے پر پھیل جانے کے بدیہی نتائج ایک طرف تو پاگل خانوں میں

دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف...... ہائے افسوس...... ان کا مشاہدہ گھروں کے اندر پلنے والے معصوم بچوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو لعنت ہماری معاشرتی زندگی کو روز افزوں مسموم کر رہی ہے اس کی رنجیدہ اور افسوس ناک شہادت ان واقعات سے مل جاتی ہے۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ معصوم اپنے والدین کے گناہوں کا عذاب بھگت رہے ہیں۔

ان ناخوشگوار اور ہولناک صورت حال سے غافل ہو کر بیٹھ رہنے کے کئی ڈھنگ ہیں۔ کئی لوگ آنکھیں بند کر کے چلتے پھرتے ہیں۔ تا کہ کہیں کچھ نظر نہ پڑ جائے۔ یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے نہ دیکھنے کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ آسان اور سستا علاج ہے۔ بعض دوسرے لوگ پرہیز گاری کی چادر میں منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ یہ پرہیز گاری اتنی ہی مضحکہ خیز ہے جتنی کہ بے حقیقت وہ کہتے ہیں یہ سب گناہ کی باتیں ہیں اگر کوئی انہیں حقیقت حال سے دوچار کر دینے کی جرات کرے تو وہ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ وہ تقدس ماب کراہت کا اظہار کر کے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر رب ذوالجلال سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی بس چلتا ہے تو جس طرح اس نے قوم لوط اور دوسرے خطا کاروں پر عذاب نازل کیا تھا اسی طرح ان گناہگاروں پر آگ کی بارش اور پتھروں کا طوفان بھیج کر دیکھنے والوں کو عبرت کا سبق دے۔ اگر یہ عذاب ان پرہیز گار بزرگوں کی موت کے بعد تک بھی ملتوی ہو جائے تو انہیں خدا سے کوئی خاص گلہ نہیں۔ اخیر میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اس لعنت کے خطرناک نتائج سے خوب آگاہ ہیں۔ لیکن خالی منڈیا ہلا کر اپنی بے بسی کا اظہار کر دیتے ہیں کہ ہم تو اس خطرہ کا تدارک کرنے سے لاچار ہیں۔

دنیا میں صرف تندرست اور تنومند نسلیں باقی رہیں گی

بے شک یہ تمام بہانے بنانا بہت آسان اور سہل ہے۔ ہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آنے والے خطرات کے مقابلہ میں سہل انگاری قوم کے لیے مہلک نتائج پیدا کر سکتی

ہے۔ یہ عذر کہ دوسری قوموں کا حال ہم سے بہتر نہیں' ہمارے اپنے انحطاط کا علاج نہیں۔ البتہ دوسری قوموں سے ہمدردی کا احساس ہماری اپنی زبوں حالی کو ضرور زیادہ قابل برداشت بنا لیتا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے میں کونسی قوم رہنمائی کرے گی اور کون سی قومیں اس کا شکار ہو جائیں گی۔ تمام صورت حال کا لب لباب یہی مسئلہ ہے زمانہ حال نسلی اقتدار کے لیے آزمائشی دور ہے۔ جو قوم اس امتحان میں ناکام ہو جائے گی وہ فنا ہو جائے گی' اور اس کی جگہ تندرست اور زیادہ تنومند نسلوں کے سپرد کر دی جائے گی' جو حالات کا مقابلہ بہتر طور پر کرنے کے قابل ہوں گی۔ اس سوال کا آنے والی نسلوں سے زیادہ تعلق ہے۔ اس کے لیے اس معاملہ میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی تو وہ ان غلط کاریوں کی فہرست میں شامل ہو گی جن کی بابت خوفناک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آباؤ اجداد کے گناہوں کی سزا ان کی اولاد کو دس پشتوں تک ملتی ہے۔ یہ ہے وہ عقوبت جو نسل اور خون کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں نازل ہوتی ہے۔

اس دنیا میں خون اور نسل کا گناہ ایک جدی گناہ ہے جو قوم اس گناہ کی مرتکب ہو اس سے زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ جنگ سے پہلے جرمنی کے اہم ترین مسائل میں تھا۔ پھر بھی اس کے حال کے لیے جو روش اختیار کی گئی وہ قابل افسوس ہے۔ اس چھوت کے نوجوانوں تک پھیلنے کو روکنے کے لیے بڑے بڑے شہروں میں کیا قدم اٹھائے گئے؟ ہماری معاشرتی زندگی کو غلاظت اور تجارت کے قالب میں ڈھالنے والے اسباب کا تدارک کا کیا اہتمام کیا گیا؟ مذکورہ بالا خامیوں کے باعث آتشک ساری قوم میں سرایت کر چکی تھی' اس کے انسداد کا کیا انتظام ہوا؟ ان سوالات کے جوابات کو جانچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جو کچھ کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کا مختصر بیان کر دیا جائے۔

حکام کو اس مسئلہ کا حل بے تکے پن سے تلاش کرنے کے بجائے خیال رکھنا چاہیے

تھا کہ مستقبل کی کئی پشتوں کی خوشحالی یا بد حالی کا انحصار اس حل پر ہے۔ اگر یہ احساس پیدا ہو جاتا تو پھر اس کا تقاضا تھا کہ پوری سنگ دلی سے قرار واقع تدابیر اختیار کی جاتیں۔ پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ سارے ملک کے روشن خیال طبقات کی توجہ اس ہولناک خطرہ پر مرکوز کر دی جاتیں' تاکہ ہر فرد کو احساس ہو جاتا کہ اس خطرہ کا مقابلہ کرنا کتنا ضروری ہے۔ جن سخت پابندیوں پر عمل مشکل ہو کر ان کو عائد کرنے اور قبول کرنے کی ضرورت عوام کے ذہن نشین کروائے بغیر ایسی پابندیاں نافذ کر دینا فضول ہوتا ہے۔ رائے عامہ کو قائل کرنے کے لیے اطلاعات اور تبلیغ کے ایک وسیع اور باقاعدہ نظام کی حاجت ہوتی ہے۔ روزمرہ کے جن چھوٹے موٹے مسائل کی وجہ سے رائے عامہ کی توجہ ایسے مرکزی اور مہم مسئلہ سے ہٹ جانے کا امکان ہو' انہیں معرض فراموشی میں ڈال دینے کا بندوبست ہونا چاہیے۔

جب کبھی کوئی غیر معمولی صورت حالت یا کوئی ایسا کام درپیش ہو جس کو کامیابی سے سرانجام دینا ناممکن نظر آئے تو رائے عامہ کو اس ایک مسئلہ پر اس طرح مرکوز کر دینا چاہیے گویا فقط اس کے حل سے زندگی اور موت وابستہ ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے رائے عامہ کو ایسا مشتعل اور متحد کیا جا سکتا ہے کہ ساری قوم پوری طاقت اور رضامندی سے اہم نتائج حاصل کرنے کی خاطر اٹھ کھڑی ہو۔

کچھ کرنے کی ترغیب یہ ہے کہ بہت کچھ ترک کر دو

یہ ایک ایسا سچا اصول ہے۔ جس کا اطلاق ہر فرد بھی اپنی زندگی پر کر سکتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی مقصد عظیم کے حصول کی کامیابی کا خواہاں ہو تو اسے پہلے اپنی تمام کوششیں اپنے منتہائے نظر سے کسی ابتدائی اور محدود مرحلہ پر مرکوز کر دینی چاہئیں اگلی منزل کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے اس اولین مرحلہ کو طے کرنا چاہیے۔ جو لوگ اپنا راستہ قدم بقدم طے نہیں کرتے' یا ایک وقت میں اپنی ساری ہمت ایک مرحلہ پر مرکوز نہیں کرتے وہ کبھی انتہائے مقصود تک نہیں پہنچ پاتے۔ کبھی نہ کبھی ان کے قدم ضرور ڈگمگا جاتے ہیں۔

اور وہ ناکام رہتے ہیں۔ ایک نصب العین طے کر کے اس کی جانب یوں منزل بمنزل بڑھنا بجائے خود ایک فن ہے۔ راستہ کے ہر پڑاؤ کو طے کرنے کے لیے پوری ہمت صرف کر دینی پڑتی ہے۔

اس لیے جب کبھی قوم کو مشکل درپیش آئے تو اسے حل کرنے کی سب سے پہلی اور لازمی شرط یہی ہے کہ حکام عوام کے ذہن نشین کرا دیں کہ اولین مرحلہ کو طے کرنے کے لیے جو فوری قدم اٹھایا جا رہا ہے اسی پر ساری کوشش کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ عوام کی نگاہیں اتنی تیز اور دوربین نہیں ہوتیں کہ وہ سارے راستہ کو یکلخت دیکھ سکیں۔ اگر وہ اتنی دور نظر دوڑانا چاہیں یا نہیں مجبور کیا جائے تو وہ تھک جاتے ہیں۔ انہیں اپنے اوپر یہ اعتماد ہی نہیں رہتا کہ ان میں اتنا طویل راستہ طے کرنے کی سکت نہیں۔ وہ کسی حد تک تو منزل مقصود کا تصور اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتے ہیں لیکن ساری سڑک کا اندازہ وہ چھوٹی چھوٹی منزلوں کے سہارے ہی سیاد رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی حالت اس دور کے چھوٹی منزلوں کھے سہارے ہی یاد رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی حالت اس دور کے مسافر کی طرح ہے جو یہ تو جانتا ہے کہ اس کی منزل مقصود کہاں ہے۔ لیکن اسے قطع مسافت میں ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک پہنچنے کے عزم سے ہی سہولت دیتی ہے۔ لمبا راستہ چلنا ہو تو مسافر صرف اسی ترکیب سے منزل مقصود تک پہنچے کا ارادہ تازہ رکھ سکتا ہے۔

امراض خبیثہ کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یہ مسئلہ عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے پراپیگنڈہ کا ہر طریقہ استعمال کرنا لازم تھا۔ یوں نہیں کہ قوم کو جو مسائل درپیش ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے بلکہ اس طرح کہ فی الحال قوم کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ درپیش ہے۔ اور وہ ہے امراض خبیثہ کا تدارک عام کو اس لعنت کے متعلق حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یہ مہم اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ساری قوم کو یقین کامل نہ ہو

جاتا کہ سب کچھ اسی مسئلہ کو حل کرنے پر موقوف ہے۔ انہیں کوئی شک نہ رہتا کہ آئندہ یا تو ہماری قوم ''تندرست'' رہے گی اور یا بیماری کے غار میں دفن ہو جائے گی۔

اگر ضرورت محسوس ہوتی تو یہ ابتدائی اقدامات مسلسل کئی صدیوں تک جاری رہتے۔ صرف اسی طریقہ سے رائے عامہ اور قومی عزم کی قوتوں کو بیدار کیا جا سکتا تھا۔ جب یہ طاقتیں بیدار ہو جاتیں تو صرف اسی صورت میں پوری سختی کے ساتھ واضح انتظامات نافذ کیے جا سکتے تھے۔ ورنہ خدشہ تھا کہ اس ساری کوشش سے عوام کی ہمدردیاں منقطع ہی نہ ہو جائیں۔ یا قوم کا ارادہ سست نہ پڑ جائے۔ یہ تو ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس لعنت کے خلاف کارگر لڑائی لڑنے کے لیے بے بہا قربانیاں اور وسیع پیمانے پر مشقت اٹھانے کی حاجت ہے۔

آتشک کے خلاف قدم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ عصمت فروشی' اوہام پرستی' رسوم پرستی' فیشن پرستی' عام تعصبات اور ملمع کی پرہیز گاری ان سب کے خلاف بیک وقت محاذ جنگ قائم کرنا ہوگا۔

سرکار کو اس وقت تک جدوجہد کی یہ مہم شروع کرنے کا حق حاصل نہیں جب تک پہلے نوجوانوں کو چھوٹی عمر میں نکاح کرنے کی سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں۔ سن رسیدگی کے بعد نکاح کی رسم پر کسی پہلو سے غور کیا جائے۔ یہ رواج انسانیت کے لیے باعث شرم ہے۔

عصمت فروشی انسانیت کی بے حرمتی ہے۔ اس کا تدارک علمی یا خیراتی وسائل سے ناممکن ہے۔ پہلے اس کو قابو میں لانے اور پھر ختم کر دینے کے لیے بہت سے ایسے گردوپیش کے حالات کا بندوبست کرنا لازمی ہے جو اس کے ممد و معاون ہیں۔ اولین شرط تو یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن سے صغر سنی میں نکاح کرنا آسان ہو جائے۔ بالخصوص لڑکوں کو بچپن میں نکاح خرنے کے قابل بنانے کے لیے موجودہ حالات میں بڑی بڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ

برائے بس میں رہتی ہیں اس بارے میں ہماری قوم کس حد تک گمراہ ہو چکی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج کل کے نام نہاد اونچے طبقہ کی مائیں بس اوقات کوئی ایسا داماد مل جانے پر اظہار مسرت کرتی دکھائی دیتی ہیں جو ''جوانی کے کھیل کھیلنے'' کا مرحلہ طے کر چکا ہو۔ ایسے مردوں کی آج کل کوئی کمی تو نہیں ہے لہذا دلہن غریب کے لیے اس قماش کا دولہا مہیا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ہاں ایسے ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ البتہ اس سیانے رشتہ کی قلعی کھول دیتی ہے۔

نکاح کا مقصد کیا ہے

ان سب امور سے قطع نظر جب انسان دیکھتا ہے کہ توالدو تناسل کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے۔ اور فطرت کو اس کے حقوق سے محروم کرنے کی خاطر جان بوجھ کر چالیں چلی جا رہی ہیں تو صرف ایک سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا نکاح کا دستور آج بھی باقی ہے؟ اگر یہ دستور آج بھی باقی ہے تو اس کا مقصد کیا رہ جاتا ہے؟ کیا نکاح اور عصمت فروشی میں کوئی فرق نہیں؟ کیا اس معاملہ میں ہماری آئندہ نسلوں کی بابت ذمہ داری کو بھی کچھ دخل ہے؟ کیا قوم فطرت کے ایک بنیادی قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو قدرت کی جس لعنت اور غضب کا مستحق بنا رہی ہے اسے اس کا کچھ احساس نہیں؟ یہی وہ لچھن ہیں جن سے مہذب قومیں زوال پذیر ہو کر بالآخر ختم ہو جایا کرتی ہیں۔

نکاح بجائے خود کوئی مقصد نہیں' بلکہ ایک برتر مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ وہ برتر مقصد ہے نوع انسانی کی بقا اور اس کی تعداد میں اضافہ اپنی نسل کی ترقی یہ ہے کہ نکاح کا مطلب اور مفہوم۔

اگر مقصد کا اقرار کر لیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ پھر نکاح کے دستور کا معیار یہ ہو گا کہ وہ کہاں تک اپنے مقصد کو پورا کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ صغر سنی کے نکاح کو عام رواج دینا چاہیے۔ کیونکہ صغر سنی کے نکاح سے نوجوان جوڑے میں باہم وضع داری

کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جو آئندہ ایک ایسی تندرست نسل کی تخلیق کے لیے لازمی ہے جس کی قوت مدافعت مفلوج نہ ہو۔ ہاں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب تک دور رس سماجی تبدیلیاں نہ کی جائیں تب تک صغر سنی کے نکاح کو عام رواج نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ان تبدیلیوں کے بغیر صغر سنی کا نکاح ناممکن ہے۔ بالفاظ دیگر گو بظاہر یہ مسئلہ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا حل صحیح ساری معاشرت کا پس منظر بدل کر ہی ممکن ہے۔ ان تبدیلیوں پر غور کر کے اندازہ کرنا چاہیے کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کہ ہماری آج کل کی نام ہاد سوشل ریپبلک 'عوام کے لیے رہائشی مکانات بھی مہیا کرنے سے قاصر ثابت ہوئی ہے۔ جب مکانات ہی نہیں تو لاتعداد منکوحہ جوڑے زندگی کہاں بسر کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ کرتوتیں جن سے عصمت فروشی کو فروغ دینے کا راستہ صاف کیا جاتا ہے۔

صغر سنی کے نکاح ناممکن ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی احمقانہ شرح مشاہرہ ہے۔ تنخواہ مقرر کرتے وقت یہ خیال ہی نہیں کیا جاتا کہ تنخواہ ایک خاندان کے گزارہ کے لیے کافی ہے۔ عصمت فروشی کا قرار واقعی تدارک صرف صغر سنی کے نکاح کو عام رواج دینے کے لیے ممکن ہے' اور صغر سنی کے نکاح کو تبھی عام رواج دیا جا سکتا ہے۔ جب پہلے بنیادی اور انقلابی معاشرتی اصلاح کے ذریعہ چھوٹی عمر کا ازدواج زیادہ آسان ہو جائے۔ عصمت فروشی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے یہ اولین لازمی اور بنیادی شرط ہے جسے پورا کیے بغیر چارہ نہیں۔

ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت لازم ہے

دوسری شرط یہ ہے کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے متعلق رائج العام غلط نظریات کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اس طرح کسی نے آج تک توجہ نہیں دی۔ ہمارے تعلیمی نصاب میں دماغی تعلیم اور جسمانی تربیت کے مابین واجبا ایک توازن قائم کرنا ہوگا۔

جس ادارے کو آج کل مکتب کہا جاتا ہے اس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی۔ لیکن مکتب

کی موجودہ شکل ایک درس گاہ کے اس تصور کی توہین ہے جو قدیم یونان میں رائج تھا۔ ہمارے نظام تعلیم میں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہ بغیر تندرست جسم کے کوئی تندرست دماغ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ چند مستثنیات کو چھوڑتے ہوئے قوم کے عوام تو خاص طور پر اس قاعدہ کے طابع ہیں۔

جنگ سے پہلے جرمنی میں کوء اس حقیقت پر غور نہ کرتا تھا۔ جسم کی تربیت میں مجرمانہ غفلت برتی جا رہی تھی۔ قوم کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے دماغ کی یک طرفہ نشوونما کو کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس کا خمیازہ توقع سے پہلے بھگتنے کی نوبت آنی تھی۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کی بالشویکی تعلیمات میں ان علاقوں میں زیادہ فروغ پاتی ہیں جہاں کے باشندے نحف ہوں۔ اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وسطی جرمنی، میکسنی اور روہر کی وادی ایسے ہی علاقے ہیں۔ ان اضلاع میں یہودیوں کی پھیلائی ہوئی چھوت کی ذہنی بیماری کا پڑھنے لکھے طبقات بھی کچھ مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ خود پڑھے لکھے طبقات بھی جسمانی طور پر ضعیف ہیں' فاقہ کشی کے سبب نہیں بلکہ ذہنی کاوش کی طفیل! ہماری قوم کے بالائی طبقات کی تربیت ذہنی تعلیم تک محدود ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ فی زمانہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کی اہلیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ کیونکہ عہد حاضر میں جسمانی طاقت ہی فیصلہ کن ہے نہ کہ ذہنی زور۔ یہ لوگ نہ تو زندگی میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنے کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ آگے ترقی کرنے کی۔ یوں بھی جسمانی کمزوری ہمیشہ انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔

محض ذہنی تعلیم کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے اور اس وجہ سے جسمانی تربیت سے سراسر غافل رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھوٹی عمر میں ہی جنسی احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ جن بچوں کی پرورش اور کھیل کود سے مضبوط اور تربیت یافتہ بن چکے ہوں ان پر شہوت کا غلبہ ایسے گھر بیٹھے رہنے والوں کی نسبت کم ہی ہوتا ہے جو ہمیشہ ذہنی معجون ہی کھاتے رہے ہوں۔ کوئی صالح نظام تعلیم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ بھی نہیں

بھولنا چاہیے کہ ایک تنومند نوجوان کسی عورت سے جو توقعات رکھتا ہے وہ ان آرزوؤں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جو قبل از وقت بیراہ روی کا تجربہ رکھنے والی ناتوانی سے پرورش پاتی ہیں۔

غرض تعلیم کے ہر شعبہ میں تدریس کے روزانہ نصاب کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ ایک بچہ کا فارغ وقت اس کے جسمانی قومی کو مفید نشوونما دینے میں صرف ہو سکیل۔ اس عمر میں اسے آوارہ پھرنے شارع عام پر شرارتیں کرنے یا سینما میں وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں جب وہ روزانہ کام ختم کر چکے تو اسے اپنا مضبوط جسم بنانا چاہیے تا کہ موقع پڑنے پر وہ کمزور ثابت نہ ہو۔ نظام تعلیم کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو یہ ضرورت پوری کرنے کے قابل بنائے اور رفی الحقیقت یہ ضرورت پوری بھی کرے۔ نظام تعلیم فقط علم یا عقل کی پچکاریاں لگانے والے کارخانہ کا نام نہیں۔

ہمارے مکتبوں کو یہ اصول بھی ترک کر دینا چاہیے ک جسم کی تربیت ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسے انفرادی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کسی فرد کو یہ آزادی حاصل نہیں کہ وہ آئندہ نسلوں کے خلاف گناہ کا ارتکاب کر کے امت کو نقصان پہنچائے۔

جسم کی عصمت بچانے کی لیے ذہن کی معصومیت کی حفاظت لازمی ہے

جسم کی تربیت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ذہن کی گمراہی کے سامان بھی ختم کرنے چاہیئں آج کل ہماری تمام جمہوری زندگی کو عیاشیوں کے ایک ایسے تکیہ سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے، جو فقط جنسی تصورات اور جنسی محرکات کو بھڑکانے کے لیے قائم کیا گیا ہو۔ سینماؤں، تھیٹروں اور دوسری تفریح گاہوں کے مشاغل کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس دسرخوان پر سجائی جانے والی غذا صالح نہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو تو بالخصوص اس سے پرہیز واجب ہے۔ اشتہار بازی کے مختلف طریقوں سے عوام کی توجہ نہایت بیہودہ اور بازاری انداز میں اپنی طرف منعطف کرواتی

ہے۔ جو شخص شباب کے ارمان بالکل محو نہیں کر چکا وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی انگیخت کے نتائج کتنے سخت خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ شہوت انگیز اور ورغلانے والی فضا ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں ایسے خیالات داخل کر دیتی ہے کہ جن سے ابھی انہیں ناواقفتی رنا چاہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی ''تعلیم'' کے نتائج ہمارے نوجوانوں میں بخوبی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ جو وقت آنے سے پہلے بالغ ہو جاتے ہیں۔ اور اس لیے وقت آنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے چودہ اور پندرہ سال کے بچوں کی روحانی کیفیات کے متعلق گاہ گاہے عدالتی کارروائی کے دوران میں ایسے ایسے انکشافات سامنے آ جاتے ہیں جن سے گھن محسوس ہوتی ہے۔ ان حالات میں یہ اکثر کچھ باعث تعجب نہیں کہ اس عمر کے بچے بھی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے جسمانی طور پر ضعیف اور ذہنی لحاظ سے گمراہ نوجوانوں کی کثیر تعداد دیکھ کر خوفناک شرم محسوس ہونی چاہیے جنہیں بڑے بڑے شہروں کی رنڈیاں ازدواجی راز ہوئے سربستہ سے آشنا کر دیتی ہیں۔ نہیں جو لوعصمت فروشی کو ختم کرنے کے لیے سنجیدگی سے خواہشمند ہیں۔ انہیں سب سے پہلے وہ روحانی علل دور کرنے میں مدد دینا ہوگا جن کے باعث عصمت فروشی فروغ پاتی ہے۔ انہیں نڈر بن کر اور احتجاجی شورش سے لاپرواہ ہو کر ہمارے بڑے بڑے شہروں کی ''تہذیب'' کو اخلاقی گراوٹ سے پاک کرنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو ان کے موجودہ ماحول کے گندے اثرات سے بچا نہ سکے وت وہ تباہ ہو جائیں گے۔ جو لوگ ان حرکتوں کو دیکھ کر ان دیکھا کر دیتے ہیں وہ دراصل ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ عصمت فروشی کے نتائج آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے ک مجرم ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کی حفاظت موجودہ نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ ہماری ثقافت کو پاکیزہ بنانے کی یہ مہم قریب قریب زندگی کے ہر شعبہ میں جاری کرنی ہو گی۔ تھیٹر' فنون لطیفہ' لٹریچر' سینما' صحافت اور اشتہارات ان سب سے گندگی کے داغ دھلنے چاہئیں۔ اور ان سب سے قوم کی خدمت اور قوم کی تہذیب کی خدمت کا کام لینا

چاہیے۔قوم کی زندگی کو جدید عشق بازی کا گلا گھونٹ دینے والی خوشبو اور پرہیز گارانہ یا نامردانہ منافقت سے یکسر پاک کرنا ہوگا۔ان سب اقدامات میں مقصد کار اور طریقہ کار دونوں کا تعین فقط قوم کی روح اور جسم کے مفاد کے تحفظ کے پیش نظر کرنا ہوگا۔اولین فریضہ نسل کی بقا ہے۔شخصی آزادی کا حق دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

جب ان انتظامات پر پورا پورا عمل درآمد شروع ہو جائے تو اس کے بعد ہی اس لعنت کے طبی علاج کی مہم کو بھی کامیاب بنانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے یہاں پھر ادھورے اقدامات سے کام نہ چلے گا۔دورس اور اہم فیصلے کرنے ہوں گے۔اگر لاعلاج مریضوں کو یہ موقع ملتا رہے کہ وہ ایک کے بعد دوسرے تندرست انسان تک چھوت پھیلایا کریں تو یہ ادھورے اقدامات کا ثبوت ہوگا۔یہ اس قماش کی ہمدردی خلق ہوگی جو ایک بیمار کا جی رکھنے کو سینکڑوں تندرست قربان کر دیتی ہے۔یہ مطالبہ نہایت معقول دلائل پر مبنی ہے کہ ناقص اشخاص کو ناقص اولاد پیدا کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ایسے پابندی نافذ کرنے کا بندوبست ہمدردی خلق کا بہترین اظہار ہوگا۔لاکھوں بے گناہ تکلیف دہ دکھ درد سے بچ جائیں گے۔قومی صحت میں بھی بتدریج ترقی ہوگی۔اگر اس تجویز پر مضبوطی سے عمل کیا جائے تو امراض خبیثہ کی مزید ترویج رک جائے گی۔پھر صرف یہ ضرورت باقی رہ جائے گی کہ لاعلاج مریضوں کو باقی آبادی سے جدا کر دیا جائے۔شاید ان حرماں نصیبوں کے حق میں تو یہ ایک وحشیانہ سلوک ہوگا۔لیکن یہی اقدام موجودہ نسل اور آئندہ نسلوں کے لیے باعث رحمت ہوگا۔اس طرح موجودہ صدی میں تھوڑا سا دکھ برداشت کر کے آئندہ ہزار ہا نسلوں کو دکھ سے بچا لیا جائے گا۔

محض قانونی پابندیوں سے معاشرتی اصلاحات کا نفاذ ناممکن ہے

بنی نوع آدم کو جو عظیم الشان مہمیں درپیش ہیں ان کے تدارک میں سے آتشک کا استیصال اور آتشک کو فروغ دینے کی اصل وجہ یعنی عصمت فروشی کا تدارک بھی ہے۔ میں اس مہم کو عظیم الشان اس لیے کہتا ہوں کہ یہاں صرف کسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کا

سوال نہیں بلکہ خرابیوں کے ایک جال کو ختم کرنا ہے جس کے باعث یہ لعنت فروغ پا رہی ہے۔ جسم کی یہ بیماری صرف اخلاقی' معاشرتی اور نسلی جبلی خصلتوں میں فتور آ جانے کا نتیجہ ہے۔

اگر یہ مہم بزدلی یا سستی کے باعث کامیابی سے انجام نہ دی جا سکی تو ہم چشم تصور سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج سے پانچ سو سال بعد صورت حال کیا ہو گی۔ خدا کے ارضی خلیفہ' حضرت انسان کا تو نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ اگر مسخ شدہ فطرت والے کچھ نمونے باقی بچ بھی گئے تو وہ خالق کی تضحیک کے سوا اور کس کام آئیں گے۔

آج تک اس لعنت کی روک تھام کے لیے جرمنی میں کیا کچھ کیا گیا؟ اگر ہم اس سوال پر ٹھنڈے جی سے غور کریں تو دل بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکام کے حق تے اس خطرناک اور مضر بیماری کے اثرات سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اس کے تدارک کے لیے سرکاری طور پر بھی جو قدم اٹھائے گئے ناکافی تھے' ار بری طرح ناکام ہو گئے۔ مرض کے اسباب کی تو کچھ پرواہ ہی نہیں کی گئی البتہ علامات کے علاج کی کوششوں کا شغل کچھ عرصہ ضرور جاری رہا۔ رنڈیوں کا طبی معائنہ ہوتا تھا۔ اور جہاں تک ممکن ہو ان پر قابو پایا جاتا تھا۔ چھوت کی علامتیں ظاہر ہونے پر انہیں شفاخانے بھیج دیا جاتا تھا۔ جب وہ بظاہر تندرست ہو جائیں تو انہیں پھر خلقت کا شکار کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک ''قانون پیش بندی'' نافذ کیا گیا تھا جس کی رو سے امراض خبیثہ کے مریضوں کو اس وقت تک مباشرت کی ممانعت تھی جب تک وہ بالکل تندرست نہ ہو جائیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی ایک فوج داری جرم تھا۔ اصولاً تو یہ قانون صحیح تھا۔ لیکن عملاً قطعی ناکام ہوا۔ اول تو اکثر عورتیں عدالت میں پیش ہو کر اس مرد کے خلاف شہادت دینے سے انکار کرتی تھیں ل جس نے ان کی صحت کو خراب کر دیا ہو۔ یوں بھی ایسے واقعات میں مردوں کی نسبت عورتیں پھبتیوں کا نشانہ زیادہ بنتی تھیں۔ پھر اگر عورت

تک چھوت خود اس کے شوہر کے ذریعہ پہنچی ہو تو اس کی مشکل کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسی حالت میں عورت خود اپنے شوہر کے خلاف بھی فرد جرم عائد کروانے کی کوشش کرے؟ یا بتاؤ وہ کیا کرے؟؟

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے وہاں ایک اور ہی دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ اس خطرہ کا عموماً نشہ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت انہیں اپنی ''دلفریب محبوبہ'' کا معائنہ کرنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ ہر روگی فاحشہ اس نکتہ سے خوب آگاہ ہوتی ہے۔ اور وہ اس لیے چن چن کر شراب کے نشہ میں مدہوش مردوں سے کام نکالتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بدنصیب مرد کو بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کی ''محسنہ مشفقہ'' کون محترمہ تھیں۔ برلن اور میونخ جیسے بڑے شہروں مں آئے دن ایسے اتفاقات پیش آتے رہتے ہیں۔ طوائفوں کے بہت سے زائرین بیرونی اضلاع سے آتے ہیں وہ شہری زندگی کے طلسم میں اسیر ہو کر بالکل ہی گم سم ہو جاتے ہیں۔ ایسے سادہ لوح رنڈیوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

بڑی بات تو یہ ہے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے چھوت لگ چکی ہے یا نہیں۔ کیا ایسی لاتعداد مثالوں کا ثبوت موجود نہیں جہاں بظاہر ایک شخص علاج سے تندرست ہو گیا تھا لیکن پھر بیمار ہو گیا' اور اس نے لاعلمی میں بے اندازہ نقصان پہنچایا۔

یہی وجہ تھی کہ عملاً ان قوانین کے نتائج منفی تھے۔ عصمت فروشی پر قابو پانے کی کوشش کا بھی یہی حشر ہوا۔ بحالات موجودہ طبی علاج یا بظاہر شفایابی نا قابل اعتماد ہے۔ کم از کم مشکوک ہیں۔ یعنی امر صرف یہ ہے کہ باوجود اس قسم کی کوششوں کے یہ لعنت زیادہ پھیلتی جا رہی ہے۔ اسی ایک حقیقت کا احساس امتناعی قوانین کو نکما ثابت کر کے ناکارہ قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ جو لوگ اس موضوع کو کچھ ایسا اہم نہیں سمجھتے انہیں اس مرض کی اشاعت کے اعداد و شمار کا معائنہ کرنا چاہیے۔ گزشتہ ایک صدی میں اس کے فروغ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور پھر یہ غور کرنا چاہیے کہ آئندہ اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

اگر کوئی شخص غیر معمولی طور پر بیوقوف نہ ہو اور اس کے سامنے صورت حالات کی وضاحت کی جائے تو اس مسئلہ کے متعلق معمولی مشاہدات کے بعد ہی اس کے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ جائے گی۔

جنگ سے پہلے جرمنی میں اس خرابی کے تدارک کی نسبت کی جو ادھورا اور مذبذبانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے اسے یقیناً انحطاط کی شہادت سمجھنا چاہیے۔ جب اپنی تندرستی کی خاطر جدوجہد کرنے کی جرات بھی باقی نہ رہے تو اس کشمکش کی دنیا میں زندہ رہنے کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

ثقافت کا عروج وزوال قوموں کے عروج وزوال کی نشانی ہے

قدیم جرمن سلطنت کے انحطاط کی کھلی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ تہذیب اور ثقاتفت کا عام معیار آہستہ آہستہ گر رہا تھا۔ جب میں ثقافت کا نام لیتا ہوں تو اس سے میری مراد وہ تہذیب نہیں ہوتی جسے آج کل یہ نام دیا جاتا ہے۔ یہ نام نہاد ثقافت اور تہذیب تو الٹے زندگی کے روحانی ارتقاء میں حائل ہے۔

گزشتہ صدی کے اواخر میں دنیا کے اندر ایک نئی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس کا کسی کو آج تک وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اور جو ہمارے لیے بالکل اجنبی تھی ماضی میں بھی حسن ذوق کی خلاف ورزیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن یہ خلاف ورزیاں اس انحراف میں بھی ایک تاریخ دلچسپی تلاش کر سکتی تھیں لیکن یہ زیر بحث انقلاب صرف فنی طور پر مہمل نہ تھا۔ بلکہ معنوی انحطاط کا بھی ترجمان تھا۔ اس کے بعض نمونے تو وجدانی مفہوم سے سراسر عاری تھے گویا آنے والے زوال کی نشانیاں سب سے پہلے ثقافتی حلقوں میں نمودار ہونے لگی تھیں

کمیونزم صرف ایک ہی قسم کی روحانیات اور ثقافت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ فنون لطیفہ کو بھی کمیونزم کے رنگ میں ڈبو دے۔

اگر کسی شخص کو یہ دعویٰ عجیب معلوم ہو تو اسے صرف ان بدقسمت ملکوں پر نظر دوڑانے

کی ضرورت ہے جو کمیونزم کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ جلد ہی یہ دیکھ کر خود وحشت زدہ ہو جائے گا کہ ان ممالک میں اب تنزل پذیر اور خلل دماغ کے مریض فن کاروں کی بے تکی اور جناتی تخلیقات کے سوا فنون لطیفہ کے کوئی متوازن نمونے تیار نہیں ہوتے۔ آرٹ کی وہ تمام مسخ شدہ اور مہمل صورتیں جنہیں اقلیدسی مصوری یا عمودی مصوری کا نام دیا جاتا ہے' اور وج موجودہ صدی کے آغاز میں نمودار ہونے گی ہیں' ان ممالک میں سرکاری طور پر فنون لطیفہ میں داخ تسلیم کر لی گئی ہیں بویریا کی کمیونسٹ حکومت تھوڑے ہی دن زندہ رہی۔ لیکن وہاں بھی اس ''آرٹ'' کا خروج ہونا شروع ہو گیا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ ملک خالی سیاسی لحاظ سے انحطاط نہیں کر رہا بلکہ ثقافتی زوال میں بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ اس زوال کی جھلک تمام سرکاری اشتہارات' پراپیگنڈے کی تصویروں اور اخبارات وغیرہ میں نمایاں تھی۔

آج ہم جس سیاسی زوال اور ثقافتی انحطاط سے دوچار ہیں۔ آج سے آٹھ سال قبل کسی کو اس کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ یہ ثقافتی انحطاط ۱۹۰۰ء سے اقلیدسی مصوری کی صورت میں راج پا رہا ہے اگر آج سے ساٹھ سال قبل کوئی شخص اپنی واردات قلب عمودی مصوری کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا' یا ایسی مصوری کی نمائش منعقد ہوتی تو اس کا ٹھٹھا اڑایا جاتا۔ ایسی نمائش کے منتظمین کو پاگل خانہ بھیج دیا جاتا۔ ان دنوں ہرگز اس قسم کے دباؤ پھیلنے کی جازت نہ دی جاتی۔ نہ رائے عامہ اسے برداشت کرتی۔ اور نہ حکومت خاموش رہتی۔ آخر ایک حکومت کا یہ بھی تو فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کو ایسے جنون میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھے۔ اس قماش کے آرٹ کو قبول کرنے سے سوائے دیوانگی کے اور کس چیز کو فروغ ہو سکتا ہے۔ ایسا آرٹ تو انسانی تاریخ میں بدترین انقلاب کا پیش خیمہ ہو گا۔ ایسے فنون لطیفہ کے رواج کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانی ذہن رجعت پسندی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس طرح انسان ک جون بدل تو گی تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اگ رہم گزشتہ پچیس سال میں اپنی ثقافتی زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ دیکھ کر

حیران رہ جائیں گے کہ ہم کس قدر رجعت پسند ہو چکے ہیں۔ چاروں جانب ان جرائم کی نشوونما کے آثار دکھاء دیتے ہیں جن سے قوم کا پیکر ہی مسخ ہو کر بگڑتا جاتا ہے۔ اور جو دیر یا زود ہماری تہذیب کو ختم کر دیں گے عرصہ سے ان علامات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آہستہ آہستہ کھا جانے والے گھن کی نشانی ہوتی ہیں۔ جو قومیں بروقت بگاڑ کے ایسے اسباب کو روک نہیں سکتیں ان کی موت کی گھڑی قریب ہوتی ہے۔

کوئی اچھی تحریک قدیم خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتی

قریباً جرمن ثقافت اور فنون لطیفہ کے ہر شعبہ میں بگاڑ کے یہی آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کے عروج کا وقت گزر چکا ہے۔ اور اب انحطاط کا زمانہ شروع ہے۔ اس صدی کے شروع میں تھیٹروں کو دیکھیے تو وہاں بھی زوال کی ابتدا ہو چکی تھی' اور ملت کی ثقافت سے ان کا رشتہ کٹ چکا تھا۔ ہاں درباری تھیٹر اس قاعدے سے مستثنیٰ تھے کیونکہ وہاں قومی آرٹ کو یوں مسخ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ان مستثنیات اور چند دیگر شائستہ اداروں کو چھوڑ کر جو ناٹک دکھائے جاتے تھے ان کی بابت یہی کہنا کافی ہے کہ اگر قوم کو انہیں دیکھنے کی نوبت نہ آتی تو بہتر تھا۔ پستی کی افسوس ناک علامتوں میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی کہ فنون لطیفہ کے اکثر مراکز کے دروازہ پر لکھا ہوتا تھا۔ نابالغوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان اداروں کے متعلق یہ احتیاط برتنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جن کا بنیادی مقصد ہی نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ فقط پکی عمر کے لوگوں کے لیے سامان تفریح فراہم کرنا۔ جن وجوہات کی بنا پر یہ پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اگر ماضی کے بڑے بڑے ناٹک نویسوں کو ان حالات کا علم ہوتا تو وہ ان پر نفرین بھیجتے۔ وہ کبھی ایسی پابندیاں پسند نہ کرتے۔ شاید کو ان کوائف کا پتہ چلتا تو وہ کیسا سر گرداں ہوتا۔ اور گوئٹے کو ان سے واسطہ پڑتا تو وہ یقیناً بگڑ کر پرے ہٹ جاتا لیکن شلر گوئٹے یا شیکسپئر کی جدید جرمن لٹریچر کے مشاہیر کے سامنے کیا حیثیت ہے؟

انہیں تو کہنہ بوسیدہ' اقتضائے زمانہ سے خارج اور ختم سمجھا جاتا ہے۔اس دور کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ نہ صرف اس کی اپنی فنی تخلیقات معیار سے گری ہوئی ہیں بلکہ اس عہد کے مصنف اور مصنفین کھلے ہمدرد ماضی کے ہر شکار کے خلاف بھی کیچڑ اچھالتے ہیں۔انحطاط کے زمانہ میں ہوا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔جتنا کسی دور کے باشندے اور ان کی فنی تخلیقات بیہودہ یا فضول ہوں۔اتنا ہی گزشتہ نسلوں کے فنی کارناموں سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے' اور اس کی بدگوئی کی جاتی ہے۔ان کا بس چلے تو ماضی کی ہر یاد کو ملیا میٹ کر دیں تا کہ وہ معیار ہی مٹ جائے جو ان کی کاریگری کے نمونوں کے آرٹ سمجھے جانے میں مانع ہے۔ایسے زمانہ کی فنی مصنوعات جتنی زیادہ قابل ملامت اور نکمی ہوں' اتنی ہی کوشش کی جاتی ہے کہ ماض کے یادگار شاہکاروں کو محو کر دیا جائے۔حالانکہ وہ صحیح ایجاد جو واقعی بنی نوع انسان کے لیے مفید ہو ہمیشہ ماضی کی قابل قدر مثالوں کے ساتھ ترازو میں پوری اترتی ہے۔گزشتہ نسلوں کی اکثر یادگاریں موجودہ عہد کے فنی نمونوں کو مقبول بنانے کی ضمانت ہوتی ہیں۔عہد حاضر کے کسی حقیقی فنی شاہکار کو یہ خطرہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا مقابلہ ماضی کے یادگار نمونوں کے ساتھ کیا گیا ہو وت اکی شان کو بٹہ لگ جائے گا۔انسانی ثقافت کے خزانہ میں سے جس نئے فنی شاہکار کا اضافہ ہو وہ ایک لحاظ سے ماضی کے کارناموں کی یادگار زندہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔کیونکہ نئے فنی نمونوں کو پرکھنے کا صحیح معیار ماضی کے شاہکاروں کے سوا ہو کیا سکتا ہے۔ہر موجودہ شے کی مخالفت اور ہر ممکن طریقہ سے اس کی تخریب کی کوشش صرف ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جو خود کوئی قابل قدر تخلیق دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکتے ہوں۔

صرف نئی ثقافتی تخیلقات اس عام اصول کے ماتحت نہیں آتیں بلکہ سیاسی کارنامے بھی اس سچائی کے تابع ہیں۔سیاسی انقلاب کی تحریکیں جتنی پست مرتبہ ہوں' اتنا ہی وہ قدیم اوضاع و اطوار کی شدید مخالفت ہوتی ہیں۔آرٹ کی طرح سیاسیات میں بھی اپنی طمع کی مصنوعات کوئی کرامات ظاہر کر کے جاب منفعت کا طمع' حاسدوں کے دل میں

ماضی کے ہر اس قابل قدر ورثہ کے خلاف اندھی نفرت پیدا کر دیتا ہے جو ان کی اپنی اختراع سے بہتر ہو۔ مثال کے طور پر جب تک تاریخ میں فریڈرک اعظم کے کارناموں کی یاد تازہ ہے۔ فریڈرک ایبرٹ کو کون پوچھے گا؟ سائنس موسی کی یادگار ہستی کے سامنے بری من کے سابق جمہوریت پسندوں کی تو وہی اہمیت ہے جو سورج کے سامنے چاند کی۔ چاندنی تو جب ہی چمک سکتی ہے جب دھوپ غائب ہو چکی ہو۔ اس لیے یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ انسانی تاریخ کے ماہتابوں کو آفتابوں سے کیوں دشمنی رہتی ہے۔

جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے اگر تقدیر ان نالائقوں کو پھریے کے خواہاں ہوتے ہیں بلکہ جہاں بس چلے اپنی کرتوتوں کے خلاف ہر قسم کی تنقید کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نئی جرمن سرکار نے تحفظ مملکت کے نام سے جو قانون بنایا ہے وہ اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔ ہر ایسے نئے عقیدہ فلسفہ اور سیاسی یا اقتصادی تحریک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو ماضی کے تمام مسلمات کا انکار کر دے انہیں حقیر اور ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ انسانی ارتقاء کے حق میں ہر مفید اختراع کی ابتدا اس مرحلہ سے کی جاتی ہے۔ جہاں انسان اس سے پہلے پہنچ چکا ہو۔ جو سچائیاں ثابت ہو چکی ہیں انہیں تسلیم کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ تمام انسانی ثقافت اور خود نسل انسانی ایک طویل نشوونما کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ ہر زمانہ نے اس عظیم الشان عمارت ک کوئی نہ کوئی منزل تعمیر کرنے میں مدد دی ہے۔ انقلاب کا مقصد اور مطلب یہ نہیں کہ ساری عمارت مسمار کر دی جائے۔ بلکہ انقلاب کا منشا تو صرف اتنا ہونا چاہیے کہ عمارت کا جو حصہ ناموزوں ہے یا پھبتا نہیں اسے ہٹا دیا جائے۔ اور اس طرح جو جگہ خالی ہو اس کو از سر نو تعمیر کر دیا جائے۔ اس تبدیلی کے بعد بھی ساری عمارت کو بحیثیت مجموعی ترقی دینے کی مہم بدستور سابق جاری رہنی چاہیے۔

اس اصول کو تسلیم کیے بغیر ارتقائے انسانی کے کوئی معنی نہیں سمجھے جاتے۔ اگر اس اصول کا انکار کر دیا جائے تو دنیا ہمیشہ انتشار میں مبتلا رہے گی' کیونکہ ہر نئی نسل ماضی سے

انحراف اپنا حق تصور کرے گی۔ کوئی نیا کام شروع کرنے سے قبل تمام سابقہ کارگزاریوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا لازم سمجھا جائے گا۔

بالشویکی آرٹ ذہنی انتشار کا ترجمان ہے

جنگ سے پہلے ہمری تہذیب کی جو درگت بن رہی تھی۔ اس کا افسوس ناک ترین پہلو یہ تھا کہ نہ صرف فنون لطیفہ کے نمونے اور تہذیب وتمدن کے لوازمات تیار کرنے والی تخلیقی قوتوں کا فقدان تھا' بلکہ ماضی کے اعلیٰ نمونوں سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان کی مذمت ہوتی تھی' اور ان کی یاد مٹا دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں قوم کو خود جدید اور پر معنی شاہکار بنانے کا وہ شوق نہ تھا' جتنا کہ ماضی کے نمونوں کی بدگوئی اور انہیں حقیر یا کہنہ مشق ثابت کرنے میں انہماک تھا۔ بالخصوص تھیٹر اور لٹریچر کا تو یہی حال تھا۔ غضب یہ تھا کہ شرمناک انحطاط کے اس دور میں کوئی بلند پایہ شے تیار کرنے کی ذرہ بھر استعداد نہ تھی۔ ماضی کو زمانہ حال کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوششیں اس امر کا ثبوت تھیں کہ مستقبل کے ان ڈھنڈورچیوں کی نیتیں ٹھیک نہیں ان علامات سے صاف ظاہر تھا کہ سوال کچھ سچے جھوٹے ثقافتی نظریات کے رواج پھیلنے کا نہ تھا' بلکہ یہاں تو انسانی منیت کی جڑوں پر کلہاڑا چلایا جا رہا تھا۔ انسان میں آرٹ کا جو احساس آج تک اچھی خاصی معقول بنیادوں پر استوار تھا اب بالکل غلط ملط کر کے بالشویکی سیاسیات کے لیے راستہ ہموار کیا جا رہا تھا۔ اگر یونان میں فن کا تخلیقی جذبہ وہاں کی تعمیرات کی صورت میں ظاہر ہوا تھا بالشویکی عہد کی ترجمان بدشکل عمودی مصوری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ پھر ہماری قوم اس خاص طبقہ کی بزدلی کی جانب توجہ مبذول کروانے کی حاجت ہے جنہیں تعلیم یافتہ اور صاحب منصب ہونے کی حیثیت میں ہماری ثقافت اس بے حرمتی کو روکنا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس خطرہ کی روک تھام کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا جسے خطرہ کا مقابلہ کرنے کا نام دیا جا سکے وہ سمجھتے تھے کہ بلا ٹل نہیں سکتی۔ اس لیے انہوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ان کے اس طرح جی ہارنے کی وجہ

یہ تھی کہ بالشویکی آرٹ کے مبلغوں کی جانب سے کوئی نیا جھگڑا کھڑا کر دیے جانے کے ڈر سے ان ان کا پتا پانی ہو رہا تھا۔ بالشویکی آرٹ کے مبلغوں کا عام دستور تھا کہ جو کوئی انہیں فنون لطیفہ کے ماہر تسلیم نہ کرے وہ اس کے خلاف شدید حملے شروع کر دیتے تھے۔ وہ اپنے حریفوں کو ختم کر دینے کے لیے یہ چرچا کرتے تھے کہ اس مخالفت کے بانی تو چند جہلا ہیں اور گندہ ذہن افراد ہیں۔ لوگ اس خوف سے لرزتے تھے کہ کہیں یہ وحشی عیار ان پر فن کو شناخت کرنے کے نااہل ہونے کا الزام نہ دھر دیں۔ حالانکہ ان گمراہ لچوں اور ذہنی اپاہجوں کی رشحات کو نہ سمجھ سکنا' یا ان سے لطف اندوز نہ ہونا کسی طرح باعث توہین نہ تھا۔ فن کے یہ نوآموز ترجمان اپنی تخلیقات کو بلند مرتبہ ثابت کرنے کے لیے ایک عجیب چال چلتے تھے۔ وہ اپنے مجہول اور نامعقول فنی نمونوں کو اپنے حیرت زدہ معاصرین کے سامنے ''واردات قلب' کا نام دے کر پیش کرتے تھے۔ اس ترکیب سے بغیر کسی تردد کے تمام معاندانہ تنقید کا منہ بند ہو جاتا تھا۔ ہر شخص کو اسی دھوکہ میں رہتا تھا کہ ایسی واردات قلب بھی ضرور گزرتی ہوگی۔ پھر بھی کسی کو یہ تو سوجھنی چاہیے تھی کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کا یہ ہذیان اور پریشان خیالی آخر ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جن کے ہوش وحواس قائم ہیں۔ یہ درست ہے کہ موخر فان شونڈ اور بوکلین کا آرٹ بھی ان کی واردات قلب ہی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ تلامیذ الرحمٰن کی واردات قلب تھی۔ نہ کہ ان لنگوروں کی واردات قلب۔

ان واقعات سے ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ طبقات کی بزدلی کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔ ان کا فرض تھا کہ ہماری قوم کے صالح مزاج کو اس طرح مسخ کر دینے کی کوششوں کا مقابلہ کرتے۔ لیکن وہ اپنے اس فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہے۔ انہوں نے قوم کو اس واہیات بے حیائی کے متعلق اپنی رائے خود قائم کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ انہیں تو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ان پر فنون لطیفہ کو نہ سمجھ سکنے کا الزام نہ آجائے۔ اسی ڈر کے مارے وہ فنون لطیفہ کی ہر مسخ شدہ صورت پر واہ واہ کے ڈونگرے برساتے رہتے

تھے۔اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ انجام کار وہ سچ مچ بھلے برے کی تمیز سے عاری ہو گئے۔

گھر اور وطن سے الفت کی علت کیا ہے

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ایسی نشانیوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ایک انحطاط کا دور شروع ہو چکا ہے۔

جا بھی ایک اور خطرناک علامت کا ذکر باقی ہے۔ انیسویں صدی کے دوران میں ہمارے قصبے اور شہر روز بروز تہذیب وتمدن کے مراکز کی حیثیت کھو کر محض ایسی بستیوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جو زندگی کے دن کاٹنے کے لیے قائم کی گئی ہوں۔ عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں عوام کو اپنی قیام گاہ سے کوئی وابستگی نہیں۔ انہیں گھر سے پیار نہ ہونے کی وجہ سے ہے کہ ان کے گھر ان کے لیے۔ فقط ایک اتفاقی اور عارضی رہائش گاہ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ **ملک** کے معاشرتی حالات کی وجہ سے انہیں اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ گھر بدلنا پڑتا ہے۔ یہ مہلت ہی نہیں ملتی کہ جس شہر میں ٹھہریں اس سے کوئی الفت پیدا ہو۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں کی سطحیت اور ثقافتی لحاظ سے بانجھ پن کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جرمنی کی جنگ ہائے آزادی کے دوران ہمارے قصبے اور شہر رقبہ میں چھوٹے تھے۔ اور ان کی آبادی کم تھی۔ جن شہروں کو واقعی بڑے بڑے شہر کہا جا سکتا ہے۔ وہ علاقہ کے نوابوں کے دارالحکومت بھی تھے۔ اس وجہ سے ان شہروں میں تہذیب وتمدن پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اور ثقافتی لحاظ سے ان کا ایک مقام بھی ہوتا تھا۔ جن شہروں کی آبادی پچاس ہزار نفوس سے زیاد تھی۔ وہ آج کل کے اتنے ہی بڑے شہروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ علمی اور فنی خزائن سے مالا مال ہوتے تھے۔ ابھی میونچ کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی کہ یہ شہر اس وقت بھی جرمنی کے فنون لطیفہ کا سب سے بڑا مرکز ہونے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ آج کل قریباً ہر صنعتی شہر کی آبادی اتنی یا اس سے زیادہ ہو گی۔ لیکن ان میں سے کسی شہر میں کوئی قابل ذکر یادگار نہیں۔ شہر کیا ہیں کرائے کے مکانات ہیں اور ایک

دوسرے میں ٹھسی ہوئی رہائشی کوٹھریوں کے جمگھٹے ہیں۔ جہاں اور کچھ بھی نہیں ایسے بے معنی مقام رہائش سے اگر کسی کو انس پیدا ہو تو معجزہ سے کم نہ ہوگا۔ جب ایک جگہ اور دوسری جگہ میں برے بھلے کا کچھ فرق ہی نہیں جب کسی شہر کی اپنی کوئی خصوصیت ہی نہیں' اور جب کوئی فنی دل آویزی کی شان پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تو کسی کو ایسے مقام رہائش سے کیا انس خاک پیدا ہوگا۔

پھر صرف اتنی ہی بات نہیں۔ خود بڑے بڑے شہروں کی آبادی میں جوں جوں اضافہ ہوا' وں توں وہ حقیقی فن کی یادگاروں سے خالی ہوتے گئے۔ وہ بڑے پیانہ پر وہی اکتا دینے والی یکساں اور بے ڈھنگی شکل اختیار کرتے گئے جو ذرا چھوٹے پیانہ پر بھونڈے صنعتی قصبوں کی شان امتیازی ہے۔ عہد حاضر ک بڑے بڑے شہروں کے تہذیب وتمدن میں جو اضافہ کیا ہے وہ ہر پہلو سے ناقص ہے ہمارے تمام قصبات کی شہرت عہد ماضی کی شان اور فنی یادگاروں کے سہارے قائم ہے۔ اگر شاہ سلجوک ثانی کے زمانی میں ہر یادگار آج کل کے میونخ سے مٹا دی جائے تو ہم یہ دیکھ کر بھول چکے رہ جائیں گے کہ اس وقت سے لے کر آج تک اہم فنی یادگاروں کی تعداد کتنی قلیل ہے۔ برلن اور ہمارے اکثر دوسرے شہروں کا بھی یہی حال ہے۔

ملت کے اتحاد سے شاندار تاریخی عمارات کا گہرا رشتہ ہے

اس ضمن میں ہم ایک نکتہ حسب ذیل ہے:

عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں ایسی کوئی نمایاں جگہ نہیں جو شہر کے سارے منظر پھر چھائی ہو اور جسے کسی ایک وپرے دور کی ترجمان سمجھا جائے۔ برعکس اس کے ہر قدیم قصبے کی شان دوبالا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی یادگار کھڑی کر دی جاتی تھی۔ قدیم شہروں کے مخصوص فنون کا اظہار افراد کے مکانات کی تعمیر میں نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس مقصد کے لیے شہر میں عوامی یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ یہ یادگاریں کسی عارضی دلچسپی کے لحاظ سے نہ بنائی جاتی تھیں بلکہ ان میں ایک مستقبل شان پیدا کرنے کی کوشش کی

جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ایسی کوئی یادگاروں سے کسی ایک شہری کے تمول کی نمائش مقصود نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تمام قوم کی عظمت اور شوکت کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ اسی جذبہ کا اثر تھا کہ ایسی ایسی یادگاریں قائم ہوگئیں جو ہر باشندہ کو اس کے وطنی قصبہ سے اس طرح مالوف کر دیتی تھیں جس کا اندازہ کرنا بھی آج کل ممکن نہیں ہے۔ عام شہریوں کی نگاہیں ادنیٰ درجہ کی ایسی متعدد عمارتوں پر نہ پڑتی تھیں جن کا مالک کوئی فرد واحد ہو۔ بلکہ وہ ہر روز ان شاندار یادگاروں کا مشاہدہ کرتے تھے جو ساری قوم کی ملکیت ہوتی تھیں۔ ان کے مقابلہ میں افراد کے مکانات قطعاً ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔

جب ہم قدیم زمانہ کی فوجی عمارات کی وسعت کا مقابلہ اس دور کے انفرادی مکانات سے کرتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قومی شان کو ظاہر کرنے والی قومی سرگرمیوں سے متعلق یادگاروں کو دوسری تمام عمارات پر ترجیح دینے کا اصول کتنا اہم سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم کی وہ شکستہ محرابیں اور وسیع کھنڈر جن کی عظمت و شوکت دیکھ کر ہم آج بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی سوداگرانہ عمارات کے آثار نہیں۔ بلکہ یا تو خداؤں کے معبد ہیں۔ اور یا سرکاری محلات ہیں۔ ان عظیم الشان عمارات کی مالک خود قوم ہوتی تھی۔ روم کے زوال کے عہد میں بھی ممتاز شہریوں کی کوٹھیاں اور محلات وہ نمایاں شان نہ رکھتے تھے جو ہیکلوں' شاہی ایوانوں تماشہ گاہوں' باغوں حماموں اور تالابوں کے لیے مخصوص تھی۔ یہ سب عمارات سرکاری ملکیت کی ہوتی تھیں اور اس وجہ سے ان کے مالکانہ حقوق قوم میں بحیثیت قوم کے ودیعت ہوتے تھے۔

اگرچہ اس زمانہ کے فنی نظریات بالکل مختلف تھے لیکن قرون وسطیٰ کے اندر جرمنی میں بھی یہی اصول رائج تھا۔ قدیم زمانہ میں قومی جذبہ مندروں یا جلسہ گاہوں کی تعمیر میں ظاہر ہوتا تھا۔ قرون وسطیٰ اسی جذبہ کی ترجمانی کلیسا کرنے لگے۔ اس زمانہ کے مشہور شہروں میں یہ کوہ پیکر یادگاریں چھوٹی موٹی خشتی اور چوبی عمارات کے ہجوم میں کھڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔ اگرچہ اب ان کی عظمت روز بروز رہائشی کوٹھڑیوں کی

کثرت کے سبب ماند پڑتی جارہی ہے۔لیکن ایسی عمارات آج بھی جن شہروں میں باقی ہیں وہاں ان کی برتری کی شان برقرار ہے۔ان کا رنگ ان کے ماحول اور فضا کے رنگ پر چھایا رہتا ہے۔کلیسا قلعوں کے برج دربار عام کے ایوانات اور غلہ کی منڈیوں کی شاندار عمارت ایک ایسے جذبہ کو ظاہر کرتی ہے جو عہد قدیم کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔

افراد کی مملوکہ عمارات کے مقابلہ میں آج کی عوامی عمارات صنعت اور وسعت دونوں کے لحاظ سے سخت ناقص ہیں۔جو بپتا روم پر آئی تھی اگر کبھی برلن بھی اس کا شکار ہو گیا تو آنے والی نسلیں کسی یہودی کی دوکان یا مشترکہ سرمایہ سے چلنے والے ہوٹل کی عمارت ہی کو ہمارے زمانہ کی ثقافت کا ترجمان یادگار سمجھنے پر مجبور ہوں گی۔خود برلن میں اگر سرکاری عمارات کا مابل سوداگرانہ اور ساہوکارانہ عمارات سے کیا جائے تو نتیجہ دیکھ کر شرم آتی ہے۔

عوامی عمارات پر جو رقم خرچ کی اجاتی ہے وہ اکثر ناکافی اور مضحکہ خیز ہوتی ہے۔آج کل عوامی عمارات اس لیے نہیں بنائی جاتیں کہ بطور ایک یادگار کے دیر تک قائم رہیں بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی ہنگامی ضرورت پوری کی جائے۔ان عمارات کو تعمیر کرانے والوں کے قلب میں اس سے بلند تر اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

مٹی کے مادھوؤں کا تکیہ

جس زمانہ میں برلن شلوس تعمیر ہوئی تھی اس وقت کے خیالات اور ان تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے جن کے ماتحت ہمارے زمانہ کے نئے کتب خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے۔وہاں جرمن پارلیمنٹ کے ایوان کی تعمیر کے لیے اس سے نصف رقم بھی منظور نہیں کی جاتی حالانکہ یہ ایوان جرمنی کی سب سے زیادہ شاندار عمارت ہونا چاہیے تھا۔اور اس کو بناتے وقت یہ کوشش ہونی چاہیے تھی کہ صدیوں تک قائم رہے۔جب اس ایوان کو اندر سے آراستہ کرنے کا سوال پیدا ہوا تو ہمارے دارالامراء نے فیصلہ کیا کہ پتھر استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے دیواروں کو پلستر ہی سے لیپ دیا جائے۔اراکین

پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے نہایت موزوں تھا کہ جس ایوان میں مٹی کے مادھوؤں کا تکیہ قائم ہونا ہو وہاں کی دیواریں سنگین بنانا بے معنی ہوتا ہے۔

ہمارے زمانہ کے شہروں میں قوم کو بحیثیت قوم کے برتری حاصل نہیں۔ اس لیے اگر قومی عمارات کو شاندار عمارات کی فہرست میں شامل کرنا غیر ضروری سمجھا جاتا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ اگر یہ رواج اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے شہری احساسات ایسے بے جان بن جائیں گے کہ ہر شہری حب الوطنی سے بیگانہ ہوگا۔

موجودہ زمانہ تک لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں منہمک رہتے ہیں۔ جن کے پیچھے کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ تو ہر وقت روپے کے لالچ میں غلطاں رہتے ہیں یہ بھی ہمارے عام قومی انتشار اور ثقافتی انحطاط کا ایک ثبوت ہے۔ جب تک دلوت کے بت کی پرستش جاری ہے تب تک ایثار یا شجاعت کے فقدان پر کیا حیرانگی ظاہر کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم وہی کاٹ رہے ہیں جو کل ہم نے بویا تھا۔

دوسری جرمن سلطنت کی تباہی سے پہلے مذکورہ بالا تمام علامات یہ شہادت دے رہی تھیں کہ قوم کو کسی واضح اور متفقہ ضابطہ حیات پر ایمان نہیں رہا۔ اسی وجہ سے چاروں جانب سے بے یقینی کا دور دورہ تھا۔ یکے بعد دیگرے جب کبھی وقت کے بڑے بڑے مسائل پر غور کرنے کی نوبت آتی اور ان کے متعلق کوئی فیصلہ کن پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس بے یقینی کا بھانڈا پھوٹ جاتا تھا۔ اسی بے یقینی کے باعث ادھورے قدم اٹھانے کی عادت عام ہوگ ء9۔ اس عادت کا پہلا شکار ہمارا نظام تعلیم تھا۔ نظام تعلیم کے خلل نے ملک میں تذبذب' ٹال مٹول اور شش و پنج پھیلا دیا۔ اس ک انتیجہ یہ نکلا کہ ذمہ داری قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگی۔ انجام یہ ہوا کہ ان چاروں جانب پھیلی ہوئی برائیوں کو بھی بزدلی سے روا رکھا گیا جن کو تباہ کن تسلیم کیا جاتا تھا۔ خیالی ہمدردی انسان ایک فیشن بن گیا۔ بے راہ روی کو کمزوری سے برداشت کر

لینے اور افراد کی دل آزاری سے مبالغہ آمیز پرہیز کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاکھوں انسانوں کا مستقبل قربان کر دیا گیا۔

دین کے بغیر دنیاوی ترقی بھی ناممکن ہے

جنگ سے پہلے جرمنی میں دین کی حالت کا ملاحظہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس شعبہ حیات پر بھی انتشار کی عام وبا اثر کر چکی تھی۔ ایک عرصہ سے قوم کی کثیر تعداد کا ایسا کوئی متفقہ عقیدہ ہی باقی نہ رہا تھا جس کی کوئی عملی اہمیت ہوتی۔ یا جس کے ماتحت وہ زندگی کے متعلق اپنے تصورات ڈھالتے۔ اس سلسلہ میں بہت سے لوگوں کا کلیسا سے قطع تعلق کر لینا اس قدر قابل توجہ نہ تھا جتنا کہ اس سے بھی زیادہ تعداد کا کلیسا سے متعلق یا غیر متعلق رہنے میں کوئی فرق نہ سمجھنا باعث تشویش تھا۔ عیسائیت کے دونوں بڑے بڑے فرقے ایک طرف تو ایشیا اور افریقہ میں تبلیغی مہمیں روانہ کر رہے تھے تا کہ دین میں نے پیرو داخل کیے جا سکیں اور دوسری طرف انہیں فرقوں کے لاکھوں معتقدان مہمات بھیجنے والے فرقوں کے وطن میں اور خود یورپ میں دین کو چھوڑتے جا رہے تھے۔ دین سے یوں برگشتہ ہونے والے لوگ یا تو خاموشی سے دین کو زندگی کا عملی معلم تسلیم کرنا ترک کر دیتے تھے۔ اور یا وہ دین کے متعلق اپنی تاویلیں گھڑ لیتے تھے۔ ملک کی اخلاقی زندگی ان حرکتوں سے براہ راست متاثر ہوئی۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بے موقعہ نہ ہوگا کہ بیرونجات میں عیسائیت کی تبلیغی مہمیں جتنے لوگوں کو عیسائی بناتی تھیں اس کے مقابلہ میں ان علاقوں کے باشندوں کی بہت زیادہ تعداد دھڑا دھڑ اسلام قبول کر رہی تھی۔

واضح رہے کہ ان مسلمات پر دینی تعلیمات پر مبنی ہیں ان کی بیخ کنی کی مہم روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی حالانکہ دین پر عمل کے بغیر اس دنیا میں انسان کے وجود کا تصور بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ کسی قوم کے سب عوام فلسفی نہیں ہوتے۔ بالخصوص زندگی میں عوام کی اخلاقی اقدار تو دین کے بغیر ہرگز برقرار نہیں رہ سکتیں۔ آج تک دین

کے جو مختلف بدل پیش کے گئے ہیں انہوں نے کوئی ایسے نتائج پیدا نہیں کیے جن کی بنا پر ہم یہ توقع کر سکیں کہ یہ ملمع کے مذاہب موجودہ دینی فرقوں کی نسبت زیادہ بہتر یا مفید ثابت ہوں گے۔

دین کے مسلمات میں خود رائی کو دخل نہیں

اگر عوام نے اپنے اعمال کی بنیاد دین اور دینی تعلیمات پر رکھنی ہے تو مسلمات دین پر غیر مشروط ایمان لانا واجب ہے اور انہیں مسلمات کو ہر دلی کوشش کی بنیاد تسلیم کرنا بھی واجب ہے۔ ایسے پاکیزہ نفوس کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ ہوگی جو روزمرہ زندگی میں عام دستور قبول کیے بغیر بھی شاید ذہانت اور دانائی کے بل پر اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان کے برعکس کروڑہا انسان ایسا نہیں کر سکتے۔ اعتقادی مسلمات کو دین میں وہی مقام حاصل ہے جو بنیادی آئین کو سرکاری کاروبار میں اور رسوم و رواج کو روزمرہ زندگی میں حاصل ہے موہوم روہانیت پر خالی ایمان ایک ایسی گول مول اور قابل تغیر شے ہے۔ جس کی لاتعداد تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔ روحانیت پر ایمان کو فقط دین کے بنیادی مسلمات کے ذریعہ ہی کوئی ٹھوس اور واضح شکل دی جا سکتی ہے۔ دین کی واضح اور ٹھوس شکل کے بغیر کوئی روحانی مذہب کبھی ایک زندہ طاقت نہیں بن سکتا۔ دینی مسلمات کی ٹھوس شکل سے علیحدہ ہو کر روحانی مذہب فقط ایک مابعد الطبیعیاتی تصور یا فلسفیانہ رائے رہ جاتا ہے۔ اندریں حالات جو شخص دین کے مسلمات پر اعتراض کرتا ہے اس کی وہی حیثیت ہے جو سلطنت کے بنیادی آئین کے خلاف بغاوت کرنے والے کی ہو سکتی ہے۔ اگر سرکار کے خلاف غداری کی وجہ سے کامل سیاسی انتشار کا خطرہ ہے تو دین سے انحراف کا نتیجہ مذموم مذہبی خارجیت ہو سکتی ہے۔

دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے وقت سیاسی قائدین کو اس کی معمولی کوتاہیوں پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ کیا دین کا کوئی یقینی اور قابل عمل نعم البدل بھی موجود ہے یا نہیں۔ جب تک کوئی یقینی اور قابل قبول نعم البدل سامنے نہ ہو کوئی احمق

یا مجرم ہی رائج الوقت دین کو ترک کرنے کی تلقین کر سکتا ہے۔۔

آج کل دین کی حالت قابل اطمینان نہیں۔ اسکے ذمہ دار وہ لوگ ہیں۔جنہوں نے دین کو دنیاوی آلائشوں سے ملوث کر دیا۔ یہ انہیں کی حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ سائنس اور دین میں ایک سراسر فضول تصادم رونما ہو چکا ہے۔ یہ تصادم کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو لیکن اس کے نتیجہ کے طور پر فتح ہمیشہ سائنس کی ہی ہو گی۔ جو ظاہر پرست لوگ سائنس کی سطحیت کے نیچے کسی تہ کا احساس نہیں کر سکتے وہ سائنس اور دین کا تصادم دیکھ کر دین سے بدگمان ہو جائیں گے۔

دین بیچ کر خریدنا ایک ذلیل سودا ہے

سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہنچایا ہے جو دین کو آلہ کار بنا کر سیاسی مقاصد یا تاجرانہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے والے منہ پھٹ ' بے حیا ساری دنیا کے سامنے چیخ چیخ کر ہر عاجز انسان کے کانوں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے حامی دیںہونے کی بلند بانگ دعاوی اس غرض سے نہیں کرتے' کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو اپنی زندگی دین پر قربان کر دیں۔ بلکہ یہ ہنگامہ تو وہ اس لیے برپا کرتے ہیں کہ تا کہ اس دنیا مںس ان کی اپنی زندگی دوبارہ آسائش سے بسر کرنے کا انتظام ہو جائے۔وہ تو ہر وقت کسی سیاسی ہیرا پھیری کے عوض دین کا سودا چکانے کو آمادہ ہیں۔اگر ان کو اسمبلی میں دس نشستیں حاصل کرنے کی توقع ہو تو وہ کمیونسٹوں کے ساتھ مل جائیں گے' جو دین کے جانی دشمن ہیں۔اور اگر انہیں وزارت میں ایک مسند حاصل کرنے کی امید ہو تو اہین شیطان ک زوجہ بننے سے بھی عذر نہ ہو گا۔بشرطیکہ خود ابلیس ان سے ہول کھا کر کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کر دے۔

یہ صحیح ہے کہ جنگ سے پہلے جرمنی میں دین کی موجودہ حالت کئی لوگوں کے دل میں کھٹکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کا نام کی آڑ لینے والی سیاسی پارٹیوں نے عیسائیت کو ذلیل مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا مزید بریں ان کا اپنے آپ کو کیتھولک

عیسائیت کی واحد اجارہ دار سیاسی پارٹی ظاہر کرنا بھی ازحد شرمناک تھا۔

یہ الٹ پھیر کی کوششیں مہلک ہیں۔ ممکن ہے کہ ان حیلوں سے کوئی سیاسی پارٹی آسمبلی کی چند نشستوں پر قبضہ کرلے لیکن اس روش میں دین کا سراسر زیان ہے۔

اس صورت حال کے نتائج ساری قوم کو بھگتنے پڑے۔ ایک ایسے نازک مرحلہ پر جبکہ ہرشے کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ ڈھانچہ ڈگمگا چکا تھا اور اخلاق و رسوم کی جڑیں کھوکھلی ہو کر ان کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ دین میں بھی مدافعت کا آغاز ہو گیا۔

سیاسیات حصول ممکنات کا فن ہے

اگر عین اس مرحلہ پر قوم کے نظام کو غیر معمولی بوجھ سنبھالنے کی ضرورت نہ پڑ جاتی تو باوجود معاشرت کے نظام میں یہ سب دراڑیں اور شگاف پیدا ہو جانے کا کوئی خدشہ نہ رہتا۔ ہاں قوم کو غیر معمولی حادثات سے ٹکرانے کی نوبت آجائے تو اس وقت قوم کے داخلی اتحاد کے بل بوتے پر ہی اس کی ٹکر کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب ایسا موقعہ آیا تو معاشرتی نظام کی یہ دراڑیں تباہی کا باعث ثابت ہوئے۔

نکتہ بین نگاہیں جرمن سلطنت کے سیاسی محاذ پر بھی بعض ایسے نقائص کا مشاہدہ کر رہی تھیں جو بروقت اصلاح اور تبدیلی کے بغیر ہلاکت کا سبب بن سکتے تھے۔ جرمنی کی داخلی اور خارجی حکمت عملی کا تذبذب ہر اس شخص پر عیاں تھا وجان بوجھ کر اندھا نہ بننا چاہتا ہو۔ ہر امر میں میانہ روی کی روش اختیار کرنے کے حق میں بظاہر بسمارک کا یہ قول نقل کیا جا سکتا تھا کہ سیاسیات کے حصول کے لیے ممکنات کے فن کا نام ہے۔ اس دلیل میں بس اتنا مغالطہ ہے کہ بسمارک کے بعد وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے والے لوگ بسمارک کے کلے ٹھلے کی شخصیتیں ہیں۔ شخصیت کے اس فرق کی بنا پر جہاں بسمارک میانہ روی کو اپنی پالیسی کی بنیاد قرار دے لیتا تو کوئی ہرج نہ تھا۔ وہاں دوسرے لوگوں نے جب بسمارک کی نقالی کی کوشش کی تو ان کی زبان سے ادا ہو کر بسمارک کے ارشادات کے معنی ہی بدل گئے۔ جب بسمارک نے یہ بات کہی تھی تو اس کی مراد یہ تھی

کہ کسی واضح سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر تمام ممکن ذرائع استعمال کرنا یا استعمال کرنے کی کوشش کرنا جائز ہے۔ اس کے جانشینوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مقولہ بھی کوئی متبرک وظیفہ ہے جس کا ورد کر لینے کے بعد سرے سے کسی سیاسی اصول یا کسی سیاسی مقصد کی پیروی کی حاجت ہی نہیں۔ جرمن سلطنت کے اس دور کے سیاسی قائدین کی کوئی دوراندیشانہ حکمت عملی نہ تھی۔ دوراندیشانہ حکمت عملی جس کی بنیاد پر مبنی ہو سکتی ہے یہاں وہ بنیاد بھی مفقود تھی یعنی کوئی واضح ضابطہ حیات' علاوہ ازیں سیاسی قیادت کے سیاسی ارتقاء کے اصولوں کا گہرا اور واضح علم بھی لازمی ہے جس سے یہ قائدین محروم تھے۔

سلطنت کی سیاسی پالیسی چلانے میں جس ذہنی افلاس اور متلون مزاجی کا اظہار کیا جا رہا تھا صورت حالات سے کئی مایوس لوگ اس کی مذمت کرتے تھے۔ انہیں اس حکمت عملی کی اندرونی کمزوری اور بے فائدگی کا احساس تھا۔ لیکن یہ لوگ سیاسیات کی صف اول میں نہ تھے ملک کی حکومت پر قابض لوگ ہاسٹن کے اسٹوبرٹ چیمبرلین جیسے مفکرین کی بیان کردہ مدبرانہ حکمت کے اصولوں سے ویسے ہی لاپروہ تھے جیسے کہ آج کل کے سیاسی قائدین ہیں۔ ان لوگوں میں اتنی عقل وت ہوتی ہی نہیں کہ خود سوچ سکیں نہ ان کا غرور انہیں یہ اجازت دیتا ہے کہ کسی سے کچھ سیکھ لیں۔ سویڈن کے وزیراعظم آکسن سٹیرنا نے جب کہا تھا کہ ساری دنیا کی حکومت چلانے میں صرف رتی بھر سے زیادہ عقل ختم نہیں ہو رہ تو اس نے ایک ازلی حقیقت کا بیان کیا تھا۔ بادشاہ کی قدیم مجلس مشاورت کا ہر رکن کم از کم رتی بھر عقل یا سس کے کسی شوشہ کا مالیک تو تھا لیکن جب سے جرمنی ایک جمہوری ملک بن گیا ہے تب سے تو عقل کا یہ شوشہ بھی مفقود ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ان لوگوں نے تحفظ مملکت کا قانون بنا رکھا تھا تا کہ کوئی ایسا خیال دل میں یا زبان پر نہ لایا جائے۔ آکسن سیرنا کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اآج کل جیسی کسی ریپبلک میں زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ تھا۔

پارلیمنٹ بزدلی' تذبذب اور غیر ذمہ داری کی درس گاہ ہے

جنگ سے پہلے ہر شخص کو اقرار تھا کہ جرمن پارلیمنٹ یا ریشتاغ ہماری نظام حکومت کی کمزورترین کڑی تھی۔ حالانکہ اس قومی ادارہ کو جرمن سلطنت کی قوت کردار کا امانت دار ہونا چاہیے تھا۔ پارلیمنٹ کی بزدلی اور ذمہ داری سے فرار کو'اس طرح برابر کی مقدار میں ملا کر قومی زندگی میں داخل کر رہی تھی کہ کیا مجال ہے جو دونوں کے اندازہ میں بال برابر بھی فرق ہو۔

آج کل حماقت کے جو بدترین قول سننے میں آ رہے تھے ان میں سے ایک چرچا یہ بھی تھا کہ انقلاب کے بعد جرمنی میں پارلیمنٹری نظام چلنا بند ہو گیا ہے۔ اس چرچے کا مطلب یہ ہوا کہ گویا انقلاب سے پہلے صورت حال مختلف تھی۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ نظام نیک کبھی سوائے ملک کی تباہی کے اور کسی مقصد کے لیے کام ہی نہیں کیا۔ یہ پارلیمنٹری نظام صرف انہیں ایام میں اپنا مقصد پورا کرسکتا ہے۔ جب لوگ اندھے ہوں یا آنکھیں بند کر کے کچھ دیکھنے سے انکار کر دیں جرمنی کے زوال کی ذمہ داری بہت کچھ اس پارلیمنٹری نظام پر ہے۔ ملک کی تباہی میں جو تاخیر واقع ہوئی اس کا سہرا پارلیمنٹ کے سر نہیں۔ بلکہ ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے اس ادارہ کی مخالفت کی ۔ یہ پارلیمنٹ تو امن کے زمانہ میں ہی جرمن قوم اور جرمن سلطنت کی قبر کھود رہی تھی۔

پارلیمنٹ بالواسطہ یا بلاواسطہ تباہ کن خرابیوں کے انبار جمع کر دینے کا باعث تھی۔ میں ان خرابیوں میں سے صرف ایک خرابی کا بیان کرتا ہوں جو اس ادارہ کی خصوصیات کی آئینہ دار ہے اور غیر ذمہ داری کی بے مثال نظیر ہے جس خرابی کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا مشاہدہ اس خوفناک تذبذب اور کمزوری کی صورت میں کیا جا سکتا تھا۔ جس سے سلطنت کے اندرونی اور بیرونی مسائل کا انصرام کیا جاتا تھا اس خرابی کی سب سے بڑی وجہ پارلیمنٹ کا عمل دخل تھا۔ یہ خرابی ملک کی سیاسی تباہی کے بڑے بڑے اسباب میں شامل تھی۔

ہر وہ مسئلہ جس میں پارلیمنٹ کے اثر کو دخل ہوا دھورا چھوڑ دیا جاتا تھا۔کسی پہلو سے بھی دیکھا جاتا تھا یہ حقیقت واضح تھی۔ دیگر ممالک کے ساتھ اتحاد کرنے کے متعلق خارجی حکمت عملی جرمنی کے تذبذب کی ایک مثال تھی ۔وہ امن کے متلاشی تھے لیکن امن ڈھونڈتے ڈھونڈتے لڑائی کے گڑھے میں گر پڑے۔

پولینڈ کے متعلق حکمت عملی بھی ادھورے اقدامات سے پایہ تکمیل تک پہنانے کی کوشش کی گئی نتیجہ یہ نکلا کہ نہ پولینڈ والوں سے دوستی قائم ہوئی' نہ جرمنی کو فتح حاصل ہوئی الٹے روس سے دشمنی مول لے لی گئی۔

ایلس لیس اور لورین کے مسئلہ کو بھی ادھورے اقدامات سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ایک دفعہ فرانسیسی اژدھا کا سر کچل کر ایلس لیس اور لورین کو دوسری جرمن ریاستوں کے برابر حقوق دینے کے بجائے یہ دونوں کام ادھورے چھوڑ دیے گئے۔اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ کھلا بھی نہ تھا کیونکہ جرمنی کی اپنی صفوں میں ملک کا سب سے بڑا غدار یعنی اعتدال پسند پارٹی سے تعلق رکھنے والا ہر ہر بھی شامل تھا۔

شہیدوں کی روحیں قبروں سے نکل کر غداروں کے گریبان پکڑ لیں گی

شاید ملک ان سب خامیوں کے باوجود بھی بچ نکلتا' بشرطیکہ ادھورے اقدامات اختیار کرنے کی یہ پالیسی اس طاقت کو منتشر نہ کردیتی جس پر بالاخر ساری سلطنت کی حفاظت کا انحصار تھا۔وہ طاقت تھی جرمنی کی فوج۔

صرف ایک مسئلہ میں جرمن پارلیمنٹ نے جس جرم کا ارتکاب کیا وہ اس قابل ہے کہ ابدالاباد تک جرمن قوم اس پر لعنتیں بھیجتی رہے۔پارلیمنٹری پارٹیوں کے ان غلاموں نے ایک بالکل بے ہودہ عذر کا سہارا لے کر قوم کے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لیا۔اور پرے پھینک دیا جو اس کا وجود قائم رکھنے کے لیے لازمی تھا۔اور جس نے قوم کی حریت اور آزادی برقرار رکھی جا سکتی تھی۔اگر آج فلانڈرز کی وادی میں قبروں کے منہ کھل جائیں تو خاک وخون میں لتھڑے ہوئے شہیدوں کی روحیں لپک لپک کر ان بے ضمیر

پارلیمنٹری جلادوں اور پاجیوں کو گریبان سے پکڑ لیں گی جو یا تو اس منصب کے اہل نہ تھے جس پر متمکن ہو گئے تھے یا محض ادھوری قابلیت رکھتے تھے۔ اور ان پر الزام لگائیں گی کہ تم نے جرمن فوج کے لاکھوں بہترین نونہالوں کو جان بوجھ کر موت کی آغوش میں دھکیل دیا۔ یہ نوجوان اور دوسرے لاکھوں جرمن محض اس لیے قتل ہوئے یا اپاہج بنا دیے گئے۔ اور اس طرح مادر وطن کی خدمت کے قابل نہ رہے کہ عوام کو فریب دینے والے چند سو مکار اپنی سازشوں کا جال پھیلا کر وظیفے وصول کرتے رہیں یا قوم کی غداری کر کے اپنی خشک مسلکے چھانٹتے رہیں۔

یہودیوں نے اپنے کمیونسٹ اور جمہوری اخبارات کے ذریعہ دنیا بھر میں جرمن عسکریت کے خلاف زبردست جھوٹا پراپیگنڈہ کیا۔ انہوں نے جرمنی پر الزام دھرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان حرکتوں کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ اور جمہوری پارٹیوں نے وہ قانون منظور کرنے سے انکار کر دیا جو ہمارے قومی دفاع کے لیے کافی عسکری تربیت فراہم کرنے کی خاطر ضروری تھا۔ ان لوگوں سے جو ہولناک جرم سرزد ہوا۔ وہ ہر اس شخص پر واضح تھا جسے یہ احساس تھا کہ جنگ کی نوبت آنے پر ساری قوم کو ہتھیار اٹھانے کی ضرورت محسوس ہو گی اور یہ بھی واضح تھا کہ ان لوگوں کی کمینہ سودا بازی کی طفیل جنہوں نے خود اپنی آپ کو عزت مآب نمائندگان قوم کا خطاب دے رکھا ہے۔ لاکھوں جرمن اس حالت میں دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوں گے نہ ان کے پاس ہتھیار پورے ہوں گے' اور نہ انہیں عسکری تربیت ہی پوری ملی ہو گی۔ ان پارلیمنٹری لچوں نے جس وحشیانہ اور سنگدلانہ بے ضمیری کا ثبوت دیا ہے اس سے قطع نظر یہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ جنگ کے آغاز میں ہی کامل تربیت یافتہ سپاہیوں کی قلت جنگ میں ناکامی کا منہ دکھائے گی۔ جنگ عظیم چھڑنے پر شکست کا یہ ہولناک طریقہ سے حقیقت کی صورت سامنے آ گیا۔

لہذا ثابت ہوا کہ جرمن قوم کو اپنے ملک کی حریت اور استقلال کے تحفظ کی خاطر

سب جنگ میں کودنا پڑا تو اس جنگ میں شکست کے باعث وہ ادھوری اور ناقص پالیسی تھی جو امن کے زمانہ میں قوم کو دفاعی قوت کی تنظیم اور عسکری تربیت کے متعلق اختیار کی گئی تھی۔

بحری بیڑے کی تعمیر کے اصول کیا ہونے چاہئیں

بری فوجوں کے لیے تربیت یافتہ رنگروٹوں کی تعداد بہت کم تھی صرف یہی نہیں بلکہ بحری بیڑے کے متعلق بھی اسی قسم کی مذبذبانہ روش اختیار کی گئی۔ اور اس طرح قوم کو بچانے والا یہ ہتھیار بھی کم و بیش ناکارہ کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے خود بحری حکام بھی اسی ادھورے پن کے جذبہ کی وبا کا شکار ہو چکے تھے۔ جو بحری جہاز انگریز بناتے تھے اس کے مقابلے میں ہمارا رجحان یہ تھا کہ اپنے بحری جہاز اس سے چھوٹے بنائے جائیں۔ یہ پالیسی کوئی دور اندیشی کی پالیسی نہ تھی۔ جو بحری بیڑا طاقت اور تعداد کے اعتبار سے اپنے اس حریف کے برابر نہیں جس سے اس کی ٹکر کا امکان ہے۔ اسے اپنی یہ کمی اپنے ہر جہاز کو جنگی لحاظ سے زیادہ قوی بنا کر پوری کرنی چاہیے۔ بحری جنگی جہازوں کی جنگ کرنے کی طاقت پر بالخصوص توجہ دینی چاہیے۔ محض بہتر روایات پر بھروسہ کرنے سے کام نہ چلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ عام صنعتی ترقی کے باعث تمام مہذب سلطنتیں ایسی مساوی حیثیت حاصل کر چکی ہیں کہ اب ان میں سے کوئی ایک سلطنت بھی ایسے بحری جہاز نہیں بنا سکتی جن کا وزن تو دوسری سلطنتوں کے بحری جہازوں کے برابر ہو لیکن جنگ کرنے کی قوت ان سے بہتر ہو پھر یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے دوسری سلطنتوں کی نسبت چھوٹے جہاز تیار کیے جائیں اور باوجود اس کے ان چھوٹے جہازوں کی جنگ کرنے کی قوت دوسری قوموں کے زیادہ وزن والے بحری جہازوں کے برابر ہو۔

دراصل جرمنی کے جنگی بحری جہاز صرف وزن ہی میں چھوٹے نہ تھے بلکہ ذرہ اور رفتار دونوں کے اعتبار سے بھی اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کم حیثیت تھے۔ امن کے زمانہ میں جنگی جہازوں کی تعمیر کا اہتمام جن بحری حکام کے سپرد تھا ان کی غیر منطقی طرز فکر

کا ایک بڑا ثبوت وہ اسلوب استدلال ہے جو یہ لوگ اپنی پالیسی کی حمایت میں استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ”نشانہ پر گولہ پھینکنے کے لحاظ سے جرمنوں کی بحری توپیں انگریزوں کی ۵ء۳۰ سینٹی میٹر دھانے والی توپوں پر ترجیح رکھتی ہیں“۔

اگ ان کا یہ قوم صحیح تھا، تب بھی جرمنی کو ۵ء۳۰ سینٹی میٹر کے دھانے وایل بحری توپیں ضرور بنانی چاہیے تھیں۔ کیونکہ مقصد یہ تو نہیں کہ ہماری حربی طاقت حریف کے برابر ہو جائے۔ بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ ہمیں فوقیت حاصل ہو۔ اگر ہمارا مقصد فوقیت حاصل کرنا نہ ہوتا تو بری فوجوں کو ۴۲ سینٹی میٹر دھانے والی توپوں سے مسلح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جرمنوں کی ۲۱ سینٹی میٹر دھانے والی بری توپیں بھی تو آخر فرانسیسیوں کی بڑے دھانے والی بری توپوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ قلعہ کشائی کا کام غالباً ۵ء۳۰ سینٹی میٹر دھانے والی بری توپیں سرانجام دے سکتی تھیں۔ بدقسمتی سے جرمن حکام نے یہ اصول فراموش کر دیا کہ حریف پر صرف نشانہ بازی میں فوقیت کافی نہیں بلکہ ہماری توپ کے گولے کے حجم اور رفتار کو بھی حریف پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ عسکری حکام سے یہ غلطی اس لیے سرزد ہوئی کہ انہوں نے ایک اور غلط اصول کو تسلیم کر رکھا تھا۔ وہ غلط اصول یہ تھا کہ حربی تیاری میں بعض پہلوؤں سے خطرہ کی پرواہ نہ کر کے خطرہ کو نظر انداز بھی کر دینا چاہیے۔ ابھی جنگ شروع بھی نہ ہوئی تھی اور بحری حکام نے پہلے ہی حملہ نہ کرنے کے اصول کا لازمی طریقہ کار مان لیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب سچ مچ جنگ چھڑی تو جرمنی کے بحری بیڑے کو آغاز ہی سے دفاع پر قناعت کرنا پڑی۔ کامیابی کبھی دشمن پر حملہ کیے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی۔ لہٰذا حملہ نہ کرنے کے اصول کو طریقہ کار بنا لینے کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی نے خود اپنی کامیابی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جس بحری جہاز کی رفتار کم ہو اور زرہ بھی کمزور ہے اسے جب کبھی کسی ایسے حریف سے سابقہ پڑا جس کی تر فتار تیز ہے اور زرہ مضبوط تو حریف ہمیشہ اس قابل ہو گا کہ اس کی زد میں آئے بغیر مناسب فاصلہ پر دور رہتے ہوئے اس کے پرخچے اڑا دے۔ یا اس کو مجروح کر دے، بہت سے جنگی

جہازوں کا فی الواقع اس تلخ تجربہ کا اتفاق ہو چکا ہے۔ امن کے زمانہ میں بحری حکام کے نظریات کس قدر غلط تھے اس کا ثبوت دوران جنگ میں مہیا ہو گیا۔ بالآخر یہ حکام پرانے جہازوں کی زرہ بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اور جہاں ابھی موقع باقی تھا وہاں نئے جہازوں کو زیادہ موٹی زرہ پہنا کر تیار کیا گیا۔ اگر سکا گی راک کے معرکہ میں جرمن بحری جہازوں کا ڈیل ڈول ان کی زرہ اور ان کی رفتار برطانوی بحری بیڑے کے برابر ہوتی تو ۳۸ سینٹی میٹر کے دہانہ اور ٹھیک نشانہ لگانے والی جرمن توپوں کی گولہ باری برطانوی بیڑے کو سمندر کی تہہ میں غرق کر دیتی۔

جاپان کی بحری پالیسی جرمنی سے مختلف تھی۔ جاپان ہر نیا بحری جہاز بناتے وقت اس امر کی پوری احتیاط برتتا تھا کہ جاپانی بحری بیڑا ہر ممکن پہلو سے ان حریفوں پر غالب رہے جن سے کبھی جنگ کی نوبت آسکتی ہے۔ جاپان کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں جاپانی بحری بیڑا بخوبی حملہ آوری کے تقاضے پورے کر سکا۔

جرمنی کی بری فوج کے حکام ایسی غلطی کے ارتکاب سے بچے رہے۔ بدقسمتی سے جرمن بحری بیڑے کو پارلیمنٹ میں زیادہ نمائندگی حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جرمنی کا بحری بیڑا بھی انہیں عادتوں کا شکار ہو گیا جس کا پارلیمنٹ میں رواج تھا۔ جرمنی کے بحری بیڑے کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر نہ کیا گیا۔ بعد میں جب اس بحری بیڑے کو استعمال کرنے کی نوبت آئی تو وہاں بھی بدنظمی اور غیر مستقل مزاجی سے کام لیا گیا۔ اگر ان نقائص کے باوجود بحری بیڑے نے لافانی شہرت حاصل کی تو اس کا سہرا جرمن خلاصیوں اور بحری افسروں کی بے مثال شجاعت اور قابلیت کے سر پر ہے۔ اگر سابق جرمن امیر البحر بھی اس قابل کا مالک ہوتا تو ہماری یہ سب قربانیاں رائیگاں نہ جاتیں۔

ایام امن میں امیر البحر جس پالیمنٹری ہوشیاری کا مظاہرہ کرتا تھا وہی بعد میں مہلک تباہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ بحری بیڑے کی تعمیر میں بھی جنگی مصلحتوں پر پارلمنٹری مصلحتوں کو ترجیح دینے کا رواج چل نکلا۔ تذبذب غیر مستقل مزاجی اور کسی معقول پالیسی

کو منڈھے چڑھانے کی نا قابلیت پارلیمنٹری نظام کی خصوصیات ہیں۔ یہی خصوصات بحری حکام میں بھی سرایت کر گئیں۔

مجرم دوسروں پر الزم لگا کر خود بچنا چاہتا ہے

جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بری فوج کے حکام اس قسم کے بنیادی طور پر غلط اصولوں سے گمراہ ہو جانے سے بچے رہے۔ لیوڈن ڈرف تب جرمن جنرل فوجی اسٹاف میں ایک کرنیل تھا۔ پارلیمنٹ اہم قومی معاملات میں جن مجرمانہ تلوان سے کام لیتے ہوئے نقصان پہنچانے والے فیصلے صادر فرمایا کرتی تھی اس کے خلاف لیوڈن ڈروف نے سردھڑ کی بازی لگادی اگر اس افسر کی یہ جدوجہد نا کام رہی تو اس کے ذمہ دار صرف پارلیمنٹ ہے۔ یا اس وقت کے وزیر اعظم بیٹ مین ہولوگ کی بھونڈی اور ضعیف حکمت عملی۔

باوجود ان حقائق کے جو لوگ دراصل جرمنی کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سارا الزام ایک آدمی کے سر منڈھنا چاہتے ہیں جو قومی مفاد سے غفلت کے خلاف مضبوطی سے ڈٹا رہا۔ یہ سب دروغ باف ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اگر ان کے سیادہ نامہ اعمال میں ایک جھوٹ یا سچ کی کمی بیشی واقع ہو بھی گئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہر وہ شخص جسے ان قربانیوں کا کچھ علم ہے جو ہماری قوم کو ان غیر ذمہ دار افراد کی مجموعی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے برداشت کرنا پڑیں۔ رہ وہ شخص جو کبھی ان لوگوں کا خیال کرتا ہے جو رائیگاں مارے گئے یا اپاہج ہو گئے ہر وہ شخص جسے اس جگر پاش ذلت اور بے حرمتی کا احساس ہے جس کا ہم شکار بن چکے ہیں۔ ہر وہ شخص جو اس اتھاہ مصیبت ار مسکنت پر مضطرب ہے جس میں آج ہماری قوم گرفتار ہے۔ ہر وہ شخص جو جانتا ہے کہ پارلیمنٹ میں چند بے اصول اور جاہ طلب متلاشیان منصب کے لیے کچھ نشستیں حاصل کرنے کی خاطر ہماری یہ گت بن گئی ہے۔ ہر ایسا شخص اقرار کرے گا کہ یہ پہاڑے کے ٹٹو سوائے پاجی اور مجرم کہلانے کے اور کسی خطاب کے مستحق نہیں۔ قوم کی

امانت سے خیانت کرنے والے غداروں کے مقابلہ میں ہر فریبی ایک شریف انسان ہے۔

صورت حال کا یہ ایک عجیب پہلو تھا کہ قدیم جرمنی کے یہ تمام نقائص اس وقت منظر عام پر لائے گئے جب ان کے تذکرہ سے قوم کے داخلی اتحاد کو زک پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اسنازک وقت پر عوام کے کانوں پر ان ناخوشگوار حقائق کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع ہوا۔ حالانکہ جب ان معاملات کی اصلاح کا موقعہ تھا تو شرمناک انداز میں ان کی پردہ پوشی کی جاتی تھی۔ یا ان کے وجود کا انکار ہی کر دیا جاتا تھا۔ اعلیٰ سرکاری حکام ایسے مسائل میں پراپیگنڈے کی نوعیت اور اس کے استعمال سے یا تو بالکل جاہل تھے یا محض واجبی ہی واجبی واقفیت رکھتے تھے۔ صرف یہودیوں کو یہ علم تھا کہ پراپیگنڈے کا استعمال قابلیت اور استقلال سے کیا جائے تو لوگوں کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ بہشت دوزخ ہے۔ اور دوزخ بہشت۔ بدترین بدحالی کی نسبت یقین دلانیا جا سکتا ہے کہ یہ تو جنت کا نقشہ ہے۔ یہودی اس راز سے واقف تھا اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمن سرکار کو اس بھید کا پتہ بھی نہ تھا۔ جنگ چھڑ جانے پر اس جہالت کی پاداش میں خوفناک ترین سزا بھگتنی پڑی۔

قدیم جرمنی میں کئی خوبیاں بھی تھیں

جنگ سے پہلے جرمنوں کی زندگی کو گھن کی طرح کھانے والے جن لاتعداد نقائص کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان سے قطع نظر بعض خوبیاں بھی موجود تھیں۔ اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ہمارے بہت سے نقائص دوسرے ممالک اور دوسری اقوام میں بکثرت سرایت کر چکے تھے۔ کئی جگہ تو ہ حالت ہم سے بھی بدتر تھی۔ برعکس اس کے ہمیں ان پر کئی پہلوؤں سے زبردست فوقیت حاصل تھی۔

جرمنی کی سب سے بڑی فوقیت تو یہ تھی کہ تمام یورپین اقوام میں سے صرف جرمن ہی ایک ایسی قوم تھے جنہوں نے اپنے اقتصادی نظام کو ایک آزادانہ قومی نظام کی صورت

میں بچائے رکھنے کے لیے جدید جدوجہد کی تھی ۔ یہی وجہ تھی ک دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بین الاقوامی سرمایہ داروں کا تسلط جرمنی پر کم تھا۔ گو اس ضمن میں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ بعض ناپسندیدہ علامات رونما ہوچکی تھیں ۔ بہرحال جرمنی کی اقتصادی خودمختاری خطرہ سے باہر نہ تھی۔ پایان کار جرمنی کی یہی فوقیت جنگ عظیم کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی ۔

اقتصادی مسائل میں جرمنی کی قومی خودمختاری کے علاوہ ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جن کی برتری عیاں تھی۔ ان خوبیوں کا اظہار تین اداروں کے ذریعہ ہوتا تھا جو قوم کی مسلسل ترقی کی ضمانت تھے ہر ادارہ اپنے دائرہ میں معراج کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ اور ایک حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ بے مثال تھا۔

پہلا ادارہ تو خود جرمن سرکار کی وضع تشکیل پر تھا۔ جرمن سرکار کی اس ہیئت تشکیل نے عہد جدید میں نشوونما پائی تھی۔ اس ضمن میں ہمیں ان بادشاہوں کو مستثنٰی قرار دینا چاہیے جو بحیثیت انسان کے انسانی کمزوریوں اور بیماریوں سے محفوظ نہ تھے۔ اگر ہم ایسی کے بھی روادار نہ ہوں تو پھر ہم موجودہ نسل کو تمام کمال ہی قابل مذمت ٹھہرے گی۔ جو شخصیتیں آج کل برسر اقتدار ہیں ان میں سے چیدہ چیدہ ہستیوں کے ذاتی کردار اور قابلیت کا جائزہ لیا جائے تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان سے زیادہ کند ذہن اور بدکردار انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر جرمنی کے انقلاب کو ان افراد کی شخصی استعداد اور ذاتی نیکی کی کسوٹی پر رکھا جائے جو نومبر ۱۹۱۸ء سے لے کر آج تک قوم کے سامنے آئے ہیں تو ندامت سے سر جھکا لینے کو جی چاہتا ہے۔ اور خیال آتا ہے کہ جب تحفظ مملکت کا قانون عوام کا منہ بند کرنے کے لیے باقی نہ رہا تو آئندہ نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کریں گی۔ یقیناً آئندہ نسلیں یہی فیصلہ کریں گی کہ ان نووارد لیڈروں کی ذہانت اور دیانت اتنی ہی کم ہے جتنی وہ بڑیں ہانکتے ہیں۔ اور دوسری برائیوں کے شکار ہیں۔

جرمن بادشاہت کی بعض کمزوریاں

یہ ماننا پڑتا ہے کہ کئی شہروں سے اور بالخصوص عوام سے بادشاہ کا جذباتی رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہوں کے پاس ہمیشہ ذہین لوگ نہیں بیٹھتے نہ ہی بادشاہوں کے مصاحبوں کا چال چلن ہمیشہ بے داغ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے صاف گو لوگوں کی نسبت کئی بادشاہ خوشامدیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ''معلومات'' فراہم کرنے کے وسیلہ بھی ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جب ساری دنیا میں پرانے حالات بدل رہے تھے اور اس انقلاب کا اثر درباری رسوم پر بھی پڑ رہا تھا تو معلومات فراہم کرنے کا یہ ذریعہ بے کھٹکا نہ تھا۔ مثال کے طور پر جب بیسویں صدی کے آغاز میں کوئی شہزادی فوجی وردی زیب تن کر کے اور گھوڑے پر سوار ہو کے پریڈ کے میدان میں سپاہیوں کو اپنے سامنے سلامی دینے کا حکم صادر کرتی تھی تو اس سے ایک اوسط مرد یا عورت کے سینہ میں کوئی خوش عقیدگی کی لہر پیدا نہ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عام بالا میں رہنے والے لوگ عوام کے ذہنوں پر ایسی پریڈوں سے بالکل ناواقف تھے۔ ورنہ اس قسم کے افسوس ناک واقعات کی ضرور روک تھام کی جاتی۔ عالم بالا کی یہ مخلوق جذباتی اور خیالی ہمدردی انسان کا جو منافقانہ ڈھونگ رچاتی تھی۔ اس سے بجائے محبت سے نفرت بڑھتی تھی۔ مثال کے طور پر جب فلانی شہزادی سپاہیوں کے کسی لنگر خانہ کا شوربا چکھنے کی زحمت گوارا فرماتی تھیں اور پھر اپنے نطق ہمایونی سے اس شوربے کی تعریف میں دو چار مدحیہ جملے ارشاد فرما دیتی تھیں۔ تو شاید اسی قسم کی حرکتیں کسی گزرے ہوئے زمانہ میں اچھا اثر پیدا کرتی ہوں لیکن اب تو ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا تھا وہ بالکل اس کے الٹ تھا۔ جس کی خواہش میں یہ پاکھنڈ رچایا جاتا تھا۔ اگر بالفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنابہ شہزادی صاحبہ اس حقیقت سے لاعلم تھیں کہ جس روز وہ سپاہیوں کی خوراک چکھتی تھیں اس دن روزمرہ جیسا کھانا پکتا تھا تو کم از کم اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے لوگ اس بھید سے واقف تھے۔ ان لچھنوں سے بہترین ادارے بھی نشانہ تضحیک یا باعث اشتعال بن جاتے ہیں۔

بادشاہ کی ضرب المثل کفایت شعاری صبح خیزی یا شب و روز کی کڑی مشقت کے تفصیلی تذکرے' اور پھر خاص طور پر بار بار یہ تشویش ظاہر کرنا کہ وہ کہیں قلت طعام سے علیل نہ ہو جائیں' لوگوں میں ایسی گفتگو کا موضوع بن جاتے تھے جو کوئی اچھا شگون نہ تھی۔ بادشاہ سلامت کیا نوش فرماتے ہیں اور کس طرح نوش فرماتے ہیں۔ یہ جاننے کی کسی کو خواہش نہ تھی۔ اگر بادشاہ پیٹ بھر کر کھا پی لیتا یا حسب ضرورت آرام کرتا تو کسی کو اعتراض نہ تھا عوام کی خوشنودی تو اس میں مضمر تھی کہ بادشاہ بحیثیت ایک فرد یا شخصیت کے اپنے فرائض ٹھیک انجام دیتا۔ بادشاہ کے متعلق جو افسانے مشہور کیے جاتے تھے ان سے فائدہ تو کچھ نہ ہوا البتہ نقصان پہنچا۔

یہ اور قسم کی دوسری باتیں تو خیر کچھ ایسی اہم نہ تھیں۔ ہاں قوم کے وسیع طبقات میں یہ روز افزوں اعتقاد بہت زیادہ مہلک تھا۔ کہ ہر فرد کہ ساری زندگی کی تمام ذمہ داری بالائی حکام نے سنبھال رکھی ہے۔ اس لیے اسے کسی امر کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں جب تک سرکاری نظام ٹھیک تھا یا کم از کم جب تک حکام کی نیت ٹھیک تھی تب تک کسی کی وزنی اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جب پرانی وزارت جس کی نیت بخیر تھی ٹوٹ گئی اور اس کی جگہ ایسے لوگ برسر اقتدار آ گئے جن کا کردار ایسا قابل اعتماد نہ تھا تو پھر ملک تباہی کے کھلے راستہ پر گامزن ہو گیا۔ تب یہ فرمانبردارانہ اطاعت اور طفلانہ بھروسہ جس کے باعث قوم کو ہر مسئلہ میں سر اطاعت خم کر دینے کی عادت تھی ایک ایسا مہلک عیب ثابت ہوا جس کی ضرر رسانی تصور سے بھی باہر تھی۔

تاہم ان نقائص اور بعض دوسری خوبیوں کے باوجود کچھ ایسی خوبیاں بھی موجود تھیں جن کا انکار ممکن نہیں۔

ملوکانہ نظام حکومت کی خوبیاں

پہلی خوبی یہ تھی کہ ملوکانہ نظام حکومت قومی امور کی انجام دہی اور قومی حکمت میں تسلسل اور استقامت کی ضمانت ہے۔ اس نظام حکومت کا فائدہ ی ہے کہ سرکاری

مناصب حریص سیاسی لیڈروں کی طالع آزمائی سے پیدا ہونے والے خلل سے محفوظ رہتے ہیں۔مزید بریں اس نظام حکومت کے ساتھ وقار اور عظمت کی جو روایات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ وہ ایسے جذبات کی پرورش کرتی ہیں جن سے سلطان اقتدار زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔علاوہ ازیں اس طرح تمام سرکاری عملہ اور بالخصوص فوج کسی ایک سیاسی پارٹی کے سامنے جواب دہی کی محتاج نہیں رہتی۔ایک اور فائدہ یہ ہے کہ سرکاری اقتدار کا اعلیٰ ترین منصب بادشاہ کے سپرد کر دینے سے سلطان کی ذات احساس ذمہ داری کی مجسم نشانی بن جاتی ہے۔ کسی مجہول پالیمنٹری اکثریت کے مقابلہ میں بادشاہ کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ بدر جہا زیادہ شدید اور واضح ہوتا ہے۔ دراصل جرمن سرکاری ملازمین کی ضرب المثل دیانت داری اور راست بازی کی بڑی وجہ یہی سلطان کی تقلید میں ذاتی ذمہ داری کا احساس تھا۔آخری دلیل یہ ہے کہ سلطان کی ذات جرمن ثقافت کی ایک اہم ضرورت پوری کرتی تھی اس طرح کئی ثقافتیں نقائص کی کمی پوری ہو جاتی تھی۔جن شہروں میں جرمن سلطاین کا قیام رہا وہ آج بھی اس تمدنی اور فنی احساس سے سرشار ہیں جو افسوس اب مٹتا جا رہا ہے۔اور جس کی جگہ روز افزوں مادہ پرستی لے رہی ہے۔ جرمن سلاطین نے علماء اور ماہرین فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی کرنے میں بہترین عملی خدمات انجام دیں۔انیسویں صدی کے اواخر کے جرمن سلاطین بالخصوص اس نوع کی خدمات کے سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔آج کل علماء اور ماہرین فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اس قسم کی کوئی خدمت انجام نہیں دی گئی۔

سارے معاشرتی نظام میں جو انتشار رونما ہو رہا تھا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ ٹھوس کام فوج نے انجام دیا۔جرمن قوم کے ترتیب دینے والے اداروں میں فوج مضبوط ترین ادارہ تھی۔یہی وجہ تھی کہ ہمارے دشمنوں کی ساری نفرت ہمارے قومی تحفظ اور ہماری آزادی کے نورتن کے خلاف مرکوز ہو گئی۔اس بے مثال ادارہ کے حق میں سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ گردوپیش کے تمام نالائق عناصر فوج کو برا بھلا

کہتے تھے۔اس سے نفرت کرتے تھے اور اس کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے ڈرتے بھی تھے۔اقوام عالم کو لوٹنے اور ان سے مزید ناجائز نفع حاصل کرنے کی خاطر ورسائی میں جو بین الاقوامی لٹیرے جمع ہوئے انہوں نے بھی جرمنی فوج ہی کو خاص طور پر اپنے بغض وعناد کا نشانہ بنایا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جرمن فوج ہماری قومی حریت کو بین الاقوامی سٹہ بازوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے والا ادارہ تھی۔اگر قوم کو متنبہ کرنے اور مقابلہ پر ابھارنے کے لیے فوج نہ ہوتی تو ورسائی کے نمائندگان کے مقاصد مشومہ جتنی جلدی پورے ہوئے اس سے بھی پہلے پورے ہو گئے ہوتے۔جرمن قوم کس حد تک جرمن فوج کی مرہون منت ہے۔اس حقیقت کو صرف ایک ہی لفظ ظاہر کرسکتا ہے اور وہ لفظ ہے سب کچھ!

جرمن فوج قوم کی تربیت کا گہوارہ تھی!

جب قوم میں ذمہ داری کا احساس مفقود ہو چکا تھا اور جب ہر قسم کی ذمہ داری سے انکار کی عادت عام پھیل رہی تھی۔اس وقت صرف فوج ہی قوم کو ذمہ داری کی تربیت دے رہی تھی۔غیر ذمہ داری کی عادت پارلیمنٹ کے بداثرات کے ماتحت پھیلی تھی۔کیونکہ پارلیمنٹ تو خود غیر ذمہ داری ک امجسم نمونہ ہے۔فوج اس وقت قوم کو انفرادی شجاعت کا سبق پڑھا رہی تھی۔جب کہ بزدلی کی خصلت ایک وبا کی طرح عام ہو چکی تھی۔اور جب ذاتی مفاد کو قومی بھلائی کے لیے قربان کرنا قریب قریب پاگل پن سمجھا جاتا تھا۔ایک ایسے دور میں جب کہ اسی شخص کو ذہین سمجھا جاتا تھا۔جو فقط اپنے ذاتی مفاد کو بچانا اور ترقی دینا جانتا ہو۔فوج ہی وہ مکتب تھا جہاں ہر جرمن کو بتایا جاتا تھا کہ قوم کی نجات ''بین الاقوامی اخوت'' کے بے بنیاد نظریات میں مضمر تھا۔نہ ہی حبشیوں 'جرمنوں 'چینیوں 'فرانسیسیوں اور انگریزوں کو ایک ہی برادری میں منسلک کر دینے سے ممکن ہے۔بلکہ خود قوم کو طاقت ور اور متحد بنانے میں پوشیدہ ہے۔

فوج ہر فرد کی قوت کا فیصلہ کو پختہ کرتی تھی اور ترقی دیتی تھی۔یہ کام اس ماحول میں

انجام دیا جاتا تھا۔ جہاں تمام انسانی اعمال بے یقینی اور تذبذب کے ماتحت تھے۔ جب ہر شخص بوجھ بنا پھرتا تھا تب اس اصول کی تعلقین کرنا دل گردہ کا کام تھا کہ حکم دینے والا کوئی ہو اس کی اطاعت کرنا اس سے بہتر ہے کہ حکم دینے والا کوئی نہ ہو۔ یہ اصول اسی دانش مندانہ اور صحت مندانہ طرز فکر کا ترجمان ہے جسے اگر فوج متواتر زندہ اور نافذ نہ رکھتی تو آج زندگی کے کسی شعبہ میں اس کا نام ونشان ڈھونڈنے سے نہ ملتا۔ اس دعویٰ کا ایک بھیانک ثبوت موجودہ حکام کی غیر مستقل مزاجی کی شکل میں موجود ہے۔ موجودہ حکام اپنی سست عقل اور پست اخلاق سے نجات حاصل کر کے کوئی واضح پالیسی اختیار کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ ہاں جب انہیں مجبور کر کے جرمن قوم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کسی حکم پر دستخط کروا لیے جائیں تو اور بات ہے۔ اس صورت میں بھی ایک طرف تو وہ اپنے افعال کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف فریق مخالف ان کے سامنے جو تجویز رکھے اس پر دستخط کر دیتے ہیں۔ دستخط کرتے وقت ان کا قلم ایسا تیز چلتا ہے جیسے کسی نائی کی قینچی یا کسی کلرک کی زبان ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے یہ ہے کہ انہیں خود تو کوئی فیصلہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ فیصلہ کوئی دوسرا کرتا ہے انہیں فقط قبول کرنا ہوتا ہے۔

فوج اپنے اراکین میں اصول پرستی کا جذبہ پیدا کر کے انہیں اپنے آپ کو ملک اور آن پر قربان کر دینے کا سبق دیتی تھی۔ درآں حالیکہ زندگی کے تمام دوسرے شعبوں میں مادہ پرستی اور حرص کا دور دورہ تھا۔ ایک طبقات میں بٹی ہوئی قوم کو فوج اتحاد کے جذبہ سے روشناس کرواتی تھی۔ فوج کی جانب سے قوم کو متحد کرنے کی کوششوں میں فقط ایک ہی سقم باقی تھا۔ وہ یہ ہے کہ دسویں جماعت پاس کر چکنے والوں کے لیے جبری فوجی خدمت کی میعاد صرف ایک سال تھی۔ میں اس میعاد کو سقم اسلیے کہتا ہوں کہ اس طرح کامل مساوات کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ مزید بریں اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقات اپنے دوسرے ہم قوموں سے جدا ایک علیحدہ صف میں منتقل ہو جاتے

تحصیل۔ایسا نہ ہوتا تھا تو بہتر ہوتا۔یوں بھی قوم ہیئت اجتماعی کے اندر جو کچھ ہورہا تھا اس سے ہماری قوم کے اعلیٰ طبقات ناواقف تھے۔وہ روز بروز قومی زندگی سے منقطع ہوتے جارہے تھے۔اگر فوج پڑھے لکھوں اوران پڑھوں میں کم از کم عسکری خدمت کے لحاظ سے ہرقسم کا امتیاز مٹا دیتی تو اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ایسا نہ کیا گیا تو یہ ایک غلطی تھی لیکن اس دنیا میں وہ کون سا ادارہ ہے جس میں ایک نقص بھی نہ ہو۔پھر فوج کی خوبیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اگر انسانی فطرت کے طبعی ضعف کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو خامیوں کی مقدار نہایت قلیل محسوس ہوتی ہے۔قدیم جرمن سلطنت کی فوج میں سب سے بری خوبی یہ تھی کہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ ہر جگہ انفرادی اہمیت کو نظر انداز کیا جارہا تھا تو محض اکثریت ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا تھا' فوج میں انفرادی اقدار کو کھلی تعداد پر ترجیح حاصل تھی۔فوج شخصیت پر یقین کا پرچار کرکے اکثریت کے بت سے اس عقیدت کا تدارک کرتی تھی جو یہودیوں اور جمہوریت پرستوں نے پھیلا رکھی تھی فوج کی تربیت وہ شے تیار کررہی تھی جو یہودیوں اور جمہوریت پرستوں نے پھیلا رکھی تھی۔
فوج کی تربیت وہ شے تیر کررہی تھی جس کی اس زمانہ میں قوم کو سب سے زیادہ حاجت تھی۔یعنی حقیقی انسان ایک ایسے عہد میں جبکہ لوگ تن آسانی اور نسوانیت کا شکار ہورہے تھے۔فوج ہر سال اپنی صفوں کے اندر ساڑھے تین لاکھ فولادی نوجوانوں کو تربیت دے کر قوم میں شامل ہونے کے لیے واپس بھیج دیتی تھی۔دو سال کی فوجی تربیت ان نونہالوں کی تمام جوانی کی نزاکتیں دور کرکے ان کے جسم آہنی بنا دیتی تھی۔جو نوجوان دو سال تک اطاعت کا سبق سیکھتا تھا اب اس میں حکم دینے کی شان پیدا ہوچکی تھی۔تربیت یافتہ سپاہی کو اس کی چال ڈھال سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

فوج جرمنی کے لیے ایک عظیم تربیت گاہ تھی۔آخر کوئی وجہ تو تھی کہ جو لوگ جرمن سلطنت کا نہتا اور کمزور دیکھنا چاہتے تھے ان سب کی شدید ترین نفرت فوج پر مرکوز تھی۔وہ جرمن فوج کی عظمت سے حسد کرتے تھے۔وہ لالچ اور حرص سے بےتاب تھے گو کہ

جرمن جو اندھے تھے یا ان کی آنکھوں پر تعصب نے پٹی باندھ رکھی تھی تسلیم نہ کرتے تھے کہ لیکن باقی کی دنیا اس حقیقت سے خوب آگاہ تھی کہ جرمن قوم کی حریت اور دفاع کا سب سے زبردست حربہ اور جرمن شہریوں کے رزق کی ضمانت یہی فوج تھی۔

جرمن کا دیوانی عملہ

ایک تیسرا قابل تعریف ادارہ اور بھی ہے جو فوج اور بادشاہ کے پہلو بہ پہلو جگہ پانے کا مستحق تھا۔ یہ جرمن سرکاری ملازموں کا عملہ دیوانہ تھا۔

جرمن نظم ونسق کی تنظیم اور کارگزاری دوسرے ملکوں کے نظم ونسق سے بہتر تھی۔ ممکن ہے کہ افسروں کی رسم پرستی پر کچھ اعتراضات ہوں لیکن اس لحاظ سے جرمنی کی حالت زیادہ سے زیادہ دوسرے ملکوں جیسی تھی۔ ان سے بدتر نہ تھی۔ دوسری سلطنتوں کے سرکاری ملازمین میں وہ اتحاد عمل نہ تھا۔ جو جرمن دیوانی عمل میں موجود تھا۔ نہ ہی دوسرے ممالک میں دیوانی عملہ ایسا با اصول اور دیانت دار تھا۔ تھوڑی سی دفتری رسم پرستی جس کے ساتھ دیانت اور وفاداری وہ یقیناً ایسی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری اور زمانہ سازی سے بہتر ہے جو جہالت' نا قابلیت اور کردار میں عیب کی نشانی ہوا کرتی تھی۔ آج کوئی شخص اعتراض کرے کہ جرمن نظم ونسق دفتری رسم پرستیکے اعتبار سے تسلی بخش ہونے کے باوجود اس کی کارگزاری قابل تعریف نہ تھی۔ تو میں ایسے معترض کو جواب دوں گا کہ دنیا میں اور کون سا ایسا ملک ہے جو جرمنی کی سرکاری ریلوے کے مقابلہ میں بہتر طریقہ سے منظم تجارتی کاروبار کا مالک ہے۔ انقلاب نے اس سرکاری ریلوے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ حتیٰ کہ سرکاری ریلوے قوم سے چھین کر عوامی ملکیت بنا دی گئی جن لوگوں ں ے جرمن ریپبلک بنا رکھی ہے ان کے ذہن میں عوامی ملکیت کی ایک خاص معنی ہیں۔ وہ معنی یہ ہیں کہ جن بین الاقوامی سٹہ باز سرمایہ داروں نے جرمنی میں انقلاب بپا کرادیا تھا ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے جائیں۔ دیوانی نظم ونسق کے عملہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ وزارتی تبدیلیوں سے بالکل متاثر نہ ہوتے تھے۔ جرمنی

کے سرکاری ملازمین پر وزارت کے سیاسی مزاج کا ہرگز کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔اب انقلاب کے بعد وہ کیفیت بدل چکی ہے۔لیاقت اور کارگزاری کی جگہ دھڑابازی نے لے لی ہے۔سرکاری ملازمین میں غیر جانبدارانہ اصول پرستی اور کام خود کر سکنے کی قابلیت کی کوئی قدر نہیں۔بلکہ الٹے یہ اوصاف مہنگے پڑتے ہیں۔

حکومت کا اقتدار عوام کے اعتماد پر مبنی ہے

جرمنی کی قدیم سلطنت کی محیر العقول طاقت اور اقتدار ملوکانہ نظام حکومت' فوج اور دیوانی عملہ پر مبنی تھا۔سرکاری اقتدار کی وہ قوت جو آج مفقود ہے انہیں تین ستونوں پر قائم تھی۔اقتدار سرکار اس غل غپاڑے سے تعمیر نہیں کیا جا سکتا جو مرکزی پالیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں مچایا جاتا ہے۔تحفظ مملکت کے قانون سرکاری اقتدار کی ضمانت نہیں ہوا کرتے جو ڈھیٹ لوگ سرکاری اقتدار کے منکر ہوں انہیں عدالتوں میں سزائیں دلوا کر اس اقدار کی دھاک نہیں بٹھائی جا سکتی۔اقتدار سرکار تو اس عام اعتماد کا اظہار ہے جو نظم ونسق کی خوبی اور قومی مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھا کر پیدا کیا جاتا ہے۔یہ اعتماد اس یقین کا پختہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت اور نظم ونسق بے غرضی دیانت داری اور خیر خواہی کی بنا پر چلائے جا رہے ہیں۔اور ملک میں جو قانون رائج ہے وہ خود قوم کے اخلاقی معتقدات کا ترجمان ہے حاقبت بینی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو حکومتیں تشدد کے بل بوتے پر قائم نہیں رہتیں۔بلکہ حکام اور قومی مسائل کے دیگر انصرام کرنے والوں کے خلوص اور لیاقت پر قوم کے اعتبار سے زندہ رہتیں ہیں۔

یہ درست ہے کہ ماضی قریب میں جنگ سے پہلے مہلک خطرات قوم کی اندرونی طاقت کو گھن کی طرح کھا کر کھوکھلا کر رہے تھے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جرمنی کے مقابلہ میں دوسری حکومتوں کی حالت ان خرابیوں کی بدولت بدتر تھی۔باوجود اس کے جب امتحان کی گھڑی آئی تو وہ دوسری حکومتیں نہ تو ناکام ہوئیں اور نہ تباہ ہوئیں۔پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ سے پہلے جرمنی میں جو نقائص

تھے ان کے مقابلہ میں خوبیاں زیادہ تھیں۔ اس لیے ہمیں تباہی کے حقیقی اسباب کسی دوسری جگہ تلاش کرنے چاہئیں۔ دراصل تباہی کے اسباب کی نوعیت دوسری ہی تھی۔

جرمنی کے زوال کی قطعی اور سب سے گہری وجہ یہ تھی کہ نسلی مسئلہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور یہ نہ سمجھا گیا کہ اقوام کے تاریخی ارتقاء میں نسلی اصول کو کیا زبردست دخل حاصل ہے۔ قوموں کی زندگی میں پیش آتے واقعات حادثات کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ نسل اور نوع کی افزائش اور حفاظت کے لیے جو کوشش کی جائے اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی نیتوں اور اعمال کو شعوری طور پر سمجھے یا نہ سمجھے اس سے ان اعمال اور نیتوں کی جزا یا مکافات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

☆☆☆

باب یازدہم :: نسل اور قوم

قانون ناموس نوعی

زندگی کی رہ گزر پر بعض حقیقتیں ایسی پیش پا افتادہ ہوتی ہیں کہ انہیں ہر آنے جانے والا دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ان حقیقتوں کے اس طرح نمایاں ہونے کے باعث ہی بعض لوگ انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یا کم از کم ان کے شعوری احساس سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ سادہ حقائق کی طرف روزمرہ کی زندگی میں لوگ اس طرح اوندھے ہوتے ہیں کہ جب کوئی انہیں اس طرف متوجہ کر دے تو ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ حالانکہ ان حقائق سے ہر شخص کو آگاہ ہونا چاہیے تھا۔ کولمبس نے انڈے کو ایک سرے پر کھڑا کرنے کی جو ترکیب بتائی تھی۔ اس جیسی لاکھوں دوسری مثالیں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کے لیے کولمبس جیسے مبصر کہاں ملتے ہیں۔

گلستان فطرت میں چہل قدمی کرتے ہوئے بہت سے لوگ اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ حالانہ ان میں سے غالب اکثریت ان کھلے اصولوں سے جاہل ہے جن کے ماتحت قدرت اپنا کارخانہ چلا رہی ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک بڑے اصول کو جو ہر ارضی جنس حیوانی پر حاوی ہے۔ ''قانون ناموس نوعی'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ فطرت کی آرزوئے نمو زندگی کی جن مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے وہ سب ایک بنیادی قانون کے تحت ہیں اس قانون کو فطرت کے اٹل قانون کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نوع حیوانی اپنی نسل کی افزائش اور توالد و تناسل کے لیے جو کوششیں کرتی ہے ان میں کبھی اپنی نوع سے باہر کسی دوسری نوع کی شمولیت گوارہ نہیں ہوتی۔ ہر حیوان اپنا جوڑا صرف اپنی ہی نسل میں تلاش کرتا ہے۔ پودنا صرف پودنی سے ازدواج کرتا ہے۔ چڑا

صرف چڑیا کو بیوی بناتا ہے۔ بطخا فقط بطخ سے بیاہ کرتا ہے۔ جنگلی چوہا صرف جنگلی چوہیا کا رشتہ قبول کرتا ہے گھریلو چوہا خالی گھریلو چوہیا سے ہی گھر آباد کرتا ہے۔ نرگرگ مادہ گرگ سے شادی کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

محض خاص حالات میں اس قاعدہ سے کبھی انحراف ہوتا ہے۔ یہ انحراف یا تو جبر کا نتیجہ ہوتا ہے یا قید کا۔ یا جب کوئی دوسری رکاوٹ ایک نوع کے افراد میں باہم توالدو تناسل ناممکن بنا دے تب ایسا ہوتا ہے۔ اس صورت میں بھی فطرت اس غیر فطری ازدواج کے خلاف اپنی پوری قوت سے احتجاج کرتی ہے فطرت کا احتجاج اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مختلف النوع والدین کی دوغلی اولاد یا پیدائشی بانجھ ہوتی ہے یا اس کی قوت تولید محدود رہتی ہے۔ اکثر مثالوں میں دوغلی مخلوق اور اس کی اولاد مدافعت امراض کی حسب معمول قوت سے بے بہرہ ہوتی ہے یا بیرونی حملہ کے خلاف اپنی حفاظت کی طبعی صلاحیتوں سے محروم رہتی ہے۔

مکافات فطرت کے اندر اچھے خاصے منطقی ہوتے ہیں۔ جب دو ایسی انواع کا ازدواج ہو جاتا ہے جن کی حیثیت مساوی نہیں تو ان کی اولاد کا مرتبہ والدین کی خصلتوں کی اوسط کے برابر بیٹھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں یا باپ دونوں میں سے جو بھی ارتقائے حیوانیت کے شجرہ میں ادنیٰ منصب رکھتا ہو اس کے مقابلہ میں اولاد کی خصائل اعلیٰ ادنیٰ ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہتر نوع سے تعلق رکھنے والے ماں یا باپ سے اولاد کی خصائل ادنیٰ ہی ں گی۔ لہذا اعلیٰ نوع کے مقابلہ میں یہ دوغلی نسل زود یا بدیر ضرور شکست یاب ہو گی۔ مخلوط الانواع توالدو تناسل فطرت کی ان کوششوں کے خلاف ہے جو ادنیٰ حوانات پر اعلیٰ افراد کو ترجیح دے کر زندگی میں ارتقاء کے خواہاں ہیں۔ یہ ارتقاء بھی جاری رہ سکتا ہے اگر اعلیٰ افراد ادنیٰ افراد کے ساتھ اختلاط قبول نہ کریں۔ بلکہ اعلیٰ انواع کو ادنیٰ پر کامل غلبہ حاصل کرنے دیں۔ جو زیادہ طاقت ور ہے اسے کمزور پر مسلط ہونا چاہیے نہ کہ اس سے اختلاط قبول کر کے اپنی برتر فطرت کو بھینٹ چڑھا دینا چاہیے۔ یہ

اصول صرف انہیں لوگوں کو ظالمانہ محسوس ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر ناقص الفطرت ہوتے ہی۔ چونکہ ان کی طبیعت کمزور ہے اور ذہن محدود ہے اس لیے وہ ایسا خیال کرتے ہیں۔ ورنہ اس اصول کی رہنمائی کے بغیر زندگی کے ارتقاء کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حیوانات کی دنیا میں نسل کو اس طرح آمیزش سے پاک رکھنے کی تڑپ فقط ایک نوع کو دوسری نوع سے ہی ممتاز نہیں کر دیتی بلکہ ہر نوع و نسل کی داخلی مماثلتوں کو بھی زیادہ اجاگر کر دیتی ہے۔ لومڑی لومڑی ہی رہتی ہے۔ بطخ بطخ ہی رہتی ہے۔ اور چیتا ہمیشہ چیتا ہی رہے گا۔ ہر نوع کے افراد میں باہم اگر کوئی امتیاز باقی رہ جائے تو وہ جسمانی طاقت قوت ارادی' ذہانت' لیاقت اور برداشت وغیرہ اوصاف تک محدود ہو گا جن سے افراد بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ ایسی لومڑی تلاش کرنا محال ہے جو بطخوں پر مہربان ہو۔ اور ان کی حفاظت کیا کرے۔ اسی طرح ایسی بلی بھی روئے زمین پر نہیں جس کی چوہوں سے دوستی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف انواع کے مابین کشمکش کسی باہمی مخاصمت کا نتیجہ نہیں بلکہ عشق اور اشتہا سے پیدا ہوتی ہے۔ کشمکش ان دونوں جذبات میں سے کسی وجہ سے پیدا ہو فطرت مزے سے تماشہ دیکھتی ہے اور جو نتیجہ بھی برآمد ہو۔ اس سے محفوظ ہوتی ہے۔ روزانہ رزق حاصل کرنے کی جدوجہد کمزوروں' بیماروں اور ڈانوڈول رہنے والوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ نر جب مادہ پر قابو پرنے کے لیے باہم جنگ کرتے ہیں تو غلبہ اس کو حاصل ہوتا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ اس طرح جو سب سے زیادہ طاقت ور ہوا سے کم از کم ایک موقعہ دیا جاتا ہے کہ اولاد پیدا کرے۔ اس جدوجہد سے نسل کی صحت اور قوت مدافعت ترقی کرتی ہے۔ یوں باہمی کشمکش زندگی کے اعلیٰ مقامات کی جانب ترقی درجات کا ایک ذریعہ ہے۔

فطرت ضعیفوں سے طاقت وروں کا اختلاط ناپسند کرتی ہے

اگر ایسا نہ ہو تو ترقی کی رفتار رک جائے بلکہ شاید رجعت کا دور شروع ہو جائے۔

کیونکہ ادنیٰ کی تعداد ہمیشہ اعلیٰ کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ادنیٰ کو بھی توالد و تناسل اور خود حفاظتی کی وہی سہولتیں حاصل ہوتیں جو اعلیٰ کو حاصل ہیں تو پھر ادنیٰ کی تعداد اور بھی کثرت سے بڑھ جاتی۔ انجام یہ ہوتا کہ اعلیٰ کو پیچھے ہٹا کر ادنیٰ برسراقتدار آ جاتے۔ فطرت نے یہ اصلاحی طاقت اس طرح بہم پہنچائی ہے کہ زندگی کی راہیں دشوار بنا دی ہیں تا کہ ان پر چلتے ہوئے کمزور پیچھے رہ جائیں اور یوں ان کی تعداد گھٹ جائے جو کمزور باقی بچیں ان کی افزائش نسل بھی اندھا دھند ممکن نہیں' کیونکہ یہاں کچھ نئی اور پہلے سے بھی زیادہ سخت پابندیاں صحت اور طاقت کا امتحان لینے کو موجود ہیں۔

اگر فطرت کی کمزوروں اور طاقت وروں سے ازدواج کی اجازت نہیں دیتی تو وہ کسی اعلیٰ نسل کا ایک ادنیٰ نسل سے اختلاط بھی برداشت نہیں کرتی۔ کیونکہ اس طرح تو فطرت نے کروڑہا سال سے سعی کر کے اعلیٰ مخلوق پیدا کرنے کا جو اہتمام کیا ہے وہ سب رائیگاں چلا جائے گا۔

اس قاعدہ کے ثبوت میں تاریخ سے لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ تاریخ حیرت انگیز وضاحت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ جب کبھی آریاؤں نے کسی ادنیٰ نسل کے ساتھ اپنے خون کی آمیزش کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ برتر تمدن کے علمبردار تباہ ہو گئے۔ شمالی امریکہ کے باشندوں کی غالب تعداد آج بھی طاطانی النسل ہے۔ انہوں نے ادنیٰ نسلوں سے بہت کم اختلاط کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کی تہذیب و تمدن کا نمونہ وسطی اور جنوبی امریکہ سے بالکل مختلف ہے۔ ہاں لاطینی النسل آباد کاروں نے وسیع پیمانے پر ملک کے قدیم باشندوں سے رشتہ داریاں قائم کر لی ہیں۔ نسلوں کے امتزاج سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اس کا فیصلہ کن اور واضح مشاہدہ وسطی اور جنوبی امریکہ میں کیا جا سکتا ہے۔ شمالی امریکہ کا طاطانی عنصر جس نے اپنا نسلی خون پاک رکھا ہے اور کسی دوسری نسل سے اختلاط نہیں کیا۔ آج سارے امریکی براعظم پر غالب ہے۔ اور اس وقت تک غالب رہے گا جب تک وہ اپنے خون کو ملوث ہونے کی عادت میں

گرفتار نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ غیر نسلی ازدواج سے ہمیشہ حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(الف) اعلیٰ نسل کا معیار پست ہو جاتا ہے۔

(ب) جسمانی اور ذہنی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔اس طرح آہستہ آہستہ اور بتدریج لیکن یقینی طور پر زندگی کی قوت کی سوتیں خشک ہوتی جاتی ہیں۔

جس عمل کی یہ سزا بھگتنی پڑتی ہے وہ خالق مطلق کے حکم کی نافرمانی ہے۔اس لیے یہ عمل ایک جرم ہی نہیں بلکہ ایک گناہ بھی ہے۔انسان جب فطرت کے اٹل قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے ت وہ ان طاقتوں کے ساتھ جھگڑا مول لیتا ہے۔جن پر خود اس کی اپنی زندگی کا دارومدار ہے۔قدرت کے قوانین کے خلاف بغاوت کر کے وہ اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

اس موقعہ پر اکثر وہ گستاخانہ اعتراض سننے میں آتا ہے جو یہودیوں کی تلقین کا نتیجہ ہے اور جو جدید امن پرستوں کی ذہنیت کا مخصوص نمونہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ "انسان تو فطرت کو بھی مسخر کر سکتا ہے"۔

انسان فطرت کے تابع ہے اس کو مسخر نہیں کرسکتا

لاکھوں لوگوں نے یہودیوں کی یہ بکواس طوطے کی طرح رٹ لی ہے۔اور بغیر سوچے سمجھے وہ اس کو دوہرا کر خیال کرتے ہیں کہ کم از کم ایک پہلو سے تو خود انہوں نے بھی فطرت کو مسخر کر لیا ہے۔حالانکہ فطرت کے ساتھ لڑنے والے ان سورماؤں کے پاس سوائے ایک وہم وخیال کے اور کوئی ہتھیار نہیں۔اور یہ وہم وخیال بھی سراسر باطل ہے اگر ان کا یہ وہم وخیال درست تسلیم کر لیا جائے تو دنیا کا وجود ہی مٹ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان آج تک کسی پہلو سے فطرت کو مسخر نہیں کر سکا۔انسان نے بڑے سے بڑا کارنامہ یہ کیا ہے کہ کبھی کبھی اس عظیم گھونگھٹ کو ہاتھ لگا لیا ہے یا شاید کبھی کبھار اس کے کسی کونے کو اٹھا کر اندر جھانک بھی لیا ہے' جو فطرت نے اپنے چہرے پر

ڈال رکھا ہے۔فطرت کے ازلی بھید اور غیبی معمے آج بھی اس نقاب کے نیچے پوشیدہ ہیں۔انسان کبھی کسی شے کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ہاں انسان ان جانداروں کو ضرور مسخر کر سکتا ہے جن کا علم ابھی وہاں تک نہیں پہنچا جہاں انسان فطرت کے کسی قانون یا بھید کو سمجھ کر رسائی حاصل کر چکا ہے۔ان سب باتوں سے قطع نظر انسانی سوچ کبھی ان حقیقتوں پر قابو نہیں پا سکتی جو خود انسانی وجود اور ارتقاء کے لیے ابدی ہیں۔کیونکہ انسانی سوچ خود انسان کی محتاج ہے۔اگر انسان ہی نہ رہا تو اس کی سوچ اس دنیا میں کہاں سے پیدا ہوگی۔لہٰذا جب سوچ کا وجود انسان کے وجود کے تابع ہے تو ثابت ہوا کہ انسان کا وجود جن قوانین کے ماتحت ہے وہ انسان سوچ پر بھی حاوی ہیں۔

پھر صرف یہی نہیں۔بعض خیالات بعض امتوں تک محدود ہیں جو خیالات سائنس کے مادی حقائق کے متعلق ہیں بلکہ وجدان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، وہ تو خاص طور پر صرف چند امتوں تک محدود ہیں۔اگر اس موقعہ پر ایک رائج الوقت محاورہ استعمال کیا جائے تو یہ مفہوم بہتر ادا ہو سکے گا۔بالفاظ دیگر ایسے خیالات کسی ''واردات قلب'' کے ترجمان ہوتے ہیں۔جن خیالات کا تعلق خشک منطق سے نہیں بلکہ جو محض جذبات کا اظہار ہیں۔مثلاً برے بھلے کی تمیز اور نیکی بدی کا فرق وغیرہ وغیرہ وہ انسان کی سرشت میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ ان کا جداگانہ تصور محال ہے۔ایسے خیالات کا وجود انسان کے تخلیقی تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے خیالات کو زندہ رکھنے کے لیے بعض نسلوں اور خاص قسم کی شخصیتوں کا وجود لازمی ہے۔مثال کے طور پر جو شخص مخلصانہ خواہش رکھتا ہے کہ دنیا میں امن پرستی پھیل جائے۔اس کا جہاں تک بس چلے اسے چاہیے کہ جرمنوں کو تسخیر عالم میں مدد دے کیونکہ اگر جرمن مٹ گئے تو دنیا میں سے ساتھ ہی امن پرستی بھی مٹ جائے گی، میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ بدقسمتی سے جس طرح ہماری قوم امن پرستی کا شکار ہے اس طرح دنیا کی اور کسی قوم کے امن کا سودا نہیں۔اگر آپ دنیا میں امن قائم کرنا چاہتے

ہیں تو آپ کو طوعاًو کرہاً دل سے جنگ کا خیال بھلا دینا ہو گا۔ امریکن نجات دہندہ عالم و ڈرو ولسن نے یہی تجویز پیش کی تھی۔ کم ازکم جرمن ضعیف الاعتقادوں نے اس کا مطلب یہی سمجھا تھا انہیں یقین تھا کہ ولسن کی تجاویز قبول کر کے ان کے اصول پرستی کے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔

خیالی ہمدردی انسان اور امن پرستی کے خوب تب ہی زیب دیں گے جب انسانیت کے بہترین نمونے دنیا کو اس حد تک مسخر کر چکے ہوں گے کہ اس کرہ ارض پر سوائے ان کسی دوسرے کا راج نہ ہو گا۔ جب تک ان خوابوں کی تعمیل ناممکن یا مشکل ہے۔ تب تک ان کا چرچا سوائے نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے پہلے جنگ کرو' بعد میں امن کی پرستش بھی کر لینا۔ اگر اس کے خلاف عمل کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انسانیت آج ہی معراج کمال حاصل کر چکی ہے۔ اور اس لیے آئندہ وہ آج سے بہتر اصولوں کی پیروی نہیں کر سکے گی۔ بلکہ اب انسانیت کا انجام صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ بربریت انحطاط اور انتشار کا شکار ہو جائے۔ شاید کئی لوگ یہ بات سن کر ہنس دیں لیکن یہ کرہ ارض پہلے بھی کروڑہا سال انسانوں کی آبادی کے بغیر آسمانی فضاؤں میں گردش کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی با آسانی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ نوبت تب آئے گی جب انسان فراموش کر بیٹھے گا کہ سرپھرے ضعیف الاعتقادوں نے کبھی تمدن کا کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا بلکہ انسان کی تمدنی ترقی ہمیشہ فطرت کے اٹل اصولوں پر ایمان لانے اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے پر منحصر رہی ہے۔

آج دنیا کی ہر قابل ستائش شے مثلاً سائنس' آرٹ' صنعتی ترقی' عہد حاضر کی ایجادات واعترافات صرف چند گنی چنی اقوام کی تخلیقی سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ ان کا سہرا ایک ہی نسل کے سر پر ہے۔ تہذیب وتمدن کی بقا صرف ایسی ہی امتوں پر موقوف ہے۔ اگر یہ امتیں مٹ گئیں تو اس دنیا کی آرائش وزیبائش بھی مٹ جائے گی۔ اور انہیں کے ساتھ قبر میں دفن ہو جائے گی۔

ملک کا اثر تو انسان پر کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو پھر بھی مختلف نسلوں پر ایک ہی ملکی اثر کے نتائج قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ کسی خطہ کا بنجر ہونا ایک نسل کو سخت مشقت اور جفاکشی پر مائل کر کے اعلیٰ ترین ترقیوں کے دروازے کھول سکتا ہے تو برعکس اس کے زمین کا یہی بنجر پن کسی دوسری نسل کے لیے زبوں حالی اور فاقہ کشی کا باعث بن سکتا ہے اسے مسکنت کا شکار بھی بنا سکتا ہے۔ بیرونی حالات کسی قوم پر جو اثر کرتے ہیں اس کا انحصار ہمیشہ اس قوم کی داخلی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ جو حالات ایک نسل کے لیے فاقہ کشی کا باعث بن جاتے ہیں، وہی حالات کسی دوسری نسل کو سخت محنت پر مائل کر دیتے ہیں۔

زندگی بغیر کشمکش کے ناممکن ہے

نیا کی تمام پرانی تہذیبیں اس لیے زوال پذیر ہو گئیں کہ جن نسلوں نے شروع میں ان کی بنیاد رکھی تھی وہ اپنے خون کو پاک نہ رکھ سکیں۔ اور اس لیے انحطاط کا شکار ہو کر مٹ گئیں۔

اس انحطاط کا سب سے زیادہ عبرت آموز سبب یہ تھا کہ قوم اس اصول کو بھول گئی کہ تہذیب و تمدن کی بنیاد انسان پر ہے نہ کہ انسان کی بنیاد تہذیب و تمدن پر۔ بالفاظ دیگر اگر کسی خاص قسم کی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنا ہے تو انسانیت کے اس نمونے کو محفوظ رکھنا چاہیے جس پر اس تہذیب و تمدن کا انحصار ہے۔ ہاں انسانیت کے خاص نمونہ کو بچانے کی کوشش میں فطرت کے اس سنگدلانہ قانون کو نہ بھولنا چاہیے۔ کہ غالب وہی آئے گا جو سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے بہتر ہونے کے باعث بقا کا حق حاصل کر چکا ہو گا۔

جو زندہ رہنا چاہتا ہے اسے لڑنا بھی ہو گا۔ اس دنیا میں زندگی کا مستقل قانون کشمشک اور جدوجہد ہے۔ یہاں جو شخص جنگ پر آمادہ نہیں اسے زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ چاہے یہ باتیں تلخ محسوس ہوں پھر بھی بھولا نہیں جا سکتا کہ حقیقت یہی ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اس زعم میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ فطرت کو تسخیر کر سکتا ہے اور اس طرح در

حقیقت فطرت کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے' اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتا ہے۔ فطرت اس گستاخی کی سزا ذلت' مسکنت اور وبا کی صورت میں نازل کیا کرتی ہے۔

جو شخص نسل کے قانون کی پرواہ نہیں کرتا' یا اس قانون کو حقیر سمجھتا ہے وہ درحقیقت آپ اپنے کو اس مسرت سے محروم کر رہا ہوتا ہے جس کی تلاش میں ہے۔ اعلیٰ نسلوں کی یلغار کامرانی کے راستہ میں روڑے اٹکا کر وہ انسان کی ترقی کی راہیں بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنے کندھوں پر خیالی ہمدردی انسان کے اتنے طومار لا دلیتا ہے۔ کہ ان کے بوجھ تلے دب کر ایسی پستیوں میں گر جاتا ہے جہاں ترقی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

آریاء نسل کو انسانیت کبریٰ کا مقام حاصل ہے

اس بحث میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ وہ کون سی نسلیں تھیں جنہوں نے شروع میں انسانی تمدن کی بنیادیں ڈالیں' اور اس طرح سے ہر اس شے کی ابتدا کی جسے ہم کسی طرح انسانیت کے تصور سے متعلق کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانہ پر اپنی توجہ محدود کریں۔ ایسا کیا جائے تو پھر اس سوال کا جواب نہایت آسان بھی ہے اور بالکل واضح بھی۔ انسانی تہذیب و تمدن کا ہر نمونہ اتمام فنون لطیفہ اور وہ تمام فنون جو آج دنیا میں ہمارے سامنے موجود ہیں دراصل آریاؤں کی ایجاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف آریاؤں نے ہی اعلیٰ قسم کے انسان پیدا کیے ہیں اور لفظ انسان سے ہمارا جو کچھ مفہوم ہو سکتا ہے۔ اس کا اصل نمونہ آریا ہی ہیں۔ نسل آدم کے باقی اور رہنما آریا ہیں اور آریاؤں کی پیشانی ہمیشہ اس تائید غیبی کے نور سے منور رہی ہے۔ جو ہر عہد میں علم کی روشنی کی صورت اختیار کر کے انسان کی شب تاریک میں اجالا کرتی رہی ہے۔ اور اس طرح غیب کے چہرے پر سے نقاب ہٹا کر انسان کو موقعہ دیتی رہی ہے کہ وہ اٹھ کر زمین کی دوسری مخلوق کی حاکم بن جائے۔ اگر دنیا سے آریا مٹ گئے تو کائنات پر ظلمت چھا جائے گی۔ چند ہزار سال میں ہی انسانی تمدن مٹ جائے گا۔ اور دنیا ایک ویرانہ بن کر

رہ جائے گی۔

اگر ہم انسانوں کو تین انواع پر تقسیم کریں' اول وہ جو تمدن کی بنا رکھتے ہیں' دوسرے وہ جو تمدن کی بنا تو نہیں رکھ سکتے لیکن پہلے سے قائم شدہ تمدن کو قائم رکھ کر پھیلانے میں مدد دیتے ہیں۔ اور تیسرے وہ جو تمدن کو تباہ کر دیتے ہیں تو پہلی قسم میں صرف آریاؤں کا نام شمار کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تمدن کی بنیادیں آریاؤں نے اٹھائیں اور انہوں نے ہی اس عمارت کی دیواریں استوار کیں۔ مختلف اقوام نے اپنی انفرادی خصوصیات سے فقط اس عمارت کے اندر رنگ و روغن کا دق پیدا کیا ہے۔ ارتقائے انسانی کا قصر تعمیر کرنے کے لیے سارا نقشہ آریاؤں نے ہی بنایا۔ اور انہوں نے ہی وہ تمام وزنی پتھر مہیا کیے جو اس محل کی تعمیر کے لیے ضروری تھے۔

دوسری نسلوں نے فقط یہ کام سر انجام دیا ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق آریاؤں کی مرتب کردہ ہدایات پر کم و بیش عمل کیا ہے۔

جاپان کا تمدن مصنوعی ہے

مثال کے طور پر سارے مشرقی ایشیا نے چند ہی برسوں میں وہ تمدن قبول کر لیا ہے جس کی بنیاد یونانی علوم اور طاطانی فنون ہیں اب وہ اس تمدن میں ایسے گھل مل گئے ہیں۔ کہ اسے اپنا تمدن ہی سمجھتے ہیں۔ صرف تمدن کے خارجی آثار سے کسی حد تک ان کی ایشیائیت ٹپکتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جاپانیوں کا تمدن تو اپنا ہے فقط انہوں نے یورپ سے آلاتی مہارت مستعار لے لی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ جاپانیوں کی موجودہ تہذیب سراسر یورپ کے علوم و فنون پر مبنی ہے۔ صرف کہیں کہیں اس پر جاپانی تمدن کے نقوش کا ملمع پھیر دیا گیا ہے۔ آج جاپان میں زندگی کی حقیقی قدریں وہ نہیں جو جاپانیوں کے آبائی تمدن کی تھیں۔ اگرچہ آبائی تمدن کے ظاہری آثار ابھی تک باقی ہیں۔ جب کوئی یورپین جاپانی تہذیب کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ پہلے تاثرات جاپانی زندگی کے انہیں مخصوص آثار سے قبول کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے یورپ کی زندگی

سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جاپان بنیادیں یورپ اور امریکہ یعنی آریائی اقوام کے عظیم الشان علوم وفنون پر قائم ہیں۔ مشرق کی جن قوموں نے فی زمانہ ترقی کا کوئی مقام حاصل کیا ہے۔ انہوں ے پہلے آریاؤں ہی کے کارناموں سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت ٹھیک کی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے علوم وفنون ہی وہ بنائے کمال ہیں جس کے سہارے اہل مشرق آج کل رزق کما کر کھاتے ہیں۔ آج اہل مشرق کے روٹی کمانے کے ڈھنگ اور اوزار یورپ او رامریکہ مہیا کرتے ہیں۔ ہاں ان آلات اور پیشوں کی ظاہری صورت جاپانیوں نے اپنی روزمرہ کی ضروریات کے مطابق ڈھال لی ہے۔

اگر آج جاپان پر آریاؤں کا اثر ختم ہو جائے تو ذرا تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجیے کہ یورپ اور امریکہ تباہ ہو جائیں تو جاپان کے موجودہ علمی اور فنی ترقی شاید کچھ تھوڑے عرصہ کے لیے تو جاری رہے لیکن چند ہی برسوں میں اس ترقی کے چشمے خشک ہو جائیں گے۔ اور جاپانیوں کی طبعی خصلتیں ابھر آئیں گی۔ اس کے ساتھ ہی جاپانیوں کی موجودہ تہذیب پہلے لکیر کی فقیر ہو کر پھر اسی غفلت کی نیند سو جائے گی جس سے آج سے ستر سال پہلے آریائی تمدن کے ساتھ ربط وضبط نے اسے بیدار کیا تھا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح جاپانیوں کی موجودہ ترقی آریائی اثر کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح زمانہ قبل تاریخ میں کسی بیرونی اثر ہی سے جاپانیوں کا اس دور کا تمدن بھی قائم ہو گیا ہو گا۔ اس قیاس کے حق میں ایک مضبوط دلیل یہ ہے کہ جاپانیوں کی قدیم تہذیب فی الواقع پہلے پژمردہ ہوئی اور پھر بالکل مردہ ہو گئی۔ ایسی سہولت کے آثار تبھی رونما ہوتے ہیں جب کوئی قوم خون کے اس جوہر سے محروم ہو جائے جس نے پہلے اس میں تخلیقی قوتیں پیدا کی تھیں۔ یا وہ بیرونی اثر ہٹ جائے جس نے کسی خطہ میں کسی قدیم تمدن کو برقرار رکھا تھا اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک قوم نے تمدن کے بنیادی لوازمات اجنبی نسلوں سے حاصل کیے ہیں۔ اس نے یہ تمدن پوری طرح جذب کر لیا اور اسے کہیں

کہیں ترقی بھی دی، لیکن بعد میں جب کبھی بیرونی اثر رک گیا تو یہ مستعار تمدن بھی پہلے مردہ ہو کر مرجھا جاتا رہا تو اس کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایسی قوم تمدن کی حامل تو ہو سکتی ہے لیکن خالق نہیں ہو سکتی۔

اس زاویہ نگاہ سے اگر مختلف قوموں کو سختی سے جانچا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ غیر آریا قوموں نے کبھی خود کوئی تمدن ایجاد نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ کسی دوسرے تمدن کی خوشہ چیں رہی ہیں۔

ساری کاروائی کم و بیش حسب ذیل طریقہ سے سرانجام پاتی رہی ہے۔

دنیا میں تمدن کی ابتدا کیسے ہوئی؟

آریائی قبیلے جن کی عددی قلت پر ہنسی آتی ہے اجنبی اقوام کو مطیع کر لیتے ہیں۔ نئے ملک کی طرز بود و باش سے متاثر ہو کر اور ادنیٰ نسلوں کے کثیر التعداد مزدور میسر آ جانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آریاؤں کی وہ ذہنی اور تنظیمی قوتیں بیدار ہو جاتی رہیں جو آج تک ان کے اندر خفتہ تھیں۔ ملک کی جو خصوصیتیں نو واردوں کو متاثر کرتی رہیں ان میں زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا وغیرہ شامل ہیں۔ چند ہزار سال یا بعض اوقات چند صدیوں میں آریاؤں نے ان تمدنوں کی بنیادیں ڈال دیں جن کی طبعی خصوصیتوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان کے بانی کون تھے۔ گو یہ درست ہے کہ ہر جگہ مفتوحین کے جداگانہ اوصاف اور علاقہ کے علیحدہ حالات کے باعث ہر خطہ میں اس ایک ہی بڑے پھیلنے والے تمدنوں کی شان مختلف ہو گئی۔ آخر کار فاتحوں نے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی جن کی وہ پہلے پابند ہوا کرتے تھے یعنی انہوں نے اپنی نسل کو پاک رکھنے سے غفلت کی۔ انہوں نے مفتوحین کے ساتھ اختلاط شروع کیا۔ اس طرح ان کا جداگانہ وجود مٹ گیا۔ کیونکہ جب سے انسان بہشت میں پہلی بار اس خطا کا مرتکب ہوا تھا تب سے لے کر آج تک اس کی گناہ کی سزا فریقین کو ہمیشہ وطن سے اخراج کی صورت میں بھگتنی پڑتی رہی ہے۔

ایک ہزار سال بعد یا اس سے بھی زیادہ مدت گزر جانے کے بعد آج ان قدیم فاتحوں کی واحد نشانی مفتوحین کی کھلتی ہوئی رنگت کی صورت میں باقی رہ گئی ہے۔ ی رنگت ان مفتوحین کے آریاؤں سے ورثہ میں پائی ہے۔ دوسری نشانی آریاؤں کے قائم کردہ تمدن کے وہ بقیہ کھنڈر ہی جو اب لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب ان لوگوں کا خون مفتوحین کے خون سے مغلوب ہو گیا جن کے صرف جسم ہی فاتحانہ عظمت کے حامل نہ تھے بلکہ جن کی روح بھی فاتحانہ شوکت رکھتی تھی تو تب وہ چنگاری بھی ٹھنڈی پڑ گئی جس سے انسانی تمدن اور ترقی کی مشعل روشن تھی۔ جس حد تک سابقہ فاتحین کی اولاد کی رگوں میں کم و بیش ان کے آبا ؤ اجداد کے خون کا اثر بطور ایک یادگار او رنشا ی کے باقی ہے۔ ج ان کی کھلتی ہوئی رنگت سے ظاہر ہے اسی حد تک ان کے تمدنی انحطاط کی رفتار بھی سست یا تیز ہے' اس تاریکی میں اگر کچھ دھندلی روشنی ہے تو اس کی کرنیں دراصل اس تمدن کی پہلی جوت جگانے والوں کے آثار سے پھوٹ رہی ہیں۔ مفتوحہ نسل جس بربریت کی طرف رجعت کر چکی ہے اس کے اندھیرے میں اب تک قدیم تنویر کی کچھ جھلک باقی ہے جس سے سطحی نگاہوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ شاید تمدن کے جو آثار دکھائی دے رہے ہیں ان کا سہرا موجودہ نسل کے سر پر ہے حالانکہ وہ کچھ وہ حال کے آئینے میں دیکھتے ہیں دراصل محض ماضی کا ایک عکس ہے۔

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اس نیم متمدن نسل کو پھر ایک دفعہ یا ایک سے زیادہ مرتبہ اس اعلیٰ نسل سے فیض یاب ہونے کا موقع مہیا کر دیں۔ جس سے پہلی مرتبہ اس نیم متمدن نسل سے اکتساب تہذیب کیا تھا۔ یہ ضرور نہیں کہ اس تازہ ملاپ کے وقت نیم متمدن نسل کو شعوری طور پر وہ پہلا اختلاط بھی یاد ہو۔ ایسا موقع پیش آنے پر پہلی بار حکمران نسل کے بچے کھچے ورثاء ایک جبلی کشش سے اعلیٰ ن سل کے تمدن کی طرف کھینچے آئیں گے اور اس طرح جو تعلق پہلی مرتبہ جبر سے قائم ہوا تھا اب برضا و رغبت تازہ کر لیا جائے گا۔ تمدن کی ایک نئی لہر اٹھے گی اور اس وقت تک اپنا جلوہ دکھائے گی جب تک کہ

اس تہذیب کے نئے علم بردار بھی مفتوحہ نسل کے ساتھ اختلاط کے باعث پھر اپنے خون میں کھوٹ ملا کر انحطاط پذیر نہ ہو جائیں گے۔

اس اچھوتے زاویہ نگاہ سے تاریخ عالم کا مطالعہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو تمدن کی عالمگیر تاریخ کے طالب علم ہیں۔ ایسے لوگوں کو غیر متعلقہ واقعات میں پھنس کر نہ رہ جانا چاہیے۔ عہد حاضر کے اکثر مورخ ایسے ہی موقعوں کے شاکر ہیں۔

خالی حامل تمدن نسلوں کے اندر پیدا ہونے والے انقلابات کا مذکورہ بالا مختصر بیان بھی واضح کر دیتا ہے کہ اس کرہ ارض پر تہذیب و تمدن کے حقیقی بانی آریا ہیں۔ مختصر طور پر یہ بھی واضح کر دی اگیا ہے کہ ان بانیان تہذیب کا عروج و زوال اور کارنامے کن اصولوں کے ماتحت ہیں۔

انسان کی بڑائی صرف اس کی ذات پر نہیں بلکہ اس کے ماحول پر منحصر ہے

جس طرح ہماری روزمرہ زندگی میں کسی غیر معمولی قابلیت کے مالک انسان کی قابلیت موقعہ میسر آنے پر ہی ظاہر ہو سکتی ہے بلکہ بعض اوقات تو موقعہ ہاتھ آنا بھی کافی نہیں ہوتا بلکہ لیاقت کے اظہار کے لیے کسی خاص انگیخت یا تحریک کی حاجت باقی رہتی ہے۔ اسی طرح اوام کی زندگی میں بھی خاص قابلیت رکھنے والی نسلیں اپنی لیاقت کے اظہار کے لیے موقعہ اور انگیخت کی محتاج رہتی ہیں۔ روزمرہ زندگی کے چکر اور یکسانیت میں قابل افراد بھی دوسروں سے کچھ مختلف دکھائی نہیں دیتے۔ ہاں جوں ہی کوئی خاص موقعہ پیش آتا ہے جہاں دوسرے لوگ گھبرا کر متزلزل ہو جاتے ہیں۔ وہیں یک بظاہر عاجز اور معمولی انسان غیر معمولی قابلیت ظاہر کرتا ہے۔ جن لوگوں نے آج تک اس انسان کو زندگی کی ادنیٰ مصروفیتوں میں ہی مشغول دیکھا ہے وہ اس غیر معمولی قابلیت کے اظہار سے انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کی ان کے اپنے وطن میں شاذ و نادر ہی قدر ہوتی ہے۔ غیر معمولی قابلیت کے اظہار کے متعلق جس

حقیقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے اس کی بہترین مثالیں جنگ کے دوران میں پیش آتی ہیں۔ تکلیف کی گھڑیوں میں جب دوسرے مایوس ہو جاتے ہیں و بظاہر معصوم نظر آنے والے نوجوان اٹھتے ہیں اور اپنے عزم صمیم اور موت کے منہ میں دلیری اور مصائب کے ہجوم کے اندر ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکنے کی غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کر کے دیکھتے دیکھتے نامور دلاوروں کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر یہ امتحان کی گھڑی سر پر نہ آتی تو کوئی خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس بے ریش لونڈے کے سینے میں ایک نامور دلاور کی روح موجود ہے۔ کسی قابل انسان کو مشہور کرنے کے لیے ہمیشہ کسی خاص انگیخت کی ضرورت ہوتی ہے قسمت کا ہتھوڑا جہاں دوسروں کو بآسانی ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ وہاں بسا اوقات اسے ایسے فولادی انسانوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے۔ جو اس کے برابر کی چوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ جب روزمرہ کی زندگی کا غلاف پھٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس کے اندر چھپا ہوا وہ گوہر بے بہا نکل کر سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر دنیا ششدر رہ جاتی ہے۔ گرد و پیش والے یہ نظارہ دیکھ کر ہٹ دھرمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ جو انسان ہمیشہ سے ان جیسا تھا۔ درحقیقت وہ اس غیر معمولی قابلیت کا مالک ہے جو اب یکلخت ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ وہ ہمیشہ کا دستور ہے جس سے ہر غیر معمولی قابلیت کے انسان کو سابقہ پڑتا ہے۔

گو یہ درست ہے کہ جب کوئی موجد اپنی اختراع کو تکمیل نہیں کر لیتا تب تک اسے شہرت نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ جب تک اسے شہرت نصیب نہ ہوتی تھی تب تک وہ اس قابلیت کا مالک بھی نہ تھا۔ ذہانت کی چنگاری تو پیدائش کی گھڑی سے ہی اس کے اندر موجود تھی۔ اور یہ چنگاری ہمیشہ شروع سے ہی اس شخص کے اندر موجود ہوتی ہے۔ جسے حقیقی تخلیق ودیعت کی گئی ہوں۔ غیر معمولی قابلیت ایک جبلی اور وہبی ملکہ ہے جس کا اکتساب تعلیم و تربیت سے بھی ممکن نہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ صرف افراد ہی اس اصول کے ماتحت نہیں بلکہ اس کا

اطلاق نسلوں پر بھی ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کے مخصوص ادوار میں تخلیقی قوتوں کا اظہار کرتی ہیں وہ دراصل پیشہ سے تخلیقی فطرت کی مالک تھیں۔ چاہے سطحی نگاہیں اس کے ادراک سے قاصر رہی ہوں پھر بھی تخلیق کی یہ استعداد ہمیشہ ان کی طبیعت میں ودیعت تھی۔ جیسا کہ ابھی افراد کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقوام کو بھی شہرت تب حاصل ہوتی ہے جب وہ کوئی عملی کارنامہ کر کے دکھاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی کی دنیا قابلیت کو بحیثیت قابلیت کے دیکھ سکنے والے احساس سے محروم ہے۔ دنیا تو صرف قابلیت کا خارجی اظہار دیکھ سکتی ہے مثلاً ایجادات' اختراعات' عمارات' تصویرات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن خارجی آثار کا یہ اقرار بھی مدتوں بعد کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک فرد جو غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ہے جسے قدرت نے اچھی خاصی استعداد ودیعت کی ہے۔ خاص حالات کی انگیخت کے بغیر اپنی قابلیت تسلیم نہیں کروا سکتا۔ اسی طرح اقوام کی تخلیقی استعداد اور قوت بھی ان کی زندگی میں تب تک بروئے کار نہیں آتی جب تک اس کو حرکت دینے کے لیے کچھ خاص حالات موجود نہ ہوں۔

اس سچائی کی سب سے بڑی مثال اس نسل کی زندگی سے ملتی ہے جو ہمیشہ سے انسانی ترقی کا علم بردار رہی ہے۔ یعنی آریائی نسل جب کبھی تقدیر اس نسل کو خاص حالات سے دوچار کرتی ہے تو اس کی قابلیتیں ترقی کر کے ٹھوس آثار کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہیں ایسے موقعوں پر نسل جو تہذیب وتمدن کے نمونے قائم کرتی ہے وہ ہمیشہ ملک کی آب وہوا اور مفتوحہ اقوام کی خصوصیتوں سے متاثر ہوتے ہیں سب سے نمایاں اثر مفتوحہ قوم کی نوعیت کا ہوتا ہے:۔ تہذیب وتمدن کا قیام جس ماحول میں ہو وہاں فنی قابلیت اور آلات کی جس قدر کمی ہو اتنی ہی ہاتھ سے کام کرنے والے مزدوروں کی تنظیم زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ مشینی طاقت کی جگہ نوکر ملازم رکھ کر کام چلایا جاتا ہے۔ آریا اگر ادنیٰ نسلوں کو فتح کر کے کثیر تعداد میں ملازم نہ رکھ سکتے تو کبھی اس راستہ کی پہلی منزل بھی طے نہ کر پاتے جس پر چل کر انہوں نے تہذیب وتمدن کی بنیادیں رکھیں۔ نوکروں کی ضرورت

مثال بعینہ وہی ہے جس طرح بعد مناسب پالتو جانوروں کے استعمال کے بغیر مشینی طاقت کی اختراع ناممکن تھی گو بعد میں مشینی طاقت نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ اب جانوروں کے بغیر بھی کام چلا سکتا ہے۔ شیکسپیر نے اپنے ڈرامے اوتھیلو میں ایک بڑی پر معنی جملہ لکھا ہے۔ چاہے کسی کو پسند ہو یا نہ ہو مسئلہ زیر بحث اس جملہ کا اطلاق بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے جو کام لینا تھا لے چکے اب اسے یہاں دے دفعہ کرو۔ ہزارہا سال سے گھوڑا انسان کا وفادار خادم رہا ہے۔ گھوڑے نے انسان کی ترقی کی منزلیں طے کرنے میں انسان کو قابل قدر مدد دی لیکن اب موٹر کی ایجاد نے گھوڑے کو بیکار کر دیا ہے۔ چند سال اور گزر گئے تو گھوڑے کے استعمال کا بالکل رواج نہ رہے گا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج انسان ترقی کے جس مرحلہ پر پہنچ چکا ہے وہاں گھوڑے کے تعاون کے بغیر نہ پہنچ سکتا تھا۔

غلامی جائز ہے

اعلیٰ تمدنوں کے قیام کے لیے ادنیٰ نسلوں کا وجود نہایت ضروری تھا۔ مشینی آلات کی غیر موجودگی میں صرا دنی نسلیں اس کمی کو پورا کر سکتی تھیں۔ جس کے تدارک کے بغیر کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔ یہ امر تو یقینی ہے کہ انسانی تمدن کے قیام کے ابتدائی مراحل میں ترقی کا انحصار اس قدر پالتو جانوروں پر نہ تھا جتنا کہ ادنیٰ نسل کے کارندوں پر تھا۔

پہلے مفتوحہ نسلوں کو غلام بنایا گیا۔ اس کے بعد جانوروں سے بھی کام لیا جانے لگا۔ بعض لوگ ہمیں اس کے الٹ یقین دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا اندازہ درست نہیں۔ پہلے پہل مفتوحہ دشمن سے ہل چلوایا جاتا تھا۔ بیل اور گھوڑے سے یہ کام لینے کی نوبت بعد میں آئی۔ چائیں چائیں کرنے والے امن پرستوں کے سوا اور کوئی شخص اس حقیقت حال کو انسانی زوال کی علامت قرار نہیں دے سکتا۔ یہ لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ارتقاء کی یہ منزلیں تہذیب کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے لازم تھیں جس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ بیہودہ گو واعظ آج دنیا کی توجہ اپنی خرافات کی جانب مبذول کروانا چاہتے

ہیں۔

انسانی ارتقاءک مثال ایک لمبی سیڑھی پر چڑھنے سے دی جا سکتی ہے۔ پہلے پایہ پر قدم رکھے بغیر کوئی شخص دوسرے پائے تک نہیں پہنچ سکتا۔ آریاؤں کے اس زمانہ کے حالات کے مطابق جو راستہ انہیں ممکن نظر آتا تھا۔ آریا اس پر چلنے کے لیے مجبور تھے۔ وہ اس راستہ پر نہ چل سکتے تھے جس کے خواب آج کل کے امن پرست دیکھ رہے ہیں یہ صحیح ہے کہ سچ مچ کے راستہ پر چلنا مشکل اور دشوار ہے۔ لیکن جو دنیا کو اپنے خوابوں کی منزل تک پہنچانا چاہتے ہوں وہ اس سچ مچ کے راستہ پر چل کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے لوگ تو انسان کو اس منزل پر پہنچانے کے بجائے اسے اس منزل سے پرے ہٹا رہے ہیں۔

یہ محض ایک اتفاق ہی نہ تھا کہ تہذیب کا اولین ظہور ان مقامات پر ہوا۔ جہاں آریاؤں نے ادنیٰ نسلوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں فتح کر کے اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ ادنیٰ نسلیں وہ پہلے اوزار تھے جن سے کام لے کر اعلیٰ تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کی گئیں۔

خواجگی و بندگی میں اختلاط مضر ہے!

آریاؤں کو جس راستہ پر چلنا تھا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے بحیثیت فاتح کے ادنیٰ نسلوں کو اپنا مطیع بنایا۔ اور اپنی رہنمائی میں ان کی جسمانی طاقت کو واضح راہوں پر ڈال کر انہیں اپنے ارادے اور مقصد کی تعمیل پر مجبور کر دیا۔ آریاؤں نے مفتوحین کو جس زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا وہ اگرچہ محنت کش کی زندگی تھی لیکن ساتھ ہی ایک مفید زندگی بھی تھی۔ مفتوحین کی طاقتوں کو ایک طرح استعمال کر کے آریاؤں نے نہ صرف ان کو قتل کرنے سے احتراز کیا بلکہ شاید مفتوحین کی یہ اطاعت کی زندگی ان کے ''آزادی'' کے زمانہ سے زیادہ آرام دہ بھی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ آریا اپنی برتری پوری سنگدلی سے قائم رکھتے تھے۔ لیکن وہ نرے آقا ہی نہ تھے۔ بلکہ ملک کے تہذیب و تمدن کا قیام اور ارتقاء

بھی انہیں کے دم سے وابستہ تھا۔دنیا میں تہذیب وتمدن کا وجودتو ہے ہی آریاؤں کی برکت سے باقی ۔لہذا آریا نسل کا تحفظ اور بقا تہذیب وتمدن کے تحفظ و بقا کے مترادف ہے ۔ جوں ہی رعایا نے ترقی کر کے فاتحوں کی ہمسری کا رتبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ جس کا پہلا مرحلہ غالباً فاتحوں کی زبان کا استعمال تھا اس کے بعد آقا اور غلام میں امتیاز کے پردے ہٹنے لگے ۔آریاؤں نے اپنی نسل پاک رکھنے میں غفلت کی۔اوراس طرح وہ اس باغ جنت میں رہائش کے حق سے محروم ہو گئے ۔جسے انہوں نے خود تعمیر کیا تھا۔ آریا نسلی اختلاط اور آمیزش کا شکار ہو گئے رفتہ رفتہ ان کی وہ تخلیقی استعداد ختم ہو گئی جس سے ثقافت پرورش پاتی تھی۔حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آیا جب ذہن اور جسم دونوں کے لحاظ سے آریا اپنے آباؤ اجداد کی نسبت مقامی باشندوں سے زیادہ مشابہ تھے۔جن کو انہوں نے کبھی فتح کیا حتا۔ کچھ عرصہ تک وہ تمدن کی باقی ماندہ پونجی کے سہارے گزارہ کرتے رہے لیکن اس کے جلد ہی بعد ان کی تہذیب مرجھا کر قصر گمنامی میں غرق ہو گئی ۔

اس طرح تہذیبیں اور سلطنتیں تباہ ہو کر ان کی جگہ نئی سلطنتیں اور تہذیبیں قائم ہو جاتی ہیں۔

قدیم تمدنوں کے زوال کی واحد توجیہ خون کی آمیزش اور نسلی انحطاط ہے۔قومیں کبھی جنگ سے تباہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہمیشہ قوت مدافعت کھو بیٹھنے سے مٹ جاتی ہیں۔اور قوت مدافعت فقط خالص نسلی خون کا کرشمہ ہے۔اس دنیا میں ہر وہ شے خس و خاشاک کی طرح حقیر ہے جس کے نسب میں خلل ہے۔دنیا کا ہر تاریخی واقعہ چاہے اچھا ہو یا برا کم وبیش نسلی تحفظ کے جذبہ کا اظہار ہے۔

ایثار کے بغیر اقتدار حاصل نہیں ہوتا

اگر پوچھا جائے کہ آریاؤں کے غلبہ کی بنیادی وجہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آریاؤں کا غلبہ اتنا خود حفاظتی ہے کہ جبلی جذبہ کے باعث انہیں جتنا کہ اس جذبہ کے اظہار کے خاص اسلوب کے باعث ہیں۔آریاؤں کا جبلی جذبہ تحفظ نفس ایک اچھوتے

انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ تحفظ نفس کے جذبہ پر اگر تحفظ کرنے والے کے زاویہ نگاہ سے تیز نظر ڈالی جائے تو اپنے آپ کو بچانے کی خواہش ہر قسم کی مخلوق میں یکساں پائی جاتی ہے۔ ہاں اس خواہش کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ادنیٰ ترین جاندار مخلوق میں حفظ نفس کے جذبہ کا اظہار ذاتی بچاؤ کے لیے انفرادی جدوجہد سے آگے نہیں بڑھتا۔ زندگی کے اس مرحلہ پر خودغرض ایسی غالب ہوتی ہے کہ دور اندیشی کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ مستقبل کو حال پر قربان کردیا جاتا ہے۔ جانور کی زندگی فقط اس کی اپنی خاطر ہے۔ وہ خوراک کی تلاش میں تبھی نکلتا ہے کہ جب اسے بھوک لگتی ہے۔ اور لڑتا ہے تو محض اپنی ذات کے بچاؤ کے لیے۔ جب تک تحفظ نفس کا جذبہ صرف اسی اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ تب تک قبیلہ بندی کا مقوعہ پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی کی اولین گروہ بندی یعنی خاندان بھی اس مرحلہ پر وجود میں نہیں آتا۔ جب نر و مادہ کا رشتہ تناسل سے بڑھ کر ازدواج کی شکل اختیار کرتا ہے تو تحفظ نفس کے جذبہ میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ زوجین جس طرح پہلے خالی اپنے انفرادی بچاؤ کے لیے علیحدہ علیحدہ لڑتے تھے اب وہ ایک دوسرے کا بھی بچاؤ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو نر و مادہ کے لیے خوراک بھی مہیا کرتا ہے۔ والدین اکثر اولاد کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کی حفاظت پر آمادہ رہتے ہیں۔ یہ ایثار کی بالکل ابتدائی شکل ہے کی ایک سادہ سی مثال ہے جب یہ جذبہ مزید وسعت پا کر خدندان کی حدود سے باہر پھیلا نگتا ہے تو ان رشتوں اور تعلقات کی ابتدا ہو جاتی ہے جن سے بالآخر ریاست اور سرکار وجود میں آتی ہے۔

انسانیت کے ادنیٰ ترین نمونے اس جذبہ کی قلیل ترین مقدار سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی زندگی کے رشتے خاندان کے قیام سے آگے نہیں بڑھتے۔ جوں جوں افراد کے فوری مفاد کو پس پشت ڈالنے پر آمادگی بڑھتی جاتی ہے۔ توں توں زیادہ وسیع گروہ بندیاں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

اپنے ذاتی مشاغل اور ضرورت پڑنے پر اپنی جان کو بھی دوسروں کی خاطر قربان کر نے کا جذبہ آریا نسل میں سب نسلوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ آریاؤں کی عظمت ان کی ذہنی استعداد پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ افراد کی تمام قوتوں کو قوم کی زندگی کے لیے وقف کر دینے کا جذبہ ہے۔

ادنیٰ پیشہ ور قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں

تحفظ نفس کا جذبہ آریاؤں کے ہاں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں پایا جاتا ہے۔ آریاء اپنے نفس کو برضا و رغبت قومی مفاد کے ماتحت کر دیتا ہے۔ اور ضرورت پیش آنے پر قوم کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔

آریاؤں کی تعمیری استعداد' اور تمدن کی بنیادیں اٹھانے کے لیے ان کی مخصوص قابلیت محض ان کی ذہانت پر مبنی نہیں اگر آریاؤں کا تفوق محض ان کی ذہنی برتری کا نتیجہ ہوتا تو آریا صرف تخریب کر سکتے تنظیم کی قابلیت سے عاری ہوتے کیونکہ تنظیم تبھی ممکن ہے جب افراد ذاتی مفاد اور ذاتی رائے قربان کر کے جماعت کی خدمت پر آمادہ ہوں۔ فرد اپنا معاوضہ مشترکہ خدمت کے وسیلہ سے حاصل کرے مثال کے طور پر جب فرد کام کرے تو ذاتی مفاد کی غرض سے کام نہ کرے بلکہ اپنے کام کو جماعتی کسب کا جزو بنا کر سب کو فائدہ پہنچائے۔ اسی جذبہ کو لفظ ''کسب'' سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کسب کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص فقط اپنی روزی کمانے میں منہمک ہے کسب سے مراد وہ تخلیقی عمل ہے جو قومی مفاد سے متصادم نہیں۔ جب انسان کی ہمت صرف خودغرضی کی تسکین پر مائل ہوتی ہے تو اس کا اظہار چوری و ڈاکہ اور نقب زنی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

حقیقی انسانی تہذیب و تمدن کے لیے وہ طبعی میلان شرط اول ہے جو خودغرضی کو پس پشت ڈال کر مشترکہ فلاح کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی جذبہ کی طفیل انسان نے وہ عظیم کارنامے کر دکھائے جن سے ان کا کارنامہ کرنے والوں کو تو شاید ہی کوئی فائدہ اٹھایا ہو لیکن آنے والی نسلیں ان سے پوری طرح فیض یاب ہوتی رہیں۔ یہ صرف اسی کا کرشمہ

ہے کہ بسا انسان باوجود نا داری کے دیانت داری سے ایک ایسی زندگی بسر کرتا چلا جاتا ہے جہاں اسے اپنی محنت کے غریبانہ اور حقیر معاوضہ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ایسے ہی پیشہ وروں کی محنت سے قومی وجود کی بنیادیں قائم رہتی ہیں۔ ہر مزدور ہر موجد اور ہر سرکاری کارندہ جو بغیر اندوختے جمع کیے ذاتی خوشی سے محروم رہ کر اپنا کام چلا جاتا ہے وہ اس اعلیٰ جذبہ کا ترجمان ہے چاہے اسے خود اپنی کارگزاری یا اس کی اہمیت کا احساس تک بھی نہ ہو۔

اس قسم کے پیشہ وروں کے بغیر نہ رزق مہیا ہو سکتا ہے۔ نہ وہ بنیادی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں جن کی تکمیل انسانی ترقی کے لیے شرط اول ہے ایسے پیشوں کی جو تعریف کی جائے اس سے بھی زیادہ تعریف کا مستحق وہ پیشہ ہے۔ جو انسان اور انسانی تمدن کا پاسبان ہے۔ ایثار کے جذبہ کا بلند ترین اظہار یہ ہے کہ انسان اپنی جان بھی قوم کی خاطر قربان کر دے انسان اپنی محنت سے جو کچھ تعمیر کرتا ہے اس کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے۔ انسان یا فطرت کی دستبرد سے اپنی محنت کے پھل کو محفوظ رکھنے کا اس سے بہتر راستہ اور کوئی نہیں۔ ہماری جرمن زبان میں ایک لفظ ایسا ہے جو اس جذبہ کے بنیادی مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ وہ لفظ ہے ''ایثار'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی مفاد پر مشترکہ مفاد کو ترجیح دی جائے اپنے مفاد پر دوسروں کی ترجیح دینا جذبہ خود غرضی کا الٹ ہے۔ اور اسے ہم اصول پرستی کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فرد ابنائے جنس کی خاطر برضا و رغبت قربانی پر آمادہ ہو۔

اصول پرستی کے بغیر ذہانت کسی کام کی نہیں

اس امر پر بار بار زور دینا نہایت ضروری ہے کہ اصول پرستی سطحی جذبات پرستی سے قطعاً مختلف ہے۔ اصول پرستی کے بغیر تہذیب و تمدن ناممکن ہے بلکہ انسانیت کا لفظ اگر کچھ مفہوم رکھتا ہے تو اصول پرستی کے طفیل آج دنیا میں بنی نوع آدم کا تصور فقط آریائی ذہین ے سہارے رائج ہے۔ ی صرف آریاؤں کا اثر ہے کہ جسم کی اعصابی قوتیں اعلیٰ

درجہ کی ذہنی قوتوں کے ساتھ ایک اچھوتے انداز میں ترکیب پا کر وہ تخلیقی طاقت پیدا ہو گئی ہے جس نے انسانی تہذیب وتمدن کی تمام یادگاریں تعمیر کی ہیں۔

اگر دنیا میں اصول پرستی نہ ہو تو تمام قوائے ذہنی ناکارہ ثابت ہوں چاہے ان کی استعداد کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ ذہانت بغیر اصول پرستی کے خالی ذہانت رہ جاتی ہے۔ یعنی ایک ایسا خارجی کرشمہ جس کے پیچھے نہ کوئی داخلی مفہوم ہے اور نہ ای تخلیقی طاقت۔

دراصل حقیقی اصول پرستی 'فرد کے مفاد اور اسکی تمام زندگی کو قومی مقامی اور قومی زندگی کے ماتحت لے آانے کا نام ہے چونکہ قومی نظم کے بغیر تنظیم کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں اس لیے اصول پرستی کو اس کی اصلیت میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فطرت کی علت غائی ہی اصول پرستی ہے۔ یہ فقط اصول پرستی کا کرشمہ ہے کہ انسان برضا و رغبت برتر قوت یا طاقت کو اپنا رہنما تسلیم کر کے اسے ایک نظام کے جزو کے طور پر کام کرنے کا موقع دیتا ہے جس کے ماتحت ساری کائنات وجود میں آئی اور کام کر رہی ہے۔

گو شعوری طور پر ہمیشہ اس کا احساس نہیں کیا جا سکتا لیکن خالص اصول پرستی اور حقیقی علم میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ ایک حقیقت ہے۔ حقیقی اصول پرستی اور اپنے بے تکے اوہام کے کھیل تماشے میں خود ہی مستغرق رہنے کے مابین فرق ہے۔ یہ فرق دریافت کرنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی تندرست اور معصوم بچہ کی رائے معلوم کی جائے۔ وہی بچ جو کسی امن پسندانہ اصول پرست کی بکواس سن کر کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا' بلکہ اسے قبل کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قومی نصب العین کی خاطر اپنی ننھی منی جان قربان کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جائے گا۔ اس کا جبلی احساس اس حقیقت کے سامنے غیر شعوری طور پر سر تسلیم خم کر دے گا کہ نوع کی حفاظت کی خاطر افراد کی جان قربان کر دینا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ یہ بچہ بے تکے امن پرستوں کی بکواس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا۔ دراصل یہ امن پرست ہیں کون؟ یہ وہ خود غرض بزدل ہیں جنھوں نے اگرچہ بھیس بدل رکھا ہے لیکن دراصل انسانی ترقی کے دشمن ہیں۔ انسانی ترقی کے لیے

یہ لازم ہے کہ افراد مشترکہ فلاح کی خاطر قربانی دینے کے جذبہ سے سرشار ہوں اور ان پاجیوں کے مجنونانہ تخیل سے متاثر نہ ہوں جو فطرت سے بھی زیادہ دانا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔اور فطرت کے فتوے پر نکتہ چینی کر کے گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جب کبھی اصول پرستی کمزور پڑ جائے تو اس طاقت میں ضعف آ جاتا ہے۔جو قوم کے وجود اور اس کی بقا کے لیے لازمی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس طاقت کے بغیر انسانی تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ جوں ہی کسی قوم میں خودغرضی کا جذبہ پھیل جائے وہیں معاشرت کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں۔اور انسان اپنے ذاتی عیش کی تلاش میں جنت سے نکل کر دوزخ میں جا گرتا ہے۔

یہودی خودغرض اور حریص ہیں

آنے والی نسلیں ان لوگوں کو یاد نہ رکھیں گی جو صرف ذاتی مفاد حاصل کرنے میں منہمک رہے۔بلکہ آئندہ نسلیں ان نامور دلاوروں کے گن گائیں گی۔جنہوں نے اپنے عیش قربان کر دیے۔

یہودی کی فطرت آریاؤں کے بالکل الٹ ہے۔غالباً دنیا میں کسی دوسری قوم کا جذبہ خودغرضی اتنا پرورش یافتہ نہیں جتنا کہ برگزیدہ قوم کا۔اس دعویٰ کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ یہ نسل آج بھی زندہ ہے۔کیا آج روئے زمین پر کوئی دوسری قوم بھی ایسی موجود ہے جس کے اندر گزشتہ دو ہزار سال میں اعتقاد اور کردار کے لحاظ سے اس قدر کم تبدیلی آئی ہو۔جتنی کہ یہودیوں میں؟ اور باوجود اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہی کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے انقلابات میں یہودیوں نے دوسری تمام قوموں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔جن تباہیوں نے بنی نوع انسان کو لاچار کر دیا' ان میں سے بار بار گزرنے کے باوجود یہودی آج بھی وہی ہے جو ہمیشہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں اپنی نسل زندہ رکھنے کا کتنا بے پناہ عزم صمیم موجود ہے۔

یہودی کے قوائے ذہنی ہزار سال کے تربیت یافتہ ہیں آج کل یہودی کی بڑی

خصوصیت مکاری سمجھی جاتی ہے۔ اور ایک خاص معنوں میں تو وہ ہمیشہ سے مکار رہاہ۔ باوجود اس کے اس کی ذہنی طاقتیں کسی اندرونی ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ ان تجرباتی اسباق کا نتیجہ ہیں جو یہودیوں نے دوسروں سے سیکھے ہیں۔ انسانی روح بتدریج قدم اٹھائے بغیر بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہر دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے اس کی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں پہلا قدم اٹھا کر پہنچے تھے۔ یہ پہلا قدم ہمیشہ ماضی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں ماضی کے لفظ کو جن وسیع معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کے لحاظ سے یہ پہلا قدم کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ گردوپیش کے عام تمدن کی سطح کا نام ہے۔ فکر انسانی کا بہت قلیل حصہ ذاتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔ زیادہ تر انسانی غور وفکر کا انحصار ازمنہ گزشتہ کے جمع کیے ہوئے تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی تمدن کا عام معیار ایک فرد کو ابتدائی معلومات کے ایسے انبار مہیا کر دیتا ہے جن کے سہارے وہ با آسانی ترقی کے آئندہ راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے گو فرد کو جو اکثر اس حقیقت کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آج کل کا یک بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے وہاں اسے آلاتی معلومات کے وہ طومار فراہم کر دیے جاتے ہیں جو گزشتہ صدی میں مہیا ہوتے ہیں۔ ان معلومات سے واقف ہو کر وہ بہت سے ایسے امور کی تہ میں پہنچ جاتا ہے جو آج سے ایک سو برس پیشتر کے بڑے سے بڑے عالموں کے لیے بھی راز سربستہ تھے۔ ان امور کا علم آج کل کی مسلمہ حقیقتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے بے اندازہ اہم ہیں۔ جو ہماری گزشتہ ترقی کے راز اور رخ کو سمجھ کر آئندہ ترقی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر گزشتہ صدی کا کوئی لائق ترین آدمی آج اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر نکل آئے تو اس کے لیے ہمارے زمانہ کو سمجھنا آج کل کے کسی پندرہ سالہ معمولی خواندہ نوجوان کے مقابلہ میں زیادی مشکل ہوگا۔ ماضی کا یہ لائق انسان پہلے وہ ابتدائی معلومات دریافت کرنے کا محتاج نہ ہوگا جو آج کل ایک نوجوان عہد حاضر کے تمدن اور تہذیب میں پرورش پاتے ہوئے خود بخود دیکھ جاتا ہے۔

یہودی نے جوں آج تک کبھی اپنی کوئی تہذیب یا تمدن قائم نہیں کیا۔ اس کی وجہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہودی ہمیشہ اپنے ذہن کو دوسروں کے فراہم کردہ مواد پر استعمال کرتا ہے۔ اس کی ذہانت ہمیشہ ان ثقافتی کارناموں کے سہارے بروئے کار آتی رہی ہے جو اس کو اپنے گردوپیش میں دوسروں کی بدولت نظر آتے ہیں۔ تاریخ میں کبھی اس کے خلاف عمل نہیں ہوا۔

یہ درست ہے کہ یہودیوں میں حفظ نفس کا جبلی احساس دوسری قوموں کے مقابلہ میں کمزور نہیں رہا' بلکہ زیادہ قوی رہا ہے' اور اس لیے بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ذہنی قوتیں بھی کم از کم دوسری نسلوں کے مساوی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودی اس خصلت سے عاری ہیں جو ایک قوم کو مہذب بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یعنی ایثار کی خصلت یہودی کا جذبہ ربانی افراد کی حفاظت سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہودیوں میں بظاہر نسلی اتحاد کا جو احساس پایا جاتا ہے۔ وہ بھی دراصل نہایت ادنی درجہ کی لڑائی گروہ بندی سے کچھ بہتر نہیں۔ یہ اسی قسم کی گروہ بندی ہے جو بعض جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ لڑائی گروہ بندی کا احساس جانوروں کو اتنی ہی دیر اکٹھا رکھتا ہے جب تک کوئی مشترکہ خطرہ سامنے ہو' اور اس خطرہ کا مقابلہ کرنے پر یہ جانور مجبور نہ ہوں یا ان کو ایک دوسرے کی امداد کرنے میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی دیتا ہو۔ بھیڑیوں کی وہی پارٹی جو اپنے شکار پر اکٹھے ہو کر جھپٹتی ہے' جب پیٹ بھر جائیں تو فوراً منتشر بھی ہو جاتی ہے۔ گھوڑوں کا بھی یہی حال ہے اگر انہیں کوئی خطرہ پیش آ جائے تو مل کر مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن ادھر خطرہ دور ہوا اور ادھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی راہ لی۔

یہودی کا بھی یہی حال ہے ان کا جذبہ ایثار بس نمائشی ہے۔ یہ جذبہ ایثار تبھی بروئے کار آتا ہے جب بغیر اس کے فرد کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ جوں ہی مشترکہ دشمن نے شکست کھائی اور ہر ایک یہودی کو جو خطرہ تھا وہ رفع ہوا' یا شکار ہاتھ آ گیا

تو اسی وقت یہ دکھاوے کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔اور جو حالت پہلے تھی وہ عود کر آتی ہے۔ یہودی تبھی باہم تعاون کرتے ہیں جب کسی مشترکہ خطرہ سے ان کی جان نکل رہی ہو۔یا جب کسی مشترکہ شکار کر دیکھ رک ان کی رال ٹپک پڑے۔ جہاں یہ دونوں محرکات موجود نہ ہوں۔وہاں یہودی فی الفور وحشیانہ خودغرضی کا اظہار کرنے لگتا ہے۔جو لوگ تھوڑی دیر پہلے یک جان ہو کر اکٹھے رہتے تھے اب وہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کے لتے لینے لگتے ہیں۔

اگر دنیا میں صرف یہودیوں ہی کی نسل ہوتی تو یہ لوگ ہمیشہ گندگی اور کیچڑ میں لت پت رہتے۔ایک یہودی دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھاتا۔دوسرا پہلے کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔اس طرح ایک مستقل اور تلخ کشمکش ہمیشہ جاری رہتی اگر اس کشمکش میں کبھی کوئی ڈھیک رہ جاتی تو محض اس وجہ سے کہ جذبہ ایثار سے عاری ہونے کے باعث یہودی سخت بزدل ہیں اور اس لیے ا میں وہ دلیری بھی نہیں جو جھگڑا بڑھانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

اس لیے کسی بیرونی خطرہ سے تصادم کے موقعہ پر یہودی ایک دوسرے کی جو مدد کرتے ہیں اس کو اصول پرستی یا ایثار کا نام دینا غلط ہوگا۔وہ مدد دیتے وقت بھی دراصل ایک دوسرے سے نفع اٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

یہودی نقال ہیں

ایسے موقعہ پر یہودی دراصل فقط اپنے انفرادی خودغرضی کے جذبہ کی تسکین کر رہا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہودی سرکار کی کوئی ارضی حدود نہیں۔یہودی سرکار میں اہم تنظیم کا نام ہے جس کا کام یہود نسل کو محفوظ رکھنا ہے اور اسکی افزائش کی سعی کرنا ہے۔کسی سرکار کی ارضی حدود اسی وقت مقرر کی جاسکتی ہیں جب اس سرکار کو قائم کرنے والی نسل میں کچھ اصول پرستی کا جذبہ موجود ہو۔علاوہ ازیں ایک سرکار کو قائم کرنے والی نسلیں میں کچھ اصول پرستی کا جذبہ موجود ہے۔علاوہ ازیں ایک سرکار کے قیام کے لیے کسب اور

پیش کا صحیح تصور اور اس تصور کے عام رواج کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ جس سرکار کی ارضی حدود معین ہوں وہ نہ اس وقت تک قائم ہو سکتی ہے اور نہ باقی رکھی جا سکتی ہیں۔ جب تک اس کے باشندے مثبت پیشے اور کسب اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ اگر یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو کوئی تہذیب یا تمدن تعمیر نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہودی نسل باوجود ذہانت کی ان قوتوں کے جو بظاہر ان میں پائی جاتی ہیں۔ تہذیب و تمدن سے عاری ہیں۔ کم از کم ان کا کوئی ایسا تمدن نہیں جس کو یہودی تمدن کہا جا سکے۔ یہودی آج کل جب تہذیب و تمدن سے مستفیض ہو رہے ہیں وہ دوسروں نے تعمیر کیا ہے۔ اور اس تمدن کو بھی یہودیوں نے اختیار کر کے بٹہ ہی لگایا ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کے مسائل میں یہودیوں کو مجموعی طور پر جو حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ کرنے سے قبل یاد رکھنا چاہیے کہ یہودیوں نے کبھی پہلے کوئی فنون لطیفہ ایجاد کیے اور نہ اج کل کوئی ایسا آرٹ موجود ہے جسے یہودی آرٹ کہا جا سکے۔ تعمیرات اور موسیقی فنون لطیفہ کی دو اہم شاخیں ہیں۔ ان دونوں شاخوں میں یہودیوں نے نہ کبھی کوئی اختراع کی ہے اور نہ کوئی تخلیق جب کبھی کسی یہودی کو کسی فن لطیف میں طبع آزمائی کا شوق چراتا ہے تو وہ ہمیشہ یا تو کسی پہلے سے موجود شے کی تالیف کرتا ہے یا پھر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دوسروں کے دماغ کی محنت کے نتائج چرا لیتا ہے۔ یہودی جبلی طور پر ان خصلتوں سے محروم ہیں جو تہذیب و تمدن قائم کرنے والی جہاں آفرین قوموں کا طغرائے امتیار رہا کرتی ہیں۔

یہودی کس حد تک دوسروں کے قائم کردہ تمدن و تہذیب پر قبضہ جما لیتا ہے اس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ یہودی زیادہ تر اس آرٹ میں مہارت پیدا کرتا ہے جس کے لیے کم سے کم اختراعی قابلیتوں کی حاجت ہے یعنی ناٹک کا فن' سچی بات تو یہ ہے کہ یہودی جب دوسروں کے تمدن و تہذیب پر قبضہ کرتا ہے تو انہیں مسخ بھی کر دیتا

ہے۔ یہودی ناٹک میں بھی بازیگری یا بندروں کی طرح نقلیں اتارنے سے بہتر اور کوئی کوشش پیش نہیں کی جاتی۔ اعلیٰ درجے کے ناٹک تیار کرنے کے لیے جس کیف اور وجدان کی ضرورت ہوتی ہے یہودی اس سے عاری ہیں۔ اس لیے ناٹک کے میدان میں بھی یہودی کوئی اعلیٰ اور تخلیقی قابلیت کا پایہ نہیں رکھتا۔ بلکہ محض ایک سطحی نقال ہے جو اپنی چالاکیوں اور بھیس بدلنے کے باوجود یہ حقیقت چھپا نہیں سکتا کہ اس کے فنی کارنامے کوئی جان نہیں رکھتے۔ اس مرحلہ پر یہودی اخبارات اسے سہارا دینے آدھمکتے ہیں۔ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا شور مچا کر اپنی دوستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہر پھوہڑ یہودی کے سر پر یہ واہ واہ کے ڈونگرے اس وقت تک برسائے جاتے ہیں جب تک ساری دنیا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکی ہوتی ہے کہ جس شخص کی اتنی تعریف ہو رہی ہے وہ ضرور ہی کوئی بڑا فنکار ہو گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ سارے شور و غوغا کے نیچے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھانڈ چھپا ہوتا ہے۔

نہیں! یہودی اس تخلیقی قابلیت سے عاری ہیں جو کسی تمدن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں وہ اصول پرستی کا جذبہ نہیں ہے نہ کبھی ہو گا۔ جو انسانیت کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر لے جانے کے لیے لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی کی ذہانت ہمیشہ تخریبی ہوتی ہے۔ کبھی تعمیری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہودی کی ذہانت کے کرشمے کبھی کبھار انسانی ذہن کو انگیخت دینے کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس انگیخت کا سہرا بھی انہیں معنوں میں یہودی کے سر باندھا جا سکتا ہے جن معنوں میں مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے وہ مصرع کہا تھا کہ جب کا مطلب ہے کہ:

"خدا شرے برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد"

اگر انسانیت کچھ ترقی کر رہی ہے تو یہ یہودیوں کے کارناموں کے طفیل نہیں بلکہ یہودی کارستانیوں سے بچ نکلنے کے طفیل ہے۔

یہودی خانہ بدوش نہیں بن بلائے مہمان ہیں

چونکہ یہودیوں کی کبھی کوئی ایسی سرکار نہیں رہی جو ارض حدود کی پابند ہو اور اس وجہ سے یہودیوں نے کبھی اپنا کوئی علیحدہ تمدن یا تہذیب بھی قائم نہیں کی۔ اس لیے ایک عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہودی بے چارے تو ایک خانہ بدوش نسل ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اور نہایت شر آمیز ہے۔ حقیقی خانہ بدوش تو آخر کسی علاقے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہاں وہ اس طرح خود کھیتی باڑی نہیں کرتے جس طرح آباد کار انسان کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ خانہ بدوش اپنے گلوں کی پیداوار پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اپنے خطہ میں اپنے ریوڑوں کو لیے گھومتے پھرتے ہیں۔ اس طرز رہائش کی بھی طبعی علت یہ ہے کہ علاقہ زرخیز نہیں ہوتا۔ اس لیے وہاں کوئی مستقل پیداوار بھی نہیں ہوتی جس کے سہارے جم کر قیام کیا جا سکے۔ اس طبعی علت کے علاوہ ایک اس سے بھی زیادہ گہری وجہ یہ ہوتی ہے کہ آس پاس کوئی ایسی مشینی تہذیب نہیں ہوتی جو اس خطہ کے قدرتی بنجر پن کو دور کرنے کے لیے کوئی سبیل نکالے۔ کئی علاقے ایسے ہیں جہاں آریا اپنی بہتر آلاتی قابلیت کی وجہ سے بستیاں قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن آریاؤں کی عدم موجودگی میں ویران پڑے ہیں۔ آریاؤں نے یہ آلاتی قابلیت گزشتہ ایک ہزار سال میں پیدا کی ہے۔ ان علاقوں کی آبادکاری کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آریا وہاں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن آریاؤں کی مشینی قابلیت سالہا سال سے آلات سے فائدہ اٹھانے کی عادت غالباً آریاؤں کو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہونے دے گی اس ضمن میں یاد رکھنا چاہیے کہ امریکہ کی آبادکاری کے پہلے دور میں آریا اپنا یومیہ روزگار شکار بن کر اور جال لگا کر حاصل کیا کرتے تھے۔ اکثر یہ لوگ قافلے بنا کر عورتوں اور بچوں سمیت جا بجا گھومتے پھرتے تھے ان دنوں ان کی طرز رہائش معمولی خانہ بدوشوں سے خاصی ملتی جلتی تھی۔ تاہم جوں ہی ان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وسیع ذرائع ان کے قابو میں آ گئے تو انہوں نے زمین کو صاف کیا قدیم باشندوں کو نکال دیا اور ایسی بستیاں قائم کیں جو سارے ملک میں پھیل گئیں۔

غالباً آریا خود بھی پہلے کبھی خانہ بدوش ہی تھے اور پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مستقل آبادیاں قائم کرتے گئے۔ لیکن آریا کسی زمانہ میں بھی یہودیوں جیسے نہ تھے۔ یہودی خانہ بدوش نہیں بلکہ کیونکہ خانہ بدوش تو کسب کا ایک خاص تصور رکھتا ہے۔ اور جب مطلوبہ ذہنی ماحول پیدا ہو جائے تو اسی تصور کی طفیل اس کا تمدن ترقی کرتا ہے۔ خانہ بدوش کے عام رویہ میں ایک خاص حد تک اصول پرستی پائی جاتی ہے۔ چاہے یہ اصول پرستی بالکل ابتدائی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس وجہ سے خانہ بدوش کا کردار آریاؤں کے لیے چاہے اجنبی ہو لیکن نفرت انگیز نہیں ہوتا۔ لیکن یہودیوں کے کردار میں تو اصول پرستی کا شائبہ تک نہیں۔ یہودی کبھی خانہ بدوش نہ تھا۔ بلکہ ہمیشہ نکھٹو اور مفت خور رہا ہے۔ وہ دوسروں کا خون پی پی کر موٹا ہوتا ہے۔ اگر یہودی جہاں پہلے آباد تھا وہاں سے کبھی کبھار نقل مکانی بھی کر گیا تو یہ نقل مکانی پر رضامندی سے نہ تھی۔ بلکہ اس وجہ سے تھی کہ وہاں کے باشندے وقتاً فوقتاً ان کی میزبانی کا فائدہ اٹھانے والے اس مہمان سے تنگ آ کر اس کو اپنے علاقہ سے نکال دیتے رہے۔ یہودیوں کی افزائش نسل بھی مفت خوری کا ایک اور نمونہ ہے۔ کیونکہ یہودی ہمیشہ اپنی نسل کے لیے نئے دسترخوان کی تلاش کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

ان باتوں سے یہودی کے خانہ بدوش ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ یہودی جب ایک دفعہ کسی علاقہ میں آباد ہو جائے تو خود کبھی اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ جہاں جائے ایسا جم کر بیٹھ جاتا ہے کہ اگر اس کے خلاف زبردست تشدد بھی استعمال کیا جائے تو وہ نہیں ٹلتا۔ وہ نئے علاقوں میں تبھی پھیلتا ہے جب وہاں اس کے خیر مقدم کے لیے پہلے سے کچھ سازگار حالات موجود ہوں۔ برعکس خانہ بدوشوں کے عام حالات میں وہ نئے علاقہ کے پرکشش ہونے کے باوجود اپنی سابقہ اقامت گاہ ترک نہیں کرتا۔ وہ طبعاً ایک نکھٹو مفت خور ہے اور ہمیشہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ وہ ایک ایسا تکلیف دہ ٹکڑا گدا ہے جو موذی کیڑے مکوڑوں کی طرح زیادہ سے زیادہ رقبہ پر پھیلتا ہی چلا جاتا

ہے۔ جہاں اسے کوئی اچھی جگہ نظر آتی ہے وہ اسی کی طرف لپکتا ہے۔ اس کا وجود کا وہی اثر ہوتا ہے جو کسی مردار خوار جن کی موجودگی کا ہوسکتا ہے۔ وہ جہاں ڈٹ جائے اسے مہمان ٹھہرانے والی قوم کا خون زود یا بدیر چوس کر اسے موت کے گڑھے میں گراتا ہے۔

یہودی ایک مذہبی فرقہ نہیں

اس طرح یہودی ہمیشہ سے ان سلطنتوں میں سکونت پذیر رہا ہے جن کی بنیاد دوسری نسلیں رکھتی ہیں۔ پھر سلطنت کے اصلی نظام کے اندر وہ اپنی سرکار کا ایک جداگانہ نظام قائم کرتا ہے۔ یہودی سرکار کے منہ پر ہمیشہ ''مذہبی فرقہ'' کا نقاب پڑا رہتا ہے۔ یہ نقاب اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب بیرونی حالات اس امت کی اصل حقیقت کے انکشاف کے لیے سازگار ہوں جوں ہی یہودی محسوس کرتا ہے کہ وہ بھیس بدلے بغیر بھی اپنی جگہ پر قابض رہ سکتا ہے تو وہ اپنے چہرہ سے پردہ ہٹا کر اپنی اس حقیقی جون میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس میں اس سے پہلے کئی لوگ اسے دیکھنے کا کبھی تعین نہ کر سکتے تھے یا یقین نہ کرنا چاہتے تے۔ یہی جون یہودیوں کا اصلی روپ ہے۔

دوسری قوموں اور سلطنتوں کی کمائی پر ایک نکھٹو مفت خورے کی طرح ہے لگا کر یہودی جو زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اسی کی وجہ سے اسے وہ شہرت حاصل ہوئی ہے جس کی ترجمانی کرتے ہوئے مشہور جرمن فلسفی شوپن ہار نے یہودیوں کو ''کذاب اعظم'' کا خطاب دیا تھا۔ یہودی جس نوع کی زندگی بسر کرتا ہے اس ی وجہ سے باقاعدہ دروغ گوئی پر مجبور ہے ویسا ہی مجبور جیسا کہ برفانی علاقوں کے باشندے گرم لباس پہننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

وہ دوسری قوموں اور سلطنتوں میں تب ہی زندگی بسر کرسکتا ہے جب انہیں یقین دلائے رکھے کہ یہودی کوئی جدا نسل نہیں۔ وہ تو صرف ایک علیحدہ مذہب کے ماننے والے ہیں اور اس وجہ سے صرف ایک جدا مذہبی فرقہ ہیں' اگر چہ اس فرقہ میں بعض عجیب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

درحقیقت یہودیوں کا یہ دعویٰ وہ پہلا جھوٹ ہے جس سے ان کی دروغ بافیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

وہ اپنا اصلی کردار اور طرز زندگی چھپانے کے لیے مجبور ہیں تاکہ دوسری قومیں انہیں اپنے اندر ایک نکھٹو مفت خورے کی طرح رہنے سے منع نہ کرسکیں۔ جتنا کوئی یہودی فرداً زیادہ ذہین ہو اتنا ہی وہ دوسروں کو دھوکہ دینے میں آسانی سے کامیاب رہتے ہیں۔ یہودیوں کی اس پردہ پوشی میں اس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے نادانستہ ان کی میزبانی قبول کر رکھی ہوتی ہے وہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ یہودی بھی سچ مچ فرانسیسی، انگریز جرمن یا اطالوی ہیں۔ فقط ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ان ممالک میں عام رائج نہیں۔ جن حکام کے ہاتھ میں سرکاری انتظامات ہوتے ہیں وہ تو شاذونادر ہی علم تاریخ سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس لیے ان کے سامنے یہودی بالخصوص بڑی آسانی سے اپنے اس فریب کا جعلی سکہ چلا لیتا ہے۔ سرکاری حکام کبھی اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی نگاہ میں اپنی عقل سے کام لینا ایک گناہ ہے کیونکہ سرکاری قوانین میں کہیں اس کی اجازت درج نہیں اور ملازمت میں ترقی بہر حال سرکاری قوانین کے مطابق نصیب ہوتی ہے۔ پھر اس تعجب کی کیا بات ہے کہ مثال کے طور پر بویریا کے سرکاری دفاتر میں آج بھی کسی کو شبہ تک نہیں کہ یہودی بجائے خود ایک جدا قوم ہیں۔ اور محض کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ اخبارات پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اگر کسی میں ماشہ بھر عقل بھی ہو تو ان اخبارات پر ایک نظر ڈالنے سے اس امر کی شہادت مل جاتی ہے۔ کہ یہودی خالی کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ صدائے یہود کے نام سے جو اخبار نکلتا ہے وہ ایک سرکاری اخبار نہیں اور اس لیے یہ پروردگان سرکار بھلا کسی غیر سرکاری اخبار سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی غلطی کے مرتکب کس طرح ہو سکتے ہیں۔

یہودی ہمیشہ سے ایک جدا قوم اور ایک جدا نسل رہے ہیں۔ وہ کبھی کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے کے باعث علیحدہ نہ تھے۔ بہت پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ یہودیوں

نے دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی خواہش سے مجبور ہو کر کسی ایسے ذریعہ کی تلاش شروع کی جس سے وہ اپنے آپ کو چھپا سکیں۔ اگر وہ اپنے آپ کو چھپا نہ سکتے تو لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ لوگوں کے متوجہ ہونے سے یہودیوں کو اپنے آرام میں خلل آنے کا خدشہ تھا۔ ان حالات میں اپنے آپ کو شک و شبہ سے بالاتر رکھنے کا اس سے زیادہ موثر حربہ کیا ہو سکتا تھا کہ مذہبی فرقہ کا بہانہ اختیار کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ مذہبی فرقہ کا تصور بھی یہودیوں نے دوسروں سے مستعار لیا ہے یہودیوں کی تو ہر شے نقلی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہودیوں کی ہر شے دوسروں کے گھروں کی چرائی ہوئی ہے۔ جب یہودی ہر قسم کی اصول پرستی سے عاری ہیں تو بھلا وہ محض اپنے ضمیر سے کوئی ذہب یا مذہبی نظام کس طرح پیدا کر سکتے تھے۔ آریائی ذہن کسی ایسے مذہب کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو کسی نہ کسی شکل میں حیات بعد ممات پر یقین نہ رکھتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تالمود میں ایسے کوئی قوانین درج نہیں ہیں جن کے ماتحت انسان دنیا میں آخرت کی زندگی کے لیے تیاری کر سکے۔ اس کتاب میں تو صرف دنیا کے اندر ایک عملی اور قابل برداشت زندگی بسر کرنے کے قوانین درج ہیں۔

یہودیوں کا دین اخلاقی تعلیمات سے عاری ہے

یہودیوں کی مذہبی تعلیمات زیادہ تر یہودی خون کو پاک رکھنے کے لیے ہدایات کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ یا ان میں یہودیوں اور باقی کی دنیا کے باہمی تعلقات پر بحث ہے۔ گویا یہودیوں اور غیر یہودیوں کے باہمی رشتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ دین یہود کو اخلاقی مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں تو ساری توجہ اقتصادی مسائل پر مرکوز ہے۔ اقتصادی مباحث میں سے بھی نہایت حقیر اور ابتدائی مسائل پر سارا زور صرف کیا گیا ہے۔ یہودیوں نے اپنی مذہبی تعلیمات اور اخلاقی قدر و قیمت پر جو کتابیں لکھی ہیں ان سے طبعاً مطلب پرستی کی بو آتی ہے۔ ان مذہبی تعلیمات کی حقیقی قدر و قیمت کے متعلق ہمیشہ سے ایسی مفصل تصنیفات موجود ہیں جن سے عملاً ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کا

مذہب آریاؤں کے لیے نا قابل فہم ہے۔ یہ مذہبی تربیت عملاً جونمو نے تیار کرتی ہے ان کی بہترین مثال خود یہودی ہیں۔ اس دنیا میں یہودی کی زندگی اور یہودی کی ذہنیت' عیسائیت سے اتنی ہی بعید ہے کہ جتنا اس کا کردار آج سے دو ہزار سال قبل خداوند یسوع کی نگاہ میں بیگانہ تھا۔ قوم یہود کے متعلق خداوند یسوع کا جو خیال تھا وہ خداوند نے پوشیدہ نہیں رکھا۔ جب خداوند نے ضرورت محسوس کی تو بنی آدم کے ان دشمنوں کو خداوند نے بیت اللہ سے نکال دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح تب بھی یہودی دین کو اپنی دوکانداری کی رونق بڑھانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے یہود کے خلاف جو رویہ اختیار کیا تھا اسی کی وجہ سے انہیں صلیب پر کھینچ دیا گیا۔ آج کل کے عیسائی جب پارٹی بازی کی سیاست میں داخل ہوتے ہیں۔ اور الیکشن کا زمانہ آتا ہے تو یہی عیسائی یہودیوں سے ووٹ مانگ کر اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد عیسائی' یہودی جماعتوں کے ساتھ سازشوں میں شریک ہو کر' خود اپنی عیسائی قوم کے مفاد کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

نئی زبان سیکھ کر نیا ذہن حاصل نہیں ہو جاتا

یہودیوں کے پہلے اور بنیادی جھوٹ کا مطلب ی ہے کہ لوگوں کو یقین دلا دیا جائے کہ یہودی کوئی الگ قوم نہیں بلکہ فقط ایک مذہب ک پیرو ہیں۔ پھر اسی جھوٹ کی بنیاد پر دوسرے جھوٹوں کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان دوسرے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ اسی زبان سے متعلق ہے جسے یہودی استعمال کرتے ہیں۔ یہودی کے لیے زبان اظہار خیالات کا ذریعہ نہیں بلکہ دلی خیالات کو پوشیدہ رکھنے کا وسیلہ ہے۔ یہودی منہ سے فرانسیسی بول رہا ہو تب بھی اس کے خیالات یہودانہ ہوتے ہیں اور جب وہ جرمن بزبان میں قافی پیائی کر رہا ہو تب بھی وہ اپنے نسلی کردار کو بیان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

جب تک یہودی دوسری اقوام کو مسخر نہیں کر لیتا تب تک وہ ان کی زبانیں بولنے پر

طوعاً وکرہاً مجبور ہے۔ لیکن جس گھڑی یہودیوں کے پنجے میں گرفتار ہوگئی تو دنیا کی کوئی نئی زبان سیکھنی پڑے گی، جس کے ذریعے سے یہودی زیادہ آسانی سے اپنا عالم گیر تسلط برقرار رکھ سکے۔ زرگری بولی شاید اس نئی زبان کی جگہ لینے کو نہایت موزوں ہوگی۔

اس قوم کا سارا وجود ایک مستقل دروغ پر مبنی ہے۔ اس کا ثبوت اس کتاب سے ملتا ہے کہ جس کا نام ہے "دانشوران یہود کا میثاق" یہودی بڑی شدت سے منکر ہیں کہ اس کتاب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ فرانک فرٹر سی ٹنگ اخبار ابار بار گڑگڑا کا اور بسور بسور کر کہتا ہے کہ یہ کلتاب تو ایک جعل سازی ہے۔ یہ انکار ہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ کتاب بالکل اصلی ہے۔ بہت سے یہودی چپکے چپکے دل میں جو ارمان چھپائے بیٹھے ہیں ا س کتاب میں ان سب کی وضاحت کردی گئی ہے۔ یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ انکشافات کس یہودی ذہن کی کاریگری کا نتیجہ ہیں۔ کام کی بات یہ ہے کہ مختلف پہلوؤں سے یہود جس منزل مقصود کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کتبا میں اس کی پوری پوری تفصیل درج ہے۔ یہودی ذہنیت اور یہودی طریقہ کار کو خوفناک صاف گوئی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سچائی کا اندازہ کرنے کے لیے بہترین معیار وہ واقعات ہیں جو درحقیقت پیش آرہے ہیں اگر اس کتاب کی روشنی میں ان تاریخ واقعات کا مطالعہ کیا جائے جو گزشتہ چند صدیوں سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں تو پھر یہ راز کھل جاتا ہے کہ یہودی اخبارات متواتر اس کتاب کی تردید اور مذمت میں کیوں مصروف ہیں۔ اگر عوام کو اس کتاب تک رسائی حاصل ہو جائے اور وہ اس کا مطلب بھی سمجھ جائیں تو اسی گھڑی وہ بلا بھی ٹل جائے جو یہودی ہمارے سر پر لانا چاہتے ہیں۔

یہودی کی حقیقت کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے اس زندگی کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے جو وہ گزشتہ چند صدیوں سے دوسری اقوام کے مابین بسر کرتا آیا ہے۔ اس داستان کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک مثال دینا کافی ہوگا۔ یہودی کی روش ہر زمانہ میں یکساں رہی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہودی جن اقوام کے گھر بن بلائے مہمان کی حیثیت سے

مقیم رہا ہے ان کی بھی ایک ہی سی گت بنتی رہی ہے۔ یہودیوں کی کارستانیوں کا مطلوبہ تجزیہ کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کی حرکتوں کا درجہ بدرجہ مطالعہ کیا جائے افہام و تفہیم میں سہولت کی خاطر ہم ان مدارج کا تذکرہ حروف ابجد کی ترتیب سے کریں گے۔

جس علاقہ کو المانیہ کہا جاتا تھا وہاں یہودی پہلے پہل روم کی یلغار کے زمانہ میں حسب دستور سوداگروں کے بھیس میں آئے۔ جب جرمن قبائل کی ہجرت عظیم شروع ہوئی تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اس بے چینی کے دور میں یہودی کہیں گم ہو گئے۔ اس لیے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مرکزی اور شمالی یورپ پر یہودیوں کے دوبارہ اور مستقل تسلط کا عمل اور وقت شروع ہوا جب جرمن اپنی ابتدائی سیاسی تنظیمات قائم کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد وہ عمل شروع ہوا جو ہمیشہ تب دوہرایا جاتا ہے جو آریائی اقوام سے یہودیوں کا ربطہ پیدا ہو جائے۔

(الف) جوں ہی جرمنوں نے پہلی مرتبہ مستقل آبادیاں قائم کیں' وہیں یہودی بھی فی الفور آدھمکے۔ شروع شروع میں تو وہ سوداگروں کے بھیس میں آئے۔ اور انہوں نے اپنی قومیت پوشیدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ابھی یہودی کھلے طور پر یہودی تھا۔ شاید کسی حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ تا حال اسے مقامی زبان پر پورا عبور حاصل نہ تھا۔ ممکن ہے کہ ایک وجہ یہ بھی ہو کہ دوسری نسلوں کے لوگ یہودی کے ساتھ اختلاط رکھنے سے باز رہے ہوں۔ ان حالات میں یہودی ایک اجنبی سودار کے سوا اور کوئی بھیس کامیابی سے اختیار نہ کر سکتا تھا۔ جن قوموں کے ہاں یہودی مقیم تھے ان کی ناتجربہ کاری اور یہودی کی عیاری و مکاری کے باعث یہودی کے لیے کھلے طور پر اپنے یہودی پن کو باقی رکھنا کچھ مضر نہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہودی کو اس حیثیت میں کچھ زیادہ ہی فائدہ رہا ہو' کیونکہ اس زمانہ میں اجنبیوں سے مہربانی کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

سود خوری اور مفت خوری یہودیوں کی ایجاد ہیں

(ب) آہستہ آہستہ لیکن پورے استقلال کے ساتھ یہودی نے گرد و پیش کی اقتصادی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔ یہودی کوئی شے پیدا نہ کرتا تھا۔ بلکہ دلالی پر اکتفا کرتا تھا۔ ہزار ہا سال سے دلالی کے فرائض سرانجام دینے کے باعث یہودی کو تاجرانہ چالاکی کا ایسا تجربہ حاصل ہو چکا تھا کہ آریا تو اس میدان میں اس کا لگا بھی نہ کھا سکتے تھے۔ آریا اس لحاظ سے بالکل سادہ لوح اور احمق ہیں۔ آریاؤں کی دیانت داری کی کوئی حد ہی نہیں۔ غرض تھوڑے ہی عرصہ بعد ایسا نظر آنے لگا کہ تجارت تو گویا یہودی کے لیے وقف ہے۔ یہودی سود پر قبضہ بھی دینے لگا۔ سودی قرضہ دیا تو یہودی کی مستقل تجارت ہے۔ قرضہ کے روپے پر سود وصول کرنا یہودیوں ہی کی ایجاد ہے۔ اس بدعت سے جو خطرات پیدا ہو سکتے ہیں شروع شروع میں کسی نے ان کا احساس نہ کیا۔ بلکہ الٹا اس بدعت کا خیر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ فوری طور پر اس میں فائدہ نظر آتا تھا۔

(ج) اب وہ مرحلہ آیا کہ یہودی ڈٹ کر جم گیا۔ بعض شہروں اور قصبوں میں تو اس نے اپنے علیحدہ محلے آباد کر لیے۔ اور منڈی میں بھی اس کے لیے مخصوص ٹھکانے طے پا گئے۔ اس طرح یہودی نے بتدریج قومی و ملکی سلطنت کے اندر ایک دوسری سلطنت قائم کر لی۔ وہ تجارت کی قلم رو اپنی جاگیر تصور کرنے لگا۔ اور نقد لین دین کے تمام معاملات اپنے مخصوص اختیارات کے ماتحت سمجھنے لگا۔ اس نے پوری سنگدلی کے ساتھ فائدہ اٹھایا۔

(ج) اب وہ مرحلہ آیا کہ مالیات اور تجارت یہودی کی اجارہ داری بن چکے تھے۔ آخر کار یہودی کی شرح سود سے بیزاری کے باعث مخالفت شروع ہوئی۔ یہودی اب جس روز افزوں گستاخی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے اس سے عام ناراضی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ یہودیوں کے اظہار تمول سے خلقت کو حسد پیدا ہوا۔ جب یہودی نے جائیداد غیر منقولہ کو بھی اپنی تجارتی اجناس میں شامل کر لیا' اور زرعی اراضی کی حیثیت سے بھی ایسی پست کر دی کہ اسے منڈی کا بکاؤ مال بنا دیا۔ تو اس وقت یہودی کے مظالم کا

جام لبریز ہو گیا۔ یہودی نے خود بھی کبھی اراضی کی کاشت نہ کی تھی۔ یہودی تو زرعی اراضی کو بھی ایک ایسی ہی شے سمجھتا تھا کہ جس سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ یہودی کا خیال تھا کہ زمین کی ملکیت خود حاصل کر کے کاشتکاروں کو اس شرط پر بحال رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نئے مالک کو انتہائی ظالمانہ خراج ادا کرتا رہا۔ یہودی کی ان حرکتوں سے اس کے خلاف عوام کی ناراضی بڑھتی گئی۔ اور آخر کار کھلی دشمنی کی صورت اختیار کر گئی۔ یہودی کا ظلم اور استحصال بالجبر ایسا ناقابل برداشت ہو چکا تھا کہ لوگوں نے اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کے خلاف جسمانی تشدد پر بھی اتر آئے۔ عوام نے اب زیادہ غور سے اس اجنبی کا معائنہ شروع کر دیا تو اس کی نفرت انگیز جبلی خصلتیں اور عادتیں ان پر کھلنے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہودی اور اس کے میزبانوں کے درمیان بیزاری کی ایک خلیج حائل ہو چکی تھی۔ جس کو پاٹ کر باہمی تعلقات کی بحالی ناممکن ہو گئی۔

بالعموم بدحالی کے ہر دور میں یہودیوں کے خلاف ہمیشہ عوامی غصہ کی لہریں اٹھتی ہیں۔ جمہور قانون اپنے ہاتھ میں لے کر یہودی کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے تھے' اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں یہودی کو برباد کر دیتے تھے۔ جمہور کا خیال تھا کہ یہودی سے مقابلہ کرنا اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچانے کے برابر ہے۔ صدیوں اکٹھے رہتے سہتے عوام یہود کے بھیدی بن گئے تھے انہیں اب یہودی کے متعلق جو واقفیت حاصل تھی اس کی وجہ سے جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آتی تو وہ یہود کے وجود کو قوم کے لیے ویسا ہی خطرہ تصور کرتے تھے جیسے کہ طاعون۔

(ہ) اب یہودی اپنی اصلیت میں کھلنے لگا۔ وہ حکومت کی تنظیم کرتا تھا سرکاری افسروں کی خوشامد کرتا تھا' اور اپنے روپے کے زور پر اپنا اڈہ زیادہ مضبوطی سے جمائے چلا جاتا تھا۔ ان حیلوں سے یہودی اپنے شکار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا قانونی اختیار باقاعدہ حاصل کر لینے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اگرچہ عوام مشتعل ہو کر اس ازلی نفع باز

کے خلاف اٹھتے تھے اور اسے باہر نکال آتے تھے لیکن چند ہی برسوں کے بعد انہیں مقامات پر پھر نمودار ہو جاتا تھا اور پہلے کی طرح مزے سے اپنا کاروبار چلانا شروع کر دیتا تھا۔اس کے خلاف کتنی ہی سختی کیوں نہ کی جائے وہ لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا پیشہ ترک کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اسے کتنا ہی تنگ کیوں نہ کیا جائے اسے کسی علاقہ سے مستقل طور پر نکالنا ناممکن تھا۔وہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد پھر واپس آ جاتا تھا۔اور ایک مرتبہ پھر وہی پرانی داستان دوہرائی جاتی تھی۔

رئیس اور نواب زادے بھی یہودیوں سے کم مجرم نہیں

یہودی کی موجودگی کے بدترین اثرات سے بچنے کے لیے نئے قانون بنائے گئے جن کے ماتحت یہودی کو اراضی کا قبضہ لینے کی اجازت نہ تھی۔

(و) جوں جوں بادشاہوں اور نوابوں کے اختیارات میں اضافہ ہوا توں توں یہودی بھی ان کے ساتھ چمٹتا گیا۔یہودی کبھی تو شاہی فرمان حاصل کرتا تھا اور کبھی 'مراعات'' طلب کرتا تھا۔بادشاہ اور نواب بالعموم مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے اور اس وجہ سے جب انہیں معاوضہ میں کافی رقم مل جاتی تھی تو یہودی کی یہ ساری درخواستیں بلاچون وچرا منظور کر لیتے تھے۔یہودی کو کتنی گراں ہی قیمت ادا کرنے پر مجبور کیوں نہ کیا جائے وہ چند ہی برسوں میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو وہ حاصل کر چکا ہوتا تھا نہ صرف اصل وصول کر لیتا تھا بلکہ سود در سود بھی نہ چھوڑتا تھا۔یہودی واقعی ایک جونک ہے جو اپنے بدقسمت شکار کے جسم سے جب ایک مرتبہ لپٹ جائے تو پھر اس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ جب ان سلاطین کو بعد میں پھر ضرورت نے مجبور کیا تو انہوں نے اس خون پی پی کر موٹی ہونے والی جونک کی رگوں سے حسب ضرورت تھوڑا بہت لہو حاصل کیا۔

یہ کھیل لامتناہی طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔نام نہاد جرم نوابوں نے اس گندے کھیل میں جو پارٹ ادا کیا وہ بھی اتنا ہی قابل نفرت ہے جتنا کہ اس سلسلہ میں

یہودیوں کا کردار۔ یہ نواب بھی قوم کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ تھے۔ ہمارے زمانہ کی حکومت کے بعض وزراء بھی ان ہی نوابوں کے بھائی ہیں

ان نوابوں ہی کی بدولت جرمن قوم اپنے آپ کو فتنہ یہود سے آزاد نہ کرو اسکی بدقسمتی سے بعد میں بھی اس صورت حال میں کوئی فرق نہ آیا۔ انجام کار ان نوابوں کو وہی انعام ملا جس کے وہ مستحق تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنی قوم کے خلاف جن جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کے باعث وہ اس سے ہزار گنا زیادہ سزا کے مستوجب تھے۔ انہوں نے ابلیس سے اتحاد کر رکھا تھا اور آخر کار انہوں نے اپنے آپ کو ابلیس ہی کے آغوش میں جکڑا ہوا پایا۔

(ز) نوابوں نے اپنے آپ کو یہودیوں کے اعمال میں شریک بنا کر خود ہی اپنے زوال کا اہتمام کیا۔ انہیں اپنی قوم میں جو حیثیت حاصل تھی آہستہ آہستہ اسے گھن لگتا گیا ۔اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ رعیت کے مفاد کی حفاظت سے قاصر رہے تھے یہودی بڑے اطمینان سے بیٹھا ان نوابوں کے زوال کے وقت کا حساب لگاتا رہا۔ جہاں تک اس کا بس چلتا تھا اس نے ان کے زوال کو قریب تر ہی لانے کی کوشش کی ۔اس نے ان نوابوں کو رعایا کے تحفظ سے باز رکھ کر ان کی مالی مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس نے انتہائی غلامانہ خوشامد سے ان کو ایسا گمراہ کیا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ذاتی شان وشکوہ کے مظاہرے کرنے میں منہمک ہو گئے ۔ان وجوہات کی بنا پر نوابوں کے لیے یہودی امداد کے بغیر کام چلانا مشکل ہو گیا۔ روپے کے معاملہ میں یہودی کا ذہن اتنا تیز تھا کہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ روپے کے معاملہ میں یہودی اتنا بے اصول تھا کہ وہ ہمیشہ ان نوابوں سے آمدنی کے نئے ذرائع کے استعمال کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا رہا۔ یہودی ان ذرائع سے روپے وصول کرتا تھا اور جس قدر جلد ممکن ہو نواب صاحب سے خرچ کرا وا ڈالتا تھا۔ ہر دربار میں ایک عدد یہودی ''درباری منیم جی'' کے بھیس میں موجود تھا۔ یہ منیم جی بھی کسی طاعون سے کم نہ تھے ۔وہ اپنے بے گناہ تختۂ مشق کو

س طرح ستاتے تھے کہ وہ مایوس ہو کر ہوش و ہواس کھو بیٹھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عیش کے وہ سامان مہیا کرنے کا ٹھیکہ بھی منیم جی ہی کے سپرد ہوتا تھا جن پر ان نوابوں کی ساری رقمیں کھل جاتی تھیں۔ ان حالات میں کیا عجب ہے کہ منیم جی کو نسل انسانی کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ تمام سرکاری اعزاز ان پر نچھاور کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں خاندانی روسا کی صفوں میں بھی بیٹھنے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اس طرح نہ صرف رئیسوں کا معاشرتی منصب مضحکہ خیز سمجھا جانے لگا بلکہ اندر سے بھی اس کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔

قدرتی بات تھی کہ یہودی نے اب جو حیثیت حاصل کر لی تھی اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اپنی ترقی کی فکر کرنے لگا۔

آخر کار ایک دن وہ بھی آیا جب یہودی نے بپتسمہ قبول کر لیا۔ اس طرح اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو اس قوم کے نونہالوں کا حصہ تھیں جسے لوٹنے پر اس نے کمر باندھ رکھی تھی۔ یہودی جنگاہ یں اس کا یہ کارنامہ ایک نہایت کامیاب سودا تھا یہودی اکثر یہ سودا کر لیتا تھا۔ یہودی کی اس تجارت کو دیکھ کر کلیسا پھولا نہ سماتا تھا کیونکہ کلیسا کا تو خیال ہوتا تھا کہ دین نے ایک نیا فرزند حاصل کر لیا دوسری طرف یہودی بھی کچھ کم خوش نہ تھا کہ اسکا کرتب کامیاب ہو گیا۔

زبان بدلنے سے شجرہ نسب تو نہیں بدل جاتا

اس مرحلہ پر عالم یہود میں ایک نیا انقلاب آنا شروع ہوا۔ آج تک وہ یہودی تھے یعنی اس وقت تک یہودی کے سوا کچھ اور بننے میں یہودی کوئی خاص فائدہ محسوس نہ کرتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ جن خصوصیات کے باعث وہ دوسری نسلوں سے ممیز تھے انہیں چھپانا اسان نہ تھا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ فریڈرک اعظم کے زمانہ تک یہودیوں کو ایک اجنبی قوم سمجھا جاتا تھا۔ جب عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان نکاح کی قانونی ممانعت ہٹا دی گئی تو مشہور جرمن ادیب گوئٹے نے اس کے خلاف احتجاج کیا

تھا۔ یقیناً گوئٹے کوئی رجعت پسند یا ابن الوقت شخص نہ تھا۔ گوئٹے کی زبان تو نسل اور عقل کے تقاضاؤں کی ترجمانی کر رہی تھی۔ درباری حلقوں میں جو شرمناک واقعات پیش آتے رہتے تھے ان کے باوجود قوم کو ایک طبعی احساس تھا کہ یہودی قوم کے جسم میں باہر سے داخل ہونے والا ایک خارجی کیڑا ہے۔ یہودی کے متعلق قوم کا رویہ قوم کے اسی احساس کا نتیجہ تھا۔

قسمت میں بدا تھا کہ اب تبدیلی آئے گی۔ ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ مہمانی کا لطف اٹھاتے ہوئے یہودی اب اپنے میز بانوں کی زبان ایسی اچھی سیکھ چکا تھا کہ اسے خیال پیدا ہوا کہ اب اپنے یہودی ہونے کی نسبت جرمن ہونے پر زور دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ گو شروع میں یہودی کی یہ حرکت مضحکہ خیز اور حماقت آمیز دکھائی دیتی ہو گی لیکن یہودی ایسا گستاخ اور بے حیا تھا کہ اس نے بلا تکلف اپنا شجرہ نسل طا طائی نسل سے جا ملایا۔ یہودی طا طائی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جرمن ہوں۔ اس طرح ایک ایسی جعل سازی کی بنیاد رکھی گئی جس کے یاجیا نہ پن کی مثال غالباً ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔ یہودی میں جرمنوں کے کردار کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے صرف جرمن زبان کو توڑ مروڑ کر اپنا الوسیدھا کرنا تھا۔ یہودی جب جرمن زبان استعمال کرتا تھا تو اس سے گھن آتی تھی۔ زبان کے سوا جرمنوں کی اور کسی خصلت کا تو یہودی پر سایہ تک نہ پڑا تھا۔ بس جرمن زبان کی مہارت ہی تھی جس کی بنا پر یہودی جرمن ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ لیکن ایک نسلی امت کے ارا کین صرف زبان ہی کے بندھن سے باہم وابستہ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے اتحاد کی اساس خون کے رشتہ پر ہوتی ہے۔ کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہودی اس حقیقت سے خوب واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہودی اپنی بولی کو بچانے سے ایس لاپروا ہے وہاں وہ اپنے خون کو دوسری نسل کے ساتھ غلط ملط ہونے سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔

ایک انسان کو کسی دوسری زبان سیکھنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن نئی

زبان سیکھ کر بھی وہ فقط اپنے پرانے خیالات ہی اس نئی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے۔ نئی زبان سیکھ کر انسان کی فطرت نہیں بدل جایا کرتی۔ اس کا بہترین ثبوت بھی خود یہودی کی ذات شریف ہے۔ یہودی چاہے ہزار زبانیں سیکھ لیے لیکن اس کی یہودانہ فطرت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ یہودی کی نمایاں خصوصیتیں جو کچھ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس وقت تھتیں جب وہ اوسٹیا کے بازاروں میں لاطینی زبان میں گفتگو کر کے گندم فروخت کیا کرتا تھا۔ ان میں اج بھی شوشہ بھر فرق نہیں آیا جبکہ وہ جرمن زبان کی ٹانگ توڑ کر بناسپتی بیچنے کی فکر کرتا ہے۔ وہ بدستور وہی یہودی ہے اگر پولیس کا کوئی افسر یا جرمنی کی موجودہ حکومت کے کسی محکمہ کا ایک اوسط ہیڈ کلرک اس کھلی حقیقت کو شناخت نہیں کر سکتا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ایک طبعی امر ہے۔ جرمنی کی موجودہ حکومت کے سرکاری ملازمین میں سے جس طرح دیوانی کا عملہ ذہانت اور ہر قسم کے جبلی احساس سے عاری ہے ویسا قوم کا اور کوئی طبقہ عاری نہیں۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا ثبوت پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

یہودی بیک وقت شاہ کا مصاحب بھی تھا اور مزدور کا ہمدرد بھی

جس مرحلہ کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں اس مرحلہ پر اگر یہودی نے اچانک یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے ایک جرمن کی جون بدل لینی چاہیے تو اس کی وجہ تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ یہودی نے محسوس کر لیا ہے کہ نوابوں کی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے اس نے اردگرد جھانکنا شروع کیا۔ کہ قوم کے معاشرتی نظام میں کوئی ایسا دوسرا چبوترہ تلاش کیا جائے جہاں وہ آزادی سے اپنا ڈیرہ لگا سکے مزید بریں قوم کی اقتصادی زندگی کے ہر پہلو پر یہودی کا مالی اقتدار اب مسلط ہو چکا تھا کہ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت تک نہ اس کی سابقہ عظیم الشان فتوحات کو قائم رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک اسے شہریت کے کامل حقوق نہ مل جائیں۔ یہودی اپنی پہلی فتوحات کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اور ان میں مزید توسیع کا بھی خواہش مند تھا۔

وجہ یہ تھی کہ یہودی جس قدر کامیابی حاصل کرتا تھا' اتنا ہی اسے اپنی پرانی منزل مقصود تک پہنچنے کی زیادہ خواہش بے چین کرتی تھی۔ اس کی پرانی منزل مقصود دنیا کی بادشاہی تھی جس کا وعدہ اس کے عقیدوں کی رو سے خدا نے اس کے ساتھ زمانہ قدیم سے کر رکھا تھا۔ جب اسے خیال آتا کہ وہ پرانا خواب اس کی آنکھوں کے سامنے پورا ہوا دکھائی دے رہا ہے تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ غرض ان سب وجوہات کی بنا پر یہودی نے تہیہ کرلیا کہ اسے کامل شہری بننے کے لیے پورا زور صرف کر دینا چاہیے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل شہری بننا چاہتا تھا جسے تمام سیاسی اور دیوانی حقوق حاصل ہوں۔

ان حالات میں یہودیوں نے شہروں اور قصبوں کے اندر اپنے مخصوص محلے اور بستیاں ترک کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔

(ط) یوں شاہی دربار کی مصاحبت کرنے والا یہودی اب قوم پرست یہودی بن بیٹھا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہودی نے اعلیٰ حلقوں کی شخصیتوں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ برعکس اس کے وہ حکمرانوں کے طبقہ میں اب پہلے سے بھی زیادہ دخیل کار بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ہاں ان کوششوں کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے یہودی قوم کے عوام میں ہر دل عزیزی حاصل کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ اگر ہم خیال کریں کہ گزشتہ صدیوں میں یہودی قوم کے عوام کے خلاف کن کن جرائم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس نے کس سنگدلی سے بار بار عوام سے ناجائز فائدہ حاصل کیا تھا۔ اس نے عوام کو روٹی سے لاچار کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اگر ہم یہ بھی فراموش نہ کر چکے ہوں کہ لوگ یہودی سے کیسی نفرت کرنے لگے تھے اور اسے کس شدت سے قومی دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ تو پھر ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ آخری سوانگ رچانے کے لیے عوام میں ہر دل عزیزی حاصل کرنا یہودی کے لی کسی کٹھن مہم تھی۔ بلاشبہ جن مظلوموں کی وہ کھال تک اتار چکا تھا ان کے سامنے اپنے آپ کو ہمدرد انسانیت ثابت کرنے کے لیے یہودی کو اپنی تمام قابلیتیں بروئے کار لانے کی حاجت

تھی۔

یہودی کی خیرات میں بھی کرامات چھپی ہوتی ہیں

لہٰذا ماضی میں یہودی قوم کے عوام کے خلاف جن جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا' اب اس نے کھلے بندوں ان کا کفارہ ادا کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنی جون بدلنے کی کاروائی کا آغاز یوں کیا کہ پہلے "محسن انسانیت" کا بھیس بدلا چونکہ ہمدردی کی یہ روش اختیار کرنے سے اس کے پیش نظر ایک واضح مقصد تھا اس لیے وہ انجیل کی اس ہدایت پر عمل کرنے سے معذور تھا کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کی خیرات کا علم نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے عوام کی مصیبتوں کا غم ہلکان کر رہا ہے۔ اور وہ مخلوق کی امداد کرنے کے لیے انتہائی ذاتی قربانیاں کرنے پر آمادہ ہے اس نے اپنی خوبیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا کہ بالآخر دنیا کو سچ مچ اس پر یقین ہو گیا کہ نفس کی یہ شان تو گویا یہودی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اگر چھ لوگ یہودی کی اس کایا پلٹ پر اعتبار کرنے سے انکار کرتے تھے تو ان کی بابت عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا۔ کہ اس کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اس طرح تھوڑا عرصہ بعد یہودی نے ایسا پانسہ پلٹا کہ خود مظلوم کا روپ دھار بیٹھا۔ اور یہ کہنا شروع کیا کہ یہودیوں پر تو ہمیشہ سے ظلم ہوتا آیا ہے ایسے احمقوں کی بھی کمی نہیں جو بدقسمت بے چارے اور غریب یہودی پر سچ مچ ترس کھانے لگے۔

یہاں ایک حقیقت قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ یہودی ذاتی قربانیوں کا دعویٰ اور چرچا کرنے کے باوجود اپنا کوئی مالی نقصان نہیں ہونے دیتا۔ اسے کوئی ایسا گر یاد ہے کہ آخر کار جمع خرچ کی میزان برابر ہی پٹتی ہے۔ بسا اوقات تو وہ اس سخاوت کی وہ مثال ہتی ہے جیسی اس کھاد کی جو صرف اس لیے کھیت میں نہیں ڈالی جاتی کہ اسے زائد فضلہ تصور کرتے وئے باہر پھینکنے کی حاجت ہوتی ہے۔ بلکہ اس لیے ڈالی جاتی ہے کہ اس سے پیداوار میں آئندہ اضافہ کی توقع ہوتی ہے۔ بہر حال کچھ عرصہ بعد دنیا کو یہ یقین دلانے

میں بڑی کامیابی حاصل ہو گی کہ یہودی تو بڑا محسن اور ہمدرد بن چکا ہے۔ اللہ اللہ یہ کتنا بڑا انقلاب تھا۔

وہی خدمات کہ جو دوسرے لوگ انجام دیں تو ایک فطری عمل متصور ہوتی ہیں جب کسی یہودی سے ظہور میں آتی تھیں تو دنیا حیران ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ان خدمات کو محض اس لیے سراہا جاتا تھا کہ ایک یہودی سے تو اس کی توقع نہ تھی یہی وجہ تھی کہ عام انسانوں کی نسبت یہودی کی ہمدردی زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی تھی۔

یہودی نے ''ملکیت'' اور ''ملازمت'' کا مفہوم مسخ کر دیا ہے

پھر معاملہ یہیں پر ختم نہ ہو گیا۔ یکلخت یہودی ترقی پسند بھی بن بیٹھا۔ اس نے یہ چرچا شروع کر دیا کہ ارتقائے انسانی کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک جہاں نو کی تعمیر کا علم بردار بن بیٹھا۔

اسی دوران میں جس اقتصادی نظام سے قوم کے عملی مفاد سب سے زیادہ وابستہ ہیں یہودی نے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہودی نے مختلف قومی کاروباروں میں حصے خریدنے شروع کیے۔ اس طرح یہودی کو قومی دولت پیدا کرنے والے حلقوں میں رسوخ حاصل ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے قومی پیداوار سٹہ بازی اور نفع اندوزی کے اصول پر بیچنی شروع کی۔ غرض قوم جو اجناس پیدا کرتی تھی وہ یہودی کے لیے قمار بازی کے ذرائع سے زیادہ شہرت حیثیت نہ رکھتی تھی۔ یوں یہودی نے وہ بنیاد ہی کھوکھلی کر دی جس پر قومی ملکیت کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ یہودی ہی کی برکت ہے کہ مزدور اور آقا میں وہ بیگانگی پیدا ہونی شروع ہو گئی جس نے بعد میں طبقاتی کشمکش کی سیاسی صورت حال اختیار کر لی۔

انجام کار سرمایہ کی منڈیوں پر تسلط ہونے کے باعث یہودی تمام اقتصادی کاروبار میں روز افزوں نفوذ حاصل کرتا چلا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی یہودی قوم کی عملی قوتوں پر مالکانہ حقوق حاصل نہ کر سکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ قوم کی قوت کار پر پورا قابو حاصل کر

چکا تھا۔

''رواداری'' اور ''رائے عامہ'' چال بازی کے نعرے ہیں

اپنی سیاسی حیثیت مزید مستحکم کرنے کی خاطر اب یہودی نسلی اور قومی امتیاز کو مٹانے کے درپے ہوا۔ کیونکہ یہ امتیاز ہر پہلو سے اس کی ترقی میں حائل تھا۔ اس مقصد کے لیے یہودی نے اپنی مخصوص ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذہبی رواداری کا پرچار شروع کیا۔ اس مرحلہ پر فری میسن کی تنظیم کامل طور پر یہودی کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ مذہبی رواداری کے بہانے نسلی وقومی امتیاز کو ختم کرنے میں یہ تنظیم یہودی کی مقصد برآری کے لیے نہایت کارآمد حربہ ثابت ہوئی۔ کھاتے پیتے لوگ سیاست وتجارت کے اعلیٰ حلقے اور حکام فری میسن کے جال میں پھنس کر باآسانی یہودی کا شکار ہو گئے۔ انہیں خود شائبہ بھی نہ ہوا کہ ہو کیا رہا ہے۔

صرف قوم کے عوام انہیں اب اپنی قوت کا احساس ہو رہا تھا' اور جنہوں نے حال ہی میں اپنے اختیارات وحقوق کے تحفظ کے لیے لڑنا شروع کیا تھا۔ تاحال یہود کے پنجہ میں گرفتار ہونے سے بچے ہوئے تھے۔ کم از کم یہودی کا رسوخ فی زمانہ الحال نہ عوام کی تہ تک پہنچا تھا اور نہ ان پر پوری طرح حاوی تھا۔ یہودی اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا۔ یہودی کی حکمت عملی کو منڈھے چڑھانے کے لیے سب سے ضروری مسئلہ یہ تھا کہ عوام پر قابو پایا جائے۔ یہودی کو بخوبی علم تھا کہ سلطانی جمہور کے منصب پر قابو ہونے سے قبل اسے کچھ نقیب حاصل کرنے ہوں گے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ اگر کھاتے پیتے لوگ وسیع تعداد میں اس کے مرید بن گئے تو انہیں میں سے نقیب بھی ڈھونڈ لیے جائیں گے۔ لیکن فری میسن کی تنظیم کے ذریعہ یہودی نے جو نفیس جال پھیلایا تھا اس میں جولاہے اور چمرنگ نہ پھانسے جاسکے۔ ضرورت محسوس ہوء کہ ان لوگوں کے لیے کوئی زیادہ اور موثر اور سخت قسم کے ذرائع اختیار کیے جائیں اس کام کے لیے فری میسن کے علاوہ اور کسی ہتھیار کی حاجت محسوس ہوئی۔ یہودی نے فیصلہ کیا کہ اس نئے ہتھیار کی

ضرورت اخبارات سے پوری کرنی چاہیے۔غرض یہودی نے اپنی ثاقب قدمی اور ہوشیاری سے کام لے کر صحافت پر قبضہ جمالیا۔رفتہ رفتہ اخبارات کے ذریعہ یہودی کی زندگی کے ہر پہلو پر مستولی ہوگیا۔یہودی نے حصول مقصد کے لیے جو رواہ منتخب کی تھی اس پر سفر طے کرنے کی خاطر اس نے تازیانہ صحافت سے کام لینا شروع کیا۔اب یہودی وہ طاقت حسب منشا پیدا کر سکتا تھا جس آج کل رائے عامہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔لیکن آج سے چند قرن پہلے اس کا یہ نام چنداں رائج العام نہ تھا۔

ادھر یہ کارروائی جاری تھی۔اور ادھر یہودی نے اپنے آپ کو متلاشی علم ظاہر کرنا شروع کیا۔یہودی ہر پہلو سے ''ترقی'' کی تعریوں کے پل باندھنے لگا۔وہ ترقی کے ان پہلوؤں کا تو بالخصوص چرچا کرتا تھا۔جس سے اس کے سوا دوسروں کی تباہی ہو رہی تھی۔ یہودی ہر ترقی اور نشوونما کا جائزہ اس معیار سے لیتا ہے کہ ان سے اس کی قوم کو کیا فائدہ پہنچے گا۔جب اسے کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو تو وہ علم کا دشمن بن جاتا ہے۔وہ ہر ایسی تہذیب کا دشمن ہے جو چاہے حقیقی تہذیب ہو۔لیکن جس میں اس کے نفع کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو وہ دوسروں کے مدرسوں سے جو علم حاصل کرتا ہے اسے صرف اپنی نسل کو ناجائز فائدہ پہنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

یہودی نسی حمیت کا دشمن ہے

اب یہودی پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو کر اپنی یہودی قوم کے تحفظ میں مصروف تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ ''عرفان'' ''ترقی'' ''حریت'' اور ''انسانیت'' کا وظیفہ ہر وقت بڑبڑاتا رہتا تھا، لیکن درحقیقت اب بھی اسکی اولین کوششیں اپنی قوم کی نسلی وحدت کو برقرار رکھنے پر مرکوز تھیں۔گاہے بگاہے وہ کسی بارسوخ عیسائی کو پھانسنے کے لیے اس کی خدمت میں کوئی یہودی عورت بطور تحفہ پیش کر دیتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہودی مردوں کا نسلی شجرہ نسب ہمیشہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک رکھا جاتا تھا۔یہودی دوسروں کے خون سے تو آمیزش کر دیتا تھا، لیکن اپنا خون ملاوٹ سے محفوظ رکھتا تھا۔یہودی کبھی کسی عیسائی

لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔ لیکن عیسائی یہودی لڑکیوں کو بیوی بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جو دوغلی نسل پیدا ہوتی ہے وہ ہمیشہ یہودیوں کی طرف داری کرتی ہے۔ اس عمل سے بلند پایہ روسا کی ایک خاص تعداد تو بالکل ہی انحطاط پذیر ہو گئی۔ یہودی اس حقیقت سے خوب واقف تھا۔ کہ وہ اپنی حریف نسل کی فکری قیادت کو مفلوج کرنے کے لیے یہ طریقہ استعمال کرتا تھا۔ اپنی چالوں پر پردہ ڈالنے اور اپنے شکار کو احمق بنانے کے لیے یہودی نسل و رنگ سے قطع نظر مساوات آدم کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ یہ دنیا میں ایسے سادہ لوح بھی موجود ہیں جو سچ مچ یہودی کے نعروں پر یقین لے آتے ہیں۔

چونکہ یہودی کی فطرت میں آج بھی اجنبی خصلتوں کی ایسی تیز بدبو باقی ہے کہ اگر عوام کو اس کے نزدیک دیکھ پائیں تو شاید ہی پھر کبھی اس کے جال میں پھنسنے پر آمادہ ہوں اس لیے یہودی اخبارات کو استعمال میں لاتے ہوئے جمہور کے سامنے اپنی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو حقیقت حال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن اس کی مطلب برآری کے لیے تیر تہدف ہے۔ مزاحیہ اخبارات کے ذریعہ بالخصوص میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دوسری نسلوں کی طرح ان میں بھی بعض انوکھی عادتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہودی ایک بے ضرر سی نسل ہیں۔ چاہے ان کے اخلاق و عادات اچنبا کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی مزاحیہ اخبارات کہتے ہیں کہ یہودی دل کا نیک اور طبیعت کا معزز ہے۔ یوں بھی عام طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ یہودی کو بے حقیقت ثابت کر کے اس کے خطرناک ہونے کو پوشیدہ رکھا جائے۔

یہودی کی نشو و نما کے اس دور میں اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ جمہوریت کو فتح حاصل ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ پارلیمنٹری نظام حکومت کی فوقیت مسلم ہو جائے۔ یہودی کے ذہن میں جمہوریت کا جو تصور ہے وہ پالیمنٹری نظام حکومت کے سوا اور کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ پارلیمنٹری نظام حکومت یہودی کے ارادوں کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ

ان نظام حکومت میں شخصیت کا عنصر تو خارج ہو جاتا ہے۔ اوراس کی جگہ حماقت مآب اکثریت نا اہلیت اور فریب کاری کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ سوائے ملوکیت کے خاتمہ کے اور کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔ ملوکیت نے تو بہر حال دیر یا زود ختم ہونا ہی تھا۔

ملازمین کو پنشن دینے کا رواج کیسے چلا تھا؟

(ی) یہی وہ زمانہ تھا جب اقتصادی ترقی نے قوم کے معاشی نظام کی کایا پلٹ دی۔ دستکاروں کا قلیل طبقہ آہستہ آہستہ مٹتا گیا اور ان کی جگہ کارخانوں کے مزدوروں نے لے لی۔ کارخانوں کے ان مزدوروں کو اپنا آزادانہ وجود قائم کرنے کی کوئی موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ وہ تو روز بروز کنگلوں کی ایک فوج کی صورت اختیار کرتے جارہے تھے۔ کارخانہ کے مزدور کی ایک ناگزیر خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے روزگار کی کوئی ایسی مستقل سبیل نہیں ڈھونڈ سکتا جو بڑھاپے میں اس کی ایک ٹیک بن سکے۔ وہ سچ مچ قوم کا عاق شدہ فرزند ہے۔ اس کا بڑھاپا اس کے لیے عذاب سے کم نہیں۔ اس کی پچھلی عمر کی زندگی کو تو زندگی کہنا بھی درست نہ ہوگا۔

پرانے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ ایسی ہی صورت حال پیدا ہوگی تھی جس کا حل تلاش کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اور آخر کار ایک حل ڈھونڈ ہی لیا گیا تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ کاشتکاروں اور دستکاروں کے پہلو بہ پہلو بتدریج منصب داروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کا ایک طبقہ بھی وجود میں آ گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر مختلف محکموں کے سرکاری ملازمین شامل تھے۔ یہ طبقہ بھی صحیح معنوں میں قوم کا عاق شدہ فرزند کہلانے کا مستحق تھا۔ اس موقعہ پر سرکار نے اس ناگوار صورت حال کا یہ حل تلاش کیا کہ جس سرکاری ملازم کی بابت ثابت ہو جائے کہ بڑھاپے میں اس کے معاش کا اب کوئی سہارا باقی نہیں رہا تو اس کی کفالت کے فرائض خود سرکار انجام دیا کرے گی۔ اس طرح پنشن اور ریٹائر ہونے کے بعد وظیفے کا دستور قائم ہو گیا۔ انفرادی کاروبار میں بھی روز افزوں

ملازمین کو پنشن دینے کا رواج ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ آج کل ہر مستقل ملازمت پیشہ کو بڑھاپے میں پنشن ملتی ہے بشرطیکہ وہ جس کاروبار میں کام کرتا ہے اس کی حیثیت ایک خاص معیار سے بلند ہو یا کم از کم اس معیار تک پہنچ چکی ہو۔ یہ سرکاری ملازمین کو ان کے بڑھاپے میں امداد دینے کی ذمہ داری قبول کرنے کا ہی پھل تھا کہ ان میں ایسا اعلیٰ پایہ کا ایثار اور فرض شناسی پیدا ہو گئی جو زمانہ قبل از جنگ میں جرمن سرکاری ملازمین کا طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح ایک پورا طبقہ جس کی کوئی ذاتی ملکیت نہ تھی افلاس سے بچا لیا گیا۔ اس بچاؤ کے لیے جو نظام کھڑا کیا گیا وہ ذہانت کا ثبوت تھا۔ یہ نظام اب قوم کی معاشرتی تنظیم میں ایک اہم حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

مزدوروں کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے

ایک دفعہ پھر ایک ایسا ہی مسئلہ اب بھی سرکار اور قوم کے سامنے درپیش ہے۔ لیکن اس دفعہ یہ مسئلہ پہلے کی نسبت بہت بڑے پیمانے پر درپیش ہے۔ جب نئی نئی صنعتیں وجود میں آئیں اور نشو و نما پانے لگیں تو لکھوکھہا انسان مضافات اور دیہات میں ترک وطن کر کے کارخانوں میں ملازمت کی تلاش کرنے آ پہنچے۔ ان مزدوروں کو جن حالات میں زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ وہ زبوں حالی سے بھی کسی بدتر نام کے مستحق تھے۔ پرانے زمانے میں کاشتکار اور دستکار جس طریقہ سے کام کیا کرتے تھے اس کا مقابلہ اس جانکاہ محنت سے نہیں کیا جا سکتا جو اب کارخانہ کے مزدور کرنے پر مجبور تھے۔ پرانے مزانہ کی مزدوری میں وقت کو ایسی زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن صنعت سازی کے جدید نظام کے ماتحت وقت اہم ترین عنصر کی صورت اختیار کر گیا۔ پرانے زمانہ میں کام کرنے کو جو اوقات مقرر تھے اب صنت سازی کے دیوزاد کارخانوں میں بھی انہیں اوقات کو رواج دے دیا گیا۔ اس سے مہلک نتائج برآمد ہوئے۔ اس سے پہلے ایک خاص وقت میں جو کام انجام دیا جا سکتا تھا وہ مقابلتاً بہت قلیل تھا کیونکہ تب کارگزاری کی رفتار اتنی سرگرم

نہ ہوسکتی تھی کہ جتنی اب عہد حاضر کے طریقوں سے ممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم نظام کے ماتحت چودہ یا پندرہ گھنٹے یومیہ کی خدمت گزاری نا قابل برداشت نہ تھی۔ لیکن بحالات موجودہ اتنا عرصہ کام کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ کیونکہ اب تو ایک ایک لمحہ میں پوری سختی سے محنت کرنی پڑتی تھی۔ پرانے اوقت کا یوں جدید حالات پر اطباق دو لحاظ سے مہلک ثابت ہوا۔ ایک تو اس طرح مزدوروں کی صحت تباہ ہوگئی۔ دوسرے اس وجہ سے مزدوروں کو یہ اعتبار نہ رہا کہ ملک میں انصاف کے کسی قانون کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مزدوروں کو تو حقیر سی مزدوری ملتی تھی اور آقا کو پہلے سے بدرجہا زیادہ نفع ہو رہا تھا اس وجہ سے طرفین کے بود و باش اور طرز زندگی میں بھی زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا۔

دیہات کی کھلی فضا میں کبھی کوئی معاشرتی مسئلہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں تو زمیندار اور مزارع دونوں مل جل کر یکساں محنت کرتے تھے۔ وہ ایک ہی سی غذا کھاتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات ایک ہی دستر خوان پر ہم نوالہ بن کر بھی بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن جدید نظام کے ماتحت زندگی کے معاشرتی پہلو کے لحاظ سے بھی مزدور اور کارخانہ دار کے حالات میں بڑا فرق پیدا ہو چکا تھا۔

ہاتھ سے محنت کرنے میں کوئی عار نہیں!

آج بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ خواجہ و بندہ کی یہ باہمی تفریق ابھی زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت نہیں کر پائی۔ خواجہ و بندہ کی یہ تمیز دراصل یہود کی خصوصیت ہے۔ ہماری قوم یہودیوں کی اس بد عادت کی کسی حد تک شکار ہو چکی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ہاتھ سے محنت کرنے والے کی نہ صرف کوی عزت نہیں بلکہ اسے کسر شان سمجھا جاتا ہے۔ یہ روش جرمنوں کی فطرت کے مطابق نہیں۔ ہماری قوم میں اس رسم کے رواج پانے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگیوں میں ایک خارجی اثر داخل ہو چکا ہے۔ یہ خارجی اثر یہود کے خیالات نے پیدا کیا ہے۔ کبھی ہماری قوم میں دستکاروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

اب اس قدیم دستور کی جگہ یہ خیال پھیل گیا ہے کہ جسمانی محنت کرنے سے انسان کمینہ اور ذلیل بن جاتا ہے۔

اس طرح قوم کے اندر ایک نیا معاشرتی طبقہ پیدا ہو گیا ہے جسے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ عادت اسی طرح جاری رہی تو ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ کیا یہ طبقہ قوم کے معاشرتی نظام میں شامل ہے۔ یا معاشرتی مرتبہ کا فرق ایک ایسی خلیج ہے جو اس طبقہ کو ہمیشہ کے لیے دوسرے طبقات سے جدا کر دے گی۔

ایک بات بہر حال یقینی ہے وہ یہ ہے کہ قوم کے بدترین عناصر ہرگز اس طبقہ میں شامل نہیں بلکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ یعنی اس طبقہ میں قوم کے سب سے زیادہ چست اور چاق و چوبند عناصر شامل ہیں۔ نام نہاد تہذیب و تمدن نے جو بے یقین چاروں طرف پھیلا رکھی ہے۔ اس کا تخریبی اور پست کن اثر ابھی تک اس طبقہ پر نہیں پڑا۔ اس جدید پنچ ذات کی کثیر تعداد ہاتھ سے محنت کرنے والے مزدوروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ابھی تک امن پرستی کے خلل دماغ کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ ہٹے کٹے ہیں اور ضرورت پڑے تو وحشیانہ پن سے بھی خالی نہیں۔

سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھانے والے بھی سرمایہ دار ہیں

ہمارے متوسط طبقہ کے کھاتے پیتے لوگوں نے تو اس اہم مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی اور لاپروائی سے حالات کو اپنی روش پر چلنے دیا۔ لیکن یہودی نے پوری مستعدی سے لپک کر صورت حال کے ان امکانات سے فائدہ اٹھایا جو اس کے مستقبل کے لیے انتہائی مفید ہو سکتے تھے۔ ایک طرف تو یہودی نے ناجائز منافع اندوزی کے لیے سرمایہ دار کے طریقہ کار کی تنظیم کو انتہائی معراج تک پہنچا دیا اور دوسری طرف اپنے اقتدار اور پالیسی کے شکار یعنی مزدوروں' کو خود اپنے ہی خلاف بھڑکا کر' ان کی جدوجہد کی قیادت بھی یہودی نے ہی سنبھال لی۔ جب ہم کہتے ہین کہ یہودی نے اپنے خلاف تحریک کی

قیادت خود سنبھال لی تو مخالفت کا مفہوم لغوی نہیں بلکہ یہ لفظ محض استعارہ کے رنگ میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کذاب عظمیٰ اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر کے دوسروں کو گناہ گار ثابت کرنے کا فن خوب جانتا ہے۔ چونکہ اس بے حیا نے اپنے خلاف تحریک میں عوام کی رہنمائی خود کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی' اس لیے یہ تو کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ وہ ایک ایسے پاجیانہ فریب کا نشانہ بن رہے ہیں جس کی مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ درحقیقت وہ ایک ایسے ہی بے نظری مکر کا شکار بنائے جا رہے تھے۔

جوں ہی عام اقتصادی صورت حال کے باعث یہ نیا طبقہ وجود میں آ گیا' اور معاشرتی نظام میں اس کا ایک علیحدہ مقام معین ہو گیا' تو یہودیوں نے فوراً بھانپ لیا کہ انہیں خود اپنی ترقی جاری رکھنے کے لیے ''نقیب'' کہاں سے مل سکتے ہیں اب اس نے مزدوروں کو کھاتے پیتے لوگوں کے خلاف آلہ کار بنایا۔ جس طرح اس نے کھاتے پیتے لوگوں کی آڑ میں سازشیں کر کے خود شہری حقوق حاصل کر لیے تھے اسی طرح اسے توقع تھی کہ مزدور زندہ رہنے کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں اس میں شمولیت اختیار کر کے بالآخر تحریک پر اپنا قبضہ جما لوں گا۔

اگر کبھی سچ مچ ایک دن ایسا آ گیا کہ یہودی کی امنگیں بر آئیں تو مزدوروں کی ساری کوششوں کا مقصد صرف یہ رہ جائے گا کہ نسل یہود کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ مزدور انجان پنے سے اپنی طاقت کے ہاتھ سے کھیل رہا ہے جس کے خلاف وہ سمجھتا ہے کہ لڑ رہا ہے۔ بظاہر مزدور کو سرمایہ کاری کے مفاد کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سرمایہ کاری کے خلاف منظم نعرے بلند کیے جاتے ہیں' لیکن انجام کار ان نعروں کو اقوام کی اقتصادی خودمختاری تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اقتصادیات کا قومی نظام برباد کر کے اس کی جگہ بین الاقوامی سرمایہ داری کا قلعہ تعمیر کر دیا جائے۔

کمیونزم کیسے ایجاد ہوا؟

یہ کام انجام دینے کے لیے یہودی نے حسب ذیل طریقہ اختیار کیا:

یہودی نے مزدور کے سامنے کورنش بجا لانی شروع کی۔ وہ مزدور پر اور مزدور کی قسمت پر ترس کھانے کا منافقانہ بہانہ کرنے لگا۔ حد یہ ہے کہ مزدور کی غربت اور زبوں حالی پر یہودی غم وغصہ کا اظہار کرنے لگا۔ یہ تھیں وہ چالیں جن سے یہودی نے مزدور طبقہ کا اعتماد حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ یہودی ایسے ظاہر کرتا تھا کہ گویا وہ مزدوروں کی تکالیف کی مختلف نوعتیں معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ اس میں یہ کوئی تمیز نہ تھی کہ کون سی شکایات خیالی ہیں اور کون سی حقیقی۔ یہودی نے مزدوروں میں یہ خواہش پیدا کرنی شروع کی۔ کہ جن حالات کے ماتحت ان کو زندگی بسر کرنی پڑتی ہے ان میں تبدیلی آنی چاہیے۔ یہودی بڑی عیاری کے ساتھ معاشرتی انصاف کی اس حس کو مشتعل کرتا تھا جو آریاء کردار کی ایک مخصوص نشانی ہے۔ جوں ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا پھر اس احساس کو ان لوگوں کے خلاف منافرت کے جذبہ میں بدل دیا جاتا جن کی زندگی کے حالات بہتر تھے۔ اگلا قدم یہ تھا کہ معاشرتی خرابیوں کے دور کرنے کی جدوجہد کو واضح فلسفیانہ رنگ دے دیا گیا۔ یہی ضرورت پوری کرنے کے لیے مارکس ازم کا عقیدہ اختراع کیا گیا۔

مارکس ازم کے اصولوں کو معاشرتی حقوق ہی کے نفاذ کی مہم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہودی کو ان اصولوں کا اثر چرچا کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ لیکن اسی طریقہ کار کے باعث یہودی شرفا کی جانب سے مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ شرفاء ان مطالبات کو اس شکل میں اور ایسی نام نہاد فلسفیانہ آمیزش کے ساتھ قبول کرنے کے منکر تھے۔ کیونکہ وہ اس فلسفیانہ آمیزش کے ساتھ اور اس شکل میں ان مطالبات کو غیر منصفانہ اور ناممکن العمل تصور کرتے تھے۔ چرچا تو ہے کہ صرف معاشرتی اصلاح کار لیکن اس کے پیچھے شیطانی اغراض چھپی ہیں۔ یہ شیطانی مقاصد کھلے طور پر

اور عریاں بے حیائی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں مارکس ازم کے اصول انسانی دانش اور انسانی حماقت کا ایک بے نظیر مرکب ہیں۔ لیکن یہ مجموعہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ صرف اس کی حماقتوں ہی کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اس کے دانش مندانہ حصے پر عمل ناممکن ہے۔ مارکس ازم فرد کی شخصی قدر و منزلت کا حتمی انکار کرتا ہے۔ مارکس ازم قوم کی نسلی بنیادوں اور قومیت کا بھی قائل نہیں۔ شخصیت اور قومیت کو اس طرح پس پشت ڈال کر مارکس ازم تہذیب وتمدن کی بنیاد اور جڑ پر کلہاڑا چلاتا ہے۔ کیونکہ تہذیب وتمدن کا تو انحصار ہی شخصیت اور قومیت پر ہے۔ اگر ضابطہ حیات کے لفظ کا اطلاق مجرمانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والے اوہام پر بھی کیا جا سکتا ہے تو یہ ہے مارکس ازم کے ضابطہ حیات کا اصل لب لباب شخصیت اور نسل کے تصورات ختم کر دیے جائیں تو معاشرت کے نظام پر ادنیٰ معاشرتی عناصر، یعنی یہودیوں کے تسلط کے راستہ سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔

مارکس ازم کے عقیدہ کے اقتصادی اور سیاسی نظریات کی بے ہودگی ہی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان نظریات کو ثابت کرنے کے لیے جو نام نہاد منطق استعمال کی جاتی ہے اسے قبول کرنے سے ذہین لوگ تو انکار کر دیتے ہیں لیکن جو اشخاص اپنے ذہنی قویٰ کے استعمال کے عادی نہیں، یا جنہیں اقتصادی اصولوں کا صرف سطحی علم ہے، وہ ناچتے ہوئے کمیونسٹ جھنڈے کے نیچے جا کھڑے ہوتے ہیں کمیونسٹ تحریک کو بھی زندہ رہنے کے لیے کسی ذہن کی حاجت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پس پردہ بیٹھ کر یہودی کا ذہن تاریک ہلاتا ہے۔ قدرتی بات یہ ہے کہ یہودی یہ گراں قدر خدمت بھی بغیر کسی معاوضہ کے ہی انجام دیتا ہے۔ یہودی کی یہ قربانی بھی اسکے ایثار کی ایک عملی مثال ہے۔

اس طرح ایک ایسی تحریک کھڑی کر دی گئی ہے جس میں زیادہ تر ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور شامل تھے اور جس کی قیادت یہودیوں کے قبضہ میں تھی۔ بظاہر یہ تحریک ان

حالات کو بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے جن کے ماتحت مزدوروں کو زندگی بسر کرنی پڑتی ہے لیکن دراصل اس تحریک کا مقصد غیر یہودی نسلوں کو غلام بنا کر تباہ کر دینا ہے۔

کمیونزم تشدد سے پنپتا ہے

نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں پہلے فری میسن جو چرچا پھیلایا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فری میسن کی امن پرستی کی تلقین نے تعلیم یافتہ طبقہ میں سے تحفظ قوم کا جبلی احساس ختم کر دیا۔ اب یہی تلقین اخبارات کے ذریعہ سے عام مزدوروں اور کھاتے پیتے طبقہ میں پھیلائی جانے لگی۔ اخبارات کے قریب قریب ہر جگہ یہودیوں کے قبضہ میں تھے۔ یہودیوں نے اپنی دو مذکورہ بالا تخریبی چالوں کے ساتھ ایک تیسری چال بھی شامل کر لی جو پہلی دونوں چالوں سے زیادہ سنگدلانہ تھی۔ وہ تیسری چال یہ تھی کہ عوام کو مرعوب کرنے کی خاطر وحشیانہ جسمانی طاقت کو منظم شکل دے دی گئی۔ کمیونسٹوں کی فوجیں عسکری رسالوں کی طرح معاشرتی نظام کے ان مورچوں پر ہلے بول دیتی تھیں، جو ان کے پہلے دو حملوں سے فتح نہ ہوئے تھے ان تمام مختلف طاقتوں کو بھڑکا کر جس کاریگری سے بیک وقت ان سے کام لیا گیا اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کاریگری نے بیک وقت ان سے کام لیا جو ادارے ہمیشہ سے سرکاری اقتدار کے روایتی امانت دار رہے ہیں اگر ان حالات میں ان پر بھی کمیونسٹوں کا تسلط ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں ہو گی سوائے الا ماشاء اللہ کے یہودی کو اپنی تباہ کاری کی مہم چلانے کے لیے آسانی حکومت کے بلند پایہ بلکہ اعلیٰ ترین افسروں میں سے نہایت فرمابردار قسم کے آلہ کار مل جاتے ہیں۔ یہ حکام ہمیشہ افسران بالا کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور ماتحتوں کے سامنے غرور تکبر سے ابرو کشیدہ نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی حماقتیں دیکھ کر ہول آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہر وقت اتنے بر خود غلط اور بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

سرکاری حکام کی یہ خصوصیتیں یہودی کو ان کے ساتھ نمٹنے میں بڑی مدد دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہودی سرکاری افسروں کو ہمیشہ انہی صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد جو کشمکش شروع ہوئی اگر مجھے اس کا سرسری نقشہ کھینچنا ہو تو میں اسے حسب ذیل صورت میں بیان کروں گا۔

یہودی نے اقتصادی لحاظ سے دنیا کو تسخیر کرنے پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اسے دنیا کی سیاسی تسخیر کا بھی شوق چرایا۔ یہودی کمیونزم کے بہانے سے عوام کی تنظیم کر کے جو اقتدار حاصل کرتا ہے اسے دو نوعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اقتدار کی یہ دو اقسام ان دو جداگانہ مقاصد کو حل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جن کو عملی جامہ پہنانا یہودی کے زیر سایہ اس ساری جدوجہد کا اصل منشا ہے۔ بظاہر یہ دونوں مقاصد دو مختلف تحریکوں کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ دونوں مقاصد کے مفہوم میں کامل اتحاد ہے ان دونوں مقاصد میں سے پہلا مقصد تو سیاسی تحریک کی کامیابی ہے اور دوسرا مقصد ٹریڈ یونینوں کی تحریک کی فتح یابی ہے۔

مزدور کی ہمدردی سرمایہ دار کے اقتدار کی سیڑھی کس طرح بنتی ہے؟

ٹریڈ یونینوں کی تحریک سے رنگروٹ بھرتی کیے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو رمق جان برقرار رکھنے کے لیے روزی کمانے کی خاطر جو جانکار جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ٹریڈ یونینوں کی تحریک اس جدوجہد میں ان کو مدد دیتی ہے' اور ان کی پشت پناہ کرتی ہے۔ مزدوروں کو اس جدوجہد کی ضرورت محسوس ہونے کے باعث لالچی اور تنگ نظر کارخانہ داروں کی کثرت ہے۔ یا تو مزدور زندگی کی ان آسائشوں کو بھی ترک کر دیں جن کے بغیر فطرت انسانی کی غیرت وحمیت کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکتے اور اپنے آپ کو بالکل ان آقاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جنہیں اکثر و بیشتر انسانی ذمہ داریوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا اور جو ایسے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں انسان کی حاجت مندی کی ذرہ بھر پرواہ نہیں ہوتی اور پھر یا مزدور مجبور ہو کر اپنے مفاد کی حفاظت کا بیڑا خود اٹھائیں

کیونکہ تمدن و معاشرت کا نظام، یعنی جسر کار، تو مزدور کی ضروریات سے سراسر غافل ہے۔

نام نہاد ''قوم پرست'' کھاتے پیتے لوگ بھی اپنی مادی ضروریات سے اندھے ہو کر مزدور کی زندگی یا موت کی جدوجہد میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور مزدور کے راستہ میں سخت مشکلات کی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ایسے تمام قوانین بنانے کی مخالفت کرتے ہیں جن سے کارخانوں میں مزدوروں کی محنت کے اوقات کم کرنے کی کوشش کی جائے (حالانکہ آج کل کارخانوں میں مزدوری کے اوقات ایسے طویل ہیں کہ ان سے مزدوروں کے خلاف انسانیت ظلم ہوتا ہے) یا جن کے ذریعہ بچوں کو مزدوری سے منع کیا جائے، یا ج کے ماتحت مزدوری کرنے والی عورتوں کی حفاظت اور امداد کا بندوبست کیا جائے، یا جن کی رو سے مزدوروں کے مکانات اور کارخانہ جات میں حفظان صحت کے انتظامات کو ترقی دی جائے۔ جب کھاتے پیتے لوگ اس ٹال مٹول میں منہمک ہوتے ہیں تو چالاک یہودی مظلوموں کی وکالت کا بیڑہ اٹھاتا ہے۔ یہودی بتدریج ٹریڈ یونین تحریک کا لیڈر بن جاتا ہے۔ یہ کام اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کیونکہ اسے مخلصانہ طور پر معاشرتی نقائص کی اصلاح کی تو فکر ہے نہیں۔ اسے تو صرف ایک دھن سمائی ہوئی ہے یعنی پیرووں کی ایک ایسی جماعت جمع کی جائے اور منظم کی جائے جو اس کے احکام کے ماتحت خودمختارانہ قومی اقتصادی نظام کو برباد کرنے کے لیے ایک موثر حربہ ثابت ہو۔ مسئلہ کا معقول حل تو صرف یہ تھا کہ دو مقاصد پیش نظر رکھ کر کوئی اعتدال کا راستہ دریافت کیا جاتا۔ پہلا مقصد تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی صحت اور خوشحالی کا ایک مناسب معیار قائم ہو جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی اقتصادی خودمختاری کے تحفظ کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے۔ یہودی نے ان دونوں مقاصد میں سے کسی ایک کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔ اس کی بڑی کوشش یہ ہے کہ ان دونوں مقاصد کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔ قومی اقتصادی نظام کی خودمختاری کی حفاظت کے بجائے وہ

اسے برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے بحیثیت ٹریڈ یونین تحریک کا لیڈر ہونے سے اسے ایسے طالبات پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی جو نہ صرف تحری کے مبینہ مقاصد سے تجاوز کرتے ہیں بلکہ قوم کے اقتصادی نظام کو تباہ کیے بغیر پورے ہی نہیں ہو سکتے۔ علی ہذا القیاس یہودی کو قوم کی صحت اور تنومندی کی نشو ونما کا بھی کوئی خیال نہیں اگر قوم بے سوچ سمجھے ہانکے جانے والے مویشیوں کا ایک ریوڑ بن جائے تو یہودی مطمئن ہوگا کہ اب ان کو مطیع کرنا زیادہ آسان ہے چونکہ یہودی کی اصل نیت یہ ہے کہ اس وجہ سے وہ بے ہودہ سے بے ہودہ مطالبات پیش کرنے سے بھی نہیں جھجکتا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ مطالبات کبھی پورے نہیں ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اس وجہ سے ان مطالبات کو پیش کرنے سے اصل صورت حالات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہاں زیادہ سے زیادہ ان مطالبات کا اثر یہ ہوسکتا ہے کہ عوام میں بے چینی پھیلا دی جائے۔ عوام میں بے چینی پھیلانا ہی اس چرچے سے یہودی کا اصل مقصد بھی ہے۔ یہودی دیانت داری سے معاشرتی حالات میں کسی حقیقی اصلاح کا طالب ہرگز نہیں۔

سیاست میں ڈنڈے کا مقام

جب تک عوام کو انتہائی وسیع پیانے پر حقیقت حال سے واقف کرنے کی مہم نہیں چلائی جاتی تب تک یہودی ٹریڈ یونین تحریک کا مسلمہ لیڈر بنا رہے گا۔ ایسی مہم کے ذریعہ عوام کو ان کی زبوں حالی کے اصل اسباب سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر اگر سرکار یہودی اور اس کی کارستانیوں کا خاتمہ کر دے تو اس صورت میں اس فتنہ سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ جب تک عوام کی لاعلمی کی وہی حالت رہے گی جو آج کل یہ اور جب تک سرکار عوام کی تکالیف سے ویسی ہی غافل رہے گی جیسی آج کل غافل ہے تب تک جمہور تو اس لیڈر کی پیروی پر آمادہ رہیں گے جو اقتصادی مسائل میں ان کے سامنے زیادہ سے زیادہ مبالغہ آمیز وعدے کرے۔ یہودی اس فن میں اعلیٰ درجہ کا ماہر ہے اور پھر اسے اپنی سرگرمیوں میں کسی اخلاقی پابندی کا بھی لحاظ نہیں۔

قدرتی طور پر اس صورت حال کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہودی تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس میدان میں اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر انہیں باہر نکال دیتاہ۔ جیسا کہ یہودی کی طبیعت کی عام قساوت اور خونخواری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ٹریڈ یونین کی تحریک کو آہستہ آہستہ ایک جسمانی تشدد کرنے والی تنظیم میں ڈھال دیتا ہے۔ جن لوگوں کی عقل سلیم نے انہیں آج تک آمریت کے سامنے سر جھکانے سے باز رکھا ہے اب انہیں ڈنڈے کے زور پر مطیع کیا جاتا ہے۔ اور ڈنڈے کے زور سے جو کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کی کچھ حدود انتہائی نہیں۔

کمیونزم کی سیاسی تحریک کے لیے روپیہ کہاں سے آتا ہے

اس کارروائی کے ساتھ ساتھ سیاسی تنظی کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ سیاسی تنظیم اور ٹریڈ یونین کی تحریک پہلو بہ پلو چلتی ہیں۔ ٹریڈ یونین کی تحریک عوام کو سیاسی تنظیم کے لیے تیار کرتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات سیاسی تنظیم میں زبردستی دھکیل دی جاتی ہے۔ سیاسی تنظیم کے زبردست کارخانہ کو چلانے کے لیے جس روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ٹریڈ یونین کی تحریک ہی مہیا کرتی ہے۔ ٹریڈ یونین کی تحریک وہ شمین ہے جس کے ذریعہ سے ٹریڈ یونین کی تحریک کے تمام ارکان کی سیاسی سرگرمیوں پر قابو حاصل کر لیا جاتا ہے اور عوام کو شاندار سیاسی مظاہروں کی خاطر ہانکا جاتا ہے۔ انجام کار ٹریڈ یونین کی تحریک اقتصادی مفاد کے لیے اپنی جدو جہد ترک کر دیتی ہے۔ اور اپنا سب سے بڑا حربہ یعنی کام کرنے سے انکار جو کہ عام ہڑتال کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے سیاسی تحریک کے سپرد کر دیتی ہے۔

سیاست میں صحافت کا دخل!

ان تمام ہتھیاروں کے علاوہ یہودی کے پاس ایک اور حربہ بھی ہے یہودیوں نے ایسے اخبارات جاری کر رکھے ہیں ج کے ذریعہ جاہل سے جاہل پڑھنے والوں کو بھی یہودیوں کا ہمنوا بنانے میں دقت پیش نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان اخبارات کا معیار جاہل

خریداروں کے ذہن کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ اخبارات ایک ایسا ہتھیار ہیں کہ جن کے ذریعہ ٹریڈ یونین کی تحریک اور سیاسی تحریک دونوں مل کر قوم کے پست ترین عناصر کو تباہ کاری کی بے مہابا مہم چلانے کے لیے تیار کر لیتی ہیں۔ ان اخبارات کا فرض یہ نہیں کہ وہ اپنے قارئین کو کسی ایسی اصول پرستی کا جذبہ بیدار کریں جس سے ان کے ذہن روزمرہ کی رذیل زندگی سے بلند ہو کر کچھ سوچ سکے بلکہ ان اخبارات کا منصب تو یہ ہے کہ قارئین کی پست ترین خواہشات کو ابھارتے رہیں۔ عوام کے پست ذہن اور خودغرض حلقوں میں اس قسم کا سودا خوب ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔

یہی اخبارات بہتان تراشی کی مجنونانہ مہمیں چلاتے ہیں۔ یہ اخبارات ہر اس شے کو برباد کر دینا چاہتے ہیں جو قومی حریت کا سہارا ہو۔ یہ اخبارات تہذیب کی جڑیں کاٹتے ہیں اور قوم کی اقتصادی خودمختاری کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

جو صاحب کردار شخص یہودیوں کا آلہ کار بننے پر آمادہ نہ ہو۔ وہ ان اخبارات کے حملوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ یہودیوں کا آلہ کار بننے سے مراد یہ ہے کہ یہودی حکومت پر قابض ہونے کے لیے جو جدوجہد کریں اس میں ان کی مزاحمت نہ کی جائے۔ کسی شخص کو یہودیوں کی نگاہ میں خطرناک ثابت کرنے کے لیے یہی عذر کافی ہے کہ وہ شخص اعلیٰ ذہانت کا مالک ہے۔ یہودیوں کی دشمنی مول لینے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کسی نے اس کی کھلی مخالفت کی ہو۔ اگر کسی کی بابت یہودی یہ سمجھیں کہ وہ آئندہ کبھی ان کی مخالفت نہیں کرنے کے قابل ہے یا اس کی لیاقت اور چال چلن ایسا ہے کہ وہ یہودیوں کی کسی حریف قوم کے اقتدار میں اضافہ کا باعث ہو سکتا ہے یا حریف قوم کی حیثیت کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتا ہے تو یہی امر بجائے خود یہودیوں کو اس شخص کا دشمن بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

جو ہمارا دوست نہیں وہ ہمارا دشمن ہے

یہودی کا جبلی احساس اس قسم کے مسائل سے نپٹنے میں کبھی اسے دھوکا نہیں دیتا۔

یہودی طبعی طور پر فی الفور ہر اس شخص کی ذہنیت بھانپ لیتا ہے جس کے ساتھ روزمرہ کی زندگی میں اسے ملنے جلنے کا اتفاق ہو۔ جن لوگوں کا مزاج یہودی مزاج کے مطابق نہ ہو انہیں وہ اپنے دشمنوں کی فہرست میں شامل کر لیتا ہے۔ چونکہ یہودی کسی حملہ ور کا شکار نہیں بلکہ خود حملہ آور ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف انہیں لوگوں کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا جو اس پر حملہ کریں بلکہ ان کو بھی اپنا حریف سمجھتا ہے جو اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ ایسے حریفوں کی کمر توڑنے کے لیے یہودی وہی ذرائع استعمال نہیں کرتا جو عام طور پر شریفانہ لڑائیوں میں استعمال کیے جاتے ہیں' بلکہ یہودی کے جو مد مقابل شائستہ اور دیانت دار ہوں ان کے خلاف وہ بہتان فروشی اور دروغ بافی کے حربے استعمال کرتا ہے۔

یہودی کو کسی حربہ کے استعمال سے عار نہیں اس کا کمینہ اور ریا جیانہ طرز عمل ایسا گھناؤنا ہے کہ اگر ہماری قوم یہودی کو مجسم شیطان اور بدی کا نشان تصور کرتی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں

اگر بہت سے لوگ یہودی کی دروغ گوئی کی مہم کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں تو اس کی وجہ ہے کہ ایک طرف تو عوام یہودی کی اندرونی فطرت سے پوری طرح واقف نہیں اور دوسری طرف ہمارے اعلیٰ طبقات بصیرت اور طبعی احساس سے عاری ہیں۔

جب یہودی کسی شخص پر اپنی بہتان تراشیوں اور دروغ گوئیوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے تو ہمارے اعلیٰ طبقات تو اپنی جبلی بزدلی کے باعث اس غریب کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ تو کسی حد تک تو اپنی جہالت کے باعث اور کسی حد تک اپنی سادہ لوحی کے باعث جو کچھ انہیں کہا جائے ہمیشہ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ سرکاری حکام یا تو خاموشی سے گھونگھٹ میں منہ چھپا لیتے ہیں اور یا پھر یہودی اخبارات کے حملوں سے بچنے کی خاطر اکثر ان کے شکاااار پر خود بھی دھاوا بول دیتے ہیں بے وقوف سرکاری افسروں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ اس طرز عمل سے سرکاری اقتدار کی حفاظت

سے کامیاب ہو جائیں گے۔ اور عوام میں ضبط ونسق قائم رکھ سکیں گے۔ رفتہ رفتہ یہودی کے ہاتھ میں کمیونزم کی تلوار ایک ایسا ہوا بن جاتی ہے جس سے سب شریف لوگ ڈرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہودی کا خوف ان کے ذہن میں رچ جاتا ہے یا کابوس کی طرح ان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ لوگ اس خوفناک دشمن کے سامنے لرزہ براندام ہو کر باآسانی اس کا شکار بن جاتے ہیں۔

فلسطین کی یہودی سلطنت' بین الاقوامی ٹھگی کا اڈا ہے

(ک) اس مرحلہ پر یہودی معاملات سرکار میں ایسا با اقتدار ہو جاتا ہے کہ اب نہ صرف وہ ایک مرتبہ پھر کھلے بندوں اپنے آپ کو یہودی کہہ سکتا ہے بلکہ اب تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ڈنکے کی چوٹ' نسلی اور سیاسی مسائل پر بھی اپنے خیالات ظاہر کرنے لگتا ہے۔ یہودیوں کا ایک گروہ بالکل ننگا ہو کر اپنے ایک جداگانہ قوم ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔ یہاں بھی ان کے ہاتھ سے جھوٹ کا دامن نہیں چھوٹنے پاتا۔ جب تحریک صیہونیت کے حامی باقی دنیا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ فلسطین میں ایک یودی حکومت کے قیام سے یہودیوں کے قومی شعور کی تسکین ہو جائے گی تو یہ بھی سادہ لوح غیر یہودیوں کو دھاکا دینے کی ایک چال ہوتی ہے۔ یہودیوں کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ فلسطین میں کوئی ایسی سلطنت قائم کریں جہاں وہ مستقل رہائش اختیار کر لیں۔ یہودیوں کا اولین مقصد تو صرف یہ ہے کہ ٹھگ بازی اور دھوکا بازی کے لیے یہودیوں کو بین الاقوامی مرکز کا ایک نظام قائم کر دیا جائے۔ اگر فلسطین میں یہودیوں کی مطلق العنان سلطنت قائم ہوگئی تو ظاہر ہے کہ اس پر کسی دوسری حکومت کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔ یہ یہودی سلطنت ان تمام ٹھگوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دے گی جن کا راز فاش ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں ٹھگ بازی کا ایک نہایت محفوظ مکتب بھی قائم کیا جا سکے گا۔

اپنے آپ کو محفوظ یہودیوں کے روز افزوں تکبر کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ان کا ایک

گروہ کھلے بندوں اور گستاخانہ اپنی یہودی قومیت کا اعلان کر دیتا ہے۔ دوسری جانب یہودیوں کا ایک اور گروہ منافقت کا یہ ڈھونگ رچائے رکھتا ہیکہ وہ جرمن فرانسیسی یا انگریز ہیں۔ اگر مصلحت وقت کا تقاضا ہو تو وہ کوئی دوسری قومیت بھی اختیار کر لیتے ہیں اب یہودی دوسری قوموں کے ساتھ اپنے برتاؤں میں ایک ایسا تہلکہ اور غو غا بپا کر دیتا ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنی فتح یابی کی گھڑی قریب نظر آ رہی ہے۔

حمیت اور ناموس کا جنازہ کب نکلتا ہے

کالے بالوں والا یہودی نوجوان جس بھولی بھالی لڑکی کو اغوا کرنے کی فکر میں ہوتا ہے وہ گھنٹوں اس کی تاک میں شست لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔ وہ شیطان کی طرح ٹکٹکی باندھ کر اسکی طرف دیکھتا ہے اور وہ اس کے خون میں گندگی ملا کر اسے اس کی قوم کے آغوش سے چھین لیتا ہے۔ یہودی کو جن قوموں میں دخل حاسل ہو جائے وہ ان کی نسلی بنیادیں تباہ کرنے کے لیے کوئی چال چلنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں کو برباد کرنے کی منظم کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کی خاطر وہ یہودیوں اور دوسری قوموں کے مابین ہر قسم کے پردے ہٹا دینے کی جدوجہد کرتا ہے۔ رائن لینڈ کے جرمن علاقہ میں حبشیوں کو یہودیوں ہی نے لا کر آباد کیا تھا تاکہ جس سفید قوم سے یہودیوں کو نفرت ہے اس کی نسل کو دوغلا کر دیا جائے۔ نسل دوغلی ہو جانے سے وہاں کے باشندوں کو تمدنی اور سیاسی معیار پست ہو جائے۔ اور اس طرح یہودیوں کو بر سر اقتدار آنے کے لیے میدان صاف ہو جائے۔ جب تک کسی قوم کی نسل میں کوئی ملاوٹ نہ ہو اور جب تک ان میں ان کے خون کے ناموش اور حمیت کا احساس باقی ہو تب تک یہودی کبھی ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں یہودی صرف دوغلی قوموں پر ہی غالب آ کر ان کا آقا بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی دوسری قومون کی نسل میں کھوٹ ملانے کے لیے منظم جدوجہد کرتا ہے۔ قوم افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لیے قوم کے خون میں کھوٹ ملانے کی خاطر یہودی قوم کے افراد کے خون میں کھوٹ ملا

دیتا ہے۔

''کنگال شاہی'' کا نعرہ ایک ڈھونگ ہے

سیاسیات کے میدان میں اب یہودی ''جمہوریت'' کی جگہ ''کنگال شاہی'' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔عوام کو کمیونزم کے جھنڈے کے نیچے منظم کرنے یہودی کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ چکا ہے کہ اب اسے جمہوریت کی ضرورت نہیں ۔اب تو وحشیانہ طاقت کے زور سے لوگوں کو اپنا مطیع بنا کر وہ ڈکٹیٹروں کی طرح حکومت کر سکتا ہے۔یہودی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے باقاعدہ طور پر دو طریقوں سے انقلاب برپا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔اس کا پہلا طریقہ کار اقتصادی ہے اور دوسرا طریقہ کار سیاسی۔

اگر یہودی کی داخلی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے میں کوئی قوم ایسی سخت جان ثابت ہو کہ اس پر یہودی کا اپنا کوئی داؤ نہ چلے تو پھر یہودی بین الاقوامی میلانات کا جائزہ لے کر اس قوم کو دشمنوں کے محاصرہ میں جکڑ لیتا ہے اور پھر اس قوم کو لڑائی کے میدان می جھونک دیتاہ۔جب یہودی کی چالوں کو کامیاب بنانے کے لیے مناسب وقت آ جائے تو عین اس حالت میں فوجیں محاذ جنگ پر لڑ رہی ہوں' یہودی ان کی پیٹھ پیچھے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیتا ہے۔

اقتصادی طور پر کسی سلطنت کو تباہ کرنے کے لیے یہودی اس کے اجتماعی اداروں کو برباد کرنے کی منظم تخریبی مہم شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ ان اداروں کے چلانے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ پھر یہ ادارے سرکار کے ہاتھ سے نکل کر سرمایہ کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں سیاسی لحاظ سے یہودی اس ستون ہی کو مسمار کر دیتا ہے جس کے سہارے سلطنت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ہودی تحفظ اور قومی مدافعت کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالتا ہے۔وہ حکومت پر قوم کے اعتماد میں رخنے ڈال دیتا ہے ماضی کا مخول اڑاتا ہے۔تاریخ پر پھبتیاں حستا ہے اور قومیت کی ہر بنیاد لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل بنا دیتا ہے۔

ثقافتی طور پر یہودی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فنون لطیفہ لٹریچر اور ناٹک میں اس طرح کانٹ چھانٹ کی جائے کہ قومیت کے جذبہ کی وقعت کم سے کم تر ہوتی چلی جائے۔ بلند ہمتی، خوبصورتی، شائستگی اور اچھائی کے تصورات محو کر دیے جائیں اور آخر کار عوام کو خود یہودی کی پست ذہنی سطح پر اتار لایا جائے۔

یہودی مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ اخلاق اور شائستگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تو پرانے وقتوں کے تعصبات اور توہمات ہیں غرض باقاعدہ یورش کر کے ہر اس بنیاد کو مٹا دیا جاتا ہے جو قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو اور جس کے بغیر قوم دنیا میں اپنی ہستی برقرار نہ رکھ سکتی ہو۔

روس انسانیت کا جیتا جاگتا جہنم ہے

(ل) اس مرحلہ پر آخری اور عظیم الشان انقلاب کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جونہی یہودی سیاسی اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے وہ فی الفور اپنے چہرہ پر سے اس نقاب کی آخری دھجیاں بھی اتار پھینکتا ہے جس کے نتیجے اس کے اصلی خدوخال آج تک پوشیدہ تھے۔ جمہوریت کا پرستار یہودی اور عوام کا ہمدرد یہودی، پرے ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ خونخوار یہودی لوگوں پر اپنے ظلم کا سکہ جمانے کو سامنے آ جاتا ہے۔ چند ہی برسوں میں یہودی اپنے پنجہ میں گرفتار قوم کے تمام ذہین افراد کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح عوام کو ان کے ذہین اور فطری قائدین سے محروم کر کے یہودی انہیں ہمیشہ کے لیے اپنے جبر و استبداد کے پنجہ میں غلام رکھنے کی خاطر اپنے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔

اس غلامی کی مہیب ترین مثال روس ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ روس میں یہودیوں نے تین کروڑ انسانوں کو قتل کر دیا یا بھوکا مار دیا۔ یہ سب کچھ ایک وحشیانہ تعصب کا دنگل رچانے کا سلسلہ میں کیا گیا۔ ان مرنے والوں میں کئی لوگوں کو اس طرح شدید عذاب دے کر ختم کیا گیا کہ اس کے تذکرہ سے انسان کے رونگٹے کھڑے

ہوجاتے ہیں۔اس ساری کارروائی سے یہودی کا سوائے اس کے کچھ مقصد نہ تھا کہ چند یہودی پڑھے لکھے' اور چند یہودی اقتصادی ٹھگوں کو ایک عظیم الشان قوم کے سر پر مسلط کردیا جائے۔

ان حرکتوں کا آخری نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ قومیں آزادی سے محروم ہوکر یہودی کی غلام بن جاتی ہیں بلکہ یہودی کی ان کرتوتوں کا حشر یہ ہوتا ہے کہ مفت خور اور نکھٹو یہودی ایک دن خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔جب شکار کی موت واقع ہو جاتی ہے تو دیر یا زود شکار کو لہو پی کر زندہ رہنے والے اژدھا کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جنگ میں شکست سے زیادہ مضر شکست خوردہ ذہنیت ہوتی ہے

اگر ہم جرمن قوم کے انحطاط کے اسباب وعلل کا جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اس زوال می سب سے زیادہ فیصلہ کن اور عمیق ترین باعث نسلی اصول کی اہمیت سے عدم واقفیت اور بالخصوص یہودیوں سے جو خطرہ درپیش تھا اس کا احساس کرنے میں کوتاہی تھی۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جرمنی کو جو شکستیں میدان جنگ کے اندر ہوئیں انہیں برداشت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہماری قوم کو جو عسکری فتوحات حاصل ہوئیں ان کے ساتھ جب ان شکستوں کا مقابلہ کیا جائے تو وہ بے حقیقت نظر آتی ہیں۔ دراصل ہمیں عاجز کرنے کا باعث وہ طاقت تھی جس نے قرنوں سے ہمیں ان شکستوں کا شکار بنانے کی باقاعدہ تیاری شروع کر رکھی تھی۔وہ تیاریاں یہ تھیں کہ قوم کی سیاسی بصیرت' اور اخلاقی حمیت کو مٹا دیا گیا۔سیاسی بصیرت اور اخلاقی حمیت کے بغیر نہ کوئی قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کے قابل ہوسکتی ہے اور نہ زندہ رہنے کی حقدار کہلا سکتی ہے۔ جرمنی کی قدیم سلطنت نے جب ہماری قوم کی نسلی بنیادیں برقرار رکھنے میں غفلت کی تو گویا اس نے اس کرہ ارض پر زندہ رہنے کے حق سے قومی دست برداری کا اعلان کردیا۔ جو قومیں اپنے باشندوں کو دوغلا بنا دیتی ہیں یا دوغلے بننے سے روکتی نہیں وہ قدرت کے

ازلی منشا کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ اگر ایسی قوموں کو ان کا کوئی مضبوط حریف تباہ کر ردے تو ایسی تباہی کو بے انصافی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو عین انصاف ہے کہ اگر کوئی قوم ان خصلتوں کو برقرار رکھنے ارو بچانے سے منکر ہو جائے جو فطرت نے اسے عطا کی ہیں' اور اس کے نسلی خون میں ودیعت ہیں تو پھر ایسی قوم کو زمین پر سے اپنا وجود ختم ہو جانے کی شکایت کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

ہر شکست میں کوئی فتح پنہاں ہوتی ہے

اس دنیا کی ہر چیز کو کسی بہتر شے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہر شکست مستقبل میں کسی کامیابی کی بنیاد بنائی جا سکتی ہے۔ میدان جنگ کی ہر ہزیمت بعد ازاں کسی نئے عروج کا سبب بن سکتی ہے۔ ہر مصیبت کا وردو ہت انسانی کے لیے ایک نیا تازیانہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر ظلم اور زیادتی سے دب کر ان قوموں کو ترقی دی جا سکتی ہ۔ جو کسی قوم کی روح کو از سر نو زندہ کر دیا کرتی ہیں وہاں ان تمام صورتوں میں یہ شرط ہے کہ نسلی خون کو پاک رکھا جائے۔

اگر نسل کی پاکیزگی میں فرق آ گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے مسرت کی اندرونی سوتیں خشک ہو جائیں گی۔ انسان ابدی ذلت کا شکار ہو جائے گا۔ نسل میں فتور آ جانے کے جسمانی اور اخلاقی نتائج سے کبھی نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس بے مثال مسئلہ کا مطالعہ کیا جائے تو پھر زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ اس کا توازن کیا جائے تو بآسانی ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ کے مقابلہ میں ان مسائل کی اہمیت بہت کم ہے۔ دیگر مسائل کی اہمیتیں ہمیشہ ایک میعاد رکھتی ہیں لیکن نسلی خون کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے یا اس میں کھوٹ شامل ہو جانے کے نتائج کا اثر اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک خود انسان کا وجود قائم ہے۔

زوال کی وہ تمام علامتیں جو جنگ سے قبل ظاہر ہو رہی تھیں اگر ان کا کھوج لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ابتدا بھی نسلی اصولوں کی خلاف ورزی کے باعث ہوئی

تھی۔

چاہے ہم عام قانون کی کوتاہیوں کا سراغ لگائیں چاہے اقتصادی پھوڑے پھنسیوں کی تشخیص کریں چاہے ثقافتی انحطاط اور سیاسی زوال کی تحقیق کریں چاہے مکتبی نظام کے نقائص کا تجزیہ کریں چاہے عام باشندوں پر صحافت کے بد اثرات پر توجہ دیں۔ یہ تمام خرابیاں ہمیشہ اپنی قوم کے نسلی مفاد سے غافل رہنے کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ یا قسم کے جسم کے اندر کسی خارجی سل کو مقیم رہنے کی اجازت دینے سے جو خطرات درپیش آ سکتے ہیں ان سے جہالت کے سبب پرورش پاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اصلاح کے تمام اقدامات معاشرتی امداد کے تمام ادارے تمام سیاسی جدوجہد تمام اقتصادی ترقی ارعلم یں تمام ظاہری اضافے کوئی نتیجہ پیدا کرنے سے عاجز رہے نہ صرف قوم اور قوم کا وجود برقرار رکھنے والا نظام یعنی حکومت روز بروز اندرونی طاقت میں اضافہ یا اس کے استحکام سے محروم ہو چکے تھے۔ بلکہ عیاں طور پر ان میں ضعف کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ دوسری جرمن سلطنت کی ملمع کی جگمگاہٹ ہمیں اس کی داخلی کمزوریوں سے اندھا رکھنے کا باعث نہ ہونی چاہیے۔ سلطنت میں جان ڈالنے کی ہر کوشش ناکام رہی وجہ یہ تھی کہ اصلی اور سب سے زیادہ اہم مسئلہ پر تو غور ہی نہیں ہو رہی تھی۔

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!

یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ وہ مختلف سیاسی پارٹیاں جو جرمن وم کے علاج معالجہ کی فکر میں آگے بڑھیں وہ سب یا ان کے تمام لیڈر بدنیت اور بدفطرت تھے۔ ان کی بہترین جدوجہد اس لیے ناکام رہی کہ قوم میں جو روگ عام پھیلا ہوا تھا انہیں اس کی علامتوں کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ لوگ کی اصی جڑ کو یاک طرف چھوڑ کر علامتوں ہی کے علاج میں مصروف رہتے تھے۔ اگر قدیم جرمن سلطنت کی نشوونما کے مدارج کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے تو سیاسی تجزیہ کرتے ہی یہ ناگزیر نتیجہ سامنے آ جاتا ہے

۔ کہ داخلی انحطاط کا بیج آغاز سے ہی بویا جا چکا تھا۔ جب ایک متحدہ سلطنت قائم ہوئی تو جرمن قوم نے سرعت سے خارجی ترقی کی منازل طے کرنی شروع کیں تو اسی وقت سے اس تعمیر میں خرابی کی ایک سورت مضمر تھی۔ اگر چہ بظاہر سیاسی کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اور اگر چہ اقتصادی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن عام صورت حال خلل پذیر تھی۔ ریشتاغ یعنی جرمن پارلیمنٹ کے انتخابات می روز بروز کمیونسٹوں کے ووٹ کی تعداد کا بڑھتے جانا ثابت کر رہا تھا کہ داخلی انتشار اور سیاسی زوال کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ نام نہاد کھاتی پیتی سیاسی پارٹیوں کی تمام کامیابیاں نہ صرف اس لیے بے سود تھیں کہ گو انتخابی کا سہرا کھاتی پیتی پارٹیوں کے سر پر بندھ جاتا تھا لیکن یہ پارٹیاں کمیونسٹوں کے ووٹوں کی تعداد بڑھنے سے روکنے میں ناکام رہتی تھیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کامیابیاں اس لیے بے حقیقت تھیں کہ خود کھاتی پیتی پارٹیوں کے اندر بھی انحطاط کا گھن لگ چکا تھا۔ اگر چہ کھاتے پیتے طبقات کو اس کا علم تک نہ تھا، لیکن مارکس ازم کے مہلک عقائد خود ان کے اندر بھی سرایت کر چکے تھے۔ کھاتے پیتے لوگوں کی جانب سے گاہے بگاہے کمیونسٹوں کی جو کھلی مدافعت کی جاتی تھی اس کی حقیقی وجہ حریص سیاسی لیڈروں کی باہمی رقیبانہ کشمکش تھی نہ کہ حریفوں کے مابین کوئی اصولی اختلاف جسے تادم آخر نباہنے کا سودا سروں میں سمایا ہوا تھا۔ اس تمام دوران میں صرف ایک ہی فریق دھن کا ایسا پکا تھا کہ استقامت اور اولوالعزمی کے ساتھ اپنی امنگوں کو پورا کرنے کی خاطر میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ یہ یہودی تھا۔ داؤد نبی کی آنکھوں کا تارا روز بروز عروج حاصل کر رہا تھا۔ ہاں قومی تحفظ کی لگن انحطاط پذیر تھی۔

سلطنت کا سرکاری نظام قوم کی روحانی کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے

اس لیے ۱۹۱۴ء میں جب قوم نے میدان جنگ کی جانب یلغار شروع نہ کی تو یہ ایک متحدہ قوم کی یلغار تھی اور نہ ہی اس یلغار کا شوق قوت اتحاد کے سرچشمہ سے پھوٹا تھا۔ امن پسندانہ عقائد اور مارکس ازم کے عقائد قوم کو مفلوج کرنے میں جو کامیابی حاصل کر

رہے تھے یہ شوق جہاد اس کے خلاف تحفظ ناموس ملت کے احساس کی آخری بھڑک تھی۔ جب قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی ترازو ڈانواڈول ہو رہی تھی تو عین ان ایام میں بھی قوم کے داخلی دشمن کو شناخت نہ کیا جا سکا۔ یہی وجہ تھی کہ خارجی دشمن کا مقابلہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ قدرت نے فاتحانہ شمشیر کی جنبہ داری سے انکار کر کے فطرت کے غیر فانی قانون انصاف کے ماتحت انتقام کشی کا فیصلہ صادر کیا۔ ہماری نئ تحریک جن میلانات اور اصولوں پر قائم کی گئی ہے وہ مذکورہ بالا تمام امور کے عمیق ادراک سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان حقائق کو تسلیم کر کے ہی جرمنی میں قومی انحطاط کو روکا جا سکتا ہے اور ایک نئ سلطنت کی صحیح اور سنگین بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔ یہ سلطنت کوئی ایسا غیر ملکی ڈھانچہ نہ ہو گا جو اقتصادی مقاصد یا مفاد کی غرض سے اپنے سر منڈھ لیا گیا ہو۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا نظام ہو گا جو خود قوم کے روحانی تقاضوں کی تخلیق ہو گا۔ یہ سلطنت خود بھی جرمن قوم کی تعمیر کردہ جرمن ایک سرکار ہو گی!

☆☆☆

باب دوازدہم :: جرمن سوشلسٹ مزدور پارٹی کے ارتقا کی پہلی منزل

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

میری تزک کے پہلے حصہ کا یہ آخری باب ہے۔ میں اس باب میں اپنی تحریک کے نشوونما کے ابتدائی مدارج بیان کروں گا۔ جن کا ہمیں اس زمانہ میں سامنا کرنا پڑا۔ میں اس سلسلہ میں ان اصولوں کا ذکر نہ کروں گا جو ہماری تحریک کے نصب العین کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اصولوں کی اہمیت اورنوعیت متقاضی ہیں کہ ان کی تفسیر بیان کرنے کے لیے تزک کی ایک دوسری مکمل جلد لکھی جائے۔ میں اپنی تزک کے دوسرے حصہ میں ان اصولوں کا تفصیلی جائزہ لوں گا۔ جن پر ہماری تحریک کا پروگرام مبنی ہے اس کے ساتھ ہی میں یہ نقشہ کھینچنے کی کوشش کروں گا کہ ہم لفظ "سرکار" سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ جب میں یہاں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتا ہوں تو اس میں وہ لاکھوں جرمن بھی شامل ہوتے ہیں جن کے دلوں میں دراصل یہی آرزوئیں مچل رہی ہیں گو انفرادی طور پر ان کی زبانیں وہ لفظ تلاش کرنے کی قدرت نہیں رکھتیں جو پوری طرح ان کے من کے سپنوں کو بیان کرسکیں۔ تمام بڑی بڑی اصلاحی تحریکوں میں ایک عجیب خصوصیت رہی ہے۔ کہ شرو میں ہمیشہ کو ایک شخصیت لاکھوں انسانوں کی ترجمانی کی دعوت کی دعوت لے کر اٹھتی ہے۔ دنیا میں جتنے عظیم الشان انقلاب آئے ان کی منزل مقصود تک پہنچنے کی تمنا تو صدیوں پہلے سے کروڑوں انسانوں کے سینوں میں کروٹیں لے رہی تھی لیکن یہ تمنا اس وقت تک عملی جامہ نہ پہن سکی جب تک انہیں کروڑوں انسانوں میں سے بالآخر ایک آدمی اٹھا اور اس نے عوام کے عزائم کا اعلان کرنے کے لیے نقیب کے فرائض سرانجام دیے۔ پھر اس اعلان کے بعد وہ نقیب اس قدیم تمنا کے حامیوں کا علم بردار بن گیا۔ اور انجام کار اس نے اس پرانی تمنا کو ایک بالکل نیا روپ دے کر پورا بھی کر دکھایا

ہے۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

آج ہماری قوم کے لاکھوں افراد ہماری موجودہ حالت میں بنیادی انقلاب کے متمنی ہیں ان کی اس خواہش کا ثبوت وہ شدید بے چینی ہے جو آج ان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا جذبہ ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کئی لوگ انقلاب کی خواہش کا اظہار مایوسی اور حوصلہ شکنی کے کلمات کے ذریعہ کرتے ہیں۔ کئی لوگ شکایت' غصہ اور غیض وغضب کے پیرائے میں اپنے ارمانوں کی غمازی کرتے ہیں ک۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کی امنگوں نے بے چینی کا بھیس بدل لیا ہے بعض اسی کیفیت کی ترجمانی متشددانہ قہر کے وسیلہ سے کرنے کی اکساہٹ محسوس کرتے ہیں۔ یہی آرزو کئی لوگوں کو الیکشن میں ووٹ ڈالنے سے باز رکھتی ہے۔ اور یہی دھن ایک کثیر تعداد کو کمیونسٹ انتہا پسندوں کے متعصّبانہ اور مجنونانہ چنگل میں جا پھنساتی ہے۔

ہماری نوزائیدہ تحریک کا اولین خطاب ان لوگوں سے تھا جو کمیونزم کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے ہم اپنی تحریک کو مطمئن اور مسعٔی افراد کی تنظیم نہیں بنانا چاہتے تھے ہم تو اس تحریک میں ان لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے جو تشویش سے مضطرب تھے جو اطمینان سے محروم تھے اور جو اندوہگین تھے اور جو بے حد چین تھے ہم اپنی تحریک کو قوم کی بالائی سطحوں کی پرواز تک محدود نہ رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہم تو اسے عوام کی گہرائیوں تک اتار لے جانا چاہتے تھے۔

قوم دو طبقوں میں بٹ چکی تھی!

اگر محض سیاسی زاویہ نگاہ سے دیکھا جاتا تو ۱۹۱۸ء میں صورت حال حسب ذیل تھی' قوم دو طبقوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک طبقہ جو کہ پہلے کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے کم تھا قوم کے تعلیم یافتہ عناصر پر مشتمل تھا۔ اس طبقہ میں وہ لوگ خارج تھے جو جسمانی مزدوری کرتے تھے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تعلیم یافتہ طبقہ قوم پرست معلوم ہوتا تھا لیکن

ذرا کرید کر دیکھا جائے تو ان لوگوں کے نزدیک قوم پرستی کے لفظ کا سوائے اس کے کچھ مفہوم نہ تھا کہ بعض مبہم اور غیر معین سرکاری مفاد کی حفاظت ایک فرض ہے ان سرکاری مفاد کے معنی معین کرنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سرکاری مفاد کا مطلب حکمران طبقہ کے بعض خاندانی مفاد سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ طبقہ اپنے اعتقادات کی حفاظت اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہتھیاروں کے استعمال پر اکتفا کرتا ہے۔ ذہنی ہتھیار ہر جگہ تو استعمال کیے نہیں جا سکتے بس ان ہتھیاروں کو کبھی یہاں استعمال کر لیا جاتا تھا اور کبھی وہاں استعمال کر لیا جاتا تھا۔ برعکس ان ہتھیاروں کے حریف وحشیانہ ہتھیار استعمال کرتے تھے جن کے مقابلہ میں ان ذہنی ہتھیاروں کا اثر بالکل سطحی ہوتا تھا۔ اس کشمکش میں ذہنی ہتھیاروں کی شکست طبعی طور پر لازمی تھی۔ جو طبقہ آج تک حکمرانی کرتا چلا آیا تھا اس پر ایک چوٹ لگی تو وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ اب وہ خوف سے کانپنے لگے اور بے رحم فاتح نے جو توہین آمیز شرائط بھان پر عائد کیں انہوں نے خاموشی سے تسلیم کر لیں۔

اس طبقہ کے مقابلہ میں دوسرا طبقہ جسمانی محنت مزدوری کرنے والے عوام کے ہجوم پر مشتمل تھا۔ یہ دوسرا طبقہ کم و بیش کمیونسٹ رجحان رکھنے وای تحریکوں کے ماتحت منظم تھا۔ منظم عوام نے تیہ کر رکھا تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تو اسے ڈنڈے کے زور سے ختم کر دیں گے۔ عوام کی ان تنظیمات میں قوم پرستی کا کوئی میلان نہ تھا۔ بلکہ وہ تو قومی مفاد کو بحیثیت مجموعی مفاد کی ترقی دینے کی جان بوجھ کر مخالفت کرتی تھیں' اور غیر ملکی ظالموں کے مفاد کو تقویت پہنچاتی تھیں۔ تعداد کے لحاظ سے یہ طبقہ باشندوں کی اکثریت پر حاوی تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس طبقہ میں قوم کے تمام عناصر شامل تھے جن کے بغیر قومی شوکت کی بحالی نہ صرف ناممکن العمل تھی بلکہ ناممکن التصور بھی تھی۔

دنیا میں کمزور کے لیے جگہ نہیں

۱۹۱۸ء میں ایک حقیقت کو صاف طور پر تسلیم کرنا تو لازمی تھا وہ یہ کہ جرمن قوم کی عظمت کو اس وقت تک بحال نہ کیا جا سکتا تھا۔ جب تک کہ پہلے بیرونی دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے قومی طاقت کو بحال نہ کرلیا جاتا۔ قومی طاقت کو بحال کرنے کے لیے اولین ضرورت اسلحہ کی نہ تھی۔ اگر چہ ہمارے کھاتے پیتے مدبرین ہمیشہ یہی رٹ لگائے رکھتے تھے کہ اسلحہ کے بغیر قوم کی طاقت بحال نہیں ہوسکتی۔ ہاں جس بات کی ضرورت تھی کہ وہ یہ تھی کہ قوم کا عزم وارادہ صمیم اور راسخ ہو جاتا ایک وقت ایسا بھی تھا جب جرمن قوم کے پاس کافی سے زیادی عسکری اسلحہ تھے۔ اور باوجود اس کے وہ اپنی حریت کی حفاظت سے قاصر رہے وجہ یہ تھی کہ وہ ان قوتوں سے محروم تھے جو تحفظ ملت کے جبلی جذبہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں اپنی دھن پر قائم رہنے کا عزم ڈھیلا تھا۔ جب وہ جذبہ مفقود ہوا جو انسانوں کو اسلحہ استعمال کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور مدافعت کا عزم صمیم پیدا ہوتا ہے تو بہترین اسلحہ بھی ناکارہ اور بے جان ثابت ہوتے ہیں۔ جرمنی اس کے لیے قوت مدافعت سے محروم نہ تھا کہ اس کے پاس اسلحہ کی کمی تھی' بلکہ قوت مدافعت سے جرمنی کی محرومی کا اصل باعث یہ تھا کہ اپنے آپ کو اسلحہ کرکے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے جرمن قوم کا ارادہ پختہ نہ تھا۔

آج کل ہمارے کمیونسٹ سیاستدان بالخصوص ہمیشہ اصرار کیا کرتے ہیں کہ ان کی بزدلانہ اور بے سود ٹائیں ٹائیں کرتے رہنے والی خارجی پالیسی اس لیے ناگریز ہے کہ جرمنی کو غیر مسلح کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ حقیقت ی ہے کہ اس خارجی پالیسی کو چلانے والے قومی غدار ہیں۔ اس قدم کے عذر اور بہانوں کا ایک ہی جواب ہے وہ جواب یہ ہونا چاہیے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں حقیقت حال اس کے عین برعکس ہے۔ آپ غیر مسلح ہونے پر اس لیے آمادہ ہو گئے تھے کہ آپ قوم پرستی کے دشمن ہیں۔ اور آپ کو قومی مفاد کی پرواہ نہیں۔ آج آپ لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ آپ کے ناک رگڑنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس ہتھیار نہیں۔ آپ کا یہ دعویٰ بھی آپ کے تمام کردار کی

طرح جھوٹا ہے۔ اور صحیح وجہ کو چھپانے کی ایک غلط کوشش ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ دولت مند اور قدامت پرست سیاست دان بھی بالکل ویسے ہی سرزنش کے مستحق ہیں جیسے کہ کمیونسٹ سیاست دان۔ یہ انہیں کی ذلیل بزدلی کا نتیجہ ہے کہ جو پاجی یہودی ۱۹۱۸ء میں برسراقتدار آ گئے تھے وہ قوم کو غیر مسلح کرنے میں کامیاب ہو گئے قدامت پسند سیاسی لیڈر جب کہتے ہیں کہ انہیں جرمنی کے غیر مسلح کر دیے جانے کے باعث ذرا مصلحت اندیشی یا بالفاظ دیگر بزدلی کی پالیسی اختیار کرنی پڑی تو اس کا دعویٰ کو پیش کرنے کے لیے نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ دراصل یہ دعویٰ کرنے کے حق دار ہیں۔ یہاں بھی حقیقت حال ان کے دعویٰ کے عین برعکس ہے۔ جرمنی کا غیر مسلح کیا جانا ان لوگوں کی حمیت کا جنازہ نکل جانے کے باعث تھا۔

بزدل کے پاس بندوق وہ کام نہیں کرتی جو بہادر کے ہاتھ میں غلیل دے جاتی ہے

اندریں حالات جرمنی کی طاقت کو بحال کرنے کے مسئلہ مطلب یہ نہیں کہ اسلحہ سازی کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے جو قوم کو اسلحہ استعمال کرنے کے قابل بنا دے۔ جب ایک دفعہ قوم اس جذبہ سے سرشار ہو گئی تو ایک ہزار ایسے راستے تلاش کر لیے جائیں گے جن میں سے ہر ایک راہ با آسانی اسلحہ مہیا کرنے پر منتج ہو گی۔ برعکس اس کے ایک بزدل چاہے دس پستولوں سے مسلح ہو کر اور اس پر کوئی دوسرا حملہ کر دے تو وہ ایک گولی نہ چلائے گا۔ بزدل کے ہاتھ میں بندوق بھ ناکارہ ہو جاتی ہے اور جی رکھنے والے کے ہاتھ میں غلیل بھی کام دے جاتی ہے۔

قوم کی سیاسی قوت کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے پہلے یہ ضروری تھا۔ کہ تحفظ ملت کا جذبہ ایک مرتبہ پھر بیدار کیا جائے۔ اس جذبہ کو بیدار کرنے کی دیگر وجوہات نظر انداز بھی کر دی جائیں تو یہی وجہ کافی ہے کہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ سیاسی خارجی پالیسی میں ہر

قدم یہ دیکھ کر اٹھانا پڑتا ہے اور کسی سلطنت کی حیثیت سے متعلق رائے قائم کرتے وقت ہر بیرونی حکومت یہی سوچتی ہے کہ اس سلطنت کی اخلاقی قوت مدافعت کتنی ہے یا کتنی سمجھی جاتی ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اس سلطنت کے پاس اسلحے کی مادی مقدار کس قدر ہے جب یہ فیصلہ کرنا ہو کہ آیا کوئی قوم حلیف بنانے کے قابل ہے یا نہیں تو اس فیصلہ کا اندازہ بے جان ہتھیاروں کے انبار دیکھ کر نہیں لگایا جاتا بلکہ تحفظ ملت کے مردانہ جذبہ اور تا دم آخر سپر انداز ہونے والی دلیرانہ شجاعت پر انحصار رکھتا ہے۔ کیونکہ ہتھیاروں کے تودے تو باہم حلیف نہیں بن سکتے مردوں کے حلیف تو مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ برطانوی قوم دنیا کا بہترین حلیف سمجھی جاتی ہے اور اس وقت تک سمجھی جائے گی جب تک برطانوی عوام کا جذبہ حمیت اور برطانوی حکومت کی سنگدلانہ ہٹ دھرمی برقرار ہے۔ انہیں خصلتوں کے طفیل برطانیہ جس جنگ میں ایک دفعہ ہاتھ ڈال دے پھر چاہے جنگ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے کیسی ہی شدید قربانیاں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں کسی ہی قسم کے ذرائع کیوں نہ استعمال کرنے کی نوبت آ جائے جب تک فتح نصیب نہ ہو تب تک برطانیہ اس جنگ سے دستبردار نہیں ہوتا جو عسکری ہتھیار فی الفور اور فی الحقیقت موجود ہوں اگر ان کی مقدار دوسری قوموں کے مقابلہ میں قطعاً ناکافی ہو تب بھی برطانیہ اس جنگ سے دست بردار نہیں ہوتا۔ جو عسکری ہتھیار فی الفور اور فی الحقیقت موجود ہوں اگر ان کی مقدار دوسری قوموں کے مقابلہ میں قطعاً ناکافی ہو تب بھی برطانیہ کی اس روش میں فرق نہیں آتا۔

اگر ایک دفعہ یہ سمجھ لیا جائے کہ جرمنی کی بحالی کا مسئلہ قوم کے سیاسی حفظ نفس کے جذبہ کو بیدار کرنے پر منحصر ہے تو پھر ہم صاف طور پر اندازہ لگا سکیں گے کہ صرف ان عناصر کو اپنے ساتھ شامل کرنا کافی نہیں جو پہلے سے قوم پرست ہیں بلکہ جو عامتہ الناس جان بوجھ کر قوم پرستی سے منحرف ہو چکے ہیں ان کے عقیدے بدل کر انہیں از سر نو قومی اصولوں کا قائل کرنا بھی لازمی ہے۔

جدید تحریکوں کو صرف عوام کی پشت پناہی کامیاب بنا سکتی ہے

ہماری تحریک ابھی نوزائیدہ تحریک تھی۔ ایک اس قسم کی تحریک کو جو ابھی ابتدائی مراحل طے کر چکی ہو اور جرمن سلطنت کو ایک مرتبہ پھر مطلق العنان بنانے کے خواب دیکھ رہی ہو اپنی عملی کوششوں کا نقشہ تیار کرتے وقت عوام الناس کی حمایت حاصل کرنا اپنا خاص الخاص مقصد سمجھنا چاہیے۔ بحثیت مجموعی ہمارے نام نہاد کھاتے پیتے طبقات بالکل کاہل ہیں۔ ان کا قوم پرستی کا جوش ایسا ضعیف ہے کہ وہ کبھی قوم پرستی کی خاطر کسی طاقت ور داخلی یا خارجی پالیسی کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جرمنوں کا کھاتا پیتا طبقہ نہایت تنگ نظر ہے۔ اگر کامیابی سامنے نظر آ رہی ہو تو پھر شاید یہ لوگ عدم تعاون کی نوعیت کا برا بھلا مقابلہ کر لیں۔ بسمارک کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن ان کی ضرب المثل بزدلی کے باعث ان سے کبھی کسی عملی اقدام کا خطرہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

برعکس اس کے ہمارے عوام کی اس کثیر تعداد کی کیفیت بالکل مختلف ہے جس پر بین الاقوامی اصولوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ وہ اپنی طبعی سادہ خشونت کے سبب تشدد کی تلقین قبول کرنے پر بآسانی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیڈر یہودی ہیں یہودی فطرتاً زیادہ وحشی اور سنگدل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں طاقتیں مل کر جرمن عظمت کو بحال کرنے کی کسی کوشش کو کچل دیں گی۔

اس سے پہلے انہوں نے اسی طرح جرمن فوج پر عقب سے حملہ کر کے اسے برباد کر دیا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منظم عوام کی یہ طاقت ہمارے موجودہ پالیمنٹری نظام حکومت کو استعمال کر کے نہ صرف خارجی پالیسی کو وم پرستی کے خطوط پر چلنے سے باز رکھ سکتی ہے بلکہ جرمنی کی سیاسی قوت کی بحالی کے راستہ میں بھی روڑے اٹکا سکتی ہے۔ جب تک حکومت کی سیاسی قوت بحال نہیں ہوتی تب تک غیر ممالک میں جرمنی کی عظمت کا سکہ دوبارہ کس طرح جمایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا **ملک** مناسب حلیفوں سے محروم ہے۔ جرمن قوم کی صفوں میں ڈیڑھ کروڑ کمیونسٹوں، جمہوریت پرستوں، امن

پرستوں اور اعتدال پرستوں کے وجود سے ہماری حکومت جس طرح مجبور اور لاچار ہے اس کا احساس صرف ہمیں تک محدود نہیں۔ غیر قوموں کو بھی ہماری حکومت کی ان مجبوریوں کا علم ہے۔ جب یہ قومیں جرمنی کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لیے مسئلہ پر غور کرتی ہیں تو اس کا نفع نقصان سوچتے وقت وہ ہماری ان مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھتی ہیں بھلا ایسی سلطنت کے ساتھ کون اتحاد قائم کرتا ہے۔ جس کی آبادی کا ایک فعال حصہ سرے سے کسی مستقل اور پختہ خارجی پالیسی کے قیام ہی کا مخالف ہے۔ یا مخالف نہیں تو کم از کم اس کے ساتھ تعاون پر بھی آمادہ نہیں۔

گھر سے باہر اقتدار حاصل کرنے سے پہلے گھر کے اندر اتحاد قائم کرنا ضروری ہے

صورت حال اس لیے بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی کہ جو سیاسی پارٹیاں قوم سے غداری کی مرتکب ہوئی تھیں ان کے لیڈر اب ہر ایسی کوشش کی مخالفت کر رہے تھے جو جرمنی کی عظمت کو بحال کرنے کی خواہاں ہو۔ اس مخالفت سے ان کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ جن مناصب پر ایک دفعہ قابض ہو چکے ہیں ان میں علیحدہ ہونے پر آمادہ نہیں۔ انسان کی تاریخ جن قوانین کے تابع ہے ان کی رو سے کبھی ممکن نہیں کہ جو لوگ سلطنت کی تباہی اور زوال کا باعث تھے اور جو یہ تباہی لائے ان سے انتقام حاصل کیے بغیر کبھی جرمن قوم اس مقام پر پہنچ سکے جہاں وہ پہلے تھی۔ آنے والی نسلیں نومبر ۱۹۱۸ء کے انقلاب کو صرف ایک بغاوت ہی سمجھیں گی بلکہ ملک کے خلاف غداری بھی قرار دیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ جرمن سرکار کی خودمختاری اور سیاسی حریت کو دوبارہ حاصل کرنے سے قبل قوم کے اندر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا لازمی تھا۔ یہ متحدہ محاذ صرف اسی طرح قائم ہو سکتا ہے کہ عوام کو پرامن ذرائع سے اپنے عقائد تبدیل کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

اگر عملی وسائل اور ذرائع کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی جرمنی کو بیرونی غلامی

سے آزاد کرانے کی تجویز اس وقت تک دیوانے کے خواب سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی جب تک قوم کے عوام حصول آزادی کی کوشش کی پشت پناہی پر آمادہ نہ کیے جا چکے ہوں اگر اس مسئلہ پر خالص عسکری زاویہ نگاہ سے غور کی جائے تب بھی ہر شخص تسلیم کرے گا' بالخصوص ہر فوجی افسر تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مان لے گا' کہ کسی بیرونی دشمن کے خلاف جنگ لڑنی ہو تو طالب علموں کے رسالے بھرتی کر کے ان سے کام نہیں چلایا جا سکتا۔قوم کی ذہنی قوت کے ساتھ ساتھ جنگ میں جسمانی طاقت کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔مزید بریں اگر مدافعت کے فرائض فقط تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے سپرد کر دیے جائیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں قوم کا یہ بے بہا تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے سپرد کر دیے جائیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں قوم کا یہ بے بہا خزانہ ضائع ہو جائے گا۔جن نوجوانوں نے گزشتہ جنگ میں اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کی تھیں اور پھر ۱۹۱۴ء کے موسم خزاں میں فلانڈرز کے میدان میں کام آ گئے تھے بعد میں ان کی کمی بری طرح محسوس ہوئی تھی۔وہ قوم کی متاع عزیز تھے ان کی کمی سارے جنگ کے دوران پوری نہ ہو سکی۔ اگر قوم کے مزدور پیشہ طبقات جان پر کھیل جانے والے فوجی رسالوں میں شمولیت پر آمادہ نہ ہوں تو نہ صرف جنگ کے لیے فوجیں مہیا کرنا ہی محال ہو جائے۔ بلکہ قوم کے اندر متحدہ محاذ کے فقدان اور متفقہ ارادے کے بغیر ضروری سامان جنگ اور اسلحہ بھی تیار نہ ہو سکے۔ ہماری قوم غیر مسلح کی جا چکی تھی۔اس کو مسلح ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ورسائی کے صلح نامے کے ماتحت ہزاروں ایسے جاسوس مقرر ہیں جو ہمیں کوئی ایسا سامان تیار نہ کرنے دیں گے جو ہمیں آزادی اور حریت حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔جب تک جاسوسوں کی اس فوج سے نجات حاصل نہیں کی جاتی تب تک ہم کوئی تیاری نہیں کر سکتے ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ ملک میں سوائے ان لوگوں کے کوئی شخص جاسوسی کے فرائض انجام دینے پر آمادہ نہ کیا جا سکے جو اپنی جبلی بدطینتی کے باعث روپیہ لے کر دنیا کی ہر شے فروخت کرنے پر تیار ہو جایا کرتے ہیں۔ایسے چند ذلیل نفس سے نپٹنا بھی

کچھ مشکل نہیں ہوتا۔لیکن جولاکھوں انسان محض اپنے سیاسی عقائد کے باعث قوم کی ہر قسم کی بحالی کے مخالف ہیں۔ان کا مقابلہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کم ازکم اس وقت تک ان کا مقابلہ ممکن نہیں جب تک ان کی مخالفت کی اصل بنیادیعنی بین الاقوامی اشتراکیت' پر غلبہ حاصل نہیں کرلیا جاتا اورعوام کے دل ودماغ کواس زہر سے پاک نہیں کردیا جاتا۔

بحیثیت ایک قوم اورسلطنت کے اپنی آزادی واپس کرنے کے امکان پر چاہے ہم کسی زاویہ نگاہ سے غور کریں۔اورچاہے میدان جنگ میں سرفروشی کے تقاضوں کوملحوظ رکھیں۔ ہرطرف سے ایک ہی شرط اول کی ضرورت یکساں محسوس ہوتی ہے۔وہ شرط اول یہ ہے کہ پہلے قوم کے عوام کوقومی حریت واستقلال کا حامی بنایا جائے۔

غلام کوئی ترقی بھی کرجائے تواس سے غیرہی فائدہ اٹھاتے ہیں

اگرہم خارجی آزادی حاصل نہ کرسکےتو خانگی اصلاح کے لیے ہرکامیاب قدم سے بھی سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ جوقومیں آج جرمنی کواپنا مقبوضہ علاقہ قرار دے کراس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہاں ہیں۔ان کی خدمت کے لیے ہم اپنی مال تیارکرنے کی استعداد میں کچھ اضافہ کرلیں گے۔ ہرنام نہاداصلاح سے ہم جتنا زیادہ مال یا اجناس پیدا کریں گے وہ ہمارے بین الاقوامی آقاؤں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی ۔اگرہم کوئی معاشرتی اصلاح انجام دینے میں کامیاب ہوگئےتو زیادہ سے زیادہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمن مزدوروں کی صنعت کی پیداوار میں کچھ اضافہ ہوجائے گا۔ اس اضافہ کافائدہ بھی غیرہی اٹھائیں گے۔اس دوران جرمن توکوئی ثقافتی ترقی بھی نہیں کرسکتی کیونکہ ثقافتی ترقی کاتو سیاسی آزادی اورکسی قوم کے احساس وقار سے گہرا تعلق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے مستقبل کا کوئی تسلی بخش حل اس وقت تک تلاش کرنا ممکن نہیں جب تک کہ قوم کے عوام کوقوم پرستی کے اصول کا قائل نہ کرلیا جائے۔جوتحریک صرف وقتی ضروریات پوری کرنے کی متمنی نہیں بلکہ جس کے ہرفعل اور ہراجتناب کا

فیصلہ مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے' اس کے نزدیک قوم کے عوام کو قوم پرستی کے اصولوں کی تعلیم دینا اہم ترین اور بلند ترین فریضہ ہوگا۔

ہمیں ۱۹۱۹ء میں ہی یقین ہو چکا تھا کہ ہماری نئی تحریک کا اولین اور اہم ترین مقصد عوام پر قوم پرستی کا رنگ چڑھانا ہوگا۔ جب ہم نے ایک دفعہ یہ فیصلہ کر لیا تو پھر اس مقصد کی مصلحتوں کے تقاضوں کے ماتحت کئی عملی نتائج کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر آ پڑی۔

(ا) عوام کو قوم کی اقتصادی بحالی کا حامی بنانے کے لیے جو معاشرتی قربانی بھی دینی پڑے تھوڑی ہے۔

قومی اتحاد کی خاطر اقتصادی قربانیاں مہنگی نہیں!

قومی اقتصادیات کے میدان میں مزدوروں کو آج جتنی مراعات بھی دی جائیں جب ان کا مقابلہ ان فوائد سے کیا جائے جو ان مراعات کے باعث ساری قوم کو حاصل ہوں گے تو ان فوائد کے مقابلہ میں یہ مراعات بالکل بے حیثیت رہ جاتی ہیں۔ہاں شرط صرف یہ ہے کہ ان مراعات سے قوم کے عوام ایک مرتبہ پھر آغوش ملت میں واپس آ جائیں۔ بدقسمتی سے جرمن آقاؤں اور مالکوں میں تنگ نظری اور کمینگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔یہی دو خصلتیں ہماری قوم کو یہ سمجھنے سے باز رکھتی ہیں کہ دور اندیشی کی نظر سے دیکھا جائے تو جب تک جرمنوں کی اکثریت کے اندر قومی اتحاد قائم نہیں ہو جاتا تب تک نہ کسی قسم کی اقتصادی ترقی ممکن ہے۔اور نہ نفع ہی کمایا جا سکتا ہے۔جرمن قوم آخر عوام ہی کی اکثریت کا دوسرا نام ہے۔

اگر جرمن ٹریڈ یونینوں نے جنگ کے دوران میں بغیر کوئی کمزوری دکھائے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی ہوتی جو جرمن کارخانہ دار نفع کے لالچ میں اندھے ہو رہے تھے۔ اگر مزدوروں کی یہ نمائندہ پولیس ان کے خلاف ہڑتال کا ہتھیار استعمال کر کے بھی انہیں راہ راست پر لے آتیں اور مزدوروں کے مطالبات منظور کرانے میں کامیاب ہو جاتیں'

اگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ٹریڈ یونینیں نچلے جرمنوں کی طرح قومی دفاع کی خاطر بھی اسی تڑپ سے سربکف ہو جاتیں جس طرح اپنے مطالبات منوانے کے لیے لڑ رہی ہوتی ہیں اگر وہ اپنے وطن کے حقوق ادا کرنے سے قاصر نہ رہتیں تو پھر ہم جنگ میں ناکام نہ ہوتے۔ جب فتح کی زبردست اہمیت کو پیش نظر رکھا جائے تو بڑی سے بڑی اقتصادی مراعات بھی کیسی حقیر اور معمولی دکھائی دیتی ہیں جو تحریک جرمن مزدور کو جرمن قوم کے آغوش میں واپس لانے کے لیے قائم کی جائے اسے صاف صاف اور قطعی طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے معاملات میں اقتصادی قربانیاں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ یہ اقتصادی قربانیاں ایسی مبالغہ آمیز نہ ہوں جس سے قومی اقتصادی نظام کی خودمختاری یا استحکام ہی خطرے میں پڑ جائے۔

(۲) عوام کو قوم پرستی کی تعلیم براہ راست نہیں دی جا سکتی۔ عوام کے اندر قوم پرستی کا جذبہ بیدار کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ان کے معاشرتی حالات کی اصلاح کی جائے۔ معاشرتی اصلاح سے ہی وہ اقتصادی حالات پیدا کیے جا سکتے ہیں جن کے بغیر قوم کا ہر فرد قوم کی ثقافتی زندگی میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوتا۔

عوام تذبذب سے اچھا اثر قبول نہیں کرتے' طاقت سے مرعوب ہوتے ہیں

(۳) عوام کو قوم پرستی کے جذبہ سے روشناس کرانا ہو تو ادھورے اقدامات سے بھی کام نہیں چلتا۔ ادھورے اقدامات سے مراد یہ ہے کہ محض قوم پرستی کی مادی مفاد کبھی بھار بے دلی سے پیش کرنے پر اکتفا کی جائے یہ کام تو اسی صورت میں ممکن ہے اگر دل لگا کر اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس منزل کی جانب بڑھتے چلے جائیں جہاں پہنچنا ہے غرض قوم پرستی کا جو مفہوم ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کے نزدیک قوم پرستی میں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے بہت کچھ اگر مگر لگا رکھی ہے قوم پرستی کے معنی ہیں غیر مشروط بے انتہا اور جوشیلی قوم پرستی۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ یہ خیال تو

کم ہمت کھاتے پیتے طبقات میں ہی قابو پایا جا سکتا ہے کہ ''آسمانی بادشاہت'' پر خالی خولی راضی ناموں سے بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کے عوام پروفیسر اور مدبرین نہیں ہوتے۔ عوام کو باریک خیالوں سے واجبی واجبی شناسائی ہوتی ہے۔ عوام کے میلانات تو جذبات پر انحصار کرتے ہیں۔ عوام کی برائیوں اور بھلائیوں دونوں کی جڑیں جذبات سے پھوٹتی ہیں۔ عوام پر صرف طاقت کے اظہار کا اثر ہوتا ہے۔ طاقت کا اظہار صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب یا تو صاف صاف کسی کی حمایت کی جائے یا مخالفت کی جائے۔ عوام پر کبھی ایسی ادھوری روش کا اثر نہیں ہوتا۔ جو مخالفت اور حمایت کے مابین ڈانواڈول ہو چونکہ عوام کا میلان جذبات پر انحصار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے کسی حامی یا مخالف ہو جائیں تو پھر حیرت انگیز استقامت سے اپنے فیصلہ پر ڈٹے رہتے ہیں۔

ایمان سے پیدا ہونے والا جذبہ ہمیشہ علم سے پیدا ہونے والے یقین کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ ذہن سے احترام مٹ جاتا ہے۔ لیکن قلب سے محبت محو نہیں ہوتی۔ اختلاف رائے ختم ہو جاتا ہے لیکن نفرت بمشکل ہی دور ہوتی ہے۔ اس کرہ ارض پر جتنے بھی زبردست انقلابات رونما ہوئے ہیں ان کو پیدا کرنے والی طاقت کبھی علمی بحث و مباحثہ سے نہیں ہوئی۔ نہ ہی کبھی علمی موشگافیوں سے عوام کو گہر متاثر کیا جا سکا ہے۔ ہاں جوش عقیدت سے لبریز ہو کر عوام ہمیشہ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں۔ بسا اوقات عوام کو میدان عمل میں دھکیلنے والا یہ جوش عقیدت جنون کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جو کوئی عوام کے دل مٹھی میں کر لینے کا خواہاں ہوا سے پہلے وہ چابی تلاش کرنی چاہیے جس سے عوام کے دلوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ دو اور دو چار کا پہاڑا یاد کرنے سے عوام کے دل کا قفل کبھی نہیں کھولا جا سکتا۔ ہاں عزم صمیم سے اور اگر ضرورت ہو تو طاقت سے کام لے کر یہ قفل ہمیشہ کھولا جا سکتا ہے۔

عوام طبعاً انتہا پسند ہوتے ہیں

(۴) عوام پر صرف اسی صورت میں قابو کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحریک کی قیادت کر رہے ہیں وہ پکا ارادہ کر لیں کہ نہ صرف اپنے مقاصد حاصل کر کے رہیں گے بلکہ جو دشمن مقابلہ پر آئے گا اسے ختم بھی کر دیں گے۔

جب عوام دیکھتے ہیں کہ کسی فریق نے اپنے حریف پر زبردست حملہ کر دیا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا زبردست حملہ آور ضرور حق پر ہی ہوگا۔ لیکن اگر حملہ آور مذبذب ہو اور اپنی کامیابی سے یہ فائدہ نہ اٹھائے کہ اسے مد مقابل کو بالکل ختم کر دے تو پھر لوگ پھر سمجھتے ہیں کہ اس حملہ آور کو ضرور اپنی سچائی میں شک ہے۔ کبھی کبھی تو حملہ آور کے تذبذب سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا جاتا ہے کہ ضرور اس کے دعوے میں کھوٹ شامل ہوگا۔

عوام بھی تو آخر فطرت ہی کا ایک جزو ہیں۔ قدرت نے عوام کے جذبات کی ساخت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ دو کھلے دشمنوں کو آپس میں مصافحہ کرتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت ور کمزور پر غالب آ جائے یا کمزور غیر مشروط طور پر طاقت کی اطاعت قبول کر لے۔

اگر عوام پر قوم پرستی کا رنگ چڑھانا ہے تو یہ کوشش صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب عوام کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینے کی خاطر تعمیری جدوجہد کی جائے۔ اور جو شیطان عام میں بین الاقوامی خیالات کا زہر پھیلا رہے ہیں ان کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔

(۵) آج کل جن مسائل کو بڑے بڑے مسائل سمجھ لیا گیا ہے درحقیقت وہ سب وقتی مسائل ہیں۔ ان مسائل کے پس پشت کچھ گہرے در واضح اسباب کام کر رہے ہیں اور ان اسباب کی تہہ میں بھی ایک بڑا سبب ایسا ہے جو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہ بڑا سبب اس مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے کہ قوم کی نسل کو کس طرح پاک رکھا جائے۔ انسان کی تنومندی یا انحطاط کا انحصار خون پر ہے۔ جو قومیں اپنی نسل کی اہمیت سے واقف نہیں یا اپنے نسب کو محفوظ رکھنے کی پرواہ نہیں کرتیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی

کسی ذلیل بازاری کتے سے اعلیٰ درجے کے شکاری کتے کا کام لینا چاہے۔ وہ نہیں جانتے کہ شکاری کتے کی تیز رفتاری اور پالتو کتوں کی سدھائے جانے کی استعداد وہ پیدائشی خصلتیں ہیں جو کسی قسم کی تربیت سے نہیں سکھائی جاسکتیں۔ جو قوم اپنے نسلی خون کو پاک نہیں رکھ سکتی وہ اس طرح اپنی قوم کے روحانی اتحاد کو پارہ پارہ کرسکتی ہے جب روحانی اتحاد برباد ہوگی اتو اس اتحاد کی بنیادوں پر تعمیر ہونے وای تمام عمارت بھی تباہ ہو جاتی ہے جن سے بیرونی دنیا کو اس اتحاد کے کرشمے نظر آسکتے ہیں۔ جب کسی قوم کے خون میں ملاوت ہوجائے تو قومی کردار میں فتور پیدا ہو جانا اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ کسی قوم کی روحانی اور تخلیقی استداد میں جب کبھی کوئی انقلاب آتا ہے وہ دراصل نسلی انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اگر ہم نے جرمن قوم کو ان کمزوریوں اور عادتوں سے نجات دلانی ہے جو جرمن کردار کا لازمی نتیجہ نہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان خارجی جراثیم سے نجات حاصل کرنی ہوگی جو قوم کے جسم کے اندر باہر سے گھس آئے ہیں اور تمام کمزوریوں اور بد عادتوں کا سرچشمہ ہیں۔

جرمن قوم کی عظمت اس وقت تک بحال نہ ہوگی جب تک نسلی مسئلہ کا احساس بیدار نہیں ہو جاتا اور پھر یہ مسئلہ حل نہیں کیا جاتا۔ نسلی مسئلہ نہ صرف ہر انسانی تحریک کو سمجھنے کی کلید ہے بلکہ اس کی مدد سے ہر نوع انسانی کے تمدن کی کنہ کو بھی پایا جاسکتا ہے۔

قوم پرستی سے قبل محروم طبقات کی دلجوئی لازم ہے

(٦) ہماری قوم کے جو عوام اج کل بین الاقوامی جال میں پھنس چکے ہیں جب ہم ان کو قوم کی آغوش میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کوشش کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم مختلف پیشہ وروں اور دوکانداروں کے مفاد کی حفاظت کرنے کا اصول ترک کر دینے پر آمادہ ہیں۔ مختلف اقسام کی مزدوری اور دوکانداری کے مفاد میں جو باہمی تخالف پایا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ قوم کو بھی اتنے ہی طبقات میں بانٹ دیا جائے۔ یہ

تخالف تو محض اقتصادی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ اگر ایک پیشہ والے مل جل بیٹھیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے قومی اتحاد میں کوئی رخنہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے اپنے پیشہ وارانہ مفاد کی حفاظت کا مطلب ہی یہی ہے کہ جن مسائل کا قومی زندگی پر اثر پڑتا ہو انہیں حل کرنے کے لیے سب اکٹھے ہو جائیں۔

سرکار کیا ہے؟ سرکار نام ہے قوم کی تنظیم کا۔ قوم میں ان لوگوں کو بھی شامل کرنا چاہیے جو آج ادنیٰ طبقات میں شمار ہوتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعلیٰ طبقات کے رتبہ کو کم کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ طبقہ کے رتبہ کو بلند کر دیا جائے۔ یہ کام اعلیٰ طبقات سے کبھی سرانجام نہ پائے گا۔ یہ فرض تو وہی ادنیٰ طبقات ادا کر سکتے ہیں جو حقوق کی مساوات حاصل کرن کے لیے لڑ رہے ہیں۔ آج کل کھاتے پیتے طبقات و سرکار دربار میں جو دخل حاصل ہے وہ انہوں ے رئیسوں یا نوابوں کی مدد سے حاصل نہ کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی طاقت سے حاصل کیا تھا۔ اور ان لیڈروں کی مدد سے حاصل کیا تھا جو خود ان کی صفوں سے اٹھے تھے۔

جرمن مزدوروں کے درجہ کو بلند کرنے اور انہیں جرمن قوم کے اندر ان کا مقام واپس دلانے کی جدوجہد خالی میٹھے میٹھے جلسوں اور زبانی جمع خرچ سے کامیاب نہیں ہو سکتی نہ ہی کام قومی اخوت کے راگ گانے سے ہو سکتا ہے۔ اگر واقعی یہ کام کرنا ہے تو اس کے لیے مزدور کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو اونچا اٹھانا ہو گا اور اس کی خاطر باقاعدہ محنت کرنی ہو گی۔ یہ محنت اس وقت تک جاری رکھنی پڑے گی جب تک کہ مزدور اور دوسرے طبقات کے مابین جو خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اسے پاٹ نہ دیا جائے جو تحریک یہ مقصد لے کر اٹھی ہو اسے اپنے پیرو مزدوروں کی صفوں میں تلاش کرنے ہوں گے۔ ایسی تحریک میں پڑھے لکھے طبقات کے صرف ان افراد کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے جو تحریک کے متصد کو نہ صرف پوری طرح سمجھ چکے ہوں' اور پوری طرح قبول کر چکے ہوں بلکہ غیر مشروط طور پر تحریک کے پیرو بھی بن چک ہوں۔ لوگوں میں تبدیلی پیدا کرنا اور پھر انہیں

باہم ازسرنو متحد کر دینا دس یا بیس سال کا کام نہیں ۔ یہ مہم تو کئی پشتوں تک جاری رکھنی پڑے گی جیسا کہ ایسی تحریکوں میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

کمیونسٹ اور سرمایہ دار دونوں قوم کے خیر خواہ نہیں

آج کل کے مزدور کو قوم کے آغوش کے اندر واپس لانے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ نہیں کہ وہ دوسرے مزدوروں کے مفاد کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ وہ بین الاقوامی اعتقادات ہیں جن کا رنگ اس پر چڑھ چکا ہے ۔دراصل یہ بین الاقوامی اعتقادات قوم پرستی اور وطن پرستی کے دشمن ہیں ۔ قوم اور وطن کی یہ دشمنی مزدوروں کے لیڈروں نے پیدا کی ہے ۔ اگر یہ لوگ قومی وفاداری کے جذبہ سے سرشار ہوتے اگر ان کی معاشرتی جدوجہد میں ہمیشہ قومی مفاد مدنظر رہتے تو پھر ٹریڈ یونینیں لاکھوں مزدوروں کو قوم کے بہترین فرزند بنا دیتیں ۔ ایسا کرنے سے ان ٹریڈ یونینوں کی اس جدوجہد میں کچھ فرق نہ آتا جو وہ اپنے اقتصادی مطالبات کو منظور کروانے کے لیے جاری رکھ سکتی تھیں ۔

جو تحریک سچے دل سے جرمن مزدور کو قوم کے آغوش میں واپس لانا چاہتی ہے، اور اسے بین الاقوامی حماقت کے پنجہ سے نجات دلانا چاہتی ہے اس کا فرض ہے کہ بعض ایسے خیالات کے خلاف سرگرمی سے مہم جاری کرے جو کارخانہ داروں میں پھیل چکے ہیں ان خیالات میں سے ایک خیال تو یہ ہے کہ قومی مفاد کے پیش نظر ملازمین کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام اقتصادی حقوق آقا کی نذر کر دیں ۔ اگر مزدور اپنے منصفانہ اور ضروری حقوق حاصل کرنے کے لیے بھی مطالبہ کرے تو وہ قوم سے بغاوت کا مجرم ہو گا ۔ اس قسم کے خیالات پھیلانے والے لوگ بالکل جھوٹے ہیں قوم کے مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ ایک ہی فریق پر ساری ذمہ داریاں ڈالی جائیں اور دوسرے فریق پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔

اگر کوئی مزدور خود اپنی رائے سے مبالغہ آمیز مطالبات پیش کرتا ہے، مشترکہ مفاد کا

لحاظ نہیں رکھتا، یا قوم کے اقتصادی نظام کو قائم رکھنے کی پرواہ نہیں کرتا تو یقیناً وہ قوم کا مجرم ہے لیکن جو کارخانہ دار ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے ظالمانہ طریقے استعمال کرتا ہے قوم کے مزدور پیشہ افراد کا حق ادا نہیں کرتا ار مزدوروں کا خون پسینہ بہا کر خود کروڑوں کماتا ہے اسے بھی تو قوم کا خیر خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایسے کارخانہ دار کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو قوم پرست کا لقب دے نہ ہی اسے قوم پرستی کا چرچا کرنے کا حق ہے وہ تو ایک بے اصول خود غرض ہے جو بے اطمینان کے بیج بو رہا ہے اور ایک ایسے فساد کی بنیاد رکھ رہا ہے جو دیر یا زود ملک کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔

سب سے پہلے نوزائیدہ تحریک کو جس خزانہ میں سے ممبر بھرتی کرنے میں وہ مزدوروں پر مشتمل ہے عوام کو بین الاقوامی جنون کے پنجہ سے نجات دلانا اس تحریک کا فرض ہے۔ اس تحریک کو سب سے پہلے مزدوروں کی معاشرتی بدحالی دور کرنی چاہیے ان کا ثقافتی معیار جو آج کل افسوس ناک حد تک پست ہے بلند کرنا چاہیے اور انہیں قوم کا ایک ایسا اولوالعزم اور قابل قدر عنصر بنا دینا چاہیے جو قوم پرستی اور خدمت قوم کے جذبہ سے سرشار ہو۔

کھاتے پیتے لوگ سیاسی لحاظ سے مفلوج ہیں

اگر قوم پرست تعلیم یافتہ طبقات میں سے بعض ایسے افراد ڈھونڈے جا سکیں جنہیں سچ مچ عوام سے محبت ہو، جو شوق سے جرمنی کے مستقبل کی آس لگائے بیٹھے ہوں اور ساتھ ہی اس جدوجہد کی اہمیت بھی سمجھتے ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے دلوں کو اپنی مٹھی میں کر لیا جائے تو ایسے افراد کو تحریک کی جانب سے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی صفوں میں جگہ دے دینی چاہیے ایسی تحریک اپنے اراکین ہرگز ان کھاتے پیتے رائے دہندگان میں سے بھرتی نہیں کر سکتے جنہیں نہ عقل ہے نہ سمجھ اگر اس تحریک نے ایسا کیا تو اس میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد گھس آئے گی جن کی ذہنیت عوام کی ہمدردیاں حاصل

کرنے کی جدوجہد مفلوج کر کے رکھ دے گی خیالی طور پر یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اگر قوم کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کو ایک ہی تحریک میں جمع کر دیا جائے تو عوام پر اس کا اثر بہت اچھا ہو گا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ کھاتے پیتے لوگوں پر ایک نفسیاتی اثر پیدا کیا جا سکتا ہے، ان کو جوش میں لایا جا سکتا ہے، عام مظاہروں سے ان کو تحریک کے مقاصد کا تھوڑا بہت ہمدرد بھی بنایا جا سکتا ہے لیکن ان کی روایتی خصلتیں نہیں بدلی جا سکتی یہ دونوں عادتیں تو صدیوں سے ان کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ دونوں طبقات کے ثقافتی معیار میں اتنا فرق ہے اور معاشرتی و اقتصادی مسائل کے متعلق ان کی روش ایسی متضاد ہے کہ جس تحریک میں ان دونوں کو اکٹھا کر دیا جائے جب اس کا مظاہروں کے زور سے پیدا کیا ہوا جوش ختم ہو جائے گا تو پھر دونوں طبقات کا تخالف تحریک کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔

آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ ہمارا پروگرام یہ نہیں کہ دوسرے گروہوں کو راضی کرنے کی غرض سے قوم پرستوں کے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے بلکہ ہمارا پروگرام تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے بس میں لے آئیں جو قوم پرستی کے مخالف ہیں۔

ساری تحریک کے کاروبار کا نقشہ اسی زاویہ نگاہ سے تیار کرنا چاہیے۔

کسی عقیدہ کی تبلیغ سے پہلے اس پر پختہ یقین لازمی ہے

7 تحریک کا پراپیگنڈہ کرتے وقت بھی ایک واضح اور صاف روش اختیار کرنی چاہیے اور کھلم کھلا ایک فریق کی حمایت کا اظہار کرنا چاہیے اس کے بغیر تو کوئی پراپیگنڈہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

اگر پراپیگنڈہ سے تحریک کو کوئی فائدہ پہنچانا ہے تو اس کا خطاب صرف ایک فریق سے ہونا چاہیے اگر کوئی پراپیگنڈہ اپنی اپیل کا رخ بدلتا ہے تو ممکن ہے کہ ایک فریق اس کو سمجھ نہ سکے یا دوسرا فریق اس سے ناراض ہو جائے یا یہ سمجھا جائے کہ یہ پراپیگنڈہ تو بالکل پیش پا افتادہ اور بے سود امور پر توجہ دے رہا ہے وجہ یہ کہ جن دو فریقوں کا یہاں

ذکر ہے ان کی ذہنی تربیت بالکل مختلف انداز سے ہوئی ہے۔

کوئی خیال جس اسلوب سے پیش کیا جاتا ہے اس کا بھی لوگوں پر مختلف اثر ہوتا ہے یہ باتیں دیکھنے میں چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی ہیں، لیکن دو جداگانہ معاشرتی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ان کا فرق بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اگر پراپیگنڈہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچنے کی کوشش کرے اور عامیانہ انداز میں اپنا مطلب ظاہر نہ کرے تو عوام پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ دوسری طرف اگر پراپیگنڈہ عوام کے خام جذبات کو الفاظ اور علامات کا جامہ پہنا دے تو پڑھے لکھے طبقات اس کو پسند نہ کریں گے کیونکہ وہ کہیں گے یہ پراپیگنڈہ تو بالکل بھونڈا اور سوقیانہ ہے جن لوگوں کو تقریر کرنے کی قابلیت کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے اگر ان میں سے سو آدمیوں کا جائزہ لیا جائے تو بمشکل دس ایسے ملیں گے جو آج بھنگیوں، لوہاروں اور قلیوں کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرکے اسے قائل کر سکیں اور کل اسی مضمون کو اتنے ہی پر اثر طریقہ سے یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طالب علموں کے سامنے پیش کر سکیں ایسا مقرر تو کوئی ہزار میں سے ایک ملے گا جو کسی ایسے مجمع کے سامنے تقریر کر سکے جہاں ایک ہی جلسہ میں لوہار اور پروفیسر ملے جلے بیٹھے ہوں اور تقریر بھی پھر اس طرح کر سکے کہ سب لوگ اس کے مطلب کو پورے طور پر اور یکساں سمجھ جائیں تقریر کا انداز ایسا ہو کہ دونوں گروہوں میں جوش پیدا ہو جائے، اور دونوں دل سے اس کی داد بھی دیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے اکثر بلند خیالات اور پاکیزہ عقیدے عوام کو اسی صورت میں سمجھائے جا سکتے ہیں جب ان خیالات اور عقائد کو عوام کے سامنے بیان کرنے کے لیے کسی معمولی درجہ کے مبلغ کی امداد بھی شامل حال ہو۔ عوام کو ایک عقیدہ سمجھانے میں اس بات سے کچھ مدد نہیں ملتی کہ جس اعلیٰ دماغ والے انسان نے یہ نظریہ ایجاد کیا تھا اس کا رتبہ کتنا بلند ہے عوام کو سمجھانے میں کامیابی کا انحصار تو اس پر ہے کہ اس نظریہ کے مبلغ کہاں تک اسے عام فہم پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں۔

جمہوریت پرستوں اور کمیونسٹوں کی تحریکیں قوم کے عوام کو اس لیے کھینچنے میں

کامیاب ہو جاتی تھیں کہ یہ لوگ جن مسائل کو بیان کرتے ہیں عوام کے دل میں پہلے سے ان کے لیے ہمدردی موجود ہے ان کے خیالات جتنے تنگ اور دلائل جتنے محدود ہوں اتنی ہی زیادہ آسانی سے عوام ان کا مطلب سمجھ سکتے ہیں، اور اتنی ہی جلدی ان پر یقین بھی کر لیتے ہیں وجہ یہ کہ اس قسم کے خیالات اور دلائل عوام کی گھٹیا ذہنی قابلیت کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہی مصلحتیں تھیں جن کو مدنظر رکھ کر ہماری نئی تحریک نے ایک صاف اور سادہ پالیسی اختیار کی یہ پالیسی حسب ذیل تھی۔

پراپیگنڈے کا پیغام اور انداز بیان دونوں اس قسم کے ہونے چاہئیں جو عوام کے ذہن سے اونچے نہ ہوں پراپیگنڈے کی قدر و قیمت کا اندازہ محض اس کی عملی کامیابی سے لگانا چاہیے جس جلسہ میں عوام جمع ہوں وہاں کسی مقرر کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ اس کی تقریر حاضرین میں سے خالی تعلیم یافتہ لوگ ہی سمجھ سکیں بلکہ اچھا مقرر وہ ہے جو عوام کے دل مٹھی میں کر لینے کا گر جانتا ہو۔

پراپیگنڈے کا مقصد علمیت کا چھانٹنا نہیں بلکہ قائل کرنا ہوتا ہے

اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی کسی جلسہ میں موجود ہو اور کسی تقریر میں محض اس وجہ سے نقص نکالے کہ تقریر کی علمی سطح اس کی اپنی قابلیت سے کم تھی گو اس نے جلسہ میں یہ بھی دیکھ لیا ہو کہ اس تقریر کا اثر معمولی قابلیت رکھنے والے لوگوں پر بہت اچھا ہوا تھا، جن کو قائل کرنا اصل مقصد ہے تو ایسا پڑھا لکھا آدمی اپنے اس رویہ سے فقط یہ ثابت کرتا ہے کہ اس میں صورت حال کا اندازہ کرنے کی قابلیت قطعاً موجود نہیں اور اس لیے وہ کسی نئی تحریک کے لیے ہرگز مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ کسی تحریک کے لیے صرف وہی تعلیم یافتہ لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو تحریک کے پیغام اور مقاصد کو ایسی اچھی طرح سمجھ چکے ہوں کہ پراپیگنڈا کرتے وقت فقط پراپیگنڈے کی کامیابی ملحوظ رکھیں، اور اسکی کوئی پرواہ نہ کریں کہ خود پڑھے لکھوں پر اس پراپیگنڈے کا اثر کیا ہوتا ہے آخر ہمارے پراپیگنڈے کا مقصد قوم

پرستی کا میلان رکھنے والے لوگوں کے لئے تفنن طبع کا سامان مہیا کرنا تو نہیں پراپیگنڈے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو قائل کیا جائے جو ہماری نسل سے ہیں اور جن کی رگوں میں ہمارا ہی خون دوڑ رہا ہے، لیکن آج تک وہ قوم پرستی کے مخالف رہے ہیں قاعدہ کلیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد کامیاب بنانے کے لیے جس قسم کا پراپیگنڈہ کرنا ہے، اور اس پراپیگنڈے کو عملی شکل دینے کے لیے جو طریقے اختیار کرنے ہیں ان کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں وہ اصول اور قواعد پیش نظر رکھنے چاہئیں جن کی تفصیل اس کتاب کے ایک باب میں بیان ہو چکی ہے اس باب کا عنوان ہے ''جنگ اور پراپیگنڈہ'' ہماری تحریک کو بعد میں جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہمارا فیصلہ صحیح تھا۔

سیاسی اصلاح حصول اقتدار کے بغیر ممکن نہیں

8 سیاسی اصلاح کی کوئی تحریک فقط رائے عامہ کی تنظیم سے برسر اقتدار گروہ پر دباؤ ڈال کر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ سیاسی اقتدار پر خود قبضہ کیا جائے ہر وہ عقیدہ جو دنیا میں کوئی انقلاب برپا کر دینا چاہتا ہے اس کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ ان تمام ذرائع پر قابض ہونے کی کوشش کرے جو اس عقیدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اس دنیا میں جو فتح یاب ہو جائے وہی سچا ہے، اور جو شکست کھا جائے وہی جھوٹا ہے جب میں اس سلسلہ میں فتح کا نام لیتا ہوں تو اس سے میری مراد ویسی فتح نہیں ہوتی جو 1918ء میں اقتدار کے بھوکوں نے حاصل کر لی تھی بلکہ میری مراد ایک ایسی فتح ہوتی ہے جس سے ساری قوم کے مفاد کو تقویت پہنچے بعض کوڑھ مغز جرمن قانون دانوں کا یہ خیال غلط ہے کہ جب انقلابی سرکار پر قابض ہو جائیں تو بس انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے کسی انقلاب کو اسی وقت کامیاب کہا جا سکتا ہے جب انقلاب کے بعد قائم ہونے والی حکومت کے ماتحت قوم کی حالت پہلی حکومت کے عہد کے مقابلہ میں سدھر جائے اور

جن اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے انقلاب کا بیڑا اٹھایا گیا تھا وہ پورے ہو جائیں نام نہاد جرمن انقلاب جس نے 1918ء کے موسم خزاں میں ڈاکوؤں کی ایک ٹولی کو مسند اقتدار پر مسلط کر دیا تھا اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔

جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کے بغیر کسی اصلاحی تحریک کے عملی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے تو پھر ہر اصلاحی تحریک کے لیڈروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ روز آغاز سے ہی اپنی تحریک کو ایک عوامی تحریک بنانے کی کوشش کریں اور اسے محض ایک ادبی مجلس یا چائے پینے کا کلب، یا ایسے جاہلوں کی انجمن نہ بنا دیں جو گاہے گاہے تاش کھیلنے میں مل بیٹھتے ہیں۔

ہمارا طریقہ کار آمرنہ ہے جمہوری نہیں

9 نئی تحریک کی فطرت اور اس کا داخلی نظام متقاضی ہیں کہ یہ تحریک پارلیمنٹری طریقہ کار کی مخالف ہو گی پارلیمنٹری طریقہ کار کا مخالف ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہماری تحریک نظری اور عملی دونوں لحاظ سے یہ اصول تسلیم نہیں کرتی کہ فیصلہ ہمیشہ اکثریت کے حق میں ہونا چاہیے اور لیڈر کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ دوسروں کی رائے اور ارادے پر عمل کرتا رہے ہماری تحریک کا اصول یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ سے لے کر بڑے سے بڑے معاملہ تک ہر فیصلہ کا پورا اختیار اور کامل ذمہ داری کسی فرد کے سپرد ہونی چاہیے۔

ہماری تحریک میں اس اصول کو تسلیم کرنے کے عملی نتائج حسب ذیل ہیں:

ہر بڑے حلقہ کا صدر اپنے بالائی قائدین کی جانب سے مقرر کیا جاتا ہے اس کے بعد وہ اپنے حلقہ کا قائد بن جاتا ہے اور اس حلقہ کی جانب سے جواب دہ بھی ہوتا ہے تمام کمیٹیاں قائد کے ماتحت ہوتی ہیں قائد کمیٹیوں کے ماتحت نہیں ہوتا کوئی کمیٹی رائے شماری کی بنیاد پر کام نہیں کرتی کمیٹیاں محض اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ ان کے سپرد کوئی خاص خدمت ہوتی ہے خدمت کے لیے تقسیم فرائض کا اختیار حلقہ کے صدر کو حاصل

ہوتا ہے ساری ذمہ داری قائد کے سر پر ہوتی ہے یہی اصول بڑے حلقوں پر بھی حاوی ہے مثلاً ضلع کا حلقہ،شہر کا حلقہ اور صوبہ کا حلقہ وغیرہ وغیرہ ہر حلقہ میں صدر کا تقرر بالائی قیادت کی جانب سے ہوتا ہے ہر صدر کو کامل منصبی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں صرف ساری پارٹی کا قائد اعلیٰ تمام ممبروں کے جلسہ عام کے ذریعہ چنا جاتا ہے وہ تحریک کا واحد قائد ہوتا ہے تمام کمیٹیاں اس کے سامنے جواب دہ ہوتی ہیں لیکن وہ کسی کمیٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا اس کا فرمان ناطق ہوتا ہے اس کے فیصلوں کی پوری ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے تحریک کے ممبروں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ غلط کام کرے تو اس کی جگہ نیا قائد چن لیں اگر وہ تحریک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے یا تحریک کی کافی خدمت سے قاصر رہے تو اسے اس کے عہدے سے ہٹایا جا سکتا ہے پھر اس کی جگہ کوئی دوسرا لائق آدمی لیڈر بنا لیا جاتا ہے جسے وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اور جسے وہی ذمہ داریاں اٹھانے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

تحریک کے ذمہ جو عالی شان فرائض سپرد ہیں ان میں سے ایک بڑا فرض یہ ہے کہ قیادت کے اصول کو نہ صرف تحریک کی اپنی صفوں کے اندر نافذ کیا جائے، بلکہ سرکار اور حکومت کو بھی اسی اصول کا پابند بنا دیا جائے۔

جب کوئی شخص قائد مقرر ہوتا ہے تو پھر اسے اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور ان اختیارات پر کوئی قید باقی نہیں رہتی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے کندھوں پر زبردست اور آخری ذمہ داری کا بوجھ بھی آ پڑتا ہے۔

جس شخص میں یہ جرات نہیں کہ وہ اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے لیڈر بنایا جائے اس کام کا بیڑا وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو شجاعت کے سانچہ میں ڈھلا ہو۔

انسانیت نے آج تک جو ترقی کی ہے اور انسان نے جس تمدن کی بنیاد رکھی ہے اس کا سہرا کبھی عوام کے ہجوم کے سر نہیں رہا یہ کارنامے ہمیشہ کوئی غیر معمولی قابلیت رکھنے

والا فرد ہی انجام دیتا رہا ہے اور ایسے کرشمے ہمیشہ کسی شخصیت کے مرہون منت رہے ہیں۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تحریک پارلیمنٹری سرگرمیوں کے حق میں نہیں اگر ہماری تحریک کبھی پارلیمنٹری اداروں کو چلانے میں کوئی حصہ لیتی ہے تو صرف اس غرض سے کہ ان اداروں میں شامل ہو کر ان کو اندر سے تباہ کر دیا جائے ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ پارلیمنٹری ادارے زوال انسانیت کی بدترین علامت میں داخل ہیں۔

سیاسی تحریک کو غیر سیاسی مسائل سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے

10 یہ تحریک پوری پائمردی سے فیصلہ کر چکی ہے کہ کسی ایسے مسئلہ کے متعلق رائے ظاہر نہ کرے گی جو تحریک کے دائرہ کار سے باہر ہو یا جو ہماری نگاہ میں کوئی بنیادی اہمیت نہ رکھتا ہو ہماری تحریک کسی دینی اصلاح کی داعی نہیں یہ تحریک تو صرف قوم کو سیاسی لحاظ سے منظم کرنے کی خاطر قائم کی گئی ہے قوم کے اندر جو دو بڑے بڑے مذہبی فرقے پائے جاتے ہیں تحریک ان کو قوم کے وجود کا یکساں جزو لاینفک تصور کرتی ہے تحریک ان تمام پارٹیوں سے برسر پیکار رہے گی جو دین کو اس کے مرتبہ سے گرانے والی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں دین تو قوم کے مذہبی اور اخلاقی استحکام کی بنیاد ہے لیکن یہ لوگ دین کو اپنی سیاسی اغراض کے حصول کے لیے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں آخر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ تحریک سرکاری نظام کی کوئی خاص ہیئت تشکیل قائم کرنے یا مٹانے کی خواہش مند نہیں بلکہ تحریک تو ان بنیادی اصولوں کو نافذ کرنا چاہتی ہے جن کے بغیر نہ کوئی جمہوریت زیادہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے نہ کوئی ملوکیت تحریک نہ ملوکیت کے قیام کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور نہ جمہوریت کی بقا پر مصر ہے تحریک تو ایک جرمن سرکار قائم کرنے کی تڑپ لے کر اٹھی ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ بالآخر اس جرمن سرکار کی ہیئت تشکیل کیا ہوگی تو ہماری نگاہ میں اس مسئلہ کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو وقتی مصلحتوں

کے پیشِ نظر حل کیا جائے گا۔

جب کوئی قوم ان بڑے بڑے مسائل اک شعور حاصل کر لیتی ہے جن پر اس کی زندگی کا درحقیقت انحصار ہے تو پھر اس قوم میں محض خارجی رسوم کی نوعیت طے کرنے میں ہرگز کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔

قائداور مقلدین کا رابطہ براہ راست ہونا چاہیے

11 جہاں تک تحریک کی اندرونی تنظیم کا تعلق ہے یہ کوئی اصول کا سوال نہیں جیسا مصلحت کا تقاضا ہوگا اس کے مطابق تحریک کی تنظیم کر لی جائے گی

بہترین تنظیم وہ نہیں ہوتی جو تحریک کی قیادت اور انفرادی پیروؤں کے مابین بہت زیادہ واسطے حائل کر دے تنظیم کی خوبی تو یہ ہے کہ کم سے کم امکانی واسطوں کے ذریعہ کام نکالا جائے اس قسم کی تنظیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص عقیدہ جو کسی ایک شخص کے ذہن کی اختراع ہے بہت سے لوگوں تک پہنچا دیا جائے اور پھر اس امر کی نگرانی رکھی جائے کہ وہ لوگ کس طرح اس عقیدے پر عمل کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ چاہے کسی پہلو سے دیکھا جائے تنظیم ایک ایسی مصیبت ہے جس کے بغیر چارہ نہیں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ تنظیم بعض مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جب اس ذریعہ کو بجائے خود کوئی مقصد سمجھ لیا جائے تو نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔

چونکہ اس دنیا میں باشعور لوگوں کی نسبت بے شعور لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے تنظیم کی حقیقی روح کو پیدا کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں محض تنظیم کی ظاہری صورت قائم کر لینا آسان رہتا ہے کسی تنظیم کی روح ہمیشہ وہ عقائد ہوتے ہیں جن کی تعمیل کے لیے تنظیم کھڑی کی جاتی ہے۔

جب کوئی عقیدہ اپنے آپ کو عملی شکل دینے کی منزل کی جانب سفر شروع کرتا ہے تو اسے عام طور پر راستہ میں حسب ذیل مدارج سے گزرنا پڑتا ہے اگر یہ کوئی اصلاحی نوعیت کا عقیدہ ہے تو پھر اس پر ان مدارج کا اطلاق زیادہ وثوق سے کیا جا سکتا ہے ہر تخلیقی

عقیدہ پہلے کسی ایک شخص کے قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر وہ شخص محسوس کرتا ہے کہ مجھے یہ عقیدہ ساری دنیا میں پھیلانا چاہیے وہ شخص اپنا عقیدہ دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے آہستہ آہستہ کئی لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں اپنے عقائد اپنے معاصرین تک براہ راست اور خود پہنچانے کا یہ بہترین طریقہ ہے اور سب سے زیادہ فطرت کی قرین بھی ہے لیکن جوں جوں تحریک کی ترقی ہوتی ہے اور مقلدین کی تعداد بڑھتی ہے تو بعد میں یہ نا ممکن ہو جاتا ہے کہ جس عقیدے پر تحریک کی بنیاد اٹھائی گئی ہے اس کا اصلی بانی خود شخصی طور پر ان گنت مقلدین کے سامنے اس کی تبلیغ کرتا پھرے، اور اس کے ساتھ ساتھ تحریک کی قیادت کے فرائض بھی سرانجام دے۔

تنظیم کے معنی کیا ہیں؟

جوں جوں مقلدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے توں توں تحریک کے قائد اور مقلدین کے مابین براہ راست بات چیت مشکل ہوتی چلی جاتی ہے قائد اور مقلدین کے مابین رابطہ برقرار رکھنے کے لیے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس طرح سے تحریک کے ڈھانچہ میں درمیانی روابط کا نظام بھی شامل ہو جاتا ہے یوں قائد اور مقلدین کے مابین براہ راست رابطہ ختم ہو جاتا ہے جو کہ ایسے رابطہ کی بہترین شکل ہے براہ راست رابطہ کی جگہ اب قائد اور مقلدین کے مابین تنظیم کا رشتہ آ شامل ہوتا ہے کیونکہ اس مصیبت کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا اس کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے درمیانی حلقے بیچ میں شامل ہو جاتے ہیں اگر کسی سیاسی تحریک کو دیکھا جائے تو اس میں چھوٹے چھوٹے حلقوں کی مثال وہ مقامی شاخیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ آہستہ آہستہ تحریک کی تنظیم کی اٹھان ہوتی ہے۔

تحریک کا قبلہ مقرر کرنے کی اہمیت

کسی تحریک میں ذیلی اور ضمنی حلقے اس وقت تک قائم نہ کرنے چاہئیں جب تک کہ تحریک کے روحانی بانی کے غیر مشروط تقلید کا اصول تمام مقلدین میں مسلم طے نہ پا چکا

ہو ورنہ خطرہ ہے کہ تحریک اعتقادی اختلافات کے باعث ٹکڑیوں میں نہ بٹ جائے اس سلسلہ میں کسی جغرافیائی مرکز کو تحریک کا قبلہ عقیدت بنا دینے کی ضرورت پر جتنا زور دیا جائے کم ہے جب اس قسم کا کوئی مرکزی یا قبلہ قائم ہو جائے تو پھر اس کے گرد ایک ساحرانہ کشش کا ہالہ کھنچ جاتا ہے مکہ معظمہ اور رومۃ الکبریٰ ایسے ہی مراکز تھے ایسے مرکز سے تحریک کو چلانے کے لیے ایک مستقل قوت پیدا ہو جاتی ہے اس قوت کا سرچشمہ تحریک کا داخلی اتحاد ہوتا ہے اور اس اتحاد کی نشانی ایک قائد کی اطاعت ہوتی ہے۔

جب کسی تحریک کے ابتدائی حلقوں کی تخم پاشی ہو رہی ہو تو اس وقت بڑی احتیاط سے بار بار اس مقام کی اہمیت پر زور دینا چاہیے جہاں تحریک کے عقائد کی ابتدا ہوئی تھی جس جگہ سے تحریک پہلے پہل شروع ہوئی تھی اور جہاں سے اس پر قابو رکھنا ہے اس کی اخلاقی، تخلیقی اور عملی عظمت کا اتنا چرچا کرنا چاہیے کہ اس مقام کی عظمت تحریک کی عظمت کی سب سے بڑی علامت قرار پا جائے۔ جوں جوں تحریک کے ابتدائی حلقوں کی تعداد اتنی بڑھتی چلی جائے کہ ابتدائی حلقوں کے اوپر اور مراکز کے نیچے، درمیانی حلقے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہو، توں توں مرکز کے احترام میں اور زیادہ مبالغہ کرنا چاہیے۔

جب تحریک کے اراکین کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تحریک کے قائد کا منفرد رابطہ بالکل ناممکن ہو جائے تو اس مرحلہ پر پہلی مرتبہ مقامی شاخیں قائم کرنی چاہئیں جب درمیانی حلقوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تب یہ ضرورت محسوس ہو گی کہ کچھ ایسے بالائی حلقے قائم کیے جائیں جن کے ماتحت یہ درمیانی حلقے تقسیم ہو جائیں ایک سیاسی تحریک میں اس حلقہ وار تقسیم کی مثال صوبائی اور اضلاعی حلقے ہوتے ہیں۔

اگرچہ تحریک کے اولین مرکز اقتدار کو بالکل نیچے کے ابتدائی حلقوں پر قابو رکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی لیکن تنظیم کے بالائی حلقوں پر اقتدار قائم رکھنا بعد میں ذرا مشکل ہو جایا کرتا ہے باوجود اس مشکل کے بالائی حلقوں پر مرکز کا اقتدار قائم رکھنا

نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تحریک کا داخلی اتحاد برقرار نہیں رہ سکتا، نہ ہی تحریک کے عقائد کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

آخر کار جب درمیانی واسطہ کی تمام بالائی تنظیمات کو ایک مرتبہ پھر یکجا کر کے ان کے اوپر بالاتر حلقے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان پر تحریک کے پہلے مرکز کا اقتدار قائم رکھنا اور انہیں مرکزی عقائد کا پابند بنانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحریک کا رسمی نظام صرف اس وقت نافذ کرنا چاہیے اور اسی حد تک نافذ کرنا چاہیے، جتنا کہ تحریک کے مرکزی روحانی نظام اور اعتقادات کا اقتدار مسلم ہو چکا ہو۔ سیاسیات میں مرکز کا یہ اقتدار تبھی پوری طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ جب قوم پر تحریک کا سیاسی اقتدار مکمل ہو چکا ہو۔ تنظیم کے مندرجہ بالا اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تحریک کے داخلی نظام کے قیام کے لیے حسب ذیل قواعد وضع کیے گئے ہیں۔

الف: یہ کہ تحریک کی تمام ابتدائی سرگرمیاں ایک شہر یعنی میونچ میں مرکوز کر دینی چاہئیں ہر لحاظ سے قابل اعتماد مقلدین کا ایک دستہ تیار کرنا چاہیے اس کے ساتھ ہی ایک ایسے نئے مکتب خیال کی بنیاد رکھ دینی چاہیے جو بعد میں تحریک کے عقائد کی تبلیغ کرنے میں مفید ثابت ہو سکے۔ بعد میں تحریک کو وسیع پیانے پر چلانے کی خاطر پہلے میونچ میں اس کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہیے۔ یہ عظمت کا مقام اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے کہ میونچ میں تحریک کے جس قدر کارنامے انجام دیے ممکن ہوں پہلے انہیں عملی جامہ پہنا کر لوگوں کو دکھایا جائے۔ تحریک اور اس کے قائد کے نام اور کام کا چرچا کرنے کی خاطر صرف یہی ضروری نہیں کہ کمیونسٹ عقیدہ ناقابل شکست ہونے کا دعویٰ غلط ثابت کیا جائے بلکہ یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ دنیا میں کمیونسٹ عقیدہ کے علاوہ دوسرے عقیدے بھی ممکن ہیں۔

ب: یہ کہ مقامی شاخیں اس وقت تک قائم نہ کی جائیں جب تک کہ پہلے میونچ میں مرکزی قیادت کا بالاتر اقتدار مسلم اور واضح طور پر نافذ نہ ہو جائے۔

ج: یہ کہ اضلاعی، علاقائی اور صوبائی شاخیں اس وقت تک قائم کی جائیں جب پہلے ان کے قیام کی ضروریات ثابت ہو چکی ہو۔ شاخوں کا قیام اسی وقت عمل میں آنا چاہیے جب مرکزی قیادت کا اقتدار مسلم قرار پا چکا ہو۔

علاوہ ازیں تحریک کے ضمنی ادارے اس وقت قائم کیے جائیں جب ان میں کام کرنے کے لائق آدمی مل جائیں جو ایسے اداروں کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں۔

تحریک کی شاخیں قائم کرنے میں کیا مشکلات پیش آتی ہیں

اس مسئلہ کو دو طرح حل کیا جا سکتا ہے:

1 یہ کہ تحریک اتنی رقم جمع کرے جس سے قیادت کی اہلیت رکھنے والے ذہین آدمیوں کو تحریک کی جانب کھینچے اور پھر ان کو تربیت دینے کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ اس طرح سے تحریک جن اشخاص کو تیار کر کے انہیں موقعہ کی مناسبت اور مطلوبہ قابلیت مد نظر رکھتے ہوئے استعمال کیا جائے مسئلہ کا یہ حل آسان بھی ہے اور اس پر عمل بھی جلد ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہے لیڈروں کی یہ قسم تحریک کے لیے اسی صورت میں کام کر سکتی ہے جب پہلے ان کی تنخواہ کا انتظام کر دیا جائے۔

2 چونکہ تحریک تو تنخواہ دار عملہ ملازم رکھنے کے قابل نہیں اس لیے اعزازی کارکنوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے طبعی طور پر یہ دوسرا حل مشکل بھی ہے اور اس میں دیر بھی زیادہ لگے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مختلف اضلاع میں ایسے ممبر پیدا نہیں ہو جاتے جو رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو مرکزی قیادت کی خدمت میں پیش کر دیں، اور یہ خدمات سرانجام دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں تب تک تحریک کے لیڈر ملک کے وسیع خطوں میں تحریک کی سرگرمیاں ترک کر دینے پر مجبور ہوں گے۔ رضا کارانہ خدمات کی پیش کش کا مقصد یہ ہو گا کہ متعلقہ علاقے میں تحریک کی تنظیم کرنے اور اس کی باگ ڈور سنبھالنے

پر آمادگی ظاہر کی جائے ہوسکتا ہے کہ وسیع علاقوں میں ایسا کوئی لیڈر نہ مل سکے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ بعض علاقوں میں دو دو، تین تین یا اس سے بھی زیادہ ایسے آدمی مل جائیں جن کی قابلیت قریب قریب یکساں ہو، ایسی صورت حال میں جو دقتیں پیش آسکتی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اور انہیں رفتہ رفتہ کچھ مدت گذر جانے کے بعد ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

تحریک کی کسی شاخ کے قیام کے لیے ہمیشہ ایک لازمی شرط یہ ہونی چاہیے کہ پہلے کوئی ایسا آدمی ڈھونڈا جائے جو قیادت کی شرطوں پر پورا اترتا ہو۔

جس طرح سے عسکری تنظیم اور فوج کے تمام شعبے اس وقت تک بیکار ہیں جب تک ان کے لیے مناسب افسر نہ ڈھونڈ لیے جائیں اسی طرح ایک سیاسی تحریک بھی اس وقت تک بیکار ہے جب تک اسے صحیح قسم کے لیڈر نہ مل جائیں۔

اگر کسی مقامی شاخ کے لیے اوصاف قیادت سے متصف اور تحریک کے مقلدین کا اعتماد حاصل کرنے کے قابل شخصیت دستیاب نہ ہو تو پھر تحریک کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ بجائے ایک ناکام شاخ کے قیام کا خطرہ مول لینے کے ایسی شاخ قائم ہی نہ کی جائے۔

قیادت کے لیے یہ وصف کافی نہیں کہ انسان قائد بننے کا خواہش مند ہو لیڈر میں دوسرے لازمی اوصاف بھی پائے جانے چاہئیں ان دوسرے اوصاف میں سے ذہانت اور قابلیت کی نسبت عزم کی پختگی اور مت کی فراوانی زیادہ مفید ہیں بہترین قائد وہ ہے جس میں ذہانت اور عزم کے ساتھ استقلال بھی پایا جائے۔

کسی تحریک کو مماثل تحریکوں سے اتحاد مہنگا پڑتا ہے

12 کسی تحریک کے مستقبل کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے پیرو کتنے جوش سے، بلکہ یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ کتنے تعصب سے اس کی خاطر جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں انہیں کامل یقین ہونا چاہیے کہ صرف وہی حق پر ہیں، اور اپنی تحریک جیسی تمام دوسری تحریکوں کو شکست دے کر خود کامیاب ہونا ان کا فرض ہے۔

یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ کوئی تحریک اپنی جیسی دوسری تحریکوں کے ساتھ اتحاد قائم کر کے پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے یہ تو صحیح ہے کہ اس قسم کے اتحاد سے تحریک کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اس سے تحریک کی ظاہری شان و شوکت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے سطحی اندازے لگانے والے خیال کرتے ہیں کہ تحریک کی طاقت میں بھی ضرور اضافہ ہو گیا ہو گا، لیکن در حقیقت ایسے اتحاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک بیرونی عناصر کو اپنے اندر داخل کر لیتی ہے جو بعد ازاں اس کی طبعی حرارت کو ٹھنڈا کر دینے کا باعث بنتے ہیں۔

بظاہر یہ کہنا آسان ہے کہ دو تحریکیں ایک ہی قسم کی ہیں لیکن دراصل ان میں کبھی یکسانیت نہیں پائی جاتی اگر کوئی یکسانیت ہوتی تو دو تحریکوں کو جگہ ایک ہی تحریک قائم ہوتی چاہے اختلاف کی نوعیت کچھ چاہے اختلاف دونوں تحریکوں کے لیڈروں کی قابلیت تک ہی محدود ہو، لیکن پھر بھی اختلاف تو ہے۔ دو مختلف المزاج پیکروں کا اتحاد قانون ارتقا کے خلاف ہے قانون ارتقا کا تقاضا تو یہ ہے کہ طاقتور کمزوروں پر غالب آ جائیں، چاہے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں غالب کی ہمت اور قوت میں کمی ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔ مماثل سیاسی جماعتوں کے اتحاد سے بعض فوری فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں، لیکن دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فوری فوائد بعض ایسی کمزوریاں پیدا کر دیتے ہیں جو بعد میں جا کر رونما ہوتی ہیں۔ کوئی تحریک اسی صورت میں عظمت حاصل کر سکتی ہے جب اس کی اندرونی طاقت کے نشوونما کے راستہ سے تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں اور اسے اس وقت تک ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے تمام حریفوں پر غالب نہ آ جائے۔

کسی تحریک کو اسی وقت تک زندہ رہنے کا حق ہے اور تبھی اس کی طاقت میں اضافہ ہو سکتا ہے جب تک وہ سچائی سے اس اصول پر کاربند رہتی ہے کہ جدوجہد کے بغیر ترقی ممکن نہیں، اور یہ کہ تحریک کو کامل استحکام اس وقت حاصل ہو گا جب فتح کی آخری منزل

طے ہو چکے گی۔

یہی وجہ ہے کہ کسی تحریک کو محض فوری اور عارضی کامیابی کے پیچھے نہ دوڑنا چاہیے بلکہ صبر اور استقلال سے بغیر کوئی کمزوری دکھائے مدت تک جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جدوجہد کی یہ مدت ہی تحریک کی اندرونی نشوونما کے امکانات بہم پہنچاتی ہے۔

جو تحریکیں اپنے جیسی دوسری تنصیبات کے ساتھ اتحاد کر کے بظاہر وسعت حاصل کر لیتی ہیں، ان کی یہ ظاہری طاقت محض دوسروں کے سہارے کا نتیجہ ہوتی ہے ان کی مثال ان پودوں جیسی ہے جنہیں بند کمرے میں مصنوعی حرارت پہنچا کر اگایا جائے۔ ایسے پودے بظاہر تو سرسبز ہو جاتے ہیں لیکن اس اندرونی قوت سے محروم رہتے ہیں جو قدرتی طور پر نشوونما پانے والے پودوں کو تناور درختوں میں تبدیل کر دیتی ہے جنہیں صدیوں تک بڑے بڑے طوفان بھی جڑ سے نہیں ہلا سکتے۔

ہر ایسی طاقتور تنظیم جس کی بنیاد کسی تخلیقی عقیدہ پر رکھی گئی ہو صرف اسی صورت میں عظمت حاصل کر سکتی ہے جبکہ اپنے جیسی دوسری تمام تنظیمات کے خلاف مذہبی جوش اور تعصب سے کام کرے۔ اس جوش اور تعصب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس تنظیم کو خود اپنی سچائی پر والہانہ یقین ہوتا ہے۔ اگر کوئی عقیدہ سچا ہے اور اسے جدوجہد کے وہ ہتھیار بھی میسر ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں تو ایسا عقیدہ جب کبھی میدان جنگ میں اترے گا، ہمیشہ ناقابل شکست ہوگا۔ ایسے عقیدے کو اگر تشدد سے دبانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی اندرونی طاقت میں اور اضافہ ہوتا جائے گا۔

عیسائیت کو جو عظمت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ عیسائیت نے ان تمام فلسفیانہ عقائد کے ساتھ سمجھوتے کر لیے تھے جو قدیم دنیا میں رائج تھے اور عیسائیت سے کم و بیش شباہت رکھتے تھے بلکہ اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت بغیر ذرا سی ڈھیل دکھائے، پورے تعصب کے ساتھ اپنی تعلیمات کا اعلان کرتی رہی اور ان کی حمایت کے لیے کمر

بستہ رہی۔

ایک تحریک دوسری تحریکوں کے ساتھ متحد ہو کر بظاہر جو ترقی کر لیتی ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں ہوتی جو ایک عقیدہ اور اس عقیدہ کو نافذ کرنے والی تنظیم آزادرہ کر اور اپنے مقاصد کے لیے تنہا جدوجہد کر کے حاصل کرسکتی ہے بلکہ تنہا رہ کر استقامت سے جدوجہد کرنے والی تنظیم تھوڑے ہی عرصہ میں سمجھوتے کر لینے والی تنظیم سے بازی لے جاتی ہے۔

جدوجہد بجائے خود ایک مقصد ہے

13 تحریک کے مقلدین کو یہ تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ جدوجہد کو ایک ایسی مصیبت نہ سمجھا کریں جس سے چارہ نہیں بلکہ جدوجہد کو تو بجائے خود ایک مقصد سمجھنا چاہیے اس لیے حریفوں کے برسرخاش رہنے سے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ جدوجہد پر آمادہ رہے جو لوگ ہمارے فلسفہ زندگی اور ہماری قوم کے دشمن ہیں، ان کی نفرت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ان کی نفرت کا جواب نفرت سے دینا چاہیے اور ان پر غالب آنے کی سعی کرنی چاہیے جھوٹ اور بہتان تراشی بھی دشمن کا ایک حربہ ہے جس سے وہ اپنی رنجش کا اظہار کرتا ہے۔

یہودی اخبارات جس شخص کی مخالفت نہیں کرتے، اس کی توہین نہیں کرتے اور اسے برا بھلا نہیں کہتے، ایسا شخص ہرگز راسخ العقیدہ جرمن نہیں۔ نہ ہی وہ قوم پرست سوشلسٹ کہلانے کا مستحق ہے۔ کسی راسخ العقیدہ جرمن یا قوم پرست سوشلسٹ کے عقائد کے خلوص، اس کے کردار کی پختگی اور اس کے ارادے کی مضبوطی کو جانچنے کے لیے بہترین معیار یہ ہے کہ اس کا نام لیتے ہی ہماری قوم کے جانی دشمن کس قدر مخالفت کا اظہار کرتے ہیں۔

تحریک کے مقلدین کو، بلکہ ساری قوم کو بار بار یاد دلانا چاہیے کہ یہودی اپنے

اخبارات کے ذریعہ ہمیشہ جھوٹ پھیلاتا ہے۔اگر یہودی کبھی کبھار جھوٹا موٹا سچ بول بھی دیتا ہے تو اس کا مطلب فقط یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی بہت بڑے فریب پر پردہ ڈال دے۔ یہ فریب ایسا زبردست ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بظاہر نظر آنے والا سچ بھی در حقیقت بہت بڑا جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ یہودی کذاب عظیم ہے جھوٹ اور دوزخی یہودی کے دو خاص ہتھیار ہیں یہودی جب کسی سے کوئی جھوٹ یا بہتان منسوب کرے تو ملزم کے ساتھیوں کو یہ الزامات عزت کی نشانی سمجھنے چاہئیں یہودی جتنا کسی کی مذمت کرے، اتنا ہی وہ ہمیں زیادہ عزیز ہونا چاہیے، جتنا یہودی کسی کی جان کا دشمن ہو اتنا ہی ہمیں اس مغضوب کو اپنا بہترین دوست سمجھنا چاہیے۔اگر ہمارا کوئی رفیق صبح کے وقت کوئی یہودی اخبار کھول کر دیکھتا ہے اور وہاں اسے اپنے خلاف کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کل کا دن ضائع کیا ہے اگر اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہوتا تو یہودی اخبارات اس کی مخالفت کرتے، اس کی توہین کرتے، اسے برا بھلا کہتے، اسے گالیاں دیتے۔

یہ یہودی ہماری قوم کا جانی دشمن ہے وہ آریائی اقوام اور آریائی ثقافت کا بدخواہ ہے۔ جو لوگ اس کا قرار واقعی مقابلہ کرتے ہیں انہیں اس نسل کی جانب سے سوائے مخاصمت کے اور کس سلوک کی توقع ہوسکتی ہے ایسے ہی لوگ تو یہودی کی بہتان تراشیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

جب ہماری تحریک کے اراکین کے گوشت پوست اور خون میں مندرجہ بالا سچائیوں کا احساس رچ جائے گا، تب ہماری تحریک ناقابل شکست اور ناقابل تسخیر بن جائے گی۔

تمام انسانی اقدار شخصی اقدار پر مبنی ہیں

14 انفرادی شخصیت کے احترام کو ترقی دینے کے لیے تحریک کی جانب سے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی اقدار کے تمام اندازے شخصی

اقدار پر مبنی ہیں۔ دنیا کا ہر عقیدہ اور دنیا کا ہر کارنامہ کسی ایک آدمی کی تخلیقی قوت کا ثمر ہے ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی عظیم ہستی کے سامنے سرِ عقیدت خم کرکے ہم نہ صرف کسی تنہا شخصیت کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک باعظمت شخصیت کو خراج تحسین ادا کرنے والے لوگ خود بھی باہم ایک مشترکہ بیعت سے متحد ہو جاتے ہیں۔

انفرادی شخصیت کا مقام کبھی کسی دوسری شے سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی فرد محض مادی احساسات کا مجموعہ نہیں بلکہ تخلیقی اوصاف کا ترجمان بھی ہے تو پھر اس کی جگہ کوئی دوسرا قائم مقام ہرگز اور کبھی نہیں لے سکتا۔ اگر کوئی اعلیٰ درجہ کا مصور اپنے کسی شاہکار کو نا تمام چھوڑ دے تو پھر اس کا کوئی شاگرد اس کو پورا نہیں کر سکتا۔ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر، یا مفکر، یا کسی عظیم مدبر، یا زبردست عسکری سپہ سالار کی نقل ناممکن ہوتی ہے ان اکابر اور مشاہیر کی قوت فنون لطیفہ کے عالم تخلیق سے متعلق ہوتی ہے یہ قوت مادی ذرائع سے یا مکھی پر مکھی مار کر حاصل نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کا سرچشمہ الہام ربانی والقائے آسمانی ہوا کرتا ہے۔

اس دنیا کے بڑے بڑے انقلابات اور بڑے بڑے کارنامے اس کے عظیم ثقافتی شاہکار اور اعلیٰ مدبرین کے لافانی کارہائے نمایاں ہمیشہ کسی ایک ہستی کے ساتھ لازم و ملزوم رہے ہیں۔ ایسی ہستیاں اپنے اپنے دائرہ میں اپنے کارہائے نمایاں کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ان بلند مرتبہ ارواح کی خدمت میں خراج تحسین ادا کرنے میں بخل کا مطلب یہ ہوگا کہ اکابرین ذکور واناث کی یاد سے ہم جو زبردست طاقت حاصل کر سکتے ہیں اس سے محروم رہ جائیں گے۔

یہودی خود اس حقیقت سے خوب آشنا ہیں اگرچہ اکابرین یہود کی عظمت اسی میں پنہاں رہی ہے کہ انہوں نے بنی آدم اور تہذیب و تمدن کو مٹا دینے کے لیے شاندار کارنامے انجام دیئے لیکن یہودی پورے اہتمام سے انجام بتوں کی طرح پوجتا ہے برعکس اس کے جب دوسری قومیں اپنے اکابرین ذکور واناث کے احترام کی یاد زندہ رکھنا

چاہییں چاہیں تو یہودی ان کی شان میں بٹا لگانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ بزرگوں کے احترام کو "شخصیت پرستی" کہہ کر بدنام کرتا ہے۔

جب کوئی قوم ایسی بزدل ہو جائے کہ وہ یہودیوں کی جانب سے اپنے بزرگوں کی یہ توہین بھی خاموشی سے برداشت کر لے تو پھر وہ اپنی اندرونی طاقت کے ایک منبع سے دستبردار ہو جاتی ہے قوموں کی اندرونی طاقت عوام کی من مانی کرنے کی اجازت دینے سے پرورش نہیں پایا کرتی بلکہ یہ طاقت تو ہمیشہ با دماغ ہستیوں سے اظہار عقیدت کر کے حاصل ہوا کرتی ہے ان نفوس پاکیزہ کی تقلید ساری قوم کی زندگی کو بلند اور شائستہ بنا دیتی ہے۔

جب انسانوں کے دل ٹوٹ چکے ہوں، جب ان کی روحیں مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب رہی ہوں، تو پھر ماضی کے دھندلکے میں سے ملت کے عالی مقام اسلاف اپنی نگاہیں اپنی درد رسیدہ اولاد پر ڈالتے ہیں یہ وہ آبا و اجداد تھے جو رنج و غم، ذہنی زنجیروں اور جسمانی غلامی پر قابو پانے کا گر جانتے تھے ان بزرگوں کا ابدی دست شفقت ایک اشارے سے مایوس دلوں میں از سر نو حوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔بد قسمت ہے وہ قوم جو عالم غیب سے بڑھنے والے ان ہاتھوں کو بڑھ کر تھام لینے میں ذرا بھی توقف کرے۔

گمنامی امنگوں کے لیے سنگ راہ ہے

ہماری تحریک کی ابتدا میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہم سب گمنام تھے ہماری کچھ حیثیت نہ تھی اس وقت یے کمزوری ہمارے بعض ساتھیوں کو آخری کامیابی سے نا امید کر دیتی تھی ۔تب ہمارا سب سے مشکل کام یہ تھا کہ ہم تحریک کے اراکین میں یہ پختہ یقین کس طرح سے پیدا کریں کہ تحریک کے سامنے ایک زبردست مستقبل ہے یہ بھی سوال تھا کہ اس یقین کو زندہ ایمان کی صورت کس طرح دی جائے ان دنوں تو صرف چھ یا سات آدمی ہمارے مقررین کی تقریریں سننے آیا کرتے تھے ذرا ان چھ یا سات الو باٹوں کی بیچارگی کا اندازہ تو کیجیے جو بالکل گمنام تھے۔اور ایک تحریک قائم کرنے کی نیت

سے مل بیٹھے تھے ان کی خواہش تھی کہ تحریک وہ کام کر دکھائے جو بڑی بڑی پارٹیاں انجام دینے میں ناکام ثابت ہو چکی تھیں وہ کام یہ تھا کہ جرمن سلطنت کی ازسر نو تشکیل کی جائے۔ اس کی عظمت اور شان کو پہلے سے بھی دوبالا کیا جائے اس حالت میں اگر کوئی ہماری مخالفت کرتا یا ہمارا انداق ہی اڑاتا، تو ہم بڑے خوش ہوتے لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن بات تو یہ تھی کہ ہماری طرف کوئی توجہ بھی نہ دیتا تھا۔ یہ بے توجہی تب میرے دل کو سب سے زیادہ رکھتی دیتی تھی۔

جب میں ان لوگوں کے حلقہ میں پہلے پہل شامل ہوا تو ابھی ایک پارٹی یا تحریک قائم کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ جب اس چھوٹی سی تحریک کے ساتھ پہلی مرتبہ میرا رابطہ قائم ہوا تو اس تقریب پر میں نے اس تحریک کی بابت جو اندازہ قائم کیا اس کا ذکر میں قبل ازیں کر چکا ہوں۔ بعد ازاں جب مجھے فرصت اور موقعہ ملا تو میں نے اس نام نہاد پارٹی کی شکل وصورت کا زیادہ غور سے مطالعہ شروع کیا جس نے پہلی مرتبہ مجھ پر ایسا برا اثر پیدا کیا تھا۔ صورت حال واقعی مایوس کن اور حوصلہ شکن تھی یہاں تو کچھ بھی نہ تھا سچ مچ بالکل کچھ نہ تھا صرف ایک پارٹی کا نام تھا پارٹی کی کونسل میں تحریک کے تمام اراکین شامل تھے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پارٹی بھی دراصل اسی قسم کا ادارہ ہے جس کے خلاف ہم جدوجہد کرنے اٹھے ہیں، یعنی ایک ننھی منھی سی پارلیمنٹ مسائل کا فیصلہ کثرت آراء سے کیا جاتا تھا پارلیمنٹ کی بڑی اماں کے ہاں اگر چلاتے چلاتے لوگوں کے حلق خشک ہو جاتے تھے تو کم از کم ان کے سامنے ایسے مسائل تو تھے جن کے متعلق یہ لوگ چلایا کرتے تھے لیکن یہاں تو اس چھوٹے سے حلقہ میں اس معاملہ پر طویل بحثیں ہوتی تھیں کہ باہر سے آنے والے جن خطوط کو دیکھ کر یہ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے، ان کا جواب کس اسلوب میں دیا جائے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ عوام کو ان باتوں کا کچھ علم نہ تھا میونچ میں کسی کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہاں اس نام کی کوئی پارٹی بھی موجود ہے صرف ہمارے گنتی کے اراکین اور ان کی

جان پہچان کے محدود سے حلقہ کو پارٹی کے وجود کا علم تھا۔

ہر بدھ کے روز ہماری نام نہاد کونسل کا اجلاس کسی قہوہ خانے میں منعقد ہوتا تھا۔ ہر ہفتے میں ایک روز شام کے وقت ''مجلس مذاکرہ'' کا اہتمام کیا جاتا تھا شروع شروع میں تحریک کے تمام اراکین پارٹی کی کونسل کے بھی ممبر تھے اس وجہ سے ''مجلس مشاورت'' اور ''مجلس مذاکرہ'' دونوں میں وہی گنے چنے لوگ موجود ہوتے تھے سب سے پہلے جو قدم اٹھانے کی ضرورت تھی وہ تو یہ تھا کہ اس چھوٹے سے حلقہ کو وسیع کیا جائے نئے ممبر شامل کیے جائیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تمام امکانی ذرائع استعمال کرتے ہوئے تحریک کا کچھ چرچا کیا جاتا ،تا کہ لوگوں کو یہ تو پتہ چلے کہ اس نام کی بھی کوئی تحریک موجود ہے۔

جلسے کس طرح کامیاب بنائے جاتے ہیں

ہم نے حسب ذیل طریقوں سے کام لینا شروع کیا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر مہینہ ہم ایک ایسا عوامی جلسہ منعقد کریں گے جہاں خلقت کو شرکت کی دعوت دی جایا کرے گی۔ کچھ دعوت نامے ٹائپ کروائے گئے باقی ہاتھ سے لکھے گئے شروع شروع کے جلسوں کے لیے یہ دعوت نامے بازار میں کھڑے ہو کر تقسیم کیے گئے اور بعض گھروں میں ہم نے خود جا کر پہنچائے تحریک کے ہر رکن نے اپنی جان پہچان کے حلقہ میں جلسہ کا چرچا کیا اور کوشش کی کہ اس کے چند شناسا ہمارے جلسوں میں شامل ہو جایا کریں ان سب کوششوں کے باوجود جو نتائج رونما ہوئے انہیں دیکھ کر سر پھوڑ لینے کو جی چاہتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک روز کس طرح میں نے خوف ساٹھ دعوت نامے لوگوں میں تقسیم کیے اور شام کے وقت ہم سب اس انتظار میں تھے کہ ہجوم جوق در جوق ہمارے جلسہ میں شامل ہو گا۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کرنے کے بعد آخر کار صدر کو جلسہ شروع کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ پھر جلسہ میں سات ہی آدمی شامل تھے وہی پرانے جانے پہچانے سات!

پھر ہم نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کی ہم اپنے دعوت نامے میونچ کے ایک ٹائپ گھر سے ٹائپ کرواکے دستی مشین کے ذریعہ ان کی نقلیں تیار کرنے لگے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے اگلے جلسہ میں کچھ لوگ تو شامل ہوئے۔ حاضرین کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ گیارہ سے بتدریج تیرہ ہوئے، پھر سترہ، پھر پچیس، اور آخر کار چونتیس ہم نے اپنے حلقہ میں کچھ رقم بھی جمع کی۔ ہر عاجز غریب نے تھوڑا تھوڑا چندہ دیا۔ اس طرح سے ہمارے پاس اتنی رقم ہوگئی کہ ہم نے اپنے جلسہ کا اعلان میونچ آبزرور نامی اخبار میں اشتہار کے ذریعہ کیا۔ یہ اخبار ابھی تک آزاد تھا۔

ہمارا پہلا عوامی جلسہ

اس مرتبہ ہمیں ایسی کامیابی ہوئی کہ ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے جلسہ گاہ کے طور پر ہاف براؤ ہاؤس گیلر کا ہال منتخب کیا تھا۔ اس ہال کو ہاف براد ہاؤس فیسٹال کا ہال سمجھنے کی غلطی نہ کرنی چاہیے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا جس میں بمشکل ایک سو تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ پھر بھی تب یہ ہال میری نگاہ میں بہت بڑا تھا ہم اس خوف سے لرز رہے تھے کہ کہیں یہ عظیم الشان عمارت جلسے کی رات کو خالی نہ رہ جائے۔

شام کے سات بجے ایوان میں ایک سو گیارہ آدمی موجود تھے چنانچہ جلسہ شروع کر دیا گیا۔ میونچ کے ایک پروفیسر نے افتتاحی تقریر کی۔ اس کے بعد میں بولا عوامی مقرر کے طور پر میری پہلی تقریر تھی ہر ہرار جو کہ ان دنوں ہماری پارٹی کے صدر تھے، ان کا خیال تھا کہ ایسا جلسہ منعقد کر کے ہم بہت بڑی جرات کر رہے ہیں ہر ہرار نہایت نیک آدمی تھے، لیکن کسی طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ مجھ میں چاہے اور کتنی ہی خوبیاں ہوں لیکن مجھ میں عوام کے سامنے کرنے کا جوہر نہیں بعد میں بھی انہوں نے اپنی یہ رائے نہ بدلی پھر بھی وہ غلطی پر تھے اس موقعہ پر مجھے تقریر کرنے کے لیے بیس منٹ دیئے گئے تھے جبکہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا پہلا عوامی جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔

خطابت سیاسی تحریکوں کی روح ہوتی ہے

میں نے نصف گھنٹہ تقریر کی اگرچہ مجھے آج تک اس کا تجربہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا لیکن میرے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ میں اچھی تقریر کرسکتا ہوں جب مجھے بولتے ہوئے نصف گھنٹہ گزر چکا تو صاف نظر آنے لگا کہ اس چھوٹے سے ایوان میں جتنے بھی لوگ موجود تھے ان سب پر گہرا اثر ہو چکا تھا۔ ان کے اندر جو ولولہ پیدا ہو چکا تھا اس کا پہلا ثبوت تو اس وقت ملا جب میں نے حاضرین سے چندے کی اپیل کی اور تین سو جرمن سکہ کی رقم جمع ہوگئی اس سے ہمیں بڑی امداد ملی ان دنوں ہمارے پاس روپے کی ایسی کمی تھی کہ ہم اپنی پارٹی کے اغراض و مقاصد بھی چھپوا نہ سکتے تھے نہ ہی تحریک کے متعلق کوئی دوسرے رسائل شائع کرسکتے تھے اب ہمارے پاس کم از کم ایک ایسی رقم کی ابتداء ہو چکی تھی جس سے ہم اپنے لازمی اور ضروری اخراجات ادا کرسکتے تھے۔

اس پہلے بڑے جلسہ کی کامیابی ایک اور پہلو سے بھی اہمیت رکھتی تھی میں ان دنوں بھی تحریک کی کونسل میں بعض تازہ اور نوجوان اراکین شامل کروا چکا تھا۔

طویل عرصہ تک فوجی ملازمت میں رہنے کے بعد میری ایسے کئی فوجی نوجوانوں سب شناسائی پیدا ہو چکی تھی جنہیں میں نے اس پارٹی میں شامل ہونے پر آمادہ کرلیا۔ یہ سب باہمت اور تربیت یافتہ نوجوان تھے جو سالہا سال تک فوجی ملازمت کرنے کے باعث اس اصول سے بخوبی واقف تھے کہ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں اور

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا!

میں نے نئے اراکین کے ساتھ چند ہی ہفتے مل جل کر کام کیا تھا کہ مجھ پر جدید اراکین شامل کرنے کی ضرورت ثابت ہوگئی ہر ہرار ان دنوں تحریک کے صدر تھے پیشہ کے لحاظ سے وہ صحافی تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی عام علمی وقفیت خاصی تھی لیکن پارٹی کا قائد ہونے کے لحاظ سے ان میں ایک بڑا نقص تھا۔ وہ کسی ہجوم کے سامنے تقریر نہ کرسکتے تھے اگرچہ وہ اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دیتے تھے، لیکن ان میں دوسروں سے کام

لینے کی وہ ہمت نہ تھی جس کی جماعت کوضرورت تھی۔ غالباًاس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ تقریر نہ کرسکتے تھے ہرڈریکسلر ان دنوں میونچ میں ہماری مقامی شاخ کے صدر تھے۔وہ ایک سادہ طبیعت مزدور تھے وہ بھی کچھ زیادہ اچھی تقریر نہ کر سکتے تھے علاوہ ازیں وہ سپاہی بھی نہ تھے۔انہیں عسکری خدمت کا کچھ تجربہ نہ تھا۔انہوں نے جنگ کے دنوں میں بھی فوجی خدمت کا تجربہ حاصل نہ کیا تھا اس طرح سے ایک تو وہ طبعاً کمزور اور وہمی تھے۔دوسرے انہیں اس واحد تربیت گاہ میں تربیت حاصل کرنے کا موقعہ بھی نہ تھا جہاں کمزور اور وہمی مزاج افراد کو صحیح معنوں میں مرد بنا دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں اصحاب اس شخصیت سے محروم تھے جو تحریک کے مقلدین میں تحریک کی آخری کامیابی کا پر جوش اور نا قابل شکست یقین پیدا کر دیتی ہے ایسی ہی شخصیت اپنے عقائد کے راستہ میں سے تمام رکاوٹیں پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ دور کر سکتی ہے اور ضرورت پڑے تو سنگدلانہ تشدد سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کرتی یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا جسم اور جن کی روح فوجی اوصاف کی تربیت حاصل کر چکے ہوں فوجی تربیت انسان کو شکاری کتے کی طرح چست ،فولاد کی طرح سخت اور چمڑے کی طرح مضبوط بنا دیتی ہے۔

ان دنوں میں ابھی سپاہی تھا چھ سال کی عسکری خدمت نے میرے جسم اور دماغ کو کندن بنا دیا تھا اس تحریک کے حلقہ میں مجھے شروع شروع میں اجنبی سمجھ کر میری جانب نگاہیں اٹھتی تھیں دوسرے سپاہیوں کی طرح میری لغت بھی اس قسم کے کلمات سے نا آشنا تھی کہ ’’اب تو کام نہ چلے گا‘‘ ’’یہ ناممکن ہے‘‘ ’’ہمیں ایسا خطرہ مول نہ لینا چاہیے۔‘‘ ’’یہ تو سخت تشویش کی بات ہے۔‘‘

کمیونسٹ تشدد استعمال کرتے ہیں

یہ سارا کام ہی طبعاً خطرناک تھا۔ان دنوں جرمنی میں ایسے کئی مقامات تھے جہاں قوم پرستوں کے کسی جلسہ عام میں عوام کو شمولیت کی دعوت دینا ،یا عوام کے سامنے براہ

راست حب وطن کی اپیل کرنا ناممکن تھا۔ جو لوگ ایسے جلسوں میں شرکت کرتے تھے انہیں بالعموم منتشر کر دیا جاتا تھا اور وہ زخمی ہاتھ پاؤں لے کر گھر واپس لوٹتے تھے یہ کارنامہ انجام دینے کے لیے کسی بہت بڑی قابلیت کی ضرورت نہ تھی جوں ہی دس بارہ کومیونسٹ موقعہ پر پہنچے وہیں کھاتے پیتے لوگوں کا بڑے سے بڑا جلسہ منتشر ہو جاتا تھا۔ اور حاضرین اس طرح بھاگ جاتے تھے جیسے کتوں سے خوف کھا کر خرگوش فرار ہو جاتے ہیں کمیونسٹ کھاتے پیتے لوگوں کے ان جلسوں پر کم ہی توجہ دیتے تھے جہاں خالی بکباروں نے تقریریں کرنی ہوتی تھیں ایسے جلسوں میں شرکت کرنے والوں کی نسبت کمیونسٹ ان جلسوں کے اندرونی کھوکھلے پن سے بہتر واقف تھے یہی وجہ تھی کہ کمیونسٹ ایسے جلسوں سے خوف نہ کھاتے تھے برعکس اس کے جوں ہی انہیں کوئی تحریک اپنے مفاد کے لیے مضر نظر آتی تھی، وہیں اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی خاطر وہ اپنی پوری طاقت خرچ کر دیتے تھے ایسے موقعہ پر ان کے ہاتھ میں سب سے زبردست حربہ وحشیانہ تشدد اور خوف و ہراس کا پھیلانا تھا۔

کمیونسٹ لیڈروں کا پیشہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دھوکہ دیں اور غلط راہ پر لگائیں طبعاً وہ ایسی تحریک سے سخت متنفر تھے جس کا کھلا مقصد یہ تھا کہ ان عوام کی ہمدردی حاصل کی جائے جو آج تک بین الاقوامی کمیونسٹوں اور سٹہ باز یہودیوں کی سیاسی جماعتوں کے لیے وقف سمجھے جاتے تھے یہودی اور کمیونسٹ تو ''جرمن مزدور پارٹی'' کا نام سن کر ہی ایسا محسوس کرتے تھے گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا کہ مناسب موقعہ پیش آنے پر ہمیں کمیونسٹ ظالموں کا مقابلہ کرنا پڑے گا جو ابھی 1918ء کی کامیابیوں کے نشہ سے مست تھے۔

ان دنوں ہماری تحریک کے محدود حلقہ میں جو لوگ شامل تھے وہ اس آنے والی کشمکش کے تصور سے ہراساں ہو جایا کرتے تھے وہ کھلم کھلا دشمن کے سامنے آنے سے ہچکچاتے تھے انہیں ڈر تھا کہ ان پر حملہ ہوا تو انہیں شکست کھانی پڑے گی۔ وہ اپنی چشم تصور سے اکثر

یہ نقشہ دیکھا کرتے تھے کہ ہمارا پہلا جلسہ عام منتشر کر دیا جائے گا انہیں دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ اس طرح پہلا جلسہ منتشر ہو جانے سے تحریک ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے گی میری رائے تھی کہ ہمیں تصادم سے بچنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے بلکہ آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، اور اس مقابلہ کے لیے ان ہتھیاروں سے فی الفور مسلح ہو جانا چاہیے جن کے بغیر وحشیانہ تشدد سے ٹکر لینا ممکن نہیں مجھے اپنی اس رائے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، تشدد کا مقابلہ ذہنی ہتھیاروں سے ممکن نہیں، بلکہ تشدد کا جواب تو صرف تشدد سے ہی دیا جا سکتا ہے ہمارے پہلے جلسہ عام کی کامیابی نے فضا میری رائے کے لیے سازگار بنا دی تحریک کے اراکین کو ایسی ڈھارس بندھ گئی کہ انہوں نے پہلے سے بھی بڑے پیانے پر ایک دوسرے جلسہ کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔

ہمارا دوسری عوامی جلسہ

اکتوبر 1919ء کی کسی تاریخ کو ہمارا دوسرا بڑا جلسہ ایبرلراؤ کیلر کے ہال میں منعقد ہوا ہمارا تقاریر کا موضوع یہ تھا کہ معاہدہ بریسٹ لٹوسک اور ورسائی کے عہدنامہ میں کیا فرق ہے چار مقررین نے بولنا تھا میں نے قریباً ایک گھنٹہ تک تقریر کی یہ تقریر پہلے جلسہ میں میری تقریر سے زیادہ کامیاب رہی حاضرین کی تعداد اب ایک سو تیس تک بڑھ چکی تھی۔ جب جلسہ کو خراب کرنے کی کوشش کی گئی تو میرے فوجی ساتھیوں نے فی الفور یہ کوشش ناکام بنا دی جو لوگ جلسہ خراب کرنے کی نیت سے آئے تھے انہیں سیڑھیوں سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا گیا ان کی واپسی سے قبل ان کی کھوپڑیوں پر ہمارے زور بازو کی کچھ نشانیاں ثبت ہو چکی تھیں۔

ہمارا تیسرا عوامی جلسہ

دو ہفتے بعد ہمارا اگلا جلسہ پھر اسی ہال میں منعقد ہوا حاضرین کی تعداد اب ایک سو ستر سے زیادہ تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہال ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا میں نے پھر تقریر کی جو اس

مرتبہ گزشتہ جلسہ سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔

ہمارا چوتھا عوامی جلسہ

اب میں نے تجویز پیش کی کہ اس سے بھی بڑا ہال تلاش کیا جائے کچھ عرصہ تک ادھر ادھر ڈھونڈ نے کے بعد ہم نے ایک ایسا ہال شہر کے دوسرے کونہ پر تلاش کرلیا اس ہال کا نام تھا ''ڈیٹشن رائش'' یہ ہال ڈشارمٹرا سے نامی بازار میں واقع تھا اس نئی جگہ ہمارے جلسہ میں لوگ پہلے کی نسبت کم آئے حاضری ایک سو چالیس سے کچھ کم ہی تھی پارٹی کی کونسل کے اراکین کے جی ڈوبنے لگے جو لوگ ہمیشہ سے جلسوں کی کامیابی مشکوک سمجھتے تھے اب انہوں نے کہنا شروع کیا جلسہ میں حاضرن کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ ہم جلسے بہت جلد جلد منعقد کرنے لگے ہیں اس موضوع پر زبردست مباحثے ہوئے میں نے کہا کہ سات لاکھ کی آبادی کے کسی شہر میں دو ہفتوں کے بعد ایک جلسہ کچھ زیادہ نہیں، بلکہ دراصل تو ہر ہفتے جلسہ ہونا چاہیے میں نے کہا ہمیں ایک جلسہ میں ذرا سی ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہونا چاہیے ہم جس طریقہ کار پر عمل کررہے ہیں وہ درست ہے اور دیر یا زور سے ہمیں کامیابی ضرور ہوگی، بشرطیکہ ہم حوصلہ اور استقلال سے اپنے راستہ پر گامزن رہیں 20-1919ء کا یہ درمیانی موسم سرما ہمارے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی مہم تھی اس جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہماری اہلیت پر مقلدین کا اعتماد پختہ کردیا جائے اور اس اعتماد کو یہاں تک ترقی دی جائے کہ وہ ایک نور ایمان کا مرتبہ حاصل کرلے، جس کی قوت سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جایا کرتے ہیں۔

ہمارا پانچواں عوامی جلسہ

اگلا جلسہ ہم نے ایک چھوٹے سے ہال میں منعقد کیا یہاں میرے دعوے کی سچائی ثابت ہوگئی حاضرین کی تعداد دو سو تک بڑھ گئی پراپیگنڈا بھی خوب ہوا اور رقم بھی خاصی جمع ہوگئی میں نے فی الفور مطالبہ کیا کہ ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے دو ہفتوں کے اندر اندر یہ جلسہ بھی منعقد ہوا اور یہاں حاضرین کی تعداد دو سو ستر تھی مزید دو ہفتے کے بعد ہم

نے اپنی تحریک کے مقلدین اور اپنے دوستوں کو ساتویں جلسہ پر مدعو کیا اب یہ ہال حاضرین کے لیے بمشکل کافی تھا، جن کی تعداد اس مرتبہ چار سو سے زیادہ تھی۔

تحریک اور پارٹی کا فرق

اس دوران میں تحریک کا اندرونی نظام بھی تکمیل پاتا رہا۔ کبھی کبھی تو ہمارے اس محدود حلقہ میں زبردست بحث مباحثہ ہوتا ان دنوں بھی وہی حال تھا جو آج کل ہے مختلف گوشوں سے یہ آواز اٹھتی تھی کہ اس نوزائیدہ تحریک کو خالی ایک پارٹی قرار دے دینا مناسب نہ ہوگا میری رائے ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی کا سبب معترض کی تنگ نظری اور عملی نا اہلیت ہوا کرتی ہے ایسے اعتراضات ہمیشہ وہ لوگ اٹھایا کرتے ہیں جو اندرونی قوت اور خارجی اظہار میں فرق نہیں کر سکتے، بلکہ کسی تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس کے بھاری بھرکم نام سے لگاتے ہیں موٹے موٹے نام ڈھونڈنے کے لیے وہ ہمارے دادا جان کے وقت کی کتابیں چھانٹ ڈالتے ہیں، پھر بھی ان کی تحقیق کے نتائج بھونڈے ہی نکلتے ہیں۔

ان دنوں لوگوں کو یہ سمجھانا ذرا مشکل تھا کہ ہر تحریک اس وقت تک ایک پارٹی کہلاتی ہے جب تک اس کے مقاصد پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے اور اسے آخری فتح حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک ایک پارٹی، پارٹی ہی رہتی ہے چاہے اسے کسی نام سے پکارا جائے۔

جو شخص کسی نئے عقیدہ کو اپنے ہم جنسوں کے فائدہ کی خاطر عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہوتا ہے اسے پہلے ایسے مقلدین تلاش کرنے پڑتے ہیں جو اس کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدو جہد کرنے پر تیار ہوں اگر اس شخص کا مقصد صرف اتنا ہی ہو کہ پارٹی بازی کے نظام کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح قومی انتشار کی روک تھام کی جائے، تب بھی اس نصب العین کے جو حامی یا مبلغ سامنے آئیں گے وہ اس وقت تک ایک ہی پارٹی کہلائیں گے جب تک کہ وہ اپنی دھن میں کامیاب نہیں ہو جاتے جب یہ بوسیدہ دماغ فقرے باز دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کسی تحریک کو جو دراصل پارٹی بھی ہے محض

اس کا نام بدل کر کچھ اور بنا دیں گے تو وہ خالی موشگافی اور لفظوں کے الٹ پھیر میں وقت ضائع کر رہے ہوتے ہیں ان لوگوں کی عملی کامیابی ان کی عقل سے بھی کم ہوتی ہے۔

خالی ماضی کی پرستش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

قدیم زمانے میں جرمنوں کے ہاں جو نام رائج تھے اور جن کا آج کل کوئی ٹھیک مطلب بھی نہیں سمجھتا، ان کو طوطے کی طرح دوہراتے رہنا قوم کے موجودہ مزاج کے خلاف ہے فراموش شدہ ماضی کے الفاظ کو دہرانے کی اس عادت سے لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کے اسلوب بیان میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، شاید وہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں بوسیدہ الفاظ کو استعمال کرنے کی یہ عادت کچھ اچھی نہیں، لیکن آج کل عام پائی جاتی ہے۔

میں ان دنوں اکثر تحریک کے مقلدین کو ان آوارہ گرد علماء سے خبردار کیا کرتا تھا جو قدیم جرمن قبائل کے ''لوک گیت'' وغیرہ کا خوانچہ اٹھائے پھرتے ہیں، اور جو کبھی کوئی مثبت یا عملی کام سوائے اس کے سرانجام نہیں دے سکتے کہ اپنی مبالغہ آمیز خودستائی کا چرچا کرتے پھریں اس نئی تحریک کو ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے جو سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں رکھتے کہ اپنے منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تو گذشتہ چالیس سال سے انہیں خیالات کا چرچا کرتے آ رہے ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اب یہ تحریک قائم کی گئی ہے۔

اگر کوئی شخص گزشتہ چالیس سال سے ایک اعتقاد کی تبلیغ کرتا چلا آیا ہے، اور اس کی مزعومہ کوششوں کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا، حتیٰ کہ وہ مخالفین کو زک دینے سے بھی ناکام رہا ہے، تو پھر گذشتہ چالیس سال کی یہ کارگزاری ہی اس مبلغ کی نااہلیت کا کافی ثبوت ہے ایسے لوگ اس وجہ سے اور زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں کہ وہ تحریک میں عام ممبر بن کر شامل نہیں ہونا چاہتے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ان کی گذشتہ خدمات کے صلہ میں انہیں تحریک کے بڑے بڑے عہدے ملنے چاہئیں جب تک انہیں بڑے بڑے عہدے نہ دیئے

جائیں وہ بھلا اپنی سابقہ خدمات کو آئندہ کیسے جاری رکھ سکیں گے جس نوزائیدہ تحریک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو، اس کا پھر خاتمہ سمجھنا چاہیے اگر کوئی تاجر کسی تجارت کا چالیس سال تک ناظم رہا ہے، اور اس کی بدنظمی کے باعث تجارت کا بالکل تیاناس ہو چکا ہے تو ایسے شخص پر کسی نئی تجارت کو چلانے کے لیے کون اعتبار کرے گا کسی نئی قومی تحریک کو چلانے کے لیے بھی اسی بات کا خیال رکھنا چاہیے کوئی شخص جس کے ہوش و حواس قائم ہوں ایک نئی قومی تحریک کی قیادت کسی ایسے خبطی انسان کے سپرد نہ کرے گا، جو جرمن آثار قدیمہ کی تلاش میں منہمک رہا ہے، اور جو چالیس سال تک اپنے اعتقادات کی تبلیغ کرنے کے بعد اب خود بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور اس کے اعتقادات بھی بوسیدہ ہو چکے ہیں۔

عہدوں کے متلاشی، تحریکوں کے دستر خوان پر بھنبھنانے والی مکھیاں ہیں

علاوہ ازیں ایسے لوگ شاذونادر ہی بے غرضی سے کسی نئی تحریک میں اس کے مقاصد کی تکمیل اور اس کے اصولوں کی تبلیغ کی نیت سے شامل ہوتے ہیں اکثر وہ اس لیے شامل ہوتے ہیں کہ نئی تحریک کا سہارا لے کر انہیں اپنے پرانے خیالات پھیلانے کا موقعہ مل جائے گا ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوششیں نئی تحریک کے لیے مفید نہیں ہوسکتیں سب سے بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ان کے عقائد کا سر پیر کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فراموش شدہ ماضی کے جرمن مشاہیر، پتھر کے زمانہ کے کلہاڑوں، عہد قدیم کے نیزوں اور ڈھالوں کا ذکر اکثر فرماتے رہتے ہیں حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ بد بخت نہایت بزدل مسخرے ہوتے ہیں ایک طرف تو یہی لوگ ٹین کی وہ تلواریں چمکاتے پھرتے ہیں جن کی ساخت کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بالکل پرانے زمانہ کی جرمن تلواروں کے مطابق ہیں، پیوند لگی ہوئی ریچھ کی کھال کی پوستین پہنتے ہیں، لمبی لمبی داڑھیاں بڑھا لیتے ہیں، اور گلے میں بیل کے سینگوں کے

پروئے ہوئے ہار پہنے پھرتے ہیں، اور دوسری طرف جب فی زمانہ قوم کے سامنے کوئی معرکہ پیش آ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسے صرف ''ذہنی ہتھیاروں'' سے فتح کرنا چاہیے جوں ہی کوئی ایک کمیونسٹ ڈنڈا لیے ہوئے نظر پڑ جائے یہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے اٹھتے ہیں آئندہ نسلیں اگر ان ہوا میں تلواریں چلانے والے سورماؤں کے کارناموں کے متعلق رجز لکھنے بیٹھیں تو انہیں ان کی شجاعت کے کارنامے ڈھونڈنے میں خاصی دقت پیش آئے گی۔

مجھے اس قسم کے اتنے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے کہ مجھے ان سوانگ بھرنے والے مسخروں سے سخت نفرت ہو چکی ہے۔ قوم کے عوام ان لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں ہاں یہودی ضرور ان جرمن تاریخ کے ماہرین کا احترام کرنے میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے وہ انہیں سچ مچ کے انسان قرار دیتا ہے جو جرمن سلطنت کے احیاء کے لیے کوشش کر رہے ہیں یہ مسخرے بھی اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ رکھتے ہیں اگرچہ ان کے بے حقیقت ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن پھر بھی انہیں دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی نسبت ہر شے بہتر جانتے ہیں ان کی یہ خود پسندی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ تمام سچے اور مخلص محبان وطن کے لیے مصیبت بن چکے ہیں مخلص محبان وطن کی نگاہ صرف ماضی کی شجاع ہستیاں ہی قابل احترام نہیں بلکہ وہ خود بھی ایسے کارناموں کی یاد اپنے پیچھے چھوڑ جانا چاہتے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے مثال کا کام دے سکے۔

ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا طرز عمل ان کی طبعی حماقت اور نا اہلیت کا ترجمان ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو ان حرکتوں سے اپنی کوئی غرض پوری کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں عام حالات میں ان دونوں گروہوں کے مابین فرق کرنا مشکل ہوتا ہے ان لوگوں میں سے اکثر کے متعلق میری رائے تو یہ ہے کہ وہ ایسی طاقتوں کے آلہ کار اور کارندہ ہوتے ہیں جو جرمن قوم کے احیاء کی مخالف ہیں جو لوگ مذہب کی اصلاح کا نام لے کر سامنے آتے ہیں، اور جرمنوں کی قدیم رسموں کی آڑ لیتے ہیں، ان کے متعلق تو

خاص طور پر میری یہی رائے ہے ان کی تمام سرگرمیوں کا ماحصل یہ ہے کہ قوم کی توجہ اصل مسئلہ پر سے ہٹا دی جائے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ساری قوم متحد ہو کر مشترکہ دشمن یعنی یہودی کا مقابلہ کرے ایسے وعظ وتلقین کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام بجائے متحد ہو کر قومی مفاد کی خاطر لڑنے کے احمقانہ اور تباہ کن مذہبی جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں واضح دلائل کا تقاضا ہے کہ تحریک ایک مضبوط مرکز کے ماتحت ہو خود مرکز پر ایک متحدہ قیادت کا تسلط لازمی ہے اس قسم کے مہلک عناصر کی سرگرمیوں کا تدارک صرف اسی صورت میں ممکن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن تاریخ کے یہ فاضل ہر ایسی تحریک کی سخت مخالفت کرتے ہیں جس کے ممبر کسی ایک لیڈر اور اس کے ڈسپلن کے ماتحت منظم ہوں یہ لوگ ایسی تحریک کے اس لیے مخالف ہوتے ہیں کہ وہ ان کی شرارتوں کی روک تھام کر سکتی ہے ۔

امت کی ترجمانی سے پہلے ملت کی نگہبانی زیادہ ضروری ہے

جب ہم نے تحریک کے پروگرام کی وضاحت کی تو ہم نے اس میں عمداً ''جرمن امت'' کا لفظ استعمال نہیں کیا امت کے تصور پر کسی تحریک کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ یہ تصور بہت ہی وسیع اور غیر معین ہے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو حامی امت کہتا ہے تو اس لقب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کسی خاص پارٹی میں شامل ہے ۔

چونکہ عملی زاویہ نگاہ سے یہ تصور ایسا مبہم ہے کہ اس کی متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں اس لیے کوئی لوگ امت کے تصور کا سہارا لے کر اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے لگتے ہیں جب کبھی کسی سیاسی تحریک کی بنیاد ایسے مبہم تصور پر رکھی جائے جس کی متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحریک کے مجاہدین کے اتحاد اور انضباط میں فرق آ جاتا ہے جب ہر رکن کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کی حدود خود معین کرے اور جو چاہے عمل کرے تو پھر تحریک میں نظم کیا خاک قائم رکھا جا سکتا ہے ۔

جو لوگ اپنے کوٹ کے بٹن میں حامی امت کا نشان لٹکائے پھرتے ہیں جب انسان ان کی کرتوتوں پر نگاہ ڈالتا ہے، اور یہ دیکھتا ہے کہ امت کی حمایت کی کتنی مختلف

تعبیریں کی جارہی ہیں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے بویریا کے ایک مشہور پروفیسر صاحب جو کہ علمی ہتھیاروں کے استعمال میں شہرہ آفاق ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ برلن پر حملہ میں شریک تھے (غالباً یہ شرکت علمی ہتھیاروں تک محدود ہوگی) کہتے ہیں کہ امت اور ملوکیت دونوں الفاظ باہم مترادف ہیں لیکن یہ جید عالم صاحب ہمیں یہ نہیں بتا سکتے کہ آج کل امت کا جو مفہوم رائج ہے اس میں اور پرانے زمانہ کے جرمن بادشاہوں میں کیا یکسانیت ہوسکتی ہے مجھے ڈر ہے کہ اگر ان عالم صاحب کو ایک واضح جواب دینے پر مجبور کیا جائے تو وہ چپ رہ جائیں گے کیونکہ جرمن سلاطین تو امت کے تصور سے بالکل بیگانہ تھے، اگر وہ امت کے تصور سے بیگانہ نہ ہوتے تو ختم نہ ہو جاتے۔ یا اگر وہ بھی حامی امت تھے تو ان کا زوال اس امر کی شہادت ہے کہ امت کی حمایت دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں۔

ہر شخص امت کے تصور کی تعبیر جدا بیان کرتا ہے ایسی مختلف تعبیروں کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی سیاسی تحریک کھڑی نہیں کی جاسکتی جو سپاہیانہ جدوجہد کے قابل ہو میں اس سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کروانا کافی سمجھتا ہوں کہ ''بیسویں صدی میں عیسائیت کے نقیبوں کی انجمن'' دنیاوی معاملات میں بالکل نادان ثابت ہوئی ہے کمیونسٹ خیال رکھنے والی پارٹیوں نے ان لوگوں کا جو مذاق اڑایا ہے اس سے ان کا خاصہ چرچا ہو چکا ہے کمیونسٹ پہلے ان لوگوں کو بک بک کرنے دیتے ہیں اور پھر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

جو کوئی دوست کے دشمن کا دشمن نہیں وہ کسی کا دوست نہیں!

میں ان لوگوں کو دوست بنانے کی پرواہ نہیں کرتا جن کے دشمن ان سے نفرت نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں کا اوپر ذکر ہوا ہے ہم انہیں اپنی تحریک کے لیے نہ صرف نکما بلکہ خطرناک سمجھتے ہیں یہی بڑی وجہ تھی کہ ہم نے اپنی تحریک کو ایک پارٹی کا نام دے دیا تھا ہمیں توقع تھی کہ پارٹی کہلانے کے بعد ہم امت کی حفاظت کے خواب

دیکھنے والوں کی یلغار سے محفوظ رہیں گے اسی لیے ہم نے اپنی پارٹی کا نام قوم پرست سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی رکھا تھا۔

پارٹی کا لفظ تخیل کی دنیا میں رہنے والے ان تمام لوگوں کو ہم سے دور رکھتا ہے جو ہمیشہ ماضی کی دنیا میں بستے ہیں اور جنہیں موٹے موٹے لفظ استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے یہ لفظ حمایت امت کے نقارچیوں کو بھی پرے رکھتا ہے پارٹی کا مکمل نام ان تمام سورماؤں سے نجات کا تعویذ ہے جو خالی روحانی تلوار ہی چلانا جانتے ہیں، دراصل بے حوصلہ اور کم ہمت ہیں، اور موقعہ پڑنے پر ہمیشہ نام نہاد ذہانت کی ڈھال کے پیچھے سر چھپائے پھرتے ہیں۔

یہ تو ہمیں پہلے سے توقع تھی کہ جوں ہی ہماری تحریک شروع ہوئی، ایسے تمام بزدل مل جل کر ہم پر حملہ کریں گے البتہ یہ حملہ قلم دوات تک ہی محدود رہے گا، کیونکہ امت کی حمایت میں سربکف ہونے والے ان مجاہدین کے ہاتھ اکثر سرکنڈے ہی کے نیزے ہوا کرتے ہیں ہماری تحریک کا ایک اصول یہ تھا کہ ہم اپنی حفاظت کے لیے تشدد کا جواب تشدد سے دیں گے قدرتی بات ہے کہ ہمارے اس اصول سے ان قلم کے دھنی مجاہدین کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی وہ ہمیں نہ صرف اس لیے برا بھلا کہتے تھے کہ بقول ان کے ہم ڈنڈا پیر کا چلہ کھینچ لیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ان کا خیال تھا کہ ہم ذہنی طاقت سے بالکل محروم ہیں یہ نیم حکیم کبھی اتنا خیال نہ کرتے تھے کہ اگر خود محبان بھی کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہو تو اسے پچاس ایسے احمق خاموش کروا سکتے ہیں جو اس پر آوازے کسنے کی نیت سے وہاں آئے ہوں اور جلسہ سننے والوں کے خلاف مکے استعمال کرنے پر آمادہ ہوں یہ نیم حکیم ایسے بزدل ہوتے ہیں کہ وہ کبھی ایسے خطرہ والی جگہ پر جاتے ہی نہیں ہمیشہ کنج عزلت میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، نہ کبھی منہ سے آواز نکالتے ہیں اور نہ عوام کے سامنے آتے ہیں۔

خاموش کارکن ہمیشہ بزدل اور نکمے ہوتے ہیں

میں آج بھی اپنی نوزائیدہ تحریک کے اراکین کو پرزور الفاظ میں ایسے لوگوں سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو اپنے آپ کو ''خاموش رکن'' کا نام دیتے ہیں یہ خاموش رکن صرف بزدل ہی نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ جاہل اور نکمے بھی ہوتے ہیں جس شخص کو کچھ علم حاصل ہے اور جو جانتا ہے کہ کوئی خطرہ درپیش ہے، اور وہ اس خطرہ کے علاج سے بھی واقف ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ خاموش نہ رہے، بلکہ سامنے آ کر کھلے کھلے بدی کا مقابلہ کرے اور اپنے نسخہ کے مطابق خود علاج کر کے دکھائے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر ثابت ہو رہا ہے اس کے طرز عمل سے عیاں ہے کہ اس کا کردار ابھی پختہ نہیں وہ اس لیے میدان عمل میں آنے سے گھبراتا ہے کہ یا تو وہ بزدل ہے یا نالائق اکثر ایسے ''خاموش کارکنوں'' کی بابت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کام کے ہوتے ہیں ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں جو سچ مچ کا کوئی کارنامہ کر کے دکھائے۔ بس وہ دنیا کو اپنے کرتبوں سے الو بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں وہ ہوتے بالکل نکمے ہیں لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ اپنے ''خاموش کام'' میں بہت مصروف ہیں مختصر یہ کہ ایسے لوگ سراسر دھوکہ باز سیاسی مناصب کے بھوکے اور مخلص کارکنوں کے حاسد ہوتے ہیں جب کسی ایسے ملوڑے کو اپنے حمایت امت کے ''خاموش کام'' کی مدح میں جھنجھناتے سنیں تو یقین جانیں کہ آپ کو ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑا ہے جو خود کوئی تخلیقی کام نہیں کرتا، بلکہ وہ دوسروں کی کمائی کا پھل چرا کر گزارہ کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں اس گستاخی، تکبر اور بے حیائی کا بھی خیال کرنا چاہیے جس سے یہ سست، لکیر کے فقیر، دوسرے لوگوں کی محنت کے نتائج کو خاک میں ملا دیتے ہیں وہ دوسروں کے کام پر نکتہ چینی کرتے وقت بڑی دوں کی لیتے ہیں ان کی ایسی حرکتوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری قوم کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہوتے ہیں۔

تحریک کا ایک سادہ سے سادہ مقلد جس میں یہ جرات ہے کہ وہ کسی شراب خانہ میں میز پر کھڑے ہو کر مخالفین ی موجودگی میں دلیری سے اور کھلے کھلے اپنے خیالات کی

حمایت کر سکے ان دبک کر بیٹھے رہنے والے مکاروں سے بہتر ہے وہ کم از کم دو چار آدمیوں کو تو تحریک کا قائل کر دے گا اس کی خدمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ٹھوس نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی کوششوں کے موثر ہونے کی نسبت رائے قائم کی جا سکتی ہے لیکن یہ بدمعاش، دھوکہ باز، جو اپنی کارگزاری کو خود ہی ''خاموش کام'' کا نام دے کر سراہتے ہیں، اور گمنامی کے آنچل میں منہ چھپا کر بیٹھ رہتے ہیں، بالکل نکھٹو ملوڑے ہیں، اور صحیح معنوں میں اسی لقب کے مستحق ہیں احیائے قوم کے لیے یہ لوگ بالکل بیکار ہیں۔

ہمارا پہلا بڑا جلسہ عام

میں نے 1920ء کے آغاز میں تحریک کا پہلا بڑا جلسہ عام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اس تجویز کے متعلق ہمارے مابین اختلاف رائے پایا جاتا تھا تحریک کے بعض سرکردہ ارکین کا خیال تھا کہ ابھی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا وقت نہیں آیا، اور اس کا نتیجہ تحریک کے حق میں مضر ثابت ہونے کا خدشہ ہے، کمیونسٹ اخبارات نے اب ہمارا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ ہم انہیں مشتعل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ہماری تحریک کے ارکین نے اب دوسرے جلسوں میں شامل ہونا شروع کر دیا تھا وہاں جا کر وہ سوالات پوچھتے تھے، اور دوسرے مقررین کی تردید بھی کرتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ان کے خلاف شور مچا کر انہیں بٹھا دیا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کی ہمت سے تحریک کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا تھا لوگوں کو ہماری تحریک کے وجود کا علم ہونے لگا جوں جوں انہیں ہمارے مقاصد کا علم ہوا توں توں ہم سے ان کی نفرت اور دشمنی بڑھتی گئی اس وجہ سے ہم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھے کہ ہمارے سرخ دوست معقول تعداد میں ہمارے پہلے عام جلسے کو رونق بخشیں گے۔

مجھے خود احساس تھا کہ شاید ہمارا پہلا جلسہ منتشر کر دیا جائے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر آج ہم نے اس لڑائی سے منہ موڑ لیا تو پھر کچھ مہینہ بعد ہمیں اس میں حصہ لینا

پڑے گا تحریک کے روز قیام سے ہی ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہم ایمان کامل اور سنگدلانہ عزم سے کام لیتے ہوئے اس وقت تک لڑ بھڑ کر آگے بڑھتے چلے جائیں گے جب تک کہ تحریک کا مستقبل محفوظ نہیں ہو جاتا۔ میں سرخ کیمپ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کی ذہنیت سے خوب واقف تھا میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہم نے جان کی بازی لگا کر ان کا مقابلہ کیا تو نہ صرف ہم ان کے دانت کھٹے کر دیں گے، بلکہ شاید کے کچھ نئے پیرو بھی فراہم کرنے میں کامیاب ہو جائیں یہی دلائل مدنظر رکھ کر میں نے سرگرمی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان دنوں ہر ہرار ہماری تحریک کے صدر تھے ہمارے پہلے جلسہ عام کے انعقاد کے وقت کے متعلق وہ میری رائے سے متفق نہ تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک مخلص اور دیانت دار آدمی کی حیثیت میں تحریک کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا ان کی جگہ ہر ایسٹن ڈریکسا تحریک کے نئے صدر مقرر ہوئے تحریک کے پراپیگنڈے کا انتظام میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا میں پراپیگنڈہ کے معاملہ میں کسی قسم کی مفاہمت پر آمادہ نہ تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ اس تحریک کے زیر اہتمام جو کہ آج تک بالکل گمنام تھی ہمارا پہلا بڑا جلسہ عام 24 فروری 1920ء کو منعقد کیا جائے گا۔

تمام ابتدائی انتظامات کی نگرانی میں نے ذاتی طور پر کی اس انتظام میں کچھ ایسی دیر بھی نہ لگی ہماری پالیسی کیا ہوگی، اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے تحریک کا سارا نظام حرکت میں لایا گیا وقت کے مسائل کے متعلق ہم اس جلسہ عام میں کیا روش اختیار کریں گے، اس کا فیصلہ ہمیں چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر کرنا تھا جلسے کے اشتہار میں لوگوں کے سامنے اپنی پالیسی کی وضاحت ضروری تھی اس ضمن میں ہم نے اشتہارات بھی چھپوائے اور مختصر رسالے بھی تقسیم کیے ان رسائل اور اشتہارات کا مضمون پراپیگنڈے کے انہیں اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا جن کا ذکر میں پراپیگنڈے کے متعلق اپنے خیالات کے ساتھ کر چکا ہوں یہ اشتہارات اور رسائل ایسے انداز میں تیار کیے گئے کہ

عوام پر ان کا اثر پڑ سکے ان کا سارا زور چند نکات پر صرف کر دیا گیا اور یہ نکات بار بار دہرائے گئے عبارت مختصر اور واضح تھی اسلوب بیان سراسر یکطرفہ اور جابرانہ تھا ہم نے یہ اشتہارات اور رسائل ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر تقسیم کیے پھر ہم صبر سے نتائج کا انتظار کرنے لگے۔

تحریک کا خاص رنگ ہم نے سرخ قرار دیا، کیونکہ سرخ رنگ جاذب نگاہ ہوتا ہے نیز سرخ رنگ کے استعمال سے یہ بھی توقع تھی کہ ہم اپنے مخالفین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر کے انہیں مشتعل کرسکیں گے اس طرح وہ ہمارے وجود کا احساس کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ہمیں نظر انداز نہ کرسکیں گے۔

سرکاری عہدہ دار سوائے الا ماشاءاللہ قوم فروش ہوتے ہیں

ہماری ان ترکیبوں کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ بریایا کے اعتدال پسندوں اور کمیونسٹوں کا گٹھ جوڑ منظر عام پر آ گیا بویریا میں ان دنوں عوامی پارٹی برسر اقتدار تھی جو جرمنی کی مرکزی عوامی پارٹی سے ملحق تھی ہمارے اشتہارات سے کمیونسٹ عوام پر جو اثر ہو رہا تھا، اس کو ملیا میٹ کرنے کے لیے عوامی پارٹی نے پورا زور لگایا ہماری سرگرمیوں پر پابندی لگانے کے لیے واضح اقدام کیا گیا پولیس کو جب ہمارے اشتہارات کی ممانعت کے لیے اور کوئی عذر نہ ملا تو انہوں نے یہ بہانہ تراش لیا کہ سڑکوں پر لوگ اشتہار پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے آمد و رفت میں دقت پیدا ہوتی ہے یوں نام نہاد جرمن قوم پرست عوامی پارٹی اپنے کمیونسٹ اتحادیوں کے آڑے آئی اور انہوں نے ہمارے اشتہارات کی ممانعت کر دی حالانکہ ان اشتہارات میں ایک ایسے پیغام کا ذکر تھا جس کی طفیل لاکھوں مزدور قوم کے آغوش میں واپس لوٹ کر آ رہے تھے ان لاکھوں مزدوروں کو بین الاقوامی شورش پسندوں نے ورغلا رکھا تھا اور انہیں خود ان کی قوم سے بیزار کر دیا تھا ہماری نوزائیدہ تحریک ان دنوں جس سخت جدوجہد میں مصروف تھی یہ اشتہارات اس کے شاہد ہیں آنے والی نسلیں ان اشتہارات کی صورت میں ہمارے

عزم واستقلال اور منصفانہ وعادی کا دستاویزی ثبوت دیکھ سکیں گی ان اشتہارات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نام نہاد قومی حکام نے ایک ایسی تحریک کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی جو انہیں صرف اس لیے ناپسند تھی کہ وہ قوم کے عوام کو قوم پرست بنا رہی تھی، اور انہیں ان کے نسلی خاندان سے متحد کر دینے کے لیے کوشاں تھی۔

یہ اشتہارات اس نظریہ کی تردید کے لیے بھی کافی ہیں کہ ان دنوں بویریا میں قوم پرست حکومت قائم تھی۔ یہ اشتہارات اس امر کا دستاویزی ثبوت ہیں کہ اگر 1919ء سے لے کر 1923ء تک بویریا میں قوم پرستی کا دور دورہ رہا تو وجہ یہ نہ تھی کہ وہاں کوئی قوم پرست حکومت قائم تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم پرستی کے جذبہ نے آہستہ آہستہ عوام پر قابو حاصل کر لیا تھا، اور پھر حکومت عوام کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوگئی سرکاری حکام کا جہاں تک بس چلا انہوں نے قوم پرستی کے اس احیاء کے راستہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالیں۔ اور اسے ناممکن بنانے کی کوشش کی وہاں دو سرکاری افسر ایسے تھے جنہیں اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

ارنسٹ پوہنر ان دنوں پولیس کا افسر اعلیٰ تھا اس کا ایک وفادار مشیر ڈاکٹر فرک تھا جو اس کے ماتحت سب سے بڑا انتظامی افسر تھا اعلیٰ افسروں میں سے صرف یہی دو افسر تھے جو اپنی ملازمت اور اپنے ذاتی مفاد پر ملکی مفاد کو ترجیح دینے کی جرات رکھتے تھے جو لوگ ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے ان میں سے صرف ہر پوہنر ہی ایسا آدمی تھا جو عوام کے سامنے ناک نہ رگڑتا تھا، بلکہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ جرمن قوم کے احیاء کی خاطر اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنا ذاتی روزگار بھی خطرے میں ڈال دے۔ اسے جرمن قوم سے والہانہ محبت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ کمینہ فطرت سرکاری افسروں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا یہ افسر قومی احیاء کی ضرورت کے جذبہ سے سرشار نہ تھے نہ ہی ان کی کارگزاری قوم کی خاطر تھی وہ صرف حکومت کے آلہ کار تھے تاکہ اپنی روٹی کما سکیں انہیں قومی بہبودی کا کچھ خیال نہ تھا حالانکہ قوم کی بہتری کی امانت ان کے سپرد تھی۔

بڑی بات یہ ہے کہ پوہنر ایک ایسا آدمی تھا جو اکثر اقتدار سرکار کے حامیوں کی وضع کے خلاف قوم کے غداروں کو اپنا دشمن بنانے سے ڈرتا نہ تھا، بلکہ قومی غداروں کی دشمنی وہ اپنی دیانت اور شہرت کے لیے طغرائے امتیاز سمجھتا تھا ایسے آدمی کے لیے یہودیوں اور کمیونسٹوں کی نفرت، یا ان کے پھیلائے ہوئے افترا و بہتان، سامان مسرت تھے۔ جب چاروں جانب قوم بدحالی میں گرفتار ہو تو اس سے بہتر سامان مسرت اور ہو بھی کیا سکتا ہے وہ تو پرانے زمانہ کا ایک رشی تھا وہ ایک صاف گو جرمن تھا وہ غلامی کی زندگی سے آزادی کی موت کو منہ سے ہی نہیں بلکہ دل سے بہتر جانتا تھا

میری رائے میں بویریا کے تمام بڑے بڑے آدمیوں سے صرف ہر پوہنر اور اس کے ساتھی ڈاکٹر فرک کو یہ حق حاصل ہے کہ انہیں بویریا کے قوم پرست بنا دینے کا ذمہ دار سمجھا جائے۔

ہماری تحریک تا قیامت زندہ رہے گی

ہمارا پہلا جلسہ عام منعقد کرنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ نہ صرف ہمارے پراپیگنڈے کا سامان تیار ہو، بلکہ ہمارے پروگرام کی موٹی موٹی شقیں بھی طبع ہو جائیں میں اس کتاب کی دوسری جلد میں ان اصولوں کو بیان کروں گا جو ہم نے یہ پروگرام بناتے وقت مدنظر رکھے۔ یہاں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ پروگرام تیار کرتے وقت مقصد یہ نہ تھا کہ نوزائیدہ تحریک کی شکل وصورت اور معنویت کو مرتب کر دیا جائے، بلکہ مقصد یہ بھی تھا کہ پروگرام پڑھ کر عوام تحریک کو سمجھ جائیں نام نہاد تعلیم یافتہ طبقات پہلے ہمارے پروگرام کا مذاق اڑاتے رہے، پھر اس پر پھبتیاں کستے رہے اور بالآخر اس پر تنقید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے پروگرام کا جو اثر ہوا اس نے ثابت کر دیا کہ ہمارے خیالات صحیح تھے۔

اس دوران میں درجنوں ہی تحریکیں میری آنکھوں کے سامنے اٹھیں، اور پھر کوئی نشان چھوڑے بغیر ختم ہو گئیں۔ صرف ایک تحریک ایسی تھی جو تب سے لے کر آج تک

قائم رہی یہ تحریک قوم پرست سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی ہے آج مجھے ہمیشہ سے زیادہ یقین ہے کہ چاہے ہماری تحریک کا مقابلہ کیا جائے، چاہے اس مفلوج کرنے کی کوشش کی جائے اور چاہے بال کی کھال اتارنے والے ''قانون دان وزراء'' ہمیں تقریر کی ممانعت کر دیں، لیکن ہمارے خیالات کو غالب آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ جب آج کل کا نظام حکومت فراموش ہو چکا ہوگا، اور لوگوں کو ان سیاسی جماعتوں کے نام بھی یاد نہ ہوں گے جو اس نظام کے ماتحت اقتدار حاصل کرتی ہیں تب بھی قوم پرست سوشلسٹ تحریک کا پروگرام مستقبل کی سلطنتوں کی تعمیر کی بنیاد کے طور پر کام دے سکے گا۔

جنوری 1920ء سے پہلے ہم جو جلسے منعقد کرتے رہے تھے، ان کے ذریعہ ہمارے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی جس سے ہم نے اپنے اولین اشتہارات رسائل اور منشور کی کاپیاں طبع کروالیں۔

پہلے بڑے جلسے کا باقی حال

اس کتاب کے پہلے حصہ کے اختتام پر میں تحریک کے اولین جلسہ عام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں پہلے بڑے جلسہ عام کی تقریب پر ہم نے اپنی چھوٹی سی پارٹی کا سابقہ ڈھانچہ توڑ کر زمانہ حال کی سب سے بڑی طاقت بننے کی طرف قدم اٹھانا شروع کیا تب مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جلسہ گاہ حاضرین سے پر نہ ہو سکے کہیں ہمیں خالی کرسیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ اگر ایک دفعہ لوگ آ گئے تو یہ جلسہ ہماری نئی تحریک کے لیے ایک زبردست کامیابی کا پیش خیمہ ہوگا جب میں بے صبری سے جلسہ کے شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا تو یہ تھی میرے دل کی حالت۔

اعلان کیا جا چکا تھا کہ جلسہ ساڑھے سات بجے شروع ہوگا جلسہ شروع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے میں ہاف براؤ ہاؤس کے سب سے بڑے ہال میں داخل ہوا یہ ہال میونخ شہر کے پلاٹز، نامی بازار میں واقع ہے۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا یہ عظیم الشان ہال جو اس وقت مجھے بہت بڑا نظر آ رہا تھا،

حاضرین سے پر تھا جن لوگوں کو ہال کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی وہ باہر کھڑے تھے حاضرین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ حاضرین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہیں ہم ہمیشہ سے بلانے کے خواہش مند تھے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ نصف سے زیادہ حاضرین کمیونسٹ یا آزاد خیال ہیں وہ دل میں امنگ لے کر آئے تھے کہ ہمارے پہلے بڑے جلسہ عام کو آسانی سے منتشر کر دیں گے۔

برخلاف ان کی توقع کے واقعات نے کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیا۔ جب پہلا مقرر تقریر ختم کر چکا تو میں بولنے اٹھا چند ہی منٹ کے بعد مجھ پر اعتراضات کی ایسی بارش ہونے لگی کہ گویا اولے برس رہے ہوں ہال کے اندر جا بجا لوگوں میں مار پیٹ ہونے لگی میرے ایام جنگ کے مٹھی بھر وفادار دوست اور تحریک کے بعض مقلدین جلسہ خراب کرنے والوں کے ساتھ دست و گریبان ہو گئے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جلسہ کا نظام دوبارہ بحال کر دیا گیا میں نے پھر اپنی تقریر شروع کی میں تقریباً نصف گھنٹہ بولا ہوں گا کہ ''مردہ باد'' کے نعرے ''زندہ باد'' کی گونج سے دب گئے آہستہ آہستہ ''مردہ باد'' ماند پڑ گئی اور چاروں جانب زندہ باد کی آوازیں آنے لگیں آخر کار جب میں نے تحریک کے پروگرام کے پچیس نکات لوگوں کے سامنے ایک ایک کر کے پیش کیے اور انہیں اظہار رائے کی دعوت دی تو ہر نکتہ کا پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ جب میں آخری نکتہ تک پہنچا تو جلسہ گاہ کے تمام حاضرین ایک نئے اعتقاد ایک تازہ ایمان اور ایک جدید عزم پر متحد ہو چکے تھے جلسہ قریباً چار گھنٹہ کے بعد ختم ہوا جب عوام کندھے سے کندھا ملائے جلسہ گاہ کے دروازوں پر دھکم دھکا ہو کر باہر جا رہے تھے تب انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی ہے جس کی طفیل جرمن قوم کا نام کبھی صفحہ ہستی سے مٹنے نہ پائے گا۔

غداروں کو چبانے کے لیے انتقام کی دیوی کا خوفناک جبڑا کھل چکا ہے

ایک ایسی چنگاری سلگائی جا چکی تھی جس سے بھڑکنے والی آگ اس بھٹی کو گرم کرے گی جس کے اندر تیار ہونے والی تلوار جرمن قوم کے احیاء کا فریضہ انجام دے گی، اور جرمنی کے گرد ایک حصار کا کام دے گی۔

جہاں میری آنکھیں نگاہ تصور سے ایک طرف جرمن قوم کے دوبارہ زندہ ہونے کا نظارہ دیکھ رہی تھیں وہاں مجھے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ انتقام کی دیوی اب 9 نومبر 1918ء کے روز قوم سے غداری کا ارتکاب کرنے والوں کو چبا ڈالنے کے لیے اپنے ہولناک جبڑے کھول رہی تھی جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی تحریک کا قافلہ منزل کی جانب اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حصہ دوم

دیباچہ مترجم

ہٹلر کی خودنوشتہ سوانح عمری کی پہلی جلد میں اس کے خاندان کے اور اس کے ذاتی حالات بھی درج ہیں چنانچہ تزک بابری اور تزک جہانگیری وغیرہ کے تسمیہ کی ادبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلی جلد کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو اس کا نام ''تزک ہٹلری'' رکھا گیا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اس وقت تک اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

شائقین کی قدردانی ملحوظ رکھتے ہوئے اب دوسری جلد کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے اس جلد میں مصنف نے ''سرکار'' کے متعلق اپنا نظریاتی عقیدہ واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایسی سرکار کے قیام کی جدوجہد کے لیے ''جماعت'' کی تنظیم کس طرح ہونی چاہیے ''آئین'' اور ''قانون'' کے متعلق مصنف کے نظریات کی وضاحت بھی اسی حصہ میں ہے۔ اس رعایت سے اس کا عنوان تجویز کرتے ہوئے ''تورہ چنگیزی'' کی ترکیب لفظی کا تتبع زیادہ مناسب حال معلوم ہوا چنانچہ اس جلد کا نام تورہ ہٹلری رکھا گیا ہے

ہٹلری نظام فکر اور سبب ترجمہ کی صراحت تزک ہٹلری کے دیباچہ اول میں کر دی گئی تھی وہ دیباچہ اس جلد کے شروع میں دوبارہ نقل کیا جا رہا ہے لہٰذا ان موضوعات پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔

یوں تو تشدد، تغلب اور استحصال شروع سے ہی دول یورپ اور ملل مغرب کا خاصہ رہا ہے۔ اسکی وجہ شاید وہ جبلی سرشت ہے جو پشتوں تک خنزیر کھانے شراب پینے، بے حجاب و بے نقاب رہنے اور اولاد زنا کو فروغ دینے سے گوری نسلوں میں سرایت کر چکی ہے نصرانیت جیسا رقت خیز اور تلف آمیز مذہب بھی اس وحشیانہ فطرت کو بدل نہ سکا۔ چنانچہ اطالوی اور المانوی قیاصرہ کی خونخوارہ، زار روس کی بربریت، نپولین کا ذوق فوج کشی، انگریزوں کی قزاقانہ روایات اور وحشیوں اور ریڈ انڈین پر امریکی مظالم، تاریخ عالم کے ہر طالب علم کو متاثر کرتے ہیں۔

لیکن ہٹلر کے عروج کے وقت سے ڈکٹیٹر شپ بطور ایک سیاسی نظام حکومت کے

مغربی تمدن کے اثرات کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ روس، ترکی اور اطالیہ میں تو ہٹلر کے عروج سے پہلے بھی ڈکٹیٹر شپ قائم تھی ہسپانیہ میں ہٹلر اور مسولینی نے مل کر ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی امریکہ میں جین حیات صدر روز ویلٹ اور انگلستان میں چرچل نے جیسا ذاتی اقتدار حاصل کر لیا وہ ڈکٹیٹر شپ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ یالٹا کے معاہدہ کی جو دستاویزات شائع ہو چکی ہیں ان کا نمایاں ترین پہلو یہی ہے روز ویلٹ کے بعد ٹرومین نے با اختیار خود کوریا کی جنگ چھیڑ دی آج پریذیڈنٹ آئزن ہاور بھی فارموسا کے مسئلہ پر جنگ چھیڑنے کے اختیارات اپنی ذات واحد میں سمیٹے بیٹھے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ ان لوگوں کا یہ اقتدار، ان کی غیر معمولی قابلیت اور اپنی اپنی قوم کے جذبات کی صحیح ترجمانی کے طفیل ہے، تو دنیا میں ایسا کون سا کامیاب ڈکٹیٹر گذرا ہے جو قابل نہ تھا یا اپنی قوم کا مزاج شناس نہ تھا آمریت اگر قیادت کا نام اختیار کر لے تو اس سے اس کی اصلیت میں کیا فرق پڑتا ہے۔

ہٹلر کے زوال کے بعد ڈکٹیٹر شپ نے دیکھتے ہی دیکھتے یوگوسلاویہ، مصر، ایران اور چین میں بھی پاؤں جما لیے ہیں آج قاہریت اور جباریت ایسی عام ہو چکی ہے کہ استبداد اور نظام حکومت مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں تجارت میں کنٹرول اور پرمٹ سیاست میں سیفٹی ایکٹ اور حاکم وقت سے اختلاف رائے رکھنے والے کو غدار قوم قرار دے کر تختہ دار پر کھینچ دینا یا گولی سے اڑا دینا ایک ایسی معمول کی رسم ہے جو کمیونسٹ اور جمہوری بلاک میں یکساں اہتمام سے ادا ہوتی ہے۔

اگر حکومت میں کلیت اور ہمہ گیری کا یہ عالمگیر رجحان ایک مذہب ہے، تو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ اس مذہب کا دیوتا نسل ہے، یا دولت یا خالی گروہ بندی، لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اس فتنہ پرور مذہب کا پیغمبر موجودہ عہد میں یقیناً ہٹلر تھا۔

پاکستان کی نوائیدہ سلطنت رحمۃ للعالمینؐ کے نام کے صدمہ میں حاصل کی گئی ہے

اس لیے ہم فی زمانہ شیطنت کے بہترین وکیل کی تعلیمات سے آگاہ رہنے کے خواہش مند ہوں تو یہ عین مناسب ہے۔

تو رہ ہٹلری کی ایک اور قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ ہٹلر نے جس طرح کمیونزم اور مارکس ازم کے مسئلہ کو سمجھا ہے ایسا گہرا اور عالمانہ تجزیہ آج تک کمیونزم کا کوئی مخالف نہیں کر سکا۔ سچ ہے ولی را ولی می شناسد شیطان کو شیطان ہی سمجھ سکتا ہے صیہونیت اور اشتراکیت کا راز ایک آریا ہی فاش کر سکتا تھا۔

پیسہ اخبار سٹریٹ لاہور

مورخہ یکم جنوری 1955ء

خاکسار

محمد ابراہیم علی چشتی

☆☆☆☆☆☆

حصہ دوئم

باب اول :: ضابطہ حیات اور پارٹی کا باہمی رشتہ

ہمارا پہلا جلسہ عام

ہماری تحریک کے زیر اہتمام پہلا عظیم الشان جلسہ عام 24 فروری 1920ء کو منعقد ہوا میونچ کے ہاف براؤہاؤس ہوٹل کے ایوان ضیافت میں قریباً دو ہزار سامعین کے سامنے ہماری تحریک کے پچیس نکات کی وضاحت کی گئی حاضرین نے ہمارے منشور کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

پریشان خیالی اور بے یقینی دور کرنے کے لیے تحریک کا منشور ضروری ہے

اس زمانہ میں چاروں طرف ایسے کہنہ اور پریشان خیالات واوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا نہ صرف کوئی سر پیر نہ تھا بلکہ جو قوم و وطن کے حق میں ضرر رساں بھی تھے ہمیں اس پریشان خیالی، بے یقینی اور گمراہی کے خلاف ایک نئے جہاد کا آغاز کرنا تھا اس مہم کو پھیلاتے وقت ہمیں کیا اصول ملحوظ رہیں گے اور ہمارے لائحہ عمل کے خطوط کیا ہوں گے، اس کی وضاحت ہمارے منشور کے پچیس نکات میں موجود تھی جب ہم نے اپنا منشور عوام کے سامنے پیش کیا تو گویا ہم نے قوم کو آگاہ کر دیا کہ ہماری تحریک کے بنیادی اصول کیا ہیں اور طریقہ کار کیا ہیں بزدل اور کم ہمت کھاتے پیتے طبقات میں اب ایک نئی طاقت کا ظہور ہونے والا تھا قضاو قدر کا حکم ہو چکا تھا کہ جب کمیونسٹوں کی فاتحانہ برات کامیابی کی چوکھٹ کے قریب پہنچے تو اس وقت یہ نئی طاقت آگے بڑھ کر قسمت کے چکر کی گردش پلٹ دے۔کمیونسٹ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے روک دیئے جائیں گے۔

قوم کو نئے انتخابی نعرہ کی نہیں بلکہ ایک انقلابی ضابطہ حیات کی ضرورت ہے

اس جناتی جدوجہد میں عوام کی پوری ہمنوائی درکار تھی ضرورت تھی کہ جمہور کے اندر تحریک کا چرچا پھیل جائے بغیر اس ہمنوائی اور چرچے کے اس جدوجہد میں کامیابی محال تھی عوام کی ہمنوائی اور جمہور میں تحریک کا چرچا صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے جب شروع سے ہی تحریک کے مقلدین کے دل میں یہ پختہ یقین نقش کر دیا جاتا کہ ہماری تحریک ملک کے سیاسی اکھاڑے میں محض کوئی نیا انتخابی نعرہ بلند کرنے کے لیے نہیں اٹھی بلکہ ہماری تحریک تو ایک جدید ضابطہ حیات کی علمبردار ہے اور یہ ضابطہ حیات ایک عظیم انقلاب کا پیغامبر ہے۔

ان دنوں کی سیاسی فضا کا اندازہ درکار ہو تو حافظہ پر زور ڈال کر یاد کرنا ہوگا کہ کیا رنگا رنگ خیالات کو یکجا کر کے سیاسی پارٹیوں کے نام نہاد منشور تصنیف ہوا کرتے تھے وقتاً فوقتاً منشور پر تازہ روغن پھیرا جاتا تھا اور ضرورت ہو تو جابجا پیوند بھی لگا دیئے جاتے تھے یہ منشور کیا ہوتا تھا ہزار سر پاؤں کے دیوتا کا ایک بھوت ہوتا تھا جو گرگٹ کی طرح باری باری رنگ بدلتا رہتا تھا اس بھوت کا حسب نسب سمجھنا ہو تو ان مقاصد پر غور کرنا ہوگا۔ جن کے ماتحت بالعموم ''منشور کمیٹیوں'' کے کھاتے پیتے اراکین ''پروگرام تیار کرنے'' بیٹھے تھے۔

انتخابی دنگل کے ''خلیفے''

ان لوگوں کو ہمیشہ ایک ہی دھن سر پر سوار رہتی تھی چاہے وہ منشور میں سے کوئی شق خارج کریں یا چاہے کسی مد کا اضافہ کریں ان کا منتہائے نگاہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ الیکشن پر اس کا اثر کیا ہوگا پارلیمنٹری نظام حکومت کے ان کو چبانوں کو جب کبھی ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ ان کے ''عزیز از جان جمہور'' پرانے زین اور لگام کو دیکھ کر تیخ پا ہو جائیں گے تو یہ پولیٹکل سائیس فوراً تازہ ہری ہری گھاس مٹھی میں لے کر سامنے آ جاتے

تھے ایسے موقعوں پر پارٹی کے سیاسی جوتشیوں اور انتخابی رمل فال دیکھنے والوں کی بھی خوب بن آتی تھی ان بزرگوں کو کبھی ''انتخابی دنگل خلیفہ'' کا نام دیا جاتا تھا اور کبھی ''ماہرین الیکشن'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا بالعموم یہ حضرات ایسے پرانے پارلیمنٹری گرگے ہوتے تھے جو ماضی میں الیکشن لڑتے لڑتے اب اس ''فن'' میں طاق ہو چکے تھے۔

انہیں خوب یاد رہتا تھا کہ گذشتہ زمانہ میں رائے دہندگان کن مواقع پر برگشتہ ہو گئے تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آج کن علامتوں سے بھانپ کر عوام کی برگشتگی کا بروقت اندازہ کرلینا چاہیے رائے دہندگان کی برہمی کو دور کردینے کا ان کے پاس ایک ہی آزمایا ہوا نسخہ تھا نسخہ یہ تھا کہ پہلے ایک کمیٹی بنائی جائے پھر عزیز از جان جمہور کے مابین چل پھر کر پتہ چلایا جائے کہ آج کل عوام میں کیا چرچے ہیں یہ لوگ اخبارات کو سونگھ سونگھ کر، اندازہ کر لیتے تھے کہ ان کے ''عزیز از جان جمہور'' آج کل کیا خواہشات رکھتے ہیں، کن نعروں سے بیزار ہو چکے ہیں اور کن امیدوں سے سرشار ہیں مختلف طبقات اور گروہوں کی توقعات اور خدشات کا جدا جدا اندازہ کیا جاتا تھا حتیٰ کہ ہر پیشہ، ہر کاروبار اور مختلف دفاتر کے ملازمین کی دلی امنگوں کی بھی تفتیش کی جاتی اور بغور مطالعہ ہوتا۔ مخالف پارٹیوں کے جن چھپے ہوئے نعروں سے خطرہ محسوس کیا جاتا، انہیں اپنانے کی کوشش کی جاتی بسا اوقات ان نعروں کے اصلی مصنفین اور مبلغین یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے کہ جن کے خلاف نعرہ وضع کیا گیا تھا، انہیں کے لبوں پر اس کا سب سے زیادہ چرچا ہے پرانی پارٹیوں کا ''نئے نعرے'' چھین کر لے جانا کوئی اچنبا حرکت نہ تھی۔

پروردگار کی بے اندازہ مغفرت، یا رائے دہندگان کی بے پایاں حماقت

غرض کمیٹیوں کے اجلاس منعقد ہوتے، پرانے منشور پر ''نظر ثانی'' کی جاتی، نئے منشور گھڑے جاتے ان لوگوں کے لیے اپنے اعتقادات تبدیل کرنا اس سے زیادہ دشوار

نہ تھا جتنا کہ کسی سپاہی کے لیے اپنا جوؤں سے بھرا ہوا پرانا کرتا پرے پھینک کر نئی قمیض بدلنا دشوار ہوسکتا ہے نئے منشور میں ہر مخاطب کی آرزوئیں پوری کرنے کے منتر درج ہوتے تھے کاشتکاروں کو یقین دلایا جاتا تھا کہ زراعت کے مفاد کی نگہداشت کی جائے گی صنعت سازوں سے وعدہ کیا جاتا کہ ان کے مال کی قیمتیں بڑھا دی جائیں گی گاہکوں سے عہد کیا جاتا کہ ہر شے سستی فراہم ہوگی اسکولوں کے مدرسین کی تنخواہیں بڑھانے کے منصوبے پیش ہوتے ۔سرکاری ملازمین کی پنشنوں کی موجودہ شرح ناکافی قرار دی جاتی بیوگان اور یتیموں کے لیے سرکاری وظیفوں کا اجراء اشد ضروری بیان کیا جاتا تجارت کی ترقی اولین فرض ہے محصول اور ٹیکس اگرچہ بالکل ختم نہیں کیے جا سکتے لیکن قریب قریب ختم کر دیے جائیں گے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عوام کے کسی طبقہ کی ضروریات کا تذکرہ چھوٹ جاتا، یا جمہور کے کسی گروہ کی آواز پارٹی کے کانوں تک نہ پہنچتی ۔آخر میں یہ کمی بھی جلدی سے پوری کی جاتی اور منشور میں جتنی جگہ باقی ہوتی وہاں ان مطالبات کو کسی نہ کسی طرح ٹھونس دیا جاتا ۔غرض ٹوٹھمبو کرتے ہوئے بالاخر دل کو تسلی دی جاتی کہ اب ہر پیٹ کے بندے اور اس کی زوجہ محترمہ کی تمام ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ لے کر ان کی تشویش دور کر دی گئی ہے اور اب وہ ایک دفعہ پھر مطمئن ہو کر ہمارے پیچھے لگ جائیں گے اس کے بعد پروردگار کی بے اندازہ مغفرت اور رائے دہندگان کی بے پایاں حماقت پر اعتماد کرتے ہوئے الیکشن لڑنے اور جرمنی کا بیڑا پار کرنے کی مہم ازسرنو شروع ہو جاتی۔

پارلیمنٹری ٹڈے

جب الیکشن ختم ہو جاتا تو پارلیمنٹری سیاست دان موسم کا آخری جلسہ عام منعقد کرنے کے بعد اگلے چار سال کے لیے فارغ ہو جاتے عوام کو پیچھے لگانے کی مہم تکمیل کو پہنچ جاتی تو پھر یہ قومی رہنما زیادہ خوشگوار اور بلند تر فرائض کی جانب متوجہ ہوتے ۔اب منشور کمیٹی توڑ دی جاتی رائے عامہ کی تنظیم اور ترقی پسندی کا مفہوم ایک مرتبہ پھر اپنے

نان شبینہ مہیا کرنے کی جدوجہد تک محدود ہو جاتا پارلیمنٹ کے اراکین آخر اسی لیے تو ہر روز اجلاس میں شرکت کرنے کی زحمت برداشت کرتے ہیں کہ ان کی روزانہ حاضری کے عوض ان کو بھتہ ملنے میں ناغہ نہ پڑ جائے "ایوان کے معزز اراکین" ہر روز بڑے اہتمام سے پارلیمنٹ تک جاتے ہیں اگر وہ ایوان میں داخل نہ بھی ہوں تو کم از کم بیرونی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر حاضری رجسٹر کے اندر اپنا نام درج کرنے سے تو ہرگز کوتاہی نہیں کرتے۔ بے چارے "نمائندگان قوم" بھی اپنے حلقہ انتخاب کی جو گراں قدر خدمات انجام دینی پڑتی ہیں انہیں میں یہ کارنمایاں بھی شامل ہے کہ ہر روز حاضری کے رجسٹر میں اپنا نام لکھنا پڑتا ہے اور اس بے بہا خدمت کے صلہ میں انہیں کچھ حقیر معاوضہ بھی طوعاً و کرہاً قبول کرنا ہوتا ہے۔ قوم کے نمائندے قوم کی جو مسلسل اور کٹھن خدمات انجام دیتے ہیں ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حقیر وظیفہ، معزز اراکین کے لیے رزق حلال نہیں۔

جب چار سال گزر جائیں، یا چار سال گزرنے سے پہلے کوئی ایسا غیر متوقع امکان پیش آ جائے کہ پارلیمنٹ کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکل کر تازہ انتخابات کی تپش میں بھاگ دوڑ کا خطرہ لاحق ہو جائے تو پھر ان معزز اراکین کا جذبہ قومی یکلخت بیتابی سے کھولنے لگتا ہے جس طرح موسم برسات میں بے چاری چیونٹی اپنے پر اگنے سے نہیں روک سکتی، اسی طرح الیکشن کی رت آ جانے پر یہ پارلیمنٹری ٹڈے بھی ایوان اسمبلی سے نکلتے ہی "عزیز از جان جمہور" کے گرد پھر پروانہ وار چکر کاٹنے لگتے ہیں رائے دہندگان کے سامنے از سر نو تقاریر کا شغل تازہ کیا جاتا ہے "شاندار خدمات" کا رونا رویا جاتا ہے اور بدبخت مخالفین کی ہٹ دھرمی اور راستہ میں روڑے اٹکانے والی کرتوتوں کا دکھڑا سنایا جاتا ہے۔

قوم کے پروانے یا الیکشن کے پسو

عوام ہمیشہ ان لوگوں کا استقبال تپاک سے نہیں کرتے ناخواندہ جمہور بھی بعض

اوقات اپنے ان خیر خواہوں کے سامنے مخالفانہ اور نا سزا نعرے بلند کرنے سے نہیں چوکتے جب جمہور کی یہ ''احسان نا شناسی'' ایک خاص حد سے تجاوز کرنے لگے تو اس کا صرف ایک ہی علاج ہے ایسے آڑے وقت پر پارٹی کا وقار بچانے کی صورت فقط یہ ہے کہ تازہ منشور مرتب کیا جائے! اگر مرض میں افاقہ نہ ہو تو آخر ایک تیر بہدف علاج یہ بھی ہے کہ نسخہ ہی از سر نو لکھ دیا جائے! منشور تبدیل کرنے کے سوا ایسے موقوں پر اور ہو بھی کیا سکتا ہے غرض ایک عدد ''منشور ساز کمیٹی'' کی تشکیل فی الفور عمل میں آ جاتی ہے اس طرح فریب کاری کا یہ چکر نئے سرے سے شروع ہو جاتا ہے اگر آپ کو علم ہے کہ عوام کی عقل کتنی موٹی ہوتی ہے تو آپ کو ذرہ بھر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ایسی چالیں کیوں بار بار چل جاتی ہیں اخبارات پھر ایک مرتبہ جمہور کو ورغلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں نیا منشور جمہور کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا ہے۔ ووٹر صاحبان چاہے کھاتے پیتے طبقات سے تعلق رکھتے ہوں اور چاہے کنگال ہوں، معصوم مویشیوں کی طرح پوری وفاداری سے جس کھونٹے پر پہلے بندھے تھے، دوبارہ بھی وہیں جا حاضر ہوتے ہیں اور پرچیاں ڈال کر انہیں قصائیوں کو الیکشن میں کامیاب کرواتے ہیں جو پہلی مرتبہ ان کو ذبح کرنے سے باز نہ رہے تھے ''عوام کے نمائندے'' اور ''مزدوروں کے ترجمان'' پارلیمنٹ کے بل میں داخل ہوتے ہی اپنا وہ پر جھاڑ دیتے ہیں جو انتخابی مہم کے دوران میں پروانہ وار سوز ظاہر کرنے کے لیے اگائے گئے تھے رائے دہندگان کی شمع کے گرد چکر کاٹنے والے یہ پروانے اب پھر وہی پرانے پسو بن کر بے دریغ عوام کا خون چوسنے لگتے ہیں ہاں چار سال گزر جائیں تو پھر انہیں خونخوار پسوؤں کو جانباز پروانوں کا روپ دھارنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

عہدوں کے لالچی لپے، غدار اور بکھیڑے باز

جب اس دھوکہ اور فریب کو بار بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تو پھر یہ احساس ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مکر اور دغا کا یہ کھیل درحقیقت نہایت گھناؤنا ہے۔ الیکشن کی مہمات میں سرگرم

رہنے سے جو روحانی تربیت ملتی ہے وہ کھاتے پیتے طبقات کو کبھی کمیونزم کی منظم طاقت کے مقابلہ کا اہل نہیں بنا سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ کھاتے پیتے طبقات نے آج تک سنجیدگی سے یہ سوچا تک نہیں کہ کمیونزم کا مقابلہ کیسے ممکن ہے یہ پارلیمنٹری نیم طبیب جو آج کل گوری نسلوں کے مزعومہ قائدین بنے بیٹھے ہیں ان کی بابت ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ان کا ذہنی معیار نہایت پست ہے لیکن ان نیم طبیبوں کو بھی اتنی عقل ضرور ہے کہ مغربی جمہوریت کے سارے اس عقیدہ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو مغربی جمہوریت اور اس کے تمام لوازمات اپنی اغراض کے حصول کا زینہ بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے کمیونسٹ جمہوریت سے اپنے مخالفین کو مفلوج کرنے کا کام لیتے ہیں جمہوریت ہی کی مدد سے کمیونسٹ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا راستہ بھی صاف کرتے ہیں بے شک کمیونسٹوں کا ایک عنصر کچھ عرصہ تک اپنی تمام جدت طبع یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیتا ہے کہ جمہوریت کا عقیدہ تو ان کا جزو ایمان ہے لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جب کوئی نازک اور امتحان کا موقع پیش آ جائے تو یہی ''معززین'' جمہوریت کے اس اصول کو پائمال ہوتا دیکھ کر کچھ پروا نہیں کرتے کہ ''تمام سیاسی فیصلے کثرت آراء کے پابند ہونے چاہئیں'' میرے اس دعوے کے ثبوت میں ایک مثال پیش کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی جن دنوں پارلیمنٹ میں کھاتے پیتے لوگوں کو اکثریت حاصل تھی تو یہ کھاتے پیتے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وطن کی باگ دوڑ ہمارے ہاتھ میں ہے لہذا وطن بالکل محفوظ ہے لیکن کمیونسٹوں نے یکلخت لچوں، غداروں، سیاسی منصب کی ہوس رکھنے والوں اور یہودی بکھیڑا بازوں کا ایک ہجوم جمع کر کے دھاوا بول دیا اور تشدد کے ذریعہ حاکمانہ اقتدار سنبھالنے میں ایک لمحہ بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی کمیونسٹوں کا یہ اقدام، اس جمہوری اصول کے خلاف ایک ضرب کاری تھا جس پر پارلیمنٹ کے بت کے پجاری آس لگائے بیٹھے ہیں خالی زود اعتقاد پارلیمنٹری شعبدہ بازی ہی اس مغالطہ میں گرفتار ہو سکتے تھے کہ کمیونزم کی عالمگیر وبا پھیلانے والے عناصر جس سنگ دل اور بربریت سے

حملہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اس کا مقابلہ آج یا کبھی مستقبل میں فقط مغربی جمہوریت کے تعویذ گنڈے سے کیا جاسکتا ہے یہ پارلیمنٹری شعبدہ باز اکثر کھاتے پیتے طبقات کے گم راہ سیاست دان ہوتے تھے۔

کمیونسٹ قول کے کچے اور چال کے پکے ہوتے ہیں

کمیونسٹ اسی وقت تک جمہوریت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، جب تک جمہوریت کسی نہ کسی طرح کمیونسٹوں کے مجرمانہ مقاصد کے حصول میں ان کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے کمیونسٹوں کے لیے جمہوریت کا ایک بدیہی فائدہ تو یہ ہے کہ جن قوم پرست عناصر کو کمیونسٹ ختم کردینا چاہتے ہیں جمہوریت کی آڑ لے کر ایسے قوم پرست عناصر کا تعاون بھی وقتی طور پر کمیونسٹوں کو حاصل ہوجاتا ہے ہاں جس روز کمیونسٹوں کو یقین ہوگیا کہ جمہوریت ان کے مقصد کے لیے ذرہ بھر ضرر رساں ثابت ہوسکتی ہے اسی روز کمیونسٹ جمہوریت کا ٹاٹ بھی اسی طرح الٹ کر رکھ دیں گے جیسے جادوگرنیاں اپنے ٹونے کا جاپ پورا کرلینے کے بعد اس کڑاہی کو الٹ دیا کرتی ہیں، جس میں نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ ڈال کر جادو پورا کرنے کی خاطر دھونی رمائی جاتی ہے جب کبھی کمیونسٹوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ایوان کی اکثریت کمیونزم کے خلاف کوئی ایسا قانون بنانے والی ہے جس سے کمیونزم کے قلع قمع کا امکان ہوسکتا ہے تو کمیونسٹ فی الفور جمہوریت کے بھان متی کے کنبہ کے گن گانے سے دستبردار ہوجائیں گے تب جمہور کے ضمیر سے اپیل کرنے کی بجائے کمیونسٹوں کی بین الاقوامی ٹولیاں اور جتھے میدان جنگ میں اترنے سے دریغ نہ کریں گے عوام کو جنگی نعروں سے مشتعل کیا جائے گا اس کے بعد جو معرکہ پیش آئے گا اس کا فیصلہ پارلیمنٹری ''شائستہ فضا'' میں نہ ہوگا بلکہ اس معرکہ کا نتیجہ سڑکوں اور کارخانوں میں ہاتھا پائی اور گشت وخون کے بعد برآمد ہوگا اسی روز جمہوریت کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلے گا پارلیمنٹ میں ''عوامی نمائندے'' مبلغین اور مصلحین کا چولا اوڑھ کر ذہن اور زبان کی تیزی سے جس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہ چکے ہوں گے

پھر اسے منچلے مزدوروں کے ہاتھ میں ہتھوڑے اور درانتیاں دے کر بلوہ بازی سے پورا کیا جائے گا 1918ء کے موسم خزاں میں ہم اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے دیکھ چکے ہیں جب کمیونسٹوں کی ضرب کاری مملکت کا نظام پاش پاش کر چکے ہوں گے تب ان کھاتے پیتے گدھوں کو احساس ہوگا کہ خالی جمہوریت کا لٹھ ہوا میں گھما کر کمیونسٹ سیلاب کو روک لینے کا زعم کیا بے مثال حماقت تھی۔

بے اصول دشمن کا مقابلہ بے اصول بن کر ہی کیا جا سکتا ہے

زندگی کے ایک اصول کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں اور اب بھی اسے دہراتا ہوں جب کسی کھیل کے میدان میں پتہ چل جائے کہ مخالف کھلاڑی کھیل کے قواعد کا دلی احترام ہرگز نہیں کرتے بلکہ وہ ان قواعد کو اسی وقت تک تسلیم کرتے ہیں جب تک ان قواعد کو اپنے نفع کے لیے استعمال کر سکیں یا ان کا بہانہ بنا کر اپنے حریفوں کو الجھنوں میں گرفتار رکھ سکیں جوں ہی یہ قواعد ان کے حق میں منفعت بخش ثابت نہ ہوں، انہیں ایسے قواعد کی خلاف ورزی میں ایک لحظہ توقف نہیں ہوتا تو ایسے کھیل کے میدان میں کھیل کے قواعد کی سچے دل سے اطاعت کرنا انتہائی سادہ لوحی ہوگی۔

کامیابی پارلیمنٹ میں نشستوں کی اکثریت سے نہیں خلقت کے ایمان سے حاصل ہوتی ہے

کھاتے پیتے لوگوں کی تمام ہم مشرب سیاسی پارٹیاں، سیاسی جدوجہد کا مقصد فقط یہ تصور کرتی ہیں کہ پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کرنے کی سعی کی جائے جوں ہی ان جماعتوں کے عقائد اور اصول الیکشن کے معرکہ میں بے سود ثابت ہوں، انہیں پس پشت ڈال دیا جاتا ہے، گویا ہوا کا ایک جھونکا آیا تھا جو آیا اور گزر گیا۔ منشور بھی اسی انداز سے تیار کیے جاتے ہیں اور ان کا حشر بھی یہی ہوتا ہے ان جماعتوں کا یہ طرز عمل ہمیشہ ان کے ضعف کا باعث ہوتا ہے ایسی جماعتیں اس مقناطیسی قوت سے محروم رہتے ہیں جو عام خلقت کو اپنی جانب کھینچ کر لایا کرتی ہے عوام تو ہمیشہ اس اٹل طاقت کی جانب کھنچتے ہیں

جو پیش کردہ نصب العین میں داعیان کے ایمان واثق سے پیدا ہوتی ہے جمہور اسی جماعت کا ساتھ دیتے ہیں جو اپنے اصول اور اعتقاد کو بچانے اور پھیلانے کی خاطر مرنے مارنے پر آمادہ ہو۔

پارلیمنٹ کی چوکھٹ کے سامنے عہدوں کی طلب میں صدا لگانے والے بھک منگے

فی زمانہ ایک فریق نے ہر قسم کی جنگی قوتوں سے مسلح ہو کر دھاوا بول دیا ہے اس فریق نے یہ جنگی قوت زندگی کے متعلق اپنے تصورات کو منظم کر کے فراہم کی ہے اگر یہ تصورات مجرمانہ نوعیت کے ہیں تو اس سے ان کی تنظیم یا طاقت میں کچھ فرق نہیں آتا اندریں حالات معاشرت کے موجودہ نظام کو صرف اسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے جبکہ دوسرا فریق ایک نئے فلسفہ حیات پر اعتقاد کامل رکھتا ہو، اور اپنی قوت اعتقاد سے ایک تازہ ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے ہماری پارٹی نے یہ تازہ ولولہ سیاسی اعتقادات کے ذریعہ پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا قوم کو بچانے کے بہانے آج جن بزدل اور کم ہمت افراد نے قیادت کی باگ سنبھال رکھی ہے، ان کو ہٹا کر ہمارے سیاسی عقیدے پر ایمان رکھنے والوں کو برسر اقتدار لانا نہایت ضروری ہے اس مقصد میں کامیابی تبھی ہو سکتی ہے جب ہم دلیری اور بے جگری سے ہلہ بولتے ہوئے ایک قلندرانہ نعرہ بلند کریں ہماری تحریک پر بسا اوقات الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ تو ایک متشددانہ انقلابی تحریک ہے یہ الزام لگانے والوں میں بوریا کی اعتدال پسند پارٹی کے نمائندے پیش پیش ہیں ایسے پست ہمت سیاسی مدبروں کو ہمارا ایک ہی جواب کافی ہے ہم انہیں خطاب کر کے بانگ دہل کہتے ہیں کہ ہم وہ فرض ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کو ادا کرنے میں تم نے اپنی مجرمانہ حماقت کے باعث آج تک کوتاہی سے کام لیا ہے ارے پارلیمنٹ کی چوکھٹ کے سامنے عہدوں کی طلب میں صدا لگانے والے بھک منگو! تم نے ملت کی تباہی میں کیا کسر اٹھا رکھی ہے ہم اپنی جارحانہ حکمت عملی سے ایک نیا ضابطہ حیات تیار کر رہے ہیں

جس کی حفاظت کے لیے ہم اپنی جانیں لڑا دیں گے اور کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے ہم اس زینے کی تعمیر میں مصروف ہیں جس پر چڑھ کر ہماری قوم ایک مرتبہ پھر آزادی کا اعلیٰ مقام حاصل کر سکے گی۔

مجاہدوں کا گروہ یا الیکشن بازوں کی منڈلی

غرض ہماری تحریک کے ابتدائی ایام میں ہمیں خاص طور پر احتیاط ملحوظ رکھنی پڑتی تھی کہ ہمارا مٹھی بھر مجاہدوں کا گروہ جو ایک نئے سیاسی ایمان کی تلقین کی خاطر میدان میں اترا تھا، کہیں الیکشن بازی کرنے والوں کی منڈلی بن کر نہ رہ جائے۔

سب سے پہلا امتناعی اقدام تو ہم نے یہ کیا کہ ایک ایسا منشور مرتب کر ڈالا جس سے ایک خاص طرح کی اخلاقی برتری ہماری تحریک کا طرہ امتیاز بن گئی یہ اخلاقی عظمت تمام ایسے ادنیٰ خصلت اور پست ہمت افراد کو ہماری تحریک سے پرے رکھنے کے لیے کافی تھی جو آج کل سیاسی پارٹیوں میں بالعموم بہتات رکھتے ہیں۔

جرمنی کا زوال کن اسباب کا نتیجہ تھا، ان اسباب پر ایک نگاہ ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمارا یہ طرز عمل مبنی بر حق تھا تحریک کا منشور واضح اور دوسری تحریکوں سے قطعاً ممتاز ہونا چاہیے۔

نئی سیاسی تحریک کے لیے ''سرکار'' کا نیا تخیل درکار ہے

ان دنوں سیاسی پارٹیوں کے مذکورہ بالا نقائص سے ہم بخوبی آگاہ تھے ہم جانتے تھے کہ اگر ہمیں ایک نئی سلطنت تعمیر کرنا ہے تو ہمیں ''سرکار'' کا ایک نیا تصور اختراع کرنا ہوگا جو اس بوسیدہ تخیل سے بالکل علیحدہ ہوگا جس میں تب ہماری قوم کی اکثریت مبتلا تھی حکومت کا یہ جدید تصور زندگی کے متعلق ہمارے نئے فلسفے کی جان تھی۔

میں اس کتاب کی پہلی جلد میں ''امت'' کی اصطلاح کے متعلق اپنے خیالات پیش کر چکا ہوں میں نے وہاں بیان کیا ہے کہ امت کا مفہوم غیر معین اور موہوم ہے آج امت کا لفظ کسی ایسے واضح مفہوم سے عاری ہے جس پر کسی مجاہدانہ تنظیم کی بنیاد رکھی جا

سکے ہر وضع اور ہر مشرب کے لوگ اختلافی راہوں پر گامزن رہنے کے باوجود اپنی سیاسی دکانوں پر امت کا سائن بورڈ لٹکائے بیٹھے ہیں میں ''قوم پرست اشترا کی مزدور پارٹی'' کا پروگرام پیش کرنے سے پہلے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ امت کے معنی کیا ہیں اور اس لفظ کا ہماری تحریک سے کیا تعلق ہے سچ پوچھئے تو آج لفظ امت کا کوئی واضح اور ٹھوس مطلب ہی نہیں اس کی ہزار تاویلیں کی جا سکتی ہیں اور عمل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ لفظ ایسا ہی عام ہو چکا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر لفظ ''مذہب'' عملی زندگی میں مذہب کا نہ کوئی اعتقادی مفہوم باقی رہا ہے اور نہ روزمرہ کی زندگی میں مذہب سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

قلب کی دھندلی کیفیتیں اور عمل کا واضح راستہ

مذہب کا کوئی قطعی مفہوم تبھی طے پا سکتا ہے جب پہلے مذہب پر عمل کے لیے کوئی واضح اور معین لائحہ عمل سامنے ہو اگر کہا جائے کہ فلاں صاحب بڑے ''مذہب پرست'' اور ''دیندار'' ہیں تو ممکن ہے کہ یہ لفظ کانوں کو نہایت بھلا محسوس ہو لیکن عام طور پر جب اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے مراد کیا ہے ممکن ہے دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں اس قسم کے گول مول الفاظ اچھے لگتے ہوں شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں ''دینداری'' کا کوئی ایسا کم و بیش واضح تصور بھی ہو کہ جب وہ کسی شخص کو دیندار قرار دیں تو اس کی قلبی کیفیات کا کوئی خاکہ ان کے پیش نظر رہتا ہو لیکن عام خلاقت فلسفیوں یا ولیوں پر مشتمل نہیں ایسی گول مول ''دینداری'' سے عوام کے پلے تو سوائے اس کے کچھ نہیں پڑتا کہ جس کے من میں جو کچھ آئے وہی سوچتا رہے، اور جو کرنا چاہے کر ڈالے ''دین'' پر اس وقت تک عمل ناممکن ہے جب تک قلب کی دھندلی کیفیات، روحانیت کے بادلوں سے نکل کر کسی دوٹوک شریعت کا قالب اختیار نہ کر لیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شریعت ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے بغیر مقصود تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں علاوہ ازیں اس مقصود کو بھی کوئی ''مجموعہ اوہام'' قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ مقصود کی

شان تو یہ ہے کہ اس پر آسانی سے عمل بھی کیا جا سکے۔ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ بڑے بڑے نصب العین ہمیشہ کسی اہم اور عمیق حاجت ہی کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کمال حسن صورت ہی کی خوبی کا نام ہے، لیکن اگر تہہ پر نظر ڈالو تو خوبصورتی تب ہی بھلی معلوم ہوتی ہے جب اس سے کچھ مطلب برآری بھی ہو سکے۔

مذہب چھوڑنے سے انسانیت کی بنیادیں ہل جائیں گی

یہ مذہب ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ انسان کو حیوانیت کے درجے سے اٹھا کر بلند تر مراتب کو عبور کرنے کی امنگ پیدا کرتا ہے مذہب کا استحکام اور تحفظ اسی ارتقاء میں مضمر ہے اگر آج ہم انسانیت کی حالت پر ایک نگاہ ڈالیں اگر ہم غور کریں کہ آج انسان کی روز مرہ عملی زندگی میں جو تھوڑی بہت اخلاقی اقدار کام کر رہی ہیں وہ فقط مذہبی عقائد کی تعلیم اور مذہب پر ایمان لانے کے باعث قائم ہیں، تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ آج بھی مذہبی تعلیمات کو مٹا کر ان کا کوئی بدل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس سے نوع انسانی کی بنیادیں ہل جائیں گی ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان ہی اعلیٰ اعتقادات کی خاطر زندہ نہیں، بلکہ اعلیٰ اعتقادات کے بغیر انسان بن کر زندہ رہنا ناممکن ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا وجود اعلیٰ اعتقادات کے طفیل قائم ہے اور اعلیٰ اعتقادات بغیر انسان کے وجود کے قائم نہیں رہ سکتے۔

مذہب کیا ہے

میں یہ مانتا ہوں کہ مذہب بعض ایسے تصورات اور اعتقادات پر حاوی ہے جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً یہ کہ روح فنا نہیں ہوتی یا یہ کہ اس زندگی کے بعد ایک آخرت کی زندگی بھی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی یا یہ کہ اس کائنات کا کوئی رب بھی ہے لیکن کوئی فرد چاہے ان اعتقادات پر کیسی ہی پختگی سے یقین کیوں نہ رکھتا ہو پھر بھی کبھی نہ کبھی یہ نوبت بھی آ سکتی ہے کہ وہ ان اعتقادات کا عقلی تجزیہ کرنے لگ جائے اور پھر اس تجزیہ کے بعد

ان کو مانے یا نہ مانے ہاں اگر اس کا یقین صرف جذبات پر مبنی نہیں بلکہ جذبات نے قوت عمل سے تقویت حاصل کر کے ایک واضح شریعت پر ایمان کامل کی صورت اختیار کر لی ہے، تو پھر یہ ایمان محکم ہوگا۔ ایسا ایمان محکم مذہبی جذبات کے اظہار کے لیے ایک راہ مستقیم پیش کرتا ہے جس پر چل کر نہ صرف مقصود کی امید ہمیشہ سامنے رہتی ہے بلکہ راستے کی منزلیں بھی معین ہو جاتی ہیں۔

اگر جذباتی اوہام تک محدود رہے، اور شرعی اعتقادات کی صورت اختیار نہ کرے تو ایسا مذہب نہ صرف بقائے انسانیت کے لیے نکما ہے بلکہ اس کے مبہم اور متعدد رجحانات معاشرہ میں بدنظمی پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

فقط آرزوؤں سے لبریز سینے کافی نہیں

اوپر میں نے جو کچھ لفظ ''مذہب'' کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کا اطلاق لفظ ''امت'' پر بھی کیا جا سکتا ہے امت کا مفہوم چند بنیادی تصورات پر مشتمل ہے ان بنیادی تصورات کی زبردست اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بالعموم یہ بنیادی تصورات ایسے گول مول اور غیر واضح ہوتے ہیں کہ ان کو کسی حد کا پابند کرنا دشوار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص ان کی من مانی تعبیر کرنے لگتا ہے ان تاویلوں کا اثر سیاسی تنظیم کے بنیادی نظام پر بھی پڑتا ہے کسی ضابطہ حیات کو ایک عملی قوت بنا دینے کے لیے اور اس کے منطقی تقاضوں کے دوٹوک جوابات مہیا کرنے کی خاطر، فقط آرزوؤں سے لبریز سینے اور ارمانوں سے بھرے ہوئے دل کام نہیں دیا کرتے۔ آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جو حریت اور آزادی کا طلب گار نہیں پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ محض حریت کی طلب رکھنے سے سب کو آزادی حاصل ہو گئی نہیں نہیں جب تک آزادی کی آرزوئیں اور حریت کے تصورات منظم لشکروں کی صورت میں صف بند اور سر بکف ہو کر میدان جنگ میں نہیں اتر آتے تب تک کسی قوم کا خواب آزادی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا کرتا۔

قوموں کے ''انتظامی پیکر'' کا نام سرکار ہوتا ہے

کوئی ضابطہ حیات چاہے بنی آدم کے لیے ہزار گنا نفع رساں کیوں نہ ہو چاہے وہ اپنی مثال نہ رکھتا ہو لیکن اس ضابطہ حیات سے ہرگز کوئی ملت اس وقت تک اپنے حفیظ و بقا کے لیے کوئی ثمر حاصل نہیں کر سکے گی جب تک وہ ضابطہ ایک عسکری تنظیم کی شکل میں منظم ہو کر سامنے نہ آجائے اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ قوموں کے انتظامی پیکر کا نام سرکار ہوا کرتا ہے جب تک کوئی سیاسی تحریک اپنی قوم کی سرکار پر قابض نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اس تحریک کو مجبوراً ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت قبول کرنی ہوگی۔ حکومت کی مسند پر قابض ہونے سے پہلے کوئی سیاسی پارٹی ساری امت کی ترجمان کس طرح کہلا سکتی ہے۔

کوئی راستہ اختیار کیے بغیر آج تک کوئی مسافر کسی منزل پر نہیں پہنچا

اگر کسی عام نظری عقیدے سے مستقبل کی تعمیر میں کوئی مدد حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے عقیدے کی نوعیت، فطرت اور اس کے احاطہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کرو جب تک کسی عقیدے کا تعلق روزمرہ کے ٹھوس حقائق سے قائم نہیں کیا جاتا، تب تک کوئی ایسی تحریک کس طرح اٹھائی جا سکتی ہے جو اس عقیدے کے اصولوں اور مسلمات کی داخلی قوت سے اس عقیدے کی خاطر سر کٹانے والے سرفروشوں کی کوئی جماعت پیدا کرے عام اصولوں کو سامنے رکھ کر ایک سیاسی منشور تصنیف کرنا لازمی ہے کیونکہ کوئی ضابطہ حیات واضح سیاسی پروگرام کی شکل اختیار کیے بغیر بروئے کار نہیں آسکتا جب تک ایمان کا رشتہ شب و روز کی دنیا کے معمولی دھندوں سے نہیں جوڑا جاتا تب تک آسمان کے نقشے زمین پر کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے سیاسی پروگرام کے لیے یہ کافی نہیں کہ ایک بلند نصب العین سامنے رکھ لے اجائے، بلکہ یہ طے کرنا لازمی ہے کہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا ذرائع استعمال کیے جائیں کوئی راستہ اختیار کیے بغیر آج تک کوئی مسافر کبھی کسی منزل تک نہیں پہنچ سکا مقصد کی فتح چاہتے ہو تو پہلے طریقہ کار تلاش کرو۔

سچ پر عمل کے لیے بھی سوچ اور سلیقہ کی حاجت ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی نظری عقیدہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مدبر کی حاجت ہوا کرتی ہے ازلی و ابدی عقیدے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح انسانیت کے خوشنما رہبر بن سکتے ہیں لیکن انسان ضعیف السبیان ان خوشنما اور درخشندہ روشنی کے میناروں سے تب ہی کوئی فیض حاصل کر سکتا ہے جب کسی اصلاحی تحریک کی ابتداء میں ہی عملی دقتیں انسان کی جبلی کمزوریوں کو ایک دیوار کی صورت بنا کر اس نور کے سامنے حائل نہ کر دیں۔

سچ پر عمل کرنے کے لیے بھی کسی سوچ اور سلیقے کی حاجت ہوا کرتی ہے راستی کا جھنڈا بلند کرنا اسی کو زیب دیتا ہے جو قوم کی سچ مچ انسانی کوتاہیوں کا عملی تجربہ رکھتا ہو عالم بقا کی حقیقتوں کے بحر ناپیدا کنار سے، اور اعتقادات کے دریائے ذخار سے، انسان کی ذہن کی تشنگی تبھی مٹائی جا سکتی ہے جب پیاسوں کو پلانے کے لیے کوئی وہاں سے چلو بھر کر لانے کی تدبیر بھی تو جانتا ہو۔

کسی ضابطہ حیات کی کامیابی کے لیے اس ضابطہ حیات کا مبنی بر حق ہونا لازمی ہے پھر اسی ضابطہ حیات سے کچھ عام نظری اصول اخذ کرنے چاہئیں ان اصولوں کی بناء پر ایک مجاہدانہ جماعت منظم کی جائے گی جس کے ارکین کے سیاسی ایمان میں باہم کوئی اختلاف نہ ہو گا اس جماعت کی حدود واضح ہوں گی اس کی تنظیم سخت ہوں گی اس جماعت کے اعتقادات یا عزائم میں کوئی داخلی تفاوت نہ ہو گی ارتقا کی یہ تمام منازل لا بدی ہیں بغیر ان منازل کو کامیابی سے طے کیے کبھی کوئی عقیدہ پروان نہیں چڑھایا جا سکتا۔

امامت کے بغیر امت نہیں بن سکتی

کسی عقیدے کو ماننے والے تو ہزاروں لوگ ہو سکتے ہیں لیکن اسے سمجھنے والے بہت تھوڑے ہوا کرتے ہیں ضرورت یہ ہے کہ پھر ان سمجھنے والوں کی صفوں میں سے کوئی ایک

شخص نکل کر سامنے آئے اور امامت کے فرائض انجام دے اس شخص کی پہلی صفت تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ عام اصولوں کو صاف اور واضح صورت میں پیش کر سکے عوام کے دلوں میں جو مجہول اور مبہم تخیلات ٹمٹماتے رہتے ہیں یہ شخص انہیں چٹان کی طرح ٹھوس اور پتھر پر لکیر کی طرح واضح اور انمٹ بنا دے گا وہ ثابت کر دے گا کہ دنیا میں صرف یہی اصول سچے ہیں تب خلقت کے منتشر اوہام کی دلدل سے ایک متفقہ اور متحدہ ایمان کی قوت ایک زبردست پہاڑ کی طرح ابھر کر دنیائے چون و چند میں نمودار ہو جائے گی اس عمل کی وجہ جواز اس کی ضرورت سے ثابت ہے ایسے فرد کا حق و بطلان اس کی آخری کامیابی یا ناکامی سے ثابت ہوگا۔

نہ سب انسان برابر ہیں اور نہ سب امتیں برابر

جب ہم لفظ ''امت'' کے حقیقی معنی دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو حسب ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

رائج الوقت سیاسی عقائد کی رو سے ''سرکار'' تہذیب وتمدن پر تو اثر انداز ہو سکتی ہے لیکن خود ''سرکار'' کی تعمیر سے نسل کا کوئی تعلق نہیں عام طور پر یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ سرکار کا وجود اقتصادی ضروریات سے پیدا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سرکار کی بنا انسان کے سیاسی احساسات کا فطری نتیجہ ہے سرکار کی بنیاد کے متعلق اس تصور سے کچھ منطقی نتائج لازم آتے ہیں یہ تصورات اور یہ منطقی استخراج ان بنیادی نسلی عوامل کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے سرکار در حقیقت معرض وجود میں آتی ہے اسی تجاہل اور تغافل سے وہ حکمت عملی پیدا ہوتی ہے جس میں انفرادی شخصیت کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اگر ایک دفعہ اس حقیقت کا انکار کر دیا جائے کہ مختلف نسلوں میں ثقافتی تخلیق کی استعداد کم و بیز ہے تو یہ غلط اصول اشخاص کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت بھی ہمارے ذہن پر مسلط ہو کر ہمیں مغالطہ میں مبتلا کر دیتا ہے جب ایک دفعہ فرض کر لیا کہ ساری نسلیں مساوی ہیں تو پھر اقوام باطل کے مراتب میں کیا تفریق باقی رہی؟ اور جب

اقوام وملل میں کوئی تمیز باقی نہیں تو پھر ان کے افراد میں کس طرح کوئی چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے؟

مارکس ازم انتشار کی قوتوں کا نچوڑ ہے

آخر یہ بین الاقوامی اشتراکیت ہے کیا؟ زندگی کا ایک عام مفہوم کچھ عرصے سے دنیا میں فروغ پا رہا تھا ایک یہودی کارل مارکس نے اس عام مفہوم کی بنا پر ایک سیاسی ضابطہ تصنیف کر ڈالا لیکن زندگی کا یہ عام مفہوم کارل مارکس سے مدتوں پہلے نشوونما پا رہا تھا زندگی کے متعلق اگر ایسے متبذل اعتقادات پہلے سے ایک وبا کی طرح پھیل نہ چکے ہوتے تو مارکس کی سیاسی تعلیمات کو کبھی ایسی حیرت انگیز اور فوری ترقی نصیب نہ ہوتی کارل مارکس کی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں اس جیسے لاکھوں انسان انحطاط کی طاقتوں کا شکار ہو رہے تھے، مارکس نے اپنے ذہن وفکر کی تیزی اور رسائی سے کام لیتے ہوئے گویا انتشار پھیلانے والے زہر کا ست نکال لیا۔ یہ ست نہ صرف زیادہ موثر ہے اور اصل زہر کے تمام سمیاتی خصائص کا نچوڑ ہے، بلکہ مارکس نے ساحرانہ مہارت سے اس ست کا ایسا میٹھا اور خوشنما شربت بھی تیار کر دیا ہے جس سے دنیا پر بسنے والی تمام آزاد قوموں کا ناس ہو جائے گا اس تباہی سے مارکس کی اپنی نسل یعنی یہودیوں کی ترقی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

"مومن اور کافر" یا "منافق اور کافر"

مارکس ازم کے اصول ان اعتقادات کا نچوڑ ہیں جو ہمارے گردوپیش کی زندگی کی بنیاد بن چکے ہیں اس لیے اس خوش فہمی میں مبتلا رہنا مضحکہ خیز ہے کہ کھاتے پیتے طبقات کیمونزم کا کوئی موثر مقابلہ کرسکیں گے ان کھاتے پیتے طبقات کی معاشرت تو خود اس زہر سے مسموم ہے جس سے مارکس ازم کا ست نکالا گیا ہے مارکس ازم سے کھاتے پیتے طبقات کا تصور حیات کوئی اصولی اختلاف نہیں رکھتا بلکہ ان کے اختلافات جزوی ہیں مارکس ازم اور کھاتے پیتے لوگوں کی زندگی کے تصور میں فرق ایسا نہیں جیسا ایک چور اور

ایک شریف آدمی کے اعتقادات میں اختلاف ہوتا ہے۔ ان کا اختلاف تو ایسا ہے جیسے ایک ڈاکو اور ایک گرہ کٹ کے اصولوں میں تمیز کی کوشش کی جائے کھاتے پیتے طبقات کے اعتقادات دراصل مارکس ازم کے اصولوں سے مختلف نہیں فقط یہ کھاتے پیتے طبقات اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ دنیا پر خود ان کا غلبہ رہے گا اور مارکس ازم باقاعدہ اسی مہم میں مصروف ہے کہ دنیا کا قبضہ یہودیوں کے ہاتھ میں چلا جائے برعکس اس کے کائنات کو امت کے زاویہ نگاہ سے دیکھنے والوں کا اصولی اعتقاد یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی حقیقی باہمی تفریق نسلی بنیادوں پر قائم ہونی چاہیے کیونکہ نسل ہی انسانیت کی جڑ ہے اس اصول کو ماننے والوں کے نزدیک سرکار محض مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے مقصد یہ ہے کہ انسان کی نسلی خصوصیات کے تحفظ و بقا کا اہتمام کیا جا سکے لہذا امت کے اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب نسلیں برابر ہیں امت کے اصول کے ماتحت انسانی نسلوں میں تفریق کا مطلب یہ ہے کہ بعض نسلیں اونچی ہیں اور بعض نیچ ہیں جب اس حفظ مراتب کو اصول مان لیا جائے تو کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اعلیٰ اور قوی نسلوں کا غالب آنا اور ادنیٰ اور کمزور نسلوں کا مغلوب ہونا اس قادر مطلق کی رضا کے عین مطابق ہے جو اس کائنات کا مالک ہے۔

گر نہ کنی حفظ مراتب زندیقی

حقیقت اور سچائی کے سامنے سر جھکا ہی دینا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ فطرت کے ہر کام میں ایک ہی اصول بروئے کار نظر آتا ہے وہ اصول یہ ہے کہ بزرگوں کی بزرگی منوائی جائے نیچ نسلیں اونچی نسلوں کے ماتحت رہیں اور اونچ اور نیچ دونوں قسم کی نسلوں کے اندر نیچے درجے کے لوگ اونچے درجے والوں کے ماتحت رہیں غرض امت پر عقیدہ انفرادی اقدار کو ترجیح دینے کی غرض سے عمومی اقدار میں تنظیم اور ترتیب کا حامی ہے برعکس اس کے مارکس ازم سب کو بدنظمی اور تباہی کے تیزاب میں گھول کر مساوات قائم کرنے کا دعویدار ہے امت پر عقیدہ کا تقاضہ ہے کہ انسانیت کسی نصب العین کی خاطر اصول پرستی

قبول کرے بغیر نصب العین اور اصول پرستی کے انسانیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ امت پر عقیدہ یہ نہیں مانتا کہ اگر کوئی اخلاقی اصول کسی نسل کا وجود خطرے میں ڈال دے اور وہ نسل اعلیٰ تر اخلاقی اصولوں کی حامل ہو، تو تب بھی ایسے مہلک اخلاقی اصول کی پیروی جاری رکھنی چاہیے اخلاق نسل کی خاطر ہے نسل اخلاق کے ماتحت نہیں اگر دنیا میں دوغلی اور مخلوط نسلوں کا غلبہ ہو گیا تو انسانی حسن اور شرافت بلکہ کسی انسانی اصول کے قائم رہنے کا ہمیشہ کے لیے کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

رب کے برگزیدہ بندوں کا انکار رب کا انکار ہے

اس کرہ ارض پر انسانی تمدن اور انسانی تہذیب فقط آریہ نسل کے دم قدم سے وابستہ ہے اگر آریہ تباہ ہو گئے اگر آریہ غلام بن گئے تو دنیا ابدی وحشت و بربریت کی تاریکی چھا جائے گی۔

انسانی تمدن کی بقا ان نسلوں کی بقا پر منحصر ہے جنہوں نے انسانی تمدن قائم کیا اگر انسانی تمدن کو قائم کرنے والی نسلیں مٹ گئیں تو انسانی تمدن بھی مفقود ہو جائے گا انسانیت کے تمدن کو فنا کرنا ایک بھیانک جرم ہے اس لیے انسانی تمدن قائم کرنے والی نسلوں پر کوئی آنچ لانا انسانیت کے خلاف ایک بھیانک جرم کا ارتکاب ہے جن لوگوں کے نزدیک انسانیت کا وجود امت کے عقیدے پر مبنی ہے وہ اعلیٰ نسلوں کی دشمنی کو ایسا ہی بھیانک جرم تصور کرتے ہیں جو بد بخت اپنا منحوس ہاتھ رب کائنات کی برگزیدہ نسل کے خلاف اٹھاتا ہے وہ گویا برگزیدگی بخشنے والے پرودگار کے کرم اور بخشش کے خلاف عصیان و طغیان کا مرتکب ہوتا ہے خدا کی رحمت کے خلاف یوں بغاوت کرنے والوں کی مثال اسی پھٹکارے ہوئے شیطان کی طرح ہے جس نے آدم کی برگزیدگی کے خلاف حسد کر کے اسے جنت سے نکلوانے کی تخریبی سازش کی تھی۔

خیر الامم

یوں امت پر عقیدہ درحقیقت فطرت کائنات کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے اسی

عقیدے کی بدولت ان طبعی قوتوں کے بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے جن سے ایک نسل ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ تر مقامات تک بڑھ سکتی ہے اعلیٰ نسلوں کو نیچ نسلوں کے مقابلہ میں برتری حاصل ہوتی ہے اور خیر الامم کو تمام کائنات میں ہر پہلو سے غلبہ و استیلاء کے مواقع بہم پہنچتے ہیں حتیٰ کہ اس دنیا میں ترقی کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد یہ برگزیدہ امت ماورائے کائنات ترقی کے راستوں پر بھی سرگرم سفر ہوسکتی ہے۔

ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل بعید میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب انسان کو ایسے پیچیدہ مسائل درپیش ہوں گے جن کا حل تلاش کرنے کے لیے انسانیت کے بہتر نمونے درکار ہوں گے بہتر اور برتر انسانوں کی یہ نسل باقی تمام امتوں کو تسخیر کرنے کی حق دار ہوگی دنیا کے تمام وسائل اور ہر قسم کے خزانے اس برگزیدہ نسل کے قبضے میں ہوں گے۔

فتح اس کی ہوگی جو سچا ہوگا

ظاہر ہے کہ امت کے نسلی عقیدے کی ہزار تفصیلی توجیہیں پیش کی جاسکتی ہیں کچھ عرصہ سے ہمارے **ملک** میں بمشکل کوئی ایسی سیاسی تحریک ہوگی جو کسی نہ کسی مرحلے پر امت کے عقیدہ کو اپنانے کی کوشش نہ کرتی ہو باوجود اس کے کیا وجہ ہے کہ امت کے نسلی تصور کو ابھی تک ایک جداگانہ عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک طرف نسلی تصور ہے دوسری جانب انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے والے کئی اور عقیدے بھی موجود ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسلی تصور اور کائنات اور زندگی کی بابت دیگر اعتقادات میں بنیادی اختلاف ہے مثال کے طور پر کائنات کا ایک تصور مارکسزم پیش کرتا ہے اس عقیدے کے پس پشت ایک عالمگیر مرکزی تنظیم ہے اس تنظیم کو اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہیں۔ اس تنظیم کے مقابلہ میں رنگارنگ کے عقیدوں کا ایک بھان متی کا کنبہ ہے دشمن کی متحد صف کے مقابلہ میں یہ ہڑبونگ کیا اثر پیدا کرسکتا ہے؟ ایسے کمزور

ہتھیاروں سے فتح حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مارکس ازم نے مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا جو تصور اپنی سیاسی قوت سے منظم کیا ہے اس کے مقابلے میں نسلی تفوق کا نظریہ اگر اسی باقاعدہ تنظیم سے پیش کیا جائے اور اسی قابلیت کے لیڈر بھی میسر آجائیں تو پھر دوسرا فریق بھی پہلے فریق کے برابر قوت مدافعت پیدا کر سکے گا اور فتح اس کی ہوگی جو سچا ہوگا۔

منصوص اعتقادات کی ضرورت

لیکن ایک ضابطہ حیات کو اس وقت تک کسی تنظیم کی شکل نہیں دی جاسکتی جب تک پہلے اس ضابطہ حیات کی تفصیلات ٹھیک ٹھیک اور واضح طور پر معین نہ کر لی جائیں مذہب میں جو حیثیت ''منصوص اعتقادات'' کو حاصل ہوتی ہے وہی مقام ایک تازہ منظم ہونے والی سیاسی پارٹیوں کے اصولوں کو حاصل ہوتا ہے لہذا نسلی عقیدے پر مبنی ضابطہ حیات کو پیش کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جائے جس کی خاطر لوگ اسی طرح لڑسکیں جس طرح مارکس ازم کی خاطر کمیونسٹوں کی پارٹی لڑتی ہے۔ جیسے کمیونسٹ بین الاقوامی اتحاد کے لیے لڑتے ہیں اسی طرح یہ پارٹی نسلی تفوق کی خاطر جنگ کرے گی۔

یہ تھا وہ مقصد جسے حاصل کرنے کے لیے جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

''عقیدہ'' بغیر تنظیم کے کارگر نہیں ہوسکتا

آج ضرورت ہے کہ امت پر عقیدے کے تمام لوازمات اور اس کی تفصیلات واضح طور سے معین کی جائیں تبھی یہ عقیدہ جماعت کا جزو لازم بنایا جاسکے گا بغیر اس کے اس عقیدے کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس دعوے کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ ہم ذرا دیکھیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس عقیدے کو پارٹی کی بنیاد بنانے کی مخالفت کرتے ہیں؟ وہ کیوں مخالفت کرتے ہیں؟ یہ مخالفین کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ امت پر عقیدہ کسی ایک پارٹی کی اجارہ داری نہیں یہ عقیدہ تو لاکھوں دلوں میں سمایا ہوا ہے ان

لوگوں کا یہ اعتراض ہی ثابت کرتا ہے کہ عقیدہ تو لاکھوں دلوں میں سمایا ہوا ہے لیکن اس کے دلوں میں سمائے رہنے سے متصادم اور مخالف اعتقادات کی کامیابی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ مخالف اعتقادات اس سیاسی پارٹی کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں جو طبقاتی کشمکش کے اقتصادی اصول پر قائم کی گئی ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر وہ سچ نہیں تو کیا وجہ ہے کہ جرمن قوم تباہی کے گڑھے کے کنارے پر کھڑی ہونے کی بجائے آج شاندار کامیابی سے ہمکنار نہیں مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کے عقیدے کو اس لیے کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ اس کے پس پشت ایک عسکری تنظیم رکھنے والی باقاعدہ پارٹی موجود ہے جو ان تھک حملے کرتی رہتی ہے مزدوروں کے اس بین الاقوامی اتحاد کے خلاف عقیدے اگر آج تک ہزیمت اٹھاتے رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اعتقادات کے حامیوں کی صفوں میں کوئی اتحاد نہیں۔

عقائد کی من مانی تعبیر کی اجازت نہیں دی جاسکتی

جب ایک عقیدہ ایک واضح ضابطہ حیات پیش کرنے کا مدعی ہے تو وہ کس طرح اجازت دے سکتا ہے کہ جس کے من میں جو کچھ آئے اس کی تعبیر کر لے۔ اگر ایسی کھلی چھٹی دے دی جائے تو پھر یہ عقیدہ مخالف عقیدوں سے جدوجہد کس طرح کر سکے گا اور کامیابی کیسے حاصل کرے گا کسی عقیدے میں تاب مقاومت پیدا کرنے کے لیے اور اسے فتح یابی سے ہمکنار کرنے کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس عقیدے پر ایمان کی کچھ واضح، معین اور گنی چنی شرائط ایمان طے کر لی جائیں پھر ان شرطوں کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا جائے اور سیاسی پارٹی کے بنیادی اصول کے طور پر مان لیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں اسے اپنا خاص فرض سمجھتا ہوں کہ عام ضابطہ حیات کے وسیع دھندلے اور مبہم نقوش میں سے وہ بنیادی اعتقادات منتخب کر کے پیش کر دوں جو شرائط ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں یہ شرائط ایمان واضح صاف اور معین ہوں گی ان شرائط ایمان کو قبول کر لینے کے بعد وہ تمام لوگ ایک علیحدہ صف میں اکٹھے ہو جائیں گے جو ان کو

اپنی زندگی کا اصول بنانے پر آمادہ ہیں بالفاظ دیگر جرمن قوم پرست اشترا کی مزدور پارٹی امت پر مبنی تصور کائنات کی بنیادی شرائط ایمان کا نچوڑ پیش کرتی ہے پھر ان شرائط ایمان کی بنا پر یہ پارٹی ایک سیاسی لائحہ عمل پیش کرتی ہے جس کے مرتب کرتے وقت زمانے کے موجودہ حالات پیش نظر رکھے گئے ہیں اس تحریک کو جو مقلدین میسر آ سکتے ہیں ان کی کمزوریاں نظر انداز نہیں کی گئیں ہمارے گردو پیش جو ٹھوس حقیقتیں موجود ہیں ان کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس سیاسی لائحہ عمل کی قوت سے عام خلقت گروہ در گروہ جماعت کی تنظیم میں شامل کی جائے گی پھر جماعت کی تنظیم کو اتنا سخت بنا دیا جائے گا جتنا کہ ممکن ہو۔ جب تک ایسی منظم اور باقاعدہ جماعت کی تشکیل ممکن نہیں ہو جاتی تب تک امت پر مبنی تصور کائنات کو دنیا پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم :: کس قسم کے معاشرتی نظام کو ''سرکار'' کہا جاسکتا ہے

سرکار کس چڑیا کا نام ہے

ہماری پارٹی پر ''سرکار'' کی تخریبی مخالفت کرنے کا الزام بڑا پرانا ہے۔ 1920-21ء میں ہی زوال پذیر کھاتے پیتے طبقات کے کچھ حلقوں نے ہماری تحریک کے خلاف یہ شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ یہ لوگ تو نفس ''سرکار'' کی تخریبی مخالفت کرتے ہیں یہ **دلیل** دینے کے بعد مختلف سیاسی پارٹیوں کے جھولی چک عناصر جن کے خود اپنے سیاسی اعتقادات ایک معجون مرکب ہیں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہیں ہماری نوزائیدہ تحریک کو تباہ کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کا استحقاق حاصل ہو گیا ہے۔ ہم پر الزام یہ ہے کہ ہم سیاست کا ایک ایسا الٹا تصور پیش کر رہے ہیں جو ''سرکار والا شان'' کے وقار کے منافی ہے ہمارے مخالفین جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ کھاتے پیتے طبقات خود بھی تو ''سرکار'' کے کسی ایک تصور پر متفق نہیں اگر ان کھاتے پیتے طبقات سے پوچھا جائے کہ ''سرکار'' کی کوئی ایک قابل فہم تعریف کر دیجئے تو یہ لوگ کھڑے منہ تکنے لگتے ہیں سرکاری یونیورسٹیوں میں جن پروفیسر صاحبان کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ طالب علموں کو سمجھائیں کہ ''سرکار'' کے لفظ کا مطلب کیا ہے، یہ بزرگوار جب آئین طلباء کی جماعت میں لیکچر دینے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنا سب سے بڑا فرض یہی سمجھتے ہیں کہ سرکار کی جس خاص شکل نے انہیں نوکری مہیا کر دی ہے اور ان کے راتب کا بندوبست کیا ہے اس کی وجہ جواز ثابت کرنے اور اس کے لا یعنی سریلے قصیدے پڑھنے میں اپنا زور بیان صرف کرتے رہیں۔ سرکار کی یہ رائج الوقت شکل جتنی زیادہ احمقانہ ہوتی ہی اس کی تعریف کسی واضح عقلی تصور کی بجائے مجذوبانہ اور متصوفانہ جذبات کا رنگ اختیار کر لیتی ہے مبہم، مصنوعی اور نا قابل فہم الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتا ہے

جسے سرکار والا شان کے وجود کا جواز ثابت کرنے کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کسی قیصر یا شہنشاہ کے ماتحت کسی یونیورسٹی کا پروفیسر سرکار کے کیا معنی اور کیا مقصد بتا سکتا ہے جبکہ ملک کی سرکار بیسویں صدی کی سب سے زیادہ عجیب الخلقت سرکار ہو۔اس غریب پروفیسر کو واقعی ایک مشکل کام درپیش ہے مشکل یہ ہے کہ آئین کا سبق پڑھانے والے ان پروفیسر صاحبان کو نوکری اس لیے نہیں دی گئی کہ وہ علم یا تحقیق حق کے لیے کوئی خدمت انجام دیں، بلکہ ان کے ذمہ تو یہ بڑی خدمت ہے کہ اپنے آقا کے تقرر کا جواز ثابت کرتے رہیں اگر سرکار کی شکل بھونڈی ہے تو کیا ہرج ہے۔اگر سرکار کی چولیں ڈھیلی ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں پروفیسر صاحب کو تو سرکار کا وجود ثابت کرنا ہے اور اس کی حمایت کرنا ہے پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ جب سرکار کی بحث چھڑے تو جہاں تک بس چلے ٹھوس حقائق کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔پروفیسر صاحب اپنے کرتب کھیلنے کے لیے پہلے تو اپنے گرد ''اصولی اقدار'' اور ''کلی فرائض'' اور ''منصبی مقاصد'' کے دھوئیں اڑاتے ہیں کہ کچھ نظر ہی نہ آئے اس ذہنی گرد وغبار کی فضا کو ''اخلاقی تقاضوں'' اور ''وجوبی اصولوں'' کے رعب دار ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

عام طور سے کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کا یہ تخیلاتی تصور پیش کرنے والے تین طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا اقتدار کا دوسرا نام سرکار ہے

1 پہلی قسم تو ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ سرکار کم وبیش عوام کی رضامندی سے قائم کی ہوئی ایک انجمن ہے جس کے ارکین حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کا اقرار کرتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے اس عقیدے کو ماننے والے سب سے زیادہ ہیں ان ہی کی صفوں میں وہ لوگ پائے جاتے ہیں جو'' قانون کے اقتدار'' کے پرستار ہیں ان حضرات کی نگاہ میں عوام کی خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں سارا کھیل'' قانون کے اقتدار'' کے

زور سے چلتا ہے ان اصحاب کی نگاہ میں چونکہ سرکار موجود ہے لہذا سرکار مقدس ہے اور اس لیے سرکار کی نافرمانی ناجائز ہے اس خلل دماغ کے عقیدے کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ انسان سرکار کی درگاہ کا کتا بن جائے ان لوگوں نے مقصد کو ذریعہ اور ذریعہ کو مقصد سمجھ رکھا ہے اس عقیدے کے حامی بازیگروں کی سی ایک قلابازی لگاتے ہیں اور دیکھنے والا یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ سر نیچا ہے اور پاؤں اونچے ہیں ان کے نزدیک سرکار ملت کی خدمت کے لیے نہیں بنائی جاتی بلکہ ملت سرکار کی پرستش اور خدمت کرنے کے لیے بنائی گئی ہے غور سے دیکھیں تو ان کے نزدیک سرکار ہے کون سرکار کی درگاہ شریف کے مجاور سرکاری عہدے دار ہیں ان مجاوروں سے عقیدت ہی کا دوسرا نام درگاہ سے عقیدت ہے۔ سرکاری ملازمین کی فرمانبرداری اور خدمت سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہونا چاہیے اس عقیدے سے کوئی گڑبڑ نہ پیدا ہو جائے اس تشویش کو مٹانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ سرکار کا کام تو فقط ملک میں امن اور چین قائم رکھنا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سرکار کو ذریعہ تو پہلے ہی مانا گیا تھا اب اسے مقصد بھی نہیں کہا جا سکتا لہذا سرکار نہ مقصد ہے نہ ذریعہ سرکار کا فرض ہے کہ امن اور قانون قائم رکھے اور تحفظ امن و قانون کا تقاضا ہے کہ سرکار قائم رہے لیجئے ہو گیا چکر مکمل اب انسانی زندگی کے لیے فقط اتنی گنجائش باقی رہ گئی ہے کہ وہ اس چکر کے اندر گھومتی رہے یوریا میں اس عقیدے کی حامل نام نہاد یوریا کی عوامی پارٹی ہے اس پارٹی میں وہاں کے چالاک اعتدال پسند سیاست دان شامل ہیں آسٹریا میں کالی پیلی وردی پوش پارٹی کے اراکین یہی عقیدہ رکھتے ہیں یہ لوگ قانون پرست ہیں خود جرمنی میں بدقسمتی سے قدامت پسند عناصر کا یہی انداز فکر ہے۔

کیا کاروبار چلانے کا نام ”سرکار“ ہے

2 دوسری قسم کے لوگوں کی تعداد ذرا تھوڑی ہے یہ وہ گروہ ہے جو سرکار کو کم از کم بعض شرطوں کا پابند کرتا ہے ان شرطوں کی پابندی کے بغیر سرکار کا وجود ان کے نزدیک مستحسن

نہیں ان کے نزدیک پہلی شرط تو یہ ہے کہ سرکار کے ماتحت سارے **ملک** میں یکساں نظام حکومت ہونا چاہیے دوسری شرط یہ ہے کہ صرف ایک سرکاری زبان ہونی چاہیے اگر یہ سرکاری زبان صرف نظم ونسق کے اصطلاحی امور تک ہی محدود رہے تو بھی ان حضرات کی تسلی ہو جائے گی ان کے نزدیک سرکار کے وجود کے لیے محض سرکاری اقتدار کافی وجہ جواز نہیں اس لیے تیسری شرط یہ ہے کہ سرکار کو رعایا کی بھلائی کا اہتمام کرنا چاہیے چوتھی شرط یہ ہے کہ سرکار کو حریت کا تحفظ کرنا چاہیے ان لوگوں کے ذہن میں اکثر و پیشتر حریت کا مفہوم، بالکل غلط ہوتا ہے حریت کا یہ تصور وہ سرکار کا جزو لازم تصور کرتے ہیں وہ سرکار کی نافرمانی کو محض اس لیے برا نہیں سمجھتے کہ یہ سرکار کی نافرمانی ہے، بلکہ اس کے ساتھ یہ پانچویں شرط بھی لگاتے ہیں کہ سرکاری کاروبار مستعدی اور قابلیت سے انجام پانا چاہیے کسی سرکار کا محض عرصے سے قائم چلے آنا عہد حاضر میں اس سرکار کو نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں اس گروہ کے نزدیک چھٹی شرط یہ بھی ہے کہ سرکار کو ہر شہری کی اقتصادی خوشحالی کا ذمہ لینا چاہیے غرض سرکار کا معیار کاروباری نفع ہے۔ اس عقیدے کے حامی زیادہ تر اوسط قسم کے جرمن کھاتے پیتے طبقات ہیں ہمارے ترقی پسند اور جمہوریت پرست سیاسی عناصر اسی عقیدہ کے حامی ہیں۔

کیا زبان سے قوم اور سرکار بنتی ہے

3 تیسری قسم تعداد میں سب سے تھوڑی ہے ان کے نزدیک سرکار کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کو سیاسی اقتدار مہیا کرنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو یہاں قوم سے مراد ایک ایسی ملت ہے جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو، اور ایک ہی زبان بولتی ہو۔ اس عقیدے کے حامیوں سے اگر پوچھا جائے کہ قوم کو ''سیاسی اقتدار'' مہیا کرنے سے کیا مراد ہے تو وہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکتے قومی زبان کی حمایت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس طرح سرکار کے ہاتھ میں ایک ایسا ٹھوس حربہ ہوگا جس سے سرکار کی ارضی حدود کے باہر بھی سرکار کا اقتدار قائم رہ سکے گا۔ اس کے علاوہ واحد زبان کا

ایک فائدہ یہ بھی تصور کیا جاتا ہے کہ ملت میں محبِ قوم کے جذبے کی ترقی اور توسیع کے لیے ایک واضح رخ معین ہو جائے گا یہ خوش فہمی ایک بنیادی مغالطے پر مبنی ہے۔

اس عقیدے کے حامیوں نے جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کا ایک نہایت سطحی مفہوم رائج کر دیا ہے اگرچہ ان کی اکثر نیتیں بخیر ہوتی ہیں لیکن گذشتہ صدی میں جن لوگوں نے اس رجحان کے افسوس ناک نتائج کا مطالبہ کیا ہے انہیں شدت سے احساس ہے کہ اس سطحی رجحان کا انجام کیسا تلخ ہوا مجھے خوب یاد ہے کہ میرے ایام جوانی میں جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کے نعرے سے ہمارے دلوں میں کیسے بے بنیاد تخیلات پرورش پایا کرتے تھے عالمگیر جرمن اتحاد کی تحریک کے حامیوں میں بھی اکثر کہا جاتا تھا کہ اگر حکومت تعاون کرے تو عین ممکن ہے کہ آسٹریا کے جرمن آسٹریا میں بسنے والے سقلابی نسل کے باشندوں کو جرمن پرستی کے دائرے میں شامل کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں ان لوگوں کو اتنی سمجھ نہ تھی کہ جرمن پرستی کا غلبہ اور تسلط کسی علاقے پر ہو سکتا ہے کسی غیر جرمن نسل کے باشندوں پر نہیں ہو سکتا جرمن پرستی سے ان کا مفہوم فقط یہ ہوتا تھا کہ غیر جرمن باشندوں کو جرمن زبان بولنے پر مجبور کیا جائے نہ معلوم وہ اس زبردست مغالطے کا شکار کس طرح ہو جاتے تھے کہ جرمن زبان سیکھ لینے سے کوئی چینی یا حبشی جرمن بن جائے گا کیا ہمیشہ کے لیے جرمن زبان بولنے کی عادت اختیار کرنے سے، یا کسی جرمن سیاسی پارٹی کو ووٹ دینے سے کوئی غیر جرمن کبھی جرمن بن سکتا ہے؟ ہمارے کھاتے پیتے طبقہ کے محبانِ قوم ہمیشہ بھول جاتے ہیں کہ جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کا یہ طریقہ درحقیقت جرمن پرستی کی روح مسخ کرنے کے مترادف ہے فرض کیجیے مختلف قوموں کے مابین تمام موٹے موٹے اور ظاہری امتیازات ختم کر کے محض ایک زبان کی مدد سے ان کو متحد بھی کیا جا سکے تو اس طرح ایک ایسی دوغلی نسل وجود میں آ جائے گی جس سے جرمن پرستی کو فروغ اور تسلط حاصل نہ ہوگا، بلکہ صحیح النسب جرمنوں کا خاتمہ ہو جائے گا تاریخ ایسی مثالیں بار بار پیش کرتی ہے کہ ایک فاتح

نسل نے اپنی خارجی قوت سے اپنی مفتوح رعایا کو فاتحوں کی زبان بولنے پر مجبور کر دیا حتیٰ کہ ایک ہزار سال بعد ایک دوسری قوم فاتحوں کی زبان بولنے لگی اور تب مفتوحوں نے فاتحوں کو مسخر اور مطیع کر کے چھوڑا۔

قومیت کی بنیاد نسل ہے

قوم کو جو چیز ایک قوم بناتی ہے وہ زبان نہیں نسل ہے رگوں میں گردش کرنے والا خون ہے اس لیے جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کا ذکر تبھی جائز تھا اگر جس قوم پر یہ عمل کیا جاتا اس کا خون بدلنا بھی ممکن ہوتا ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے خون میں ملاوٹ تو کی جاسکتی ہے لیکن اسے بدلا نہیں جا سکتا اور جب خون میں ملاوٹ ہوتی ہے تو اس سے ہمیشہ اعلیٰ نسل مسخ ہو جاتی ہے، خون کی آمیزش کا انجام کار یہی ہوتا ہے کہ وہ خصلتیں مٹ جاتی ہیں جن کی بدولت فاتحوں نے کسی ادنیٰ نسل پر غلبہ حاصل کیا ہو۔ جب کوئی اعلیٰ نسل کسی ادنیٰ نسل کے ساتھ اختلاط کرتی ہے تو سب سے پہلے اس کی ثقافتی تخلیق کی استعداد مٹ جاتی ہے، چاہے اس اختلاط کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی خچر نسل فاتحوں کی زبان بولنے میں خود فاتحوں پر بھی ہزار درجے بازی لے جائے۔ ایک عرصے تک دونوں مخلوط ذہنیتوں میں کش مکش رہتی ہے ممکن ہے جو قوم بتدریج اختلاط و انحطاط کے گڑھے میں گر رہی ہے موت سے کچھ مدت پہلے اس کی ثقافتی تخلیق کی استعداد بجھتے ہوئے چراغ کی لو کی طرح ایک مرتبہ بھڑک اٹھے اور ثقافت، تہذیب اور تمدن کے حیران کن منظر پیش کر جائے لیکن یہ حیران کن مناظر محض ان عناصر کی سرگرمیوں کی طفیل ہوتے ہیں جنہیں اعلیٰ نسل کی باقیات الصالحات کہنا چاہیے یا یہ دوغلی نسل کے ان عناصر کے کارنامے ہوتے ہیں جن میں شریفوں کا خون غالب ہوتا ہے اور اپنا رنگ دکھا جاتا ہے۔ لیکن اس دوغلی نسل کے آخری نمونے ہرگز ہنر مندی کا ایسا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ ثقافتی زوال اور رجعت متقری کی مثال ہوتے ہیں۔

نسلی اختلاط سے اتحاد قائم نہیں ہو سکتا

یہ تو خوش قسمتی ہی سمجھنی چاہے کہ آسٹریا میں جرمن پرستی کے فروغ اور تسلط کو جوزف ثانی کی منصوبہ بندی کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اگر یہ منصوبہ بندی کامیاب ہو جاتی تو غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آسٹرین سلطنت تو شاید بچ جاتی لیکن واحد زبان کے رواج کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جرمن عنصر کی پاکیزگی ختم ہو جاتی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد نئی مغلوبہ آبادی میں شاید جتھہ بندی کا ایک برا بھلا احساس پیدا ہو جاتا لیکن ایسی آبادی کی اہلیت واستعداد میں بڑا تنزل واقع ہو چکا ہوتا۔ شاید ایک قومی سلطنت تو وجود میں آجاتی لیکن وہ نسل مٹ جاتی جو ثقافتی تخلیق کی استعداد رکھتی تھی۔

جرمن قوم کے لیے یہ اچھا ہوا کہ اختلاط کے اس منصوبے کو کامیابی نہ ہوئی اگرچہ اختلاط کا یہ منصوبہ ارادی طور پر کسی بلند تر نصب العین کی خاطر ترک نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہیس برگ کا شاہی خاندان نہایت کوتاہ بین اور تنگ نظر واقع ہوا تھا اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو آج جرمن قوم بطور ایک ثقافتی عنصر کے مٹ چکی ہوتی۔

ایسے نام نہاد قوم پرست عناصر صرف آسٹریا میں ہی نہیں بلکہ جرمنی میں بھی اس قسم کے غلط خیالات میں پھنسے ہوئے تھے بدقسمتی سے کئی ایسے لوگ ہی غلط استدلال کے ماتحت پولینڈ میں بھی جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کی تجویزوں کی حمایت کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس قسم کے منصوبوں سے جرمنی کی مشرقی سرحد پر جرمن پرستی کو فروغ حاصل ہو جائے گا یہاں پھر وہ اس وہم میں مبتلا تھے کہ پول قوم کے لوگوں کو جرمن زبان بولنے پر مجبور کر کے جرمن پرست بنایا جا سکتا ہے اگر یہ بات چل جاتی تو اس کے نتائج نہایت مہلک ہوتے ایک اجنبی نسل زبان کے استعمال سے ان خیالات کا اظہار کرتی جو جرمن ذہنیت سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے یوں اس اجنبی قوم کی ذلت ہماری بزرگی کی آڑ لیتی، اور ہماری شرافت ان کی پستی کا آلہ کار بن جاتی۔

زبان سیکھنے سے خون نہیں بدل جاتا

یہ خیال کرنے سے طبیعت متلانے لگتی ہے کہ آج بھی جرمنوں کے وقار کو اس بات سے کیسے دھکا لگتا ہے کہ جرمن زبان بولنے والے یہودی جب امریکہ میں داخل ہوتے ہیں تو چونکہ انہوں نے طوطے کی طرح ہماری زبان کا ستیاناس کرنا سیکھ لیا ہے، اس لیے کئی امریکی انہیں جرمن سمجھنے لگتے ہیں، کیونکہ امریکہ کے باشندے خود جرمن ثقافت سے نا آشنا ہیں یہاں جرمنی میں فقط اس لیے مشرق سے آنیوالے ان گندے تارکین وطن کو ہرگز جرمن نسل یا جرمن قوم کے اراکین قبول نہ کرلیا جائے گا کہ ان میں سے اکثر جرمن زبان بول سکتے ہیں۔

تاریخ سے جرمن پرست کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے تلوار کے زور سے زمین کو فتح کیا اور جرمن کاشتکاروں نے ہل چلا کر اس علاقے کو آباد کیا۔ اگر اس مہم کو انجام دینے میں کچھ اجنبی خون بھی ہماری قوم میں داخل ہوگیا تو اس حد تک یہ آبادکاری ہماری نسل پاکیزگی کے لیے بربادی ثابت ہوئی۔ آج جرمنوں میں انفرادی خود پرستی کا جو طبعی میلان پایا جاتا ہے وہ اسی خون میں ملاوٹ کا نتیجہ ہے اگرچہ کئی لوگ ہماری قوم میں اس انفرادیت کے رجحان کو قابل تحسین سمجھتے ہیں۔

کیا سرکار مقصود بالذات ہے

اسی تیسری قسم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سرکار کو ایک حد تک قائم بالذات نصب العین کے طور پر قبول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک سرکار کی وجہ جواز خود سرکار ہے اس لیے ان کے نزدیک سرکار کا تحفظ نوع انسانی کے وجود کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

سرکار کے مفہوم کے متعلق خود ہمارا تجزیہ حسب ذیل ہے:

سرکار کے متعلق اوپر جتنی آراء بیان کی گئی ہیں ان سب میں یہ مشترکہ نقص اور سقم موجود ہے کہ وہ ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر جاتی ہیں وہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ثقافتی اقدار کی تخلیق کی استعداد فقط چند نسلی عناصر میں پائی جاتی ہے اس لیے سرکار کا

سب سے بڑا مقصد نسل کی بقا و ارتقا ہے بغیر نسل کے تحفظ و ارتقا کے انسانی تہذیب و تمدن ترقی نہیں کر سکتے ۔

سرکار خود کوئی مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے

یہی وجہ ہے کہ اس یہودی کارل مارکس نے غلط تصورات اور بے بنیاد تخیلات کو مقدم قرار دیتے ہوئے سرکار کے مقصد کی جو وضاحت پیش کی ہے وہ درست نہیں ہے اس نے سرکار کے تصور سے نسلی ذمہ داریوں کا تذکرہ خارج کر دیا ہے نسل کی جگہ کھاتے پیتے طبقات نے جن دوسرے تصورات کو سرکار کی بنیاد قرار دیا ہے ان میں سے کوئی تصور عالمگیر طور پر مقبول نہیں نتیجہ یہ نکلا کہ مارکس ازم کا یہ عقیدہ فروغ حاصل کر رہا ہے کہ سرکار کو سرے سے قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ مارکس ازم مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا جو عقیدہ پیش کرتا ہے اس کے خلاف کھاتے پیتے طبقات کی جدوجہد کی قسمت میں نامرادی و ناکامی پہلے سے مقدر ہو چکی ہے کھاتے پیتے طبقات تو آغاز سے ہی ان بنیادی اصولوں کو قربان کر دیتے ہیں جن کے سوا مارکس ازم کا مقابلہ کرنے کی اور کوئی صورت نہیں ۔ کھاتے پیتے طبقات کے مکار حریف نے ان کے نظام کے کمزور پہلو تاک لیے ہیں اب مارکس ازم کھاتے پیتے طبقات حریف نے ان کے نظام کے کمزور مورچوں پر انہیں ہتھیاروں سے دھاوا بول رہا ہے جو خود کھاتے پیتے طبقات نے نادانستہ طور پر مارکس ازم کو مہیا کر دیئے ہیں ۔

اندریں حالات کوئی ایسی تحریک جو کائنات کے نسلی تصور کے عقیدے پر مبنی ہو اسے سب سے پہلے سرکار کی نوعیت اور مقدمے کے متعلق ایک واضح اور معقول عقیدہ مدون کرنا ہوگا ۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ سرکار بجائے خود کوئی مقصد نہیں ، بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے ۔

سرکار محض ایک آلہ کار ہے

بغیر سرکار کے انسانی تہذیب وتمدن کی کوئی اعلیٰ شکل ترقی نہیں کرسکتی۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی تہذیب وتمدن کی ترقی کا سرچشمہ سرکار ہے۔تہذیب وتمدن کی ترقی کا سرچشمہ تو صرف وہ نسل ہے جسے قدرت نے ثقافتی تخلیق کی استعداد بخشی ہے روئے زمین پر سینکڑوں اچھی اچھی سرکاریں موجود ہوسکتی ہیں لیکن یہ صرف آریہ ہیں جو تہذیب وتمدن کے خالق اور محافظ ہیں اگر آریہ مٹ جائیں تو ہر وہ ثقافت جو آج دنیا کی مہذب اقوام کی روحانی حاجت روائی کرتی ہے فنا ہو جائے گی، بلکہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ فقط سرکار کا قیام نسل انسانی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں بچا سکتا۔سرکار کا قیام سرکار بنانے والوں کے وجود پر منحصر ہے۔اور سرکار بنانے والوں کا وجود اعلیٰ ذہانت اور موقع شناسی کی اس استعداد پر منحصر ہے۔جو صرف ایک اعلیٰ نسل کا حصہ ہے۔

تہذیب وتمدن کا سرچشمہ نسل ہے

مثال کے طور پر اگر آج کرہ ارض کسی زبردست زلزلے سے تہ و بالا ہو جائے اور سمندروں کی لہروں سے کوئی نیا کوہ ہمالیہ ہو جائے تو اس ایک قیامت سے انسانی تہذیب فنا ہوسکتی ہے۔روئے زمین پر کوئی سرکار باقی نہ رہے گی۔نظام اور تربیت کی ہر شکل مٹ جائے گی ہزارہا سال کی کدوکاوش سے ثقافت اور تہذیب کے جو معیار قائم ہوئے ہیں ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا۔چاروں جانب سوائے موت کی ویرانی اور تباہی کے سیلاب اور کیچڑ کے اور کچھ دکھائی نہ دے گا۔فرض کیجئے چند اشخاص اس تباہ کن انقلاب سے بچ جائیں اور وہ اشخاص اس خاص نسل سے تعلق رکھتے ہوں جس کے اندر تہذیب وتمدن کی تعمیر کی جبلی استعداد ودیعت کی گئی ہے جب وہ دور تلاطم ختم ہو جائے گا تو یہ زمین پھر ایک دفعہ انسانی قوت تخلیق کے کرشموں سے گلزار بن جائے گی۔ چاہے یہ کارنامہ انجام دینے میں ایک ہزار برس ہی کیوں نہ لگ جائیں۔برعکس اس کے اگر وہ نسل ہی مٹ جائے جو ثقافتی تخلیق کی استعداد کی مالک ہے تو پھر چاہے دنیا میں اور

کوئی تبدیلی نہ آئے لیکن محض اس اعلیٰ نسل کا فقدان ہی روئے زمین کو ایک برباد ریگستان بنانے کے لیے کافی ہوگا۔ تاریخ ایسی بہتیری مثالیں پیش کرتی ہے کہ جن اداروں کا قیام تخلیقی استعداد سے عاری نسلیں عمل میں لاتی ہیں انہیں کبھی بقائے دوام حاصل نہیں ہوتا۔ زمانہ قبل تاریخ میں حیوانوں کی کیا کیا اقسام ختم ہوگئیں اور آج ان کا کوئی نشان بھی باقی نہیں۔ اسی طرح انسان بھی اگر اس استعداد سے محروم ہو جائے جس کی بدولت اپنی زندگی کا ساز و سامان اور زاد مہیا کرتا ہے تو وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے گا۔

سرکار نسلی خصائص کے تحفظ اور نشو و نما کے لیے ایک وسیلہ ہے

سرکار کبھی ثقافت کی ترقی کا کوئی مرحلہ طے نہیں کیا کرتی۔ سرکار تو فقط اس نسل کی حفاظت کرتی ہے جس کے دم قدم سے تہذیب و تمدن ترقی کرتی ہیں ممکن ہے ایک سرکار بغیر کسی تبدیلی کے صدیوں تک قائم رہے گو اس سرکار کے ماتحت رہنے والوں کی ثقافتی استعداد اور اس استعداد سے متاثر ہونے والی زندگی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جائے۔ کیونکہ سرکار نے نسلی اختلاط کو روکنے میں اپنا فرض ٹھیک سے ادا نہیں کیا سرکار بطور ایک مشین کے کام کرتی رہے گی لیکن نسل میں فتور کا زہر جو قوم کے اندر داخل ہو چکا ہے تہذیب و تمدن کو گھن کی طرح کھا جائے گا۔ یہ گھن کھایا ہوا تہذیب و تمدن ایک نہ ایک دن اپنے زوال کے آثار بھی ظاہر کرنے لگے گا۔

غرض انسانوں کی اعلیٰ خصلتوں کو برقرار رکھنے کی شرط اولین سرکار نہیں بلکہ نسل ہے انسان کی اعلیٰ خصلتیں فقط نسل کی مرہون منت ہیں۔

استعداد کے اظہار کے لیے ''سازگار ماحول'' درکار ہوتا ہے

نسلی اہلیت کبھی نہیں مٹتی گو یہ ممکن ہے کہ بیرونی حالات اس کے اظہار کا موقع مہیا نہ کریں تو ایسی اہلیت مدتوں دبی رہے اقوام و ملل بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نسلوں کی ثقافتی تخلیق کی استعداد ایسے زمانوں میں مضمر رہتی ہے جب بیرونی حالات وقتی طور پر اس

کے اظہار کی اجازت نہ دیں۔ اس لیے یہ کہنا سخت بے انصافی ہے کہ عیسائیت کے ورود سے قبل کے زمانے کے جرمن لوگ وحشی تھے اور تہذیب وتمدن سے عاری تھے جرمن کبھی تہذیب وتمدن سے عاری نہ تھے بات صرف اتنی تھی کہ جرمن جن شمالی علاقوں میں تب آباد تھے وہاں کی شدید سردی ان کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی تھی جس کے باعث ان کی تخلیقی استعداد کو اظہار کا موقع نہ ملا اگر جرمن اس زمانے میں بھی جنوبی علاقوں کی معتدل آب وہوا میں آجاتے تو چاہے ان جنوبی علاقوں میں ثقافت کا نام و نشان بھی نہ ہوتا تب بھی ان کے اندر جو ثقافتی استعداد ودیعت تھی وہ ضرور پھوٹتی اور پروان چڑھتی جیسا کہ مثال کے طور پر یونان کے علاقے میں ہوا۔ ہاں اس کے لیے یہ شرط لازمی تھی کہ چند ادنی نسلیں ان لوگوں کا بطور غلام کام کرنے کے لیے مہیا ہو جائیں جنہیں ہانک کر ان سے کام لیا جا سکتا۔ ثقافت کی یہ تخلیقی استعداد صرف شمال کی سرد آب وہوا میں رہنے کا نتیجہ نہ تھی بحر منجمد کے شمال کے قریب رہنے والے اسکیمو اور لیپ لینڈر اگر جنوب میں بھی آباد کر دیئے جائیں تو وہ کوئی تمدن اختراع نہیں کر سکتے نہیں! نہیں!! یہ تخلیقی استعداد ایک خاص انعام ہے جو صرف آریاؤں پر نازل ہوا ہے یہ استعداد کبھی حالات کی نا مساعدت کے باعث مضمر رہتی ہے، اور کبھی ماحول کی یاوری سے بروئے کار آجاتی ہے۔

ان حقائق سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

سرکار کی بنیاد روحانی یک دلی اور جسمانی قرابت ہے

سرکار محض حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے سرکار کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ روحانی یک دلی و یک جہتی اور جسمانی قرب رکھنے والے باشندوں کے تمدن اور معاشرت کے تحفظ وارتقاء کا اہتمام کرے ان اہلیتوں اور اس استعداد کے نشوونما کا اہتمام کیا جائے جو نسل میں ودیعت ہیں ان اہلیتوں اور استعداد کا بیشتر حصہ نسل کا مادی وجود برقرار رکھنے پر صرف ہوگا اور مادی وجود برقرار رکھنے پر توجہ دینے سے جو فرصت باقی بچے گی اسے ذہنی

وثقافتی ترقی پر صرف کیا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بغیر مادی خوشحالی کے ذہنی اور ثقافتی ترقی ممکن ہی نہیں۔

سرکار ایک چھلکا ہے جس کا مغز ملت کے مفاد ہیں

جو سرکار یہ مقصد پورا نہ کرے اسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ایسی سرکار، سرکار نہیں آسیب ہے۔ ایسی سرکار کا فی الواقع موجود ہونا اس کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی **دلیل** نہیں اگر کہا جائے کہ چونکہ سرکار موجود ہے اس لیے چاہے وہ ضرر رساں بھی ہو تب بھی اسے برقرار رکھنا چاہیے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی موجود ہو اور کہا جائے چونکہ یہ ٹولی موجود ہے لہذا اس کو قائم رکھنا چاہیے۔

ہم قوم پرست اشتراکی جو کہ ایک نئے ضابطہ حیات کے علمبردار ہیں اس اصول کے قائل نہیں کہ حقائق کو ہمیشہ قبول کر لینا چاہیے ہمارا عقیدہ ہے کہ جب حقائق غلط ہوں تو انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اگر غلط حقائق کو قبول کر لیا جائے تو پھر ہم کسی نئے اور زبردست عقیدے کی حمایت کس طرح کر سکیں گے ہم تو ان غلط کاریوں کے محافظ بن کر رہ جائیں گے جن کا آج چاروں طرف غلبہ ہے ہمیں واضح طور پر مغز اور چھلکے میں تمیز قائم رکھنی چاہیے سرکار ایک چھلکا ہے اور اس کا مغز وہ نسل ہے جو اس کے زیر سایہ پرورش پاتی ہے چھلکے کی خوبی اسی میں ہے کہ مغز کی حفاظت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے ورنہ بغیر مغز کا چھلکا پھینک دینا چاہیے۔

سرکار ملت کا ''انتظامی پیکر'' ہے

غرض نسلی سرکار کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان نسلی عناصر کی حفاظت اور بقا کا اہتمام کیا جائے جن کی ثقافتی جدوجہد سے وہ حسن او روقار پیدا ہوگا جو اعلیٰ انسانیت کا خاصہ ہے بطور آریہ کے ہمارا عقیدہ ہے کہ سرکار محض ملت کے ''انتظامی پیکر'' کا دوسرا نام ہے یہ انتظامی پیکر صرف ملت کی بقا کا ہی ذمہ دار نہیں بلکہ اس کے ذمہ یہ فرض بھی ہے کہ ملت کی آزادی کامل اور استقلال تام کا بندوبست کر کے ملت کی ذہنی اور ثقافتی

اہلیتوں کی نشوونما اور ترقی کا اہتمام کرے۔

سرکار کا بھوت

آج کل لوگ ہمارے سروں پر جس قسم کی سرکار مسلط رکھنا چاہتے ہیں وہ سرکار نہیں بلکہ آسیب ہے یہ آسیب انسانی فطرت میں خلل پیدا ہو جانے سے وجود میں آیا ہے۔ جہاں اس آسیب کا سایہ پڑ جائے وہاں رسوائی، عذاب اور ذلت کے اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔

ہم قوم پرست اشترا کی خوب جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا اعتقادات کو قبول کر کے ہم فی زمانہ دنیا میں ایک انقلابی ذہنیت کی علمبرداری اختیار کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں انقلاب پرست کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتقادات اور اعمال کی کسوٹی ہمارے معاصرین کی تحسین یا نفرین نہیں، بلکہ ہمارا فرض تو صرف یہ ہے کہ جس کو حق سمجھتے ہیں اس کی پیروی کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے آنے والی نسلیں اس کی قدر کریں گی اور وہ صرف ہماری آج کی جدوجہد کی داد دیں گے بلکہ اس کی تصدیق کرتے ہوئے ہمارا شروع کردہ کام آئندہ جاری رکھیں گی۔

سرکار کا معیار نسل کی پرورش ہے

ہم قوم پرست اشترا کی سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت اسے مذکورہ بالا معیار پر پرکھتے ہیں سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ جب کسی ایک قوم کے مفاد کے پیش نظر کیا جائے تو ایسا اندازہ اضافی ہوتا ہے لیکن جب سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے پیش نظر کیا جائے تو ایسا اندازہ کلی حیثیت رکھتا ہے بالفاظ دیگر میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ کسی سلطنت کی خوبی و برتری کا اندازہ نہ تو اس کے تمدنی معیار سے کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اس بات سے کہ سرکار کو بیرونی دنیا میں کتنی اہمیت دی جاتی ہے بلکہ سرکار کی خوبی و برتری کا معیار یہ ہے کہ اس سرکار کے ماتحت کام کرنے والے محکمے اور ادارے کس حد تک ان نسلی عناصر کی

پرورش کرتے ہیں جن کی خاطر یہ سرکار قائم کی گئی ہے۔

''سرکار'' ملت کی استعداد کے اظہار کا ذریعہ ہے؟

اگر کوئی سرکار نہ صرف اس نسل کو زندہ رکھنے کا اہتمام کرتی ہے جس کی خاطر اسے قائم کیا گیا ہے، بلکہ اس سرکار کے وجود سے اس نسل کے تحفظ و بقا کا انتظام بھی ہو رہا ہے، تو پھر اس سرکار کو ایک مثالی سرکار سمجھنا چاہیے، قطع نظر اس کے کہ باقی کی دنیا اس سرکار کو ثقافتی اعتبار سے اچھا سمجھتی ہے یا برا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکار کا کام باشندوں میں اہلیت و استعداد پیدا کرنا نہیں، بلکہ سرکار کا فرض تو یہ ہے کہ باشندوں میں جو اہلیت و استعداد پہلے سے موجود ہے اس کے اظہار کا موقع بہم پہنچایا جائے۔ دوسری طرف اس سرکار کو مضر سمجھنا چاہیے جس میں چاہے ثقافت کا معیار بلند ہو لیکن اس ثقافت کے علمبرداروں کی نسلی پاکیزگی کو غلط ملط کر کے ان کی تباہی کا اہتمام کیا جا رہا ہو۔ جب کسی نسل کی پاکیزگی میں خلل آجاتا ہے تو ثقافت و تمدن کی وہ جڑیں کٹ جاتی ہیں جن سے سبزہ و گل کی نمود کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ثقافت و تمدن سرکار پیدا نہیں کیا کرتی۔ سرکار تو فقط ایک نسل کے افراد کو اکٹھے ایک زندہ تنظیم کی صورت میں باہم رہنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ اس زندہ تنظیم ہی کا نام سرکار ہے جب ایک نسل کے لوگ یوں ایک سرکار کے ماتحت ایک زندہ تنظیم کی صورت میں زندگی بسر کریں تو اس کا ثمر ثقافت و تمدن کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔

سرکار اپنی رعایا کی سیاسی تنظیم کا نام ہے

میں ایک دفعہ پھر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ سرکار فی نفسہ کوئی وجہ نہیں رکھتی سرکار تو ایک نسل کے باشندوں کی سیاسی تنظیم کی بیرونی شکل ہے یہی وجہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کو سرکار کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سرکار کا معیار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے سرکار بنائی ہے جن لوگوں میں ثقافت کی تخلیق کی استعداد ہے ان کی قدر و قیمت یقیناً وحشی قبیلوں کے ایک قبیلہ سے زیادہ ہے باوجود اس کے ممکن ہے کہ بسا اوقات حبشیوں کی

سرکار کی تنظیمی حالت، اگر محض کارگذاری کے اعتبار سے دیکھی جائے تو شاید ان اعلیٰ ثقافتی استعداد رکھنے والوں کی سرکار سے بہتر ہو۔ سرکار کی شکل کا بہترین آئینہ ڈھانچہ اور بہترین انتظامی ادارے کسی قوم میں حکومت کی استعداد اور اہلیت پیدا نہیں کر سکتے اگر قدرت نے اس قوم کو اس اہلیت اور استعداد سے عاری کر دیا ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ سرکار کا آئینہ ڈھانچہ ٹھیک نہ ہو یا انتظامی اداروں میں خلل ہو تو اس کے باعث قوم کی اہلیت اور استعداد بھی رفتہ رفتہ ضائع ہو جائے گی ایسا تب ہوتا ہے جب تمدن کے علمبر دار نسلی عناصر کو آئین اور انتظام کے اس خلل کے باعث کچل دیا جائے یا برباد کر دیا جائے۔

سرکار کا مقصد ملت کو خارجی اثرات سے بچانا اور داخلی اثرات کا بڑھانا ہے

اس لیے کسی سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بدولت کسی خاص نسل کی بہبود کافی الواقعہ کہاں تک اہتمام ہو رہا ہے خارجی دنیا میں اس سرکار کی حیثیت کیا ہے، اچھی ہے یا بری، اس سے اس کی داخلی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا غرض کسی سرکار کی اضافی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بالکل آسان ہے، کیونکہ یہاں لفظ یہ دیکھنا ہے کہ جس نسل کی سرکار ہے اس کی بقا و ارتقا کا اہتمام کہاں تک کر رہی ہے۔ برعکس اس کے کسی سرکار کی کلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ یہاں صرف یہ نہیں دیکھنا کہ سرکار اپنے داخلی فرائض انجام دینے میں کہاں تک ٹھیک کام کر رہی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اب تو یہ بھی طے کرنا ہے کہ جس نسل کی سرکار ہے اس نسل کی اہلیت اور ثقافتی استعداد کا درجہ کہاں تک پست یا بلند ہے۔

جیسی قوم ویسی سرکار

اس لیے جب کسی سرکار کے منصب و مقصد کی بلندی کا تذکرہ ہو تو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ منصب و مقصد کی بلندی کا تعلق ملت سے ہے، نہ کہ سرکار سے سرکار کا کام تو فقط

یہ ہے کہ اپنی تنظیمی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملت کو وہ ساز و سامان اور حالات مہیا کردے جن کے اندر ملت اپنی اہلیت و استعداد کا اظہار کر سکے اگر ہم یہ سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ جرمنوں کو کسی قسم کی سرکار درکار ہے تو اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک اور سوال کا جواب درکار ہے اور وہ بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم جرمن کس قسم کی ملت ہیں جس قسم کی ہم ملت ہوں گے اسی قسم کی ہمیں سرکار درکار ہوگی جب تک یہ طے نہ کرلیا جائے کہ کس مقصد کے لیے سرکار قائم کرنا ہے تب تک یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ سرکار کی شکل وصورت کیا ہوگی۔

سیاسی اتحاد کی بنیاد نسب ہے

بدقسمتی سے آج جرمنوں کی قوم کسی ایک نسلی عنصر پر مشتمل نہیں جن نسلی عناصر سے ہماری ملت نے ترتیب پائی ہے انہیں متحد کرنے میں ابھی تک اس حد تک کامیابی نہیں ہوئی کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہماری ملت بجائے خود ایک نسل ہے برعکس اس کے ملت کے جسم میں جو زہر داخل ہو چکا ہے اس نے صرف ہمارا خون گدلا نہیں کر دیا بلکہ ہماری ملی روح کو بھی مسخ کر دیا ہے یہ زہر خاص طور پر جنگ سی سالہ کے بعد سے زیادہ تر داخل ہوتا رہا ہے ایک طرف ہمارے ملک کی سرحدیں کھلی تھیں دوسری طرف ان سرحدوں کے اردگرد جو اجنبی نسلیں آباد تھیں ان سے اختلاط روا رکھا گیا تیسری طرف خود جرمنی کے اندر بھی اجنبی نسلوں کو وطنیت اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی ان سب عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن نسلی عناصر سے ہماری ملت مرتب ہے ان میں باہم یکدلی و یکجہتی قائم نہیں ہو سکی، بلکہ ابھی تک وطن میں خارجی نسلی عناصر کا داخلہ جاری ہے اس معجون مرکب سے کوئی نئی نسل پیدا نہیں ہوئی متضاد عناصر پہلو بہ پہلو باہم متصادم ہیں نتیجہ یہ ہے جب ملت پر کوئی خطرے کا وقت آتا ہے جبکہ جبلی اتحاد کا جذبہ متحرک ہونا چاہیے تو جرمن مختلف سمتوں کی طرف منہ اٹھا کر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

جن بنیادی نسلی عناصر سے ہماری ملت نے ترکیب پائی ہے نہ صرف مختلف اضلاع

میں ان کا تناسب مختلف ہے بلکہ ایک ضلع میں بھی مختلف عناصر آباد ہیں ایک طرف شمالی نسل ہے چوتھی طرف مغربی نسل، ایڈریاٹک اور مشرقی نسل سے مل جل کر ایک نیا نمونہ پیش کرتی ہے پانچویں طرف ان مختلف عناصر کی باہمی آمیزش سے متعدد دوغلے عناصر وجود میں آ گئے ہیں یہ گوناگونی اور رنگا رنگی ہماری ملت کے داخلی اتحاد میں بہت بڑا نقص ہے۔

تسخیر عالم سے پہلے یک رنگی شرط ہے

اس نقص کی وجہ سے ہم جرمنوں میں وہ احساس ملی مفقود ہے جو خون کی وحدت سے پیدا ہوا کرتا ہے خطرات اور نازک حالات میں قومیں اسی احساس ملی کی بدولت متحد ہو کر اپنے بچاؤ کا سامان کرتی ہیں اس احساس کے ماتحت ایسے موقعوں پر فروعی اختلافات مٹ جاتے ہیں، اور دشمن کے مقابلے میں پوری ملت ایک صف میں کھڑی ہو جاتی ہے ہم جرمنوں میں تجرید و تفرید کا رجحان اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے بنیادی نسلی عناصر ملک میں پہلو بہ پہلو آباد ہونے کے باوجود اپنے امتیازات ختم کر کے واحد اکائی کی صورت اختیار نہیں کر سکے زمانہ امن میں ممکن ہے ہماری یہ گوناگوں اور بوقلمونی شاید ہمیں کچھ فائدہ پہنچاتی ہو لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس رنگا رنگی کے طفیل ہم آج تک تسخیر عالم سے محروم رہے ہیں۔

امن کی حفاظت تلوار سے ہوتی ہے

اگر تاریخ کے ارتقاء کے دوران میں جرمن ملت کے اندر وہ اتحاد موجود رہتا جو جبلی احساس یک جہتی سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے دوسری قوموں نے اتنا فائدہ اٹھایا ہے، تو آج جرمن سلطنت کی قلمرو غالباً تمام کرہ ارض پر حاوی ہوتی۔ دنیا کی تاریخ ایک دوسرا ہی منظر پیش کرتی ہے اگر ایسا ہو جاتا تو پھر اندھے امن پرستوں کی وہ آرزو بھی پوری ہو جاتی جو عرض کرنے، گڑگڑانے اور بسورنے کے باوجود آج تک پوری نہیں ہو سکی۔ یعنی دنیا میں امن قائم ہو جاتا یہ امن صلح کی جھنڈیاں لہرانے اور بد قسمت بوڑھی عورتوں کی

گریہ وزاری سے یا امن کے حق میں اپیلوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اس امن کی ضمانت ایک فاتح قوم کی تلوار ہوتی ہے ایک ایسی قوم جس میں تسخیر عالم کی ہمت ہوتی ہے اور ایک ایسی قوم جو ایک برتر تہذیب پیش کر کے دنیا کی خدمت کرسکتی۔

نسل کا نزول ہونا ایک نعمت ہے

چونکہ ہماری قوم ایک ایسی قومیت سے محروم ہے جس کی بنا نسلی وحدت ہو، اس لیے ہمیں بے اندازہ مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں ہماری اسی قومی تفریق سے غالباً ان جرمن نوابوں کو تو فائدہ پہنچا جو مختلف علاقوں میں مقامی سردار بن بیٹھے، لیکن جرمن قوم بحیثیت مجموعی حقوق سلطانی حاصل نہ کرسکی۔

آج بھی ہماری قوم اس داخلی اتحاد کی معدومیت سے بڑا نقصان اٹھا رہی ہے لیکن جو امر ماضی میں اور آج تک ہماری ناکامیوں کا سبب رہا ہے وہی مستقبل میں ممکن ہے ایک بہت بڑی رحمت ثابت ہو۔ اگرچہ یہ بہت بڑا نقص ہے کہ ہماری قوم کے بنیادی نسلی عناصر آج تک یکجا نہیں کیے جا سکے، اور اس وجہ سے ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آ سکی جس میں یکسانیت پائی جا سکے۔ لیکن یہ خوش قسمتی ہے کہ ان حالات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ ہماری قوم کا بہترین خون آج تک پوری پاکیزگی کے ساتھ صحیح و سالم ہے ہمارے بہترین نسلی عناصر نزول ہیں۔

انسانیت کے بلندترین ارمان

اگر ہماری قوم میں غلامی نسل عناصر کی آمیزش ہو جاتی تو شاید اس سے ایک قومی یکجہتی تو پیدا ہو جاتی، لیکن جیسا کہ ہر نسلی آمیزش سے ثابت ہوا ہے کہ یہ نئی متحدہ نسل تمدنی اہلیتوں سے اسی قدر بہرہ ور نہ ہوتی جتنا کہ بہترین بنیادی عنصر نزول رہنے کی حالت میں تمدنی اہلیتوں کا مالک ہے۔ ہماری قومی یکجہتی کے قائم نہ ہونے سے ایک فائدہ بھی ہوا ہے کہ آج بھی ہمارے مابین شمالی جرمنی نسل کے ایک ایسے کثیر گروہ موجود ہیں جن کا خون ہر آمیزش سے پاک ہے مستقبل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ لوگ قوم کا بہترین

خزانہ ہیں جس دور ظلمت میں نسلی قوانین سے یکسر بے توجہی برتی جاتی تھی، جب ہر فرد کو دوسرے فرد کے برابر سمجھا جاتا تھا، تب مختلف بنیادی عناصر کی حقیقی نسلی قدرو قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا آج ہم سمجھ چکے ہیں کہ اگر قوم کے تمام نسلی عناصر متحد ہو جاتے تو شاید ہمیں خارجی اقتدار میں بڑا حصہ مل جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسانیت کا بلند ترین ارمان غالباً تشنہ تکمیل رہ جاتا۔ یہ اس لیے کہ اس درجہ تکمیل تک پہنچنے کے لیے قدرت نے ایک ہی نوع کے باشندوں کو چن لیا ہے، اور یہ برگزیدہ نسل اسی قومی یکسانیت میں گھل مل کر قومی اتحاد کا شکار ہو چکی ہوتی۔

سرکار کا مقصد شرفاء کی پرورش ہے

تقدیر نے خود ہماری رہنمائی کرتے ہوئے بغیر ہماری جانب سے کسی قسم کے تعاون کے ہمیں جس گڑھے میں گرنے سے بچالیا ہے اب ہمیں اس کا ہوش رکھنا چاہیے اور اس ہوش کو کام میں لاتے ہوئے اس گڑھے میں دوبارہ گرنے کے لیے نہ جانا چاہیے۔

جو شخص کہتا ہے کہ جرمن قوم کے ذمے اس دنیا میں ایک فریضہ ادا کرنا ہے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ فریضہ تب تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک ہم کوئی ایسی سرکار نہ بنالیں جس کا سب سے بڑا مقصد ہماری نسل کے شریف ترین خون کا تحفظ و بقا ہو، اور جو دوسرے درجے پر تمام نوع انسانی میں نسلی تحفظ اور ارتقاء کا اہتمام کرے۔

''سرکار'' خالی امن اور قانون کی چوکیدار نہیں

اس طرح دنیا میں پہلی مرتبہ سرکار کا کوئی داخلی مقصد اعلیٰ معین ہو جائے گا ایک طرف تو وہ مسخرے ہیں جو کہتے ہیں سرکار صرف امن اور قانون کی چوکیدار ہے تا کہ اس کے پہرے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو بڑے امن اور چین سے دھوکا دیتا رہے۔ دوسری طرف یہ بلند نصب العین ہے کہ انسانیت کے شریف ترین اور اعلیٰ ترین عناصر کی بقاء اور نشوونما کا اہتمام کیا جائے تا کہ خالق اولیٰ نے اس دنیا میں جو شرافت نازل کی ہے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکے اس مردہ سرکار کی جگہ جو ایک مشین کی طرح فقط اپنا ہی چکر

چلانا چاہتی ہے ایک زندہ سرکار نمودار ہو گی جس کی تمام سعی صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو گی، اور وہ مقصد یہ ہے یہ جو اوج تخیل پر پہنچا دیتا ہے۔

سرکار کی نصب العین تسخیر عالم ہے

بطور ایک سرکار کے جرمن ریاست میں ہر جرمن شریک ہو گا اس سرکار کا کام صرف یہ نہیں کہ ہماری ملت کے قابل ترین عناصر کو یکجا کر کے ان کی پرورش کرے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ بتدریج لیکن یقینی طور پر دنیا میں جرمن ملت کا تسلط قائم کر دے۔

یوں جمود کی جگہ جدوجہد اور کوشش کی راہیں کھلتی ہیں یہاں وہ مقولہ راست آتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں سچا ثابت ہو سکتا ہے یعنی جو سوئے ہیں وہ کھوتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو بڑے گا مرتبہ اس کا بڑھایا جائے گا۔ جتنا بلند وہ نصب العین ہو جس کے حصول کی کوشش کی جائے اور جتنا اس کوشش کے وقت عوام اس نصب العین کو سمجھنے سے عاری ہوں، اتنی ہی اس کی کامیابی زیادہ شاندار ہوتی ہے یہ وہ سبق ہے جو تاریخ ہماری سکھاتی ہے یہ کامیابی اور بھی شاندار ہو گی اگر کامیابی کی منزل کا اندازہ پہلے سے کر لیا گیا اور ہر قسم کی مشکلات کے مقابلہ میں بغیر ذرہ بھر کسی ہچکچاہٹ کے ان تھک کوشش جاری رکھی گئی۔

سرکار ملت کا ایک ہتھیار ہے

آج کئی افسر جو سرکاری کاروبار کے مختار ہیں شاید موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرنا زیادہ قرین مصلحت سمجھیں شاید اس کے مقابلے میں کسی نئی سرکار کے قیام کے لیے کوشش کرنا انہیں ناگوار ہو انہیں اس میں زیادہ آرام ہے کہ سرکار کو ایک ایسی مشین سمجھ لیا جائے جس کا کام فقط اپنے تحفظ کی کوشش کرنا ہے وہ اپنے حق میں بڑے یقین کے ساتھ اعلان کر سکتے ہیں کہ ان کی زندگی تو سرکار کے لیے وقف ہے لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی طاقت ہے جسے قوم کی طاقت کہا جا سکے سوائے قوم کی حاجت کے اور کسی شے کے لیے جدوجہد نہ کرے گی انسان فقط اپنے ہم جنسوں کی خاطر بنایا گیا ہاں

یہ سچ ہے کہ جیسے میں نے اوپر کہا ہے سرکار کے اقتدار کو فقط تنظیمی کل سمجھ لینا زیادہ آسان ہے اور سرکار کو اس دنیا میں خالی ملت کے تحفظ کے لیے ایک زبردست ہتھیار تصور کرنے سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کمزوردلوں کے لیے سرکار اور سرکار کا اقتدار بجائے خود ازلی و ابدی جدوجہد میں استعمال کیا جائے گا یہ وہ ہتھیار ہے جسے استعمال کرنے کا حق ملت کے ہر فرزند کو حاصل ہے بشرطیکہ وہ اسے ایک بغیر مطلب کے ہتھیار سمجھ کر استعمال نہ کرے بلکہ اس احساس کے ساتھ استعمال کرے کہ یہ ہتھیار ملت کے تمام فرزندوں کے مشترکہ تعاون کا دوسرا نام ہے۔

انسانوں کے جسم ہی نہیں روحیں بھی مسخ ہو چکی ہیں

غرض ہم ایک ایسے اعتقاد کی خاطر لڑ رہے ہیں جو فطرت کائنات کی اصل اور بنیاد ہے اس جنگ میں ہمارے ساتھیوں کی تعداد تھوڑی ہو گی اس معاشرے میں ہمیں زیادہ ساتھی کس طرح مل سکتے ہیں جبکہ اس معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے جسم ہی نہیں بلکہ ان کی روحیں بھی مسخ ہو چکی ہیں اس ملک کے ہزار ہا باشندوں میں سے صرف خاص خاص لوگ ہماری صفوں میں شامل ہوں گے عمر رسیدہ لوگوں میں سے صرف وہ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوں گے جن کے دل ابھی تک جوان ہیں اور جن کی ہمتوں کی کمر خمیدہ نہیں ہو چکی برعکس اس کے جو لوگ اپنا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال کو علی حالہ برقرار رکھا جائے وہ کبھی ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے ہمارے مقابلے میں ان لوگوں کی لاتعداد فوج ہے جو اگرچہ نیت کے برے نہیں لیکن سست اور لاپرواہ ہیں انہیں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی خودغرضیاں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ موجودہ صورت حال کو برقرار رکھیں بظاہر ہماری جدوجہد کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ہم جب مشکلات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف یہی دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں ابھی کس قدر کام کرنا ہے، یا یہ کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ کیسی عظیم الشان کامیابی ہو گی۔

قوموں کی قسمت اقلیتیں بدلتی ہیں نہ کہ اکثریتیں

جب کبھی کوئی ایسا نعرہ جنگ بلند کیا جائے جسے سنتے ہی پست ہمت لوگ پیچھے ہٹنے لگیں یا کم از کم دل چھوڑ دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے نعرے میں شریک ہونے کے لیے وہ لوگ آگے بڑھ کر آنے والے ہیں جو طبعاً مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں یا درکھو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ جب کسی قوم کے اندر سے چند بلند ہمت مستعد، اور کارکن افرا دبڑھ کر سامنے آجائے اور کسی مقصد کی خاطر جد و جہد کرنے کے لیے متحد ہو جائیں تو ان کا مرتبہ فی الفور غافل عوام سے بالاتر ہو جاتا ہے یہ مٹھی بھر لوگ بہت جلد دنیا کی قسمت کے مالک بن جاتے ہیں تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا کے تاریخی کارنامے ہمیشہ اقلیتوں نے انجام دیئے ہیں بشرطیکہ یہ تعداد میں تھوڑے لوگ ایسے، عزم، حوصلے اور پیش دستی کی استعداد رکھتے ہوں کہ ساری ملت ان کی ہمنوا اور پیرو بن جائے۔

دوغلی نسل کے کمینوں پر عذاب الٰہی نازل ہوگا

اکثر لوگوں کو ہمارے راستے میں جن مشکلات کا احساس ہوتا ہے وہ ہمارے نزدیک کامیابی کی منزل کی نشانیاں ہیں چونکہ ہمارا کام عظیم ہے چونکہ ہمارے راستے میں بہت سی مشکلات ہیں اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ ہمارے حامی صرف بلند ترین کردار کے مالک بن سکیں گے یہ کسوٹی ہماری کامیابی کی ضمانت ہے قدرت نسلی دو غلے پن کے غلط نتائج کو رفع کرنے کے لیے بسا اوقات خود مداخلت کرتی ہے قدرت کو دوغلی نسل کے کمینے بھلے معلوم نہیں ہوتے مخلوط نسل کی اولاد کو قدرت کی جانب سے سخت عذاب دیئے جاتے ہیں یہ عذاب بالخصوص تیسری چوتھی اور پانچویں پشت پر نازل ہوتے ہیں۔ ان سے وہ تمام اعلیٰ خصلتیں چھین لی جاتی ہیں جو ان کی پہلی جد کے والدین کو حاصل تھیں ان کے ارادے متزلزل رہتے ہیں انہیں جسمانی ضعف لاحق ہو جاتا ہے وجہ یہ کہ کمبختوں کے خون میں یکسانی جو نہیں ہوتی۔ مصیبت کے وقت صحیح النسب افراد صحیح فیصلے کرتے ہیں یہاں صحیح فیصلوں سے مراد یہ ہے کہ ان کے فیصلوں میں باہمی تضاد نہیں ہوتا۔ اور وہ جو رخ اختیار کر لیتے ہیں پھر اسی پر چلتے ہیں برعکس اس کے مجہول النسب افراد نا مساعد

حالات میں گھبرا جاتے ہیں اور ان کے فیصلے خود باہم متصادم ہو جاتے ہیں غرض مجہول النسب شخص صرف صحیح النسب شخص کے مقابلہ میں ہیچ نہیں ہوتا بلکہ اس کی قسمت میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا نام ونشان جلد ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا بے شمار حالات ایسے ہیں جن میں صحیح النسب نسلیں اپنے آپ کو بچا لیتی ہیں لیکن مخلوط نسلیں ہمت ہار بیٹھتی ہیں یہ قدرت کی مداخلت کا نتیجہ ہے جو وہ اصلاح کے احوال کی خاطر کرتی ہے قدرت دوغلی اولاد کی نسل جاری نہیں رہنے دیتی وہ ان کی نسل منقطع کر کے انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

مجہول النسب قوموں کی تباہی مقدر ہو چکی ہے

مثال کے طور پر اگر کسی نسل کا کوئی فرد اپنے خون کی آمیزش ایک اعلیٰ نسل کے کسی فرد کے ساتھ کرتا ہے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی اولاد نسلی لحاظ سے کمتر درجہ کی ہوگی پھر اس دوغلی اولاد کے آئندہ بچے ان لوگوں کے مقابلہ میں کمزور ہوں گے جن کا خون نسلی لحاظ سے غیر مخلوط ہے جب ایک دوغلی نسل میں کسی اعلیٰ نسل کا خون داخل ہونا بند ہو جاتا ہے اور دوغلی نسل کے افراد باہم توالد و تناسل پر مجبور ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی دوغلی نسل جلد ہی ختم ہو جاتی ہے دوغلی نسلوں کے ختم ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت ناکافی ہوتی ہے ان کی قوت مدافعت اس وجہ سے ناکافی ہوتی ہے کہ قدرت انہیں زندہ نہیں رکھنا چاہتی قدرت کا یہ طرز عمل بڑا دانشمندانہ ہے اگر دوغلی نسل ختم نہ ہو جائے تو پھر ہزار ہا سال گذر جانے کے بعد وہ بجائے خود ایک نئی نسل کی صورت اختیار کر لیتی ہے تاہم یہ نئی نسل بھی بہر حال دوغلی ہی رہتی ہے اس نئی نسل کے اصلی اجزا امتداد زمانہ سے یوں باہم مل جاتے ہیں کہ اصلی اجزاء کو شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس طرح جو نئی نسل وجود میں آتی ہے اس میں کسی حد تک گروہ بندی کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن ایسی دوغلی نئی نسل کی ذہانت اور ثقافت ہمیشہ اپنے صحیح النسب آباؤ اجداد کے مقابلہ میں پست رہتی ہے علاوہ ازیں نئی نسل بن جانے کے باوجود بھی دوغلی نسلیں

ہمیشہ ایسی اعلیٰ نسلوں کے مقابلے میں شکست کھاتی ہیں جنہوں نے اپنا خون پاکیزہ رکھا ہو ہزار ہا سال گذر جانے کے بعد دوغلی نسل میں گروہ بندی کا جو احساس پیدا ہوتا ہے، وہ تنازع للبقائے کے لیے کافی نہیں دوغلی نسلوں کا احساس گروہ بندی یوں کمزور رہتا ہے کہ نہ ان میں مصلحت شناسی کی استعداد ہوتی ہے اور نہ ہی تخلیق و تعمیر کی ایسی طاقت ہوتی ہے جس سے کسی اعلیٰ نسل پر غلبہ حاصل کر سکیں شرط صرف یہ ہے کہ ایسی اعلیٰ نسلیں ہم جنس اجزا سے مرکب ہو، اور ان اجزا کی ذہنی اور ثقافتی استعداد بہتر درجہ کی ہو۔

اپنا شجرہ نسب بھول جانے سے شرافت مٹ جاتی ہے

لہٰذا ہم حسب ذیل اصول صحیح قرار دے سکتے ہیں ہر نسلی امتزاج جلد یا بدیر دوغلی اولاد کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے ہاں اگر دوغلی نسل کے اعلیٰ حلقوں میں کسی حد تک صحیح النسب ہم جنس عناصر محفوظ رہیں تو پھر دوسری بات ہے دوغلی نسلوں کو تباہی کا یہ خطرہ اس وقت تک لاحق رہتا ہے جب تک کہ خود اعلیٰ نسلیں اپنی پاکیزگی سے غافل ہو کر اپنا شجرہ نسب فراموش نہ کر جائیں اور دوغلی نسلوں سے اختلاط شروع نہ کر دیں۔

یہی وہ اصول ہے جس کے ذریعہ فطرت آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال سے ہمیشہ اس زہر کو خارج کر دیتی ہے جو کسی پاکیزہ خون والی نسل میں وقتاً فوقتاً داخل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ اصول بروئے کار آنے سے پہلے یہ شرط لازمی ہے کہ کسی امت میں ایسے خاندان باقی ہوں جن کا شجرہ نسب نسلی اختلاط سے محفوظ ہو۔

فطرت کی پاکیزگی خون کی پاکیزگی پر منحصر ہے

اگر کسی قوم میں اس کی نسلی جبلت محفوظ ہو تو وہ خود بخود مذکورہ بالا اصول پر عمل شروع کر دیتی ہے مثال کے طور پر اگر ایسی قوم کا کوئی گروہ عارضی طور پر اور مجبوراً اپنے نسلی خون کو پاکیزہ نہیں رکھ سکا، تو جوں ہی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے، قوم کے جن عناصر کا خون پاک ہے وہ مزید نسلی اختلاط سے احتراز کرتے ہوئے صرف باہمی ازدواج کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوغلی نسلوں کے نمونے خود بخود ایک طرف ہٹ جائیں گے اور

نگاہوں سے محو ہو جائیں گے اگر ان کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ پاکیزہ خون والے عناصر پر غالب ہیں تو پھر دوسری بات ہے۔

گھوڑے، گدھے اور خچریں

جب انسان جبلی احساس سے محروم ہو کر قدرت کے تقاضے نظر انداز کرنے لگتا ہے تو پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی کہ قدرت اس کے گناہوں کی تلافی کرے گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی اسی صورت میں ممکن ہے جب صحیح فطری ذوق کو دوبارہ زندہ اور تازہ کیا جائے تلافی مافات کرنی ہو گی خطرہ یہ ہے کہ جو ایک دفعہ صحیح راستہ سے بھٹک جائیں پھر وہ زیادہ سے زیادہ گمراہی میں غرق ہو جاتے ہے تب نسلی امتیاز بالکل مٹ جاتا ہے، اور انسان اپنی برتری کی آخری علامتوں سے بھی عاری ہو جاتا ہے اس کے بعد نہ گھوڑے باقی رہتے ہیں نہ گدھے، بلکہ چاروں جانب خچریں ہی خچریں دکھائی دیتی ہیں، جن کی باہمی مساوات آج کل کے تمام ترقی پسندوں کا منتہائے نگاہ ہے لیکن اس قسم کی مساوات دنیا سے ہر قسم کی بلند اقدار ختم کر دے گی کچھ شک نہیں کہ بنی نوع آدم ایک بہت بڑا ریوڑ بن جائے گی، لیکن یہ مویشیوں کا ایک گلہ ہو گا وہ انسان نہ ہوں گے جنہوں نے تہذیب وتمدن کی تخلیق وتعمیر انجام دی تھی اگر یہ نوبت آ گئی تو انسانیت کا خاتمہ سمجھ لینا چاہیے۔

دوغلی اولاد کی پیدائش بند ہونی چاہیے

جو لوگ اس کرہ ارض کی یہ حالت نہیں دیکھنا چاہتے انہیں احساس کر لینا چاہیے کہ جرمن سرکار کا یہ خاص منصب ہے کہ دنیا میں دوغلی اولاد کی پیدائش بند کر دی جائے۔

ہمارے معاصرین میں سے تھڑولے لوگ یقیناً اس پالیسی کی مخالفت کریں گے اور شکایتوں سے آسمان سر پر اٹھا لیں گے کہ یہ تو انسان کے مقدس ترین حقوق میں مداخلت بیجا کا ارتکاب ہے لیکن یہ نادان نہیں جانتے کہ دنیا میں صرف ایک ہی حق مقدس ہے اور وہ حق بیک وقت مقدس ترین فریضہ بھی ہے وہ مقدس حق اور فریضہ یہ ہے کہ نسلی خون کو

پاک رکھا جائے تاکہ انسانیت کے بہترین نمونے محفوظ رہیں، اور بنی نوع آدم کی شرافت بلند سے بلند تر مقام حاصل کر سکے۔

نکاح ایک مقدس عبادت ہے

ایک قومی سرکار کا پہلا کام یہ ہے کہ مناکحت کا معیار بلند کر کے اسے زبونیٔ نسل کا آلہ کار نہ بننے دیا جائے۔ سرکار کا فرض یہ ہے کہ نکاح کو ایک ایسی مقدس عبادت کا درجہ دے دیا جائے جس کا مقصد باری تعالیٰ جل شانہ کی خلافت کے امین پیدا کرنا ہے، نہ کہ لنگور اور انسان کی نسلی آمیزش میں بھتنوں کی پرورش کرنا انسان کے حقوق کے نام پر احتجاج کرنا، ہرگز اس معاشرہ کو زیب نہیں دیتا، جس نے خباثت کے بدترین پتلوں کو اپنی ذریت بڑھانے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے نتیجہ یہ ہے کہ معززین اور شرفا کی زندگی دوبھر ہو چکی ہے ہر دوائی خانہ، بلکہ ہر خوانچہ فروش مانع حمل آلات فروغ کر رہا ہے تا کہ تندرست انسان بچے پیدا نہ کر سکیں آج کل ہماری سرکار کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ ملک میں امن قائم رہے اور قانون شکنی کی نوبت نہ آئے ایسی سرکار دولت مدار کے ماتحت کھاتے پیتے لوگ اس وہم میں گرفتار ہو چکے ہیں کہ آتشک اور تپدق اور اس قسم کی دوسری خاندانی امراض کے بیماروں، اور اپاہجوں ار مجانین کو اولاد پیدا کرنے سے منع کرنا کوئی جرم ہے برعکس اس کے ہماری قوم کے ہزارہا تندرست افراد کا اولاد پیدا کرنے سے باز رہنا ان حضرات کے نزدیک ہرگز قابل تعرض نہیں۔

شرفا میں منع حمل ایک گناہ ہے

ہمارے شرفا کا اخلاقی احساس مانع حمل آلات کو دیکھ کر قطعاً مجروح نہیں ہوتا ان لوگوں کی ذہنی کاہلی اور کوتاہ اندیشی کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت درکار ہو سکتا ہے اگر اس طبقہ کے ذہن مفلوج اور احساس کند نہ ہوتا تو پھر وہ ضرور سوچتے کہ کس طرح آئندہ نسلوں کی خوراک اور آسائش مہیا کرنے کا اہتمام کیا جائے، تا کہ مستقبل میں ہماری ملت تندرست افراد پر مشتمل ہو وہ کیوں نہیں سوچتے کہ کس طرح ایسے حالات پیدا کیے

جائیں جن میں ہمارے بعد آنے والی نسل زندہ رہ سکے، اور اپنی ضروریات زندگی فراہم کر سکے۔

یہ موجودہ نظام بلند خیالی، بلند ہمتی اور شرافت سے کیسا عاری ہو چکا ہے کلیسا بھی دنیا میں خدا کی نیابت کرنے والی مخلوق کے خلاف اس مکروہ سازش میں مداہنت کا ارتکاب کر رہی ہے اگر چہ نائب حق کی فضیلت منبر پر بیان کی جاتی ہے لیکن گرجاؤں کا واقعی طرز عمل اس فضیلت کے قطعی منافی ہے۔

جب جسم ذلیل ہو جاتا ہے تو روح بھی پاپی بن جاتی ہے

یہ بزرگ روح کی باتیں کرتے ہیں، لیکن انسان کو جو اس روحانی امانت کا حامل ہے اپنی آنکھوں کے سامنے کنگالوں کی صف میں شامل ہوتا دیکھ کر بے حسی سے خاموش رہتے ہیں پھر جب ان کی سنگدلی کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں تو وہ حیرانی کا اظہار کرتے ہیں انہیں تعجب ہوتا ہے کہ عیسیٰ کا مقدس خون خود ان کے اپنے **ملک** میں کیسا بے اثر ہو چکا ہے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ **ملک** کی بازاری مخلوق خدا کو کیوں بھول چکی ہے، اور اس کی اخلاقی حالت کیوں اتنی گر گئی ہے وہ نہیں جانتے کہ جب جسم **ذلیل** ہو جاتا ہے تو روح بھی پاپی بن جاتی ہے جب انہیں اصلاح احوال کا خیال آتا ہے تو پھر یہ چندے کر کے "مذہبی مبلغین" کے مشن کبھی جنوبی افریقہ بھیجتے ہیں کبھی وسطی افریقہ اور کبھی مغربی افریقہ، تاکہ ہوتنو قبیلہ کے وحشیوں اور زولو قبیلہ کے حبشیوں، اور کافر قبیلہ کے جنگلیوں کو کلیسا کی برکتوں سے آشنا کریں خود یورپ کے اندر تو یہ حالت ہے کہ اللہ رحم کرے بہر حال اس کا شکر واجب ہے یورپ کی قومیں اخلاقی زوال کا شکار ہو رہی ہیں لیکن ہمارے پرہیز گار اور صالح مشنری وسطی افریقہ میں حبشیوں کی نجات کے لیے جدوجہد فرماتے ہیں افریقہ کے جنگلوں کے یہ وحشی اور غیر مہذب انسان کم از کم تندرست تو ہیں کیا اب انہیں ہماری "اعلیٰ تہذیب" کے نام پر دوغلی نسل کی ایک فوج بنا دیا جائے گا جس میں رنگا رنگ کے نکمے اور بے شعور تیتر بٹیر ملے جلے ہوں گے۔

دینداری کا وعظ کرنے سے یتیم کی پرورش بہتر ہے

شرافت انسان کے زیادہ قرین ہوتا اگر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے پرہیز گار بزرگ غریب حبشیوں کو اپنے وعظوں سے نہ ستاتے، جو نہ یہ وعظ سننا چاہتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں اچھا ہوتا اگر وہ یہ بے نتیجہ شغل ترک کر دیتے اور ذرا سنجیدگی اور شفقت سے کام لیتے ہوئے اہل یورپ کو یہ تلقین کرتے ہوئے کہ جب کوئی میاں بیوی بیماریوں میں گرفتار ہوں تو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے کہ وہ کسی یتیم کو گود میں لے لیں، اور اسے ماں باپ کی طرح پالیں بجائے اس کے کہ وہ ایک عدد مریل اور مریض بچہ پیدا کریں جو خود بھی ساری عمر دکھوں میں گرفتار رہے اور دوسروں کے لیے بھی پریشانی اور رنج کا موجب ہو۔

قوم کا سب سے قیمتی ورثہ اولاد ہوتی ہے

قومی سرکار کو اس ضمن میں ان تمام کوتاہیوں کی تلافی کرنی ہوگی جو بحالت موجودہ تمام متعلقہ فریقین کی غفلت اور نافرض شناسی کے باعث سرزد ہو چکی ہیں قومی سرکار نسل کو معاشرتہ کی زندگی کا مرکزی نقطہ بنالے گی قومی سرکار ہرگز نسلی خون کو آلودہ کرنے کی اجازت نہ دے گی قومی سرکار اس حقیقت کا اقرار کرے گی کہ کسی قوم کا سب سے قیمتی ورثہ اس کی اولاد ہوتی ہے یہ انتظام کرنا قومی سرکار کا فرض ہے کہ صرف تندرست افراد ہی بچے پیدا کرسکیں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جو والدین بیمار ہوں یا جن میں کوئی خاندانی نقص ہو انہیں بچے پیدا کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو والدین اس گناہ سے بچتے ہیں وہ عزت کے مستحق ہیں دوسری طرف قوم کو تندرست بچے نہ دینا ایک جرم کا ارتکاب ہے۔ اس معاملہ میں سرکار آنے والے ہزارہا سال کی امانت دار ہے قوم کے مستقبل کے مقابلہ میں افراد کی خودغرضانہ خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں انہیں اس معاملہ میں سرکار کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا اس مسئلہ میں اپنے فرائض پورے کرنے کی غرض سے سرکار موجودہ زمانہ کی طبی ایجادات سے فائدہ حاصل کرسکتی ہے

سرکار کو اعلان کر دینا چاہیے کہ جو شہری کسی ایسی خاندانی مرض میں مبتلا ہیں جس کی تشخیص ہو سکتی ہے انہیں بچہ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دوسری طرف جو عورت تندرست بچے پیدا کرنے کے قابل ہے اس کے لیے سرکار کی جانب سے یہ اہتمام ہونا چاہیے کہ اقتصادی نظام کے کسی سقم یا کسی مالی تنگی کے باعث اس کی گود خالی نہ رہ جائے۔

افسوس آج اولاد جیسی رحمت ایک زحمت بن چکی ہے

آج ایک ایسا سیاسی نظام رائج ہے جس کے ماتحت والدین کے لیے اقتصادی لحاظ سے اولاد ایک رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے سرکار کو ان بزدلانہ بلکہ مجرمانہ غفلت شعاریوں کو رفع کرنا ہوگا جن کی بدولت بڑے بڑے کنبوں کی معاشرتی سہولتیں میسر نہیں آ رہیں۔ سرکار اپنی رعایا کی اولاد کی سب سے بڑی پالنہار ہوگی اولاد سے بڑی وہ کونسی نعمت ہے جو کسی قوم کو میسر آ سکتی ہے سرکار کی توجہ پہلے بچوں کی جانب ہونی چاہیے پھر بالغوں کی باری آ سکتی ہے۔

والدین اپنے گناہ معصوم اولاد کے سر نہ تھوپیں

جو لوگ جسمانی یا ذہنی امراض میں گرفتار ہیں انہیں اپنی بیماریوں کو اپنی اولاد کے ذریعہ قوم کے اندر مستقل رکھنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے ایک قومی سرکار کو یہ ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جس کا علاج قوم کو تربیت دے کر کیا جا سکتا ہے مستقبل میں یہ کارنامہ ہمارے زمانہ کی سرمایہ دارانہ جنگوں کے مقابلہ میں زیادہ شاندار اور زیادہ اہم سمجھا جائے گا تعلیم و تربیت کے ذریعہ سرکار اپنی رعایا کو ذہن نشین کر دے گی کہ بیماری باعث ذلت نہیں بلکہ ایک حادثہ ہے جس پر رحم کھانا چاہیے لیکن یہ امر باعث ذلت بھی ہے اور ایک قومی جرم بھی ہے کہ اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کو محض اپنی نفسانی تسکین کی خاطر آنے والی معصوم جانوں کے سر تھوپ دیا جائے۔

خاندانی امراض میں مبتلا لوگ اولاد پیدا نہ کریں

سرکار اپنی رعایا کو یہ تربیت بھی دے گی کہ اگر کوئی شخص بغیر اس کے کسی تصور کے کسی

خاندانی مرض میں گرفتار ہے اور اس وجہ سے خود اولاد پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنی محبت اور شفقت کے کسی ایسے گمنام بچہ پر نچھاور کرتا ہے جو تندرست ہے اور ایک دن قوم کا تومند رکن بننے کی اہلیت رکھتا ہے تو ایسا ایثار پیشہ شخص انسانیت کا بہترین محسن ہے اور صحیح معنوں میں عالی مرتبت کہلانے کا مستحق ہے ایسی تربیت کا اہتمام کرتے ہوئے سرکار اخلاقی تلقین و ترغیب سے بھی کام لے گی سرکار کو یہ فرض ادا کرنا ہی ہو گا چاہے سرکار کا یہ طرز عمل لوگوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور وہ اسے پسند کریں یا نہ ناپسند۔

اگر صرف چھ سو سال کے لیے ان افراد کو بچے پیدا کرنے سے منع رکھا جائے جو جسمانی یا دماغی امراض میں گرفتار ہیں تو بنی نوع انسان نہ صرف بہت سی تکالیف سے نجات حاصل کر لے بلکہ صحت و تندرستی کا ایک ایسا معیار قائم ہو جائے جس کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اگر قوم کے تندرست افراد کی اولاد بڑھانے کا کوئی عملی انتظام سوچ سمجھ کر باقاعدہ طریقہ سے کر لیا جائے تو دنیا میں ایک ایسی نسل کے قیام کی داغ بیل پڑ جائے جو ان جراثیم سے محفوظ ہو جن سے آج ہمارے جسمانی اور روحانی انحطاط کی تمام بیماریاں پھیل رہی ہیں اگر کوئی قوم اور سرکار یہ راستہ اختیار کر لے کہ ملت کے صرف ان عناصر کی نشوونما اور پرورش کی جائے گی جو نسلی لحاظ سے برتر ہوں اور ان کی اولاد بڑھانے کا اہتمام کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ساری قوم آنے والے زمانہ میں ان اہلیتوں سے فائدہ اٹھائے جو نسلی جوہر کو محفوظ رکھنے کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جو حقیقی شرافت کا اصلی سرچشمہ ہیں۔

شرفا کی نوآبادیات قائم ہونی چاہئیں

اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے سرکار کا پہلا کام تو یہ ہے کہ جب کوئی نیا علاقہ اس کے تصرف میں آئے تو وہاں نوآبادیات قائم کرنے کا انتظام کسی اوٹ پٹانگ پالیسی کے ماتحت عمل میں نہ آئے بلکہ باقاعدہ طے شدہ اصولوں کے ماتحت کیا جائے خاص واقفیت رکھنے والے ارکین پر مشتمل کمیٹیاں مقرر کی جائیں جو افراد کسی نوآبادی

میں جا کر مقیم ہونا چاہیں انہیں پہلے ایسی کمیٹیوں سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے پر مجبور کیا جائے ان سرٹیفکیٹوں میں درخواست دہندہ کی نسلی پاکیزگی کی تصدیق ہونی چاہیے یوں ملک کی سرحدات پر ایسی نوآبادیات قائم کی جا سکتی ہیں جن کے باشندے بہترین نسلی پاکیزگی اور شرافت کے نمونہ ہوں گے اس قسم کی نوآبادیات ساری ملت کے لیے باعث برکت ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ نوآبادیات ترقی کریں گی تو ان سے ملت کے ہر رکن کو مسرت، اعتماد اور فخر حاصل ہو گا۔ وہ ایک ایسا پاکیزہ تخم ہوں گی، جو پھوٹ کر پروان چڑھے گا تو ساری ملت ترقی کرے گی، بلکہ خود انسانیت پر بہار آئے گی۔

مویشیوں کی نسل کشی کرنے والو! انسان کی بھی اصلاح نسل درکار ہے!!

جس ضابطہ حیات کی رو سے سرکار کی بنیاد نسلی اصول پر رکھی جانی چاہیے اس پر عمل پیرا ہونے سے ایک ایسا دور قائم ہو جائے گا جب شرافت کا غلبہ ہو گا۔ تب لوگ صرف کتوں، گھوڑوں اور بلیوں کی اصلاح نسل کا خیال نہ رکھیں گے بلکہ خود انسان کی بہترین نسل کشی پر بھی توجہ دیں گے جب یہ دور آ جائے گا تو ایک گروہ خاموش رہنے اور دستبردار ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے گا ایک دوسرا گروہ ایسا ہو گا جو بخوشی ایثار پیشہ ہونے کا ثبوت دے گا اور اپنی اہلیتوں سے برت نسل کی خدمت کو اپنا شعار بنائے گا۔

اس قسم کے ایثار پیشہ لوگوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا دنیا میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں تارکان دنیا ایسے نہیں جو اپنی مرضی سے اولاد پیدا کرنے سے باز رہتے ہیں حالانکہ نہ کوئی انہیں اس پر مجبور کرتا ہے نہ ان پر کوئی پابندی عائد ہوتی ہے۔ فقط دینی تلقین کے زیر اثر وہ یہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں اگر لوگوں کو سمجھا دیا جائے کہ نسلی آمیزش کو روکنا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہی قربانی لوگ بغیر دینی تلقین کے بھی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہ نسلی آمیزش تو وہ فساد ہے جو ایک پشت کے بعد دوسری پشت کو منتقل ہوتا رہتا ہے لوگوں کو یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ انسان کا فرض ہے کہ خدائے بزرگ و

برتر کی نیابت کی غرض سے انسانیت کے صرف ایسے نمونے پیدا کرے جو کارسازِ حقیقی کی اصل صنعت کے مطابق ہوں۔

اچھی تجویزوں پر عمل کرنے کو اچھے لوگ درکار ہوتے ہیں

یہ کوئی تعجب نہیں کہ ہمارے زمانہ میں وحشیوں اور اجنبیوں کی فوج ہمارے معاشرہ میں داخل ہو چکی ہے وہ ان باتوں کو سمجھتی ہے اور نہ قبول کرتی ہے وہ تو تمسخر سے کندھے جھٹک کر وہی ایک عذر پیش کرے گی جو ہمیشہ ان کے لبوں پر رہتا ہے وہ کہیں گے یہ ہے تو بڑی اچھی تجویز لیکن افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ہم انہیں اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہاں ہاں اس تجویز پر تم سے عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تجویز جس حقیقت پر مبنی ہے تم اس کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ تمہیں تو ایک ہی تردد رہتا ہے تم نرے انفرادی اغراض کے بندے ہو خود غرضی کے سوا تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں تمہارا معبود صرف پیسہ ہے بہر حال ہم تمہاری امداد کے بھوکے نہیں ہم تو ان ہزارہا مفلوک اور مفلس افراد سے تعاون کے طالب ہیں جو اپنی غربت اور حاجت کے باعث خود اپنی ذات کو دنیا کا مرکز، محور اور مقصد نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنا معبود اپنے آپ کو نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں جن کی خاطر انہیں اپنی جانیں نچھاور کرنے سے بھی عذر نہیں ہم ان نوجوانوں کی وسیع فوج کے تعاون کے طالب ہیں جو اس زبردست ابتلا کے زمانہ میں ہوش سنبھال رہے ہیں وہ ضرور ان برائیوں کے خلاف جنگ کریں گے جن کا باعث ان کے آباؤ اجداد کی سستی اور غفلت تھی یا تو جرمن نوجوان ایک دن نسلی اصول پر مبنی سرکار قائم کر کے دم لیں گے اور یا پھر وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ان کھاتے پیتے لوگوں کی دنیا کا جنازہ اور حشر دیکھ لیں گے۔

ابتری کے اقرار کے بعد اس کا تدارک فرض ہو جاتا ہے

اگر کسی زمانہ میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا خود اس زمانہ کے لوگوں کو بھی اقرار ہو اور باوجود اس کے وہ ان خرابیوں کا تدارک نہ کریں بلکہ آج کل کے کھاتے

پیتے لوگوں کی طرح اپنے آپ کو طفل تسلیاں دیتے رہیں اور اس قسم کے فضول عذر کرتے رہیں کہ حالات کی اصلاح کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تو ایسے لوگوں کی قسمت میں تباہی مقدر ہو چکی ہوتی ہے ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کی ایک قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ حالات کی ابتری کا انکار نہیں کر سکتے انہیں ماننا پڑتا ہے کہ بہت کچھ غلط ہو رہا ہے اور بہت کچھ ناپسندیدہ ہے پھر بھی انہیں یہ ہمت نہیں پڑتی کہ برائی کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیں حالانکہ ان خرابیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ضرورت صرف یہ ہے کہ چھ یا سات کروڑ انسانوں کی قوت کو منظم کر کے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے لیکن ان کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہے وہ خود تو کوئی ایسی کوشش کرتے نہیں اور جب کوئی دوسرا اس قسم کی کوشش کرے تو وہ صرف احمقانہ نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں اور دور کھڑے رہ کر یہ ثابت کرنے میں مشغول رہتے ہیں کہ اس قسم کی کوشش تو از روئے عقل ناممکن ہے اس لیے اس کی ناکامی پہلے سے یقینی ہے مثال کے طور پر ایک پورا بر اعظم شراب کی ممانعت کے لیے کوشاں ہے تاکہ ایک قوم کو اس بربادکن عادت سے بچایا جا سکے لیکن ہمارے یورپین کھاتے پیتے لوگ سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے اور کچھ نہیں کرتے کہ بیوقوفوں کی طرح بغلیں جھانک کر شک و شبہ سے سر ہلانے لگتے ہیں اور تحریک کا تمسخر اڑا کر اپنے آپ کو بڑا عقل مند ظاہر کرنا چاہتے ہیں ان لوگوں کی ذہنی حالت کسی ایسے تمدن ہی میں برداشت کی جا سکتی ہے جو خود تمسخر کے لائق ہو پھر جب ان احمقوں کی ایک نہیں چلتی اور کسی علاقہ کے لوگ اپنی شریفانہ کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کامیابی سے انکار شروع کر دیتے ہیں یا پھر اسکی اہمیت گھٹانے لگتے ہیں ایسی سفلانہ کوشش کے دوران میں اخلاقی اصولوں کا نام لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا، حالانکہ یہ لوگ جس تحریک کی مخالفت کرتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ بداخلاقی کے ایک بہت بڑے منبع کو بند کر دیا جائے۔

برائی کا مقابلہ نہ کرنے والا بھی برا ہوتا ہے

نہیں! نہیں!! اس مسئلہ پر ہم اپنے آپ کو کسی دھوکہ میں مبتلا نہیں رکھ سکتے ہمارے معاصرین میں سے کھاتے پیتے لوگ ہر شریفانہ کام انجام دینے کے ناقابل ہو چکے ہیں یہ کھاتے پیتے لوگ ہر اچھی خصلت سے عاری ہیں یہ لوگ برے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس لیے برے نہیں کہ برائی چاہتے ہیں بلکہ وہ اس لیے برے ہیں کہ برائی کے مقابلہ میں کمر ہمت باندھ کر ڈٹ جانے میں سستی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو سیاسی مجلسیں اپنے آپ کو کھاتے پیتے لوگوں کی جماعتیں کہلاتی ہیں وہ بس چند گروہوں اور چند طبقات کے مفاد کی حفاظت کرنے والی پیشہ ورانہ انجمنیں ہیں ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک بس چلے اپنے خود غرضانہ مفاد کی حفاظت کرتی رہیں ظاہر ہے کھاتے پیتے سیاست دانوں کی یہ برادریاں ہرگز کسی جدوجہد کی اہلیت نہیں رکھتیں خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ مقابلہ دکانداروں سے نہ ہو بلکہ کنگال اور مفلوک الحال عوام سے ہو جو انتہائی اقدامات پر تلے ہوں، اور تشدد سے بھی منہ پھیرنے والے نہ ہوں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت سرکار کا فرض ہے

اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سرکار کا سب سے پہلا فرض قوم کی خدمت ہے اور قومی اصلاح و بہبود ہے، اگر ہم مانتے ہیں کہ قوم کی خدمت اور قومی اصلاح و بہبود بغیر نسلی عناصر کے تحفظ و ترقی کے ناممکن ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ سرکار کے یہ فرائض نسلی لحاظ سے بچوں کی افزائش کا اہتمام کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ سرکار کو ہر شہری کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ہوگا تاکہ وہ نسل کی نشوونما میں بہتر طور پر اپنے فرائض انجام دے سکے۔

تن درستی سے ہی ذہن درست ہو سکتے ہیں

جس طرح بطور ایک قاعدہ کلیۃ کے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی ذہانت اور دماغی قابلیت کی سب سے پہلی شرط نسل ہے اسی طرح افراد کی تربیت میں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ترقی کی

پہلی سیڑھی ایک تنومند جسم اور جسمانی صحت ہے عام قاعدہ یہی ہے کہ ایک مضبوط اور صالح دماغ کسی توانا اور تنومند جسم کے اندر ہی پایا جا سکتا ہے یہ ٹھیک ہے غیر معمولی قابلیت رکھنے والے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نہ صحت اچھی ہوتی ہے اور نہ قد و قامت اونچا ہوتا ہے بلکہ ان کا جسم امراض کا شکار ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس سے وہ اصول غلط ثابت نہیں ہو سکتا جو میں نے ابھی بیان کیا ہے یہ تو اس قسم کی خاص خاص مثالیں ہیں جو ہر قاعدہ کے خلاف ہمیشہ مل جاتی ہیں جب کسی قوم کی اکثریت جسمانی لحاظ سے ضعیف ہو جائے تو شاذ و نادر ہی زبوں حالی کے ان نمونوں میں سے کوئی عالی ہمتی کا کارنامہ انجام پاتا ہے اگر ان میں سے کوئی عالی ہمت نکل بھی آئے تو اس کی سرگرمیاں ان حالات میں زبردست کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں۔ اپاہج اور مفلوج جسم والے گروہوں میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی عالی ہمت قائد کا پیغام سمجھ سکیں ان کے ارادے ایسے پست ہوتے ہیں کہ وہ بلندی پر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مضبوط قوت فیصلہ کا نام کردار ہے

جو سرکار نسلی اصول پر قائم کی گئی ہو، اور جس کو اس حقیقت کا احساس ہو کہ افراد کی تربیت جسم سے شروع ہوتی ہے، ایسی سرکار کا تعلیمی نظام صرف معلومات فراہم کرنے تک محدود نہ ہوگا، بلکہ اس کے تعلیمی نظام کے اندر جسمانی تربیت اور جسم کو توانا بنانے کا اہتمام بھی شامل ہوگا ذہن کی تربیت دوسرے درجہ پر آتی ہے جسمانی تربیت کی خاطر سب سے پہلے کردار کی تعمیر کی ضرورت ہے۔ کردار کیا ہے؟ کردار نام ہے قوت فیصلہ اور قوت ارادی کے مضبوط ہونے کا تعلیمی نظام کے ذریعے یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیے کہ ذمہ داری خوشی سے قبول کی جائے سائنس کی رسمی تعلیم کا درجہ سب سے آخر میں آتا ہے لہٰذا جو سرکار نسلی اصول کی بنیاد پر قائم کی جائے اس کے نزدیک ایک ایسا شخص جو مقابلتاً سائنس کی رسمی تعلیم سے عاری ہے لیکن جسمانی صحت کے لحاظ سے توانا ہے، مستقل مزاج ہے اور دیانت دار ہے احکام کی تعمیل برضا و رغبت کرتا ہے اور وقت پڑنے پر جلد

ہی سے فیصلہ کرسکتا ہے، ارادے کا پکا ہے تو ایسا شخص قوم کا زیادہ مفید رکن سمجھا جائے گا، بمقابلہ ایک ایسے کمزور اور نحیف انسان کے جو بہت پڑھا لکھا اور شائستہ ہو۔

مضبوط جسم کے بغیر پاکیزہ روحیں کسی کام کی نہیں

کوئی ایسی قوم جو پڑھے لکھوں پر مشتمل ہوں، لیکن جس کا ہر رکن جسمانی لحاظ سے کمزور رہو، فیصلہ کرنے اور پھر اس فیصلہ پر عمل کرنے میں تذبذب کا شکار ہو، بزدل اور صلح پسند ہو، تو ایسی قوم اس دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کے نا قابل ہے انسان کی قسمت کا فیصلہ جس جانکاہ کشمکش پر منحصر ہے، اس میں شاذونادر ہی کسی شخص کو محض اس لیے شکست ہوتی ہے کہ اس کے پاس علم وفضل کی کمی تھی ناکام وہ لوگ ہوتے ہیں جو نتائج کی پرواہ نہیں کرتے یا اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکیں ذہن اور جسم کا ستیاناس ہو جاتا ہے تو پھر ایسا جسم محض اس لیے حسین نظر نہیں آسکتا کہ اس کے اندر ایک جاندار روح کا قیام ہے اگر ہم بہترین ذہنی تربیت ان لوگوں کو دیتے ہیں جو جسمانی لحاظ سے اپاہج یا ناکارہ ہیں، جو فیصلہ کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کے ارادے کمزور ہیں تو ہمارا طرز عمل منصفانہ نہیں یونانیوں کا نظریہ حسن اسی لیے ازلی وابدی سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے ذہن اور روح کی بلندی اور شرافت اور نفس کے ساتھ جسمانی حسن اور توانائی کو بھی لازمی قرار دیا تھا۔

قسمت صرف طاقتوروں کی یاری کرتی ہے

مولٹکے کا یہ مقولہ کہ آخر کار قسمت صرف ان لوگوں کی یاوری کرتی ہے جو مستعدی سے عمل کرتے ہیں یقیناً جسم اور روح کے رشتہ کے متعلق صحیح نظریہ بیان کرتا ہے جو ذہن تندرست ہے وہ بالعموم اپنی رہائش بھی کسی توانا جسم کے اندر ہی رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک قومی سرکار کے ماتحت جسمانی ریاضت کوئی انفرادی فعل نہیں، نہ ہی جسمانی ریاضت کا اہتمام کوئی ایسا فرض ہے جو پہلے والدین کے ذمہ ہو اور صرف دوسرے یا تیسرے درجہ پر قومی ذمہ داری سمجھا جائے۔ جسمانی ریاضت قوم کی بقا کے

لیے ضروری ہے اس معاملہ میں قوم کی نمائندگی کرنا اور قوم کو بچانا سرکار کے ذمہ ہے جہاں تک رسمی تعلیم کا تعلق ہے سرکار آج بھی افراد کے حق خوداختیاری میں دخل دیتی ہے حکومت جبراً قوم کی جانب سے بچوں کو جبری تعلیم کے نظام سے وابستہ کرتی ہے اس معاملہ میں والدین کی رضامندی کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک روز قومی سرکار قوم کے تحفظ کی خاطر افراد کی ناسمجھی اور جہالت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے اختیارات سے کام لے گی، سرکار کو تعلیم کا انتظام یوں کرنا ہوگا کہ شیرخوارگی کے زمانہ سے ہی جسم باقاعدہ طور پر ریاضت کے عادی بن جائیں وہ اس طرح محنت کے عادی اور مشقت اٹھانے کے قابل بن جائیں کہ آنے والے زمانہ میں انہیں جو بوجھ بھی اٹھانا پڑے اسے سہار سکیں سب سے بڑھ کر سرکار کا فرض یہ ہے کہ گھر بیٹھے رہنے والوں کی ایک نسل پیدا نہ ہوجائے۔

ماں کی گود سنوارنے سے قوم کا مستقبل سدھر سکتا ہے

جسمانی صحت، صفائی اور تعلیم کی ابتدا نوجوان ماؤں کی تربیت سے ہوتی ہے سالہا سال کی محنت سے تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب بچے کی پیدائش پر بالعموم نہ اس کے ناف کے زخم میں پیپ پڑتی ہے اور نہ ہی ماں کو زچگی کا بخار چڑھتا ہے اسی طرح سے ماں اور کھلائی کو مناسب تربیت دے کر یہ انتظام بھی کیا جاسکتا ہے کہ بچے کی شیرخوارگی سے ہی اس کے پروان چڑھنے تک اسے اپنی جسمانی نشوونما کے لیے ورزش کی ترکیبیں سکھادی جائیں۔

علم کو کتابوں کی گٹھڑی نہ بناؤ

قومی سرکار کو یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ اسکول میں بچوں کی جسمانی ورزش کے لیے زیادہ وقت دیا جائے یہ ایک احمقانہ حرکت ہے کہ ننھے ننھے دماغوں پر موٹی موٹی کتابوں کا ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑے ہوکر بچوں کو ان موٹی کتابوں کے سبق بہت کم یاد رہتے ہیں اور جو یاد رہتا ہے وہ فضول حصہ ہوتا ہے

اصل کام کی بات نہیں ہوتی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کا ذہن علم کے اس ڈھیر میں سے بھوسہ اور دانے الگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا نتیجہ یہ کہ بھوسہ اور دانے دونوں کا ایک بڑا سا گٹھڑ باندھ کر ان غریبوں کی گردن پر لاد دیا جاتا ہے آج حالت یہ ہے کہ ہائی اسکول میں بھی ہفتہ بھر کے اندر صرف دو گھنٹے جسمانی ورزش پر صرف کیے جاتے ہیں اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ ورزش کے اس قلیل وقفہ میں یہ بات طالب علموں کی مرضی پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ چاہیں تو ورزش کرلیں ورنہ یوں ہی کھڑے دیکھتے رہیں یہی وجہ ہے کہ ہماری ذہنی تعلیم اور جسمانی تربیت کے درمیان کوئی صحیح تناسب باقی نہیں رہا۔

بچوں کے لیے کھیل اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ تعلیم

کوئی دن خالی نہیں جانا چاہیے جبکہ ننھے طالب علم ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام جسمانی ورزش میں حصہ نہ لیں ہر قسم کی کھیلوں کا انتظام ہونا چاہیے جمناسٹک کا بھی انتظام ہونا چاہیے ایک کھیل ایسا ہے کہ اس کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کئی لوگ اپنے آپ کو امت پرعقیدے کے پیرو کہاتے ہیں اور باوجود اس کے وہ اس کھیل کو وحشیانہ اور بازاری کہتے ہیں اس کھیل کا نام ہے گھونسہ بازی، باکسنگ سمجھ میں نہیں آتا کہ نام نہاد ''شائستہ'' طبقات میں اس کھیل کے خلاف کیا کیا غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے نوجوان تلوار چلانا سیکھیں اور اس کے بعد ڈوئل لڑنے میں اپنا وقت صرف کریں، تو اسے بالکل طبعی اور شریفانہ کھیل سمجھا جاتا ہے لیکن گھونسہ بازی نا صاحب!! یہ تو وحشیانہ کھیل ہے!! جی کیوں وحشیانہ کھیل ہے؟ کوئی دوسرا کھیل ایسا نہیں جو انسان میں جنگجوئی پیدا کرنے کے لیے اس کھیل کا مقابلہ کرسکے کوئی دوسرا کھیل اس قدر جلد فیصلے پر مجبور نہیں کرتا نہ ہی کوئی دوسرا کھیل جسم میں فولاد کی سی لچک اور مضبوطی پیدا کرنے کے لحاظ سے گھونسہ بازی کا مقابلہ کرسکتا ہے اگر دو نوجوان اپنے کسی جھگڑے کا فیصلہ گھونسہ بازی سے طے کرلیتے ہیں تو اس میں ایسی کونسی بات ہے جسے تلوار سے لڑنے کے مقابلہ میں وحشیانہ کہا جائے جب کسی شخص پر حملہ کیا جائے اور وہ اپنے مکوں سے اپنی حفاظت کرے، تو وہ دلیری میں

اس شخص سے کسی طرح کم نہیں جو ایسے موقعہ پر پولیس کے سپاہی کو اپنی امداد کے لیے بلانے کی خاطر بھاگ جائے۔

ناک پر عینک لگانے والے منشی اور تسبیح پھیرنے والی کنواری بڑھیا

بڑی بات یہ ہے کہ ہر تندرست جوان کو سخت چوٹیں کھانے کا تجربہ ہونا چاہیے یہ اصول ہمارے زمانہ کے ان بہادروں کو ضرور وحشیانہ معلوم ہوگا جو صرف ذہنی ہتھیاروں سے لڑنا چاہتے ہیں لیکن قومی سرکار کا مقصد یہ نہیں کہ فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے والے صلح پسند اور نازک مزاج زنانوں کی ایک نو آبادی قائم کر دے قومی سرکار کے نزدیک انسانی زندگی کا نصب العین ناک پر عینک ٹکانے والے منشی اور تسبیح پھیرنے والی کنواری بڑھیا نہیں قومی سرکار تو جرات مند، دلیر مرد اور اولاد پیدا کر کے اسے پروان چڑھانے والی متحمل مزاج ماں کی محتاج ہے

قاعدہ کلیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کھیل کا مقصد صرف افراد کو مضبوط، چوکس اور دلیر بنانا نہیں، بلکہ اس کا مقصد جسم کو مشقت کا عادی اور نا مساعد حالات میں زندگی گذارنے کے قابل بنانا بھی ہے۔

پڑھے لکھوں کو بھی پہلوان بننا چاہیے

اگر ہمارے بالائی طبقات نے اتنی اعلیٰ تعلیم نہ پائی ہوتی اور اس کی بجائے تھوڑی گھونسہ بازی بھی سیکھی ہوتی تو جب ایک طرف سپاہی سینہ تان کر گولیاں کھا رہے تھے، ان کی غیر حاضری میں غنڈے، غدار اور آوارہ گرد عناصر جرمنی کے اندر انقلاب برپا کرنے میں کامیاب نہ ہو جاتے یہ انقلاب اس لیے برپا نہ ہوا کہ انقلاب کے حامی دلیر، مستعد، یا جانباز تھے بلکہ یہ اس لیے کامیاب ہوا تھا کہ تب جرمن سرکار کے حاکم المناک طور پر بزدل اور قوت فیصلہ سے عاری تھے دراصل یہی بزدل اور مذبذب حاکم اس انقلاب کا باعث تھے ہمارے تعلیم یافتہ لیڈروں نے فقط ذہنی تعلیم پائی تھی یہی وجہ تھی کہ جب دشمن نے ان کے سر پر گھونسے اور لٹھ برسانے شروع کیے تھے تو وہ ساری چوکڑی

بھول گئے اس ساری تباہی کی وجہ فقط یہ تھی کہ ہمارے تعلیمی نظام کا مقصد مرد پیدا کرنا نہ تھا، بلکہ وہ تو دفتروں کے بابو، انجینئر، مستری، دوساز، منشی، ماہرین قانون اور پروفیسر صاحبان پیدا کرنے پر تلا ہوا تھا، تاکہ خدانخواستہ جرمن میں دانشوری کا بازار سرد نہ ہو جائے۔

جہاں تک خالص دانشوری کے میدان کا تعلق ہے جرمنوں کے قائدین نے ہمیشہ اچھی قابلیت کا ثبوت دیا ہے، لیکن جہاں عملی مسائل میں عزم کی پختگی دکھانے کا موقعہ آیا، وہاں جرمن قائدین بالکل نکمے ثابت ہوئے۔

شجاعت کا دروازہ ریاضت ہے

یقیناً تعلیم کے ذریعہ ایک بزدل انسان کو بہادر نہیں بنایا جا سکتا ایک شخص میں ایک حد تک جبلی دلیری موجود ہے لیکن مناسب تعلیم نہ ملنے کے باعث بے چارہ جسمانی طاقت اور مضبوطی سے محروم ہے نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کی طبعی شجاعت بھی دب کر رہ جائے گی فوجی افسر اس سچائی کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں کہ جب کسی شخص کی جسمانی طاقت مناسب تربیت حاصل کر لیتی ہے تو اس کے اندر دلیری اور جنگجوئی بھی پیدا ہو جاتی ہے فوج میں ہر شخص سورما نہیں ہوتا پھر بھی اوسط فوجی خاصہ دلیر ہوتا ہے جنگ سے پہلے جرمن سپاہیوں کو جو قابل تعریف تربیت دی گئی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ فوج کی عظیم الشان تنظیم کا ہر رکن خود اعتمادی کا پتلا تھا۔ انہیں اپنی برتری میں ایسا یقین تھا کہ دشمن بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہ کرتے تھے 1914ء کے موسم گرما کے آخر اور پھر موسم خزاں میں جرمن فوجوں نے فتح پر فتح حاصل کر کے جس لافانی اور لازوال شجاعت اور تہور کی مثالیں پیش کی ہیں وہ صرف اس تربیت کا نتیجہ تھیں جو انہیں باقاعدہ دی گئی تھیں پہلی جنگ عظیم سے قبل زمانہ امن کی مدت ہائے دراز میں جو لوگ جسمانی طور پر کمزور تھے انہیں دلیری کے ایسے کارنامے انجام دینے کے قابل بنا دیا گیا جن پر یقین نہیں آتا۔ تربیت سے ان کے اندر جو خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی اسے خوفناک

سے خوفناک لڑائی بھی متزلزل نہ کرسکی۔

جانبازی کی تعلیم گہوارے سے ملنی چاہیے

جرمن فوجوں نے شکست نہیں کھائی بلکہ یہ تو جرمن قوم تھی جس نے ہار مان لی، اور آج دنیا کی ہر قوم اسے پاؤں سے ٹھوکریں مار رہی ہے ہماری قوم کو اس قوت کی حاجت ہے جو خود اعتمادی سے سرشار ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے یہ خود اعتمادی ہمارے بچوں میں پیدا کرنے کی کوشش ان کے گہوارے سے ہی شروع ہونی چاہیے تعلیم وتربیت کے سارے نظام کی کوشش اس امر پر مرکوز ہونی چاہیے کہ بچوں میں یہ پختہ اعتقاد راسخ ہو جائے کہ وہ ہر ایک اور کسی ایک کا مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک کسی شخص کی اپنی جسمانی صحت اور طاقت ٹھیک نہیں، اسے یہ یقین کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی قوم دنیا میں کسی سے شکست نہ کھائے گی ماضی میں جرمن فوجوں کو فتوحات حاصل ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر سپاہی کو اپنی ذات پر اعتماد تھا اور تمام سپاہیوں کو اپنے سرداروں اور سپہ سالاروں پر اعتماد تھا جرمن قوم کی ملی قوت صرف تبھی بحال ہوسکتی ہے جب ان کو یہ اعتماد ہو جائے کہ وہ اپنی چھینی ہوئی آزادی دوبارہ حاصل کرنے کے قابل بن چکے ہیں قوم میں یہ اعتماد تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب پہلے لکھو کھہا افراد میں یہ اعتماد پیدا ہو چکا ہو۔

اس قسم کے مسائل میں اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

خالی امن قائم رکھنے اور اطاعت بجالانے سے غلامی کے داغ نہیں دھلتے

ہماری قوم کو ایک زبردست شکست اور خفت اٹھانی پڑی ہے اس لت سے نجات پانے کے لیے ہمیں جو کوشش کرنی پڑے گی وہ بھی زبردست ہونی چاہیے یہ خیال کر لینا بہت بڑی غلطی ہو گی کہ ہماری قوم کو مضبوط بنانے کے لیے فقط ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کو یہ سبق کافی ہوگا کہ امن قائم رکھنے اور اطاعت کرتے رہئے اگر ہم نے یہ غلطی کی تو اس کے نتائج سخت تلخ ہوں گے جب کوئی قوم موجودہ صورت حال سے نجات حاصل

کرنا چاہیے اور رائج الوقت نظام سے بیزار ہو تو خالی ''امن'' قائم رکھنے اور اطاعت بجا لانے سے کام نہیں چلا کرتا۔ رائج الوقت نظام نہ صرف ہماری شکست کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس شکست کے سامنے سر تسلیم خم بھی کرتا ہے اگر ہم اپنی غلامی کی زنجیریں توڑ کر اپنے دشمنوں کے منہ پر مارنا چاہتے ہیں تو یہ کام خالی امن قائم رکھنے اور اطاعت بجالانے سے کیسے انجام پا سکتا ہے ہم سے جو کچھ چھن گیا ہے اگر ہم نے اسے واپس لینا ہے تو اس کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم آزادی کی پیاس سے تڑپ اٹھیں اور قومی ہمت کی آگ کو یوں بھڑکا دیں کہ اس کے شعلے آسمان کے تارے توڑ لائیں۔

طالب علموں کا لباس بھی توجہ کا مستحق ہے

بچوں کو لباس بھی ایسا پہنانا چاہیے جو اس مقصد سے مطابقت رکھتا ہو یہ دیکھ کر دل جل جاتا ہے کہ ہمارے بچے تو فیشن پرستی کی وبا میں گرفتار ہو چکے ہیں انہوں نے الناس باللباس کے مقولہ کا مطلب بالکل الٹا سمجھا ہے۔

بچوں کا لباس تو خاص طور پر ان کی تعلیم و تربیت کی مناسبت سے تیار ہونا چاہیے جو نوجوان گرمی کے موسم میں ڈبل پائچوں کی پتلون اور بند گردن کی جیکٹ پھنسائے پھرتا ہے اس بیچارے کا تو لباس ہی اسے ہاتھ پاؤں ہلانے سے معذور کر دیتا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ بچوں میں آرزوئے برتری بلکہ تفاخر کی حوصلہ افزائی سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے میری مراد اس تفاخر سے نہیں جو قیمتی پوشاک پہننے کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ دوسرے ویسا لباس پہنے نظر نہ آئیں، بلکہ میری مراد اس تفاخر سے ہے جو ایک شخص اپنے سڈول اور ورزشی جسم کی آہنی مضبوطی کی بنا پر محسوس کرتا ہے ورزشی جسم بنانا ایسی چیز ہے جس کے لیے ہر شخص کوشش کرتا ہے۔

مرد کا جسم مردانہ ہونا چاہیے

ورزشی جسم آئندہ زندگی میں بھی کام آتا ہے نوجوان لڑکیاں آگے چل کر جن نوجوانوں کو اپنا دل دیں گی، انہیں بھی اس کی جسمانی تنومندی کے مشاہدہ کا موقع ملنا

چاہیے آج کل لباس پہننے کا ایسا احمقانہ رواج چل نکلا ہے جس کی بدولت جسم کے سڈول پن یوں پوشیدہ رہتا ہے کہ ہماری قوم کی ہزارہا لڑکیاں دو غلے یہودیوں کی بغل میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں حالانکہ ان کمبختوں کے بے ڈھنگے جسم کا تصور کیا جائے تو کراہت اور گھن محسوس ہوتی ہے قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جن کا جسم حسین ہے انہیں منظر عام پر لا لیا جائے تا کہ قوم کو عام طور پر خوبصورت اور مضبوط جسم بنانے کا خیال پیدا ہو۔

جبری عسکری تربیت مرد کو مرد بنا دیتی ہے

آج کل ہمارے ہاں جبری قومی تربیت ختم ہو چکی ہے یہ اسی نظام کی بدولت تھا کہ زمانہ امن میں ہمارے بچوں کو جسمانی تربیت میسر آجاتی تھی یوں ہمارے نظام تعلیم میں جسمانی تربیت کی جو کمی تھی وہ پوری ہو جاتی تھی۔ اندریں حالات میں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان پر عمل اور بھی ضروری ہو جاتا ہے ہمارے ہاں جبری قومی تربیت کا جو پرانا نظام رائج تھا وہ نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کی کامیابی صرف افراد کو تربیت یافتہ بنانے میں ظاہر نہ ہوئی بلکہ مرد اور عورت کے تعلقات پر بھی اس کا نہایت اچھا اثر ہوا تھا نوجوان لڑکیاں اپنا شوہر انتخاب کرنے میں فوجیوں کو غیر فوجیوں پر ترجیح دیتی تھیں قومی سرکار کو جسمانی تربیت کا انتظام صرف سکول کے زمانہ تک محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ ایسا اہتمام کرنا چاہیے کہ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی جبکہ نوجوانوں کے جسم ابھی نشوونما پا رہے ہوتے ہیں جسمانی تربیت جاری رکھی جائے نوجوانوں کی صحیح جسمانی نشوونما پر ہی ان کی آنے والی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔

نوجوانوں کو آوارہ نہ پھرنے دو

یہ تصور بالکل احمقانہ ہے کہ اسکول چھوڑنے کے بعد نوجوان شہریوں کی تربیت پر سرکار کی جانب سے قابو رکھنے کا اختیار دفعتاً ختم ہو جاتا ہے اور پھر یہ اختیار تبھی تازہ ہوتا ہے جب یہ شہری فوج میں بھرتی ہوں سرکار کا یہ اختیار در حقیقت ایک سرکاری فرض ہے اور یہ اختیار بغیر کسی وقفہ کے مسلسل استعمال ہونا چاہیے موجودہ سرکار تندرست اشخاص

پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہی اس لیے سرکار اپنا یہ فرض ادا کرنے میں مجرمانہ طور پر قاصر رہی ہے یہ سرکار ہمارے نوجوانوں کو سڑکوں پر آوارہ پھرنے اور رنڈیوں کے گھروں میں اپنی جوانی خراب کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتی ہے کیوں سرکار ان نوجوانوں کی باگیں نہیں کھینچ کر رکھتی کیوں ان کی جسمانی تربیت اور ریاضت اس وقت تک جاری نہیں رکھی جاتی جب تک کہ وہ نشوونما پا کر بالغ مرد یا عورتیں نہیں بن جاتیں۔

جسمانی ریاضت کا سبق ضروری ہے

فی الحال ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرکار کو جسمانی تربیت اور ریاضت جاری رکھنے کے لیے ضرور جبری تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے یا کوئی اور غیر فوجی انتظام کرنا چاہیے اصل بات یہ ہے کہ جبری جسمانی تربیت اور ریاضت کا کوئی انتظام کرنا چاہیے اور اس انتظام کے لیے جو مناسب ترین ممکن ہو اسے اختیار کرنا چاہیے اسکول چھوڑنے کے بعد نوجوانوں کی جسمانی تربیت اور ریاضت قومی سرکار کا ویسا ہی اہم سرکاری فرض ہے جیسا کہ بچوں کو دانشوری کی تعلیم دینا یہ تربیت دینے کا انتظام سرکاری اداروں کے ذریعہ لازمی ہے اسی جسمانی تربیت کا نقشہ بعد میں جبری فوجی تربیت کے انتظام سے حسب ضرورت علیحدہ بھی رکھا جا سکتا ہے اس صورت میں نوجوان رنگروٹوں کو ابتدائی ڈرل سکھانے کی مصیبت سے فوج کو نجات مل جائے گی فوج کو موجودہ قسم کے رنگروٹوں سے واسطہ نہ پڑے گا بلکہ فوج کے پاس وہ نوجوان جائیں گے جن کے جسم پہلے سے ابتدائی جسمانی ریاضت کی بدولت تربیت یافتہ بن چکے ہوں گے فوج کے ذمہ صرف یہ کام باقی رہ جائے گا کہ وہ ان گھٹے ہوئے جسم کے نوجوانوں کو فوجی سپاہیوں میں تبدیل کر دے۔

جسے حکم ماننا نہیں آتا اسے حکم دینا بھی نہیں آتا

تب قومی سرکار کی فوج کو یہ حاجت نہ ہو گی کہ وہ نوجوانوں کو سیدھا کھڑے ہونے اور ٹھیک طرح سے چلنے کا بھی سبق دیا کرے بلکہ فوج تو حب الوطنی کی تعلیم کی اعلیٰ ترین اور آخری درس گاہ ہو گی فوج میں نوجوان رنگروٹ کو نہ صرف یہ دکھایا جائے گا کہ اسے

ہتھیاروں کا استعمال کس طرح کرنا چاہیے بلکہ اسے آنے والی ذاتی زندگی میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل بھی بنایا جائے گا عسکری تربیت کا سب سے بڑا مقصد وہی ہونا چاہیے جو کبھی ہماری پرانی فوج کی سب سے بڑی خوبی ہوا کرتی تھی یعنی عسکری تربیت ایک نوجوان کو ایک مرد بنا دیتی تھی اسے نہ صرف حکم ماننے کا سبق دیا جاتا تھا بلکہ اسے وہ اصول بھی سکھائے جاتے تھے جن کے ماتحت وہ ایک روز حکم دینے کے قابل بن جائے اسے یہ سیکھنا پڑتا تھا کہ اسے اپنے افسروں کے سامنے صرف اسی وقت خاموش نہ رہنا چاہیے جب اسے جائز طور پر ڈانٹ ڈپٹ کی جا رہی ہو بلکہ افسر جب ناجائز سختی بھی کرے تو ماتحت کا فرض ہے کہ مودبانہ خاموشی اختیار کرے۔

علاوہ ازیں سپاہی کو اپنی قوت پر خود اعتمادی کا شعور، اور جماعت بندی کا احساس اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کا رکن ہے جسے شکست نہیں دی جا سکتی۔

جب سپاہی اپنی عسکری تربیت ختم کر لے تو اسے دو سرٹیفکیٹ ملنے چاہئیں ایک تو اس کے شہری ہونے کی سند ہو گی یہ وہ قانونی دستاویز ہو گی جس کے ماتحت اسے قومی معاملات میں حصہ لینے کا اختیار ہو گا دوسری سند اس کی جسمانی صحت کا تصدیق نامہ ہونا چاہیے جس کے بغیر اسے نکاح کرنے کے قابل نہ سمجھا جائے۔

لڑکیوں کو ایسی تعلیم دو کہ اچھی ماں بن سکیں

قومی سرکار لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے گی اس تعلیم و تربیت کے دوران میں قومی سرکار کو یہ اصول ملحوظ رہے گا کہ بچوں کو ایسی تعلیم دینی چاہیے جو بعد میں انہیں ان کے فرائض زندگی بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل بنائے یہاں پھر جسمانی تربیت اور ریاضت کو خاص اہمیت دی جائے گی روحانی اور ذہنی تربیت کی اہمیت کا درجہ اس کے بعد آئے گا لڑکیوں کی تعلیم میں یہ نصب العین ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انہیں ایک دن ماں بننا ہے۔

قومی سرکار کو چال چلن درست کرنے پر محض ثانوی توجہ دینی چاہیے چال چلن درست کرنے کے لیے اور کردار کی تعمیر کی خاطر، وہ تمام ذرائع اختیار کیے جائیں گے جو اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب ہوں۔

سعادت اور شقاوت پیدائشی ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ انفرادی کردار کی اصل بنیادیں تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی موجود ہوتی ہیں جو شخص جبلی طور پر خودغرض ہے وہ ہمیشہ بنیادی لحاظ سے خودغرض ہی رہے گا جو شخص اصول پرست ہے وہ ہمیشہ بنیادی لحاظ سے اصول پرست ہی رہے گا۔ جن لوگوں کا کردار شروع سے ہی واضح ہوتا ہے ان کے علاوہ لکھا کھا افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا کردار مبہم اور غیر معین ہوتا ہے جو شخص پیدا ہی خطا کار ہوا ہے، وہ ہمیشہ خطا کار ہی رہے گا کئی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں جرم کے ارتکاب کا میلان پایا جاتا ہے لیکن اگر ان کی سخت اور صحیح تربیت کی جائے تو وہ قوم کے اچھے رکن بن سکتے ہیں برعکس اس کے کئی کمزور اور مذبذب کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو نظام تعلیم کی خرابی کے باعث بد بن جاتے ہیں۔

بچوں کو اپنے راز سینہ میں محفوظ رکھنے سکھاؤ

جنگ کے دوران میں اس بات پر بڑا واویلا کیا جاتا تھا کہ ہماری قوم ایسی منہ پھٹ واقع ہوئی ہے کہ ہم اپنے راز کی حفاظت نہیں کر سکتے اس کمزوری کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے اہم ترین راز بھی دشمن سے محفوظ نہ رکھے جاسکتے تھے یہاں میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں جرمن قوم کے نظام تعلیم نے جنگ سے پہلے جرمنوں کو رازداری کی کیا تربیت دی تھی؟ کیا اسکول کے دنوں میں اکثر ایسا نہ ہوتا تھا کہ کسی ننھے چغلخور کو اس کے ان ساتھیوں پر ترجیح دی جاتی تھی جو اپنے لب نہ کھولتے تھے کیا یہ سچ نہیں کہ آج کی طرح تب بھی دوسروں کے خلاف شکایتیں کرنے والوں کو ''صاف گو'' سمجھا جاتا تھا اور جب چپ رہ کر بدلہ لینے کی کوشش کرے اسے ''ضدی'' کہتے تھے کیا کبھی یہ سکھانے کی کوشش

کی گئی کہ راز داری ایک قابل قدر مردانہ خصلت ہے ہرگز نہیں وجہ یہ تھی کہ یہ باتیں ہمارے تعلیم دینے والوں کی نگاہ میں بے حقیقت تھیں لیکن یہ انہیں بے حقیقت باتوں کا نتیجہ تھا کہ ہماری سرکار کو کروڑہا روپیہ قانونی مصارف پر خرچ کرنا پڑا۔ ہتک عزت اور اس قسم کے دوسرے مقدمات میں سے نوے فیصدی جھگڑے دراصل راز داری کی اہلیت نہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں کئی باتیں جو ذمہ داری کے احساس کے بغیر منہ سے نکل جاتی ہیں انہیں ایک دوسرے کے پاس لاپروائی سے دہرایا جاتا ہے ہماری اقتصادی فلاح و بہبود کو بھی بارہا اس عادت سے یوں نقصان پہنچتا ہے کہ مال تیار کرنے کے طریقے اسی طرح دوسروں پر کھول دیئے جاتے ہیں ہماری قومی دفاع کے لیے جو خفیہ تیاریاں کی جاتی ہیں وہ اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں کہ ہماری قوم کو خاموش رہنے کی تمیز نہیں۔ ہر شخص جو کچھ سنتا ہے اسے کسی دوسرے کے سامنے دوہرا دیتا ہے جنگ کے زمانہ میں اس باتونی پن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑائیوں میں شکست ہو جاتی ہے ایک ایک لڑائی میں شکست کا ایک پوری مہم میں کامیابی یا ناکامی کا اثر پڑتا ہے۔

بچوں کو چغل خور نہ بناؤ

یہاں یہ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جو کچھ بچپن میں سکھایا نہیں جاتا، وہ بڑے ہو کر نہیں کروایا جا سکتا۔ ایک استاد کو ہرگز بچوں کی شرارتیں دریافت کرنے کے لیے چغل خوری کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہیے ننھے بچوں کی بجائے خود ایک سرکار ہوتی ہے بڑی عمر کے لوگوں کا سامنا کرتے وقت ان کے اندر ایک قسم کا اجتماعی اتحاد پایا جاتا ہے یہ ایک قدرتی عادت ہے دس سال کی عمر کے بچوں کا جو باہمی اتحاد ہو سکتا ہے وہ بڑی عمر کے آدمیوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ جو بچہ اپنے ساتھیوں کی چغل خوری کرتا ہے وہ غداری کا مرتکب ہوتا ہے اس کے کردار کا یہ میلان اگر یوں ہی نشوونما پاتا رہا تو سچی بات یہ ہے کہ وہ بڑا ہو کر غدار ہی بنے گا ایسے لڑکوں کو ''اچھے میاں'' اور ''سچے میاں'' وغیرہ وغیرہ کا نام دے کر اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہیے اس کے کردار میں تو مجرمانہ خامی

دکھائی دے رہی ہے ممکن ہے استاد صاحب کے لیے یہ امر باعث سہولت ہو کہ وہ اپنا کام خود انجام دینے کی بجائے شاگردوں کو اس قسم کی نازیبا خصلتوں سے فائدہ اٹھائیں لیکن ان کا یہ طریق کار بچوں میں ایسی اخلاقی عادتیں پیدا کر دے گا جو ایک دن مہلک نتائج کا باعث ہوں گی ایسا اکثر ہوتا آیا ہے کہ بچپن کا ننھا چغل خور بڑا ہو کر ایک زبردست لچا ثابت ہوتا ہے۔

بچوں کو چوٹ کھانے اور دکھ سہنے کی تربیت دو

بہت سی مثالوں میں سے یہ تو ابھی میں نے ایک ہی مثال پیش کی ہے ہمارے اسکولوں میں آج کل اچھی اور شریفانہ خصلتوں کی جان بوجھ کر تربیت دینے کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے مستقبل میں ہمارے تعلیمی نظام کے اس پہلو پر زیادہ زور دینا ہوگا وفاداری، ایثار اور مصلحت اندیشی ایسی خوبیاں ہیں جو ہر عظیم المرتبت قوم کے افراد میں پائی جانی چاہئیں اسکول کے اندر تعلیم کے دوران میں یہ خوبیاں طالب علموں میں پیدا کرنا اور ان کی مسلسل نشوونما کا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔آج کل ہمارے نصاب تعلیم میں کئی ایسی امور بھی شامل ہیں جو اتنے ضروری نہیں بچوں کو یہ تربیت بھی ملنی چاہیے کہ جب انہیں چوٹ لگے یا دکھ پہنچے تو وہ شکایت کرنے نہ دوڑیں ذرا ذرا سی تکلیف پر منہ بسورنا نہ شروع کر دیں واویلا مچانے کی بجائے اپنے دردوں کا علاج خود کرنا سیکھیں اگر نظام تعلیم بچے کو چھوٹی ہی عمر میں چوٹ اور دکھ سہارنے کی تربیت نہیں دیتا تو بڑے ہو کر نتیجہ یہی نکلے گا کہ جب سپاہیوں کو خندق میں رہنا پڑے گا تو ڈاک میں گھر جانے والے سارے خطوط آہ وزاری اور شکوہ وشکایت سے پر ہوں گے اگر اسکول کی تعلیم کے دوران میں ہمارے بچوں کے ذہن میں علم ذرا کم ٹھونسا جاتا اور اس کی جگہ انہیں ضبط نفس کی زیادہ تربیت دی جاتی تو 1914ء سے لے کر 1918ء تک جب ہماری قوم جنگ کر رہی تھی تو یہ نوجوان زیادہ کارآمد ثابت ہوتے۔

قومی سرکار کے نظام تعلیم میں جسمانی تربیت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ کردار کی

تعمیر کو زیادہ اہمیت دی جائے گی آج ہمارے قومی معاشرہ میں کئی نقائص ایسے پائے جاتے ہیں جو ٹھیک نظام تعلیم کے ذریعہ اگر بالکل رفع نہیں کیے جا سکتے تو کم ضرور کیے جا سکتے ہیں۔

بچوں کو عزم کی پختگی کا سبق سکھانا چاہیے

قوت ارادی کی تربیت، قوت فیصلہ کو مضبوط بنانے اور ذمہ داری قبول کرنے کی عادت کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔

ہماری پرانی فوج کی تربیت کے دوران میں ایک اصول رائج تھا کہ کوئی حکم نہ دینے کی نسبت یہ بہتر ہے کہ افسر غلط حکم ہی دے دے ہمارے بچوں کو اسی اصول کے ماتحت یہ تربیت دینی چاہیے کہ جب ان سے کوئی سوال پوچھا جائے تو جہالت سے چپ رہنے کی بجائے یہ بہتر ہے کہ غلط جواب ہی دے دیں جواب غلط ہو جانے کے ڈر سے جواب دینے میں ہچکچانا غلط جواب دینے سے زیادہ باعث ذلت ہے اگر ہمارے نوجوانوں کو یہ سادہ اور فطری اصول سکھا دیئے جائیں تو پھر وہ نا مساعد حالات میں بھی قوم عمل سے محروم نہ رہیں گے۔

بچوں میں قوت فیصلہ پیدا کرو

اکثر ماتم کیا جاتا ہے کہ ماہ نومبر و ماہ دسمبر 1918ء کے دوران میں جرمنی کے تمام سرکاری حکام اپنی قوت فیصلہ کھو بیٹھے تھے قیصر جرمنی سے لے کر فوجوں کے ڈویژن کمانڈر تک ہر شخص کی قوت فیصلہ یوں مفلوج ہو چکی تھی کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داری پر کوئی فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ تھا یہ ایک خوفناک واقعہ تھا اور اس ایک واقعہ سے ہمارے نظام تعلیم کی خامی ہولناک طور پر ثابت ہو جاتی ہے اس بربادی کے زمانہ میں ہمارے قومی کردار کی جو کمزوریاں بڑے پیمانے پر ظاہر ہوئیں وہ چھوٹے پیمانے پر روزمرہ کی زندگی میں بھی ہمیں نقصان پہنچاتی رہتی ہیں آج اگر ہماری قوم دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے ناقابل ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ

ہمارے اندر دشمن کے مقابلہ کرنے کے لیےقوت ارادی کی کمی ہے ہماری قوم میں یہ نقص ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ جب کوئی ایسا فیصلہ کرنے کی نوبت آتی ہے جس میں خطرہ کا امکان ہوتو فیصلہ سے گریز کیا جاتا ہے حالانکہ خطرہ کا امکان قبول کیے بغیر دنیا کا کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا ایک جرمن جرنیل نے اپنا ایک اصول بیان کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر خود ہی اپنی قوت فیصلہ کی المناک کوتاہی کا اعتراف کرلیا تھا اس نے کہا ”مجھے جب تک اکیاون فیصدی کامیابی کا یقین نہیں ہوجاتا تب تک میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا“ یہ ”اکیاون فیصدی کامیابی کا امکان“ ہی آج جرمنوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے جو شخص اپنی کامیابی کے لیے قدرت سے ضمانت حاصل کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا، وہ شجاعت کے تمام کارناموں کی بنیاد ہی کا منکر ہے شجاعت کی تو بنیاد ہی یہی ہے کہ جب کوئی شجاعانہ کارنامہ انجام دیا جائے تو صورت حالات میں جان کا خطرہ بھی لاحق ہو مرد شجاع وہی ہے جو جان پر کھیل کر کامیابی کی جانب بڑھتا ہے اگر ایک سرطان کا مریض یہ جانتے ہوئے کہ اس کی موت یقینی ہے آپریشن کرانے چلا جاتا ہے تو اس میں دلیری کی کونسی بات ہے ہاں اگر آپریشن میں کامیابی کا امکان صرف ایک فیصدی ہے، اور پھر بھی کوئی ڈاکٹر حوصلہ کرکے آپریشن کا ذمہ اٹھالیتا ہے تو یقیناً یہ شجاعانہ کارنامہ ہے اگر ایسا آپریشن ناکام بھی ہوجائے تو ڈاکٹر سے شکایت کا موقعہ نہیں۔

بچوں کو ذمہ داری قبول کرنے کے اہل بناؤ

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ قوت ارادی سے بزدلانہ محرومی، اور قوت فیصلہ کا فقدان، دراصل ہمارے نوجوانوں کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہیں اس محرومی اور فقدان کے تباہ کن نتائج آج ہماری قوم میں ہر جگہ ظاہر ہو رہے ہیں اس تباہی کی بدترین مثال ہمارے سیاسی مدبرین کی بزدلی ہے جس کا مظاہرہ وہ ملکی مسائل کے حل میں ناکامی سے کرتے ہیں۔

آج ہماری قوم میں ہر شخص ذمہ داری قبول کرنے سے جس طرح بھاگتا ہے وہ بھی

اسی سبب کا نتیجہ ہے سبب وہی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو صحیح تعلیم نہیں دیتے اس غلطی کی بدترین مثال ہمارے سرکاری محکمے پیش کرتے ہیں سرکار کا پارلیمنٹری نظام تو گویا ان خرابیوں کا شاہکار ہے۔

بچوں کو دین کے سادہ اصول سکھاؤ، الجھنوں میں مبتلا نہ کرو

بدقسمتی سے ہمارے سکولوں میں ہمارے بچوں کو کیتھولک مذہب کے اس قسم کے ثقیل اصول سکھانے پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ ان ننھے بچوں کو ''اقرار گناہ'' اور ''توبۃ النصوح'' اور ''وقت کاملہ'' کے سبق سیکھنے چاہئیں برعکس اس کے کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ ان ننھے گناہگاروں کو دو چار سادہ اور کھلی کھلی باتیں سمجھا دی جائیں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ آج کل کے ماہرین تعلیم کے نزدیک بچوں سے کھلی باتیں کرنا بداخلاقی اور پاجی پن سمجھا جاتا ہے آپ کو یقین تو نہ آئے گا لیکن کئی بچوں کی ذرا سی آزادہ روی دکھانے پر انہیں یہ کہہ کر دھمکایا جاتا ہے کہ ''کمبخت تو ایک دن پھانسی پائے گا پھانسی!'' کسی کو خیال نہیں آتا کہ اس معصوم کی یہ آزادہ روی ساری قوم کے لیے انمول دولت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

میدان جنگ کی کامیابی مکتب کی تربیت کا محتاج ہے

ایک دن آنے والا ہے جب قومی سرکار بچوں کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کی تربیت کا انتظام کرنے پر مجبور ہو گی اس طرح بچوں کے دل میں لڑکپن سے ہی ذمہ داری قبول کرنے اور صاف گوئی اور دلیری سے جو کچھ کیا ہے اس کا اعتراف کرنے کی عادت بھی پیدا کی جائے گی اگر قومی سرکار کو اس ضرورت کا احساس ہو جائے تو ایک سو سال تک اس نہج پر بچوں کو تعلیم دینے کے بعد ایک ایسی قوم بن جائے گی جسے کبھی اس قسم کی شکست نہ دی جا سکے گی جیسی شکست نے آج ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

تعلیم کو آسان بناؤ

آج کل ہمارے نظام تعلیم کا بڑا کام بچوں کو رسمی علوم سکھانا ہے قومی سرکار اس رسمی

تعلیم میں صرف چند ہی تبدیلیاں کرے گی یہ تبدیلیاں تین قسم کی ہوں گی

پہلی تبدیلی تو یہ ہوگی کہ ننھے بچوں کے دماغ پر ایسے مضامین کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے جن میں سے پچانوے فیصدی فضول ہوتے ہیں اس لیے بچے ان کو بھول بھی جاتے ہیں ابتدائی اور ثانوی مدارس کا نصاب تعلیم آج کل ایک عجیب معجون مرکب ہے بعض مضامین کا نصاب اتنا وسیع کر دیا ہے کہ بعد میں اس کا بہت کم حصہ یاد رہ جاتا ہے۔

کارآمد علم سکھاؤ

سچی بات تو یہ ہے کہ جتنا علم بچوں کے ذہنوں میں ٹھونسا جاتا ہے اس کا بہت کم حصہ بعد میں کار آمد آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ اتنا نا کافی ہوتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم اپنی روزی کمانے کے لیے کسی ہنر میں خاص قابلیت حاصل کرنا چاہے تو یہ تعلیم اسے اس قابل بھی نہیں بناتی مثال کے طور پر ایک اوسط سرکاری ملازم کو لیجئے جو ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کر کے گیا ہے اور اس سے پوچھئے کہ میاں! اب تیس یا چالیس سال کی عمر میں تمہیں اس علم کا کتنا حصہ یاد ہے جو اتنی مشقت سے تمہارے اندر ٹھونسا گیا تھا اور جس کی خاطر تم نے ایسے ایسے دکھ اٹھائے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب یہ ہوگا کہ ”ہمیں جو کچھ پڑھایا گیا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ طالب علموں کو ایسا علم مہیا کیا جائے جس سے وہ بعد کی زندگی میں کوئی کام لے سکیں بلکہ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ قوت فہم قوت حافظہ اور بالخصوص قوائے فکر کی نشوونما اور تربیت ہو جائے“ یہ جواب ایک حد تک ٹھیک ہے باوجود اس کے ایک بچہ کے ذہن پر ایسے علم کا ایک طوفان نازل کر دینا ذرا خطرناک ہے جس پر قابو رکھنا اس کی طاقت سے باہر ہو نہ ہی اس علم کی مختلف اقسام کو وہ طالب جدا جدا شناخت کر سکتا ہے نہ ان کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے بالعموم اس علم کا ضروری حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اور غیر ضروری حصہ ذہن میں اٹک کر رہ جاتا ہے اس طرح وسیع نصاب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے تعلیم کا مقصد یہ تو نہیں کہ ذہن پر بے اندازہ مضامین کا ایک بوجھ لاد دیا جائے تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ ایک شخص کو ایسا علم فراہم

کر دیا جائے جو بعد کی زندگی میں اس کے کام آئے یا جسے وہ قوم کے فائدہ کے لیے استعمال کر سکے یہ مقصد مضامین کی فراوانی سے فوت ہو جاتا ہے اگر بہت سے مضامین ایک بچہ کے ذہن میں ٹھونس دیئے جائیں، جن میں سے اکثر وہ یاد نہیں رکھ سکتا، یا جن کا ضروری حصہ وہ اپنی بعد کی زندگی میں بھول جائے گا تو اس کا کیا فائدہ کیا ہے۔

فضول زبانیں سکھانا بیکار ہے

کیا وجہ ہے کہ لاکھوں لوگ اسکول کی تعلیم کے دوران میں دو یا تین زبانیں سیکھیں جبکہ اپنی آنے والی زندگی میں انہیں ان زبانوں کے استعمال کا کوئی موقع نہیں ملے گا، اور اس لیے ان میں سے اکثر انہیں بھول جائیں گے مثال کے طور پر ایک لاکھ طالب علم فرانسیسی پڑھتے ہیں ان میں سے بمشکل دو ہزار اپنی بعد کی زندگی میں اپنی اس قابلیت کا استعمال کر سکتے ہیں باقی اٹھانوے ہزار نے جو کچھ بچپن میں سیکھا تھا، اسے استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی ان سب نے جو ہزارہا گھنٹے صرف کر کے یہ زبان سیکھی تھی، وہ سب اکارت گئے یا نہیں یہ کہنا کہ اس قسم کی تعلیم سے بچے کے ذہن کی نشوونما ہوتی ہے اگر چہ یہ سب بچے بعد میں اپنے اس علم کا کوئی استعمال کر سکتے تو پھر اس دلیل میں کوئی وزن بھی ہوتا۔ بحالت موجودہ اٹھانوے ہزار بچوں کا قیمتی وقت ضائع کیا جاتا ہے ان کا لہو پسینہ ایک کیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ ان دو ہزار کو پہنچتا ہے جنہوں نے بعد میں اس زبان کو استعمال کرنا ہے۔

زبان سکھانے کے اصول

میں نے جس زبان کو بطور مثال پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تعلیم سے بچوں کے ذہن میں منطقی استدلال کی استعداد پختہ ہوتی ہے، یا ان کی تیزی ذہن میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر لاطینی زبان کی تعلیم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اندریں حالات یہ بہتر ہو اگر نوجوان طالب علموں کو ایسی غیر زبانوں کے صرف عام تصور سے آشنا کرا دیا جائے یا بہتر تو یہ ہو کہ فقط زبان کے مخصوص

مزاج سے روشناس کرا دیا جائے مخصوص مزاج سے آشنائی کا مطلب یہ ہے کہ زبان کی خصوصیات سے آگاہ کر دیا جائے اس کی گرامر کے ابتدائی اصول سکھا دیئے جائیں یا اس کے تلفظ، اسلوب تحریر اور نحو وغیرہ کے متعلق موٹی موٹی ابتدائی باتیں بتا دی جائیں اوسط طالب علموں کے لیے اتنی تعلیم کافی ہوگی اس سے اس زبان کے متعلق ان کا تصور بھی زیادہ واضح ہو جائے گا اس لیے اتنا علم انہیں یاد بھی رہ سکے گا عملی طور پر بھی ایسا علم زیادہ مفید ہوگا آج کل بچوں کے ذہن میں کئی زبانوں کا تفصیلی علم ٹھونسنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کی نسبت یہ سرسری علم زیادہ بہتر ہوگا تفصیلی علم اول تو بچے سیکھ ہی نہیں سکتے، یا پھر جلد ہی بھول جاتے ہیں، اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو پھر یہ خطرہ بھی نہ رہے گا کہ بہت سا علم سکھانے کے باعث ضروری حصے بھول کر صرف غیر ضروری حصے یاد رہ جائیں جب بچہ صرف مفید علم سیکھے گا تو بھول جانے والے حصے کا انتخاب اس کے اپنے حافظہ کے رحم و کرم پر نہ ہوگا بلکہ جو کچھ اسے بھولنا تھا وہ پہلے اسے پڑھایا ہی نہیں جائے گا۔

اکثر طالب علموں کے لیے کسی زبان کی مبادیات کا سیکھنا اور سمجھنا ہی ان کی آنے والی زندگی کے لیے کافی ہوگا جن لوگوں کو بعد میں اس زبان کی واقعی ضرورت ہوگی ان کے لیے یہ مبادیات کا علم ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوگا اس زینے پر کھڑے ہو کر وہ آئندہ سیڑھیاں چڑھنے اور زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنے کے منصوبے بنا سکیں گے۔

اس قسم کا نصاب تعلیم وضع کرنے سے جسمانی ریاضت کے لیے وقت بچایا جا سکے گا مزید بریں جن دوسرے تعلیمی لوازمات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، ان کا زیادہ توجہ سے مطالعہ کرنے کا بھی وقت مل جائے گا۔

علم تاریخ پڑھنے کے اصول

ایک اور اصلاح نہایت ضروری ہے اس کا تعلق علم تاریخ پڑھانے سے ہے شاید دنیا کی کوئی دوسری قوم اتنا علم تاریخ نہیں پڑھتی جتنا کہ یہ علم جرمنوں کو رٹایا جاتا ہے اور شاید دنیا کی کسی دوسری قوم پر تاریخ کے مطالعہ کا اتنا برا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس علم نے ہمارا

ستیاناس کر دیا ہے اگر موجودہ زمانہ کی سیاسیات آنے والی تاریخ کا پیش خیمہ ہے تو ہماری ملکی سیاسیات کی موجودہ حالت ہمارے ہاں تاریخ کی تعلیم کی مذمت کے لیے کافی ہے ہماری موجودہ سیاسی نالائقی کا ماتم کرنے کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک ہم اپنی قوم کو بہتر سیاسی تعلیم دینے کا ارادہ نہیں کر لیتے ہمارے ہاں ننانوے فیصدی تاریخ کی تعلیم کا انتظام قابل افسوس ہے بالعموم صرف چند تاریخیں یاد رہ جاتی ہیں کچھ سالہائے پیدائش اور کچھ نام یہ ہے ہمارا سرمایہ تاریخ، تاریخ کا ارتقاء جن بنیادی اصولوں اور واضح اصولوں پر ہوا اس سے ہم بالکل جاہل ہیں تاریخ کے وہ بنیادی نقوش جو دراصل اہمیت رکھتے ہیں سکھائے ہی نہیں جاتے بچوں کے سامنے تاریخوں اور واقعات کی تقدیم وتاخیر کا ایک ڈھیر لگا کر، یہ بات ان کی اپنی ذہانت یا کند ذہنی پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ پتہ چلائیں کہ آخر ان بہت سے واقعات کے مابین ربط اور رشتہ کیا تھا۔اور وہ کیا طاقتیں تھیں جنہوں نے یہ مختلف واقعات کو جنم دیا۔

ہمارے لیڈر علم سے کورے ہیں

ممکن ہے آپ کو میری یہ سچی باتیں پسند نہ آئیں اگر آپ کو پسند نہ آئیں تو آپ دل بھر کر اعتراض کر لیجئے لیکن ہماری پارلیمنٹ میں نمائندگی قوم جو تقریریں کرتے ہیں ایک ہی اجلاس کے دوران میں ذرا ان کا مطالعہ کیجئے تو جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا ثبوت آپ کو مل جائے گا سیاسی مسائل اور بالخصوص خارجہ پالیسی کے متعلق ان بزرگوں کی تقریریں ضرور ملاحظہ کیجئے یاد رکھئے یہ حضرات جرمن قوم کے سربرآوردہ ہونے کے مدعی ہیں کم ازکم ان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ہمارے ثانوی اعلیٰ اسکولوں میں تعلیم پا چکے ہیں ان میں سے کئی یونیورسٹیوں سے بھی فارغ التحصیل ہیں ان تقاریر کے مطالعہ کے بعد آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ان کا تاریخی علم کیسا ناقص ہے اگر یہ حضرات تاریخ کا مطالعہ نہ کرتے لیکن سیاسی مسائل سمجھنے کی طبعی استعداد سے بہرہ ور ہوتے تو شاید نتیجہ ان کے حق میں بہتر ہوتا تب یہ لوگ قوم کے لیے بھی مفید ثابت ہوتے۔

تاریخ کا نصاب دوبارہ مرتب ہونا چاہیے

تاریخ کے متعلق ہمارا نصاب تعلیم مختصر کرنے کی ضرورت ہے تاریخ کی تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تاریخی ارتقاء کے اصولوں کا علم ہو جائے ہمارے نظام تعلیم میں تاریخ کا نصاب محض اس مقصد تک محدود ہو جانا چاہیے ایسا ہو گیا تو اس سے ہر طالب علم کو فائدہ ہو گا طالب علموں کے ذریعہ یہ تبدیلی قوم کے لیے بھی مفید ثابت ہو گی تاریخ صرف اس لیے نہیں پڑھی جاتی کہ گزرے ہوئے واقعات کا علم حاصل کیا جائے ، بلکہ مطالعہ تاریخ کا فائدہ یہ ہے کہ مستقبل کے لیے راہنمائی حاصل کی جائے ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہماری قوم کے تحفظ کے لیے کون سی پالیسی اختیار کرنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے یہ ہے اصل مقصد تاریخ کی تعلیم محض اس مقصد تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کے ماتحت مقصد تو فراموش ہو چکا ہے، اور ہم محض حصول مقصد کے ذرائع میں الجھ کر رہ گئے ہیں اصل نصب العین تو کب کا فراموش ہو چکا ہے یہ جواب کوئی جواب نہیں کہ تاریخ کے گہرے مطالعہ کے لیے یہ علم لازمی ہے کہ مختلف واقعات کب وقوع پذیر ہوئے تھے ورنہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلے گا کہ تاریخی ارتقاء کی موٹی موٹی منزلیں کیا تھیں تاریخی ارتقاء کی منزلیں معین کرنا، پیشہ ور مورخین کا کام ہے ایک اوسط درجہ کا آدمی تاریخ کا پروفیسر نہیں ہوتا ایسے آدمی کے لیے تاریخ پڑھنے کا ایک ہی مقصد ہے وہ مقصد یہ ہے کہ اسے تاریخ کا اتنا علم حاصل ہو جائے جس سے وہ اپنے ملک کے سیاسی مسائل کے متعلق آزادانہ رائے قائم کر سکے جو شخص تاریخ کا پروفیسر بننا چاہتا ہے، وہ بعد میں تفصیلات کا مطالعہ کر سکتا ہے وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات کی بھی تحقیق کرتا رہے تو کوئی ہرج نہیں ہمارے ہاں تاریخ کی موجودہ تعلیم اس لحاظ سے بالکل ناقص ہے اوسط طالب علم کے لیے اس کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع ہے، اور ماہرین تاریخ کی ضرورت کے لحاظ سے اس کا دائرہ بہت تنگ ہے۔

قومی سرکار کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی تاریخ عالم مرتب کرے جس میں

نسلی مسئلہ کو نمایاں رکھا جائے۔

نظام تعلیم کا ایک عملی خاکہ

جو دلائل میں نے اوپر پیش کی ہیں، ان کا اختصار یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ قومی سرکار کے لیے ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس طرح سے بدلنا لازمی ہے کہ صرف ضروری مضامین کی تعلیم دی جائے اس کے بعد مختلف مضامین میں اعلی تعلیم کا علیحدہ اہتمام کیا جا سکتا ہے جو لوگ کسی مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل کرنا چاہیں وہ یہ مزید تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اوسط طالب علم کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مختلف مضامین کے ابتدائی لوازمات سے آگاہ ہو جائے اس ابتدائی تعلیم میں ضروری مضامین کا لب لباب شامل ہو گا جس مضمون کو وہ اپنی بعد کی زندگی میں کام کرنے کے لیے خاص طور پر اختیار کرنا چاہے، صرف اس کا مطالعہ تفصیلی طور پر کیا جا سکتا ہے تمام مضامین سے عام واقفیت کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے لیکن کسی مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل کرنا متعلقہ طالب علم کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس طرح تعلیم کا نصاب مختصر ہو جائے گا اسکول میں کوئی گھنٹے بچ جائیں گے ان گھنٹوں میں جسمانی تربیت و ریاضت اور کردار کی تعمیر کا اہتمام کیا جا سکتا ہے کردار کی تعمیر میں قوت ارادی قوت فیصلہ اور قوت عمل کی نشو ونما ہو گی۔

علم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سکھاؤ

آج کل ہمارے ہاں اسکول کی تعلیم میں حتیٰ کہ ثانوی مدارس میں بھی اس بات کا کچھ خیال نہیں رکھا جاتا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی نے کیا پیشہ اختیار کرنا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک ہی پیشہ اختیار کرنیوالے لوگ تین مختلف اقسام کے اسکولوں میں تعلیم پا کر آتے ہیں اسکولوں میں عام تعلیم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، کسی مضمون میں خصوصی امتیاز کا اہتمام نہیں ثانوی اسکولوں میں بھی کسی مضمون کے اندر خصوصی امتیاز حاصل کرنے کا امتیاز نہیں قومی سرکار اس قسم کے مذبذب نظام تعلیم کو بدل دے گی۔

ثقافتی تعلیم کی بنیاد اور سائنس کی بجائے تاریخ پر ہونی چاہیے

قومی سرکار نصاب تعلیم میں دوسری تبدیلی حسب ذیل کرے گی

ہمارے مادہ پرست زمانہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم واقعاتی اور عملی مسائل پر بہت زیادہ زور دیتی ہے مثال کے طور پر عملی ریاضیات، عملی طبیعات، عملی کیمیا وغیرہ وغیرہ اس میں شک نہیں کہ یہ مضامین ایک ایسے زمانہ میں ضروری ہیں جب صنعتی ہنرمندی اور صنعتی کیمیا دانی کو زبردست اہمیت حاصل ہو چکی ہے اور جبکہ ہماری روزمرہ زندگی ہر قدم پر ان دونوں مضامین کے عملی مظاہروں سے وابستہ نظر آتی ہے لیکن کسی قوم کی ثقافت کی بنیاد فقط ان دو مضامین کے علم پر رکھنا خطرناک ہے ثقافت کی بنیاد تو ہمیشہ اصول پرستی پر رکھی جانی چاہیے اور اس کا منتہا اعلیٰ مقاصد ہونے چاہئیں ثقافت کی بنیاد، انسان کو ضبط و نظم کا پابند کرنے کے لیے رکھی جاتی ہے اس کا مقصد وہ بنیادیں فراہم کرنا ہے جن پر مختلف علوم و فنون کی خصوصی تعلیم کی عمارت آئندہ کھڑی کی جا سکے اگر یہ بنیادیں قائم نہ کی جائیں تو ہم ان قوتوں کو ضائع کر دیں گے جو کسی قوم کے تحفظ کے لیے ہنرمندی اور کاروانی کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہیں تاریخ کے شعبہ میں قدیم تاریخ کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ کے موٹے موٹے خدوخال نہ صرف اپنے زمانہ کی تاریخ کا بہترین سبق دیتے ہیں بلکہ مستقبل کے لیے بھی موثر ترین رہنمائی کرتے ہیں۔ یونان کی ثقافت کے اصول ہمیں زندگی کے ہر پہلو کے حسن سے آگاہ کرنے کے لیے حیرت انگیز تاثیر رکھتے ہیں یہ درست ہے کہ مختلف ملتوں میں بڑا فرق ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ہی نسل سے وابستہ ہونے کے باعث مختلف ملتوں میں بلند پیمانے پر جو یک جہتی اور اتحاد پایا جاتا ہے ہم اسے نظر انداز کر دیں ہمارے زمانہ میں جو کشمکش جاری ہے اس کے مقاصد نہایت عظیم ہیں ایک تہذیب اپنے تحفظ و بقا کے لیے جنگ لڑ رہی ہے یہ وہ تہذیب ہے جو ہزارہا سال کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے یونان اور جرمنی دونوں اسی ایک تہذیب کی اولاد ہیں۔

ثقافت کی بنیاد بلند مقاصد پر ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص علم پر

عام ثقافت اور علم کے خصوصی شعبوں کے مابین واضح امتیاز قائم رکھنا چاہیے آج کل حال یہ ہے کہ علوم وفنون کے خصوصی شعبے روز بروز لکشمی دیوی کے غلام بنتے جارہے ہیں اس رجحان کا توازن بحال کرنے کے لیے ثقافت کے عمومی اصولوں کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے کم ازکم عمومی ثقافت کے وہ اصول تو ضرور برقرار رکھنے چاہئیں جو بلند مقاصد کی تلقین کرتے ہیں اس حقیقت پر بار بار زور دینا چاہیے کہ ہنر مندی، تجارت اور سوداگری کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب قوم باقی رہے قوم خیالات کی یکجہتی سے متحد رہتی ہے خیالات کی یکجہتی اعلیٰ اصولوں اور بلند مقاصد کے اتحاد پر مبنی ہے اس لیے بغیر اعلیٰ اصولوں کے اور بلند نصب العین کے ہنر مندی، تجارت اور سوداگری کی ترقی بھی ناممکن ہے یہ ترقی مادہ پرستی اور خودغرضی کی فضا میں ممکن نہیں بلکہ ایسی ترقی تو دوسرے ہم قوموں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو قربان کردینے اور ایثار سے کام لینے سے ہی ممکن ہے۔

قوم کا مرکز عقیدت سرکار یا قیادت نہیں بن سکتی

آج کل جو نظام تعلیم رائج ہے اس کا سب سے بڑا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ طالب علموں کے اندر وہ علم ٹھونس دیا جائے جس سے وہ دنیا میں اپنا گزارہ چلا سکیں اس اصول کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ" نوجوانوں کو ایک روز معاشرہ کا کارآمد رکن بننا چاہیے" لیکن کارآمد رکن کا مطلب صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ جائز طریقہ سے روزی کما سکے شہری فرائض کی تربیت نہایت سطحی طور پر دی جاتی ہے یہ تربیت بھی ضمنی ہوتی ہے نہ کہ اصل مقصود مزید بریں اس تربیت کی بنیادیں بڑی ناقص ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکار بجائے خود محض ایک صورت کا نام ہے لوگوں کو یہ تربیت دینا مشکل ہے کہ وہ سرکار کی صورت ہی کو اپنا مقصد بنالیں، اس صورت کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو اس صورت کے سامنے جواب دہ تصور کریں صورت کے ٹوٹنے میں کون سی دیر لگتی ہے

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، آج کل لوگوں کے ذہن میں سرکار کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہی باقی نہیں رہا ان حالات میں سوائے ''حب الوطنی'' کی رسمی تلقین کے سرکار کے اور کچھ معنی ہی باقی نہیں رہے قدیم جرمنی میں چھوٹے سے چھوٹے نوابوں کے ظل اللہ ہونے پر بڑا زور دیا جاتا تھا یہ ظل اللہیت کا پردہ کبھی ہوشیاری سے نہ تانا گیا بلکہ اکثر نہایت بھونڈے پن سے کھڑا کیا جاتا تھا چونکہ ان نوابوں اور رئیسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے ان حقیقی عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات مکمل طور پر پیش کرنے کا کوئی امکان نہ تھا جو دراصل جرمن قوم کی تاریخ کے لیے زیب و زینت ہیں نتیجہ یہ تھا کہ عام خلقت کو جرمنی کی تاریخ کا جو علم تھا وہ نہایت ناکافی تھا وجہ یہ تھی کہ تاریخی ارتقا کے بنیادی اصول واضح نہ کیے جاتے تھے۔

مرکز عقیدت اکابرین امت کو بنانا چاہیے

ظاہر ہے کہ اس طرح قوم پرستی کا کوئی حقیقی جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا ہمارا تعلیمی نظام کیوں نہ کر سکا کہ عوام الناس کے ہجوم میں سے چند تاریخی شخصیتوں کے نام منتخب کر لیے جاتے اور پھر ان شخصیتوں سے ساری جرمن قوم کو یوں روشناس کروایا جاتا کہ ہر فرد ان شخصیتوں کو اپنے بزرگ سمجھتا ایسا ہو جاتا تو ساری قوم ان مشترک آباؤ اجداد کی عظمت کے تصور سے وابستہ ہو کر متحد ہو جاتی جرمن تاریخ کے حقیقی اکابر کے نام تو کبھی موجودہ نسل کے سامنے پیش ہی نہیں کیے گئے ساری قوم کی توجہ ان شخصیتوں پر اس طرح مرکوز نہیں کی گئی جس سے ایک مشترکہ قومی جذبہ پیدا ہو جاتا جو مختلف مضامین پڑھائے جاتے تھے ان میں سے چند ایسے مضامین چن لیتے تھے جو قومی وقار کو اونچا کرنے اور قومی عظمت کا نقش دل پر بٹھانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے پھر ان مضامین میں خالی واقعات پر اکتفا نہ کرنا چاہیے تھا بلکہ حسب ضرورت مبالغہ آمیزی سے کام لینے سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے تھا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ روشن مثالیں پیش کر کے قومی افتخار کے جذبات کو مشتعل کر دیا جاتا یہ کام ان لوگوں کا تھا جن کے ہاتھ میں قوم کو تعلیم دینے

کے اختیارات تھے ان دنوں یہ راستہ اختیار کیا جاتا تو اسے جنون آمیز قوم پرستی تصور کیا جاتا، پھر قوم پرستی کے جنون کا بھی اسے ایک نمونہ سمجھا جاتا جس پر ناپسندیدگی کی نگاہیں پڑتیں ان دنوں خاندان شاہی سے لفظی عقیدت کا اظہار زیادہ مقبول تھا لوگ اسے برداشت بھی کر لیتے تھے لیکن قومی افتخار کو باقی سب اقدار پر ترجیح دینا ہرگز برداشت نہ کیا جاتا شاہی خاندان سے لفظی عقیدت تو خادم مہیا کرتی تھی لیکن قومی افتخار سے وابستگی ترقی کر جائے تو خطرہ تھا کہ یہ جذبہ کہیں سرکار کو عوام کی خدمت پر مجبور نہ کر دے شاہی خاندان سے وابستگی کا نتیجہ تو صرف یہ تھا کہ فوج سے ریٹائر ہونے والے پرانے فوجیوں کی انجمنوں کی تشکیل عمل میں آ جاتی تھی لیکن اگر قوم پرستی اور حب الوطنی ترقی کر جائیں تو کیا راستہ اختیار کریں گی اور اس کی روک تھام ذرا پہلے سے کر لینا مشکل تھا یہ قومی جذبہ ایک عالی ہمت اور عالی نسب گھوڑے کی طرح ہے جو ہر سوار کو اپنی پیٹھ پر نہیں ٹکنے دیا پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ کئی لوگ ایسے خطرہ سے بچنا چاہتے ہیں یہ تو کسی کو وہم و خیال بھی نہ تھا کہ ایک روز جنگ چھڑ جائے گی پھر اس جنگ میں حب الوطنی کا کڑا امتحان دینا ہوگا توپ خانہ کی گولہ باری سہنی ہوگی زہریلی گیس کے جھونکوں میں سے گذرنا ہوگا پھر جب یہ امتحان سر پر آ ہی گیا تو ہمارے جذبہ حب الوطنی کی کمی کے لیے ہمیں خوفناک جرمانہ ادا کرنا پڑا ''حضور شہنشاہ عالی وقار'' اور ''قیصر والا اقتدار'' کی خاطر کوئی شخص بھی اپنی جان دینے پر آمادہ نہ تھا جہاں تک ''قوم'' کا تعلق تھا اکثر سپاہیوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ''قوم'' کس چڑیا کا نام ہوتا ہے۔

پنچایتی سرکار سے عقیدت سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی

جب جرمنی میں انقلاب بپا ہو گیا اور دامن شہنشاہ سے وابستہ رہنے والی حب الوطنی کا خاتمہ ہو گیا تو بیچارے تاریخ پڑھانے والے استادوں کو بڑی دقت پیش آئی اب تاریخ پڑھنے کا مقصد ہی کیا باقی رہ گیا تھا نتیجہ یہی نکلا کہ تاریخ پڑھانے کا مقصد کوئی نہیں، صرف واقعات رٹا دینے چاہئیں موجودہ سرکار کو حب الوطن کے جوش کی کچھ قدر

نہیں لیکن یہ سرکار جو کچھ چاہتی ہے وہ بھی ناممکن ہے جب خاندان شاہی سے وابستگی ایک ایسے دور میں لوگوں کی سرفروشی سے سرکار کی حمایت پر نہ اکسا سکی جب دنیا میں قوم پرستی کے چرچے غالب ہو رہے تھے،تو یہ بیچاری پنچایتی سرکار کس کھیت کی مولی تھی کہ لوگ اس کی خاطر اپنا خون گرائیں کیا اس میں شک ہے کہ جرمن قوم میدان جنگ میں ساڑھے چار سال پامردی سے ہرگز کھڑی نہ رہتی اگر جنگ کا نعرہ یہ ہوتا کہ آؤ بہارو! پنچایتی سرکار کی خاطر اپنی گردنیں کٹا دو'' پھر شاندار پنچایتی سرکار کی مسند حکومت پر جو لوگ قابض ہیں، ذرا ان کے منہ اور پیشانیاں تو دیکھئے کیا یہ اس قابل ہیں کہ لوگ ان کی خاطر سر کٹائیں۔''

پنچایتی سرکار غریب کی جورو ہے جو سب کی بھابھی ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ پنچایتی سرکار محض اس لیے قائم ہے کہ یہ بیچاری سب کا اور ہر ایک کا کہا مان لیتی ہے، اور جو کچھ مان نہیں سکتی اس کے ماننے کا وعدہ کر لیتی ہے یہ پنچایتی سرکار دشمنوں کو خراج اور جرمانے ادا کرتی ہے یہ سرکار اجنبیوں کے حق میں ہمارے وطن کی سرزمین کے ٹکڑوں سے دستبردار ہونا قبول کر لیتی ہے دنیا کی غیر قومیں اس پنچایتی سرکار کو اپنا ہمدرد سمجھتی ہیں ایک کمزور شخص ہمیشہ کسی طاقت ور شخص کے مقابلہ میں ان ظالموں کا زیادہ منظور نظر ہوتا ہے جو اسے اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہیں ڈال سکیں اس پنچایتی سرکار کی برائی ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑا اور کیا ثبوت درکار ہے کہ ہمارے دشمن اس طرز حکومت کو ترجیح دیتے ہیں ہمارے دشمن، جرمن پنچایتی سرکار کو محبوب رکھتے ہیں اور کوئی آلہ کار نہیں مل سکتا فقط یہی وجہ ہے کہ یہ بلند مرتبہ سرکار آج تک زندہ اور قائم ہے یہی وجہ ہے کہ یہ سرکار کسی ایسے نظام تعلیم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں جس سے سچ مچ لوگوں میں حب الوطنی کی روح بیدار ہو جائے اگر پنچایتی جھنڈے کے علمبردار سورمے پھدک پھدک کر نعرے بلند کرتے رہیں تو یہ پنچایتی سرکار بالکل مطمئن ہے لیکن اس پنچایتی سرکار کو پتہ نہیں کہ یہ پھدک کر نعرے بلند کرنے والے سورمے جس

دن خون کی قربانی دینے کا وقت آیا تو خرگوشوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوں گے۔

مورچے ٹوٹ سکتے ہیں قلعے فتح ہو سکتے ہیں لیکن سورماؤں کے ارادے نہیں ٹوٹتے

قومی سرکار کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے لڑنا ہوگا۔قومی سرکار کا وجود ہمارے دشمنوں کے تجویز کردہ معاہدوں پر دستخط کرنے سے محفوظ نہ ہو جائے گا، بلکہ قومی سرکار اپنا وجود برقرار رکھنے اور اپنے تحفظ کی خاطر وہی راہیں اختیار کرے گی، جن کے متعلق موجودہ نظام حکومت کا خیال ہے کہ ان راہوں کو ترک کر دینا چاہیے قومی سرکار کی شکل جس قدر قومی مفاد کے حق میں مفید ہوگی ، اور جتنا قومی سرکار کا جذبہ قومی روح کے مطابق ہوگا، اتنا ہی اس سرکار کے دشمن اس پر حسد کریں گے، اور اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔قومی سرکار کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ وہ ہتھیار یا اسلحہ نہ ہوں گے جو یہ سرکار استعمال کر سکے گی ، بلکہ اس کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے شہری ہوں گے مورچے ٹوٹ جاتے ہیں، قلعے فتح ہو جاتے ہیں، لیکن زندہ مردوں اور عورتوں کی وہ فصیل جو حب وطن کے گارے سے تعمیر ہوئی ہے، کبھی وطن کی حفاظت سے باز نہیں رکھی جا سکتی۔ہاں حب وطن کا یہ جذبہ روحانی عشق کے درجہ تک پہنچا ہونا چاہیے۔

لہٰذا ہمارے تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے تیسرا نکتہ حسب ذیل ہوگا۔

قوم کے بزرگوں کی عزت قوم کی تقویت کا باعث ہوتی ہے

قومی سرکار کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ مختلف علوم سے بھی قومی جذبہ افتخار کی پرورش کا کام لیا جا سکتا ہے نہ صرف دنیا کی تاریخ بلکہ انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ قومی افتخار کے جذبہ کی پرورش کے زاویہ سے مرتب کرنی چاہیے ایک موجد محض اس لیے عظیم ہستی نہیں کہ اس نے کوئی ایجاد اختراع کی ہے، بلکہ وہ اس لیے عظیم ہستی ہے کہ اس نے اپنی قوم کی خدمت کی۔کسی بڑے کارنامے پر غور کرنے سے دل میں جو جذبہ تحسین پیدا ہوتا ہے اسے فخر ومباہات کے اس جذبہ میں تبدیل کر دینا چاہیے کہ یہ کارنامہ ہماری نسل نے

انجام دیا ہے۔ جرمنی کی تاریخ میں لاتعداد اکابر گذرے ہیں، لیکن یہ مقصد پورا کرنے کے لیے ہمیں چند نام چننے ہوں گے یہ عظیم ترین اکابر کے نام ہوں گے پھر ان بزرگوں کو نوجوانان قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے گا کہ ان بزرگوں کی یاد قومی جذبہ کی تقویت کے لیے مضبوط سہارا ثابت ہو۔

قوم پرستی کی بنیاد قومی جذبہ افتخار ہوتا ہے

اس اصول کے مطابق مختلف علوم کے موضوعات ازسرنو ترتیب دینا ہوں گے طریقہ تعلیم کو یوں بدلنا ہوگا کہ اسکول چھوڑنے کے بعد لڑکا یا لڑکی نیم صلح پرست، حامی جمہوریت، یا ایسی ہی کچھ اور بلا نہ بن جائے، بلکہ صمیم قلب سے جرمن پرست ہو۔ یہ قومی جذبہ شروع سے ہی اخلاص پر مبنی ہونا چاہیے اس کی بنیاد محض دکھاوے پر نہ ہونی چاہیے جب بچوں کے ذہن ابھی نقش پذیر ہوتے ہیں تو ان پر حسب ذیل بنیادی، اور ناقابل تردید اصول کندہ کردینا چاہیے جو شخص اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے، وہ صرف اپنی جان قوم کی خاطر قربان کرنے پر آمادگی سے ہی اپنے جذبہ قومی کا صدق ثابت کرسکتا ہے۔ جس جذبہ قومی سے مقصود اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنا ہو، وہ ہرگز جذبہ قومی نہیں نہ ہی قوم پرستی صرف چند طبقات تک محدود رکھی جاسکتی ہے۔ نعرے لگانے اور تالیاں بجانے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ان حرکتوں سے کوئی شخص اپنے آپ کو قوم پرست کہلانے کا مستحق نہیں بن جاتا۔ ہر نعرے کے پس پشت یہ مخلصانہ عزم بالجزم لازم ہے کہ قوم کی بہتری کا انتظام بہرحال کرنا ہے۔

قوم پر فخر سے پہلے قوم کو فخر کے قابل بنانا ہوگا

کوئی شخص اپنی قوم پر صرف تب فخر کرسکتا ہے جب قوم میں کوئی طبقہ ایسا باقی نہ رہ جائے، جس کی حالت کا تصور کرنے سے سر شرم سے جھک جائے۔ جب کسی قوم کی نصف سے زیادہ تعداد زبوں حالی کا شکار رہے۔ مفلسی نے ان کا کچومر نکال دیا ہے حتیٰ کہ ان میں بد اخلاقی بھی سرایت کرگئی ہے تو ایسی کریہہ المنظر قوم پر کون شخص فخر کرسکتا ہے

جب قوم کے تمام اراکین جسم اور اخلاق دونوں کے لحاظ سے تنومند ہوں، صرف اسی صورت میں ایسی قوم سے وابستہ ہونے کا احساس اس معراج کمال تک پہنچ سکا ہے جسے قومی افتخار کہا جاتا ہے۔ قومی افتخار کی انتہائی بلندیاں فقط وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اپنی قوم کی عظمت سے واقف ہیں۔

نوجوانوں کے دلوں میں جذبہ قوم پرستی اور معاشرتی عدل کا احساس، ایک ہی شوق اور تڑپ کے اجزاء بن جانے چاہئیں ایسا ہو گیا تو پھر ایک دن آئے گا جب ایسے شہریوں پر مشتمل ایک قوم نمودار ہوگی، جو ایک دوسرے کی اخوت اور مشترکہ قومی افتخار کے بندھن سے متحد ہوں گے ایسی قوم نا قابل شکست ہوگی اور اسے کبھی مٹایا نہ جا سکے گا۔

قوم سے عشق کو جنون کے درجہ پر پہنچانا ہوگا

ہمارے زمانہ میں مجنونانہ قوم پرستی کو جس خوف کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہی نامرادی کا نشان ہے ہمارا زمانہ قوت وشکوہ کی ہر استعداد سے عاری ہے نہ صرف یہ زمانہ خود استعداد سے عاری ہے، بلکہ اسے جوان مردی کے مظاہروں سے بھی نفرت ہے۔ جب تک یہ نفرت برقرار ہے، فطرت اس زمانہ کو کبھی عالیشان کارنامے انجام دینے کی اجازت نہ دے گی اس زمین پر جتنے زبردست انقلابات بپا ہوئے ہیں، اگر ان کے پیچھے پرجوش اور مجنونانہ جذبات کام نہ کر رہے ہوتے تو ان کا کبھی تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ جن خصلتوں کو نیکی قرار دیتے ہیں، ان خصلتوں اور صلح پسندی کے زور سے یا امن اور قانون کی پرستش سے کبھی انقلابات برپا نہیں ہوتے۔

دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے

ایک بات یقینی ہے کہ دنیا میں عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے سوال صرف یہ ہے کہ اس انقلاب کا انجام آریا نسل کے حق میں ہوگا، یا ازلی وابدی قوم یہود اس انقلاب سے کامیاب نکلے گی۔

نوجوانوں کو صحیح خطوط پر تعلیم دے کر قومی سرکار بنی نوع آدم کی ایک ایسی نسل پیدا کر دے گی جو دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی جنگ میں حصہ لینے کی اہل ہوگی۔

فتح و کامرانی اس قوم کے حصہ میں آئے گی جو پہلے سے راستہ پر چل نکلے گی قومی سرکار تعلیم اور جسمانی تربیت و ریاضت کے لیے جو نظام قائم کرے گی، اس کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کے دماغ میں نسل پرستی سما جائے، اور وہ نسلی عقیدہ کو سمجھ لیں۔ اسکول سے کوئی لڑکا یا لڑکی بغیر نسلی پاکیزی کا مطلب سمجھے، اور بغیر نسلی خون کی آمیزش سے بچانے کی ضرورت پر ایمان لائے، فارغ التحصیل ہو کر نہ نکلے اس طرح ہماری نسل کے تحفظ کی اولین ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ہماری قوم کی آئندہ ثقافتی ترقی بھی اسی انتظام پر منحصر ہے۔

انجام کو دیکھا جائے تو جسمانی اور ذہنی تربیت اس وقت تک ناکارہ ہے، جب تک کہ یہ تربیت حاصل کرنے والے خود اپنا وجود برقرار رکھنے اور اپنی خصوصیات کو قائم رکھنے پر تلے ہوئے نہ ہوں۔

اپنوں کے کام آؤ۔ غیروں کے آلہ کار نہ بنو

اگر اس اصول پر عمل نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی صورت پیدا ہو جائے گی، جس پر ہم جرمنوں کے لیے سوائے ماتم کرنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ افسوس ناک صورت آج بھی پیدا ہو چکی ہے، گو شاید ہمیں اس کا احساس نہیں وہ صورت یہ ہے کہ ہم جرمن دنیا کی تہذیب وتمدن کے لیے بطور کھاد استعمال کیے جاتے ہیں اس زمانہ کے کھاتے پیتے لوگ تو اسے معمولی بات سمجھتے ہیں جب ہماری قوم کا کوئی رکن ہمارے دائرہ سے نکل کر کسی اور قوم میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط ایک شہری کم ہو گیا انہیں یہ احساس نہیں کہ ہمارے نسلی خون میں فتور پڑنے کا ایک اور راستہ کھل گیا۔ دوسری نسلوں سے ہمارے مسلسل ازدواج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان نسلوں کو ان کی ذلیل حیثیت سے اٹھا کر تہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر لے جائیں گے اس کے ساتھ

ساتھ ہم جن بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں، اگر یہ اختلاط جاری رہا تو ہم وہاں سے ہمیشہ نیچے ہی گرتے جائیں گے۔

نظام تعلیم میں آخری تبدیلی یہ کی جائے گی کہ مذکورہ بالا تعلیم و تربیت کی معراج کے طور پر عسکری تربیت دی جائے گی ہر جرمن شہری جو عام تربیت حاصل کرتا ہے، اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے خاطر عسکری تربیت دی جائے گی۔

قابلیت اور ذہانت ورثہ میں نہیں ملتی

قومی سرکار ایک طرف تو جسمانی اور ذہنی تربیت کو بڑی اہمیت دے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود سرکاری ملازمین کے انتخاب کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں آج کل اس اہم مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین آج کل بڑے عہدوں پر فائز ہیں، ان کی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم دینے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کی ذہانت پر محض ثانوی توجہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ ذہانت ایک ایسی قابلیت ہے جس کا حال دوسروں کے ساتھ مقابلہ کے بعد ہی کھلتا ہے ممکن ہے ایک دیہاتی بچہ کسی شہری بچہ کے مقابلہ میں کم تہذیب یافتہ اور شائستہ ہو لیکن باوجود اس کے وہ کسی ایسے لڑکے سے زیادہ ذہین ہو جس کا خاندان کئی پشتوں سے اعلیٰ مناصب پر قابض چلا آیا ہے۔ شہر کے بچہ کی شائستگی اور تہذیب کا بھلا اس کی ذہانت یا کند ذہن ہونے سے کیا تعلق ہے شائستہ اور مہذب تو وہ اس لیے ہے کہ اس نے جن حالات میں تربیت پائی ہے وہاں اس کو مختلف کیفیتیں محسوس کرنے اور متنوع سبق سیکھنے کا زیادہ موقعہ ملا ہے۔ اگر دیہاتی والدین کے ذہین بچے بچپن سے ہی اس قسم کے حالات میں پرورش پائیں تو ان کی تہذیبی اور تمدنی حالت بھی ترقی کر جائے۔ آج کل صرف ایک میدان ایسا ہے جہاں کوئی شخص محض اپنی استعداد کے سہارے ترقی کر سکتا ہے، اور جہاں اس کے خاندانی مرتبہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے یہ میدان فنون لطیفہ کا ہے یہاں صرف تعلیم سے کام نہیں چلتا بلکہ یہاں تو اندرونی جوہر کی ضرورت ہے یہ درست ہے کہ اندرونی جوہر کی

نشوونما بھی ٹھیک طرح ہو تو وہ ترقی کرتا ہے، ورنہ مرجھا جاتا ہے لیکن یہ ترقی صرف ان معنوں میں ہوتی ہے کہ ایک جوہر پہلے سے موجود ہے، اور اب اس کی نشوونما ہو جاتی ہے یہاں روپیہ اور باوا جان کی جائیداد سے کچھ کام نہیں چلتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جوہر قابل صرف اونچے خاندانوں یا دولت مندوں کے گھر ہی جنم نہیں لیتا اکثر فنون لطیفہ کے ماہرین غریب گھرانوں میں تولد ہوتے ہیں بار بار ایسا ہو چکا ہے کہ کسی دور افتادہ گاؤں سے ایک بچہ آیا، اور بعد میں مشہور ماہر فن بن گیا۔

یہ انسان ہیں یا چلتی پھرتی ڈکشنریاں

جس حقیقت حال کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے اس کو قوم کی ذہنی اور علمی حالت کی ترقی کے لیے مدنظر رکھا جاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں لوگ کیسے نا سمجھ ہیں بار ہا یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اگرچہ اس اصول کا اطلاق فنون لطیفہ کے میدان میں مناسب ہے، لیکن ان علوم پر اس کا اطلاع نہیں ہو سکتا جو روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں یہ درست ہے کہ ہر شخص کو کسی حد تک مشینوں کے مستری کا کام سکھایا جاتا ہے، جس طرح پالتو کتوں کو ہوشیار مالک کئی کرتب سکھا لیتے ہیں لیکن اس تربیت کا یہ مطلب نہیں کہ جانور اپنی عقل استعمال کر کے وہ کرتب انجام دیتا ہے عقل تو سکھانے والے کی ہوتی ہے یہی اصول انسان پر بھی عائد ہوتا ہے انسان میں ذہانت ہو یا نہ ہو، اسے سائنس کی کئی ترکیبیں سکھائی جا سکتی ہیں جیسا کسی جانور کا کرتب، ایک حد تک کسی شخص کو زبردستی ذہین بھی بنایا جا سکتا ہے مطلب یہ کہ اگر اس کو شدید ذہنی تربیت دی جائے تو اسے اوسط درجہ کے کاریگروں سے زیادہ علم حاصل ہو جائے گا لیکن یہ علم اور ایسی ذہانت بانجھ ہی رہتی ہے اس قسم کے انسان چلتی پھرتی ڈکشنری بن جاتے ہیں جب زندگی میں کوئی نازک وقت پڑ جائے اور زبردست فیصلے طے کرنے کی فوری ضرورت ہو تو علم کی یہ چلتی پھرتی پٹاریاں بس ڈھکی ہی رہ جاتی ہیں ایسے لوگوں کو ہر نئے موقعہ پر از سر نو تربیت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انہیں جو

کرتب سکھایا گیا ہے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی کی حاجت ہو تو وہ خود یہ تبدیلی نہیں کر سکتے، بلکہ انہیں یہ تبدیلی بھی سکھانی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بنی نوع آدم کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ جب لوگوں کو علم ٹھونسا گیا ہو اور انہوں نے علم ہضم نہ کیا ہو، تو ایسے لوگ صرف موجودہ سرکار کے اعلیٰ عہدوں پر ہی قابض رہنے کی اہلیت پیدا کر سکتے ہیں۔

علم مردہ ہے، اس میں جان جوہر ذاتی سے پیدا ہوتی ہے

یہ بات تو بغیر چرچا کیے بھی واضح ہے کہ کسی قوم کے ذہین اور فطین اشخاص اس قوم کی آبادی کے ہر طبقے میں پھیلے ہوتے ہیں یہ طبعی امر ہے کہ علم بجائے خود مردہ رہتا ہے اگر علم کسی زندہ انسان کے ذہن میں داخل ہوا تو اس میں جان پڑ جائے گی، اور کسی میاں مٹھو کے ذہن میں ٹھونس دیا گیا تو ویسا ہی بیجان رہے گا علم میں تخلیقی قوت تبھی پیدا ہوتی ہے، جب علم کے ساتھ ذہانت اور جوہر ذاتی بھی شامل ہو جائے۔

ایک مثال سے ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا زمانہ اس معاملہ میں کسی شدید غلطی کا مرتکب رہا ہے ہمارے نامور اخبارات وقتاً فوقتاً ایسی خبریں شائع کرتے رہتے ہیں کہ ”دنیا کے کسی حصہ میں پہلی مرتبہ ایک حبشی وکیل بن گیا ہے، یا استاد بن گیا ہے، یا پادری بن گیا ہے، یا بہت بڑا قوال بن گیا ہے۔“ ان خبروں سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ خود جرمنی میں جو غیر اقوام کے لوگ آباد ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کھاتے پیتے طبقات میں کئی ایسے احمق موجود ہیں جو ایسی خبریں پڑھ کر تحسین و آفرین کے دو نگڑے برسانے لگتے ہیں انہیں یہ سن کر وجد طاری ہو جاتا ہے کہ ہمارے زمانہ تعلیم کے طریقوں نے کیا حیرت انگیز ترقی کر لی ہے برعکس اس کے عیار یہودی جو زیادہ چالاک ہیں، خوب سمجھتے ہیں کہ ایسی خبروں سے وہ عقیدہ عام کیا جا سکتا ہے جسے وہ لوگوں میں پھیلانا چاہتے ہیں وہ فتنہ پرور عقیدہ یہ ہے کہ ”سب انسان برابر ہیں“ ان بیوقوف کھاتے پیتے لوگوں کو یہ سمجھ نہیں کہ ایسی خبریں خود عقل و دانش کے خلاف ایک سنگین جرم

کے ارتکاب کی خبریں ہیں یہ مجرمانہ دیوانگی کا فعل ہے کہ ایک پیدائشی بن مانس کو وکیل بنا دینے کا ڈھونگ رچایا جائے۔ دوسری طرف مہذب نسلوں کے لکھو کھہا افراد ایسے کام انجام دیتے رہیں جو ان کے تمدنی رتبہ کے شان شایان نہیں یہ کھاتے پیتے لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ جب لکھوکھہا عالی استعداد افراد کنگال ہو کر تباہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں تو ایسے حالات میں ہوٹنٹو قبیلہ کے جنگلیوں اور زولو قبیلوں کے وحشیوں۔۔۔۔کو ایسے عہدوں پر قابض ہونے کی تربیت دینا جن کے لیے علم و دانش لازمی ہیں، درحقیقت منشائے ربانی کے خلاف کھلی نافرمانی اور سرکشی کے مترادف ہے۔ ان جنگلیوں کو تربیت دے کر تعلیم یافتہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے کتوں کو کرتب سکھانا۔ اگر صاحب استعداد نسلوں پر اتنی ہی محنت اور کوشش صرف کی جائے تو ان کا ہر فرد ایسے معاملات میں ہزار درجہ زیادہ قابل ثابت ہو سکتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے مستحق صرف اعلیٰ ذہن ہیں

اگر اس قسم کی حرکتیں عام ہو گئیں تو ایک دن ایسا بھی آجائے گا جب صورت حال نا قابل برداشت ہو جائے گی سچ پوچھئے تو صورت حال اب بھی نا قابل برداشت ہے، کیونکہ ذہانت اور طبعی جوہر کو اعلیٰ تعلیم کا حقدار بنانے کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ حالت نا قابل برداشت ہے کہ ہر سال لکھوکھہا انسان جو کہ طبعی استعداد سے بے بہرہ ہیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں اور دوسری طرف لکھوکھہا انسان جوہر ذاتی رکھنے کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں، اس طرح قوم کو جو عملی نقصان پہنچتا ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ گزشتہ چند برسوں سے امریکہ میں اہم ایجادات و اختراعات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ معاشرتی طبقات کے ذہین افراد کو اعلیٰ تعلیم دینے کا تناسب یورپ کے مقابلے میں بہت اونچا ہے۔

''کھوپڑی کے تابوت'' میں ''علم کی لاش''

ایجاد کرنے کے لیے کھوپڑی کے صندوق میں علم کی لاش کافی نہیں ہوتی اختراعات

کے لیے ایسے علم کی ضرورت ہے جسے جوہر ذاتی اور استعداد طبعی کی امداد حاصل ہو۔ہاں آج کل جو ہر ذاتی اور استعداد طبعی کی کچھ قدر نہیں قدر ہے تو اسکول سے آنے والی رپورٹوں کی۔

یہ پھر ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق قومی سرکار کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں سے قوم کی تربیت کرنا ہوگی قومی سرکار کا کام یہ نہیں کہ کسی ایک معاشرتی طبقہ کو جو پہلے سے موجود ہے، باقی طبقات پر غالب کر دیا جائے۔قومی سرکار کا تو فرض یہ ہے کہ قوم کی کل آبادی میں سے بہترین دماغ چن کر، وہ جس منصب اور اعزاز کے مستحق ہیں، انہیں وہاں پہنچا دیا جائے قومی سرکار کا فقط یہ فرض نہیں کہ ہر اوسط بچے کو پرائمری اسکول میں ایک خاص حد تک تعلیم دی جائے ، بلکہ قومی سرکار کا یہ بھی فرض ہے کہ مناسب قابلیت رکھنے والے بچوں پر ترقی کی وہ راہیں کھول دی جائیں جن کے لیے وہ طبعی استعداد رکھتے ہیں علاوہ ازیں ہر معاشرتی طبقہ کے ذہین بچوں پر ہائی اسکولوں کے دروازے کھول دیئے جانے چاہئیں یہ بہت لازمی ہے سوائے اسکے اور کوئی طریقہ نہیں جس سے قوم کی رہنمائی کے لیے قابل لیڈروں کا ایک گروہ پیدا کر دیا جائے۔ایسا نہ ہوا تو تعلیم یافتہ طبقہ میں طبعی استعداد رکھنے والے افراد داخل نہ کیے جاسکیں گے۔

دانشور طبقہ بر خود غلط ہوتا ہے

ایک اور وجہ بھی ہے کہ سرکار کو خود کیوں یہ کمی پورا کرنے کا انتظام کرنا چاہیے دانشور طبقہ ہمیشہ ایسا بر خود غلط ، خود پسند ، اور لکیر کا فقیر ہوتا ہے کہ قوم کے باقی طبقات سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔خاص طور پر جرمنی کا دانشور طبقہ تو اس مرض میں اور بھی بری طرح گرفتار ہے اس کے دو برے نتیجے نکلتے ہیں اول تو دانشور طبقہ، نہ تو عوام الناس کو سمجھ سکتا ہے، اور نہ اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔یہ طبقہ اتنی مدت سے عوام سے کٹ چکا ہوتا ہے کہ اب اس کا عوام سے کوئی ایسا نفسیاتی رابطہ ہی باقی نہیں رہتا جس کے ذریعہ وہ ان کو سمجھ سکے۔وہ تو قوم سے قطعی اجنبی بن چکا ہوتا ہے۔دوسرے دانشور طبقہ میں مطلوبہ

قوت ارادی مفقود ہوتی ہے یہ قوت ہمیشہ شائستہ طبقات میں کم پائی جاتی ہے کیونکہ وہ خلوت نشین رہتے ہیں برعکس اس کے عامۃ الناس میں چونکہ ایک گونہ وحشیانہ جبلت کا غلبہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی قوت فیصلہ بھی زیادہ طاقتور ہوتی ہے لہٰذا ہم جرمنوں میں علمی شائستگی اور ثقافت کی کبھی کمی نہیں رہی ۔ لیکن ہماری قوت فیصلہ اور قوت ارادی ہمیشہ کمزور رہی ہے ۔

ان کو علمی بدہضمی کی شکایت ہے

مثال کے طور پر ہمارے سیاسی مدبرین میں سے جو لوگ زیادہ دانشور تھے، اتنے ہی وہ کوئی عملی کارنامہ انجام دینے میں نکمے ثابت ہوئے جب عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو اس جنگ کے لیے ہماری سیاسی تیاریاں اور صنعتی سازوسامان دونوں ناکافی تھے ۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ قوم کے حاکم پوری طرح تعلیم یافتہ نہ تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے قومی امور کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے ۔ ان کے اندر اتنا علم اور ذہانت ٹھونسی جا چکی تھی کہ بیچاروں کو علمی بدہضمی ہوگئی تھی ان کا کوئی جبلی احساس اعتدال کی حالت پر نہ تھا ۔ نہ ان میں ہمت اور جوش باقی تھا ۔ نہ ہی وہ دلیری سے کوئی کام انجام دے سکتے تھے ہماری قوم کی بدقسمتی یہ تھی کہ ہم ایک ایسے صدر اعظم کے ماتحت جنگ لڑ رہے تھے جو نیم دوروں نیم بروں فلسفی تھا ۔ اگر بیٹھ مین قان ہالوگ کی جگہ ہمارا قائد کوئی ہردلعزیز اور درشت مزاج شخص ہوتا تو ہمارے عام سپاہیوں کا شجاعانہ خون رائیگاں نہ بہتا ۔ ہمارے قائدین کو مبالغہ آمیز دانشوری کی جو بیماری لاحق تھی، اس سے ان لچوں کو سب سے زیادہ مدد ملی جنہوں نے ماہ نومبر 1918ء کا انقلاب برپا کیا ۔ یہ عقل کے مارے ہوئے کنجوسی سے قومی دولت کے سر پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے رہے، اور اسی دولت کو داؤ پر لگا کر انہوں نے وہ بازی نہ کھیلی جس سے دوسری قوموں نے فتح حاصل کر لی ۔

دانشوروں کے طبقہ میں تازہ خون داخل ہوتا رہنا چاہیے

یہاں کیتھولک کلیسا ایک قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے کلیسا کے پادریوں کو ازدواج کی اجازت نہیں، اس لیے وہ اپنے جانشین خود اپنی صفوں سے انتخاب نہیں کر سکتے، بلکہ بتدریج عامۃ الناس سے، انہیں اپنے جانشین منتخب کرنے پڑتے ہیں کئی لوگ ترک نکاح کی اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے حالانکہ کلیسا کے اس قدیم نظام کو اس قوت کے ساتھ برقرار رکھنے میں اس راز کو بڑا دخل ہے یوں کلیسا کے اعلیٰ عہدہ دار ہمیشہ عوام کے نچلے طبقوں سے بھرتی کر کے کلیسا، نہ صرف عوام الناس کے ساتھ ایک جبلی اور نفسیاتی ربط قائم رکھتا ہے بلکہ جوہر قابل کی جرات اور ہمت کا ایک ایسا خزانہ بھی فراہم کر لیتا ہے جو صرف عوام سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسا کا جناتی نظام اپنی ذہنی لچک اور آہنی قوت ارادی کے ساتھ آج تک زندہ ہے۔

قومی سرکار کا یہ بھی فرض ہے کہ ایسے نظام تعلیم کی اس طرح تنظیم کرے، اور اس کو اس طرح چلائے کہ موجودہ دانشور طبقے میں قوم کے دیگر ادنیٰ طبقات سے ہمیشہ تازہ خون داخل ہوتا رہے۔

سرکاری ملازمت آبائی جاگیر نہ بن جانی چاہیے

قوم کی عام آبادی سے سرکار کو بڑی احتیاط اور پوری تفتیش کے بعد وہ افراد انتخاب کرنے چاہئیں، جن میں طبعی جوہر موجود ہے اور انہیں قومی خدمت پر مامور کر دینا چاہیے سرکار خود یا سرکار کے مختلف محکمے کسی خاص طبقہ کے افراد کو آمدنی مہیا کرنے کے لیے قائم نہیں ہوئے، بلکہ وہ تو اس لیے قائم ہوئے ہیں کہ وہ کام انجام دیں جو ان کے سپرد کیا گیا ہے یہ کام تبھی ٹھیک طرح انجام دیا جا سکتا ہے اگر سرکار مختلف مناصب کے لیے موزوں افراد کو خود تربیت دے۔ جو افراد اس تربیت کے لیے منتخب ہوں، ان میں مطلوبہ طبعی قابلیت اور قوت ارادی موجود ہونی لازمی ہے یہ اصول صرف دیوانی عہدہ داروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ قوم کی ذہنی اور اخلاقی قیادت سنبھالنا چاہتے ہیں ان پر بھی عائد ہوتا ہے۔ چاہے وہ کسی دائرہ میں کام کر رہے ہوں ایک قوم کی عظمت کسی حد

تک اس شرط پر منحصر ہوتی ہے کہ اس قوم کے بہترین دماغوں کو قومی خدمت کے ان محکموں کے لیے پوری تربیت دی جائے جنہیں سنبھالنے کی ان میں خصوصی استعداد ہے پھر ان تربیت یافتہ افراد کو ان عہدوں پر متمکن کر دیا جائے جہاں وہ قوم کی بہترین خدمت انجام دے سکتے ہیں اگر دو قوموں میں جنگ چھڑ جائے اور دونوں قوموں کی طاقت اور طبعی استعداد یکساں ہو تو اس قوم کو فتح ہو گی جس نے اپنی ذہنی اور اخلاقی قیادت اپنے بہترین دماغوں کے سپرد کی ہو گی، اور اس قوم کو شکست ہو گی جو محض خاص گروہوں یا محض چند طبقات کا شکار بنی رہی، اور جس کے افراد کی منفرد قابلیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

ہاتھ سے کام کرنا کوئی عیب نہیں

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا کے موجودہ حالات میں یہ اصلاح ناممکن نظر آتی ہے فوراً اعتراض کیا جائے گا کہ کسی اعلیٰ عہدے پر متمکن سرکاری عہدے دار کے منظور نظر فرزند دلبند سے یہ توقع رکھنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کمائے، اور وہ یہ مشقت محض اس لیے برداشت کرے کہ کوئی دوسرا شخص جس کے والدین مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، سرکاری ملازمت کے کسی عہدے پر فائز ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ یہ دلیل تبھی تک ٹھیک نظر آتی ہے جب تک ہاتھ سے کام کر کے روزی کمانا، اس طرح برا سمجھا جاتا ہے جس طرح کہ آج کل برا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قومی سرکار کو ہاتھ سے کام کرنے والوں کی قدر افزائی کرنا ہو گی اس قدر افزائی کا معیار موجودہ معیار سے بالکل مختلف ہو گا۔ اگر ضرورت ہو تو قومی سرکار تعلیم و تربیت کا ایک ایسا مستقل نظام کھڑا کرے گی جس سے یہ رائج الوقت احمقانہ عادت دور کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ ہاتھ سے کام کرنا کوئی ایسا پیشہ ہے جس کے لیے پیشہ اختیار کرنے والے کو شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے۔

افراد کی عزت و حرمت کا معیار یہ نہ ہو گا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، بلکہ افراد کی قدر

افزائی کا یہ معیار ہوگا کہ وہ جو کام بھی کرتے ہیں کیسے اچھے طریقے سے کرتے ہیں، اور یہ کام قوم کے لیے کہاں تک مفید ہے میرا یہ قول ایک ایسے زمانہ میں سخت قابل اعتراض سمجھا جائے گا، جبکہ کسی ایک اخبار کا کوئی نامہ نگار بھی کسی ماہر ترین مستری سے زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت نامہ نگار قلم سے گھس گھس کرتے ہیں جیسے میں کہہ چکا ہوں، عزت و حرمت کا یہ غلط معیار فطری اقدار کے مطابق نہیں یہ معیار تو مصنوعی طور پر اختیار کیا گیا ہے ایک ایسا وقت بھی تھا جب اس غلط معیار کا نام ونشان بھی نہ تھا موجودہ منافی فطرت حالات اس لیے پیدا ہوئے کہ ہمارے زمانہ میں مادہ پرستی کا زور ہوگیا ہے۔ اس مادہ پرستی سے جہاں اور بہت سے خرابیاں پیدا ہوئیں، وہاں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوگئی۔

روپیہ عزت کا پیمانہ نہیں بن سکتا

بنیادی لحاظ سے دیکھا جائے تو کسی پیشہ کی قدر و قیمت کا دو طریقوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک پہلو تو مادی ہے، دوسرا اصولی کسی پیشہ کی مادی قدر و قیمت تو اس پر منحصر ہے کہ اس کام سے کہاں تک عملی فائدہ پہنچتا ہے آبادی کا جتنا زیادہ حصہ کسی کام سے فائدہ اٹھاتا ہے اتنی ہی اس کام کی مادی قیمت زیادہ ہوگی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس پیشہ سے مادی فائدہ براہ راست پہنچتا ہے یا بالواسطہ۔ اس قدر و قیمت کا اظہار اس مادی معاوضہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو کام کرنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ اس خالص مادی قدر و قیمت کے علاوہ ایک اصولی قیمت بھی ہوتی ہے اصولی قیمت کا اندازہ کام کی مادی اہمیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پہلو سے کیا جاتا ہے کہ اس کام سے کہاں تک ایک قومی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی ایجاد کی مادی قدر و قیمت کا اندازہ کام کی مادی اہمیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پہلو سے کیا جاتا ہے کہ اس کام سے کہاں تک ایک قومی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی ایجاد کی مادی قدر و قیمت ایک مزدور کے روزانہ کام سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی یقینی بات ہے کہ قوم کو

مزدوروں کی روزمرہ چھوٹی موٹی خدمات کی بھی اتنی ہی حاجت ہے کہ جتنی بڑے پیانہ پر دوسری خدمات کی مادی اعتبار سے تو مختلف خدمات کا معاوضہ قوم کو ان خدمات کی ضرورت کے مطابق مختلف مقرر کیا جا سکتا ہے اور اس فرق کا اظہار معاوضہ کی کمی بیشی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے لیکن اصولی لحاظ سے دیکھا جائے تو مزدور اور کارکن جب اپنا اپنا کام ٹھیک طرح انجام دیں، تو ان کا کام چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ سب مساوی حیثیت رکھتے ہیں انسان کی قدر افزائی کا معیار اس کی یہ اصولی حیثیت ہونی چاہیے، نہ کہ وہ مادی معاوضہ جو وہ قبول کرتا ہے۔

ہر شخص وہ کام کرے جس کا وہ اہل ہے

جس سرکار کا کاروبار عقلی اصولوں پر چلایا جائے، وہاں ہر فرد کے سپرد وہ کام ہوگا جسے انجام دینے کی اس میں اہلیت ہوگی بالفاظ دیگر افراد کو ان پیشوں کی تربیت دی جائے گی جن کے لیے ان میں طبعی رجحان پایا جائے گا۔ طبعی رجحان ایک جبلی امر ہے اور وہ تعلیم و تربیت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا یہ تو قدرت کا انعام ہے کوئی اکتسابی شے نہیں لہذا لوگوں کی قدر افزائی ان کے کام کی نوعیت پر نہ ہونی چاہیے، کیونکہ یہ تو کم و بیش کسی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ جب کسی شخص کا کوئی پیشہ اختیار کرنا، اس کے جوہر ذاتی پر منحصر ہے، یا اس جوہر ذاتی کی بنا پر اسے جو تربیت دے گی اس پر منحصر ہے، تو اس حالت میں اس کی قدر افزائی کا معیار تو یہ ہونا چاہیے کہ قوم نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے وہ اسے کس حد تک ٹھیک انجام دیتا ہے۔ ایک شخص جو پیشہ اختیار کرتا ہے، وہ اس کے وجود کا مقصد نہیں، بلکہ محض اس کے وجود کو قائم رکھنے کا ایک وسیلہ ہے زندگی کا اصلی مقصد تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو بہتر بنائے اور بطور انسان کے ترقی کرے۔ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے انسان قوم کا محتاج ہے کیونکہ وہ قوم کی تمدنی زندگی میں ایک جزو ہے۔ قوم کا وجود ہمیشہ ان بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جن بنیادوں پر خود سرکار کا وجود قائم ہے۔ لہذا ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ ان بنیادوں کو مضبوط بنائے۔ کوئی شخص ان

بنیادوں کو کیسے مضبوط بنا سکتا ہے، اس کی توفیق دینا قدرت کے ہاتھ ہے۔ فرد کا فرض یہ ہے کہ اسے قوم جو کچھ عطا کرتی ہے وہ پوری دیانت اور سرگرمی سے اس کا عوض قوم کو ادا کر دے۔ جو شخص یہ فرض ادا کرتا ہے وہ اعلیٰ ترین اعزاز و اکرام کا مستحق ہے۔ مادی معاوضہ تو اس حساب سے دیا جائے گا کہ کسی پیشہ سے قوم کو کیا مادی فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اصولی معاوضہ صرف یہ ہے کہ قوم ہر اس شخص کا احترام کرے جو قدرت کی بخشی ہوئی استعداد کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کرتا ہے۔ اس فطری استعداد کی تربیت قوم پر منحصر ہے۔ اگر یہ حقیقت سمجھ لی جائے تو پھر ایک دیانت دار کاریگر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہاں ایک نااہل سرکاری ملازم بن کر دن بھر خدا کی بخشیش ضائع کرنا، اور دیانت دار عوام کو خون چوس کر مفت کی روٹیاں توڑنا ضرور بے عزتی کی بات ہے اگر ایک دفعہ یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو یہ ماننے میں کوئی دقت نہ رہے گی کہ کسی شخص کو کوئی ایسا عہدہ نہ دینا چاہیے جس کا وہ اہل نہ ہو علاوہ ازیں ذاتی استعداد اور قابلیت ہی وہ واحد معیار ہیں جس کا منصفانہ اندازہ کر کے کسی شخص کو قومی مسائل میں دخل دینے کی اجازت ہونی چاہیے۔

مساوات کی بنیاد اجرت پر نہیں، فرض شناسی پر ہونی چاہیے

موجودہ زمانہ تو خود اپنی تباہی کا انتظام کر رہا ہے۔ ایک طرف بالغ رائے دہندگی کا حق دیا جاتا ہے۔ مساوی حقوق کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اس مساوات کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں رائج الوقت نظام کے ماتحت کسی انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ اسے روزانہ اجرت کیا ملتی ہے۔ یہ معیار قبول کرنے سے، انسانی شرافت کی بنیاد پر مساوات کے قیام کی جڑ کٹ جاتی ہے مساوات اس کا نام نہیں کہ کوئی شخص کیا کام کرتا ہے، مساوات تو اس پر منحصر ہے کہ جو کام کسی کے سپرد کیا جاتا ہے وہ اسے کس حد تک ٹھیک انجام دیتا ہے صرف یہی طریقہ ہے جس سے لوگوں کی عزت افزائی انکل پچو طریقہ سے طے کرنے کی بجائے، ہر شخص اپنا معاشرتی اعزاز خود طے کرنے کا مختار بن

جاتا ہے۔

نازک وقت میں کھلی کھلی بات کردینی چاہیے

بحالات موجودہ جبکہ لوگ ایک دوسرے کا اعزاز و اکرام کا اندازہ ایک دوسرے کی تنخواہوں کی مقدار سے لگاتے ہیں مذکورہ بالا سچائی کی اہمیت کو ہرگز نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان خیالات کی تلقین ترک کردیں، بلکہ ہمارا فرض اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب کسی زمانہ میں انسانیت کو اندر سے گھن لگ جاتا ہے، اور وہ تباہی کے گڑھے میں گرنا شروع کردیتی ہے تو ہر وہ شخص جو اس کا علاج کرنا چاہے اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ خرابی کی اصل جڑیں ننگی کرکے لوگوں کے سامنے پیش کردے۔ قوم پرست اشتراکی تحریک کا فرض ہے کہ بحالات موجودہ وہ یہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھا لے۔ پست ہمت کھاتے پیتے لوگ قوم میں جو گمراہی پھیلا رہے ہیں، ہمیں اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔ اور ان تمام عوامی طاقتوں کو مجتمع کرکے ان میں باہمی ربط پیدا کرنا ہوگا۔ جو ایک نئے ضابطہ حیات کا علمبردار بننے پر آمادہ ہیں۔

فضیلت کا معیار لالچ یا اجرت نہیں، بلکہ ایثار اور زہد ہے

یہاں یہ اعتراض کیا جائے گا کہ کسی پیشہ کی مادی قدر و قیمت اور اصولی قدر و قیمت میں امتیاز کرنا مشکل ہے اگر جسمانی مزدوری کرنے والوں کی قدر افزائی کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لیے اجرت بھی کم ملتی ہے معترض کہے گا کہ اجرت کم ملنے کی وجہ سے ہی جسمانی مزدور کو قومی تمدن و تہذیب میں شرکت کا موقعہ نہیں ملتا۔ انسانی تمدن کی اصولی قدر و قیمت سے اگر مزدور کو حصہ نہیں ملتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور غریب کی روزانہ سرگرمیوں میں ان اقدار کا کوئی عمل دخل ہی نہیں یہ بھی کہا جائے گا کہ جسمانی مزدوروں کا پیشہ اختیار کرنے میں اسی وجہ سے عذر کیا جاتا ہے کہ اس پیشہ کی کم آمدنی کے باعث جسمانی مزدوروں کا تمدنی معیار مجبوراً پست ہوتا ہے تمدنی معیار کا یوں پست ہونا ہی جسمانی مزدوروں کی بے عزتی کا موجب ہے۔

ان اعتراضات میں بہت کچھ حقیقت بھی ہے لیکن ان اعتراضات میں سچائی کا شامل ہونا ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ مستقبل میں مختلف پیشوں کی اجرت کے مابین اتنا زیادہ فرق نہ ہونا چاہیے یہ نہ کہو کہ اجرتیں مساوی کر دی گئیں تو عملی کام کا معیار گر جائے گا یہ قومی انحطاط کی بدترین علامت ہوگی کہ لوگوں کو علمی پیشے اختیار کرنے پر اکسانے کے لیے انہیں زیادہ اجرت دینا لازمی ثابت ہو۔ اگر دنیا میں آج تک یہی دستور رائج ہوتا تو دنیا بہترین علمی اور تمدنی کارناموں سے محروم رہتی دنیا کی عظیم ترین ایجادات، اہم ترین اختراعات، انقلاب انگیز علمی انکشافات، اور انسانی تمدن کے شاندار ترین نمونے دولت کے لالچ، یا دولت کے زور سے وجود میں نہیں آئے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ان عظیم کارناموں کی ابتدا ہمیشہ دنیاوی عیش و آرام کی وہ صورتیں ترک کرنے سے ہوئی جو خالی دولت سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

انسان صرف دولت اور لذت کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا

یہ ٹھیک ہے کہ آج کل دولت ایک ایسی طاقت بن چکی ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اس کے باوجود وہ وقت آنے والا ہے جب انسان بلند تر اقدار کی پرستش کرے گا آج انسان کو جو کچھ حاصل ہے اس کا بہت سا حصہ روپے اور جائیداد کے لالچ سے تیار ہوا ہے لیکن آج انسان کو جو کچھ حاصل ہے وہ اس سے محروم کر دیا جائے تو انسانیت کو کچھ خسارہ نہیں رہے گا۔

ہماری تحریک کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانہ کا خواہشمند بنایا جائے جب ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی فراہم کر دی جائیں گی اس زمانہ میں یہ اصول تسلیم کیا جائے گا کہ انسان صرف مادی لذتوں کی خاطر زندہ نہیں اس اصول کا اطلاق یوں ہوگا کہ اجرتوں کے نرخ زیادہ معقول ہوں گے تنخواہ ایسی مقرر کی جائیں گی کہ ہر شخص چاہے وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور کیوں نہ ہو، اگر اپنا فرض دیانت داری سے ادا کرتا ہے تو عزت اور شائستگی کی زندگی بسر کر سکے بحیثیت ایک انسان اور بحیثیت ایک

شہری کے وہ اعزاز و اکرام کا مستحق ہو گا یہ نہ کہو کہ یہ محض عالم خواب کی باتیں ہیں یہ نہ کہو کہ دنیا کبھی ان جوابوں پر عمل نہ کرے گی یہ مت کہو کہ یہ خواب نا قابل عمل ہیں۔

مشکلات اس لیے پیش آتی ہیں کہ انہیں حل کیا جائے

ہم بھی ایسے سادہ لوح نہیں کہ اس خیال میں مگن ہو جائیں کہ دنیا میں کبھی کوئی ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے جب کوئی خرابی باقی نہ رہے گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم جن خرابیوں کا احساس کر چکے ہیں انہیں دور کرنے کی جدوجہد نہ کریں۔ یا کوتاہیوں کو رفع کر کے نصب العین کی جانب بڑھنا ترک کر دیں۔ یہ درست ہے کہ واقعات کی دنیا ہمیشہ انسان کی خواہشات کے راستہ میں بہت سی مشکلات پیدا کرے گی لیکن ان مشکلات کا تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان بار بار اپنے نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کرے کوئی ناکامی اسے اپنا عزم بالجزم چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکے جس طرح قانون کے نفاذ میں غلطیاں رہ جانے کے باوجود ہم عدل و انصاف کی تلاش ترک نہیں کر سکتے، جس طرح امراض کے باقی رہنے کے باوجود ہم علم طب سے منہ نہیں موڑ سکتے، اسی طرح مشکلات پیش آنے کے باوجود ہم بلند نصب العین کے حصول کی کوششیں بھی ترک نہیں کر سکتے۔

لالچ سے ذلت، اور قربانی سے عزت حاصل ہوتی ہے

انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ بلند نصب العین قبول کرنے سے جو زبردست طاقت ظہور میں آتی ہے، اس کا کبھی اندازہ نہ ہونے دے اگر موجودہ حالت میں بعض لوگ مایوس ہو چکے ہیں، اگر ان مایوس ہونے والوں میں کچھ سپاہی بھی شامل ہیں تو میں انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب دنیا میں تمہاری شجاعت، بلند نصب العین کی خاطر زبردست ترین قربانیاں پیش کرنے کا بہترین نمونہ تھی کیا میدان جنگ میں گردنیں کٹانے والے، دو وقت کی روٹی کی تلاش میں جانیں نچھاور کرتے تھے یا کیا ان کا یہ ایثار اور قربانی ملک کی محبت، ملک کی عظمت پر یقین، اور ملک کے وقار کو بچانے کی

تڑپ کا نتیجہ تھی جب جرمن قوم نے بلند اصولوں کو ترک کر کے انقلابیوں کے مادی انعامات کے نعروں پر کان دھرا، جب انہوں نے سپاہی کے ہتھیار پرے پھینک کر غلامی کی گٹھڑی سر پر اٹھائی، تب اور رہا صرف تب، جس جنت کے ان سے وعدے کئے گئے تھے، اس کی بجائے وہ ایک ایسے دوزخ میں داخل ہو گئے جہاں سوائے دنیا بھر کی حقارت، بدترین ذلت، اور سخت ترین محرومی کے ان کی قسمت میں اور کچھ نہیں لکھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس مادہ پرست پنچایتی رواج کو قائم کرنے والے حسابیوں کے مقابلہ میں ہمیں محض قربانی اور ایثار کی پیکر، اصول پرست جرمن سرکار کا تصور پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم :: ''سرکار کے اراکین'' اور ''سرکار کی رعایا'' میں کیا فرق ہوتا ہے

کسی سرکار کا شہری ہونے کا مطلب کیا ہے

آج کل سرکار دراصل سرکار کہلانے کی مستحق نہیں یہ سرکار **ملک** کے باشندوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔یعنی شہری اور غیر شہری شہری وہ لوگ ہیں جنہیں **ملک** کے اندر پیدا ہونے کے باعث، یا قانون کے ذریعہ **ملک** کا شہری بن جانے کے سبب شہریت کے تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں غیر شہری وہ لوگ ہیں جنہیں یہی حقوق کسی اور سرکار کے ماتحت حاصل ہوں۔ان دونوں قسموں کے علاوہ کچھ اور لوگ ہیں جو دنیا کی کسی سرکار کے شہری نہیں اور اس لیے انہیں سرکار کے ماتحت بھی شہریت کے حقوق حاصل نہیں۔

آج کل شہری حقوق حاصل کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ جو شخص کسی سرکار کے علاقہ کے اندر پیدا ہوتا ہے، وہ اس سرکار کا شہری بن جاتا ہے یہ نیا پیدا ہونے والا بچہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے، یا کس نسل سے رشتہ رکھتا ہے، ان باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا، اگر کوئی حبشی کسی ایسی ماتحت ریاست میں آباد تھا جس پر جرمنی کا قبضہ تھا اور اب وہ حبشی جرمنی میں داخل ہو کر یہاں رہائش اختیار کر لیتا ہے تو اس کا لڑکا خود بخود دنیا کی نظروں میں ''جرمنی کا شہری'' بن جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس کسی یہودی کو بچہ، کسی پول قوم کے باشندہ کا لڑکا، کسی افریقی تخم، یا کسی ایشیائی نطفہ، یوں ہی ''جرمن شہری'' بن سکتا ہے۔

جب میں دام ہوں تو کوئی نہیں پوچھتا منہ میں دانت کتنے ہیں

کسی **ملک** کے اندر پیدا ہونے کے باعث، اس **ملک** کی شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے علاوہ، یہ حقوق بعد میں حاصل کرنے کا ایک اور وطیرہ بھی ہے اس دوسرے

طریقے کے لیے کئی شرطیں لازمی ہیں مثلاً ایک شرط تو یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو درخواست کنندہ کوئی نقب زن یا گرہ کٹ نہ ہونا چاہیے اس کے اعمال مشتبہ نہ ہونے چاہئیں بالفاظ دیگر سیاست کے معاملہ میں وہ ایک بے ضرر گدھا ہونا چاہیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی مالی حیثیت ایسی ہو کہ جس ریاست کا شہری بننا چاہتا ہے، اس کے لیے بوجھ ثابت نہ ہو۔ ہمارا زمانہ حقیقت پسندی کا زمانہ کہلاتا ہے اس لیے کسی کے پاس رقم کافی ہو تو بوجھ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر درخواست کنندہ کے حالات ایسے ہیں کہ اس سے خاصے ٹیکس وصول ہونے کی توقع رکھی جا سکتی ہے تو یہ بڑی اہم بات ہے اور اسے جلدی سے شہری حقوق حاصل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی نسل کے مسئلہ کا اس سوال سے کچھ تعلق ہی نہیں سمجھا جاتا۔

کیا دستاویز کی سند سے قومیت بدلی جا سکتی ہے

شہریت کے حقوق حاصل کرنے کا یہ سارا طریقہ کسی موٹروں کی انجمن کا ممبر بن جانے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں درخواست کنندہ درخواست دیتا ہے درخواست کی پڑتال ہوتی ہے درخواست منظور ہو جاتی ہے ایک روز درخواست کنندہ کو وہ ٹکٹ مل جاتا ہے جس کے ذریعے اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ شہری بن گئے ہیں ایک درخواست کنندہ جو آج تک زولو قبیلہ کا ایک جنگلی تھا یا کافر قبیلہ کا ایک وحشی تھا، اب اسے یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ اس دستاویز کی برکت سے تم ایک ''جرمن شہری'' میں تبدیل کر دیئے گئے ہو۔

سرکار کا صدر اعظم اختیار خصوصی سے یہ شعبدہ انجام دے سکتا ہے جو کام خدا سے نہ ہو سکا وہ اب حقوق شہریت کے دفتر کے ایک کلرک صاحب اپنی انگلیوں میں قلم پکڑ کر آنکھ جھپکنے میں پورا کر دیتے ہیں اس جنبش قلم کے کیا کہنے جس کے زور سے ایک تاتاری غلام چٹکی بجانے میں سچ مچ کا ''جرمن'' بن جاتا ہے۔

قوم کے جسم میں زہریلے جراثیم

نہ صرف یہ نئے شہری جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کا خیال نہیں کیا جاتا، بلکہ ان کی جسمانی صحت کی بھی کچھ تفتیش نہیں کی جاتی۔ اگر وہ آتشک کا مریض ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں موجودہ سرکار اسے اپنا شہری قبول کرنے پر آمادہ ہے صرف شرط یہ ہے کہ وہ مالی طور پر بوجھ ثابت نہ ہو اور سیاسی طور پر خطرناک نہ ہو۔

یوں سال بسال ''سرکار مہربان'' ہماری قوم کے جسم میں زہر کے کیڑے داخل کرتی رہتی ہے۔

شہری اور غیر شہری کے حقوق میں ایک اور فرق یہ ہے کہ ''مسٹر شہری'' کو سرکار کے تمام عہدوں پر قابض ہونے کی اجازت ہے چونکہ اس امر کا امکان ہے کہ اسے عسکری خدمات جبراً بجالانی پڑیں اس لیے اسے عام انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت ہے یہ تو اسکے موٹے موٹے حقوق ہوئے جہاں تک ذاتی حقوق اور شخصی آزادی کا تعلق ہے، غیر شہریوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو کہ شہریوں کو، بلکہ بعض معاملات میں تو غیر شہریوں کی حالت اچھی ہے یہ ہے ہماری موجودہ جرمن پنچایتی سرکار کا حال۔

میں خوب جانتا ہوں کہ میں وہ باتیں سنا رہا ہوں جنہیں کسی کا دل سننے کو نہیں چاہتا بہر حال ہماری سرکار کی شہریت کے حقوق حاصل کرنے سے زیادہ احمقانہ اور مجنونانہ قاعدہ شاید دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

قومیت کی بنیاد نسل ہے

آج کل صرف ایک سرکار ایسی ہے جو کم از کم تھوڑی بہت کوشش کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں کن امور کا خیال رکھنا چاہیے ہماری جرمن پنچایتی سرکار کو تو یہ توفیق نہیں ہوئی لیکن امریکہ کی حکومت نے چند معقول شرطیں بھی عائد کر رکھی ہیں مثال کے طور پر کسی ایسے شخص کو شہریت کے حقوق عطا نہیں کیے جاتے جس کی صحت خراب ہو۔ اس طرح بعض خاص نسلوں کے افراد کو شہریت کے حقوق حاصل کرنے کی ممانعت ہے ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکن سرکار اسی راستہ پر چل رہی ہے جس پر ہم قومی

سرکار کو چلانا چاہتے ہیں۔

قومی سرکار اپنی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کرے گی سرکار کے شہری، سرکار کی رعایا، اور غیر شہری۔

اصول یہ ہونا چاہیے کہ کسی سرکار کے علاقہ میں پیدائش سے محض اس سرکار کی رعایا کے حقوق حاصل ہوں رعایا کو سرکار کے کسی عہدہ پر قابض ہونے یا ملکی سیاسی زندگی میں حصہ لینے یا کسی الیکشن میں کھلے یا چھپے دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی دوسرا اصول یہ ہے کہ سرکار کی رعایا کے ہر فرد کی قومیت اور نسل کا تعین ہونا چاہیے رعایا کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس سرکار کی رعیت میں شمولیت کو ترک کرتے ہوئے جس سرکار کی قومیت سے دراصل تعلق رکھتا ہے، اس کا شہری بن جائے ایک شہری اور رعیت کے ایک فرد میں صرف اتنا فرق باقی رہ جائے گا کہ غیر شہری کسی دوسری سرکار کا شہری ہوتا ہے۔

شہریت کے حقوق عطا کرنے سے پہلے، اس کے فرائض کی تعلیم بھی ملنی چاہیے

ہر وہ لڑکا یا لڑکی جو جرمن قومیت سے تعلق رکھتے ہوں، اور جرمن سرکار کی رعیت میں شامل ہوں، اسکول کی تعلیم کی وہ مدت پوری کرنے پر مجبور ہوں گے جو ہر جرمن کے لیے لازمی ہے اس تربیت کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ جس نسل کے فرزند ہیں اس سے وابستگی کا احساس ان میں بیدار ہو جائے گا اور جس نسل کے وہ چشم و چراغ ہیں اس میں شمولیت کا شعور ان کو حاصل ہو جائے گا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد انہیں جسمانی ریاضت کے وہ مرحلے بھی جبراً طے کرنے ہوں گے جو جرمن سرکار نافذ کرے گی اس کے بعد وہ فوجی تربیت بھی حاصل کریں گے یہ فوجی تربیت معمولی درجہ کی ہوگی۔ جو ہر جرمن فرد کو ضرور ملنی چاہیے اس تربیت کے بعد وہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے فوجی خدمت بجالانے کے قابل بن جائیں گے ہر نوجوان جو جبری فوجی بھرتی کی میعاد پوری کرلے، اور جس کی

صحت اور چال چلن کی تصدیق ہو جائے، وہ جرمن شہری بننے کا مستحق ہو گا جرمن شہریت کا یہ منصب عطا کرتے وقت بڑی سنجیدگی سے کچھ رسوم بجالائی جائیں گی شہریت کے حقوق عطا کرنے والی دستاویز کو ہر نوجوان اپنی زندگی کی سب سے بڑی دولت کے طور پر محفوظ رکھے گا اس دستاویز کے طفیل اسے ایک شہری کے تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی سرکار کو اپنے شہریوں اور رعیت کے مابین واضح امتیاز قائم کرنا ہو گا شہری قوم کے رکن ہیں وہ سرکار کے وجود کے قیام اور اس کی عظمت کے تحفظ کی بنیاد ہیں برعکس اس کے سرکار کی رعیت فقط ملک میں مقیم ہے، اور اپنی روزی یہاں کما کر کھاتی ہے۔

شہریت رشتہ اخوت کی علامت ہے

شہریت کے حقوق کی سند عطا کرتے وقت ہر شخص کو قوم اور سرکار سے وفاداری کا باقرار صالح حلف اٹھانا ہو گا یہ سند اس رشتہ اخوت کی علامت ہو گی جس سے ایک قوم کے تمام طبقات اور گروہ باہم برادری کی لڑی میں پروئے جائیں گے جرمن سرکار کی رعیت ہونا ایک جرمن بھنگی کے نزدیک کسی غیر سرکار کا بادشاہ ہونے کے مقابلہ میں بڑی عزت ہو گی۔

شہریوں کو وہ مراعات حاصل ہوں گی جو غیر شہریوں کو حاصل نہ ہوں گی جرمن سرکار کا ہر شہری اس سرکار کے علاقہ میں آقائیت کے رتبہ کا مالک ہو گا اس اعلیٰ اعزاز کے بدلہ میں کچھ ذمہ داریاں بھی ہوں گی جو لوگ ذاتی وقار کے احساس، یا پختگی کردار سے عاری ثابت ہوں، یا مجرم ہوں، یا وطن کے غدار ثابت ہوں، وہ ہر وقت سرکار کی شہرت کے حقوق سے محروم کیے جاسکیں گے جب کسی شہری کو حقوق شہریت سے عاری کر دیا جائے تو وہ رعیت میں شامل سمجھا جائے گا۔

ہر جرمن لڑکی پیدائش کے بعد فقط سرکار کی رعایا میں شامل ہو گی ہاں شادی کے بعد وہ جرمن شہری کا درجہ حاصل کر لے گی کوئی عورت جو آزادانہ طور پر اپنی روزی کمانا چاہتی ہے اگر وہ جرمن رعیت میں شامل ہے تو اسے بغیر شادی کے بھی جرمن شہریت طلب کرنے کا اختیار ہو گا۔

باب چہارم :: فرد کی شخصیت پر "قومی سرکار" کا عقیدہ کیا اثر پیدا کرتا ہے

سب انسان برابر نہیں

اگر قوم پرست اشترا کی قومی سرکار کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرے اور ان کی حفظ وبقا کا اہتمام کرے جن کے بل پر سرکار قائم ہے،تو صرف یہ کافی نہیں کہ جس نسل سے سرکار کے شہری تعلق رکھتے ہیں اس نسل کے افراد کی پرورش کی جائے،انہیں تعلیم دی جائے اور عملی زندگی کے لیے تیار کیا جائے بلکہ خود سرکار کو اپنی تنظیم اس طرح بدلنی ہوگی کہ وہ یہ سب کام اچھی طرح انجام دے سکےاور ان کے لوازمات پر پوری اترے۔

کسی شخص کی قدر وقیمت کا اندازہ اس کی نسل سے لگانا، اور اسکے ساتھ مارکس ازم کے اس اصول کی مخالفت کرنا کہ "سب انسان برابر ہیں" بالکل احمقانہ حرکت ہوگی، اگر اس کے ساتھ یہ عزم بالجزم نہ ہو کہ ہم خود اپنے اصولوں کو ان کے منطقی نتائج تک پہنچا کر ہی دم لیں گے اگر ہم قوم اور نسل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ زندگی کا انحصار اسی ایک اصول پر ہے،تو پھر ہمیں افراد پر بھی اس اصول کے نتائج کا اطلاق کرنا ہوگا۔اگر میں قوموں کے مابین نسل کی بنا پر امتیاز کرتا ہوں،تو لازماً مجھے افراد کے مابین بھی ان کے حسب نسب کی بنا پر امتیاز کرنا ہوگا۔ جب یہ اصول تسلیم کرلیا کہ دوقومیں برابر نہیں تو خود قوم کے اندر دو فرد کیسے برابر ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر کسی ایک شخص کا دماغ کسی دوسرے شخص کے دماغ کے برابر نہیں ہوتا اگر چہ دونوں کا دماغ ایک ہی نسلی خون سے بنا ہو پھر بھی تفصیلات میں بڑا فرق ہوسکتا ہے اگر چہ اصولاً دونوں برابر ہیں لیکن عملاً ضرور ان میں فرق ہوگا۔

شریفوں کو رزیلوں پر ترجیح ملنی چاہیے۔

اس حقیقت کا پہلا نتیجہ بڑا بدیہی ہے وہ نتیجہ یہ ہے کہ ایک امت کے اندر ان عناصر کی زیادہ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جن کا نسب زیادہ اعلیٰ ہے خاص طور پر انہیں اپنی نسل بڑھانے کی ترغیب دینی چاہیے۔

مقابلتاً یہ کام آسان ہے کیونکہ اس کام کو سمجھنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہر قسم کی پیچیدگی سے خالی ہے اس کے مقابلہ میں ساری قوم میں سے ان لوگوں کو چننا جن کی دماغی استعداد اور روحانی کردار بہترین ہے، اور پھر انہیں سرکار کے اقتدار میں سے حصہ دے کر وہ اختیارات سپرد کرنا جو نہ صرف ان کی اہلیت کے مطابق ہو، بلکہ قوم کے لیے بھی مفید ثابت ہوں، زیادہ مشکل ہے استعداد اور کارکردگی دونوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتخاب کرنا خاصہ پیچیدہ کام ہے یہ ایک ایسا کام ہے جو روزمرہ کی زندگی کی جدو جہد کو مد نظر رکھ کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

جو ضابطہ حیات جمہوریت کے اس اصول کا انکار کرتا ہے کہ کثرت رائے کا فرمان تسلیم کرنا چاہیے اور دنیا میں بہترین افراد یعنی بہتر نسل رکھنے والے افراد، کو حکومت کے اختیارات سپرد کرنا چاہتا ہے، ایسے ضابطہ حیات کے لیے لازمی ہے کہ وہ خود امت کے اندر بھی افراد پر حفظ مراتب کے اصولوں کا اطلاق کرے۔ ایسے ضابطہ حیات کا لازماً انتظام کرنا ہو گا کہ قیادت اور سیادت کے مناصب بہترین افراد کے سپرد کیے جائیں یہ اصول کثرت رائے پر مبنی نہیں، بلکہ شخصیت کے معیار پر مبنی ہے۔

حکومت صرف اصلاح احوال کی ذمہ دار نہیں اسے اصلاح اشخاص بھی کرنی ہے

جو شخص سمجھتا ہے کہ قوم پرست اشتراکی سرکار کی دوسری سرکاروں سے بس یہی امتیاز ہے کہ قومی سرکار کی فقط ہیئت تشکیل مختلف ہے، وہ ہماری تحریک سے محض سطحی آشنائی رکھتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ جب ہم ضابطہ حیات کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہوتی

ہے ہیئت تشکیل میں فرق کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ قومی سرکار کی اقتصادی نوعیت دوسری سرکاروں سے مختلف ہو یعنی یہاں مفلسی اور دولت مندی میں بہتر توازن ہو یا یہ کہ اقتصادی پالیسی مرتب کرنے میں عامۃ الناس کو زیادہ دخل ہو یا یہ کہ اجرتوں کا معیار زیادہ منصفانہ ہو یا یہ کہ تنخواہوں میں زیادہ تفاوت نہ ہو یہ سب صورتیں قومی سرکار کا دوسری سرکاروں سے امتیاز پوری طرح بیان نہیں کرتیں وجہ یہ کہ مذکورہ بالا اصلاحات سے ہماری قوم کی بقا کا یقینی تحفظ نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً ان ترکیبوں سے قوم کی عظمت کی ضمانت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جو قوم صرف خارجی اصلاحات سے مطمئن ہو جائے، اسے دنیا کی مختلف اقوام کے مابین زندہ رہنے کی کشمکش میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی جو تحریک اپنا نصب العین ان معمولی مصلحتوں تک محدود کردے گی وہ کبھی رائج الوقت حالات میں دوررس اور گہری تبدیلیاں پیدا نہ کرسکے گی یہ درست ہے کہ یہ مصلحت کوشیاں صحیح بھی ہیں اور منصفانہ بھی لیکن ان کا اطلاق صرف خارجی عوامی تک محدود ہے یہ قوم کو وہ اخلاقی قوت نہیں بخش سکتیں جس کے بغیر قوم کو اس کی موجودہ کمزوریوں سے نجات دلانا ناممکن ہے۔

اس زاویہ نگاہ کی مزید وضاحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک دفعہ پھر بنی نوع انسان کے تمدنی ارتقاء کی اصل ابتدا اور علت کا کھوج لگایا جائے۔

تمام اختراعات کا سہرا کسی ایک شخص کے سر ہوتا ہے

بنی نوع انسان کو پہلی بار جس اقدام نے حیوانات کی دنیا سے جدا کردیا، اور جس طرح انسان نے پہلی ایجاد کی ان دونوں کا سبب ایک ہی تھا۔ ایجاد تو یوں ہوئی کہ جب انسان کو دوسری مخلوقات کے ساتھ زندہ رہنے کی کشمکش میں پورا اترنے کے لیے مختلف حیلے اور ترکیبیں اختیار کرنا پڑیں، تو اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو اس جدوجہد میں کامیابی کا واحد راستہ تھا۔ انسان نے اس طرح پہلے پہل جو بھونڈی ایجادات کیں وہ کسی ایک فرد کی اختراع نہ تھیں ہم ان ایجادات کے موجدین کی شناخت ابھی تک نہیں

کر سکے۔ جب وہ انفرادی موجد کی شناخت نہ کر سکے تو مجبوراً انہوں نے ایجاد کا سہرا اجتماعی کوشش کے سر باندھ دیا۔ یہ محققین جب جانوروں کی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی چند چالیں اور کچھ کامیاب حیلے انہیں تمام جانوروں کے مابین مشترک دکھائی دیتے ہیں اس وجہ سے انسان ان چالوں اور حیلوں کی اصلی وجہ نہ دریافت کرسکتا ہے نہ بیان کر سکتا ہے بس وہ یہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ واقعات جبلی رجحان کا کارنامہ ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے ''جبلی رجحان کے کارنامے'' کوئی معنی نہیں رکھتے ہر وہ شخص جو جانداروں کے اعلیٰ ارتقا کے نظریہ پر عقیدہ رکھتا ہے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ زندہ رہنے کی خواہش کا ہر نیا اظہار اور زندگی کی ہر نئی شکل کی ابتداء ماضی میں ضرور کسی ایک تاریخ سے شروع ہوئی ہوگی اس اظہار اور صورت کا نمونہ پہلے پہل لازماً کوئی ایک فرد ہوگا پھر اس نمونہ کی تقلید بار بار ہوئی حتیٰ کہ اس تقلید کی عادت وسیع رقبے پر پھیل گئی۔ پھر اس تقلید کی عادت ہر انسان کے لاشعوری رجحانات میں داخل ہوگئی اس لاشعوری رجحان کو اب جبلی رجحان کہہ دیا جاتا ہے۔

ہر منزل کا پتہ کوئی راہنما بتاتا ہے

انسان کے بارے میں یہ توجیہہ سمجھنا اور اس پر یقین کرنا زیادہ انسان ہے، دوسرے جانداروں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں انسان نے جو کاریگری اور ہوشیاری دکھائی اس کا پہلا مظاہرہ یہ تھا کہ اس نے جن جانوروں میں خاص استعداد دیکھی نہیں سدھا کر ان سے کام لینا شروع کر دیا۔

اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اس ابتدائی دور میں انسان نے جو فیصلے کیے اور جو کارنامے انجام دیئے ان سب کا سہرا افراد کے سر پر ہے بعد میں تمام نوع انسانی ان فیصلوں اور کارناموں کی پیروی کرنے لگی اس کارروائی کی ایک من وعن مثال ان بنیادی عسکری اصولوں کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے جو اب جنگی چالوں کی بنیاد بن چکے ہیں ابتدا میں کسی ایک انسان نے یہ اصول وضع کیے، پھر کئی سال گزرنے کے بعد عین ممکن

ہے ہزار ہا سال گزرنے کے بعد یہ اصول ہر جگہ اختیار کر لئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان اصولوں کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔

تمام ایجادات کی بنیاد ایک دوسرے انسان کی فضیلت ہے

انسان نے اپنی پہلی ایجاد کی تکمیل کرتے کرتے ایک دوسری اختراع کر ڈالی، جہاں انسان نے اور کئی کرتب سیکھے، وہاں اس نے یہ بھی دریافت کرلیا کہ دیگر جانداروں کو کس طرح سدھا کر اپنی زندگی اور موت کی جنگ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔یوں بنی نوع انسان کی ایجادات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جسے آج ہم خود دیکھ رہے ہیں انسان نے جو مادی ایجادات کیں، ان کی ابتداء پتھر کے ہتھیاروں سے ہوئی، پھر اس نے پالتو جانوروں کو سدھایا، اس کے بعد مصنوعی طور پر آگ سلگانے کے طریقے اختراع ہوئے، حتیٰ کہ ہمارے زمانہ کی حیران کن ایجادات اختراع ہوئیں۔ان سب مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایجادات کا آغاز ہمیشہ کسی ایک فرد سے ہوا۔جوں جوں ہی ہم عہد حاضر کے قریب آتے جائیں،توں توں ایجادات کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔اور ان کے اثرات زیادہ انقلاب انگیز ہو جاتے ہیں ہم پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایجاد کی ابتداء افراد ہی کی ذریعہ ہوئی ہم اپنے گردوپیش جو مادی اختراعات دیکھتے ہیں یہ سب افراد کی استعداد اور قوت اختراع کا پھل ہیں۔تمام ایجادات و اختراعات کی مدد سے انسان دوسرے حیوانات کے مقابلے میں بلند تر مقامات طے کرتا گیا۔حتیٰ کہ اس نے اپنے آپ کو حیوانات کی دنیا سے بالکل علیحدہ کرلیا۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایجادات بنی نوع انسان کی ترقی اور سربلندی کا زینہ ہیں ایک وحشیانہ صنعت کے نمونہ نے آج سے ہزار ہا سال پہلے انسان کو زندہ رہنے میں جو مدد دی تھی، اور جس طرح اس بھونڈی ایجاد کے سہارے وہ زمانہ قبل از تاریخ کے جنگلوں میں شکار کرتا رہا تھا غور سے دیکھا جائے تو موجودہ سائنس کی حیرت انگیز اختراعات، اصولاً بالکل اسی طرح انسان کو زندہ رہنے اور اپنی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مدد دیتی ہے انجام پر نظر ڈالی جائے تو

انسان کے تمام قوائے فکر اور ایجادات کا مقصود اس کرہ ارض پر کامیابی سے زندہ رہنا ہے ممکن ہے کسی ایجاد یا کسی گہرے علمی نظریہ کے عملی نتائج شروع شروع میں واضح نہ ہوں، لیکن آخر کار ہر ایجاد اور نظریہ کا مقصد دنیاوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ ان تمام ترکیبوں کا حاصل یہی ہے کہ انسان کے اردگرد جو مخلوق ہے، اس کے مابین خود انسان بلند سے بلند تر مقام حاصل کرتا ہے یہ بلند مقام حاصل کرنے سے انسانی منصب کو تقویت پہنچتی ہے انسان زمین کا حاکم ہے بلند سے بلند تر مقام حاصل کرنا انسان کو ہر پہلو سے ترقی یافتہ بناتا ہے۔

انسان کی ترقی انسانیت کی محسنوں کے طفیل ہے

غرض تمام ایجادات فرد کی قوت تخلیق کی مرہون منت ہیں۔ ایسے تمام افراد بنی نوع انسان کے محسن ہیں، چاہے وہ بڑے تھے یا چھوٹے، اور چاہے ایجاد و اختراع کے وقت ان کی نیت کچھ ہی کیوں نہ تھی۔ ان کی کارگزاری کے طفیل لاکھوں بلکہ اربوں انسانوں کی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل میسر آئے۔

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمارے گردوپیش آج تہذیب وتمدن کے جو نمونے نظر آتے ہیں ان کا سہرہ ہمیشہ افراد کے سر رہا ہے ہر فرد دوسرے افراد کے کام کی کوتاہی پوری کرتا ہے اور بعد میں آنے والے افراد اپنے کام کی بنیاد اپنے پیشروؤں کی کارگزاری پر رکھتے ہیں ان ایجادات واختراعات سے کام لینے میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے آج مال اور سامان پیدا کرنے کے جو طریقے رائج ہیں دراصل وہ بھی ایک ایجاد کی حیثیت رکھتے ہیں یہ ایجاد بھی افراد کی قوت تخلیق کی مرہون منت ہے حتیٰ کہ نظری علوم میں جو کارنامے انجام دیئے جاتے ہیں، اگرچہ انہیں مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا، لیکن درحقیقت عملی ہنرمندی کے تمام کارنامے انہیں نظری علوم پر مبنی ہوتے ہیں یہ نظری علوم بھی انفرادی ذہنوں کی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں عوام کا ہجوم کبھی کوئی ایجاد نہیں کرتا اکثریت کبھی تنظیم یا فکر کی استعداد نہیں رکھتی ہمیشہ اور ہر ایک مثال میں کوئی ایک

انسان، کوئی ایک شخص، اختراع کرتا ہے یا تنظیم کی خدمت انجام دیتا ہے۔

ہر ایجاد اپنے موجد کا عکس ہوتی ہے

غرض انسانی معاشرہ صرف اسی صورت میں ٹھیک طور پر منظم سمجھا جا سکتا ہے جب اسے افراد کی تخلیقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کے مواقع میسر آئیں اور مختلف اشخاص کی کارگزاریوں سے معاشرہ کو فائدہ پہنچانے کا انتظام ہو۔ کسی ایجاد کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو موجد کی شخصیت ہے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ایجاد مادی حقائق سے تعلق رکھتی ہے، یا اصول نظریات سے۔ ہر باقاعدہ معاشرہ کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ایجاد کرنے والوں کو ایسے منصب پر فائز کر دیا جائے جہاں وہ سب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں درحقیقت معاشرہ قائم ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجادات کا فائدہ دوسروں کو پہنچانے کا موقع ملے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل سے معاشرہ کو ایک بے جان مشین بننے سے روکا جا سکتا ہے، اور ایک زندہ حقیقت بنایا جا سکتا ہے معاشرہ کے اندر صاحب دماغ افراد کو عوام سے بالاتر مقام بخشنے اور عوام کو خواص کی تعمیل بجالانے کا سبق دینے کی کوشش شخصیت کے اصول پر منظم ہونی چاہیے۔

بہبود عوام کا نسخہ غلبہ عوام نہیں بلکہ غلبہ خواص ہے

لہذا کسی معاشرتی تنظیم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ صاحب دماغ افراد کو عوام سے بلند تر اٹھنے سے باز رکھے۔ برعکس اس کے کہ ہر معاشرتی تنظیم کا فرض ہے کہ وہ اپنی تنظیمی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے صاحب دماغ افراد کو عوام کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بلند کرے معاشرتی تنظیم کا کام اس اصول پر شروع ہونا چاہیے کہ بنی نوع انسان کو آج تک کوئی سہولت عوام کے طفیل حاصل نہیں ہوئی، بلکہ ہر سہولت ہمیشہ افراد کی تخلیقی قوتوں سے حاصل ہوتی رہی ہے لہذا افراد ہی بنی نوع انسان کے اصلی محسن ہیں سب کا بھلا اسی میں ہے کہ تخلیقی دماغ رکھنے والے افراد کو صاحب رسوخ بنا کر ان کا کام انجام

دینے میں مدد دی جائے بہبودی عوام ہرگز غلبہ عوام سے حاصل نہیں ہو سکتی عوام نہ سوچنے کی استعداد رکھتے ہیں نہ عمل کی اور عوام میں غیر معمولی قوتوں کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا حکمران صرف وہ اشخاص بننے چاہئیں جن میں قیادت کا طبعی جوہر اور استعداد پائی جاتی ہے۔

جو بڑھے گا مرتبہ اس کا بڑھایا جائے گا

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قیادت کے اہل صاحب دماغ افراد صرف زندگی کے سخت امتحان میں کامیابی کے ذریعہ ہی منتخب کیے جا سکتے ہیں، زندگی کی جدوجہد میں کئی لوگ ناکام رہ کر تباہ ہو جاتے ہیں جو ناکام رہ کر تباہ ہو جاتے ہیں، ان کی تباہی ثابت کرتی ہے کہ اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچنا ان کی قسمت میں نہ لکھا تھا۔صرف چند لوگ ایسے بچتے ہیں جنہیں قدرت کے چنے ہوئے افراد میں شامل سمجھنا چاہیے اسی طرح غور و فکر،فنون لطیفہ کی تخلیق اور اقتصادی میدان میں بھی انتخاب کی کارروائی جاری رہتی ہے ہاں غور و فکر فنون لطیفہ کی تخلیق اور خاص طور پر اقتصادی میدان میں قدرت کی جانب سے انتخاب کی یہ کارروائی بلا روک ٹوک جاری نہیں رہتی۔یہاں انسان بھی مداخلت کرتے رہتے ہیں، قدرت کی جانب سے امتحان اور مصائب کے ذریعہ انتخاب کا یہ سلسلہ سرکار کے نظم و نسق میں بھی جاری رہتا ہے۔سرکار کے ماتحت فوج کا محکمہ قوم کے دفاع کی خاطر قائم ہوتا ہے۔یہ محکمہ سرکاری اقتدار کا ایک شعبہ ہے اس شعبہ میں بھی قدرت کی جانب سے انتخاب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے شخصیت کا عقیدہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیشہ غالب رہتا ہے یہی عقیدہ ہے جس کی رو سے افسر اپنے ماتحتوں پر حاکم ہوتا ہے یہی عقیدہ ہے جس کی رو سے ہر شخص اپنے امیر کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمے آید

یہ صرف سیاسی زندگی ہے جہاں فطرت کا یہ اصول برقرار نہیں رکھا جاتا۔تمام انسانی تمدن محض افراد کی تخلیقی قوتوں کی بدولت تعمیر ہوا ہے باوجود اس کے قوم کے نظم و نسق کے

اعلیٰ شعبوں میں یہ فتور پیدا ہو گیا ہے کہ معاملات کے فیصلے رائے عامہ کے مطابق ہونے چاہئیں رائے عامہ کا مطلب یہ ہے کہ کثرت رائے کو ترجیح ملنی چاہیے پھر سرکار کے اعلیٰ حلقوں سے اس پر فتور عقیدہ کا زہر قومی زندگی کی جڑوں تک پھیل جاتا ہے اس طرح جو خلل اوپر سے شروع ہوا تھا وہ نیچے تک آجاتا ہے۔قوم کے سارے جسم میں تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں مختلف قومی شعبوں میں یہودیوں کو جو تخریبی کارروائیاں کرنے کا موقع مل رہا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودی جن قوموں کے ہاں مہمان ٹھہرے تھے وہاں انہوں نے شخصیتوں کا مرتبہ گھٹا کر کثرت رائے کی پیروی کا عقیدہ رائج کر دیا ہے۔یوں بنو آریا کے تعمیری عقیدہ کی جگہ بنی اسرائیل کے تخریبی عقیدہ نے لے لی ہے یہودی دنیا کی قوموں اور نسلوں کے مابین تخریب کا خمیر ہیں جہاں وہ پہنچ جاتے ہیں انسانی تمدن تباہ ہو جاتا ہے۔

اکثریت کی حکومت سے فتور پیدا ہوتا ہے

مارکس ازم یہودیوں کی جانب سے شخصیت کے عقیدہ زندگی کو ہر شعبہ سے مٹا کر اس کی جگہ عددی اکثریت کا تصور رائج کر دینے کی کوششوں کا آخری مرحلہ ہے سیاسیات میں پارلیمنٹری نظام حکومت اسی کوشش کا نتیجہ ہے ہم ان کوششوں کے تباہ کن اثرات اپنی چاروں جانب دیکھ سکتے ہیں دیہات اور محلوں کی پنچایتوں سے لے کر قومی حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں تک اس کثرت رائے کے عقیدہ نے فتور مچا رکھا ہے اقتصادیات کے میدان میں دیکھئے تو ٹریڈ یونین کی تحریک نے خلل مچا رکھا ہے ٹریڈ یونین کی تحریک ملازموں کے حقیقی مفاد کا تحفظ نہیں کرتی یہ تحریک تو یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک کے مقاصد پورے کرتی ہے جوں جوں قوم کی اقتصادی زندگی سے شخصیت کا عقیدہ خارج ہو رہا ہے توں توں رائے عامہ کا رسوخ اور سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور جوں جوں رائے عامہ کا رسوخ اور سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں توں توں قوم کا اقتصادی نظام قوم کی اجتماعی فلاح و بہبود اور خدمت میں ناکام ثابت ہو رہا ہے بحیثیت مجموعی اقتصادی نظام

کی تخلیقی استعداد بھی ختم ہو رہی ہے دکانداروں کی وہ کمیٹیاں جو ملازمین کے مفاد محفوظ کرنے کی بجائے کارخانوں میں مصنوعات کی تیاری کے مسائل میں مداخلت کرتی ہیں، ان سے بھی ایسے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کمیٹیوں کے سبب مصنوعات کی تیاری کے نظام کو ضعف پہنچتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ صنعتی کاروبار میں مصروف ہیں انہیں نقصان پہنچتا ہے اگر تہہ پر نظر ڈالی جائے تو عوامی مطالبات خالی خوش آہنگ نظریاتی نعرے بلند کرنے سے پورے نہیں ہو سکتے عوامی مطالبات پورے کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں عوام کو وہ سامان بہم پہنچایا جائے جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں جب عوام کی ضروریات پوری ہو جائیں تو ان میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ امت کے افراد کے باہمی تعمیری تعاون سے ہر فرد کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے افراد کی ضروریات پورا کرنے کا سامان امت کے ہر طبقہ کے باہمی تعمیری تعاون سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

نظام عالم ''نسلی عصبیت'' اور ''شخصی فضیلت'' کے اصولوں پر قائم ہے

مارکس ازم اگر موجودہ اقتصادی نظام پر قابض ہو کر اس نظام کو ''رائے عامہ'' کے اصول پر چلانے میں کامیاب ہو جائے تو اس سے یہ اصول سچا نہ ہو جائے گا مارکس ازم کا عقیدہ سچا ہے یا جھوٹا، اس کا فیصلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ آج ہمیں حاصل ہے، وہ کل مارکس ازم کے ماتحت بھی موجود رہے گا یا نہیں مارکس ازم کے جھوٹے یا سچے ہونے کا فیصلہ تو اس پر منحصر ہے کیا کہ مارکس ازم کے اصولوں پر عمل کر کے انسانی تمدن میں آئندہ بھی ترقی کی وہی رفتار جاری رکھی جا سکتی ہے جیسی کہ آج تک جاری رہی ہے اگر مارکس ازم موجودہ اقتصادی نظام کو مارکس ازم کی رہنمائی کے ماتحت قائم رکھنے میں سو فیصدی بھی کامیاب ہو جائے تو تب بھی اس سے کچھ ثابت نہ ہو گا اصل بات تو یہ ہے کہ مارکس ازم خود اپنے اصولوں کے ماتحت کوئی ایسی ترقی کرنے کا اہل نہیں جسے موجودہ تہذیب و تمدن کے مساوی قرار دیا جا سکے۔

نسلی ضابطہ حیات، مارکس ازم کے ضابطہ حیات سے یہ بنیادی اختلاف رکھتا ہے کہ نسلی ضابطہ حیات نسل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، اس لیے وہ شخصیت کی اہمیت بھی تسلیم کرتا ہے لہذا انہیں دو اصولوں پر نسلی ضابطہ حیات کا نظام قائم ہے نسلی عقیدہ کے اہم ترین اصول نسل اور شخصیت ہیں۔

زندگی کے ہر شعبہ میں بے مرشدیت ختم کر دی جائے گی

اگر قوم پرست اشتراکی تحریک ان بنیادی اصولوں کی اہمیت کو شناخت نہ کر سکے اور صرف موجودہ سرکار کی ظاہری شکل پر سرخی پاؤڈر مل کر "رائے عامہ کی پیروی" کا اصول تسلیم کر لے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہماری تحریک مارکس ازم کا بنیادی اصول مان کر اس سے مقابلہ کرنے نکلی ہے اس کے بعد قوم پرست اشتراکی تحریک کو ایک جداگانہ ضابطہ حیات کہلانے کا ہرگز کوئی حق نہ ہو گا اگر ہماری تحریک کا مقصد بھی یہی ہے کہ شخصیتوں کو مٹا کر ان کی جگہ "رائے عامہ" مسلط کر دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم پرست اشتراکیت کے جسم میں بھی اس طرح مارکس ازم کے جراثیم داخل ہو گئے ہیں جیسے کھاتی پیتی قوم پرست پارٹیوں کو یہ مرض لاحق ہو چکا ہے۔

قومی سرکار کا فرض ہے کہ وہ ہر حالت میں شخصی اقدار کی اہمیت تسلیم کر کے اپنے شہریوں کی خوشحالی کی ضمانت مہیا کرے۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ اقتصادی زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ سے زیادہ مال اور سامان پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام پیداوار میں سے ہر فرد کو زیادہ سے زیادہ حصہ مہیا کیا جائے۔

غرض قومی سرکار کا فرض ہے کہ وہ ملکی حکومت کے ہر شعبہ سے پارلیمنٹری اصولوں کو خارج کرنے کی خاطر پوری سنگدلی سے کارروائی کرے پارلیمنٹری اصولوں کے ماتحت رائے شماری کا معیار تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کن اقتدار عوام الناس کے ہجوم کے سپرد کر دیا جاتا ہے اس غلط اصول کی جگہ شخصی ذمہ داری کا نفاذ لازم ہے۔

بہترین آئین حکومت اور سرکار کی بہترین صورت وہ ہے جس کے ماتحت اعلیٰ ترین

دماغ مقتدر ترین مناصب پر فائز ہو کر قوم پر زیادہ سے زیادہ اثر ڈال سکیں۔

مرشد وہی ہے جس میں مرشد والی خصلتیں ہوں

جس طرح اقتصادی میدان میں غیر معمولی قابلیت کے انسان، کوئی حاکم طاقت چھو منتر سے پیدا نہیں کر سکتی بلکہ غیر معمولی قابلیت رکھنے والے افراد تو خود اپنی ہی کوششوں سے سامنے آیا کرتے ہیں، جس طرح ایک چھوٹی سے دکان سے لے کر ایک بڑے کارخانہ تک کو چلانے کی طاقت تجربہ سے حاصل ہوتی ہے جس طرح زندگی ایک مکتب ہے، جہاں عملی سبق پڑھائے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسیات کے میدان میں بھی یک لخت سیاسی مدبرین پیدا نہیں کیے جا سکتے غیر معمولی قابلیت کے سیاسی مدبر اس معیار پر نہیں پرکھے جا سکتے جس پر عام انسانوں کو پرکھا جاتا ہے۔

سرکار کے قیام میں شخصی حفظ مراتب کا اصول ہر مرحلہ پر ملحوظ رہنا چاہیے سرکار کی چھوٹی سے چھوٹی مقامی تنظیم سے لے کر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں تک یہی اصول مد نظر رکھا جانا چاہیے۔

کثرت رائے سے کبھی کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہمیشہ ہر فیصلہ کچھ افراد کا فیصلہ ہوا کرتا ہے جو لوگ کوئی فیصلہ کریں، وہی اس فیصلہ کے لیے ذمہ دار بھی قرار پانے چاہئیں جو شخص کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز ہو اس کے مشیران کار بھی مقرر کیے جائیں گے لیکن وہ جو فیصلہ کرے گا اس کی ذمہ داری فقط اس کی ذات پر ہوگی۔

مرشد مشورہ بھی کرتا ہے

جس اصول نے پرشیا کی فوج کو جرمن قوم کے تحفظ کے لیے ایک قابل تعریف حربہ بنا دیا تھا ہماری سرکار کی تشکیل بھی اسی اصول پر عمل میں آئے گی وہ اصول یہ ہے کہ ہر حاکم کو اپنے ماتحتوں پر مکمل قائدانہ اختیارات حاصل ہوں گے لیکن وہ خود اپنے بالائی قائد کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

جن انجمنوں کو آج کل پارلیمنٹوں کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہ تب بھی قائم رہیں

گی لیکن یہ انجمنیں صرف مشیر کی حیثیت میں مشورہ دیں گی ذمہ دار تو کوئی ایک فرد ہی ہو سکتا ہے اس لیے ذمہ داری ہمیشہ افراد کے کندھوں پر ہوگی جب ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ہوگی، تو فرمان اور اختیار بھی فقط فرد ہی کا چلے گا۔

یہ پارلیمنٹیں خالی اس لیے درکار ہیں کہ آئندہ کے لیے قائدین کی بتدریج تربیت ہو سکے بعد میں وقت آنے پر ان میں سے مناسب لوگوں کو خصوصی ذمہ داری کے عہدے سپرد کیے جائیں گے۔

اس طرح سرکار کی تنظیم کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

محلے، شہر اور ملک سب کسی مرشد کے تحت ہونے چاہئیں

میونسپلٹیوں کے انتظام سے لے کر ساری مملکت کی مرکزی حکومت تک، قومی سرکار کسی مرحلہ پر عوامی نمائندوں کی ایسی منڈلی نہ ہوگی جو خالی کثرت رائے سے فیصلہ کرتی ہے پارلیمنٹ فقط امیر کا انتخاب کر کے اس کی مجلس مشاورت کی حیثیت میں کام کرے گی جب تک امیر امیر ہے یہ مجلس مشاورت محض اس کی مشیر ہے۔ مجلس مشاورت کے مختلف اراکین صرف وہی خدمات انجام دیں گے جو امیر ان کے سپرد کرے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض معاملات میں ان مشیروں کو مکمل ذمہ داری بھی سونپ دی جائے مثلاً ہر میونسپلٹی کے صدر کو بہت سے مقامی اختیارات حاصل ہوں گے۔

مشاورت اہل الرائے سے ہونی چاہیے نہ کہ اناڑیوں سے

اصولاً قومی سرکار یہ دستور قطعاً بند کر دے گی کہ سیاسی اور اقتصادی مسائل پر ان لوگوں سے رائے حاصل کی جائے جو ان مسائل سے بالکل نابلد اور ناواقف ہوتے ہیں نہ انہوں نے کوئی خصوصی تربیت حاصل کی ہوتی ہے، نہ ان مسائل کا نہیں ذاتی تجربہ ہوتا ہے سرکار اپنی نمائندہ مجالس کو اس طرح مختلف شاخوں میں تقسیم کرے گی کہ ہر پیشہ اور فن کے ماہرین ایک طرف اپنی جداگانہ شاخ کے رکن ہوں گے، اور دوسری طرف اجتماعی سیاسی مسائل پر بحیثیت مجموعی رائے دینے کے لیے وہ ایک مرکزی اجلاس میں جمع ہو جایا

کریں گے۔

ان ماتحت شاخوں اور مرکزی اجلاس کے مابین مکمل تعاون قائم کرنے کے لیے چیدہ افراد کا ایک بالا دست ادارہ قائم کیا جائے گا۔ یہ بالا دست ادارہ ماہرین خصوصی کی سینٹ کا ہوگا۔

سینٹ یا مرکزی اجلاس میں کبھی ووٹ لینے کی نوبت نہ آئے گی یہ مجلس کام کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے نہ کہ ووٹ دینے کے لیے۔ ہر رکن کو مشورہ دینے کے طور پر اپنی رائے کا ووٹ ظاہر کرنے کا اختیار ہوگا لیکن اس رائے یا ووٹ کا آخری فیصلہ کے اختیار سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اس اصول کا منشاء یہ ہے کہ مکمل اختیارات سونپ کر مکمل طور پر ذمہ داری کا تعین کیا جائے اس اصول کے تحت منتخب لیڈروں کا ایک گروہ قوم کے سامنے آ جائے گا موجودہ زمانہ میں پارلیمنٹ نے جو غیر ذمہ داری کی فضا پھیلا دی ہے اس کے پیش نظر اس قسم کی ذمہ دار قیادت کا تصور کرنا بھی محال ہو گیا ہے۔

اس طرح قوم کی سیاسی تشکیل انہیں اصولوں کے ماتحت عمل میں لائے گی جن کے ماتحت ہماری قوم اقتصادی اور ثقافتی عظمت حاصل کر چکی ہے۔

دنیا ہمیشہ سے جمہوریت کے ماتحت نہیں بلکہ کسی مرشد کے ماتحت رہی ہے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اصولوں پر عمل کرنا ممکن بھی ہے؟ میں جواب کے طور پر اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ دنیا پر ہمیشہ اس جمہوریت کا راج نہیں رہا جس کے ماتحت کثرت رائے سے فیصلے کیے جاتے ہیں جمہوریت تاریخ عالم کے دوران ہمیشہ عارضی وقفوں کے لیے برسر اقتدار آئی جب جمہوریت برسر اقتدار آئی تو یہ زمانہ ہمیشہ قوموں اور سرکاروں کے زوال کا زمانہ رہا ہے۔

ہاں کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایسا بنیادی انقلاب فقط زبانی جمع خرچ سے بپا کیا جا

سکتا ہے یا ایسا انقلاب پہلے حکومت کے بالائی حلقوں میں قائم کر کے پھر اس کا اثر نیچے تک پہنچایا جا سکتا ہے میں نے جس تبدیلی کا نقشہ کھینچا ہے، یہ محض سرکار کا آئین حکومت بدلنے تک محدود نہیں اس تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی اور شہری زندگی میں بھی انقلاب پیدا کرنا ہوگا یہ انقلاب صرف ایک ایسی تحریک کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے، جو خود اسی اصول پر منظم کی جائے پھر اسی اصول کی تڑپ سے اس میں ولولہ پیدا کیا جائے ایسی تحریک کے اندر ایسی سرکار قائم کرنے کا بیج موجود ہوگا۔

غرض آج قوم پرست اشتراکی تحریک کا فرض ہے کہ وہ ان اصولوں کو پوری طرح سمجھ لے اور پھر خود اپنی تنظیم کے اندر ان اصولوں پر پورا عمل کرے۔ اس طرح یہ تحریک نہ صرف مستقبل میں ہماری سرکار کی رہنمائی کی خدمت انجام دے سکے گی، بلکہ خود تحریک کی تنظیم میں یہ ہدایت پیدا ہو جائے گی کہ وہ بعد میں سرکار کا ہاتھ بٹا سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب پنجم :: ”ضابطہ حیات کی نوعیت اور تحریک کی تنظیم کا باہمی رشتہ“

یہودی کرہ ارض کو اپنی وراثت سمجھتے ہیں

میں نے گزشتہ ابواب میں ”قومی سرکار“ کا ایک عام اور موٹا سا خاکہ کھینچا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ چونکہ ہم نے قومی سرکار کے قیام کی لابندی شرائط شمار کر لی ہیں، لہذا محض یہ شرطیں گنوانے سے قومی سرکار کے قیام کا بندوبست ہو جائے گا یہ جان لینا کافی نہیں کہ قومی سرکار کی نوعیت کیا ہوگی قومی سرکار کے قیام کا بندوبست کرنا اس سے زیادہ ضروری ہے آج جو سیاسی جماعتیں موجود ہیں، اور موجودہ سرکار سے نفع حاصل کر رہی ہیں، ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اس نظام میں کوئی تبدیلی پیدا کر دیں گی یا خود بخود اس نظام کے متعلق اپنی روش بدل ڈالیں گی آج کل زمانہ اختیار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ یہودی تھے، یہودی ہیں اور یہودی رہیں گے اس لیے ان ارباب اختیار کی جانب سے سرکار میں کسی انقلاب کی امید رکھنا ناممکن ہے موجودہ زمانہ کے جن رجحانات کا تذکرہ ہم نے سابقہ صفحات میں کیا ہے اور جن سے ہمیں آج کل سامنا ہے، اگر ان کے تدارک کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو عالمگیر صیہونی اقتدار کا خواب پورا ہو جائے گا یہ خواب پورا ہو گیا تو یہودیوں کی یہی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو گی کہ ایک روز یہودی دوسری سب قوموں پر غالب آ جائیں گے، اور اس کرہ زمین کے برگزیدہ وارث ہوں گے۔

یہودی فقط اپنی امت کا خیر خواہ ہے

آج کل جرمن قوم کے ہزارہا افراد یا تو کھاتے پیتے طبقات میں شامل ہیں اور یا پھر کنگال شاہی کے منصوبے بنانے والی سیاسی جماعتوں کی رکنیت قبول کر چکے ہیں ان

دونوں اقسام کے جرمن اپنی بزدلی، سستی اور بیوقوفی کے باعث قوم کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں برعکس اس کے یہودی اپنے راستہ پر استقامات سے سرگرم سفر ہے وہ اپنی توجہ کبھی اپنی منزل مقصود سے ہٹنے نہیں دیتے جس جماعت کی قیادت یہودیوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ کبھی یہودیوں کے ملی مقاصد سے سرمو انحراف نہ کرے گی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ یہودیوں کے مفاد، اور آریا قوموں کے مفاد میں مشرق ومغرب کی تفاوت ہے۔

اگر ہم قومی سرکار کے متعلق اپنے خواب کو حقیقت کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان طاقتوں سے بچ کر رہنا ہوگا جو آج عوامی زندگی پر قابض ہیں ان طاقتوں کی جگہ ہمیں ایسی طاقتیں تلاش کرنا ہوں گی جو ہمارے نصب العین کو قبول کر کے اس کی خاطر جنگ لڑنے پر آمادہ ہوں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے نصب العین کے حصول کی خاطر جنگ ہی لڑنی پڑے گی ہمارا اولین مقصد قومی سرکار کے نظریہ کی تبلیغ نہیں، بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ آج جو یہودی سرکار قائم ہے، اسے ختم کر دیا جائے۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی نظام قائم کرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا کہ نئے نظام کے لیے میدان صاف کرنا تعصب اور خود غرضی مل کر نئے نظریہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں یہ متحدہ محاذ ہر وسیلہ سے نئے نظریہ کی کامیابی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے متعصب اور خود غرض لوگ اس لیے نئے نظریہ کے مخالف ہوتے ہیں کہ نیا نظریہ یا انہیں ناپسند ہوتا ہے، اور یا خود ان کے وجود کا دشمن۔

تعمیر سے پہلے تخریب کی ضرورت ہوتی ہے

یہی وجہ ہے کہ ہر نئے عقیدہ کے حامیوں کو بجائے تعمیری کام کرنے کے متعلق اپنی امنگیں پوری کرنے کے سب سے پہلے ایک تخریبی جنگ لڑنی پڑتی ہے، تاکہ موجودہ صورت حال کا خاتمہ کیا جا سکے۔

کوئی ایسا نظریہ جس کے اصول بالکل اچھوتے ہوں، اور کچھ اہمیت بھی رکھتے ہوں، ہمیشہ اپنی تبلیغ کا آغاز مخالفین پر سخت تنقید سے کرتا ہے یہ شدید تنقید ایک ایسا حربہ

ہے کہ چاہے وہ نئے عقیدہ کے حامیوں کو برا معلوم ہو لیکن اس کے استعمال کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔

آج کل جو لوگ امت کے عقیدہ کے حامی کہلاتے ہیں، انہیں تاریخی ارتقاء کے اصولوں کا نہایت سطحی علم ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بار بار زور دیتے ہیں کہ منفی تنقید سے کسی حالت میں کام نہ لیں گے برعکس اس کے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیشہ تعمیری کام کریں گے ایسی باتیں فضول بکواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں موجودہ زمانہ کے نام نہاد امت پرست ایسی ہی بکواس کے عادی ہیں اس سے ان کی حقیقت کھل جاتی ہے ان کی ایسی باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے موجودہ زمانہ کی تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مارکس ازم کو بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کا مسئلہ درپیش تھا مارکس ازم بھی تعمیری کام سرانجام دینا چاہتا ہے اگرچہ مارکس ازم کے ''تعمیری کام'' کا منشا صرف یہ ہے کہ بین الاقوامی یہودی سرمایہ داروں کا استبدادی راج قائم کر دیا جائے۔ باوجود اس کے ستر سال تک مارکس ازم کی اکثر و بیشتر توجہ صرف تنقید پر مبذول رہی۔ ذرا سوچو تو یہ تنقید کیسی مہلک اور تباہ کن ثابت ہوئی تنقید کی جاتی رہی بار بار وہی تنقید دوہرائی جاتی رہی، حتیٰ کہ اس تنقید کا تیزاب پرانی سرکار کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ گیا، اور ایک روز اس سرکار کا تمام ڈھانچہ کھوکھلا ہو کر رہ گیا اور ریزہ ریزہ ہو گیا جب یہ کام ہو چکا تب مارکس ازم نے اپنا نام نہاد تعمیری کام شروع کیا۔

ہر اثبات سے پہلے نفی لازمی ہے

مارکس ازم کا یہ طرز عمل فطرت، منطق اور مصلحت کے عین مطابق تھا کوئی رائج الوقت نظام کبھی خالی خولی اعلانات اور نئے نظام کے قیام کی خواہش سے نہیں مٹا۔ یہ توقع ہی نہ رکھنی چاہیے کہ جو لوگ موجودہ نظام کے حامی ہیں اور ان کے مفاد اس نظام سے وابستہ ہیں، وہ فقط نئے نظام کی ضرورت ثابت کر دینے سے اس کے حامی بن جائیں گے برعکس اس کے اکثر ہوتا یہ ہے کہ دو متصادم نظام پہلو بہ پہلو چلنے لگتے ہیں جو

نیا عقیدہ بطور ایک ضابطہ حیات کے مسابقت کے میدان میں مقابلہ کی خاطر اترا تھا وہ اب ایک سیاسی پارٹی بن کر رہ جاتا ہے اس حیثیت سے وہ کبھی بعد میں نجات حاصل نہیں کر سکتا وجہ یہ کہ ایک ضابطہ حیات ہمیشہ رواداری کا مخالف ہوتا ہے کبھی کوئی ضابطہ حیات اپنے پہلو بہ پہلو دوسرے ضابطہ حیات کی بقا کا روادار نہیں ہوتا ہر ضابطہ حیات صرف اپنے قیام اور اپنے اوپر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے ایک ضابطہ حیات چاہتا ہے کہ قومی زندگی کا ہر پہلو اس کے اصولوں کے مطابق بدل دیا جائے ایک ضابطہ حیات کبھی اپنے آس پاس سابقہ حالات کے آثار قائم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہی حال مذاہب و ادیان کا ہے۔

عیسائیت نے فقط اس پر اکتفا نہ کی تھی کہ بت پرستوں کے مندروں کے پہلو بہ پہلو، عیسائیوں کے گرجے بھی کھڑے ہو جاتے، نہیں بلکہ عیسائیت نے پہلے کافروں کے مندر گرانے پر توجہ دی۔ یہ اسی متعصبانہ عدم رواداری کی برکت تھی کہ عیسائیت کا دین اپنے پیروؤں کی نگاہ میں ایک ''مسلمہ حقیقت'' کی صورت اختیار کر گیا۔ بغیر رواداری کا خون کیے کبھی ''مسلمہ دین'' کا تصور پرورش نہ پا سکتا تھا۔

تعصب کا مقابلہ عصبیت سے ہی ممکن ہے

شاید یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ تاریخ عالم میں جس قسم کے واقعات کی ہم نے مثالیں پیش کیں ہیں، درحقیقت وہ ہمیشہ یہودیوں کے مخصوص طرز فکر کا نتیجہ تھیں یہ تعصب اور عدم رواداری دراصل یہودی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں ممکن ہے یہ اعتراض سو فیصدی درست ہو اگر یہ اعتراض درست ہے تو میں اس پر سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتا بنی نوع انسان کی تاریخ میں تعصب اور عدم رواداری کی مثالیں در پیش آنا، آخر افسوس ہی کی بات تو ہے مان لیجئے کہ یہ عادتیں فطرت انسانی کے خلاف ہیں لیکن یہ مان لینے سے وہ حقائق نہیں بدل جاتے جو آج ہمیں درپیش ہیں جو لوگ جرمن قوم کو اس کی موجودہ زبوں حالی سے نجات دلانا چاہتے ہیں وہ خالی یہ سوچ کر اپنا سر

پیٹنے پر اکتفا نہیں کر سکتے کہ یوں نہ ہوتا تو کیا اچھا ہوتا ہمیں تو یہ دریافت کرنا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ موجود ہے اس سے نجات حاصل کرنے کی کیا ضرورت اور کون سی ترکیب ہے جب ہمیں ایک فلسفہ حیات سے سامنا ہے جس کی پشت پر جہنمی تعصب کا جذبہ کام کر رہا ہے، تو ایسے عقیدہ کا مقابلہ کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم بھی ایسے ہی شدید جذبہ سے تڑپ کر اس کے سامنے ڈٹ جائیں ہم بھی ویسا ہی مضبوط ارادہ کر لیں ہمارا یہ عقیدہ ایک نیا عقیدہ ہو گا یہ ایک پاکیزہ عقیدہ ہو گا صرف یہی عقیدہ سچا ہو گا۔

اینٹ کا جواب پتھر ہی دے سکتا ہے

ممکن ہے آج ہم سب اس پر اظہار افسوس کے لیے آمادہ ہو جائیں کہ عیسائیت کی ترویج کا آغاز پہلا موقعہ تھا جب روحانی تشدد اور جبر کی ابتدا کی گئی۔ ورنہ اس سے پہلے پرانی دنیا میں تو ضمیر کی خاصی آزادی ہوا کرتی تھی لیکن ہمارے اس اظہار افسوس سے یہ حقیقت نہیں بدلی جا سکتی کہ وہ دن اور آج کا دن جبر کا جواب صرف جبر ہے تشدد کا جواب صرف تشدد ہے اینٹ کا جواب پتھر ہے سوائے اس کے نظام نو کے قیام کے لیے تعمیری کوشش شروع کرنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں سیاسی جماعتیں ہمیشہ مصالحت اور سودے بازی پر آمادہ رہتی ہیں لیکن ایک ضابطہ حیات کبھی مصالحت نہیں کرتا سیاسی جماعتیں اپنے مخالفین کو راضی کرنے کی خاطر اپنی تعلیمات میں ترمیم قبول کر لیتی ہیں لیکن ایک ضابطہ حیات کہتا ہے میں بھی غلط ہوں اور میرے سوا سب غلط ہیں۔

دشمن سے نفرت کرنی چاہیے

شروع شروع میں تو سیاسی جماعتیں بھی ہمیشہ یہی امنگ لے کر میدان میں نکلتی ہیں کہ صرف خود برسر اقتدار آئیں گی اور اپنی من مانی کریں گی۔ سیاسی جماعتیں ہمیشہ ایک ضابطہ حیات بننے کا تھوڑا بہت میلان رکھتی ہیں لیکن ان سیاسی جماعتوں کے پروگرام ایسے محدود ہوتے ہیں کہ ان کے اندر وہ شجاعانہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کے بغیر کسی ضابطہ حیات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان سیاسی جماعتوں میں مصالحت اور سودا بازی کا

جو جذبہ پایا جاتا ہے، اس کے باعث ان جماعتوں میں صرف وہی تھڑ دلے اور مرغی کے چوزے کا سا حوصلہ رکھنے والے لوگ شامل ہوتے ہیں، جو کبھی غازیوں کی یلغار کا مطلب سمجھ نہیں سکتے یہی وجہ ہے کہ ابھی انہوں نے گھر کی دہلیز سے ایک پاؤں بھی باہر نہیں نکالا ہوتا کہ ان کے سینے سکڑ نے اور دل دھڑ کنے لگتا ہے وہ کسی عقیدہ کی خاطر جنگ کرنے کے نا اہل ہوتے ہیں وہ بہت جلد برسر اقتدار نظام کے سایہ میں کوئی حقیری جگہ حاصل کرنے کے شوق میں ایسا وطیرہ اختیار کر لیتے ہیں جس کا نام ان بدبختوں نے "مثبت تعاون" رکھ چھوڑا ہے جب انہیں موجودہ نظام کے ماتحت کوئی ایسی معمولی جگہ مل جاتی ہے، تو پھر جب تک ان کا بس چلے، یہ وہیں چپکے رہتے ہیں بس ان کی ہمتوں اور کوششوں کا یہیں خاتمہ ہو جاتا ہے پھر اگر ان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ اکھڑ اور وحشی مزاج مرغا انہیں ان کے کھانچہ سے نکال باہر کرے، تو پھر یہ خوشامدانہ اذانیں دے کر دوبارہ کسی نہ کسی طرح وہیں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اس وضع اور قماش کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی ٹولی جمع ہو جاتی ہے، جن میں سے ہر ایک کو وہی دانے دنکے کی ہوس ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک پہلی قطار میں کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے اس محبوب ڈربے میں داخل ہونے کے اشتیاق میں اپنے مقدس ترین اعتقادات بھی ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں بس یہ شرط ہے کہ ان کی چونچ ہری رکھنے کو چارہ ملتا رہے۔ یہ لوگ سیاسیات کے میدان میں لیڈر نہیں گیدڑ کہلانے کے مستحق ہیں۔

لڑائی میں ہر وہ ہتھیار جائز ہے جو کارگر ہو

برعکس اس کے ایک ضابطہ حیات کبھی اپنی جگہ کسی دوسرے نظام کے ساتھ بانٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا ایک ضابطہ حیات کبھی ایسے نظام کے ساتھ تعاون نہیں کرتا جس کی وہ مذمت کر چکا ہو۔ ایک ضابطہ حیات موجودہ نظام کے خلاف ہر ہتھیار سے جنگ جائز سمجھتا ہے وہ موجودہ نظام کے تصورات کی تمام دنیا سے برسر پیکار رہتا ہے ایک ضابطہ حیات اپنے سوا تمام خیالات کو تباہ کر کے مٹائے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

غرض ایک ضابطہ حیات کو برسر اقتدار لانے کی جنگ میں کبھی منفی حربے اختیار کرنے پڑتے ہیں ان منفی حربوں سے دشمن کو جو خطرہ لاحق ہوتا ہے، دشمن بھی اس سے غافل نہیں رہتا اس لیے دشمن ان کے مقابلہ کی خاطر ایک متحدہ محاذ قائم کر کے ان منفی حربوں کی مذمت کرتا ہے کبھی ایک ضابطہ حیات کو برسر اقتدار لانے کے لیے مثبت حربے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں نئے عقیدہ کو کامیاب بنانے کے لیے ان مثبت حربوں کا جارحانہ ہونا لازمی ہے بہر حال حربے مثبت ہوں یا منفی، ان کو استعمال کرنے کے لیے آہنی عزم رکھنے والے جنگجوؤں کے ایک حلقہ کی حاجت ہوا کرتی ہے۔

الیکشن کی ہنڈکلھیا میں ووٹروں کا پکوان

ایک نیا فلسفہ حیات صرف اسی صورت میں اپنے خیالات کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے جب اس دور کے دلیرترین اور مستعدترین عناصر اس کی پشت پناہی پر آمادہ ہو جائیں اس کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ جس قوم میں یہ فلسفہ حیات رائج کرنا ہے اس کے بہترین افراد اس نئے فلسفہ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں پھر اس نئی تحریک کے پیرو ایک مضبوط عسکری تنظیم میں منظم کر دیئے جائیں یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اعتقادات کی طویل فہرست میں سے وہ خیالات چننے ہوں گے جو مذکورہ بالا عناصر اور افراد کے لیے کشش رکھتے ہوں ان خیالات کو واضح اور موثر الفاظ میں بیان کرنا ہوگا نئی تحریک کے پیروؤں کے لیے یہ جدید اصول شرائط ایمان کی حیثیت کے مالک ہوں گے ایک عام سیاسی جماعت کا پروگرام تو بس الیکشن کی ہنڈکلھیا میں کامیاب نتائج کا پکوان تیار کرنے کا نسخہ ہوتا ہے برعکس اس کے ایک ضابطہ حیات کا پروگرام موجودہ نظام، موجودہ حالات مختصر یہ کہ موجودہ ضابطہ حیات کے خلاف ایک اٹل اعلان جنگ ہوتا ہے۔

ہر سپاہی کے دل میں کمانڈر جیسا ولولہ ہونا چاہیے

یہ ضروری نہیں کہ ایک نئے عقیدہ کی خاطر لڑنے والا ہر سپاہی تحریک کے قائدین

کے تمام بنیادی تصورات اور منصوبوں سے واقف ہو ضرورت صرف یہ ہے کہ ہر سپاہی کو بنیادی اعتقادات کا علم ہو، چند بنیادی اصول اس کے ذہن نشین ہو چکے ہوں اسے یہ یقین ہو چکا ہو کہ تحریک کو چلانا اور تحریک کے عقیدہ کو کامیاب بنانا نہایت ضروری ہے ہر سپاہی کو تحریک کے نقشہ جنگ کا علم لازمی نہیں سپاہی کو تو صرف مضبوط ڈسپلن کا پابند لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے اسے اپنے مقصد کے اعلیٰ اور منصفانہ ہونے کا پختہ یقین ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اس کے دل میں جذبہ اور ولولہ ہونا چاہیے تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی غیر مشروط ہونی چاہیے تحریک کے ہر مقلد کو تحریک کے آخری نصب العین کا علم ہونا چاہیے اور یہ یقین ہونا چاہیے کہ تحریک کا مقصد شاندار ہے تحریک کو چلانے والوں کے ارادے مصمم ہیں۔

مقلدین کے بغیر امام اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا

فرض کیجئے کسی فوج کا ہر سپاہی سالار ہو فرض کیجئے ہر سپاہی نے سپہ سالاری کی تربیت حاصل کی ہو فرض کیجئے ہر سپاہی میں سپہ سالار کی استعداد بھی ہو ایسی فوج کا انجام کبھی بخیر نہ ہو گا اسے کبھی جنگ میں کامیابی نہ ہو گی علی ہذا القیاس کوئی سیاسی تحریک کسی ضابطہ حیات کے حصول کے لیے مفید نہیں ہو سکتی اگر اس کا ہر رکن دانشور کہلانے کا مستحق ہے نہیں نہیں !! سادہ لوح سپاہیوں اور مقلدین کی بھی حاجت ہے اس کے بعد تحریک میں ڈسپلن قائم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تحریک تبھی قائم رہ سکتی ہے جب قائدین اعلیٰ ذہنی قابلیت کے مالک ہوں ان قائدین کے ماتحت مقلدین کی ایک کثیر تعداد ہو جو پورے اخلاص اور جذبہ سے تحریک کے نصب العین کے حامی ہوں ایک تحریک کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں شرطیں پوری ہوں دو سو جوانوں کے کسی ایسے فوجی دستہ میں ڈسپلن قائم رکھنا بالاخر بدرجہا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جس کا ہر فرد ذہین اور اہل ہو، برخلاف اس کے دو سو جوانوں کے ایک ایسے فوجی دستہ میں ڈسپلن قائم رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے جہاں ایک سو نوے افراد ذرا کم

لائق ہوں اور دس افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔

تحریک کو ان پڑھوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے

جمہوریت پرست اشتراکیوں نے اس حقیقت کو سمجھ کر بڑا فائدہ اٹھایا ہے جرمن عوام میں سے اکثر جب عسکری تربیت کی معیاد پوری کر کے گھر آتے ہیں تو انہوں نے ضبط کی پابندی اور اطاعت کے اصول سیکھ لیے ہوتے ہیں اس مرحلہ پر جمہوریت پرست اشتراکی لپک کر آگے بڑھتے اور عوام کے اس گروہ کو جمہوریت پرست اشتراکیت کی جماعت کے ڈسپلن کے ماتحت لے آتے ہیں یہ نیا جماعتی ڈسپلن اس ڈسپلن سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جوان نوجوانوں نے عسکری تربیت کے دوران میں سیکھا تھا جمہوریت پرست اشتراکیوں کی تنظیم گویا ایک فوج تھی، جو آگے جا کر افسروں اور سپاہیوں میں بٹی ہوئی تھی ایک جرمن مزدور جب اپنی عسکری تربیت کی معیاد پوری کر کے گھر آتا تو وہ اس تحریک کی فوج کا سپاہی بن جاتا اس فوج کے افسر یہودی دانشور تھے جرمنی میں ٹریڈ یونینوں کے عہدیداران گویا اس فوج کے جمعدار ہوتے تھے اس تحریک کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ صرف غیر تعلیم یافتہ طبقات اس تحریک میں شامل ہوتے تھے لیکن ہمارے متوسط طبقہ کے لوگ اس امر کو درخوار اعتنا نہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک میں صرف غیر تعلیم یافتہ لوگ شامل ہو رہے ہیں نتیجہ یہ تھا کہ کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں زیادہ تر دانشوروں کی ٹولیاں ہوتی تھیں یہ ٹولیاں محض نکمے افراد پر مشتمل ہوتی تھیں، جن میں کوئی ڈسپلن نہ پایا جاتا تھا برعکس اس کے مارکس ازم کی فوج کے سپاہی پڑھے لکھے اور ذہین نہ تھے مارکس ازم کے لیڈروں نے اس فوج کو تربیت دے کر اپنی جماعت کے لیے ایسے سرفروش تیار کر لیے تھے جو اپنے یہودی آقاؤں کی اسی طرح اندھا دھند فرمانبرداری کرتے تھے جیسے وہ فوج میں جرمن افسر کی اطاعت کرتے آئے تھے جرمنوں کے متوسط طبقہ نے اس قسم کے حقیر مسائل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا انہیں نے کبھی غور نہ کیا کہ مارکس ازم کی فوج میں فقط غیر تعلیم یافتہ افراد کی شمولیت کیسا معنی خیز نکتہ ہے انہوں نے یہ

بھی نہ سوچا کہ اس میں کیا خطرات پوشیدہ ہیں وہ تو اس خیال میں مگن تھے کہ جب کسی سیاسی تحریک کے تمام مقلدین پڑھے لکھے حلقوں سے تعلق رکھتے ہوں تو یہ بات بجائے خود اس تحریک کے کلاہ میں سرخاب کا پر لگانے اور اسے کامیابی تک پہنچانے کے لیے کافی ہے ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی تحریک کے برسر اقتدار آنے کے امکانات زیادہ ہیں برعکس اس کے جو سیاسی جماعت ان پڑھ عوام پر مشتمل ہو، اس کی کامیابی کا کیا امکان ہو سکتا ہے ان حضرات کو یہ سمجھ بالکل نہ تھی کہ کسی تحریک کی طاقت کا سرچشمہ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے عام اراکین کا ذہنی معیار اور روحانی مقام کتنا بلند ہے، بلکہ تحریکوں کی طاقت کا معیار تو یہ ہوتا ہے کہ کسی تحریک کے عام پیرو اس تحریک کے فکری قائدین کی تعمیل کس سرگرمی سے بجا لانے پر آمادہ ہیں اصل فیصلہ کن امر یہ ہے کہ تحریک کی قیادت کس نوع کی ہے جب دو فوجیں لڑیں تو فتح اس فریق کی نہ ہوگی جس کے عام سپاہی حیلہ ہائے جنگ کے علم پر عبور رکھتے ہیں، بلکہ فتح تو اس فریق کی ہوگی جس کے قائدین برتر ہیں اور جس کے ڈسپلن کا معیار بلند تر ہے ڈسپلن کے معیار کا مطلب یہ ہے کہ سپاہی بہترین تربیت یافتہ ہوں اور انہیں جو حکم دیا جائے اس پر آنکھ میچ کر عمل کریں۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے کہ جب کسی ضابطہ حیات کو عملی جامہ پہنانا ہو تو یہ سچائی ہمیشہ مد نظر رکھنی چاہیے۔

لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرنی چاہیے

اگر ہم کسی ضابطہ حیات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو یہ لازمی ہے کہ اس ضابطہ حیات کی بنا پر لڑنے والی ایک تحریک قائم کی جائے جب تحریک قائم ہو گی تو یہ منطقی لاحقہ ہے کہ اس تحریک میں شامل ہونے والے انسانوں کے میلانات بھی مد نظر رکھنے ہوں گے تحریک کا نصب العین اور بنیادی اصول بالکل واضح اور معین ہونے چاہئیں حتیٰ کہ ان کے متعلق غلط فہمی کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے اسی طرح پراپیگنڈا کا پروگرام بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے یہ پروگرام بناتے وقت ملحوظ رکھنا چاہیے کہ پراپیگنڈہ میں ان لوگوں کے

ذہن پر اثر کرنے کی استعداد ہونے چاہیے جن کی قبولیت کے بغیر بلند ترین خیالات بھی خیالات کی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اگر قومی سرکار کا تصور آج ایک موہوم خواہش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اگر اس موہوم خواہش نے ایک دن کھلی اور واضح کامیابی کی صورت اختیار کرنا ہے،تو یہ لازم ہے کہ ''قومی سرکار'' کے مجہولی معنی اور وسیع تصور کو چند ایسے واضح اصولوں کے قالب میں ڈھالا جائے جو اپنی طبعی اور داخلی کشش سے عوام کو اپنا مقلد بنالیں جب تک عوام ان اصولوں کے مقلد نہ بن جائیں گے تب تک ان اصولوں کی خاطر جنگ کون لڑے گا یہ جنگ صرف جرمن مزدور ہی لڑ سکتے ہیں۔

کلمہ ایمان کی ضرورت

یہی وجوہات تھیں جنہیں مدنظر رکھتے ہوئے ہماری نئی تحریک کا پروگرام چند بنیادی اصولوں کی شکل میں واضح کر دیا گیا تھا ان بنیادی اصولوں یا نکات کی تعداد پچیس ہے ان نکات کا اولین مقصد یہ ہے کہ ایک عام شخص کو پتہ چل جائے کہ ہماری تحریک کا نصب العین کیا ہے گویا یہ نکات ہمری تحریک کے لیے کلمہ ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں اس کلمہ ایمان سے ایک طرف تو تحریک میں شامل ہونے والے مقلدین کو فیض حاصل ہوگا دوسری طرف کلمہ ایمان کی پیروی سے تحریک میں شامل ہونے والے مقلدین کے مابین یک جہتی اور اتحاد قائم رہے گا۔

اس مسئلہ میں ہمیں حسب ذیل حقیقت نہیں بھولنی چاہیے۔

کلمہ ایمان بدلا نہیں جا سکتا

جہاں تک تحریک کے نصب العین کا تعلق ہے، وہ اصولاً بالکل سچا ہے لیکن جہاں تک اس نصب العین کے پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں بعض نفسیاتی مصلحتیں مدنظر رکھی گئی ہیں لہذا وقت گزرنے پر یہ ممکن ہے کہ بعض اصول بالفاظ دیگر پیش کرنے کی تجویز سامنے آئے بدلتے ہوئے حالات میں یہ تبدیلی الفاظ ہمارے مفہوم کو شاید بہتر طریقہ پر ادا

بھی کرتے ہوں لیکن الفاظ بدلنے کی کوششیں اکثر مہلک نتائج پیدا کرتی ہیں وجہ یہ ہے کہ آخر پروگرام کی کوئی بنیاد تو ناقابل تبدیل اور مستحکم بھی ہونی چاہیے جس پر ہمیشہ بحث کی بنیاد قائم کی جا سکے جونہی کوئی نکتہ یا اس کا ایک شوشہ بھی تبدیل کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اصولی تیقن میں فرق آجاتا ہے اس تبدیلی سے صرف الفاظ نہیں بدلتے ممکن ہے نئے الفاظ بہتر ہوں، اور وہ مطلب بھی بہتر اسلوب سے ظاہر کر سکتے ہوں، لیکن اس کے بعد بحث مباحثہ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس سے چاروں جانب گڑبڑ مچ جاتی ہے اس لیے ان حالات میں ہمیشہ غور سے سوچنا چاہیے کہ نئے اور بہتر الفاظ اختیار کرنا ضروری ہے یا تحریک کے اندر داخلی اختلافات پیدا کرنے سے بچنا زیادہ ضروری ہے ایسے حالات میں پرانے الفاظ قائم رکھنا زیادہ بہتر ہو گا ممکن ہے پرانے الفاظ کی بندش چست نہ ہو لیکن یہ قدیم الفاظ بجائے خود ایک ٹھوس اور بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو بدلنا ہی ٹھیک ہے چونکہ الفاظ کی تبدیلی کا تعلق صرف ظاہری صورت سے ہوتا ہے اس لیے تصحیح مناسب اور ممکن نظر آتی ہے لیکن تہہ پر نظر ڈالیے اور پورا تجزیہ کیجئے تو عام مخلوق کے خیالات ہمیشہ سطحی ہوتے ہیں اس لیے اس قسم کی تبدیلیوں کے باعث سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ جس تبدیلی کا مقصد صرف پروگرام کی شکل بدلنا ہے، عوام اس سے یہ مطلب لیں گے کہ تحریک کا نصب العین بھی بدل گیا ہے اس طرح تحریک کے اعتقادات کو رائج کرنے کے عزم بالجزم اور مقلدین کے جذبہ کی جنگجوئی میں ضعف پیدا ہو جائے گا یوں جو قوت تحریک کو بیرونی دنیا میں غالب کرنے میں صرف ہونی چاہیے وہ پروگرام کے متعلق اندرونی اختلافات اور بحث و مباحثہ میں ضائع ہو جائے گی۔

عقیدہ اٹل ہونا چاہیے، عمل میں لچک ہو سکتی ہے

جب ایک عقیدہ فی نفسہ درست ہے تو اس میں کیا خطرہ ہے کہ اس عقیدہ کے اظہار کے لیے وہی پرانے الفاظ استعمال کیے جائیں، جن میں اب اصلاح کی گنجائش پیدا ہو

چکی ہے عقیدہ کے اظہار کے پرانے الفاظ بدلنے کی کوشش کی گئی تو تحریک کا یہ بنیادی اصول جسے آج تک چٹان سمجھا جاتا رہا، ریزہ ریزہ ہوکر رہ جایگا اور اختلاف رائے اور بحث کی دھول اڑنے لگے گی اس کے نتائج افسوسناک بھی ہوسکتے ہیں پھر اگر یہ تحریک ابھی اپنی کامیابی کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے تو اس قسم کی بدعتوں سے بچنا ہی چاہیے عوام کو کسی ایسے عقیدہ کے متعلق اندھا دھند اعتقاد میں کس طرح پابند کیا جاسکتا ہے جبکہ ہر روز اس عقیدہ کو بیان کرنے والے الفاظ بدلے جارہے ہوں۔

کسی تعلیم کی حیثیت اس کے الفاظ میں مضمر نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصل قدر و قیمت تو اس کے مطالب و معانی پر منحصر ہوتی ہے تحریکوں کے داخلی مطلب و معانی نہیں بدلا کرتے ہر تحریک کا مفاد اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ انتشار و اختلاف اور شک وشبہ سے بچتی رہے ہر تحریک کی کامیابی کے لیے اتحاد کی طاقت درکار ہوتی ہے۔

سائنس کے اصول بدلتے رہتے ہیں، لیکن دین اپنی جگہ قائم ہے

یہاں پر ہم کیتھولک کلیسا سے ایک سبق سیکھ سکتے ہیں اگرچہ اس کلیسا کے کئی اصول بارہا موجودہ تحقیقی علوم کی تعلیمات سے ٹکراتے ہیں، اور بسا اوقات یہ ٹکراؤ بالکل غیر ضروری ہوتا ہے الفاظ کے معمولی ہیر پھیر سے یہ تصادم رد کیا جاسکتا ہے، لیکن کیتھولک کلیسا اپنی تعلیمات کا ایک شوشہ بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتا کیتھولک کلیسا نے یہ حقیقت خوب سمجھ رکھی ہے کہ اگر اعتقادات میں ہر روز کانٹ چھانٹ ہونے لگی تو اس طرح کلیسا کی قوت مدافعت میں ضعف آجائے گا سائنس کی تحقیقات کے نتیجے تو عارضی ہوتے ہیں اور یہ ہر روز بدلتے رہتے ہیں دین کیسے ہر روز سائنس کی ان تعلیمات کی پیروی میں اپنی صورت بدل سکتا ہے اسی لیے کلیسا نے ایک مستقل فیصلہ کر رکھا ہے کہ دین کے اصول اٹل اور ناقابل ترمیم ہے یہی وجہ ہے کہ کلیسا کی بنیادیں آج بھی اتنی ہی قوی ہیں جتنی گزشتہ زمانہ میں مضبوط تھیں ہم باآسانی پیشین گوئی کرسکتے ہیں کہ دنیا کی ہر روز نیا روپ بدلنے والی علمی تعلیمات کے طوفان میں دین کی یہ محکم چٹان ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی

جانب کشش کرتی رہے گی، جو اس کی ثابت قدمی سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے نت نئے اعتقادی تزلزل سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تحریک کے اصول پتھر کی لکیر ہونے چاہئیں

اندریں حالات جو شخص پوری سنجیدگی اور صمیم قلب سے قومی سرکار کے نظریہ کو کامیاب بنانا چاہتا ہے، اسے ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس کامیابی تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے وہ راستہ یہ ہے کہ ایک سرفروش عسکری تحریک کھڑی کی جائے اس تحریک کی مضبوط بنیادیں چٹان کی طرح اٹل اصولوں پر تعمیر ہونی چاہئیں ان اصولوں میں باہم کوئی تضاد یا تصادم نہ ہونا چاہیے جہاں تک تحریک کے اصولوں کے بیان کا تعلق ہے، جو اصول ایک مرتبہ جس طرح بیان کر دیا گیا، پھر اس میں سر مو ترمیم نہ کرنی چاہیے اصولوں کے بیان میں وقتی تقاضوں کی کوئی پرواہ نہ کرنی چاہیے اصولوں کو بیان کرتے وقت ایک مرتبہ جو شکل دے دی، پھر اس شکل کو بہر حال سچا ثابت کرنا چاہیے جب تک تحریک کامیاب نہ ہو جائے کم از کم اس وقت تک اصولوں میں کوئی لفظی ترمیم کا خیال تک نہ کرنا چاہیے تحریک کی کامیابی سے پہلے اگر کسی اصول میں فلاں فلاں ترمیم پر بحث چھڑ گئی تو اس سے تحریک کو قوت مدافعت اور اتحاد یکجہتی میں فرق آ جائے گا آج جس ترمیم کو ''اصلاح'' کا نام دیا جا رہا ہے، ممکن ہے کل اس کی چھان بین کی جائے تو مزید ''اصلاح'' کی گنجائش نکل آئے، اور اس سے اگلے روز پہلے سے بھی بہتر ''اصلاح'' سوجھنے لگے جب اصلاح کا یہ دروازہ کھل جاتا ہے تو پھر راستہ بند کرنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے اور جب راستہ کھل گیا تو کیا پتہ کون نامعقول اس راستہ کے ذریعہ داخل ہو جائے۔

تحریک کے پیروؤں کا کام عمل کرنا ہے بحث کرنا نہیں

یہ ایک نہایت اہم سچائی ہے، قوم پرست اشتراکی تحریک کے اراکین کو یہ نکتہ شروع سے ہی عملی طور پر سمجھا دینا ضروری تھا ''جرمن قوم پرست مزدور اشتراکی پارٹی'' کے پروگرام کے پچیس نکات ایسی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں تبدیلی کی گنجائش ہرگز

نہیں تحریک کے موجودہ اور آئندہ اراکین کبھی ان اصولوں پر تنقید کی جرات نہ کریں گے ان کا فرض تو یہ ہے کہ وہ ان اصولوں کی اطاعت اور تعمیل بجا لائیں اور ان پر عمل کر کے دکھائیں ایسا نہ کیا گیا تو ہر آنے والی نسل بجائے تحریک کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کرنے، اور تحریک کو زیادہ مضبوط بنانے کے، اپنی قوت اس قسم کی اعتقادی بحثوں میں ضائع کر دے گی کہ کون کون سے اصولوں کو بیان کرنے میں کس کس "اصلاح" کی گنجائش ہے تحریک میں شامل ہونے والوں کی اکثریت تحریک کے اصولوں کے الفاظ نہیں جانچا کرتی وہ تحریک کا مطلب وہی سمجھیں گے جو تحریک کے قائدین ان کے سامنے بیان کریں گے۔

صرف ہم سچے ہیں باقی سب جھوٹے ہیں

تحریک کا نام رکھتے وقت بھی یہی اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں تحریک کا پروگرام بھی انہیں اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے ہمارے پراپیگنڈا کی بنیاد بھی انہیں اصولوں پر ہے۔قومی سرکار کے عقیدہ کو کامیاب بنانے کے لیے ایک ہر دلعزیز پارٹی کی ضرورت تھی یہ پارٹی صرف "عقلمند" لیڈروں پر مشتمل نہ ہو گی، بلکہ اس میں ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور بھی شامل ہوں گے ان اعتقادات کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش ایک عسکری تنظیم کی پشت پناہی کے بغیر کامیاب نہ ہو گی۔جس طرح ماضی میں ایسی کوششیں ناکام ہوتی رہی ہیں اسی طرح آج بھی یہ کوشش ناکام ہو گی، اور آئندہ بھی ناکام رہے گی یہی وجہ ہے کہ ہماری تحریک نہ صرف ان اعتقادات کی واحد علمبردار ہونے کے دعوے میں سچی ہے بلکہ وہ ایسا دعویٰ کرنے پر مجبور ہے قوم پرست اشتراکی تحریک کے بنیادی اصول امت کے عقیدہ پر مبنی ہیں امت کے عقیدہ کا تقاضا ہے کہ قوم پرست اشتراکیت نافذ کی جائے۔اگر قوم پرست اشتراکیت کامیاب ہو گئی تو وہ اپنے ان اصولوں پر سختی سے کاربند رہے گی۔یہاں پھر ہماری تحریک کو نہ صرف یہ حق پہنچتا ہے بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کے علاوہ امت پر عقیدہ کی باقی تمام

تعبیروں کو بیہودہ، فضول، واہیات اور بددیانتی پر مبنی قرار دے۔

اگر ہماری تحریک پر اعتراض کیا جائے کہ اس نے تو امت کے عقیدہ پر اجارہ داری قائم کرلی ہے تو اس کا صرف ایک جواب ہے۔

نہ صرف ہم نے امت کے عقیدہ پر اجارہ داری قائم کرلی ہے بلکہ عملی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس عقیدہ کی تخلیق ہم نے انجام دی ہے۔

امت پر عقیدہ کا مطلب صرف ہم نے سمجھا ہے

آج تک امت پر عقیدہ کے نام سے جن توہمات کا چرچا کیا جاتا تھا وہ کبھی ہماری ملت کی تقدیر نہ بدل سکتے تھے ان توہمات میں نہ تسلسل تھا نہ ربط، اور نہ کوئی سیاسی مغز اکثر و بیشتر ادھر ادھر سے دو چار غیر مربوط اور لایعنی تخیلات کا جوڑ توڑ تیار کردیا جاتا تھا بسا اوقات ایسا ہوتا کہ امت پر عقیدہ کی یہ مختلف تعبیریں باہم متضاد ہوتی تھیں ان میں کوئی داخلی یکجہتی نہ پائی جاتی تھی اگر ان توہمات میں داخلی ربط پیدا بھی کردیا جاتا تو بحیثیت عقیدہ کے وہ ایسے ضعیف تھے کہ ان پر کوئی تحریک قائم نہ کی جاسکتی تھی۔

یہ صرف قوم پرست اشتراکی تحریک کا کارنامہ ہے کہ اس نے امت پر عقیدہ کو ایک مربوط اور پر معنی سیاسی مفہوم دیا ہے۔

نقل نقل ہے اور اصل اصل

قسما قسم کی انجمنیں اور گروہ جن میں سے کسی کا طول ایک بالشت ہے تو کسی کا طول و عرض دونوں مل کر ایک گرہ بنتے ہیں، آج کل اپنی آپ کو ''امت پر عقیدہ کے حامی'' کا خطاب حاصل کرنے کا مستحق سمجھتے ہیں یہ بھی اسی کام کا نتیجہ ہے جو قوم پرست اشتراکی تحریک نے کیا ہے ہماری سرگرمیوں کے بغیر، ان میں سے کسی ایک پارٹی میں یہ ہوش نہ تھا کہ یہ امت پر عقیدہ کا نام لیتے یہ اس لفظ کا مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے بالخصوص ان کے رہنما تو اس عقیدہ کے قریب پھٹکنے کا نام نہ دیتے جب جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی نے اس عقیدہ میں معنی بھر دیئے تو اب ان سب کے منہ میں پانی بھر آیا ہے

یہ صرف ہماری پارٹی کے پراپیگنڈہ کی کامیابی ہے کہ اس نے امت پر عقیدہ کی طاقت عیاں کر دی ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مقلدین حاصل کرنے کی ہوس میں دوسری پارٹیاں بھی ہماری نقل اتار رہی ہیں کم از کم وہ ہماری لفظی نقل کی تو ضرور کوشش کرتی ہیں۔

منافقوں سے بچ کر رہنا ضروری ہے

جس طرح پہلے یہ پارٹیاں ہر اصول کو اپنے حقیر انتخابی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں اسی طرح اب انہوں نے امت پر عقیدہ کا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا ہے ان کا مقصد صرف دکھاوا اور منافقت ہے وہ فقط یہ چاہتے ہیں کہ قوم پرست اشتراکی پارٹی کے اراکین نے عوام میں جو رسوخ پیدا کر لیا ہے، اس کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جائے اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے اور ہماری تحریک کی کامیابی کے ڈر سے، یہ چرچے ان کی زبان پر بھی آ گئے ہیں ہماری تحریک ایک ایسے ضابطہ حیات پر مبنی ہے جسے عالمگیر اہمیت حاصل ہے ہماری رقیب پارٹیاں خوب جانتی ہیں کہ ہماری تحریک میں بے ہمہ ہونے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس سے ان کو سخت خطرہ لاحق ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ آج کل وہ الفاظ دوہرا رہے ہیں جو آج سے چھ سال پہلے ان کے نزدیک حماقت کی نشانی تھے پانچ سال قبل انہوں نے ان خیالات کا مقابلہ شروع کیا چار سال قبل یہ اس عقیدہ کے سامنے لاچار ہو گئے اور اب دو سال سے انہوں نے خود اسی عقیدہ کا ورد شروع کر دیا ہے اور اسے اپنے سیاسی ایمان میں شامل کر لیا ہے غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان نعروں سے کسی بہانے برسر اقتدار آ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمیں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ہمیں اس حقیقت پر نگاہ رکھنا ہے کہ ان پارٹیوں میں سے کسی ایک کو بھی پتہ نہیں کہ جرمن قوم کی ضروریات کیا ہیں میرے اس الزام کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ امت پر عقیدہ کا نام کس سطحی انداز سے لیتے ہیں۔

آدھا ایمان پورے کفر سے زیادہ خطرناک ہے

وہ لوگ ان سے کسی طرح کم خطرناک نہیں جو امت کے عقیدہ پر نیم ایمان لاکر قسما قسم کی بھونڈی تجاویز پیش کرتے ہیں ان لوگوں کی تجاویز کی بنیاد کھوکھلی ہوتی ہے ان کے دماغ میں کہیں سے کوئی اکیلا وکیلا خیال کہیں سے گھس آتا ہے اور پھر ان کے ذہن پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے ممکن ہے وہ خیال فی نفسہ درست ہو لیکن جس طرح یہ لوگ اس خیال کا رشتہ بیرونی دنیا کے حقائق سے منقطع کر کے اس کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس سے بھی کوئی متحد اور جنگجو جماعت قائم نہیں ہو سکتی نہ ہیان خبطیوں کے اصول کسی تنظیم کی بنیاد بن سکتے ہیں بعض لوگ اس قسم کے ''پروگرام'' تصنیف کرنے کا شغل فرماتے رہتے ہیں چند خیالات اپنے ذہن کی اپچ سے ایجاد کیے چند تصورات کہیں سے مانگ کر مہیا کیے یا کہیں سے پڑھ کر چرا لیے اور پھر سب کی کھچڑی پکا کر پیش کر دی ایسے نادان دوست امت پر عقیدہ کے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں یہ لوگ نیک نیت ہوں تو خشک دماغ اور بانجھ فطرت کے خیالی گھوڑے دوڑانے والے ''شیخ چلی'' ثابت ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر یہ وہ شرارتی شوریدہ سر ہوتے ہیں جو عوام میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رکھنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی ذہنی فرعونیت، اپنی کوششوں کی بے بسی، اور اپنی نا قابلیت، پر اپنی چھجہ دار داڑھیوں سے اور قدیم جرمن رسم و رواج کا سوانگ رچا کر پردہ ڈال سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی تمام حرکتیں بے فائدہ ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر میں یہاں ان ایام کی داستان بیان کروں جب قوم پرست اشترا کی تحریک نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ششم :: ہماری جدوجہد کا پہلا دود

ہمارے جلسے

ہمارا پہلا بڑا جلسہ 24 فروری 1920ء کو ہاف براؤہاؤس کے ایوان طعام میں منعقد ہوا۔ ابھی اس جلسہ کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی کہ ہم نے آئندہ جلسے کا انتظام شروع کردیا۔ اس وقت ہم ہر مہینہ یا زیادہ سے زیادہ پندرھواڑے کے بعد، میونخ جیسے کسی شہر میں ایک چھوٹا سا جلسہ منعقد کرنے کی تجویز پر بڑی احتیاط سے غور کیا کرتے تھے لیکن اب ہم نے فیصلہ کرلیا کہ ہر ہفتے ایک جلسہ عام منعقد کریں گے مجھے یہ نہ بتانا چاہیے کہ ہم ہر مرتبہ بڑی تشویش سے سوچا کرتے تھے کہ کیا حاضرین کافی تعداد میں جمع ہو جائیں گے، اور حاضرین فراہم ہو گئے تو کیا وہ ہماری تقریر سنیں گے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے پختہ یقین تھا کہ اگر حاضرین آ گئے تو پھر وہ جلسہ میں ٹھہریں گے اور تقریر بھی سنیں گے۔

اس زمانہ میں میونخ شہر کے ہاف براؤہاؤس کا ہال ہم قوم پرست اشتراکیوں کی نگاہ میں ایک مقدس درس گاہ کی حیثیت حاصل کرچکا تھا ہر ہفتے جلسہ عام منعقد ہوتا تھا یہ جلسہ قریباً اسی ہال میں منعقد ہوتا تھا ہر مرتبہ ہال میں حاضرین کی تعداد سابقہ جلسہ سے زیادہ ہوتی تھی حاضرین ہماری باتیں بھی زیادہ سے زیادہ توجہ سے سنتے تھے۔

ہم نے پہلے تو یہ موضوع چھیڑا کہ "عالم گیر جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری کس پر ہے" اس زمانہ میں کوئی شخص اس موضوع کی پرواہ نہ کرتا تھا پھر ہم نے بتدریج صلح کے معاہدات پر بحث شروع کی ہم قریباً ہر اس مضمون پر کچھ نہ کچھ کہتے جس سے ہمارے سامعین کو دلچسپی ہوتی، اور جس سے انہیں ہمارے خیالات کی جانب متوجہ کرنے کا امکان نظر آتا۔ ہم نے صلح کے معاہدات کی جانب خاص طور پر توجہ مبذول کروائی۔

بھیڑیئے قوم کی روح کے تکے نوچ رہے تھے

ان دنوں اس نئی تحریک نے عوام کے سامنے جو پیشین گوئیاں بار بار دہرائی تھیں وہ اب لفظاً لفظاً پوری ہو چکی ہیں۔ آج ان مسائل کا تذکرہ اور ان کی بابت لکھنا آسان ہے لیکن ان دنوں کسی ایسے جلسہ عام میں جہاں حاضرین کھاتے پیتے طبقات پر مشتمل نہ ہوں، بلکہ مفلس وقلاش اور مفلوک الحال عوام کا ہجوم ہو، جنہیں شورش پیدا کرنے والوں نے بھڑکا رکھا ہوتا تھا، ورسائی کے صلح نامہ پر اعتراض کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ جرمنی کی پنچائتی سرکار پر حملہ کیا جا رہا ہے جرمنی کی پنچایتی سرکار پر حملہ کرنا، رجعت پسندی، بلکہ شاہ پرستی کا مترادف تھا صلح نامہ ورسائی کے متعلق نکتہ چینی کا پہلا کلمہ منہ سے نکلتے ہی فوراً اعتراض کیا جاتا تھا ''اور برسٹ لٹوسک کا بھی تو نام لو!'' یہ نعرہ سنتے ہی ہجوم بڑبڑانے لگا، بڑبڑاہٹ رفتہ رفتہ غراہٹ کی صورت اختیار کر لیتی، حتیٰ کہ مقرر کو لاچار ہو کر انہیں قائل کرنے کی کوشش ترک کرنی پڑتی۔ یہ لوگ اس طرح ہاتھوں سے نکل چکے تھے کہ انہیں قائل کرنے کی کوشش دیوار سے ٹکریں مارنے کے برابر تھی وہ نہ یہ سننا چاہتے تھے اور نہ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ صلح نامہ ورسائی تو ایک بدنامی کا پلندہ اور کلنک کا ٹیکہ ہے یہ جبری صلح نامہ ہماری قوم کے حقوق کے خلاف ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ ہے مارکس ازم کے حامیوں کی تخریبی کارروائی اور بیرونی دشمنوں کے زہریلے پراپیگنڈے نے ان لوگوں کی عقل مسخ کر دی تھی سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے خلاف کسی کو شکایت کا حق بھی نہ تھا بیشک ہم نے ایک بڑا جرم کیا تھا آخر کھاتے پیتے جرمن طبقہ نے انتشار پھیلانے کی اس خوفناک مہم کے تدارک کے لیے کون سی کوشش کی تھی کیا انہوں نے مارکس ازم کے حامیوں کے مقابلہ میں صورت حال کی وضاحت کرنے میں کوئی بہتر اقدام کیا تھا ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! اس زمانہ میں یہ ''پاسبان قوم'' کہیں دکھائی بھی نہ دیتے تھے جو آج کل اپنی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں ممکن ہے وہ اپنے مخصوص حلقوں میں تقریریں کرتے ہوں شاید یار دوستوں کی محفل میں انہوں نے اس موضوع پر کبھی گفتگو

فرمائی ہو لیکن یہ وہاں کبھی نظر نہ پڑتے تھے جہاں انہیں آنا چاہیے تھے جہاں بھیڑیئے قوم کی روح کے تکے نوچ رہے تھے یہ وہاں آنے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتے تھے اگر کبھی آتے بھی تھے تو بھیڑیوں ہی کی ہمنوائی چلانے لگتے تھے۔

ہم رائے عامہ کی لونڈی نہیں اس کے رہنما ہیں

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے بھی واضح احساس ہو گیا تھا کہ ہماری تحریک میں اس وقت جو مٹھی بھر لوگ شامل تھے ان کے سامنے سب سے پہلے یہ مسئلہ واضح کرنا تھا کہ جنگ چھیڑنے کا گناہ کس فریق کے ذمہ ہے اس مسئلہ کی وضاحت تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کرنا تھا اگر مستقبل میں ہم اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے متمنی تھے تو اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ صلح نامہ کا مطلب عوام کو ٹھیک طرح سمجھا دیا جاتا اس وقت عوام کی رائے یہ تھی کہ جنگ کے بعد کا صلح نامہ گویا جمہوریت کی فتح کے مترادف ہے لہذا یہ ضروری تھا کہ ہم صلح نامہ کی مخالفت شروع کریں ہم عوام کے ذہن پر نقش کر دینا چاہتے تھے کہ ہم صلح نامہ کے دشمن ہیں اس طرح بعد میں جب حقیقت کھل جائے گی اور فریب کا پردہ چاک ہو کر گھناؤنی اصلیت سامنے آ جائے گی تو عوام کو یاد رہے گا کہ ہم نے شروع سے ہی انہیں تنبیہہ کر دی تھی تب عوام کا اعتماد ہمیں حاصل ہو جائے گا تب بھی میرا قاعدہ یہی تھا کہ جن بنیادی مسائل کے متعلق عوام گمراہ ہو چکے تھے ان کی بابت میں اپنا مسلک کھلم کھلا بیان کرتا میں ہر دلعزیز یا مخالفت کی پرواہ کیے بغیر ہر گمراہی کی پرزور تردید کرتا اس طرح مخالفت کا جو طوفان اٹھتا میں اس کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی رائے عامہ کی لونڈی نہیں، بلکہ رائے عامہ کی راہنما ہے یہ تحریک عوام کی محکوم نہیں بلکہ ان کی قیادت کی مدعی ہے۔

دشمن کو شکست دینی چاہیے، اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے

ہر تحریک میں یہ طبعی کمزوری پائی جاتی ہے کہ مخالفین کے طور طریقوں کی پیروی کی جائے بالخصوص آغاز میں یہ کمزوری زیادہ ہوتی ہے جب مخالفین کی کوششوں سے عوام

غلط خیالات قبول کر چکے ہوں یا مسائل کے متعلق غلط روش اختیار کر چکے ہوں تو نئی تحریک بھی انہیں مخالفین کے جنگی نعرے اور طور طریقے قبول کر لیتی ہے یہ کمزوری اس وقت زیادہ راسخ ہو جاتی ہے جبکہ مخالفین کی تقلید کو نئی تحریک کے مقاصد کے حق میں مفید ثابت کرنے کے لیے کچھ بہانے بھی تراش کر لیے جاتے ہیں جو درحقیقت بالکل بے بنیاد ہوتے ہیں انسان میں نقالی کا ایک طبعی جذبہ پایا جاتا ہے یہ جذبہ نئی تحریک کو اپنے مخالفین کی تقلید پر اور زیادہ آسانی سے آمادہ کر دیتا ہے پھر اس نقالی کے جواز میں کچھ اس قسم کے عذر لنگ کھڑے جاتے ہیں کہ نئی تحریک ''اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے'' یہ راستہ اختیار کر رہی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ تحریک بھی اپنے مخالفین کی مجرمانہ پالیسی میں شریک ہوتی ہے۔

یہ اخبارات قوم کے سر پر چڑیل کی طرح سوار ہیں

مجھے بار بار ایسی مثالوں کا تجربہ ہو چکا ہے، ہر موقع پر بڑی ہمت سے کام لے کر اپنی تحریک کی کشتی کو عام بہاؤ سے بچانا پڑا یہ عام بہاؤ مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اگر ہم ہمت سے کام نہ لیتے تو خدشہ تھا کہ ہماری تحریک کی کشتی بھی عام سیلاب میں بہہ جاتی ایسا موقع آخری مرتبہ تب آیا جب جرمن اخبارات نے ٹیرول کے علاقہ کو اٹلی سے واپس لے کر جرمنی سے الحاق کرنے کے مطالبہ کو غیر معمولی اہمیت دے کر اچھالنا شروع کیا اس مسئلہ کو جو اہمیت دی گئی وہ جرمن قوم کے مفاد کے منافی تھی دراصل یہ جرمن اخبارات بھی ہماری قوم کے سر پر چڑیل کے آسیب کی طرح سوار تھے، اور ہمیشہ اسے ورغلا کر کسی نہ کسی غلط راستہ پر لگا دیتے تھے تمام نام نہاد قوم پرستوں قوم پرست پارٹیوں اور قوم پرست انجمنوں نے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ ان کی نعرہ بازی سے درحقیقت کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے، ٹیرول کے مسئلہ پر ایک عام غوغا بپا کر دیا اس طرح یہ قوم پرست عناصر اپنی نادانی سے ایک ایسے نظام کی مخالفت کو تقویت پہنچا رہے تھے جسے ان دنوں ہمیں جرمنوں کے لیے خاص طور پر اس اندھیری دنیا میں امید کی کرن سمجھنا چاہیے تھا میری

مراد مسولینی اور اس کی قائم کردہ تحریک فسطائیت سے ہے ایک طرف بین الاقوامیت کے حامی یہودی، آہستہ آہستہ لیکن بڑی کامیابی سے جرمن قوم کا گلا گھونٹ رہے ہیں دوسری طرف ہمارے نام نہاد ''محبان وطن'' ایک ایسے شخص اور اس کے قائم کردہ نظام کے خلاف ہنگامہ آرائی میں مصروف ہیں جس نے اپنی قوم کو یہودی تصوف پرستوں سے نجات دلا کر کم از کم ایک چوتھائی آبادی کو صیہونیت کے پنجہ سے آزاد کر دیا تھا اس شخص نے بین الاقوامیت کی عالمگیر زہریلی فضا کے خلاف قوم پرستی کی طاقتوں کو فروغ دیا ہے لیکن کمزور اور ناقص کردار کے انسان ہمیشہ ادھر ہی رخ پھیر لیا کرتے ہیں جدھر کی ہوا چل رہی ہو عوام نے جو نعرہ بلند کیا اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں بلکہ پیشانی بھی رگڑنے لگتے تھے انہیں جھوٹ بولنے کی ایسی لت پڑ چکی ہے اور اخلاقی لحاظ سے وہ ایسے ذلیل ہیں کہ شاید وہ اپنے دل میں بھی سچ کو تسلیم نہ کرتے ہوں لیکن سچ یہی ہے کہ کئی لوگ محض بزدلی اور رائے عامہ کے خوف سے (جسے یہودیوں نے بھڑکا رکھا تھا) اس مسئلہ پر نعرہ بازی اور شور مچانے میں شریک ہو گئے اس کے سوا انہوں نے جو عذر تراش رکھے تھے ان کی نوعیت ویسی ہی تھی جیسے کم ہمت مجرم اپنے گناہ کا احساس کرتے ہوئے بھی ادھر ادھر سے بہانے گھڑ لیا کرتے ہیں۔

تحریک کی باگیں فولادی گرفت سے پکڑنی چاہئیں

ضرورت تھی کہ تحریک کی باگیں فولادی گرفت سے پکڑ کر تحریک کا رخ پلٹ دیا جائے اور اس طرح اس غار میں گرنے سے بچا لیا جائے جو سامنے نظر آ رہا تھا ہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یوں تحریک کا رخ موڑنا کوئی ہر دلعزیز اقدام نہ تھا وجہ یہ تھی کہ رائے عامہ کو متحرک کرنے والی تمام طاقتیں ایک ہی رخ پر کام کر رہی تھیں۔ رائے عامہ کے ایسے سیلاب کو روکنے کی جو لوگ کوشش کیا کرتے ہیں وہ ہر دلعزیز نہیں رہ سکتے۔ تاریخ ایسی متعدد مثالیں پیش کرتی ہے کہ کئی افراد کو اسی حرکت پر سنگسار کر دیا گیا، گو بعد میں آنے والی نسلیں اب ان کی قبر پر شکرانے نچھاور کرتی ہیں۔

کسی تحریک کو ہمیشہ آنے والی نسلوں پر نگاہ رکھنی چاہیے اور وقتی ''زندہ باد'' کے ہنگاموں پر کان نہ دھرنا چاہیے ممکن ہے کہ اس طرح کے بعض ارکان کو کچھ وقت تکلیف میں گزارنا پڑے ان تکلیف اٹھانے والوں کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ رہائی کا وقت قریب ہے جو تحریک دنیا کا نقشہ بدلنا چاہتی ہے اسے مستقبل پر دھیان رکھنا چاہیے حالیہ معذوریوں کے سامنے جھک جانا اس کا شیوہ ہونا چاہیے۔

صبر اور استقلال سے مخالف بھی موافق بن جاتے ہیں

یہاں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ میں سب سے پائدار کامیابی انہیں لوگوں کو حاصل ہوئی جنہیں شروع شروع میں بہت کم حامی ملتے تھے شروع میں حامی نہ ملنے کی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ رائے عامہ کے خلاف چلتے تھے، اور وقتی میلانات و خیالات کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ہمیں اس سچائی کا تجربہ پہلی ہی مرتبہ عوام کو خطاب کرنے پر ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ ہم عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیتاب نہ تھے بلکہ ہم تو عوام کی حماقتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے ان دنوں بار بار ایک ہی واقعہ دہرایا جاتا تھا ہوتا یہ کہ جب میں جلسہ میں تقریر کرنے جاتا تو سامعین کے اعتقادات، جو کچھ میں کہنا چاہتا اس کے بالکل الٹ ہوتے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا کہ ہو جائے، وہ چاہتے تھے کہ نہ ہو میں قریباً دو گھنٹہ دو یا تین ہزار لوگوں کو یہ منانے کے لیے صرف کرتا کہ وہ اپنی پہلی رائے بدل ڈالیں میری ہر چوٹ سے ان کے پہلے خیالات ایک نہ ایک حد تک مسمار ہو جاتے آخر کار میں نہیں لا کر اپنے اعتقادات اور اپنے ضابطہ حیات کا ہمنوا بنا لیتا۔

دشمن کی چال کا اندازہ کر کے اس کا توڑ تلاش کرنا چاہیے

ان تجربات سے مجھے ایک ایسا ملکہ حاصل ہو گیا جو اس وقت کے لحاظ سے خاصہ اہم تھا یعنی میں نے دشمن کے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لیے جن کے ذریعے وہ اپنا جواب تیار کرتا تھا جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہمارے حریف اور بالخصوص وہ لوگ جو ہمارے

خلاف مباحث کی راہنمائی کر رہے تھے، بنی بنائی دلیلوں جو گویا ایک سانچہ تھیں جس میں ڈھل کر ہمارے دعاوی کی تردید کے لیے گولہ بارود تیار ہوتا تھا ہم اپنے دعاوی کی تلقین مسلسل کر رہے تھے ہماری تردید میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے اعتراضات اور استدلال کے استعمال سے ثابت تھا کہ ہمارے مخالفین کسی ایک مرکز سے باقاعدہ تربیت پا کر ہمارے سامنے آتے تھے یوں پتہ چل گیا کہ ہمارے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی ڈھنگ سے حملہ کرتے ہیں انہوں نے جو طریقہ سیکھ رکھا ہے بس اسی طریقہ سے بحث کر سکتے ہیں میں آج فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے صرف اس پراپیگنڈے کو بے اثر بنانے کا علاج اختراع کرلیا ہے بلکہ اس ڈھنگ سے پس پردہ بیٹھ کر ہمارے خلاف منصوبے چلانے والوں کو خود ان کے ہی ہتھیاروں سے شکست دے دی۔ دو سال گذرنے کے بعد میں اس فن کا ماہر بن چکا تھا۔

بحث میں جیتنے کا نسخہ یہ ہے کہ حریفوں کی دلیلوں کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے

میں ہر تقریر سے پہلے واضح طور پر اندازہ کرلیتا تھا کہ ہمارے خلاف کیا دلیلیں کس انداز میں پیش کی جائیں گی مباحثہ کی اس نوعیت اور اس کے مدارج کے متعلق یوں قافیہ کر کے میں اپنی تقریر میں خود حریف کی متوقع دلیلوں اور اعتراضات کی تردید شروع ہی میں کر دیتا ہوں اس طریقہ کو کامیاب بنانے کے لیے میرا دستور یہ تھا کہ میں اپنے دعوے کے خلاف تمام ممکن اعتراضات خود ہی بیان کر کے انہیں باہم متصادم ثابت کر دیتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر اخلاص سے تقریر سننے والا میرا لوہا مان کر میرا قائل ہو جاتا۔ چونکہ ہم اعتراضات کا جواب پہلے ہی پیش کر دیتے تھے لہذا جب حریفوں کی جانب سے پامال اعتراضات دہرائے جاتے تھے تو سامعین کے حافظہ پر ان کا نقشہ ہی نہ جمتا جو کچھ انہیں سکھانے کی کوشش کی جاتی تھی وہ بغیر ان کے لبوں پر آئے پہلے ہی غلط ثابت ہو چکا ہوتا تھا اس لیے سننے والے میری تقاریر زیادہ توجہ سے سنتے تھے۔

جب میں اپنی فوجی رجمنٹ میں سیاسی اتالیق کے عہدہ پر مامور تھا تو میں نے معاہدہ ورسائی اور قیام امن کے موضوع پر اپنا لیکچر تیار کیا تھا فوجیوں کو ایک بار یہ لیکچر سنانے کے بعد میں نے اس کا عنوان اور موضوع بدل کر اب لیکچر کا عنوان یہ رکھ دیا کہ "معاہدات ورسائی اور برسٹ لٹوسک میں تقابل" اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ میرے پہلے لیکچر کے بعد جو بحث شروع ہوئی اس سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ دراصل عوام کو معاہدہ برسٹ لٹوسک کے متعلق کچھ علم نہ تھا ہمارے مخالفین نے اس قابلیت سے پراپیگنڈہ کیا تھا کہ برسٹ لٹوسک کے معاہدہ کو بدنام کرکے رکھ دیا تھا لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ معاہدہ سیاہ کاری اور ظلم کی بدترین مثال تھا۔

مخالف کے ایک ایک عذر کی تردید کرنی چاہیے

یہ سفید جھوٹ اس کثرت سے عوام کے سامنے دہرایا گیا تھا کہ لاکھوں جرمنوں کو یقین ہو چکا تھا کہ معاہدہ ورسائی اس جرم کی منصفانہ سزا ہے جس کا ارتکاب ہماری قوم نے معاہدہ برسٹ لٹوسک کے نفاذ سے کیا تھا یہی وجہ تھی کہ عوام معاہدہ ورسائی کی مخالفت انصاف کے خلاف سمجھتے تھے کئی لوگوں کی تو سچ مچ ایسی مخالفت سے اخلاقی گھن محسوس ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ جرمنی میں "تاوان جنگ" کی شرمناک اور ابلیسانہ اصطلاح عام طور پر استعمال ہونے لگی یہ ریاکارانہ اصطلاح صریح دروغ گوئی پر مبنی تھی باوجود اس کے ہمارے لاکھوں ہم وطن یہی سمجھتے تھے کہ تاوان جنگ کی وصولی فطرت کے برتر انصاف کا تقاضا ہے یہ خیال کرنے سے روح لرز اٹھتی ہے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے لیکن درحقیقت ایسا ہی تھا اس مغالطہ کا بہترین ثبوت وہ پراپیگنڈہ تھا جو میں نے معاہدہ برسٹ لٹوسک کی وضاحت کرکے معاہدہ ورسائی کے خلاف شروع کیا میں دونوں معاہدوں کا اس طرح مقابلہ کرتا تھا کہ ہر موضوع پر دونوں معاہدات کی ایک ایک مد کو لے کر ان کا باہمی توازن کرتا پھر میں یہ حقیقت واضح کرتا کہ کس طرح برسٹ لٹوسک کا معاہدہ انسانی اقدار کے تقاضوں کے عین مطابق ہے برعکس اس کے ورسائی کا معاہدہ کیونکر منافی

انسانیت و وحشت و بربریت کی بدترین مثال ہے اس تقابل کا سامعین پر حیرت انگیز اثر ہوتا تھا کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے دو ہزار کے قریب سامعین کے جلسہ کو خطاب کیا جہاں ایک ہزار نو سو افراد مجھے مخالفانہ نگاہوں سے گھور رہے تھے تین گھنٹہ کی تقریر کے بعد میرے گرد کا مجمع مخلصانہ غیظ و غضب سے مشتعل ہو چکا تھا ان کے دل و دماغ سے ایک بہت بڑے جھوٹ کا اثر مٹ چکا ہوتا تھا ہزار ہا افراد کا مجمع جھوٹ سے نجات پا کر سچ کے احساس سے سرشار ہو جاتا تھا۔

قوم کے فرزندوں کو قوم کے دائرہ میں واپس لانا چاہیے

ان دنوں میں دو موضوعات پر تقریر کرنا سب سے اہم سمجھتا تھا پہلا موضوع تو تھا ''عالمگیر جنگ کے اسباب کیا تھے'' دوسرا عنوان تھا'' معاہدات ورسائی و برسٹ لٹوسک میں تقابل'' میں نے یہ تقریریں درجنوں مرتبہ دہرائی ہوں گی '' میں انہیں ہمیشہ ایک لب ولہجہ میں پیش کرتا، حتیٰ کہ جہاں تک ان دو نکات کا تعلق تھا عوام کے کثیر طبقہ کا ذہن بالکل صاف ہو گیا اور وہ نئے اعتقدات پر متحد ہو گئے اس طبقہ میں سے ہماری تحریک کے اولین اراکین کی بھرتی ہوئی۔''

ان مجمعوں کا مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں آہستہ آہستہ مجمع عام کے سامنے جلسہ گاہ میں تقریر کرنے کا ماہر بن گیا مجھے لوگوں کے جذبات ابھارنے اور وسیع جلسہ گاہوں میں ہزار ہا اشخاص کے سامنے تقریر کی مناسبت سے جسمانی حرکات میں کمال حاصل ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، ان دنوں ہماری تحریک کا حلقہ مختصر تھا ان دنوں میں اس چھوٹے سے حلقہ سے باہر کوئی ایسی پارٹی نہ تھی جو عوام کے سامنے یوں مسائل کا تجزیہ کرتی آج کل جو سیاسی جماعتیں یوں باتیں بناتی ہیں گویا رائے عامہ کو تبدیل کرنے کا سہرا ان کے سر پر ہے، اس وقت ان میں سے کوئی سیاسی جماعت بھی کام نہ کر رہی تھی چند سیاسی لیڈر جو اپنے آپ کو قوم پرست کہتے تھے اگر کبھی کبھار یہ موضوع

چھیڑتے بھی تو زیادہ تر اپنے ہمنوا حلقوں کے سامنے، جو پہلے سے ان کے ساتھ متفق ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایسے لیڈروں کی تقریروں کا فائدہ صرف یہ ہوسکتا تھا کہ پہلے سے جو لوگ ان کے ہم عقیدہ تھے وہ اپنے عقیدہ میں زیادہ راسخ ہوجاتے۔ لیکن قوم کو جس کام کی حاجت تھی وہ تو کچھ اور ہی نوعیت کا تھا ضرورت تو یہ تھی کہ قوم کے جو فرزند دشمن کے ہم عقیدہ اور ہم مسلک بن چکے تھے ان کی رائے اور ذہن کو مسائل کی وضاحت اور پراپیگنڈا کے ذریعہ تبدیل کر کے انہیں پھر قومی دائرہ میں واپس لایا جاتا۔

تقریری پراپیگنڈے کے ساتھ لٹریچر بھی تقسیم ہونا چاہیے

ہم نے اپنے پراپیگنڈے کو تقویت پہنچانے کے لیے ایک ورق کی گشتی چھٹیاں بھی چھاپ کر بانٹنی شروع کیں میں ابھی فوج میں تھا جب میں نے ایک ایسی گشتی چھٹی کا مضمون تیار کیا تھا میں نے اس چٹھی میں معاہدہ ورسائی اور معاہدہ برسٹ لٹوسک کا باہمی تقابل کیا تھا یہ گشتی چٹھی تب کثیر تعداد میں طبع کر کے تقسیم کی گئی تھی۔ اب میں نے یہی چٹھی پھر چھپوا کر اپنی پارٹی کے لیے استعمال کی اس سے خاصی کامیابی ہوئی شروع شروع میں ہمارے جو جلسے منعقد ہوئے وہاں دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں ہمیں یہ خاص امتیاز حاصل تھا کہ سامعین کے سامنے میزوں پر قسما قسم کے رسالے، اشتہار اور پمفلٹ ڈھیر کیے ہوئے تھے باوجود اس کے ہماری تحریک کا انحصار بنیادی لحاظ سے تقریروں پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی عظیم انقلاب اب بغیر تقریر کے بپا نہیں کیا جا سکتا تقریر کی کامیابی کی وجوہات نفسیاتی ہیں۔

انقلاب صرف تقریر سے پیدا کیا جاتا ہے

میں اس کتاب کی پہلی جلد میں واضح کر چکا ہوں کہ وہ تمام زبردست واقعات جن کے ذریعہ روئے زمین کے نقشے بدلے جاتے رہے ہمیشہ تقریر کے ذریعہ وقوع پذیر ہوئے نہ کہ تحریر کے ذریعہ اس موضوع پر بعض اخبارات میں لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں ان بحثوں کے دوران میں ذہین کھاتے پیتے لوگوں نے تقریر کے حق میں میری دعویٰ کے

خلاف بہت کچھ کہا لیکن بات کی تہہ تک پہنچ جانے والے اشخاص خوب جانتے تھے کہ اس مخالفت کی اصل وجہ کیا ہے کھاتا پیتا ذہین طبقہ تقریر کے حق میں میرے دعویٰ کی مخالفت اس لیے کرتا تھا کہ وہ خود تقریر کے ذریعہ عوام کو مسحور کرنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے اور نہ طاقت وہ تو ہمیشہ منشیوں کی امداد پر تکیہ کرتے تھے لوگوں کو تقریر کے ذریعہ ابھارنے کی خاطر یہ اصحاب کبھی لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اترنے کا نام نہیں لیتے تھے واقعات کی رو نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس سے آج کل کے کھاتے پیتے طبقات چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں وہ طبعی حس ہی مفقود ہو چکی ہے جس کے ذریعے عوام کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔

تحریر پر تقریر کی ترجیح

ایک تقریر کرنے والا تقریر کے دوران عوام کا رخ دیکھ کر مسلسل اپنی تقریر کا ڈھب بدلتا رہتا ہے اس لیے اسے اپنی تقریر وقتی تقاضے کے مطابق ڈھالنے کا موقع ملتا ہے وہ سننے والوں کے چہرے کو دیکھ کر خوب اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اس کی بات سمجھتے ہیں یا نہیں اس کے ساتھ متفق ہیں یا نہیں اور کیا اس کے الفاظ وہی اثر پیدا کر رہے ہیں جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے برعکس اس کے ایک مصنف کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کی تحریر کون پڑھے گا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مصنف شروع سے ہی انسانوں کے کسی خاص گروہ سے مخاطب نہیں ہوتا جو اس کی نگاہ کے سامنے ہو بلکہ وہ تو مجبور ہے کہ ایک عام انداز اور ایک عام اسلوب سے جو کچھ لکھنا ہے لکھ ڈالے غرض مصنف کا نفسیاتی باریکیاں نظر انداز کرنا اور اپنے بیان پر لچک سے محروم رہنا ایک لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک اچھا مصنف، ویسی تقریر نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ایک اچھا مقرر تصنیف کر سکتا ہے۔ ہاں اگر مصنف کو عوام کے سامنے تقریر کرنے کی بھی مشق ہے تو پھر دوسری بات ہے یاد رکھنا چاہیے کہ عام بجائے خود جامد ہوتے ہیں وہ جس حالت میں ہوں اسی کی عادتوں میں گرفتار رہتے ہیں ان کے اندر کسی ایسی تحریر کو پڑھنے کی کوئی طبعی خواہش

نہیں ہوتی جوان کے عقیدہ کے مطابق نہ ہو۔عوام تو کسی تحریر کو تبھی پڑھتے ہیں جب اس میں وہی کچھ لکھا ہو جسے وہ خود پڑھنا چاہتے ہیں غرض کسی تحریر میں کوئی خاص رجحان پایا جائے تو اس تحریر کو وہی لوگ پڑھیں گے جو پہلے سے اس رجحان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں فقط کوئی رسالہ یا اشتہار اپنے اختصار کے باعث ان لوگوں سے وقتی نگاہ التفات کی توقع رکھ سکتا ہے جو اس کے سامنے مندرجات سے متفق الرائے نہیں۔

تصویر بھی تحریر سے زیادہ موثر ہوتی ہے

تصویر چاہے کسی شکل میں ہو اور میں اس میں سینما کی فلم بھی شامل سمجھتا ہوں عوام کی توجہ کو زیادہ کشش کرتی ہے تصویر کو زیادہ پر کشش بنانے کے لیے کسی خاص ذہانت سے تیار کردہ مضمون کی بھی ضرورت نہیں بس احتیاط یہ رکھنی چاہے کہ تصویروں کے نیچے جو عبارت لکھی جائے وہ بالکل مختصر ہو تصویر کے ذریعہ جو مضمون پیش کیا جائے گا اسے ہر شخص دیکھنے پر آمادہ ہوگا لیکن تصویر کے نیچے جو لمبی عبارتیں لکھی جاتی ہیں انہیں کوئی نہیں پڑھتا کوئی بات عوام کو سمجھانی ہو تو تصویروں کے ذریعہ بہت تھوڑے عرصے میں اور نہایت آسانی سے سمجھائی جاسکتی ہے برعکس اس کے یہی بات تحریر پڑھ کر سمجھنی ہو تو اس کے لیے طویل اور شدید محنت سے مطالعہ کی حاجت ہوتی ہے۔

بہر حال تصویروں میں بھی دقت یہ ہوتی ہے کہ کچھ پتہ نہیں ایک تصویر کس کے پلے پڑتی ہے اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہے کہ تصویر کشی کے ذریعہ جو مضمون پیش کرنا ہے وہ ایک ہی انداز سے پیش کیا جائے گا حالانکہ دیکھنے والے مختلف طبیعتیں رکھتے ہوں گے تصویروں کا اثر بھی تبھی زیادہ ہوتا ہے جب تصویروں کی پیش کش کا انداز دیکھنے والے کی ذہنی سطح اور اس کی طبیعت کے مطابق ہو یہی وجہ ہے کہ اگر ایک کتاب عوام کے لیے چھاپی جارہی ہو تو شروع سے ہی اس کا اسلوب بیان اور اس کی ذہنی سطح کسی ایسی کتاب سے بالکل مختلف ہوگی جو اعلیٰ ذہین طبقات کے لیے تیار کی جائے۔

تقریر مناسب حال ہونی چاہیے

جس طرح مختلف طبقات کے لیے تحریریں مختلف اسلوب اور مختلف سطح پر تصنیف کی جاتی ہیں اسی طرح تقریریں بھی سامعین کی نوعیت اور موقع کی مناسبت سے مختلف انداز کی ہوتی ہیں ممکن ہے ایک مقرر اپنی تقریر میں، اور ایک مصنف اپنی تحریر میں ایک ہی موضوع پر طبع آزمائی کریں لیکن اگر کوئی مقرر واقعی اعلیٰ پیانے کا ہر دلعزیز مقرر ہے اور اس میں تقریر کی غیر معمولی استعداد طبعی موجود ہے تو وہ کبھی کسی ایک دلیل یا ایک مضمون کا اسی شکل میں دو مختلف موقعوں پر ایک ہی صورت میں نہ دہرائے گا۔ وہ ہمیشہ عوام کا رخ دیکھ کر اپنی تقریر کو اس کے مطابق ڈھال لے گا عوام کو مجمع جس خاص وقتی جذبہ سے سرشار ہو گا اس کی مناسبت سے مقرر کی زبان سے پہلا لفظ نکلے گا اس طرح لب کھولتے ہی اسے سامعین کے دلوں تک راہ مل جائے گی اگر اسے عوام کے غالب جذبہ کا اندازہ کرنے میں کچھ مغالطہ رہ گیا ہو تو اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ مجمع اس کی غلطی کی اصلاح کرنے کو موجود ہے جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں ایک اچھا مقرر سامعین کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ کرسکتا ہے کہ آیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سامعین اسے سمجھتے ہیں یا نہیں دوسرے کیا اس کی دلیلیں ان کی عقل کے مطابق ہیں تیسرے سامعین کو کہاں تک اس پر اعتبار اور اعتماد ہے کیا وہ اس کے قول کو سچا سمجھ کر قبول کر رہے ہیں اگر مقرر کو نظر آئے کہ سامعین اس کی بات نہیں سمجھ سکتے تو وہ ایسے آسان اور واضح الفاظ میں وضاحت کرے گا کہ جلسہ گاہ میں ہر شخص اس کی بات سمجھ جائے گا دوسرے اگر وہ دیکھے کہ اس کے دلائل سامعین کی عقل کے مطابق نہیں تو وہ اپنے خیالات کے سلسلہ کی ہر کڑی کا رشتہ اگلی کڑی کے ساتھ اس احتیاط اور آہستگی سے قائم کرے گا کہ بیوقوف ترین سننے والا بھی اس کے استدلال کو سمجھ جائے گا تیسرے جونہی اسے محسوس ہو گا کہ سامعین اس کی تقریر سے قائل نہیں ہو رہے وہ جس طرح اپنا مضمون پیش کر رہا ہے اسے وہ صحیح نہیں سمجھتے تو وہ اپنے دلائل مختلف پیرائے میں بار بار دہرائے گا ہر دلیل کے ساتھ تازہ مثالیں پیش کرے گا اور سامعین کے دل میں جو اعتراض کھٹک رہا ہے اسے خود پیش

کرے گا ان اعتراضات کو دہرانے کے بعد وہ ان کا تجزیہ کر کے ان کی تردید کر دے گا حتیٰ کہ مخالفین کا آخری گروہ بھی اپنے ہلنے جلنے اور اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اسے بتا دے گا کہ سب نے اس کی وکالت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

سامعین کو قائل کرنا کافی نہیں انہیں مائل بھی کرنا ہوتا ہے

اکثر اوقات یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے جبلی تعصّبات پر قابو پانے کی ضرورت ہوتی ہے اس قسم کے تعصّبات زیادہ تر لاشعوری ہوتے ہیں ان لاشعوری تعصّبات کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے نہ کہ عقل پر اس قسم کے جبلی تعصّبات پر قابو پانا کسی سوچی سمجھی رائے کو بدلنے سے ہزار ہا درجہ زیادہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ ان کی بنیاد جذباتی نفرت پر ہوتی ہے نہ کہ کسی غلط فہمی یا ناقص علم پر غلط خیالات اور جہالت کو سمجھا بجھا کر دور کیا جا سکتا ہے لیکن جذباتی تنصر کو مٹانا شاذ ہی ممکن ہوتا ہے سینے کے اندر چھپی ہوئی ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فقط جذبات ہی کو مشتعل کر کے کام لیا جا سکتا ہے جذبات کو مشتعل کرنا تحریر سے ممکن نہیں یہ کام تقریر ہی کر سکتی ہے۔

میرے اس دعویٰ کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ اگرچہ کھاتے پیتے طبقات کے کئی اخبارات موجود تھے ان میں سے کئی اخبارات میں تحریر اور طباعت کا اچھا انتظام بھی تھا ان اخبارات کی اشاعت لاکھوں تک پہنچتی تھی باوجود اس کے یہ اخبارات عوام کو کھاتے پیتے طبقات کا دشمن بننے سے نہ روک سکے دانشور طبقات سال بہ سال اشتہارات اور کتابوں کی جو بارش کرتے تھے وہ نچلے طبقہ کے لاکھوں افراد پر اتنا ہی اثر کرتی تھیں جتنا کہ چکنے گھڑے پر پانی کی بوند اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو میں سے ایک بات ضرور سچی تھی یا تو کھاتے پیتے طبقات کے اخبارات میں موجود مواد شائع ہوتا تھا وہ بالکل ناکارہ تھا اور یا عوام کے دلوں تک فقط تحریروں سے رسائی ناممکن ہے آج تک جو تحریریں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں وہ نفسیاتی عمق سے بالکل عاری تھیں ایسی تحریریں بالخصوص بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔

اخبارات کتابوں سے زیادہ موثر ہوتے ہیں

یہاں یہ اعتراض بالکل فضول ہے کہ مارکس ازم کے حامیوں کا زبردست رسوخ محض ان کی تحریروں کے طفیل ہے خاص طور پر مارکس ازم کی سب سے بڑی کتاب جو کارل مارکس نے لکھی تھی ان کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی یہ اعتراض برلن کے بعض قوم پرست اخبارات نے پیش کیا ہے اس سے زیادہ سطحی دلیل آج تک پیش نہیں کی گئی یہ دلیل ایک غلط مفروضہ پر مبنی ہے مارکس ازم کو عوام پر جو حیرت انگیز اثر و رسوخ حاصل ہوا ہے اس کی وجہ یہ رسمی مطبوعہ کتاب نہیں جو یہودی نظام فکر کی ترجمان ہے بلکہ اس اثر و رسوخ کی حقیقی وجہ وہ تقریری پراپیگنڈا ہے جو سالہا سال سے عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ہر ایک لاکھ جرمن مزدوروں میں سے شاید ایک مزدور نے بھی مارکس ازم کی کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہوگا اس کتاب کا مطالعہ زیادہ تر ذہین طبقہ اور بالخصوص یہودیوں نے کیا تحریک کے عالم اور مخلص پیروؤں کو تو اس کتاب کا علم بھی نہیں یہ مخلص پیرو زیادہ تر نچلے طبقات سے تعلق رکھتے تھے یہ کتاب عوام کے لیے لکھی بھی نہیں گئی یہ کتاب تو یہودیوں کے تسخیر عالم کے منصوبے کے دانشور اور ذہین لیڈروں کی راہنمائی کے لیے لکھی گئی ہے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت بالکل مختلف ذرائع سے یعنی روزانہ اخبارات کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔

صحافت تب موثر ہوتی ہے جب واقعات سے اس کا ربط ہو

کھاتے پیتے طبقات کے اخبارات اور مارکس ازم کے حامیوں کے اخبارات میں فرق یہ ہے کہ مارکس ازم کے حامی اخبارات کی ادارت شورش پیدا کرنے والے سرغنوں کے ہاتھ میں ہے برعکس اس کے کھاتے پیتے طبقات کی ساری تحریک پیشہ ور مضمون نویسوں کے ہاتھ میں ہے اشتراکی جمہوریت کا حامی جو ہمیشہ جلسہ گاہ سے اٹھ کر اپنی ایڈیٹری کی کرسی پر واپس آتا ہے اس کے لیے عوام کو مشتعل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے برعکس اس کے کھاتے پیتے طبقات کا مضمون نگار اگر کبھی اپنی میز چھوڑ کر عوام

تک پہنچے بھی تو ہجوم کے میلے کپڑوں اور پسینے کی بدبو سے بیمار پڑ جاتا ہے نتیجہ یہ کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بے اثر ہوتا ہے۔

کمیونزم پھیلنے کا راز کیا ہے

مارکس ازم کی حمایت میں لاکھوں مزدوروں کی شمولیت مارکس ازم کے حامی مضمون نگاروں کے مذہبی شان سے لکھے ہوئے مقالات کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس زبردست پراپیگنڈا کا نتیجہ ہے جو ہزارہا ان تھک کارکن ہروقت جاری رکھتے ہیں ان کارکنوں میں آتش مزاج شورش پھیلانے والوں سے لے کر مزدوروں کی انجمنوں کے چھوٹے سے چھوٹے ملازم قابل اعتماد مندوبین اور اسٹیج پر تقریر کرنے والے بھی شامل ہیں علاوہ ازیں لاکھوں جلسے ہوتے ہیں جہاں مقررین میزوں پر کھڑے ہو کر دھواں دھار شراب خانوں میں اپنے خیالات عوام کے ذہن نشین کرتے ہیں یوں انہیں جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کی نفسیات پر انہیں لائق آفرین عبور حاصل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں خوب علم رہتا ہے کہ رائے عامہ کا قلعہ فتح کرنے کے لیے کسی خاص وقت کون سے ہتھیار مفید ثابت ہو سکتے ہیں اسی پر اکتفا نہیں اس کے علاوہ وہ عظیم الشان عوامی مظاہرے اور جلوس منعقد ہوتے ہیں جن میں بیک وقت ایک ایک لاکھ انسان حصہ لیتے ہیں ان سب باتوں کا اثر یہ ہے کہ ایک پست ہمت انسان کے دل میں بھی یہ فخر پیدا ہو جاتا ہے کہ گو میں زمین پر رینگنے والا ایک حقیر کیڑا ہوں لیکن میرا رشتہ ایک ایسے دیو پیکر اژدہا سے ہے جس کی پھنکار کے سامنے کھاتے پیتے طبقات ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے اگر انہوں نے ذرا چون چرا کی تو آگ اور اس کے شعلے انہیں بھسم کر دیں گے چنانچہ آج کنگال شاہی کے قیام کی خوشی فی الفور منائی جا سکتی ہے فتح کی گھڑی قریب ہے۔

علم کلام ایک فن ہے

اس قسم کے پراپیگنڈا کا لوگوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اشتراکی جمہوریت کے حامی اخبارات کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں ان کے دل و دماغ ان اخبارات کا اثر قبول

کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے پھر یہ اخبارات تحریریں پیش نہیں کرتے بلکہ ان میں تق تقریریں چھاپی جاتی ہیں جہاں کھاتے پیتے طبقات کے ہاں پروفیسر صاحبان اور فاضل مضمون نویس اور نظریاتی ماہرین اور ہر قسم کے مصنفین گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے ہیں وہاں مارکس ازم کے حامیوں کے ہاں مقررین تصنیف کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں اس فن میں نمایاں ترین حیثیت یہودیوں کو حاصل ہے عام طور پر یہودیوں کی علم کلام میں مہارت اور سچ کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے مطابق بنا لینے کی استعداد انہیں ایک موثر مصنف بنا دیتی ہے لیکن دراصل ان کا اسلوب بیان ایک انقلابی مقرر کا ہوتا ہے نہ کہ کسی مصنف کا۔

یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے طبقات کے اخبارات عوام الناس میں کچھ رسوخ نہ رکھتے تھے انہوں نے عوام کو قائل کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی غرض یہاں بھی بارسوخ اخبارات پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔

سورج چڑھتے وقت تقریر کا اثر کم ہوتا ہے

جذباتی تعصبات،نفسیاتی میلانات اور وجدانی کیفیات کو مٹا کر ان کی جگہ نئے رنگ بھرنا خاصا مشکل کام ہے اس کوشش میں کامیابی کا انحصار کسی ایسے حالات اور اثرات پر ہے جنہیں ناپنا،تولنا اور بیان کرنا ممکن نہیں فقط ایک ذکی الحس مقرر جو اعلیٰ استعداد کا مالک ہو یہ کام انجام دے سکتا ہے ایسی کوششوں کو کامیاب بنانے میں یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہے کہ دن کے کون سے حصہ میں تقریر کی جائے ایک ہی تقریر کرنے والا ہو، وہی تقریر کی جائے اور موضوع بھی ایک ہو تب بھی صبح کے دس بجے اس کا اثر کچھ اور ہوگا سہ پہر کے تین بجے کچھ اور اثر ہوگا اور شام کو کچھ اور ہی اثر ہوگا جب میں نے پہلے پہل مجمع عام کے سامنے تقریریں شروع کیں تو میں صبح دوپہر سے پہلے کا وقت عام طور پر مقرر کرتا تھا مجھے ایک مظاہرہ خاص طور پر یاد ہے جس کا انعقاد ہم نے میونخ کے شہر میں کنڈل کیلر کے ہال کے اندر منعقد کیا تھا اس مظاہرہ کا مقصد جرمن اضلاع پر ظلم وستم کے خلاف

احتجاج تھا ان دنوں یہ ہال میونخ میں سب سے بڑا ہال تھا یہاں جلسہ منعقد کر کے ہم نے بڑی جرات سے کام لیا تھا جلسہ کا وقت ہم ایسا مقرر کرنا چاہتے تھے کہ ہماری تحریک کے اراکین اور دیگر سامعین آسانی سے شمولیت کر سکیں اس سے میں نے اتوار کے روز صبح دس بجے کا وقت مقرر کر دیا اس کا جو نتیجہ نکلا وہ نہایت حوصلہ شکن تھا لیکن ہم نے اس ناکامی سے بھی سبق سیکھا یوں تو سارا ہال حاضرین سے بھر گیا نظارہ بڑا شاندار تھا لیکن تمام حاضرین کچھ بے جان سے بیٹھے تھے کسی میں جوش ہی پیدا نہ ہوتا تھا اس موقع پر خاص تقریر میں نے کرنی تھی اس خیال سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ میں سامعین سے ربط قائم کرنے میں قطعاً ناکام تھا میرا خیال ہے میری تقریر ہمیشہ سے کچھ زیادہ بری نہ تھی پھر بھی نتیجہ صفر کے برابر رہا میں محسوس کر رہا تھا کہ حاضرین بے چین ہیں لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں نے ایک نیا سبق سیکھ لیا ہے اس کے بعد میں نے یہی تجربہ کئی مرتبہ دہرایا نتیجہ ہمیشہ وہی رہا۔

جگہ اور ماحول بھی تقریر کے اثر میں فرق پیدا کر دیتے ہیں

اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں اگر ہم کسی تھیٹر کا دوپہر کا شو دیکھنے جائیں اور پھر وہی کھیل شام کو دیکھیں تو دونوں کا مختلف اثر دیکھ کر حیران رہ جائیں گے ایک حساس شخص خود بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ دوپہر کے شو اور شام کے کھیل کے اثر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے دونوں وقت دل و دماغ کی حالت بالکل مختلف ہوتی ہے جو حال تھیٹر کا ہے وہی اثر سینما کی فلم پر بھی ہوتا ہے سینما پر وقت کا اثر نہایت سبق آموز ہے۔ ممکن ہے کسی کا خیال ہو کہ تھیٹر میں شاید دوپہر کے وقت ایکٹر ویسی توجہ نہیں دیتے، جیسی شام کے وقت لیکن سینما کی فلم کے متعلق تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دوپہر کے شو اور رات کے نو بجے کے شو میں کوئی بنیادی فرق ہو سکتا ہے نہیں! یہ بات نہیں!! بلکہ وقت کا انسان پر ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا کہ جگہ اور مکان کا کئی کمرے ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان کو جوش محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی وجوہات کیا ہیں، یہ تفصیل بیان کرنا ذرا مشکل ہے بہر حال

یہ حقیقت ہے کہ بعض کمروں میں ایک شخص دوسرے پر بالکل اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں بعض گذری ہوئی یادیں یا سنی سنائی روایتیں بھی انسان کے ذہن میں تصویر کی طرح موجود رہتی ہیں اور اس کے دل و دماغ کے متاثر کرنے میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ایک پرانا تاریخی ڈرامہ اگر اس شہر میں پیش کیا جائے جس کے قدیم حالات کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے تو وہاں اس کا اثر دنیا کے کسی اور شہر سے بالکل مختلف ہو گا۔ جب کھیل میں وہاں کے معروف مقامات یا روایات کی جانب اشارہ ہو گا تو اس کا لطف کسی اجنبی ماحول میں ویسا نہیں اٹھایا جا سکتا۔

تقریر کرتے ہوئے اوقات کا لحاظ کیسے رکھا جائے

ان تمام مثالوں میں مسئلہ یہ ہے کہ کسی دوسرے انسان کے ارادوں پر کہاں تک اور کن طریقوں سے قابو پایا جا سکتا ہے اس اصول کا اطلاق خاص طور پر جلسوں پر ہوتا ہے یہاں حاضرین کی قوت ارادی تقریر کرنے والے کے ارادے سے ٹکرا رہی ہوتی ہے مقرر کی خواہش ہوتی ہے کہ حاضرین کو قائل کر کے ایک نئے انداز فکر کا معتقد بنا دے۔ صبح کے پہر اور دن کے وقت انسانی طاقت کسی کی بات ماننے کے خلاف زور سے بغاوت کرتی ہے۔ برعکس اس کے رات کے پہر میں جس کا ارادہ قوی تر ہو اس کی بات دوسروں کو ماننی پڑتی ہے سچ یہ ہے کہ ہر جلسہ میں دراصل درمختلف قوت ارادی رکھنے والے فریقین کا دنگل ہوتا ہے ایک شخص جو فن تقریر کا ماہر ہے اور جس کے انداز دعوت میں پیغمبرانہ تیور موجود ہیں ان لوگوں کو زیادہ آسانی سے قائل کر سکتا ہے جن کی قوت مدافعت کمزور پڑ چکی ہو۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے قوائے ارادی و ذہنی کو بحال رکھیں انہیں قائل کرنا اور معتقد بنانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

جلسہ گاہ میں روشنی کا انتظام بھی تقریر کے اثر میں فرق پیدا کرتا ہے

کیتھولک مذہب کے گرجوں میں مصنوعی طور پر جو پر اسرار و ہندلی روشنی کا سماں پیدا کیا جاتا ہے اس کا بھی اصل مقصد یہی ہے موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں خوشبو سلگائی جاتی

ہے خوشبو سلگانے کے عجیب وغریب برتن استعمال میں آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

غرض تقریر کرنے والے اور سننے والوں کے مابین جو دنگل منعقد ہوتا ہے اس میں تقریر کرنے والا اپنی حیرت انگیز ذکاوت سے پراپیگنڈہ کے نفسیاتی اثرات کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ برعکس اس کے ایک مصنف کو یہ فائدہ اٹھانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی شخص کے ذہنی اعتقادات پہلے سے قائم ہو چکے ہوں تو مصنف ایسے اعتقاد کو زیادہ راسخ بنانے، اسے تقویت پہنچانے اور اس میں گہرائی پیدا کرنے کی خدمات انجام دے سکتا ہے تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی عظیم الشان انقلاب کبھی خالی تحریروں سے بپا نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ انقلاب کے ساتھ ساتھ تصنیفات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

انقلاب ہمیشہ تقریر کے زور سے بپا ہوتا ہے

یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انقلاب فرانس فلسفیانہ نظریات کی بنا پر بپا کیا جا سکتا تھا۔ یہ انقلاب دراصل شورش پھیلانے والوں کی ایک پوری فوج کا مرہون منت تھا۔ اس فوج کی راہنمائی چند عظیم الشان عوامی مقررین کر رہے تھے۔ یہ مقررین عوام کے جذبات کو ابھارتے تھے عوام کے جذبات خود بھی مشتعل ہو چکے تھے حتیٰ کہ یہ مواد ابلتے ہوئے لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ اس نے تمام یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حال ہی میں جو عظیم الشان بالشویک انقلاب روس میں بپا ہوا اس کا بھی یہی حال تھا یہ انقلاب لینن کے حامی مضمون نویسوں نے برپا نہیں کیا بلکہ یہ انقلاب ان مقررین کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے ہر جگہ پہنچ کر نفرت کے اس عقیدہ کی تبلیغ کی ان کے ماتحت لا تعداد چھوٹے بڑے مقررین کام کر رہے تھے جو ہر جگہ شورش پھیلاتے رہے۔

روس کا ناخواندہ اور جاہل عوام کمیونسٹ انقلاب کے حامی اس لیے نہ تھے کہ انہوں نے کارل مارکس کے نظریات پڑھ لیے تھے بلکہ وہ تو اس لیے انقلاب کے حامی تھے کہ ان کے سامنے ایک جنت کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ یہ نقشہ اس عقیدہ کے حامی ہزارہا شورش

پھیلانے والوں نے عوام کے سامنے پیش کیا۔

عوام سے خطاب کے لیے عامیانہ اسلوب ہی موثر ہوتا ہے

ہمارے کاؤدن مدعیان ذہانت جو کہ عملی دنیا سے بالکل جدا رہتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مصنف تو ضرور ہی ایک مقرر سے زیادہ ذہین ہوتا ہے اس زاویہ نگاہ کی حمایت کرتے ہوئے ایک فاضل نقاد نے جن کا مضمون کسی قوم پرست اخبار میں چھپا تھا، یہ دلیل دی کہ بڑے سے بڑے مقرر کی تقریر بھی جب چھپ کر سامنے آتی ہے تو اس کا پول کھل جاتا ہے اس سے مجھے ایک اور مضمون یاد آ گیا جو میں نے دوران جنگ مطالعہ کیا تھا۔ یہ مضمون لائیڈ جارج کی تقاریر کے متعلق تھا لائیڈ جارج تب برطانوی کابینہ میں گولہ بارود کی تیاری کا وزیر تھا اس مضمون میں لائیڈ جارج کی تقاریر کا تجزیہ کر کے نہایت باریکی سے ان کا جائزہ لیا گیا تھا۔ مضمون نویس نے یہ فاضلانہ رائے ظاہر کی تھی کہ ان تقاریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مقرر کی ذہانت اور علم نہایت ناقص ہے۔ ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تقاریر بالکل پیش پا افتادہ اور عامیانہ ہیں، میں نے خود ان تقاریر میں سے چند جو ایک رسالے کی صورت میں مطبوعہ تھیں فراہم کیں ان کے مطالعہ کے بعد مجھے اس خیال سے ہنسی آئی کہ یہ جرمن منشی صاحب جو اپنے کان میں سرنڈے کا قلم پھنسائے پھرتے ہیں، یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ تقاریر عوام کو نفسیاتی پہلو سے متاثر کرنے کے فن میں کیسے قیمتی جواہر پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں اس شخص نے ان تقریروں پر فقط اس لیے نکتہ چینی کی تھی کہ خود اس کے درماندہ ذہن پر ان کا اچھا اثر نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس عالی مرتبہ برطانوی مقرر کی تقریروں نے اس کے سامعین پر بڑا اثر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان تقاریر کا اثر تمام دنیا کی برطانوی آبادی پر ہوا تھا۔ اس نگاہ سے دیکھا جائے تو اس انگریز کی یہ تقریریں زریں کارنامہ کہلانے کی مستحق ہیں کیونکہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کو عوام کی روح سے کتنا گہرا رابطہ تھا یہی وجہ تھی کہ ان تقاریر کا اثر اتنی دور تک پہنچا۔ اب ان تقاریر کے مقابلہ میں ذرا جرمنی کے دوران جنگ کے وزیر مین ہالوگ کے

بے اثر تتلائی ہوئی زبان سے ادا ہونے والے ارشادات کا جائزہ لیجئے بادی النظر میں بے شک جرمن وزیر اعظم کی تقریریں بہتر ذہانت کی آئینہ دار ہیں لیکن یہ بے موقع ذہانت یہ ثابت کرتی ہے کہ ان صاحب کو عامۃ الناس سے بات کرنے کی تمیز نہیں یہ واقعہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے تقریر نہیں کر سکتا تھا باوجود اس کے ایک اوسط درجہ کے جرمن مصنف کا پر حماقت دماغ جس میں بے شمار سائنس کا علم ٹھنسا ہوا تھا۔ برطانوی وزیر کی تقریروں کا اثر عوام پر کیا ہوگا، اس کا اندازہ بڑے بھولپن سے یوں لگانے بیٹھتا ہے کہ خود اس پر ان تقریروں کا کیا اثر ہوا حالانکہ اس کا ذہن تو نظریاتی علم کی یلغار سے خشک ہو چکا ہے ایسے جرمن مصنف کے لیے یہ طبعی امر تھا کہ وہ اپنے ذہن پر اثرات کے ماتحت اس تقریر کا مقابلہ جرمن وزیر اعظم کے علمی لحاظ سے چٹ پٹی تقریر کے ساتھ کرتا، چاہے وہ تقریر عوام پر بالکل بے اثر ہی کیوں نہ ثابت ہو چکی ہو اسے تو یہ خیال تھا کہ خود اسے کون سی تقریر زیادہ موثر معلوم ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ لائیڈ جارج کا ذہن نہ صرف بیتھ مین ہالوگ سے کسی طرح نہ تھا بلکہ اس سے ہزار درجہ زیادہ قابل تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی تقریر ایسے انداز اور لب ولہجہ سے کرتا تھا جس کے باعث عوام دل کھول کر اس کی بات سنتے تھے اور پھر مکمل طور پر اس کی اطاعت کرتے تھے یہ ٹھیک ہے کہ تقریروں کا انداز بالکل عامیانہ تھا لیکن ان کے اس عامیانہ پن اصطلاحات کی تازگی مثالوں کی سادگی، سلاست اور برجستگی سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ اس انگریز کی سیاسی قابلیت کس اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جب کوئی سیاسی مدبر اپنی قوم کے سامنے تقریر کرتا ہے تو اس تقریر کو جانچنے کا معیار یہ نہیں کہ اس کا اثر یونیورسٹی کے پروفیسروں پر کیا ہوگا۔ بلکہ معیار تو یہ ہے کہ اس کا اثر عوام پر کیا ہوگا۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس سے کسی تقریر کرنے والے کی استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تحریر سے تحریک کے قائدین کی تربیت کا کام لینا چاہیے

چند ہی سال گذرے ہماری تحریک بالکل حقیر تھی اس تھوڑے سے عرصہ میں اس

تحریک نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے آج اندرونی اور بیرونی دشمن اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اس ترقی کی وجہ فقط یہ تھی کہ ہم نے ہمیشہ مذکورہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھا۔اور ان پر عمل کیا۔

ہماری تحریک میں تحریروں سے بھی بڑا اہم کام لیا گیا۔لیکن جن دنوں کا میں اب ذکر کر رہا ہوں تب تحریروں سے فقط یہ کام لیا جاتا تھا کہ تحریک کے چلانے والے قائدین کو یکساں تربیت دی جائے۔ان قائدین میں صف اول اور دوسری صف دونوں اقسام کے لیڈر شامل تھے ہم اپنے عام مخالفین کو قائل کرنے کے لیے تحریر سے کام لیتے تھے ایسا تو شاذونادر ہی ہوا کہ کوئی پکا اور مخلص اشتراکی جمہوریت کا حامی یا کمیونسٹ فقط ہمارا کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ کر ہمارے ضابطہ حیات کی تعلیم پانے پر آمادہ ہو گیا ہو یا اس نے خود اپنے ضابطہ حیات پر نکتہ چینی کا اثر قبول کر لیا ہو۔ایک اخبار کا بھی تبھی مطالعہ کیا جاتا ہے جب وہ پڑھنے والے کی سیاسی پارٹی سے متعلق ہو علاوہ ازیں اخبار پڑھنے سے کوئی قائل نہیں ہو جاتا ،وجہ یہ ہے کہ کسی اخبار کا خالی ایک پرچہ پڑھ کر کسی نئی تحریک کا جو عام نقشہ ذہن میں آتا ہے وہ ایسا دھندلا اور نا تمام ہوتا ہے کہ اس سے کسی اجنبی اخبار پڑھنے والے کی رائے نہیں بدل سکتی۔پھر جس شخص کو اپنے ایک ایک آنہ کے خرچ کا حساب رکھنا ہو اس سے تو یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ وہ صرف واقعات کے ہر پہلو سے واقفیت کی خاطر اپنے عقیدہ کے مخالف اخبار کا باقاعدہ خریدار بن جائے گا تحریک کا اخبار وہی شخص باقاعدہ پڑھتا ہے جو تحریک کا رکن بن چکا ہو۔وہ اخبار کا مطالعہ اس لیے کرتا ہے کہتا کہ اسے پتہ چلتا رہے کہ تحریک میں کیا ہو رہا ہے۔

تحریک کے اشتہارات ایسے لکھے جانے چاہئیں کہ منہ بولتے نظر آئیں

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا اطلاق ''منہ بولتے اشتہارات'' پر نہیں ہوتا بالخصوص اگر یہ اشتہارات مفت تقسیم ہو جائیں تو پھر انہیں بخوشی ایک سے دوسرا شخص پڑھنے کے

لیے لے لیتا ہے شرط یہ ہے کہ اشتہار کا عنوان کسی ایسے مسئلہ کے متعلق ہو جو ان دنوں زبان زد خلائق ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا اشتہار پڑھنے والا اس پر تھوڑی بہت توجہ دے کر اپنی رائے یا ذہنی میلان میں تھوڑی بہت ترمیم کر لے اور نئی تحریک پر توجہ دینے لگے۔ لیکن یہاں پوری کامیابی کی صورت میں بھی تحریک سے تھوڑی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ اعتقادات میں کوئی واضح فرق نہیں آئے گا وجہ یہ ہے کہ اشتہار فقط کسی موضوع کی جانب توجہ دلا سکتا ہے اشتہار کا فائدہ خالی یہ ہے کہ اس کا پڑھنے والا بعد میں کسی ایسی صورت حال میں شامل ہونے پر آمادہ ہو جائے جہاں اسے زیادہ واقفیت بہم پہنچا کر اس کی اعتقادی راہنمائی کی جا سکے۔ یہ راہنمائی صرف کسی جلسہ عام میں ہی مہیا کی جا سکتی ہے۔

تحریک کے لیے جلسے اور عوامی مظاہرے بھی ضروری ہیں

جلسہ ہائے عام اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ان میں شمولیت کے بعد جو شخص پہلے صرف تحریک کے ساتھ وابستگی کا ارادہ کر رہا تھا اب وہ اپنے سابقہ رشتوں سے کٹ کر تنہا رہ جانے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ جلسہ میں شامل ہوتا ہے تو پہلی مرتبہ اسے ایک نئی معاشرتی تنظیم کے وجود کا احساس ہوتا ہے اس احساس سے اکثر لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اور انہیں تقویت پہنچتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی پلٹن یا رسالے میں شامل ہو جاتا ہے، اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پیش قدمی رکتا ہے تو پھر اس کے لیے دشمن کے محاذ پر قبضہ کرنا تنہا بڑھنے کی نسبت زیادہ آسان ہو جاتا ہے اسی طرح جلسہ کے ہجوم میں بیٹھا ہوا ایک شخص ایک قسم کی پناہ محسوس کرتا ہے اس احساس کے خلاف کئی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔

وسیع پیانے پر عالیشان عوامی مظاہرے نہ صرف ہر رکن کا دل بڑھاتے ہیں بلکہ اسے تحریک کے قریب لا کر جماعتی یک جہتی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں جو شخص پہلی مرتبہ ایک نئے عقیدے کا حامی بن کر اس بازار یا علاقہ میں آتا ہے جہاں اس کی دکان یا

کارخانہ ہے وہ پہلے ذرا دل میں گھبراتا ہے۔ اسے اس وقت ایسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک انسان بہت سے انسانوں کے گروہ میں شامل ہو کر محسوس کرتا ہے عوامی مظاہرے اس گروہ کی عظمت اس کے دل پر نقش کر دیتے ہیں دیو پیکر کارخانہ یا دوکان سے باہر نکلنے پر ایک عام شخص اپنے آپ کو نہایت حقیر تصور کرتا ہے پھر جب وہ پہلی مرتبہ کسی جلسہ عام میں داخل ہوتا ہے اور چاروں جانب اپنے ہم عقیدہ افراد کو دیکھتا ہے تو اسے بڑی تسلی ہوتی ہے اسی دوران میں اگر جماعتی تاثر اس میں سرایت کر جائے تو اسے اور بھی حوصلہ ہو جاتا ہے۔ جہاں تین یا چار ہزار لوگ کسی شخص کے چاروں جانب جمع ہوں، وہاں ان کے جوش وخروش سے یہ جماعتی تاثر با آسانی پیدا ہو جاتا ہے اگر ہزارہا لوگوں کا یہ اتحاد کامیاب بھی ہو جائے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ نئی تعلیم سچی اور مبنی بر انصاف ہے ایسے موقع پر اس کے دل میں ان اعتقادات کے خلاف پہلی مرتبہ حقیقی شک پیدا ہوتا ہے جنہیں وہ آج تک مانتا آیا تھا۔ اس کے بعد وہ جماعتی ہمنوائی کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے تب ہزارہا لوگوں کی قوت ارادی ان کی خواہشات اور ان کی طاقت ہر ایک فرد میں داخل ہو جاتی ہے جو لوگ ایسی جلسہ گاہ میں شک وشبہ سے داخل ہوتے ہیں وہ یہاں سے یقین حاصل کر کے واپس جاتے ہیں اور وہ اس نئی معاشرت کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں۔

کھوکھلی لیاقت وبال جان بن جاتی ہے

قوم پرست اشتراکی تحریک نے کبھی اس اصول کو نظر انداز نہیں کیا اس تحریک نے کبھی ان کھاتے پیتے گدھوں کی رائے نہیں مانی جن کا خیال ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں لیکن جنہوں نے اپنی حماقت سے ایک عظیم سلطنت ضائع کر دی، خود اپنا وجود خطرہ میں ڈال دیا اور اپنے طبقہ کی برتری سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کی لیاقت سے ان کی جان پر بن گئی ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں بس وہ ایک ہی مہم میں ذرا چوک گئے ہیں وہ جرمن قوم کو مارکس ازم کا شکار ہونے سے نہیں بچا سکے یہ وہ میدان ہے

جس میں داخل ہوتے ہی ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور ان کی حالت قابل رحم بن جاتی ہے۔ انہوں نے خود اپنے متعلق جو رائے قائم کر رکھی ہے وہ ان کے تکبر کا ثبوت ہے ان کے غرور اور حماقت دونوں کی جڑیں یکساں گہری ہیں۔

اگر یہ لوگ آج بھی تقریر کی اہمیت کو گھٹاتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ الحمد اللہ انہیں احساس ہو چکا ہے کہ خود ان کی تقریروں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ہفتم :: سرخ طاقتوں سے تصادم

تحریک کے لئے ہنگامہ آرائی بھی ضروری ہے

1919ء سے لے کر 1921ء تک ہر سال میں نے کھاتے پیتے طبقات کے بعض جلسوں میں شرکت کی میں جب بھی ان جلسوں میں شریک ہوا مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو بچپن میں ارنڈ کے جلاب کا تیل پیتے وقت مجھ پر وارد ہوا کرتی تھی یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑتا تھا کیونکہ اس سے مجھے فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی تھی! لیکن یہ کڑوا گھونٹ تھا یقیناً نہایت بدمزہ۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ جرمن قوم کے گرد رسے سے باندھ کر اور انہیں زبردست کھینچ کر کھاتے پیتے طبقات کے جلسوں میں لایا جاتا، اور پھر وہاں مقفل دروازوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا جلسہ کے اختتام تک کسی کو واپسی کی اجازت نہ ہوتی تو پھر شاید چند سو سال بعد ان جلسوں کا قوم پر کچھ اثر ہونے لگتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں صاف گوئی سے اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ایسے حالات رونما ہو جاتے تو میں زندگی پر موت کو ترجیح دیتا۔ مجھ میں جرمن قوم سے وابستہ رہنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہتی۔ خدا کا شکر ہے کہ صورت حال ایسی نہیں یہی وجہ ہے کہ سمجھدار اور ہوش و حواس قائم رکھنے والے عوام کھاتے پیتے طبقات کے ان جلسوں سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیطان آب زم زم سے بھاگتا ہے۔

میرا کھاتے پیتے طبقات کے ضابطہ حیات کے علمبرداروں سے تعارف ہوا مجھے ان کے جو حالات معلوم ہوئے ان سے مجھے ذرا حیرت نہ ہوئی مجھے پہلے سے علم تھا کہ یہ حضرات تقریر کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ ان دنوں میں نے جمہوریت پرستوں، جرمن قوم پرستوں، قومی پارٹی اور بویریا کی عوامی جماعت (بویریا کی اعتدال پسند پارٹی) کے جلسوں میں شرکت کی سب سے پہلے مجھے جس حقیقت کا احساس ہوا وہ یہ تھی کہ سب جگہ

حاضرین کی ایک ہی کیفیت تھی تقریباً ہر جگہ حاضرین صرف پارٹی کے اراکین پر مشتمل ہوتے تھے منظر کچھ اس قسم کا تھا کہ جیسے یار لوگ تاش کھیلنے کی محفل میں بیٹھے جمائیاں لے رہے ہیں یہ جلسے کسی ایسی قوم کے جلسے نظر نہ آتے تھے جو حال ہی میں ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو چکی ہے مقررین کا جہاں تک بس چلتا وہ بھی یہی کوشش کرتے کہ مجلس کے سکوت میں فرق نہ آئے۔ یہ حضرات اس طرح تقریر کرتے گویا کسی علمی اخبار کا مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یا کوئی فاضلانہ مقالہ تلاوت فرما رہے ہیں۔ وہ ہر قسم کے جوشیلے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے تقریر میں چلتے چلتے کسی جگہ مولویانہ مزاح بھی آ جاتا۔ جب ایسی مزاحیہ عبارت سامنے آتی تو مقرر کی میز کے سامنے بیٹھنے والے لوگ بڑی فرض شناسی سے ذرا مسکرا دیتے۔ مسکرانے میں یہ احتیاط لحوظ رکھی جاتی کہ کہیں قہقہے کی آواز نہ نکل جائے بس ذرا یوں ہی مقرر کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اونچے خاندان کے لوگوں کی طرح بڑی تمکنت سے ذرا ہونٹوں پر شگفتگی کے آثار کھیل جاتے۔

ایک ناکام جلسہ کا نقشہ

یہ مقرر کی میز کے گرد بیٹھنے والے لوگ ہر جگہ ضرور موجود ہوتے تھے ایک دفعہ میں ایک ایسے جلسہ میں شریک ہوا جو میونخ کے شہر کے ویگز ہال میں منعقد ہو رہا تھا یہ ایک عوامی مظاہرہ تھا جو جنگ لیپ زگ کی برسی منانے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریر پڑھی۔ یہ مقرر کسی یونیورسٹی کے بزرگوار قسم کے پروفیسر تھے پلیٹ فارم پر مجلس منتظمہ تشریف فرما تھی۔ جناب صدر کی بائیں جانب جو صاحب بیٹھے تھے انہوں نے ایک آنکھ کی عینک لگا رکھی تھی جناب صدر کی بائیں جانب جو بزرگ بیٹھے انہوں نے بھی ایک آنکھ کی عینک لگا رکھی تھی جناب صدر کی آنکھوں پر کوئی چشمہ نہ تھا تینوں حضرات نے بڑا وضعدار قسم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا کسی جج کی عدالت میں حاضر ہوں جہاں سزائے موت کا اعلان کیا جانے والا ہے، اور اس وجہ سے چاروں جانب سکوت چھایا ہے یا گر جا

میں پادری صاحب ''عذاب شدید کی خوشخبری'' کے عنوان سے وعظ ارشاد کرنے لگے ہیں یا کوئی مذہبی عبادت کی رسم ادا ہونے والی ہے نام نہاد ''تقریر'' لکھی تو خوب تھی لیکن کچھ نہ پوچھئے کہ اس کے ''پڑھے جانے'' سے حاضرین پر کیا بیتی پون گھنٹہ تک محسوس ہو رہا تھا کہ حاضرین کو کلوروفام سنگھایا جا رہا ہے یہ خاموشی بھی ٹوٹتی جب کوئی عورت یا مرد ہال سے نکل کر باہر چلا جاتا۔ یا جب کوئی بہرہ کمرہ میں داخل ہوتا۔ چاروں جانب سے جمائیاں لینے کی آواز میں برابر اضافہ ہو رہا تھا حاضرین کو نیند آ رہی تھی میں تین مزدوروں کے عقب میں بیٹھا تھا یہ لوگ یا تو محض شوق تجسس سے آ گئے تھے یا شاید انہیں ان کی پارٹی نے ''خبر لینے'' بھیجا تھا وقتاً فوقتاً یہ تینوں جب ایک دوسرے کی جانب دیکھتے تو بے اختیار دانت نکال دیتے یا ایک دوسرے کو کہنی مارتے پھر وہ چپکے سے ہال سے نکل کر چلے گئے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جلسہ خراب کرنے کی نیت سے نہ آئے تھے یوں بھی جلسہ خراب کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی آخر کار یہ رسم ختم ہونے کا وقت قریب آیا پروفیسر صاحب کی تقریر ختم ہوئی ان کی آواز تو کچھ عرصہ پہلے ہی سنائی نہ دے رہی تھی۔ صرف لب ہلتے نظر آ رہے تھے اس کے بعد عینک والے صاحب نے جرمن بہنو! اور بھائیو!! کو مخاطب کر کے ایک زوردار اختتامی تقریر کی۔ انہوں نے حاضرین کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے پروفیسر فلاں صاحب کے زبردست لیکچر کا مخلصانہ شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ پروفیسر صاحب کے الفاظ نے کس طرح سب سامعین کے دل میں ہل چل پیدا کر دی ہے۔ ان کی رائے میں اس عالمانہ لیکچر کے بعد کسی قسم کے سوالات پوچھنا، یا بحث کرنا بدمزاقی کے مترادف ہوتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ لیکچر کے بعد بحث نہ کرنے کی تجویز پیش کر کے تمام حاضرین کی ترجمانی کر رہے ہیں لہذا وہ حاضرین جلسہ سے درخواست کرتے ہیں کہ سب کھڑے ہو جائیں اور کوئی قوم پرست گیت گائیں اس کے بعد قومی ترانہ گایا گیا۔

عوامی مظاہرے ''پرامن'' سے زیادہ ''پرجوش'' ہونے چاہئیں

قومی ترانہ سب نے مل کر گایا۔ میرے کانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ جب ترانہ کا دوسرا بند پڑھا جا رہا تھا تو گانے والوں کی آواز کچھ مدھم پڑ گئی لیکن ٹیپ کا مصرع آنے پر پھر وہی آواز اونچی ہو گئی جب ہم تیسرے بند پر پہنچے تو میرا یہ شک یقین کے درجہ تک پہنچ گیا کہ حاضرین میں سے اکثر کو قومی ترانہ کے اشعار یاد نہ تھے اس لئے ٹیپ کے مصرع میں تو سب شریک ہو جاتے تھے لیکن باقی اشعار میں اللہ اللہ خیر صلی۔

خیر اس قسم کی فضول باتیں سوچنے کا کیا فائدہ۔ بات تو یہ ہے کہ قومی ترانہ سب نے شوق سے گایا اور ثابت کر دیا کہ تمام حاضرین قوم پرست تھے اس کے بعد جلسہ ختم ہوا اور حاضرین جلسہ گاہ سے باہر بھاگنے لگے۔ کسی نے شراب کا جام چڑھایا، کوئی قہوہ خانے میں گھس گیا اور کسی نے تازہ ہوا میں سانس لینے پر اکتفا کی۔

''چلو! باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لیں'' میں تو اس وقت یہی سوچ رہا تھا کیا قومی یادگاریں منانے کا یہی طریقہ ہے جس جنگ میں لاکھوں جرمنوں نے اپنی جانیں قوم کی آن پر قربان کر دیں کیا اس کی برسی یوں ہی منعقد ہونی چاہیے۔ لاحول ولا قوۃ۔

اس قسم کی حرکتیں حکومت کو خوب پسند آتی ہیں، کیونکہ ایسے جلسے پر امن ہوتے ہیں۔ جس وزیر کے سپرد قانون اور امن کا محکمہ ہے اسے ہرگز کوئی خدشہ نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے جلسے میں عوام جوش میں آ جائیں گے آداب مجلس کو طاق پر رکھتے ہوئے جلسہ گاہ سے نکل کر شراب خانوں اور قہوہ خانوں میں گھسنے کی بجائے بازاروں میں مظاہرے شروع کر دیں گے۔ جس سے پولیس کو ناحق تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

نہ! نہ!! ایسے شہری کسی کام کے نہیں۔

برعکس اس کے قوم پرست اشتراکیوں کے جلسے ہرگز ''پرامن'' نہ ہوتے تھے یہاں دو ضوابط حیات کی باہمی ٹکر تھی سخت مخالفانہ ٹکر! یہاں جلسے گراموفون پر گانے والے ریکارڈ کی طرح ختم نہ ہوتے تھے یہاں تو عوام قومی جذبہ سے سرشار ہو کر جلسہ گاہ سے باہر جاتے تھے۔

جلسہ منعقد کرنا بھی جنگ سے کم نہیں

شروع ہی سے ہم نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہمارے جلسوں میں آہنی نظم وضبط قائم رہنا چاہیے۔ صدر کے احکام کی تعمیل بلاچون وچرا ہونی چاہیے۔ ہم کھاتے پیتے لوگوں کے جلسہ کی طرح اپنے جلسہ میں صابن کی جھاگ سے رنگین بلبلے بنا کر نہ اڑانا چاہتے تھے ہم تو ایسی باتیں کہتے تھے کہ ہمارے جلسہ میں کوئی مخالف بیٹھا ہوتو بھڑک اٹھے بارہا ایسا ہوا کہ ہمارے جلسہ میں مخالفین کی جتھہ بند ٹولیاں آئیں چند سرغنے ان کی راہنمائی کے لئے ان کے ہمراہ تھے ان کے چہروں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آج ہی سارا قصہ یہیں ختم کر کے جانے کا نام لیں گے۔

ہاں ہاں کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ سرخ جھنڈے کے علمبردار کثیر تعداد میں ہمارے جلسوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی نیت سے آئے انہوں نے یہ منصوبے پہلے سے بنا رکھے ہوتے تھے کہ بارہا جلسہ منتشر ہونے میں تھوڑی ہی کسر باقی رہ گئی لیکن ہمارے صدر کے سنگدلانہ عزم نے اور ہمارے جلسہ کے منتظم رضا کاروں کے اجڈ سلوک نے جلد ہی حریفوں کے مزاج ٹھکانے لگا دیئے۔ بے شک ہمارے حریف اگر ہم سے ناراض ہوں تو وہ اس معاملہ میں حق بجانب ہیں۔

مخالفین کو بھی متوجہ کرنا چاہیے

کمیونسٹوں کو ہمارے جلسہ میں کھینچ لانے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ ہم نے اپنے اشتہار سرخ رنگ میں چھاپے تھے عام کھاتے پیتے لوگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے بھی بالشویکوں کا لال رنگ استعمال کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں کوئی راز پنہاں ہے جرمن قوم پرست حلقوں میں کانا پھوسیاں شروع ہوگئیں کہ یہ بھی مارکس ازم کے حامیوں کا ایک فرقہ ہے۔ یہ تو مارکس ازم کے حامی ہیں جو بھیس بدل کر باہر نکلے ہیں یا ممکن ہے سوشلسٹ ہوں۔ یہ لوگ تو آج تک مارکس ازم اور سوشلزم کا فرق نہیں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ہمارے جلسوں میں حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے یوں پکارا

جاتا ہے کہ ''اے ہم وطن مردو! اور عورتو'' کھاتے پیتے لوگوں کی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''خواتین وحضرات!'' ہماری پارٹی کے اراکین بھی ایک دوسرے کو ''جماعتی رفیق'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو انہیں پختہ یقین ہو جاتا کہ یہ تو کمیونسٹ ہیں۔ ہم ان بزدل کھاتے پیتے لوگوں کی باتیں سن کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے یہ غریب ہماری تحریک کی ابتدا، ہماری نیت اور ہمارے مقاصد کو مسخ کر کے غلط رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

ہم نے سرخ اشتہار چھاپنے کا فیصلہ پورے غور وخوض اور محتاط اندازہ لگانے کے بعد کیا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ذرا ان کمیونسٹوں کو چڑائیں۔ انہیں ہماری جانب توجہ تو ہو یہ بھی ہمارے جلسوں میں آئیں کچھ ہرج نہیں اگر یہ ہمارا جلسہ خراب کرنے کی کوشش کریں ہمیں لوگوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کا موقعہ تو ملے۔ ان دنوں ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ہمارے حریف کس طرح بار بار اپنی چال بدلتے تھے وہ بے چارے ہمیشہ لاچار ہو کر حیران رہ جاتے تھے پہلے تو انہوں نے پیروؤں سے اپیل کی کہ ہمارے جلسہ میں کوئی نہ جائے اور ہمیں نظر انداز کر دیا جائے عام طور پر ان کی اس اپیل پر عمل کیا گیا۔ جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے حامی ہماری صفوں میں شامل ہونے لگے اور انہوں نے ہماری تعلیمات کو قبول کر لیا تو ان کی اس اپیل پر عمل کیا گیا۔ جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے حامی ہماری صفوں میں شامل ہونے لگے اور انہوں نے ہماری تعلیمات کو قبول کر لیا تو ان کے لیڈروں کو بے چینی اور اضطراب محسوس ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ صورت حال برداشت نہیں کی جا سکتی اور بزور تشدد اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینا چاہیے۔

ایک کامیاب تحریک کس طرح ترقی کرتی ہے

تب ''طبقاتی شعور رکھنے والے کنگالوں'' سے اپیل کی گئی کہ وہ ہمارے جلسوں میں کثرت سے شامل ہو کر اور مزدوروں کے ''مکے سے رجعت پسند شاہ پرستوں'' کی اس

تحریک کو کچل کے رکھ دیں۔

اچانک ہماری جلسہ گاہ، جلسہ شروع ہونے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی مزدوروں سے پر ہوگئی۔ ان اجتماعات کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ گویا بارود کی بھری ہوئی بوری رکھی ہے اور پاس ہی سلگتا ہوا فیتہ بھی موجود ہوتا تھا لیکن نتیجہ ہمیشہ ان کی توقعات کے خلاف نکلتا جو لوگ ہمارے دشمن کی حیثیت میں آتے تھے وہ جاتے وقت اگر ہماری تحریک میں شمولیت پر آمادہ نہ ہو چکے ہوتے تو کم از کم خود اپنے اعتقادات پر تنقیدی نگاہ ڈالنا ضرور شروع کر دیتے۔ آہستہ آہستہ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا میری تقریر اور تین گھنٹہ کی بقیہ تقریروں نے ہمارے موافقین اور مخالفین کو یکجا کر کے ہمارے پیروؤں کی ایک جوشیلی جماعت کی صورت میں متحد و منظم کر دیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے مخالف قائدین ڈر گئے انہوں نے وہ حیلے ترک کر دیئے تھے پھر ادھر ہی رجوع کیا انہوں نے سچائی اور پارسائی کا جامہ پہن کر پھر ایک مرتبہ اعلان جاری کیا کہ مزدوروں کو اصولاً ہمارے جلسوں میں شرکت کرنی ہی نہ چاہیے۔

تب ہمارا جلسوں میں مزدوروں کی آمد ایک مرتبہ پھر رک گئی۔ یا اگر وہ آتے تھے تو بہت تھوڑی تعداد میں لیکن تھوڑا ہی عرصہ بعد کھیل از سر نو دوبارہ شروع ہو گیا مزدوروں نے ہمارے جلسوں سے دور رہنے کی ہدایت نظر انداز کرتے ہوئے پھر ان میں شمولیت شروع کر دی کمیونسٹ روز افزوں تعداد میں ہمارے کارکن بننے لگے حتیٰ کہ پھر "عملی اقدام" کا فیصلہ کیا گیا ہماری جماعت کو تشدد سے ختم کر دینے کا حکم جاری ہو گیا۔

کسی کامیاب تحریک کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے

باوجود اس کے دو، تین اور پھر آٹھ جلسے منعقد ہو چکے، تو انہیں اندازہ ہو گا کہ جلسے توڑنے کا حکم دینا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا ذرا مشکل ہے ہر جلسہ کے بعد سرخ لشکر کی طاقت زیادہ کمزور ہوتی جا رہی تھی دفعتاً پھر یہ نادری حکم صادر ہوا کہ اے کنگالو! اے کمیونسٹ مردو اور عورتو! ان قوم پرست اشتراکی شورش پیدا کرنے والوں کے جلسوں

میں ہرگز مت جایا کرو۔

سرخ اخبارات نے بھی اس قسم کے حربے باری باری استعمال کرنے شروع کئے۔ جب بھی وہ ہمیں خاموش کرانے کی کوشش کرتے تو انہیں تجربہ ہوتا کہ یہ ناممکن ہے پھر انہوں نے اس کے مخالف لائحہ عمل بنایا ہر روز ہماری جماعت کا تذکرہ ہوتا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ مزدوروں کی نگاہ میں ہمیں مضحکہ خیز ثابت کر دیا جائے کچھ عرصہ کے بعد انہیں احساس ہوا کہ ہمارا تو کچھ بگڑتا نہیں الٹا ہمیں فائدہ ہو رہا ہے لوگ پوچھتے تھے کہ جب موضوع مضحکہ خیز ہے تو اس پر اخبار کی اتنی جگہ کیوں ضائع کی جاتی ہے تب لوگوں میں ہمارے متعلق تجسس شروع ہوا اس پر اخبارات نے اپنے حملہ کی صورت بدل دی کچھ عرصہ ہم سے یہ سلوک کیا گیا کہ ہمیں بنی نوع آدم کا دشمن اور مجرم قرار دے دیا گیا مقالہ پر مقالہ شائع ہو رہا تھا ہر مقالہ میں ہمارے مجرمانہ عزائم کی نئی تفصیل درج ہوتی تھی ان الزامات کی تائید میں لمبے چوڑے ثبوت مہیا کئے جاتے تھے بے سروپا جھوٹی کہانیاں جو سراسر بہتان تراشی پر مبنی ہوتی تھیں ہمارے خلاف اختراع کی جاتی تھیں اس اخباری مہم کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں لوگوں میں بدنام کر دیا جائے۔

دلیری اور جرات کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی

ان دنوں میں نے یہ موقف تیار کر رکھا تھا کہ چاہے وہ ہم پر ہنسیں، چاہے پھبتیاں کسیں، چاہے ہمیں احمق ثابت کریں اور چاہے مجرم، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ہمیں نظر انداز نہ کر سکتے تھے اور ہم پر توجہ دینے کے لئے مجبور تھے رفتہ رفتہ مزدوروں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ صرف ہم ہی ایک ایسی جماعت ہیں جو ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں دل یہ کہتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہودی اخبارات کے پیرووں کو پتہ چل جائے گا کہ ہم کون ہیں اور در اصل کیا چاہتے ہیں۔

کمیونسٹوں کو اگر ہمارا کوئی جلسہ منتشر کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے لیڈر انتہا درجہ کے بزدل تھے جب نازک وقت آیا تو وہ لڑنے مرنے کا

کام اپنے چھوٹے موٹے ماتحتوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر خود میدان سے بھاگ جاتے تھے پھر وہ ہال سے باہر ایک طرف کھڑے ہو کر یہ انتظار کرتے تھے کہ جلسہ منتشر ہو جائے تو تماشہ دیکھیں گے۔

مخالفین کی صفوں میں جاسوس بھیجنے چاہئیں

ہمیں اپنے حریفوں کے ارادوں کا ہمیشہ خوب علم رہتا تھا اس کی دو وجوہات تھیں اول تو ہم نے اپنی پارٹی کے کئی اراکین کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اسی مصلحت کی خاطر سرخ جماعتوں کے رکن بنے رہیں دوسرے سرخ جماعتوں کے لیڈر ہماری خوش قسمتی سے ایسے باتونی تھے کہ جو کچھ کرنا ہوتا تھا پہلے ہی اس کا چرچا ہر جگہ کرتے پھرتے تھے باتونی پن کی یہ عادت بدقسمتی سے آج بھی جرمنوں میں عام ہے ان لوگوں سے کوئی تجویز چھپا کر نہ رکھی جاتی تھی روایتی مرغی کی طرح یہ حضرات چوزے نکلنے سے پہلے ہی کڑکڑانا شروع کر دیتے تھے لہذا ہم ہر موقع پر ہم اس پیمانہ پر احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتے تھے کہ سرخ حملہ آوروں کو یہ علم بھی نہ ہوتا تھا کہ گڑبڑ مچانے کی پہلی کوشش پر ہی انہیں کس طرح جلسہ سے باہر نکال پھینکا جائے گا۔

پولیس کے بھروسے پر جلسہ منعقد نہیں کیا جا سکتا

ان حالات نے مجبور کر دیا کہ ہم اپنے جلسوں کی حفاظت خود کریں سرکاری حفاظت پر تکیہ نہ کیا جا سکتا تھا تجربہ سے ثابت ہوا کہ پولیس ہمیشہ جلسہ خراب کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے سرکاری حفاظت کا ہمیشہ ایک ہی پہلو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ پولیس والے کھڑے ہو کر اعلان کر دیتے ہیں کہ اب جلسہ ختم کیا جا رہا ہے حالانکہ جلسہ ختم کرنا ہی ہمارے مخالفین کا اصل مقصد ہوتا تھا۔

عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں پولیس نے جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا وہ سرکاری بدانتظامی کی واضح مثال ہے۔ جونہی انہیں اطلاع پہنچتی کہ کوئی جلسہ منتشر کرنے کی کوشش کی جائے گی، وہیں یہ حضرات جلسہ خراب کرنے والوں کو گرفتار کرنے

کی بجائے جلسہ منعقد کرنے والے بے گناہوں کو یہ مشورہ دینے پہنچ جاتے کہ ''جلسہ بند کیا جاتا ہے''پولیس اپنے اس اقدام کی وضاحت یوں کرتی تھی کہ ''امن اور قانون کے تنفر کے لئے تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔''

پولیس کی حفاظت میں جلسہ منعقد کرنے سے عوام کی ہمدردی ضائع ہو جاتی ہے

نتیجہ یہ تھا کہ شرفاء کی سیاسی سرگرمیاں ہمیشہ منچلے اور رہتھ چھٹ لچوں کے رحم وکرم پر ہوتی تھیں جو ماردھاڑ پر تلے رہتے تھے سرکار تو امن کے نام پر ان غنڈوں کے سامنے جھک جاتی اور رعایا کو حکم دے دیتی کہ خواہ مخواہ غنڈوں کو مشتعل کرنے کا کیا فائدہ ہے جب قوم پرست اشتراکی کسی جگہ جلسہ منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے، اور مزدوروں کی یونین اعلان کر دیتی کہ وہ یہ جلسہ منعقد نہ ہونے دیں گے، تو حکومت ان غنڈوں کو نہ گرفتار کرتی، نہ جیل بھیجتی۔ الٹے پولیس ہمارے جلسہ کی ممانعت کا اعلان کر دیتی یہ قانون کی محافظ پولیس ایسی بے شرم تھی کہ اسے ایسے موقعوں پر ہمیں لکھ کر حکم دینے سے بھی عار نہ تھا ان حالات میں یہی علاج تھا کہ جلسہ خراب کرنے کی ہر کوشش جڑ پکڑنے سے پہلے ہی دبا دی جائے یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے وہ یہ کہ جو جلسے پولیس کی حفاظت میں منعقد کیے جاتے ہیں وہ عوام کی نگاہ سے جلسہ منعقد کرنے والوں کی قدر ومنزلت گرا دیتے ہیں جو جلسہ پولیس کی حفاظت کے بغیر منعقد نہیں کیا جا سکتا اس کے ذریعہ کسی شخص کو تحریک کا مقصد بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام کے نچلے طبقہ کی ہمدردیاں حاصل کرنی ہیں تو ایک سیاسی جماعت میں اتنی طاقت بھی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی ہمدردی کا مستحق بھی ثابت کرے۔ جس طرح ایک عورت ایک بزدل کے مقابلہ میں ایک دلیر مرد کو ترجیح دیتی ہے، اسی طرح عوام کے قلوب پر بھی ایسی سیاسی جماعت کا سکہ بیٹھتا ہے جو شجاعت کے زیور سے آراستہ ہو۔ وہ کسی ایسی کمزور تحریک کا اثر قبول نہیں کرتے جو اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے بھی پولیس کی امداد کی

محتاج ہو۔

جلسہ خراب کرنے والوں کا مقابلہ کیسے کرنا چاہیے

یہی وجہ تھی کہ ہماری نوزائیدہ تحریک کو خاص طور پر اپنا وجود قائم رکھنے کے قابل بنانا نہایت ضروری تھا ہم مدافعت خود کرنا چاہتے تھے، اپنے خلاف سرخ طاقتوں کا حملہ ناکام بنانے کی کوشش بھی خود ہمارے ہی ذمہ تھی۔

ہمارے جلسوں کے لئے حفاظتی اقدامات کی تنظیم حسب ذیل دو اصولوں پر مبنی تھی:

1 اپنے جلسہ کو ایسا جاندار بنانا اور یوں نفسیاتی تاثر کا ایک خاص معیار قائم رکھنا کہ اس میں کوئی مداخلت کارگر ہی نہ ہو۔

2 منتظم رضا کاروں کے ایسے دستے فراہم کرنا جو ضرورت پڑے تو نظم وضبط قائم رکھ سکیں۔

ان دنوں ہمارے جلسوں میں صورت حالات پر صرف ہمارا ہی قابو ہوتا تھا۔ کبھی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ ہم نے کسی دوسرے کو اپنے جلسے پر قابو پانے دیا ہو۔ ہمارے مخالفین خوب جانتے تھے کہ چاہے وہ ہمارے خلاف کتنی ہی طاقت کیوں نہ فراہم کر کے لائیں، جونہی انہوں نے ہمیں ذرا اشتعال دلایا انہیں بغیر کھٹکے اٹھا کر جلسہ گاہ سے باہر پھینک دیا جائے گا ان دنوں ہم جلسے میونخ شہر کے علاوہ دوسرے مقامات پر منعقد کرتے تھے وہاں اکثر پانچ سو یا آٹھ سو مخالفین کا سامنا ہوتا تھا۔ ہماری قوم پرست اشتراکی پارٹی کے صرف پندرہ یا سولہ اراکین ان کے سامنے ڈٹ جاتے تھے باوجود اس کے کہ ہم کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے ہم بجائے ہتھیار ڈالنے کے اپنی جان دینے پر آمادہ ہوتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ ہماری پارٹی کے مٹھی بھر ساتھیوں نے سرخوں کے ایک پر تشدد انہ اور مشتعل ہجوم کا شجاعانہ مقابلہ کیا یہ ٹھیک ہے کہ وہ پندرہ بیس آدمی بالآخر ضرور ختم کئے جا سکتے تھے لیکن ہمارے مخالفین کو علم تھا کہ ان لوگوں کو ختم کرنے سے پہلے ان کی تعداد سے تین یا چار گنا زیادہ حملہ آوروں کی کھوپڑیاں چکنا چور ہو گئی ہوں گی

یہ قربانی وہ لوگ پیش کرنے پر آمادہ نہ تھے ہم نے جلسے منعقد کرنے کے لئے مارکس ازم کے حامیوں اور کھاتے پیتے لوگوں، دونوں کے طریقوں کا بغور مطالعہ کیا تھا، اور ہم نے دونوں سے مفید سبق حاصل کئے تھے۔

کمیونسٹوں کی مکارانہ چالیں

مارکس ازم کے حامی ہمیشہ اپنے جلسوں میں ایسا کڑا ضبط قائم رکھتے تھے کہ ان کے جلسہ کو منتشر کرنے کا کبھی کھاتے پیتے لوگوں کو خیال بھی نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ سرخے دوسروں کے جلسے خراب کرنے پر یوں تلے ہوئے تھے، جوں جوں وقت گزرتا گیا نہ صرف سرخوں کو اس کارروائی میں خوب مہارت حاصل ہوگئی بلکہ جرمنوں کے کئی اضلاع میں تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ سرخوں نے کھلم کھلا اعلان کر رکھا تھا کہ مارکس ازم کے حامیوں کے سوا کسی اور سیاسی جماعت نے جلسہ منعقد کرنے کی جسارت کی تو اسے مارکس ازم کے حامی اپنے خلاف ''نا قابل برداشت اشتعال انگیزی'' تصور کریں گے۔ جب کمیونسٹ تحریک کو چلانے والے پس پردہ لیڈروں کو یقین ہو جاتا کہ کوئی جلسہ منعقد ہونے والا ہے جہاں خود ان کی زیادتیوں اور غداریوں اور حیلہ بازیوں کا پردہ چاک کیا جائے گا تو وہ ایسے جلسہ کو ناکام بنانے میں ذرہ بھر توقف نہ کرتے۔ جوں ہی کوئی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا اعلان ہوتا، سرخ اخبارات یک آواز ہو کر اس کے خلاف غرانا شروع کر دیتے یہ قانون شکن عناصر سب سے پہلے حکام کی جانب رجوع کرتے اور بڑے حاکمانہ اور دھمکی آمیز لہجہ میں یہ درخواست کرتے کہ ''کنگال طبقہ کے خلاف اس اشتعال انگیزی'' کو فوراً روک دیا جائے، کیونکہ قانون اور امن کا یہی تقاضا ہے۔ اس دعویٰ کو پیش کرنے کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی تھی، اس کا لب ولہجہ اور انداز مخاطب افسر کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق بدلتا رہتا تھا جس قسم کا احمق افسر ہو، ویسا ہی اسلوب بیان اختیار کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ یہ مطالبہ سو فیصدی کامیاب رہتا تھا۔ اگر کوئی افسر صحیح معنوں میں جرمن پرست ہو، اور محض نشان کا ہاتھی نہ ہو، اور ایسے گستاخانہ مطالبہ کو

رد کر دے تو تب ایک نئی چال چلی جاتی تھی ۔ وہ چال یہ تھی کہ ایک طرف تو اعلان کیا جاتا کہ ''کنگال مزدوروں کو اشتعال نہ دلاؤ'' اس کے ساتھ ہی پارٹی کے اراکین کو ہدایت کی جاتی کہ فلاں تاریخ پر فلاں جگہ جلسہ میں پوری جمعیت اور طاقت کے ساتھ شرکت کرو۔ اس شرکت کا مقصد یہ ہوگا کہ ''کھاتے پیتے طبقات کی شرمناک سازشوں کا بلبلہ مزدوروں کے زبردست مکے کی طاقت سے پھوڑ دیا جائے۔''

جلسہ میں حریف سے دبنا ٹھیک نہیں

کھاتے پیتے طبقات کے جلسے جس دہشت کے ماحول میں منعقد ہوتے تھے انہیں دیکھ کر ان غریبوں پر ترس آتا تھا۔ ان لوگوں پر کمیونسٹوں کا ایسا رعب چھایا تھا کہ جب تک اس کا حال آنکھوں سے نہ دیکھ لیا جاتا محض سنی سنائی سے تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ اکثر تو اس قسم کی دھمکیوں سے ہی جلسہ فوراً ملتوی کر دیا جاتا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ جلسہ کا اعلان آٹھ بجے ہوتا تو کارروائی کا آغاز پونے نو یا نو بجے سے بمشکل ہی ہو سکتا۔ صدر جلسہ کارروائی یوں شروع کرتے کہ پہلے ''حزب اختلاف کے معزز اراکین'' کی شان میں ایک قصیدہ ارشاد کرتے اس میں کہا جاتا کہ صدر اور منتظمین جلسہ ان حریفوں کی آمد پر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں یہ خوش آمدید صریحاً سفید جھوٹ ہوتا تھا۔ ان مخالفین کی آمد کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی کہ اگرچہ وہ ہمارے ساتھ متفق نہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ باہمی تبادلہ وخیالات اور افہام و تفہیم سے ہی مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ حزب اختلاف کے معزز مہمان فوراً ان شرائط کو بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے اس کے ساتھ ساتھ غریب صدر یہ بھی یقین دلاتا کہ اس جلسہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کسی کو اس کے عقیدہ سے منحرف کیا جائے (نا صاحب اس کی ضرورت ہی کیا ہے) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ سیاسی رائے خود قائم کرے اور پھر اپنی رائے برقرار رکھے۔ لیکن دوسروں کو بھی تو آزادی رائے کا حق دینا چاہیے۔ لہٰذا میں حاضرین سے درخواست کرتا ہوں کہ اب جو صاحب تقریر فرمائیں گے ان کو دوران تقریر میں ٹوکا نہ جائے۔ یہ تقریر نہایت مختصر ہو

گی۔ آپ خاموشی سے تقریر سن کر دنیا پر ثابت کر دیں گے کہ یہ جلسہ جرمنوں کے افسوسناک باہمی اختلافات کی شرمناک مثال نہ دہرائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کمیونسٹ جلسے کیسے خراب کرتے ہیں

کمیونسٹ پارٹی کے کامریڈ صاحبان اس قسم کی میٹھی میٹھی گفتگو سے ذرا نہ پسیجتے۔ جوں ہی تقریر شروع ہوتی مقرر پر آوازے کسے جاتے، اور اسے خاموش ہوتا پڑتا۔ حضرات مقررین یوں بھیگی بلی بن کر سٹیج سے اتر جاتے کہ بعض دفعہ تو خیال ہوتا کہ شاید وہ خود ہی چاہتے تھے کہ انہیں خاموش کر کے درجہ شہادت بخش دیا جائے۔ کھاتے پیتے طبقات کے مجاہدین اس شان کے ساتھ جلسہ گاہ سے رخصت ہونا شروع کر دیتے کہ ان کے پیچھے پیچھے ایک غوغائی ہجوم ان کا تعاقب کر رہا ہوتا ایسا تب ہوتا جب ان لوگوں کی قسمت اچھی ہوتی ورنہ عام طور پر اختتام کا منظر اس سے زیادہ حسرت ناک ہوتا تھا۔ یعنی کسی کی ہڈیاں سلامت نہ بچتیں اور جوتا ٹوپی کی تو پھر ہوش ہی کسے رہتی تھی۔

ان حالات میں ہماری قوم پرست اشتراکی پارٹی نے جلسوں کا جو انتظام شروع کیا تھا اسے دیکھ کر مارکس ازم کے حاجی بھونچکے رہ گئے وہ ہمارے جلسوں میں اس خیال سے شرکت کرنے آتے تھے کہ جس کھیل کھیلنے کے عادی ہو چکے ہیں وہی کھیل یہاں بھی کھیلا جائے گا۔ اور ہمارا بھی وہی حشر ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ ''آج انہیں ختم کر دیں گے'' بارہا ایسا ہوا کہ وہ جلسہ گاہ میں یہی نعرے لگاتے داخل ہوئے لیکن انہیں ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ جلسہ گاہ سے اٹھا کر باہر پھینکے جا چکے ہیں۔ انہیں دوبارہ یہ نعرہ بلند کرنے کی مہلت بھی نہ دی گئی۔

جلسہ کے منتظمین کو خود اعتمادی سے کام لینا چاہیے

اول تو ہمارے جلسہ میں کارروائی کا ڈھنگ ہی کچھ مختلف تھا۔ ہم اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے نہ کسی سے تقریر کی اجازت مانگتے تھے۔ نہ خاموش رہنے کی اپیل کرتے تھے نہ کسی کو اپنے جلسہ میں بکواس کی اجازت دیتے تھے۔ ہم یہ تسلیم ہی نہ کرتے

تھے کہ ہمارے جلسہ میں ہر ایرے غیرے کو بحث شروع کرنے کی اجازت ہے۔ ہم بڑے روکھے انداز میں ہر شخص کو سمجھا دیتے کہ جلسہ ہمارا ہے جو ہماری مرضی ہو گی ہم یہاں کریں گے۔ اگر کسی نے ہماری کارروائی میں خلل ڈالا تو اسے بغیر پوچھ گچھ کے اٹھا کر جلسہ سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ جو صاحب جلسہ کی کارروائی میں مداخلت کریں۔ ان سے اس مداخلت کے باعث جو کچھ بھی سلوک ہو اس کے ذمہ دار ہم نہ ہوں گے۔ اگر زائد وقت بچا تو جلسہ کے آخر میں بحث کی اجازت دی جائے گی۔ اب ہماری پارٹی کے فلاح رفیق کار تقریر شروع کرتے ہیں یہ انداز تخاطب ایسا تھا کہ مارکس ازم کے حامی بیچارے اسے سن کر ششدر رہ جاتے۔

رضا کاروں کی تنظیم کی ضرورت

دوسرے ہمارے ہر جلسہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ اور منظم رضا کاروں کا ایک گروہ جلسہ میں امن قائم رکھنے کی خاطر ہماری ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ برعکس اس کے کہ کھاتے پیتے لوگوں کے جلسوں کی حفاظت ایسے افراد کے ہوتی تھی جنہیں دیکھ کر خیال آتا تھا کہ بوڑھے میاں کو استقبال کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے ان کو زعم ہوتا تھا کہ ان کی عمر کے باعث ان کا احترام کیا جائے گا اور ان کا حکم مانا جائے گا لیکن مارکس ازم کے حاجی کچھ نہ جانتے تھے کہ احترام کرنا اور حکم ماننا کس بلا کا نام ہے۔ ان حالات میں کہا جا سکتا ہے کہ کھاتے پیتے لوگوں کے جلسوں میں جلسہ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا۔

جب پہلے پہل ہمارے جلسے شروع ہوئے تو میں نے اسی وقت حفاظتی رضا کاروں کا ایک دستہ مرتب کر ڈالا۔ اس دستہ میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے۔ ان میں سے بعض تو وہ فوجی تھے جو میرے ساتھ جنگ میں شامل رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ پارٹی کے وہ نوجوان اراکین تھے جنہیں شروع ہی سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ دہشت اور تشدد کا مقابلہ صرف دہشت اور تشدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں صرف جان پر کھیل جانے والے دلیر مردوں کو کامیابی حاصل ہوا کرتی ہے ہم ایک ایسے نصب العین کی

خاطر لڑ رہے تھے جس کے لئے خون کا آخری قطرہ بہانا بھی جائز ہے۔ان نوجوانوں کو یہ سبق سکھایا گیا تھا کہ جب مسائل کا فیصلہ عقل کے بجائے لٹھ سے ہونے لگے تو خیر اسی میں ہے کہ حملہ کا انتظار کرنے کی جگہ خود ہی حملہ شروع کردو۔ ہمارے جلسوں کے محافظین کی ناموری اسی میں ہے کہ ان کے لڑاکے پن کی شہرت ہو۔ان کو زبان ہلانے سے پہلے ہاتھ کے جوہر دکھانے چاہئیں۔

دوران جنگ پروان چڑھنے والے ان نونہالوں نے غیر معمولی جوش وخروش سے ہمارے اس پیغام پر لبیک کہا وہ پہلے ہی کھاتے پیتے طبقات کی سستی اور بزدلی دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

اب ہر شخص پر ثابت ہو گیا کہ جرمنی میں انقلاب بپا ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت کی حکومت نے انقلابیوں کو کچلنے میں بزدلی دکھائی تھی اگر تب حکومت انقلاب کو کچل دینا چاہتی تو فوجیوں کی کمی نہ تھی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس وقت کوئی ایسا صاحب دماغ نہ تھا جو اس طرح انقلاب کو دبا دینے کا حکم دیتا جب میں ان نوجوانوں کے سامنے تقریر کرتا اور انہیں سمجھاتا کہ ان کے فرائض وقت کے مستقبل کے لحاظ سے کیسے اہم ہیں تو ان کی آنکھوں میں جوش کی ایک عجیب چمک آ جاتی میں انہیں بار بار یہ سبق دیتا کہ اگرچہ تمہاری کھوپڑی میں دنیا بھر کی عقل جمع ہو چکی ہے لیکن بازوؤں میں اتنی سکت نہیں کہ اپنے سر کو لاٹھی سے بچا سکو تو یہ ساری عقل اکارت جائے گی صلح کی دیوی جنگ کے دیوتا کی ہمراہی کے بغیر اس دنیا میں اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتی ایسی مثالوں سے جنگ میں خدمت کا مفہوم ان نوجوانوں کے ذہن پر خوب واضح طور سے نقش ہو جاتا تھا دفتروں کی مردہ فضا میں کرسیوں پر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بیٹھے ہوئے بدچلن اور مریض سرکاری افسر جنگ کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتے تھے بطور ایک قومی فریضہ کے جنگ کے معنی وہی زندہ دل جوان سمجھ سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ ملک کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی ہے تو

موت سے کبھی نہ ڈرنا چاہیے۔

ہمارے رضا کاروں کی تنظیم

ان نوجوانوں نے کیا خوب کارنامے انجام دیئے!

جب کبھی ہمارے جلسہ میں کوئی شخص خلل پیدا کرتا یہ نوجوان ستائی ہوئی بھڑوں کے چھتے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ خلل پیدا کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو، یہ نوجوان خود زخمی ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں، انہیں ذرہ بھر پرواہ نہ ہوتی تھی کہ نوبت خون خرابے تک پہنچ جائے گی ان کے سینے میں تو یہ شوق موجزن تھا کہ ہماری تحریک اپنی مقدس منزل کی جانب کامیابی سے بڑھتی جائے۔

1920ء کے موسم گرما میں ہمارے جلسوں کی حفاظت کے لئے اور وہاں ضبط قائم رکھنے کی خاطر ہمارے رضا کاروں کی تنظیم ایک واضح شکل اختیار کر چکی تھی 1921ء کے موسم بہار میں ہمارے رضا کاروں کی یہ جماعت سو سو رضا کاروں کی ٹکریوں میں تقسیم کی جا چکی تھی یہ ٹکڑیاں پھر آگے ٹولیوں میں تقسیم تھیں۔

اس تنظیم کی ضرورت یوں واضح تھی کہ اب ہمارے جلسوں کی تعداد روز افزوں تھی میونخ شہر کے ہاف براؤ ہاؤس میں اب بھی ہمارے جلسے منعقد ہوتے تھے لیکن اب اس کے علاوہ ہم سارے شہر کی بڑی بڑی جلسہ گاہوں میں بھی جلسے منعقد کرتے تھے 1920-21ء کے درمیانی موسم خزاں اور موسم سرما میں ہم نے جو جلسے بیور گر براؤ اور میونخ شہر کے کنڈول براؤ میں منعقد کئے وہاں حاضرین کی تعداد بے اندازہ بڑھ چکی تھی ہمارے جلسوں میں ہمیشہ یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جلسے میں ہجوم زیادہ ہوتا تھا تو پولیس جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے گھنٹوں پہلے داخلہ بند کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

تحریک کے جھنڈے اور نشان کی ضرورت

ہمارے جلسوں میں ضبط قائم رکھنے کی خاطر رضا کاروں کے جو دستے مرتب ہوئے انہوں نے ایک اور بڑا مشکل سوال حل کر دیا۔ اس وقت تک ہماری تحریک کا کوئی جماعتی

نشان کا طغریٰ نہ تھا۔ ہمارا جداگانہ جھنڈا بھی نہ تھا اس وقت کے ماحول میں یہ کمزوریاں کچھ ایسی ناقابل برداشت نہ تھیں لیکن خیال یہ تھا کہ مستقبل میں شاید ایسی کمزوریاں برداشت نہ کی جاسکیں ان علامات کا تعین نہ ہوسکنے کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ پارٹی کے اراکین کے پاس کوئی ایسا ظاہری نشان نہ تھا جس سے ان کی شناخت ہوسکے باہمی شناخت کے بغیر ان میں تعاون اور اتحاد کے امکانات کا پورا فائدہ نہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ یہ نامناسب تھا کہ آئندہ بھی پارٹی کے اراکین یونہی بغیر کسی ظاہری نشان کے چھوڑ دیئے جائیں یہ نشان ایسا ہونا چاہیے جو تحریک کے مقاصد کا ترجمان ہو اور جو بین الاقوامی کمیونسٹوں کے نشانات کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔

میرے ایام جوانی کے دوران میں مجھے بارہا تجربہ ہوچکا تھا کہ اس قسم کا ظاہری نشان کسی سیاسی جماعت کے لئے نفسیاتی اہمیت رکھتا ہے اس قسم کے نشانات سے اراکین کو جذباتی تسکین بھی حاصل ہوتی ہے جنگ کے بعد جب کمیونسٹ شاہی محل اور قیصری باغ کے سامنے عوامی مظاہرے کر رہے تھے تو میں ان دنوں برلن میں ہی تھا چاروں جانب سرخ جھنڈوں کا ایک سمندر نظر آتا تھا کہیں بازوؤں پر سرخ نشانات تھے کہیں کوٹ کے بٹن کے سوراخوں میں سرخ پھول لگے تھے قریباً ایک لاکھ بیس ہزار حاضرین کا مجمع ہوگا اس وسیع اجتماع میں ہر جانب پھیلے ہوئے سرخ نشانات سے ایک عجیب ہیبت، رعب اور قوت کا احساس ہوتا تھا میں یہ مظاہرہ دیکھ کر خوب سمجھ گیا، بلکہ میں نے خود محسوس کیا کہ ایک بازار میں چلنے پھرنے والا عام شہری اس قسم کے ڈرامائی مظاہروں کو دیکھ کر کیوں ان سے جادو کا سا اثر قبول کرتا ہے۔

جھنڈے کی اہمیت اعتقادی ہونی چاہیے

کھاتے پیتے طبقات بحیثیت ایک سیاسی پارٹی کے نہ کسی ضابطہ حیات کے علمبردار ہیں اور نہ کسی ضابطہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی ایک جھنڈا نہیں ان کی سیاسی جماعتیں تو ایسے ”محبان وطن“ پر مشتمل ہوتی ہیں جو بس حکومت کا سرکاری

جھنڈا اٹھائے پھرتے ہیں اگر اس سرکاری جھنڈے کا رنگ کسی ضابطہ حیات کا ترجمان ہوتا تو کم از کم یہی سمجھ لیا جاتا کہ یہ سرکاری جھنڈا سرکاری ضابطہ حیات کا ترجمان ہے اس صورت میں اس جھنڈے کا احترام کرنے والے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ جھنڈا ان کے ضابطہ حیات کو نافذ کرنے کی کوششوں کا ترجمان ہے۔

فی الحقیقت صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔

ہماری سرکار تو رنگا رنگ کے نمونوں کا ایک گلدستہ ہے جس کو باندھ کر اکٹھا کرنے کا کام جرمن کھاتے پیتے طبقات کی امداد کے بغیر ہی انجام پا رہا تھا سرکاری جھنڈا جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ تھا اس لئے یہ بس سرکار کا جھنڈا تھا اور اسکے سوا کچھ نہ تھا۔ اس جھنڈے کی نہ کوئی اعتقادی نوعیت تھی، نہ اہمیت۔

جرمنی کا پرانا جھنڈا

جرمن زبان بولنے والے علاقہ میں صرف جرمن آسٹریا ایک ایسا رقبہ تھا جہاں کھاتے پیتے طبقات کی سیاسی جماعت کا جھنڈا اس قابل تھا کہ اسے کسی سیاسی پارٹی کا جھنڈا تسلیم کیا جاتا یہاں قوم پرست کھاتے پیتے طبقات کے ایک گروہ نے 1848ء کے قومی جھنڈے کے رنگوں کو اپنا لیا تھا۔ اس جھنڈے میں یہ رنگ تھے کالا، لال اور سنہری۔ یہ جھنڈا کسی ضابطہ حیات کا تو ترجمان نہ تھا پھر بھی قومی زاویہ نگاہ کا ترجمان ہونے کی حیثیت میں جہاں تک اس علاقے کا تعلق تھا۔ یہ ایک انقلابی جھنڈا ضرور کہلا سکتا تھا۔ تب اس جھنڈے کے بدترین مخالف اشتراکی جمہوریت پرست تھے یا عیسائی مذہب پرست اشتراکی، یا پادریوں کی پارٹی کے اراکین جس طرح ان عناصر نے 1918ء میں کالے، سفید اور لال رنگوں کے قیصری جھنڈے کو بٹہ لگایا تھا۔ اسی طرح وہ آج بھی اپنے اس نئے جھنڈے کو ذلیل کر رہے تھے یہ ٹھیک ہے کہ جرمن پنچایتی سرکار کا کالا، لال اور سنہرا جھنڈا 1848ء کی یادگار تھا یہ بھی ٹھیک ہے کہ 1848ء کا زمانہ ایک مثالی عہد متصور ہوتا ہے لیکن اس دور میں اس جھنڈے کی نمائندگی راستباز جرمنوں کے

ہاتھ میں تھی یہودی سازشی چوہے کے بلوں میں چھپے رہتے تھے جب اس جرمن علاقہ کو شرمناک طریقہ پر غلام بنالیا گیا اور نا قابل معافی غداری کا ارتکاب ہوا تب مارکس ازم کے حامی اور اعتدال پرست پارٹی کے حامی اس جھنڈے کے پرستار بن بیٹھے آج یہ لوگ اس جھنڈے کے پرستار بن بیٹھے ہیں آج یہ لوگ اس جھنڈے کو اپنا مقدس اور پیارا جھنڈا کہتے ہیں وہ اس جھنڈے کو اپنانا چاہتے ہیں لیکن یہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے سرکاری جھنڈے سے 1918ء میں غداری کی تھی۔

پرانا جھنڈا کام نہیں دے سکتا

غرض یہ بالکل سچ ہے کہ 1920ء تک مارکس ازم کے حامیوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا جھنڈا نہ تھا جو مارکس ازم کی مخالف طاقتوں کو یکجا کرنے کا نشان بن سکتا۔ کھاتے پیتے جرمنوں میں سے بھی بہتر سیاسی عناصر اب اچانک کالے، لال اور سنہرے رنگوں کو اپنا نشان بنانے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ انہیں 1918ء کا تلخ تجربہ نہ بھولا تھا وہ اس جھنڈے کو تو قبول نہ کرتے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں خود بھی اپنا کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کر سکتے تھے جو نئی صورت حال سے مطابقت رکھتا انہیں زیادہ سے زیادہ یہی خواہش تھی کہ پرانی جرمن سرکار کو از سر نو بحال کر دیا جائے۔

غرض یہ ہے کہ وہ طرز فکر جس کی علمبرداری کالے سفید اور لال رنگ کے جھنڈے کے سپر دہوتی ہے یہ پرانی قیصری جرمن سرکار کا جھنڈا ہے اس جھنڈے کو اب ہماری نام نہاد قوم پرست کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں دوبارہ زندہ کرنا چاہتی ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ایک ایسی سرکار جسے مارکس ازم کے حامیوں نے شرمناک حالات میں ختم کر دیا اس کا نشان اب مارکس ازم کے حامیوں کو کچلنے کے لئے اچھا ثابت نہیں ہو سکتا ممکن ہے ایک شریف النفس جرمن اس جھنڈے کا احترام کرے اور اسے لحاظ سے عزیز رکھے کہ جب یہ جھنڈا زندہ تھا تو اپنی جوانی کے ایام میں اس نے اس جھنڈے کے سائے میں جنگ لڑی اور کئی سورماؤں نے اسی جھنڈے کی آن پر اپنی جانیں قربان کر

دیں۔لیکن مستقبل کی کشمکش میں حصہ لینے کے لئے یہ جھنڈا کسی کام کا نہیں۔

پرانے جھنڈے کی بے حرمتی نہ کرو

جہاں تک ہماری تحریک کا تعلق ہے ہم نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ جرمن قوم کا پرانا جھنڈا اگر ختم ہو گیا ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے میرے اس زاویہ نگاہ اور کھاتے پیتے طبقات سے تعلق رکھنے والے سیاسی مدبرین کے زاویہ نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ اچھا ہے نئ جرمن سرکار نے ایک نیا جھنڈا بنالیا ہے۔اب وہ اس نئے جھنڈے کے ماتحت جو ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں ہمیں ان کی کچھ پرواہ نہیں۔ آؤ ہم سب تقدیر کا شکرادا کریں کہ ہمارے دوران جنگ سربلند جھنڈے کو یہ ذلتیں برداشت کر کے ایک ذلیل چیتھڑا بن جانے سے بچالیا گیا ہے۔

موجودہ جرمن سرکار تو اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو فروخت کر رہی ہے خدا وہ دن نہ لائے کہ ایسی سرکار اس قابل احترام جھنڈے کو اپنا لے جس میں کالا سفید اور لال رنگ شامل تھے۔

جب تک نومبر 1918ء کے شرمناک واقعات کا داغ ہماری پیشانی سے دھو نہیں دیا جاتا۔تب تک مناسب یہی ہے کہ اس شرمناک صورت حال کے اعلان کے لئے اس کا ایک علیحدہ جھنڈہ ہی ہے۔اس سرکار کا حق ہے کہ پرانے وہ ایک پرانے معزز جھنڈے کو چرا کر اپنا لے ہمارے کھاتے پیتے سیاسی مدبرین کو ہوش رکھنا چاہیے کہ جو شخص اس موجودہ سرکار کے لئے کالا،سفید اور لال جھنڈا تجویز کرتا ہے وہ جرمنوں کے شاندار ماضی کو داغ لگانے کا خواہش مند ہے۔پرانا جھنڈا ہماری پرانی قیصری سرکار ہی کے شایان شان تھا۔قدرت کا شکر ہے کہ اس پنچایتی سرکار نے اپنے قدوقامت کے مطابق ایک الگ جھنڈا تراش لیا ہے۔

یہ ایک اور وجہ تھی کہ ہم قوم پرست اشتراکی پارٹی کے اراکین پرانے جھنڈے کو پھر بلند کرنا اپنے خاص مقصد کے لئے موزوں نہ سمجھتے تھے ہمیں ہرگز یہ آرزو نہیں کہ ہم اس

قیصری جرمن سرکار کو دوبارہ زندہ کریں جو خود اپنی غلطیوں کے باعث ختم ہو چکی ہے۔ ہم تو ایک نئی سرکار تعمیر کرنے کے خواہش مند ہیں۔

نئی سرکار کا نیا جھنڈا

جو تحریک مارکس ازم کا ان خطوط پر مقابلہ کرنا چاہتی ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک نئی سرکار کے نشان کے طور پر ایک نیا جھنڈا بھی تجویز کرے۔

ایک نیا جھنڈا اختیار کرنے کا سوال تب عرصہ تک ہمارے سامنے رہا سوال یہ تھا کہ جھنڈے کی شکل وصورت کیا ہو۔ ہر طرف سے مختلف تجاویز موصول ہو رہی تھیں یہ تجاویز نیک نیتی سے پیش کی جاتی تھیں لیکن کم و بیش سب نا قابل عمل تھیں نئے جھنڈے کے لئے فقط یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہماری جدو جہد کا نشان بن جائے بلکہ اس کے لئے یہ بھی شرط تھی کہ وہ ایک موثر اور خاصے لمبے چوڑے اشتہار کا کام بھی دے سکے جو لوگ عوام کی پسند سے تعلق رکھنے والے معاملات میں حصہ لیتے ہیں وہ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں دراصل کتنی اہمیت رکھتی ہیں لاکھوں اشخاص کو تحریک کی جانب متوجہ کرنے کا اولین مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں جھنڈا دیکھ کر تحریک سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔

جھنڈے کا رنگ

یہی وجہ تھی کہ ہمیں جو مختلف تجاویز موصول ہوئیں وہ ہم نے نامنظور کر دیں ایک تجویز تو یہ تھی کہ ہماری تحریک کا جھنڈا سفید ہو جس کا مقصد یہ ہو کہ ہماری پرانی سرکار زندہ کرنا چاہتے ہیں ہم اس طرح ان فرسودہ سیاسی جماعتوں کی صف میں کھڑا نہ ہونا چاہتے تھے۔ جو فقط گذرے ہوئے زمانہ کو واپس لانا چاہتی ہیں علاوہ ازیں سفید کوئی ایسا رنگ نہیں جس سے عوام کی توجہ کو کھینچا جا سکے یا قائم رکھا جا سکے۔ سفید رنگ تو صرف جوان لڑکیوں کی انجمنوں کے لئے ہی موزوں رہتا ہے اسے ایک ایسی تحریک کا نشان کس طرح بنایا جا سکتا ہے جو انقلابی دور میں اصلاح کی علمبردار ہے۔

ایک تجویز یہ تھی کہ کالے رنگ کا جھنڈا اختیار کیا جائے موجودہ حالات کی مناسب سے تو یہ تجویز بہت موزوں تھی لیکن اس سے یہ کچھ پتہ نہ چلتا کہ ہماری تحریک کے عزائم اور ارادے کیا ہیں۔ علاوہ ازیں کالا رنگ بھی جاذب توجہ نہیں۔

ایک تجویز یہ تھی کہ سفید اور نیلے رنگ کا جھنڈا اختیار کیا جائے ایسا جھنڈا خوبصورت تو ضرور ہوتا، لیکن یہ جھنڈا پہلے سے جرمنی کی وفاقی سرکار کے ماتحت ایک ریاست کا جھنڈا ہے۔ پھر وہ ریاست بھی ایسی ہے کہ بدقسمتی سے تنگ نظری کے لئے مشہور ہے اور اس کی کوئی اچھی شہرت نہیں علاوہ ازیں ان رنگوں میں بھی نقص یہی ہے کہ جاذب توجہ نہیں کالے اور سفید جھنڈے پر بھی یہی اعتراض تھا۔

کالے، لال اور سنہرے رنگوں کو تو اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ موجودہ جرمن پنچایتی سرکار کے جھنڈے میں شامل ہیں۔

علی ہذا القیاس کالے، سفید اور لال رنگ کے جھنڈے کو اختیار نہ کرنے کی وجوہات میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کم از کم یہ رنگ اس شکل میں تو استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ جس طرح آج تک استعمال ہوتے آئے ہیں پھر بھی یہ تینوں رنگ باقی تمام رنگوں سے بہتر ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان رنگوں کا آپس میں خوب میل ہے اور جاذب نظر بھی ہیں۔

ہمارا نیا جھنڈا

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری خواہش ہمیشہ سے یہی تھی کہ پرانے رنگوں کو کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھا جائے اس کی وجہ تو یہ تھی کہ میں ایک سابق فوجی کی حیثیت سے پرانی جرمن سرکار کے جھنڈے کو ان رنگوں کو اپنے لئے واجب التعظیم سمجھتا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے شخصی ذوق کے اعتبار سے بھی ان رنگوں کا باہمی میل بہت خوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وہ تمام لاتعداد تجاویز اور نقشے نامنظور کر دیئے تھے جو نئی تحریک کے جھنڈے کی خاطر پیش کئے گئے تھے ان مجوزہ خاکوں میں کئی ایسے تھے جو

پرانی سرکار کے جھنڈے کے رنگوں میں سواستیکما کا نشان بھی شامل کرتے تھے بحیثیت قائد کے میں خود اپنا نقشہ عوام کے سامنے پیش نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ کوئی اور شخص مجھ سے بہتر نہیں تو میرے جیسا نقشہ پیش کر دیتا۔ ہوا بھی یہی کہ سٹارن برگ کے قصبہ سے ایک دانتوں کے جراح نے ایک بہت اچھا نقشہ پیش کیا جو میرے نقشہ سے بالکل ملتا جلتا تھا اس کے نقشہ میں صرف ایک سقم تھا وہ سقم یہ تھا کہ سواستیکما کی شاخیں بیل کے سینگوں کی طرح گول مڑی ہوئی تھیں اور پس منظر سفید تھا۔

لاتعداد تجربوں کے بعد میں نے ایک آخری نقشہ تیار کیا میرا نقشہ یہ تھا کہ سرخ جھنڈے میں ایک سفید دائرہ جس کے مرکز میں سواستیکما کا نشان بنایا جائے۔ کئی تجربوں کے بعد میں نے جھنڈے اور سفید دائرے کے رقبے اور سواستیکما کی جسامت میں مناسبت و توازن پیدا کر لیا۔ اس کے بعد ہمارے جھنڈے کی شکل آج تک نہیں بدلی گئی۔

ہمارے رضا کاروں کا طغریٰ

اس کے ساتھ ہم نے اپنے جلسوں میں انتظام کرنے والے رضا کاروں کے دستوں کی خاطر اس نمونہ کے بازو بند نشان بھی تیار کروا دیئے یہ بازو بند سرخ ہوتے تھے بیچ میں ایک سفید دائرہ ہوتا تھا اور اس نے اندر سواستیکما کا نشان بنایا جاتا تھا میونخ شہر کے ایک سنار ہرفس نے اس بازو بند کا پہلا عملی نمونہ بنا کر پیش کیا جس کے بعد یہ نمونہ مستقل صورت اختیار کر گیا۔

1920ء کے موسم گرما کے عین وسط میں ہمارا جھنڈا پہلی مرتبہ عوام کے سامنے پیش کیا گیا یہ جھنڈا ہماری تحریک کے لئے خوب موزوں تھا تحریک بھی نئی تھی اور جھنڈا بھی نیا گویا دونوں کے جوانی کے دن تھے یہ جھنڈا پہلے کسی نے کبھی نہ دیکھا تھا اس زمانے میں اس جھنڈے کا عوام پر یہ اثر ہوا گویا جلتی ہوئی مشعل چلی جا رہی تھی تحریک کی حامی خواتین میں سے ایک خاتون کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ ہمیں پہلا جھنڈا تیار کر

دے۔ جس دن یہ جھنڈا بن کر آیا ہم سب بچوں کی طرح خوشی سے اچھل پڑے۔ چند ہی ماہ بعد میونخ میں ہم لوگوں کے پاس ایسے چھ جھنڈے تھے جلسہ گاہوں کی حفاظت کے لئے ہمارے رضا کاروں کی تعداد روز افزوں تھی۔ انہی رضا کاروں کی بدولت ہمارا جھنڈا بہت جلد مقبول عام ہوگیا۔

اور پھر یہ جھنڈا ہماری تحریک کے لئے کیا خوب نشان ثابت ہوا۔

ہمارے جھنڈے کی وضاحت

اس جھنڈے میں جو رنگ شامل تھے ایک طرف تو ہم اس لئے ان کا احترام کرتے تھے کہ وہ ہمارے شاندار ماضی کے ترجمان تھے اس جھنڈے کے ماتحت جرمن ملت نے اپنا قومی وقار برقرار رکھنے کے لئے جنگیں لڑی تھیں دوسری طرف یہ جھنڈا ہماری تحریک کی پشت پر جو فلسفہ ہے اسے بھی وضاحت سے پیش کر دیتا ہے ہم قوم پرست اشترا کی اپنے جھنڈے کو اپنی پارٹی کے پروگرام کا ترجمان سمجھتے ہیں سرخ رنگ ہماری تحریک میں معاشرتی انقلاب کے تخیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سفید رنگ ہماری قوم پرستی کی علامت ہے سواستیکا ہمارے قومی نصب العین کا نشان ہے وہ نصب العین یہ ہے کہ ہم انسانیت کے آریائی فرزندوں کو دنیا کا حاکم دیکھنا چاہتے ہیں ہم تخلیقی کارگذاری پر ایمان رکھتے ہیں ایسی محنت اور مشقت کرنا جس سے کوئی نتیجہ نکلے صرف آریاؤں کا مقدر ہو چکا ہے بنی سام کو یہ توفیق حاصل نہیں ہوسکتی اس لئے سواستیکا کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اولادِ سام کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔

دو سال کے عرصہ میں ہماری جلسہ گاہوں کی حفاظت کرنے والے رضا کار، طوفانی دستوں کی شکل اختیار کر چکے تھے اس رضا کارانہ تنظیم کا مقصد ایک جدید ضابطہ حیات کی حفاظت کرنا تھا ضرورت تھی کہ اس تنظیم کو بھی کامرانی کا ایک نشان دیا جائے یعنی اس کا بھی ایک جھنڈا ہو میں نے اس جھنڈے کا خاکہ بھی تیار کرلیا اور اس کی تیاری جماعت کے قدیم رفیق کار ہرگوبر کے سپرد کردی، جو سنار کا کام کرتے تھے اس روز سے لے کر

آج تک یہ نشان بھی قوم پرست اشترا کی جدو جہد کا طغریٰ خصوصی رہا ہے۔

ہمارے ابتدائی جلسے

اب ہمارے جلسوں میں عوام کی دلچسپی بڑھ چکی تھی خاص طور پر 1920ء میں تو یہ دلچسپی بہت بڑھ گئی ہمیں مجبور کیا جاتا تھا کہ ایک ہفتے میں دو دو جلسے کریں جہاں ہمارا اشتہار لگا ہوتا وہاں ہجوم ہو جاتا۔ شہر کی بڑی بڑی جلسہ گاہیں سامعین سے پر ہو جاتیں۔ ہمارے اکثر جلسے کسی ہال میں ہوتے تھے ہزارہا مخلوق خدا جسے مارکس ازم کی تعلیمات نے گمراہ کر دیا تھا ہمارے جلسے سننے آتی وہ ہماری باتیں سنتے تو بہت سے متفق ہو جاتے پھر وہ وطن کو آزاد کرانے کی جدو جہد میں کام کرنے کے لئے ہمارا ہاتھ بٹاتے میونخ کے عوام اب ہم سے خوب واقف ہو چکے تھے ہمارے چرچے لوگوں کی زبان پر تھے ''قوم پرست اشترا کی'' کی ترکیب لفظی اب اکثر سننے میں آتی تھی، اس مجموعہ الفاظ کا مفہوم بالکل واضح تھا اس کے تذکرے سے ایک سیاسی پارٹی کا تفصیلی پروگرام تصور میں آجاتا تھا ہمارے حامیوں اور اراکین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ 21-1920ء کے درمیانی موسم سرما میں ہم میونخ کے اندر ایک مضبوط پارٹی بن چکے تھے۔

ان دنوں سواء مارکس ازم کی حامی پارٹیوں کے میونخ میں اور کوئی قابل ذکر پارٹی نہ تھی کم ازکم کوئی ایسی قوم پرست پارٹی نہ تھی جو ہماری طرح عوامی مظاہروں کا انتظام کر سکتی میونخ کے کنڈل ہال میں پانچ ہزار حاضرین بیٹھ سکتے تھے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہال میں ہمارا جلسہ ہوا تو حاضرین کے بیٹھنے کے لئے جگہ نہ رہی۔ شہر میں صرف ایک دوسرا ہال اور تھا جہاں ہم نے ابھی تک جلسہ منعقد نہ کیا تھا اس کا نام کرونی سرکس ہال تھا۔

جنوری 1921ء میں ایک مرتبہ پھر جرمنی کے لئے سخت تشویش کے اسباب پیدا ہو گئے۔ معاہدہ پیرس کی رو سے جرمنی کو دس کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کی مجذوبانہ شرط عائد کر دی گئی پھر یہ بھی حکم تھا کہ یہ رقم سونے کی اشرفیوں میں ادا کرنی ہوگی جب

جرمنی نے یہ شرط ماننے سے کچھ عذر کیا تو جرمنی کے دشمنوں نے لندن میں جمع ہوکر جرمنی کو الٹی میٹم دے دیا۔

ہمارا پہلا عوامی مظاہرہ

اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے میونخ کے ملت پرست عناصر کی ایک مشترکہ مجلس منتظمہ نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا میں یہ دیکھ کر سخت مضطرب ہوا اور جھنجھلا اٹھا کہ وقت گزرتا جارہا ہے اور عملاً کچھ نہیں کیا جارہا پہلے کونس پلاٹز میں جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی پھر کچھ سوچ کر یہ تجویز ملتوی کردی گئی کیونکہ خطرہ تھا کہ سرخے جلسہ خراب نہ کردیں پھر یہ تجویز ہوئی کہ فیلڈان ہال کے سامنے مظاہرہ کیا جائے لیکن یہ تجویز بھی ملتوی ہوگئی آخر کار طے پایا کہ میونخ کنڈل ہال میں ایک مشترکہ جلسہ منعقد کیا جائے دن پر دن گذرتے جارہے تھے بڑی بڑی پارٹیوں نے اس سانحہ عظیم کو قطعاً نظر انداز کردیا تھا۔ مجلس منتظمہ ابھی تک یہ ٹھیک طرح سے طے نہ کرپائی تھی کہ مظاہرہ کس روز کا ہے جائے۔

یکم فروری کو منگل کے روز میں نے پرزور مطالبہ کیا کہ کوئی آخری فیصلہ کیا جائے مجھے بدھ کے روز تک انتظار کرنے کو کہا گیا بدھ کے روز میں نے پھر پوچھا کہ صاف صاف بتائے جلسہ کب ہونا ہے جواب پھر گول مول اور ٹال مٹول کی صورت میں تھا مجھے بتایا گیا کہ "توقع ہے" اسی ہفتے میں مظاہرہ منعقد کیا جائے گا۔

مجھ میں اب مزید ضبط نہ تھا میں نے فیصلہ کیا کہ ہم خود احتجاجی مظاہرہ کریں گے بدھ کی دوپہر کو میں نے دس منٹ میں اشتہار کا مضمون لکھوا دیا اسی وقت اگلے روز یعنی فروری کے لئے کرونے سرکس ہال بھی ہم نے کرایہ پر لے لیا۔

ایک کامیاب جلسہ کا انعقاد

اس زمانے کے حالات میں یہ فیصلہ ایک بہت بڑی مہم کا ذمہ لینے کے مترادف تھا صرف یہی خطرہ نہ تھا کہ جلسہ گاہ سامعین سے پر ہوسکے گی کہ نہیں بلکہ یہ خدشہ بھی تھا کہ

جلسہ خراب نہ کر دیا جائے۔

تعداد کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو ہمارے جلسہ گاہ کے محافظ رضا کار کا شمار اس وسیع ہال کے لئے کافی نہ تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ اگر جلسہ خراب کیا گیا تو اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ ایک بڑے ہال میں جلسہ خراب کرنے والوں سے نجات حاصل کرنا شاید عام جلسہ گاہوں سے زیادہ دشوار ہو لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ میرے خدشات بے بنیاد تھے حقیقت حال بالکل برعکس نکلی اتنے بڑے ہال میں جلسہ خراب کرنے والوں کا ناطقہ بند کر دینا اور ان پر غلبہ حاصل کرنا چھوٹی چھوٹی جلسہ گاہوں کی نسبت زیادہ آسان ثابت ہوا۔

ایک بات یقینی تھی اگر ہمیں ناکامی ہوئی تو پھر ہمیں سنبھلنے میں مدت لگ جائے گی ہمارا ایک جلسہ خراب ہو گیا تو ہماری جو دھوم مچ چکی ہے اس میں فرق آ جائے گا ہمارے مخالفین جب ایک دفعہ کامیاب ہو گئے تو پھر وہی حربے بار بار دہرائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم مزید جلسے نہ کر سکیں گے اس نئی دقت کا مقابلہ کرنے میں کئی مہینے ضائع ہو جائیں گے۔

ہمارے پاس صرف ایک دن باقی تھا یعنی جمعرات کا، جس میں ہم اپنے اشتہارات نکال سکتے تھے بدقسمتی سے اسی روز صبح بارش ہو گئی اب یہ خوف پیدا ہوا کہ بارش اور برف میں باہر نکلنے کی بجائے اکثر لوگ گھر ہی رہنا پسند کریں گے خاص طور پر ایسے جلسے میں کون جائے جہاں دھینگا مشتی اور خون خرابے کا خطرہ ہو۔

جمعرات کی صبح کو یک لخت مجھ پر یہ ڈر طاری ہو گیا کہ ممکن ہے یہ بڑا ہال سامعین سے پر نہ ہو سکے پھر تو مجلس منتظمہ میرا خوب مذاق اڑائے گی اس خیال سے میں نے مختلف اقسام کے دستی اشتہارات کا مضمون فی الفور لکھوایا اور اسی روز سہ پہر میں یہ دستی اشتہارات تقسیم کروا دیئے یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ ان دستی اشتہارات میں جلسے پر آنے کی دعوت درج تھی۔

میں نے دو لاریاں کرایہ پر لیں پھر جہاں تک بس چلا ان لاریوں کو چاروں جانب سے سرخ اشتہارات سے سجا دیا۔ ہر لاری پر ہمارا جھنڈا نصب کر دیا گیا پھر ایک ایک لاری پر ہماری پارٹی کے پندرہ بیس ارکان بٹھا دیئے گئے ان اراکین کو ہدایت دی گئی کہ سڑکوں پر جلسے کا اعلان خوب زور و شور سے کریں اشتہارات تقسیم کریں اور اس روز شام کو جو جلسہ منعقد ہو رہا ہے اسکے پراپیگنڈہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں یہ پہلی بار تھا کہ سڑکوں پر جھنڈے لہراتے ہوئے لاریاں گھومیں لیکن ان میں مارکس ازم کے حامی نہ بیٹھے تھے لوگوں کے منہ ہماری ان سرخ گاڑیوں کو دیکھ کر کھلے کے کھلے رہ گئے۔ شہر کے بیرونی علاقے میں سرخے مٹھیاں بھینچ بھینچ کر کہتے تھے کہ یہ دیکھو مزدوروں کو مشتعل کرنے کی ایک نئی صورت نکالی گئی ہے مارکس ازم کے حامیوں کو شاید وہم تھا کہ جلسے منعقد کرنا اور سڑکوں پر لاریاں گھمانا صرف انہی کے لئے جائز ہے۔

ایک کامیاب جلسہ کا نقشہ

شام کے سات بج گئے اور جلسہ گاہ میں ابھی صرف چند نفوس ہی پہنچے تھے مجھے ٹیلی فون پر ہر دس منٹ کے بعد اطلاع دی جا رہی تھی میں مضطرب ہو گیا عام طور پر سات سوا سات بجے تک ہماری جلسہ گاہ قریب قریب آدھی بھر جایا کرتی تھی بسا اوقات تو جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہتی لیکن جلد ہی میں سمجھ گیا کہ میرے اضطراب کی اصل وجہ کیا تھی میں یہ بھول گیا تھا کہ نئی جلسہ گاہ کتنی وسیع ہے ہاف براہاؤس میں ایک ہزار حاضرین موجود ہوں تو جلسہ گاہ خاصی بھری بھری نظر آتی ہے لیکن اس سرکس بلڈنگ میں اتنی ہی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نظر نہیں آتی تھوڑا عرصہ بعد مجھے حوصلہ افزا اطلاعات موصول ہونے لگیں پونے آٹھ بجے مجھے بتایا گیا کہ جلسہ گاہ تین چوتھائی بھر چکی ہے اور ٹکٹ خریدنے والوں کا ایک کثیر ہجوم ابھی جلسہ گاہ سے باہر ہے میں اب جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں سرکس بلڈنگ پہنچا تو آٹھ بج کر دو منٹ ہوئے تھے جلسہ گاہ سے باہر عوام کا ہجوم

کھڑا تھا ان باہر کھڑے ہونے والوں میں کچھ تماشائی تھے اور بعض ہمارے مخالف تھے جو واقعات کے رو پذیر ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

جب میں ہال میں داخل ہوا تو مجھے وہی مسرت محسوس ہوئی جو ایک سال پہلے میونخ ہاف براؤ ہال کے ایوان دعوت میں ہمارے پہلے جلسے کی تقریب پر محسوس ہوئی تھی جلسہ گاہ میں ہجوم کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا میں بہ مشکل ہجوم میں سے گزر کر پلیٹ فارم پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ہمیں کیا شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے میرے سامنے ہال ایسے نظر آتا تھا جیسے آدھی سیپ کا بہت بڑا ٹکڑا ہو۔ ہزار ہا حاضرین سے جلسہ گاہ پر تھی۔ کرسیوں کے علاوہ فرش پر بھی بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ پانچ ہزار چھ سو ٹکٹ بک چکے تھے اس کے علاوہ بیروزگاروں، غریب طالب علموں اور خود ہمارے نظم وضبط قائم رکھنے والے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی اندازہ تھا کہ ساڑھے چھ ہزار افراد موجود ہوں گے۔

میری تقریر کا عنوان تھا ''مستقبل یا تباہی'' مجھے یقین ہو گیا کہ عوام کا یہ ہجوم جس سے میں مخاطب ہوں مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ اس یقین سے مجھے وہ مسرت حاصل ہوئی کہ میں خوشی سے جھوم گیا۔

میں نے تقریر شروع کی، میں اڑھائی گھنٹے تک بولتا رہا آدھ گھنٹہ تقریر کر چکنے کے بعد مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ جلسہ کامیاب ہو گیا۔ ان ہزار ہا افراد سے اب ہمارا ربط قائم ہو گیا تھا جب میں ایک گھنٹہ تقریر کر چکا تو چاروں جانب سے خود بخود بے اختیار تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین کی آواز آنے لگی جب میں دو گھنٹے تقریر کر چکا تو تالیوں اور نعروں کی جگہ حاضرین پر سنجیدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی اس کے بعد مجھے متعدد بار اسی ہال میں اس سنجیدہ خاموشی کا تجربہ ہونا تھا۔ جو لوگ اس سنجیدہ خاموشی کا تجربہ حاصل کر چکے تھے وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے اس خاموش سنجیدگی کا مظاہرہ دل میں کھب جانے والا ہوتا ہے کہیں تنکہ گرنے کی بھی آواز نہیں آتی تھی لوگ مبہوت ہو کر بے حس وحرکت بیٹھے

ہوئے تھے جب میں نے تقریر ختم کی تو حاضرین نے قومی ترانہ گا کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

میں تقریر ختم کرنے کے بعد یہ شاندار منظر بیس منٹ تک کھڑا دیکھتا رہا۔ وسیع ہال آہستہ آہستہ خالی ہو گیا پھر میں پلیٹ فارم سے رخصت ہوا۔ میرا دل خوش اور مطمئن تھا میں گھر واپس لوٹ آیا۔

میونخ کے کرونے سرکس ہال میں ہمارے اس پہلے جلسہ کی تصویریں اتاری گئیں ہمارے اس جلسہ میں وج شاندار کامیابی حاص ہوئی اس کا نقشہ الفاظ کی نسبت ان تصویروں میں بہتر نظر آتا ہے کھاتے پیتے اخبارات نے یہ تصویریں شائع کیں اس کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت تھی کہ جلسہ صرف ''قوم پرست'' نوعیت کا تھا۔ ان اخبارات پر جو شکست خوردہ ذہنیت چھائی رہتی تھی اس سے اس کا بہتر ثبوت درکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہیں ذکر نہ تھا کہ جلسے کا اہتمام کرنے والے کون تھے۔

ہم نے شروع میں تحریک کیسے پھیلائی

یوں پہلی مرتبہ اب ہماری حیثیت ایک معمولی پارٹی کی نہ رہی تھی اب ہمیں نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا میں چاہتا تھا کہ اگر کسی کو یہ شک باقی ہو کہ ہم اس قسم کے جلسے روز روز نہیں کر سکتے تو یہ شک دور کر دیا جائے میں نے اگلے ہی ہفتے اسی سرکس ہال میں ایک اور جلسہ رکھ دیا اب کے پھر ہمیں وہی کامیابی نصیب ہوئی ایک مرتبہ یہ بڑا ہال حاضرین سے بھر گیا یہاں تک کہ اس کے آٹھ ہفتہ میں نے یہیں ایک اور جلسہ رکھ دیا۔ یہ جلسہ بھی ویسا ہی کامیاب ثابت ہوا۔

1921ء کے اوائل میں یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد میں نے میونخ میں اپنی سرگرمیاں اور بھی تیز کر دیں۔ میں نہ صرف ہر ہفتہ جلسہ منعقد کرتا تھا بلکہ بعض اوقات ایک ہفتے میں باقاعدہ دو جلسے کرتا تھا۔ موسم گرما اور موسم خزاں میں ہم نے ہر ہفتے تین تین جلسے منعقد کرنے شروع کر دیئے اب ہمارا ہر جلسہ سرکس ہال میں منعقد ہوتا تھا یہ

دیکھ کر ہم باغ باغ ہو جاتے کہ ہمارا ہر جلسہ پہلے کی طرح کامیاب ہوتا تھا۔

جلسوں کے انعقاد کا نتیجہ یہ نکلنا شروع ہوا کہ ہماری جماعت کے اراکین و معاونین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔

قدرتی بات ہے کہ ہماری ان کامیابیوں سے ہمارے مخالفین پر رات کی نیند حرام ہو گئی۔ شروع شروع میں ہمارے مخالفین کا حال یہ رہا کہ کبھی تو ہمارے خلاف تشدد کا استعمال کرتے، اور کبھی لاچار ہو کر ہمیں نظر انداز کرنے کا ڈھونگ رچاتے پھر انہیں احساس ہو گیا کہ ہماری تحریک کی ترقی نہ تشدد سے روکی جا سکتی ہے نہ ہمیں نظر انداز کرنے سے چنانچہ ہمارے حریفوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہی دفعہ ہمارے خلاف زور لگا کر اس پیمانہ پر تشدد کیا جائے کہ آئندہ ہمارے جلسوں کا انعقاد بالکل بند ہو جائے۔

مخالف جھوٹے الزام بھی لگاتے ہیں

ہمارے خلاف یہ اقدام کرنے کے لیے پہلے کسی بہانے کی ضرورت تھی یہ بہانہ یوں تلاش کیا گیا کہ جرمن پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی جان پر بڑے پراسرار طریقے سے حملہ ہوا اس ممبر کا نام ارہارڈ ائیر تھا۔ یک لخت اعلان ہو گیا کہ کسی نامعلوم حملہ آور نے پارلیمنٹ کے ان ممبر صاحب پر شام کے وقت متعدد گولیاں چلائیں گولی ان کو لگی ایک نہیں صرف ان پر گولی چلانے کی کوشش کی گئی پارلیمنٹ کے ممبر صاحب نے حیران کن طریقے سے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے جمہوری اشتراکیت پرست لیڈروں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہ صرف ممبر صاحب کو قتل ہونے سے بچا لیا بلکہ قاتلان کو بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھگا دیا۔ دراصل یہ حملہ آور تھے ہی بزدل یہ حملہ آور ایسے تیز رفتار تھے اور اس سرعت سے بھاگ نکلے کہ بعد میں تفتیش کے باوجود پولیس ان کا ذرا بھر سراغ نہ نکال سکی یہ پراسرار واقعہ مشہور کر کے جمہوری اشتراکیت پرست پارٹی کے اخبار نے ہماری تحریک کے خلاف عوام کے جذبات کو بھڑکانا شروع کیا اس اشتعال انگیزی کے ساتھ ساتھ وہی پرانا سبق ایک بار پھر دہرایا جانے لگا کہ اب کے موقعہ ہو تو مزدوروں کو کیا قدم اٹھانا چاہیے

ان کا مقصد یہ تھا کہ ہماری تحریک پھیلنے نہ پائے، بلکہ شروع میں ہی مزدوروں کے تنومند بازو اس پودے کی نازک جڑیں اکھاڑ کر پرے پھینک دیں۔

چند روز بعد اصل حملہ شروع ہوا قطعی طور پر فیصلہ کر لیا گیا کہ ہمارا ایک جلسہ جو میونخ ہاف براؤ ہاؤس میں منعقد ہونے والا تھا خراب کر دیا جائے اس جلسہ میں مجھے تقریر کرنا تھی۔

جلسہ خراب کرنے والوں کا مقابلہ

4 نومبر 1921ء کی شام کو چھ سات بجے کے درمیان مجھے پہلی مرتبہ ٹھیک ٹھیک اطلاع ملی کہ آج رات کا جلسہ منتشر کر دیا جائے گا یہ کام پورا کرنے کے لیے ہمارے مخالفین نے تہیہ کر لیا ہے کہ بعض فیکٹریوں کے کمیونسٹ مزدور کثیر تعداد میں ہمارے جلسہ پر حملہ آور ہوں گے۔

ہمیں اس سازش کا پہلے سے علم ہو جاتا لیکن ایک افسوس ناک اتفاق کے باعث ایسا نہ ہو سکا بات یہ تھی کہ اس روز ہم نے میونخ کے سٹرنکر گیسے بازار سے اپنا پرانا دفتر بدل لیا تھا ہم نے پرانا دفتر ترک کر دیا تھا اور نئے دفتر میں ابھی پوری طرح کام شروع نہیں ہوا تھا نئے دفتر میں پرانے کرایہ دار نے ٹیلی فون کٹوا دیا ہوا تھا ہمیں ابھی نیا ٹیلی فون لگوانا تھا چنانچہ ٹیلی فون کے ذریعے ہمیں جلسہ توڑنے کی کوشش کے متعلق کئی لوگوں نے خبردار کرنا چاہا لیکن یہ اطلاع ہم تک نہ پہنچ سکی۔

یہی وجہ تھی کہ اس روز شام کو ہمارے محافظ دستے معقول تعداد میں مہیا نہ ہو سکے موقع پر صرف ایک دستہ موجود تھا عام طور پر ہر دستے میں سو رضا کار ہوتے تھے لیکن اس دستے میں صرف چھیالیس رضا کار تھے ٹیلی فون کے ذریعے تا حال ہمارے روابط ایسے نہ تھے کہ ایک گھنٹے کے اندر خطرے کی اطلاع دی جا سکتی یہی وجہ تھی کہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے رضا کاروں کی مطلوبہ تعداد مہیا نہ ہو سکتی تھی علاوہ ازیں اس سے پہلے کئی مرتبہ یہ بھی ہو چکا تھا کہ ہمیں حملے کی خبر ملی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ وہ جو پرانی ضرب المثل

ہے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، کئی دفعہ ثابت ہو چکی تھی۔

شاید یہ وجہ تھی کہ اس روز ہمارے جلسے کو خراب کرنے کے لیے ہمارے مخالفین کے وحشیانہ عزم کے مقابلے کا پورا اہتمام نہ کیا گیا تھا۔

بڑی بات یہ تھی کہ ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ میونخ کا ہاف براؤ ہاؤس ہمارے مخالفین کی جانب سے ہمارے جلسے خراب کرنے کی کوشش کے لیے کوئی موزوں مقام تھا۔ ہمیں تو یہ خطرہ تھا کہ اس قسم کا حملہ کسی بڑے ہال میں کیا جائے گا۔ خاص طور پر کرونے سرکس ہال میں، لیکن اس رات ہم نے ایک بڑا کارآمد سبق سیکھا بعد ازاں ہم نے اس سوال کا بڑے محققانہ انداز سے جائزہ لیا ہم جس نتیجے پر پہنچے وہ دلچسپ بھی تھا اور نا قابل یقین بھی۔ چنانچہ اس کے بعد اسی سبق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری تحریک کی تنظیم ہوئی اور اسی اصول پر ہمارے طوفانی دستوں نے اپنا طریقہ کار وضع کیا۔

یا ہٹلر، مرحبا!

میں ہاف براؤ ہاؤس ہال میں اس روز شام کے پونے آٹھ بجے پہنچا جلسہ گاہ میں پہنچتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ سرخوں کی نیت کیا ہے۔ ہال حاضرین سے پر تھا اس لیے پولیس نے اندر آنے کے راستے بند کر دیئے تھے ہمارے مخالفین وقت سے بہت پہلے آ کر ہال میں داخل ہو چکے تھے ہمارے ہمدرد زیادہ تر ہال سے باہر تھے باڈی گارڈ کا قلیل تعداد والا دستہ مجھے دروازے کے قریب ملا میں نے ہال کا بڑا دروازہ بند کروا دیا باڈی گارڈ کے جو پینتالیس یا چھیالیس ارکان موجود تھے انہیں میں نے ہال کے اندر بڑھنے کا حکم دیا میں نے ان جوانوں پر واضح کر دیا کہ آج شام پہلی مرتبہ تمہیں تحریک کے لیے اپنی نا قابل شکست اور مخلصانہ وفاداری کا ثبوت دینا ہو گا۔ ہم میں سے کوئی شخص زندہ ہال سے باہر نہ بھاگے گا۔ میں نے اعلان کر دیا کہ میں ہر قیمت میں ہال کے اندر رہوں گا اور میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم میں سے کوئی مجھے یہاں چھوڑ کر چلے جائے گا اگر میں نے تم میں سے کسی کو بزدل پایا تو اپنے ہاتھ سے تمہارے سینہ پر سے تحریک کا طغریٰ اور ''

تمہارے بازو بند جس پر تحریک کے نشان ہیں نوچ لوں گا“ میں نے ان نوجوانوں کو سمجھا دیا کہ جلسہ خراب کرنے کے ذرا بھی آثار پیدا ہوں تو انہیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے آپ کو بچانے کا بہترین حربہ یہ ہے کہ خود حملہ آور پر ہلہ بول دو۔

رضا کاران نے تین مرتبہ ”یا ہٹلر! مرحبا!!“ کا نعرہ بلند کیا ان کی آواز آج معمول سے زیادہ گونج دار اور زیادہ خوفناک تھی۔

جلسہ میں فساد کا ایک منظر

تب میں ہال کے اندر داخل ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے صورت حال کا جائزہ لیا ہمارے مخالفین یکجا جمگھٹا کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی خشمگیں نظروں سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے لاتعداد چہروں پر غیظ و غضب اور نفرت کے آثار ہویدا تھے۔ سب میری جانب دیکھ رہے تھے کچھ دوسرے لوگوں نے میرا منہ چڑا کر میرے خلاف نعرے لگائے۔ ان کی پیشانیوں پر لکھا تھا کہ آج وہ ہمیں ختم کر کے دم لیں گے انہیں ہمارے سر پھوڑنے میں بھی عذر نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی آثار تھے جن سے ان کے ارادے ظاہر ہو رہے تھے انہیں احساس تھا کہ ان کی تعداد زیادہ ہے وہ اپنی قوت اور غلبہ کے زعم میں اپنے جذبات چھپانے کی پرواہ نہیں کر رہے تھے۔

باوجود اس کے ہم نے جلسہ کا آغاز کر دیا۔ میں نے تقریر شروع کی ہاف براؤ ہاؤس ہال میں ہمیشہ دروازے سے دور شراب کی میز پر کھڑے ہو کر تقریر کیا کرتا تھا اس لیے میں ہمیشہ حاضرین کے وسط میں ہوتا تھا غالباً یہی وجہ تھی کہ یہاں ہمنوائی اور یک جہتی کا ایسا احساس پیدا ہوتا تھا جو دوسری جلسہ گاہ میں میسر نہ آتا تھا۔

میرے سامنے اور خاص طور پر میرے بائیں جانب فقط ہمارے مخالفین ہی بیٹھے یا کھڑے تھے ان میں سے اکثر تنومند جوان تھے ان میں مقامی فیکٹری کارخانہ کسٹر مان

اور ایسار فیکٹری کے مزدور شامل تھے ہال کی دائیں دیوار کے ساتھ ساتھ ان کا ہجوم بالکل میری میز کے قریب تک پہنچا ہوا تھا۔ اب ان لوگوں نے طشت بھر بھر کر شراب کے جگ منگوانے شروع کر دیئے وہ شراب خود پی لیتے تھے اور خالی جگ میز کے نیچے جمع کرتے جاتے تھے یوں جنگ کے لیے گولہ بارود فراہم کیا جا رہا تھا اگر یہ جلسہ امن سے ختم ہو جاتا تو مجھے بہت حیرانی ہوتی۔

اگرچہ کئی مرتبہ میری بات کاٹی گئی لیکن میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے اپنی تقریر جاری رکھنے میں کامیاب ہو گیا مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں اب حاضرین کے دلوں پر قابو پا رہا ہوں۔ جو لوگ جلسہ خراب کرنے آئے تھے ان کے لیڈروں کو بھی یہ احساس ہو چلا تھا چنانچہ وہ مضطرب ہو کر ہال سے باہر نکل جاتے۔ پھر واپس آتے اور اپنے ساتھیوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے اپنی بے چینی نہ چھپا سکتے۔

مجھے پھر ایک جگہ ٹوکا گیا جواب دیتے ہوئے مجھ سے تھوڑی سی نفسیاتی غلطی ہو گئی جب الفاظ میرے منہ سے نکل چکے تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن منہ سے نکلی ہوئی بات پرانی ہو جاتی ہے جلسہ گاہ میں تصادم شروع ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر تک چند مقامات سے گرم گرم گفتگو کی آوازیں آئیں یک لخت ایک شخص کود کر ایک میز پر چڑھ گیا اور چلایا ''آزادی'' یہ نعرہ بلند ہوتے ہی آزادی کے حامیوں نے اپنی پہلوانی کے جوہر دکھلانے شروع کیے۔

چند منٹ کے اندر ہال ہجوم کے چیخنے اور چلانے کی آوازوں سے لرز اٹھا۔ شراب کے جگ یوں سروں کو زخمی کر رہے تھے جیسے میدان جنگ میں توپ کے گولے چل رہے ہوں۔ اس شہر و شر میں کبھی کبھی کرسیوں کی ٹانگ ٹوٹنے، شراب کے جگ ریزہ ریزہ ہونے، کراہنے، چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں۔

یہ منظر کسی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا میں اپنی جگہ پر میخ کی طرح گڑا کھڑا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جوانوں میں سے ہر ایک اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔

یہ نظارہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر کھاتے پیتے لوگ بھی ہمت کریں تو ان کے جلسے کس طرح کامیاب بنائے جاسکتے ہیں۔

جانبازوں کے خون سے تحریک سیراب ہوتی ہے

شرارت شروع ہوتے ہی فی الفور میرے طوفانی دستوں نے حملہ شروع کر دیا۔ انہیں طوفانی دستوں کا نام اسی روز سے دیا گیا۔وہ بھوکے بھیڑیوں کے غول کی طرح بار بار دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔وہ آٹھ آٹھ اور دس دس کی ٹولی میں اکٹھے حملہ کرتے تھے وہ جب یورش کرتے تو حریفوں کی کثیر تعداد کو ہر یلغار کے ساتھ ہال سے باہر دھکیل آتے۔ پانچ منٹ کے بعد کوئی رضا کار ایسا نہ تھا جو خون سے شرابور نہ ہو۔تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لوگ کس خمیر سے بنے ہوئے ہیں سب سے اول نمبر میرے دلیر مورس ہیس کا تھا جو آج میرا پرائیویٹ سیکرٹری ہے اس کے علاوہ کئی اور بھی تھے گو وہ زخموں سے چور تھے لیکن بار بار حملہ کرتے تھے جب تک ان میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ہمت تھی، وہ ٹلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے بیس منٹ مزید ہنگامہ جاری رہا مخالفین کی تعداد سات آٹھ سو تھی لیکن بیس منٹ کے بعد ہمارے پچاس سے کم رضا کاروں نے ہر مخالف کو ہال سے باہر نکال دیا تھا۔صرف ہال کے بائیں کونے میں ایک بہت بڑا ہجوم تھا جو ابھی تک ہمارے رضا کاروں کا سخت مقابلہ کر رہا تھا یکا یک ہال کے دروازے کے قریب پستول کی دو گولیاں چلنے کی آواز آئی یہ گولیاں پلیٹ فارم کا نشانہ کر کے چلائی گئی تھیں اس کے بعد فی الفور چاروں جانب سے گولیوں کی بارش ہونے لگی آہا ہا یہ بھی کیا منظر تھا اس منظر کو دیکھ کر جنگ کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

اس وقت یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کس شخص نے گولی چلائی لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے جوانوں نے پہلے سے بڑھ کر جوش سے حملے جاری رکھے یہ حملے اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ جلسہ خراب کرنے والوں کا آخری فرد بھی ہال سے باہر نکال دیا گیا۔

اب یہ ہنگامہ شروع ہوئے پچیس منٹ گزر چکے تھے ہال ایسے نظر آتا تھا گویا یہاں کوئی بم پھٹا ہے میرے ساتھیوں میں سے اکثر کی مرہم پٹی کی گئی اور بعض کو چارپائی پر اٹھا کر لے جانا پڑا لیکن صورت حال پر ہم قابو پا چکے تھے ہر امن ایسن جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے انہوں نے اٹھ کر اعلان کیا کہ ''جلسے کی کارروائی بدستور جاری رہے گی صاحب مقرر اپنی تقریر شروع رکھیں''یوں میں نے اپنی تقریر مکمل کی۔

جب ہم خود جلسے کے اختتام کا اعلان کر چکے تو ایک گھبرایا ہوا پولیس افسر ہال میں داخل ہوا پہلے اس نے ہاتھ ادھر ادھر ہلائے پھر اعلان کیا کہ ''جلسہ منتشر کیا جاتا ہے۔''

قانون کی یہ بوالعجبی دیکھ کر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی یہ ہے ہماری پولیس کی کار گذاری جتنے لوگ چھوٹے ہوں اتنا ہی بڑا بن کر دکھاتے ہیں۔

اس رات ہم نے ایک کارآمد سبق سیکھا اور ہمارے مخالفوں نے بھی اس روز جو سبق سیکھا پھر ایس کبھی نہ بھول سکے اس کے بعد 1923ء کے موسم خزاں تک روزنامہ مین شی ز پوسٹ نے پھر مزدوروں کے خوفناک مکے سے ہمیں دھمکانے کی کوشش نہ کی۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ہشتم :: صاحب قوت کی یکتائی اس کے حق کے باعث توانائی ہوا کرتی ہے

متحدہ محاذ کی تجاویز

میں نے گذشتہ باب میں محب وطن جرمن پارٹیوں کے ایک متحدہ محاذ کا تذکرہ کیا تھا یہاں میں اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

جب ہم کسی متحدہ محاذ کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف پارٹیاں اپنے مشترکہ مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لیے مل جل کر کام کرتی ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض طے شدہ امور میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا جائے۔ ایک مشترک مجلس منتظمہ مقرر کی جاتی ہے اس مجلس کو کچھ اختیارات سونپے جاتے ہیں مجلس کے سپرد یہ کام ہوتا ہے کہ آئندہ متحدہ کوششوں سے کسی متفقہ پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ایک عام شہری جب یہ خبر سنتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ مختلف پارٹیاں اب ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے بعد مل جل کر کام کریں گی آخر کار ایک مشترکہ پلیٹ فارم تلاش کرلیا گیا باہمی تنازعات کا خاتمہ ہو گیا ہے اس کے بعد یہ اختلافی احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اتحاد سے بڑی تقویت حاصل ہو گی چھوٹے چھوٹے گروہ علیحدہ کام کرتے تو کمزور رہتے، اب مل جل کر طاقتور ثابت ہوں گے لیکن میری رائے میں اس قسم کے اتحاد پر خوط ہونا غلطی ہے۔

ایک مقصد کے لیے جدا جدا جماعتیں کیسے بنتی ہیں؟

میری رائے میں اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے یہ بڑا اہم سوال ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ مختلف انجمنیں، پارٹیاں اور جماعتیں جب سب ایک ہی قسم کے مقاصد لے کر اٹھی ہیں تو پھر ان کی تنظیمات کیوں جدا جدا ہیں اس سوال کا جواب

سبق آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک انجمن کافی ہے یہ تو کوئی معقول بات نہیں کہ مقصد ایک ہی ہو اور اس ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے متعدد پارٹیاں وجود میں آ جائیں۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مقصد کے لیے شروع شروع میں ایک پارٹی قائم ہوئی ہوگی کسی ایک شخص نے کوئی ایک کلمہ حق بلند کیا کسی خاص مسئلہ کا کوئی حل تجویز کیا یوں ایک مقصد سامنے آیا اور اس شخص کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک تحریک وجود میں آ گئی۔

ہر انجمن یا پارٹی یوں ہی وجود میں آتی ہے پروگرام یا تو کسی موجودہ خرابی کو دور کرنے پر مشتمل ہوتا ہے یا مستقبل میں کوئی نیا نظام قائم کرنے کی فکر ہوتی ہے۔

جو تحریک پہلے شروع ہوا سے سبقت حاصل ہوتی ہے

جب ایک دفعہ یوں کوئی تحریک وجود میں آتی ہے تو اسے عملاً سبقت کے کچھ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اب جائز طریقہ کار تو یہ ہوگا کہ جو مزید افراد اس تحریک کے نصب العین کی خاطر جدوجہد کرنا چاہیں انہیں اسی تحریک میں شامل ہو کر اسے تقویت پہنچانا چاہیے تا کہ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے بہتر اور زیادہ موثر کوشش ہو سکے بالخصوص صاحب دماغ کا تو فرض ہے کہ وہ تحریک میں شامل ہو کر مشترکہ مقاصد کو کامیابی کی منزل تک پروان چڑھانے میں ہاتھ بٹائیں غرض معقولیت اور دیانت کا تقاضا ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ہی تحریک چلائی جائے میں عنقریب واضح کر دوں گا کہ کسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے دیانت اور خلوص شرط اول ہے۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ تو رنجیدہ اور افسوسناک ہے دوسری وجہ قابل رحم ہے کیونکہ اس کی بنیاد طبع انسانی کی ایک جبلی کمزوری پر مبنی ہے اگر مسئلہ کی تہہ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان دونوں وجوہات کی پشت پر ایک تیسری وجہ کام کر رہی ہے اس تیسری وجہ کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اپنا عزم زیادہ پختہ بنانا چاہیے

ہمیں پہلے سے زیادہ جوش اور قوت کے ساتھ کام کرنا چاہیے اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم انسانی کمزوریوں پر غالب آ جائیں گے انسانی کمزوریوں پر غلبہ پا لیا گیا تو پھر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہر تحریک کے پس پشت تحریک کا بانی ہوتا ہے

ایک مقصد پورا کرنے کا اہتمام ایک پارٹی کے ذمہ کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کی جس وجہ کو میں نے اوپر رنجیدہ بیان کیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں جتنے عظیم کارنامے انجام دیئے جاتے ہیں ان کی پشت پر کوئی ایسی خواہش ہوتی ہے جس کی تڑپ مدت سے لاکھوں سینوں میں موجود تھی پہلے یہ تڑپ خاموش تھی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صدیوں تک انسان کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کا متمنی رہتا ہے وہ نامساعد حالات کے صدمے جھیلتے رہتے ہیں لیکن سب کے دلوں میں جو خواہش ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی جو قومیں ایسی مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی شجاعانہ جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوتیں انہیں بدنصیب سمجھنا چاہیے اگر وہ ایسی کوشش ہی نہ کریں تو انہیں زوال پذیر سمجھنا چاہیے کسی قوم کی ہمت اور توانائی کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اسے مظلومیت سے نجات دلائے جس قوم میں یہ کس بل ہو اسے زندہ رہنے کا حق ہے ایسے رہنما خوبی قسمت سے ہی قوم کو میسر آیا کرتے ہیں وہ قوم کو کسی بدترین عذاب سے نجات دلاتے ہیں یا قوم کو جو خطرات درپیش ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتے ہیں ساری قوم کے دل میں جو آرزوئیں عرصہ سے تڑپ رہی تھیں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

جن مسائل کو وقت کے عظیم مسائل کہا جاتا ہے ان کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ انہیں حل کرنے کی امنگ ہزارہا سینوں میں موجود ہوتی ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس امنگ کا پورا کرنا فرض ہے خود قسمت ہزارہا افراد کو ایک ہی مہم پوری کرنے کے لے آگے

بڑھاتی ہے فطرت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک کھلے مقابلے کے بعد جو سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ دلیر ہو بالاخر اسی کو کامیابی کا انعام بخشا جائے۔ مسئلہ حل کرنے کا سہرا ایسے منتخب روزگار فرد کے سر ہی رہے۔

پیغمبری کے جھوٹے دعوے دار

ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیوں تک انسان کی کثیر تعداد اپنی مذہبی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتی وہ چاہتے ہیں کہ اپنے دین کی اصلاح کریں روح کی اس پکار کے جواب میں درجنوں ایسے مدعی پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں یہ زعم ہوتا ہے کہ اپنی عقل اور سمجھ کے طفیل وہ زمانہ کی مذہبی دقتیں حل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں اسی زعم میں وہ نئی تعلیمات کے پیغمبر ہونے کا مدعی کر دیتے ہیں یا کم از کم موجودہ دینی عقائد سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

یہاں پھر یہ امر یقینی ہے کہ فطرت کے تقاضے پورے ہو کر رہیں گے جو بہترین ہوگا جو سب سے زیادہ قومی ہوگا، اسی کو اس منصب کے لیے منتخب کیا جائے گا لیکن عام دستور یہی ہے کہ حریف آسانی سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صرف ایک ہی شخص اس کام کے لیے موزوں ہے بر عکس اس کے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ انہیں بھی دقتوں کے حل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس منتخب روزگار شخص کو انہیں زعم ہوتا ہے کہ وہ بھی یہ خدمت انجام دینے کی استطاعت رکھتے ہیں معاصرین بالعموم یہ طے نہیں کر سکتے کہ مختلف دعویداروں میں سے کون بہترین اہلیت رکھتا ہے اور کون سب کی متفقہ تائید کا مستحق ہے۔

اختلاف کا مقصد حق و باطل کا امتحان ہے

یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے یا کم از کم قرنوں سے ایک ہی مقصد کے پورا کرنے کے لیے مختلف افراد مختلف تحریکیں قائم کرتے ہیں ہر تحریک کا بانی ایک ہی مقصد پیش کرتا ہے یا کم از کم عوام یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف تحریکوں کا مقصد ایک ہے عوام تو صرف موہوم خواہشات محسوس کرتے ہیں عوام کی رائے واضح نہیں ہوتی عوام کے سامنے اپنے نصب

العین کا تصور صاف نہیں ہوتا۔ عوام یہ ٹھیک طرح نہیں جانتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں عوام میں یہ فیصلہ کرنے کی استعداد نہیں ہوتی کہ ان کا نصب العین اور خواہشات کس حد تک اور کس طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔

رنج کی بات یہ ہے کہ مختلف انسان ایک ہی منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کرتے ہیں ہر ایک کو اخلاص سے یہی زعم ہوتا ہے کہ اس کام کو میں دوسروں سے بہتر انجام دے سکتا ہوں ہر ایک اسی وہم میں گرفتار رہتا ہے کہ میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے میرا فرض ہے کہ دوسروں کی پرواہ کیے بغیر اسی راستے پر گامزن رہوں۔

یہ تحریکیں، یہ پارٹیاں یہ مذہبی فرقے، وغیرہ وغیرہ سب وقت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک دوسرے سے جدا جدا وجود میں آتے ہیں سب کا مقصد ایک ہی نصب العین کا حصول ہوتا ہے یہ نظارہ خاصا رنجیدہ یا بظاہر رنجیدہ نظر آتا ہے عام لوگوں کا خیال تو یہی ہے کہ جو طاقت مختلف راہوں میں منتشر ہے اگر وہ ایک مشترکہ جدوجہد میں متحد ہو جاتی ہے تو مقصد بہت جلد پورا ہوتا اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں کوئی شک باقی نہ رہتا لیکن یہ خیال درست نہیں فطرت اپنے اٹل اصولوں کے مطابق خود اس تصادم کا آخری فیصلہ کرتی ہے فطرت مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں حریفانہ کشمکش کی دعوت دیتی ہے سب کامیابی کی منزل کی جانب دوڑتے ہیں اس دوڑ میں ہر ایک سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے پھر جس کا راستہ سب سے مختصر ہو۔ جس کی راہ سب سے زیادہ واضح ہو جو سب سے زیادہ عزم کا دھنی ہو اسی کی تحریک کامیاب ہوتی ہے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن

اگر مختلف حریف ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہ کریں تو دور کھڑے فیصلہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کون دوسرے سے بہتر ہے اگر آخری فیصلہ ان دانشوروں کی موشگافیوں پر چھوڑ دیا جائے جو اپنے علم کی برتری کے زعم میں کامیابی کی کھلی نشانیوں کی

بھی پرواہ نہیں کرتے تو پھر کوئی تصفیہ کس طرح ہوسکتا ہے کسی اقدام کے حق و بطلان کا آخری معیار یہی ہے کہ بالاخر کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف گروہ مختلف راستوں سے ایک ہی منزل کی جانب بڑھیں تو کوئی ہرج نہیں جونہی ہر حریف کے علم میں یہ بات آئے کہ اس جیسی متوازی کوششیں بھی اس پہلو میں جاری ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ بڑی احتیاط سے ایک مرتبہ پھر جائزہ لے کہ کیا واقعی اس نے بہترین راستہ اختیار کیا ہے کیا اس سے مختصر راستہ تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ کیا منزل تک جلد پہنچنے کی کوشش کا اور کوئی امکان بھی ہے؟

سفر کرنے سے ہی منزل تک پہنچتے ہیں!

باہمی مقابلے سے اس دوڑ میں حصہ لینے والے ہر فرد کی استعداد پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے بنی نوع انسان نے اکثر ترقی کا سبق ناکام ہونے والوں کی نامرادیوں سے ہی حاصل کیا ہے۔ غرض یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ منزل تک پہنچنے کا بہترین راستہ مختلف راہوں پر سرگرداں پھرنے سے ہی دریافت ہوسکتا ہے جس کیفیت کو ہم نے شروع میں رنجیدہ سمجھا تھا وہ درحقیقت قدرت کا ایک بہت بڑا انعام ہے ہمیں دیکھ کر۔۔۔۔۔۔ افسوس ہوا تھا، کہ افراد کی قوتیں جدا جدا راستوں پر ضائع ہو رہی ہیں اس اختلاف کی ذمہ داری دراصل غیر شعوری طور پر ہر گروہ کے سر ہے۔

جرمن قوم کے اتحاد کے دو راستے تھے

آیئے اب اس اصول کا اطلاق ذرا تاریخ کے واقعات پر کریں۔ جرمن قوم کو جو مسئلہ درپیش ہے جب اس کا حل تلاش کرنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو کسی زمانہ میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے صرف دو راستے ہیں دراصل شروع سے ہی ان دونوں راستوں پر چلنے کا مشترکہ فیصلہ کر لینا چاہیے تھا ایک وہ راستہ جس پر آسٹریا کی حکومت چل رہی تھی دوسرا وہ راستہ جو پرشیا کی حکومت نے اختیار کیا تھا۔ آسٹریا کے تاجدار ہیپز برگ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پرشیا کے قیصر ہوہن

زولرن کے خانوادے سے تھے اگر یہ رائے تسلیم کر لی جاتی تو اس کا تقاضا تھا کہ ان دو حکومتوں کے علاوہ بقیہ تمام جرمن عناصر کا فرض تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ اگر اس رائے پر واقعی عمل ہوتا تو اکثر عناصر خاندان ہیبز برگ کا ساتھ دیتے کیونکہ اس زمانے میں ان کی شان وشکوہ زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ آسٹریا کی حکمت عملی اختیار کرنے سے مملکت المانیہ کبھی متحد ہو کر ایک جرمن سرکار نہ بن سکتا۔

مسائل جنگ سے ہی حل ہوتے ہیں

آخر کار ایک مضبوط اور متحد جرمن سرکار کا قیام کن حالات کا مرہون منت تھا یہ وہی حالات تھے جنہیں لاکھوں جرمن ناپسند کرتے تھے ان حالات کو برادرکشی کی لعنت کا آخری اور بھیانک مظاہرہ سمجھا جاتا تھا سچ یہ ہے کہ جرمنی کے شاہی تاج کے نشان کی شان پر پرشیا اور آسٹریا کی باہمی جنگ سے دوبالا ہوئی۔ یہ جنگ کونش گراٹز کے میدان جنگ میں ہوئی تھی بعد کے مورخین نے رائے ظاہر کی ہے کہ جرمنی کے شاہی راج کو محاصرہ پیرس سے فروغ حاصل ہوا۔ یہ غلط ہے یوں دیکھا جائے تو جرمن سرکار کی بنیاد متحدہ محاذ اور اشتراک کار پر استوار نہ ہوئی تھی بلکہ جان بوجھ کر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھی ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس جنگ اقتدار میں حصہ لینے والوں کو یہ شعور نہ تھا کہ ان کی جدوجہد کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے اس کشمکش میں بالاخر پرشیا نے فتح حاصل کی اگر کوئی شخص سیاسی جنبہ داری سے اندھا نہ ہو جائے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ محض عقل انسانی کے بل بوتے پر جدوجہد کی جاتی تو یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا یہ مسئلہ دراصل فطرت کی دانش مندی سے طے ہوا۔ فطرت نے اپنی دانش مندی کا اظہار مختلف طاقتوں کو لڑا کر کیا اس لڑائی سے ہی آخر اس اتحاد کی صورت ظاہر ہوئی جہاں تک عقل انسانی کام کر سکتی تھی دو صدیاں پہلے کون شخص جرمن علاقوں پر نظر ڈال کر سنجیدگی سے کہہ سکتا تھا کہ نئی جرمن سرکار کی بنیاد خاندان ہیبز برگ نہ رکھ سکے گا بلکہ پرشیا کے خانوادہ ہوہن زولن سے یہ مہم پایہ تکمیل تک پہنچے گی اور آج کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ

تقدیر کا فیصلہ انسان کے فیصلہ سے بہتر ثابت ہوا ہے آج کون یہ کہے گا کہ جرمن سرکار کی بنیاد کسی زوال پذیر اور رو بہ انحطاط شاہی خاندان پر رکھی جانی چاہیے۔

نہیں! فطری ارتقا اگرچہ ایک صدی میں مکمل ہوا لیکن ماننا پڑتا ہے کہ حق بحقدار رسید۔

اختلاف بھی باعث رحمت ہو سکتا ہے

اور آئندہ بھی ایسا ہو گا اس لیے یہ کوئی افسوس کی بات نہیں کہ مختلف لوگ ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے لیے الگ الگ کوششیں کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سب سے مضبوط اور سب سے چست راہنما منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اسے کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔

قوموں کی زندگی میں ایک ہی نوعیت کی مختلف تحریکیں جدا جدا راستوں سے بظاہر ایک ہی منزل تک بڑھتی نظر آنے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے یہ دوسری وجہ افسوس ناک نہیں بلکہ رحم کی مستحق ہے اس کی بنیاد عبرت ناک حسد، رقابت اور جاہ طلبی پر ہے۔ اس کی بنیاد اس جذبے پر ہے کہ دوسروں کا مال اپنی جیب میں ڈال لیا جائے بدقسمتی سے یہ انسانی کمزوریاں بالعموم ایک ہی فرد میں جمع ہو جاتی ہیں۔

حسد بری بلا ہے

جب کبھی کوئی ایسا شخص منظر عام پر آتا ہے جو اپنی قوم کی بدحالی کا اصل سبب تشخیص کر لیتا ہے جب کبھی حقیقی مرض تشخیص کر لیا جاتا ہے اور اس مرض کا علاج شروع ہوتا ہے جونہی منزل معین کر کے قافلہ سفر پر روانہ ہوتا ہے تو تھڑدلے اور کم ہمت افراد پوری طرح متوجہ ہو جاتے ہیں وہ اس رہنما پر نگاہ رکھتے ہیں جو اب عوام کی توجہ کا مرکز بن چکا ہوتا ہے جس طرح چھوٹی چھوٹی چڑیاں بہ ظاہر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتی ہیں لیکن دراصل سب کی نگاہ اپنے اس خوش قسمت ساتھی پر ہوتی ہے جسے روٹی کا کوئی ریزہ کہیں سے مل جائے تو وہ فوراً اس سے چھیننے کی کوشش کریں گی اور اگر وہ غافل ہوا تو

سچ مچ چھین کر بھی لے جائیں گی یہی حال انسانوں کا ہے جونہی کوئی شخص نئی راہ تلاش کر کے سفر شروع کرتا ہے، وہیں نقالوں کی ایک فوج کان پھڑ پھڑا کر سونگھنا شروع کر دیتی ہے، کہ یہ اس منزل پر پہنچ گیا تو اسے کیا کچھ مل جائے گا جونہی انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ منزل پر پہنچ کر۔۔۔۔۔۔۔ کیا انعام ملے گا وہیں وہ اپنی سمجھ کے مطابق کوئی اور راستہ ڈھونڈ کر پہلے مسافر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کر دیتے ہیں۔

خدا نقالوں سے بچائے

جونہی کوئی نئی تحریک قائم ہوتی ہے اور ایک واضح پروگرام پیش کرتی ہے اس قسم کے لوگ آگے بڑھ کر دعویٰ دائر کر دیتے ہیں کہ ہم بھی اس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سچ مچ اخلاص سے اس تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا اس کی مسابقت کا حق تسلیم کرتے ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ پروگرام چرا کر اسی پروگرام پر ایک نئی پارٹی تعمیر کرنا چاہتے ہیں یہ قبیح حرکت پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر یہ لوگ پوری بے حیائی کا ثبوت دیتے ہیں وہ نا سمجھ عوام کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ جو راستہ اس تحریک نے اختیار کیا ہے ہم بھی عرصہ سے اسی راستے پر گامزن ہونے کے لیے پر تول رہے تھے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ اچکے اپنے فریب میں کامیاب ہو جاتے ہیں در حقیقت وہ نفرت کے مستحق ہوتے ہیں یہ کیا شرمناک سینہ زوری ہے کہ جو نشان کسی علم پر پہلے لہرا چکا ہے اسے وہاں سے اتار کر اپنا جھنڈا مشہور کر دیا جائے۔ کسی دوسری تحریک کے پروگرام پر ڈاکہ ڈال کر ایک نئی جماعت کھڑی کر دی جائے گویا اس نئی جماعت کے بانی نے وہ پروگرام تصنیف کیا ہے اس بے حیائی کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب نئی جماعت قائم کر کے افتراق اور اختلاف کی آگ بھڑکانے والے افراد خود ہی اتفاق اور اتحاد کا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں یہ اتفاق اور اتحاد کے نعرے تب بلند کیے جاتے ہیں جب انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ وہ مسابقت کی دوڑ میں اپنے حریف سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

یہی روش ہے جس کے باعث وطن پرستوں کے محاذ میں رخنے پڑ جاتے ہیں۔

اختلاف کی بنیاد خلوص پر ہو تو اتحاد میں دیر نہیں لگتی

1918ء اور 1919ء کے زمانہ میں نام نہاد محبِّ وطن گروہوں اور پارٹیوں کا قیام ایک طبعی امر تھا۔ ان جماعتوں کی کثرت کی ذمہ داری ان بانیوں کے سر پر نہ تھی۔ 1920ء تک قوم پرست سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی آہستہ آہستہ ایسی دوسری پارٹیوں پر غلبہ پا کر نمایاں مقام حاصل کر چکی تھیں ان چھوٹے گروہوں میں سے کئی ایک کے بانی ایسے مخلص اور دیانت دار تھے کہ انہوں نے قابل تعریف عجلت سے اپنی ناکام جماعتوں کو ختم کرتے ہوئے نئی جماعت میں غیر مشروط طور پر شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

ایسی روشن مثال ایک تو جولیس سٹرائشر نے پیش کی جوان دنوں نرن برگ میں جرمن سوشلسٹ پارٹی کا داعی تھا قوم پرست سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی کے اغراض و مقاصد جرمن سوشلسٹ پارٹی سے ملتے جلتے تھے لیکن دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے علم کے بغیر قائم ہوئی تھیں سٹرائشر ان دنوں نرن برگ میں ایک معلم تھا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ جرمن سوشلسٹ پارٹی کا سب سے بڑا داعی تھا اسے اپنے نصب العین پر پختہ ایمان تھا اسے اپنی تحریک کی مستقبل میں کامیابی میں کوئی شک نہ تھا لیکن جونہی قوم پرست سوشلسٹ پارٹی کی برتر قوت اور وسعت کا سٹرائشر کو احساس ہوا اس نے جرمن سوشلسٹ پارٹی ترک کر کے اپنے پیروؤں سمیت قوم پرست سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی کیونکہ یہ پارٹی جرمن سوشلسٹ پارٹی پر غالب آ چکی تھی سٹرائشر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی آئندہ جدوجہد ہماری پارٹی میں شامل ہو کر جاری رکھے گا یہ فیصلہ کچھ آسان نہ تھا لیکن جس نے یہ فیصلہ کیا اس کا اخلاق اور دیانت داری ظاہر ہے۔

اختلاف برائے اختلاف خود غرضوں کا شیوہ ہے

جب تحریک کا پہلا دور مکمل ہو گیا تو پھر ہماری ہم مسلک طاقتوں میں سے کوئی افتراق باقی نہ رہا ہر دیانت دار، معزز صاف گو اور منصف مزاج شخص اپنے اخلاق سے خود بخود ہماری طرف کھینچا آتا تھا۔

میں نے اوپر محب وطن عناصر کی صفوں میں جس انتشار کا ذکر کیا ہے اس کا سبب مذکورہ بالا دوسری وجہ تھی غرض پرست افراد جن کا اپنا کوئی ضمیر نہ تھا جن کا کوئی نصب العین نہ تھا وہ قوم پرست سوشلسٹ مزدور پارٹی کی کامیابی کو دیکھ کر اس کی نقلیں کرنے لگے۔

یکلخت ہمارے پروگرام سے ملتے جلتے دوسرے پروگرام پیش کیے جانے لگے۔ ہمارے خیالات ہم سے چرا کر ان کا جداگانہ اعلان کیا جاتا۔ جن مقاصد کی خاطر ہم سالہا سال سے لڑتے آئے تھے انہی کا چرچا از سر نو شروع کیا جا رہا تھا۔ جن راہوں پر مدت ہوئی قوم پرست سوشلسٹ چلتے آتے تھے اب انہیں بطور ایک دریافت کے پیش کیا جائے گا لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اگرچہ قوم پرست سوشلسٹ مزدور پارٹی ایک مدت سے موجود ہے پھر بھی اس جیسی دوسری پارٹیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے طرح طرح کے حربے اختیار کیے جاتے تھے ان لوگوں کے الفاظ ایسے ہی منافقانہ تھے جیسا کہ ان کی نیتیں غیر شریفانہ تھیں۔

قائدین کی کمزوری جاہ طلبی ہے

حقیقت میں ان سب چالوں سے غرض صرف ایک تھی وہ غرض تھی ان جدید بانیان تحریک کی جاہ طلبی یہ خالی الذہن لوگ چاہتے تھے کہ بغیر کوئی نئی خدمت انجام دیئے انہیں برتری حاصل ہو جائے ان کی سب سے بڑی قابلیت ان کی بے شرمی تھی وہ دوسروں کے خیالات چرانے سے باک نہ رکھتے تھے عام زندگی میں ایسے ہی لوگوں کو چور کہا جاتا ہے۔

ان دنوں کوئی ایسا نیا خیال یا تصور نہ تھا جو منظر عام پر آئے اور یہ جیب کترے اس پر اپنے ہاتھ کی صفائی کی مشق نہ شروع کریں یہ حرکتیں انہی لوگوں سے سرزد ہوتی تھیں، جو

بعد میں آنسو بہا بہا کر صدق دل سے محبّ وطن عناصر کے باہمی افتراق پر مرثیے پڑھا کرتے تھے اور دن رات اتحاد کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے ان حرکتوں سے انہیں امید یہ تھی کہ شاید دوسروں کی آواز دب جائے انہیں توقع تھی کہ ان بلند آہنگ الزامات کو سن کر جس حریف سے اس کا تخیل چرایا گیا ہے شاید وہ اپنا دعویٰ ترک کر دے، اور ان چوروں کو نہ صرف ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کھلی چھٹی دے دے بلکہ جس تحریک کی بنیاد وہ خود رکھ چکا ہے اسے ان اٹھائی گیروں کے حوالے کر دے۔

جب نقل نہیں چلتی تو نقال اتحاد کا نعرہ بلند کرتے ہیں

جب یوں کام نہ چلا تو پھر انہوں نے اپنے دعوے ذرا گھٹا دیئے انہوں نے اپنی بہانہ سازی میں ذرا انکسار پیدا کر لیا اب ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی مشترکہ مجلس قائم کر کے انہیں بھی اس میں نمائندگی مل جائے ان کی ناکامی بھی ان کی پست ذہنیت کی طفیل تھی وہ جو امیدیں ظاہر کیا کرتے تھے ان میں سے ایک پوری نہ ہو سکی۔

یہ مشترکہ مجلس کیا بلا تھی ہر وہ تحریک جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت نہ رکھتی تھی، مشترکہ مجلس کے دروازے کا رخ کر لیتی تھی انہیں توقع تھی کہ آٹھ لولے لنگڑے مل جائیں تو پہلوان کا ناطقہ بند کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی سازشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر ان اپاہجوں کی فوج میں کسی ایک کے اعضا صحیح و سالم بھی تھے تو باقیوں کو سہارا دیتے دیتے اس کی اپنی حیثیت بھی ختم ہو جاتی۔

کسی دوسری جماعت کے ساتھ مل کر مشترکہ محاذ بنانا کوئی اصول کا سوال نہیں بلکہ ایک چال کا سوال ہے یعنی دیکھنا یہ ہو گا کہ کیا اس طرح مقصد میں کامیابی کی زیادہ توقع ہے لیکن اشتراک کا فیصلہ کرنے سے پہلے حسب ذیل بنیادی اصول کبھی نہ بھولنے چاہئیں۔

مشترکہ محاذ اصول کا سوال نہیں چال کا سوال ہے

جب دو جماعتوں میں اشتراک کا سوال پیدا ہو تو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ دو کمزور

جماعتوں کے اتحاد سے کبھی قوت پیدا نہیں ہوتی البتہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ مضبوط جماعت جب کسی کمزور پارٹی سے اتحاد کرتی ہے تو خود اپنی طاقت بھی کھو بیٹھتی ہے یہ خیال غلط ہے کہ کمزور گروہوں کے مل جانے سے کوئی قوی گروہ وجود میں آ سکتا ہے تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شکل کچھ ہو اور حالات کچھ ہوں دنیا میں کثرت ہمیشہ احمقوں اور نقالوں کی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بہت سی جماعتیں مل بیٹھتی ہیں تو ان سب جماعتوں کی منظوری سے ان کے قائدین پر مشتمل ایک مشترک مجلس منتظمہ معرض وجود میں آ جاتی ہے اس مجلس میں کثرت احمقوں اور بزدلوں کی ہوتی ہے اس قسم کے اتحاد کے بعد کھو کھلے مقابلے کا امکان کوئی نہیں رہتا یہ سوال نہیں رہتا کہ بہترین رہنما کو آگے لایا جائے یوں سب سے زیادہ تندرست اور سب سے زیادہ قومی شخص کی کامیابی یقینی نہیں ایسے اتحاد فطری ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں جس مسئلہ کی خاطر اتحاد قائم ہوتا ہے اسے اس اتحاد سے فائدہ کی جگہ نقصان پہنچتا ہے۔

جدا سیاسی جماعتوں کا اتحاد فقط وقتی ہوسکتا ہے

یہ ہوسکتا ہے کہ محض ایک چال کے طور پر کسی مستقبل پر نگاہ رکھنے والی تحریک کی قیادت ہم مسلک جماعتوں سے اس بنا پر کوئی مشترکہ محاذ قائم کرے کہ کسی مسئلے ک امل جل کر حل تلاش کیا جائے یا کسی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوا جائے لیکن یہ صرف عارضی اور ہنگامی حل ہوسکتا ہے دو جماعتوں کا اتحاد کبھی مستقل نہ ہونا چاہیے ایسے اتحاد کا صرف مطلب یہ ہوگا کہ ہر تحریک اپنی برتری سے دست بردار ہو رہی ہے جب مشترکہ محاذ قائم کیا جاتا ہے تو متعلقہ جماعتیں اس طرح پھنس جاتی ہیں کہ اپنی اپنی طاقت کو جدا جدا اپنی مرضی سے طبعی جدوجہد میں استعمال کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ نہ ہی حریف غالب آ کر مکمل کامیابی حاصل کرنے کا کوئی امکان باقی رہتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا کا کوئی کارنامہ مشترکہ کوششوں سے انجام نہیں پاتا۔ کارنامے ہمیشہ افراد کی کامیابی سے انجام پایا کرتے ہیں مشترکہ محاذ سے جو کامیابیاں

حاصل کی جائیں وہ کھوکھلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ باہمی اشتراک ختم ہو جانے پر اسی اشتراک میں سے آئندہ انتشار کے جراثیم نکل آتے ہیں اشتراک میں ہمیشہ انتشار کے جراثیم موجود ہوتے ہیں جو کچھ دائیں ہاتھ سے حاصل کیا جاتا ہے وہی بائیں ہاتھ سے چھن جاتا ہے انسانی عقل کی تاریخ میں جو عظیم الشان انقلاب رونما ہوئے، جن سے روئے زمین کا حلیہ بدل گیا، وہ بغیر زبردست جدوجہد کے کبھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچائے جا سکتے تھے یہ جدوجہد ہمیشہ افراد کے مابین ہوتی ہے متحدہ محاذ اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔

بڑی بات یہ ہے کہ عوامی سرکار کسی محبِّ وطن اتحاد سے قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ اتحاد کے لیے شرطِ اول مصالحت ہے۔ عوامی سرکار کا قیام مصالحت سے نہیں بلکہ کسی تحریک کے آہنی عزم سے عمل میں آئے گا یعنی عزم صرف ایک ایسی جماعت میں پایا جا سکتا ہے جو دوسری جماعتوں کے ساتھ جدوجہد کے بعد ان پر غالب آ چکی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب نہم :: طوفانی دستوں کی تنظیم کے متعلق بنیادی تصورات

سرکار کے تین بنیادی ستون

پرانی جرمن سرکار کی قوت تین بنیادی ستونوں پر تھی اول قیصری ملوکیت دوسرے مستقل سرکاری ملازمین اور تیسرے فوج 1918ء کے انقلاب کے بعد ملوکیت ختم ہوگئی فوج برطرف کردی گئی اور سرکاری ملازمین کا سیاسی پارٹیوں کی بددیانتی اور رشوت خوری نے ستیاناس کردیا یوں اقتدار سرکار کی بنیاد اور چولیں دونوں ہل کر رہ گیں سرکار کا اقتدار تین عناصر پر منحصر ہوتا ہے بغیر ان عناصر کے سرکاری قوت ختم ہو جاتی ہے۔

عوام کی تائید وہ پہلا عنصر ہے جس کے بغیر سرکاری اقتدار کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔ لیکن فقط عوامی تائید سرکاری اقتدار کے قیام کے لیے کافی نہیں جو اقتدار محض عوامی تائید پر مبنی ہو گا وہ کمزور، غیر یقینی اور متزلزل ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو عوامی تائید سے اقتدار حاصل ہو جائے وہ اپنے اس اقتدار کو مستقل یا مضبوط تر بنانے کی خاطر جسمانی قوت بھی فراہم کرتا ہے غرض جسمانی قوت یا جسمانی قوت استعمال کر سکنے کا اختیار اقتدار کی دوسری طرف ہے یہ دوسری بنیاد پہلی بنیاد کے مقابلے میں زیادہ پائیدار اور محفوظ ہے لیکن جسمانی قوت ہمیشہ عوامی تائید سے زیادہ موثر نہیں ہوتی اگر عوامی تائید اور جسمانی قوت دونوں یکجا ہو جائیں اور کچھ عرصہ تک اکٹھی کام کرتی رہیں تو پھر اقتدار کی ایک تیسری بنیاد بھی حاصل ہو جاتی ہے جو ان پہلی دو بنیادوں سے زیادہ مضبوط اور موثر ہے میری مراد ہے رواج، دستور اور روایات کی تائید۔ جب کسی اقتدار کی پشت پر عوامی تائید، جسمانی قوت اور رواجی تصدیق اکٹھی ہو جائیں تو پھر ایسا اقتدار مستحکم اور ناقابل شکست بن جاتا ہے۔

جرمنی میں انقلاب کے بعد اقتدار کی یہ تیسری اور آخری بنیاد بھی کھوکھلی ہو چکی تھی

کوئی ایسی قوت باقی نہ رہی تھی جس کی اطاعت رواجی طور پر مدتوں سے ہوتی آئی ہو۔ پرانی سرکار ختم ہوگئی قیصری ملوکیت ترک کردی گئی شہنشاہیت اور عظمت کے پرانے تمام نشان مٹ گئے رواج اور روایات کا پرانا نقشہ فنا ہوگیا نتیجہ یہ تھا کہ اقتدار سرکار کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

فوج کی بنیاد غیر مشروط اطاعت پر ہے

اقتدار کا دوسرا ستون یعنی جسمانی قوت بھی اب باقی نہ رہی تھی انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر وہ ادارہ بھی منتشر کردیا گیا جو آج تک اقتدار سرکار کی تنظیم اور تحفظ کا سب سے بڑا امانت دار سمجھا جاتا تھا یہ ادارہ جرمنی کی فوج تھی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ خود فوج کے بعض عناصر انقلاب کی تائید میں شورش پھیلانے کے لیے استعمال کئے گئے جو فوج محاذ جنگ پر لڑ رہی تھی اس میں انتشار کی قوتیں زیادہ دخیل نہ ہو سکیں لیکن جوں جوں فوجیں میدان جنگ سے واپس آئیں توں توں فوجوں میں بھی اس انقلابی طاعون کے جراثیم اثر کرتے گئے جس نے مادر وطن کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا تھا میدان جنگ قومی عظمت کی یادگار اور شہیدوں کا گہوارہ تھا لیکن وہ میدان جنگ اب پیچھے رہ گیا تھا جب فوجیں لام بندی توڑنے کے بعد مراکز پر واپس پہنچیں تو فوج بھی اس افراتفری کا شکار ہو گئے جس کے چرچے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے انقلابی فوجیوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ فوجی مجلسیں بنا رکھی تھیں ان مجلسوں نے ایک نئی اصطلاح گھڑ لی تھی وہ اصطلاح تھی ''رضا کارانہ اطاعت'' اطاعت کا مفہوم تو ہر سپاہی جانتا ہے لیکن جب اطاعت رضا کارانہ ہو تو پھر وہ اطاعت تو نہ رہی کچھ اور ہی بلا ہو گی۔

خالی عوامی تائید سے حکومت نہیں چلتی

یقیناً ان باغی فوجیوں کے سہارے کوئی اقتدار کا مرکز قائم کرنا ناممکن تھا یہ باغی فوجی تو اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ کارخانے کے ہڑتالی مزدوروں کی طرح فوجی بھی بس دن کے آٹھ گھنٹے فوج کے ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے یوں وہ دوسرا ستون گر چکا تھا جس کے سہارے

سرکار کا اقتدار قائم ہوتا ہے اب حامیان انقلاب کے پاس اقتدار کا صرف ایک عنصر باقی رہ گیا تھا یعنی عوامی تائید بس اسی رپ انقلابی سرکار کے وجود کا دارومدار تھا لیکن اقتدار کی یہ بنیاد سخت غیر محفوظ تھی یہ ٹھیک ہے کہ انقلاب نے چند تشددانہ حملوں سے پرانی سرکار کا فولادی ڈھانچہ چرمر کر دیا تھا اور اس کی بنیادیں اکھاڑ ڈالی تھیں لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم کی معاشرت کا نظام پہلے ہی جنگ کے صدموں کی تاب نہ لاتے ہوئے درہم برہم ہو چکا تھا۔

ہر قوم میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں

ہر قوم کی ہیئت تشکیل طبقات پر مشتمل ہوتی ہے ایک طرف تو وہ گروہ ہوتا ہے جسے قوم کا بہترین عنصر کہنا چاہیے یہاں بہترین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بہترین شہری ہوتے ہیں وہ جری اور دلیر ہوتے ہیں وہ اپنے ذاتی مفاد کا ایثار کرنے پر آمادہ رہتے ہیں دوسری طرف وہ گروہ ہوتا ہے جنہیں ننگ قوم یا بدترین عنصر کہنا چاہیے وہ بدکار، خطا کار، زیاں کار اور خودغرض نابکار ہوتے ہیں ان دونوں گروہوں کے بین بین تیسرا گروہ متوسط درجہ کے لوگوں کا ہوتا ہے جن کی شرافت اور خباثت دونوں میں تمیز کرنا ذرا مشکل ہے۔

کسی قوم کو عروج تب حاصل ہوتا ہے جب اس کی قیادت کی باگ دوڑ اس کے اشراف کے ہاتھ میں ہو جب کسی قوم کی قیادت متوسط طبقے کے ہاتھ میں آجائے تو پھر وہ ترقی اور رواداری کی عام ڈگر پر چلنے لگتی ہے حالات میں اعتدال رہتا ہے متوسط طبقہ کے خصلتیں اور عادتیں قومی زندگی میں بھی رونما ہونے لگتی ہیں یہ وہ دور ہوتا ہے جب کہ اشرف کا گروہ اور خبیثوں کا گروہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب نہیں ہوتا سب اپنی اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔

کسی قوم کا زوال کا وقت تب ہوتا ہے جب اس کی قیادت اس کے رذیل اور پاجی طبقہ کے ہاتھ میں آجاتی ہے یاد رکھنا چاہیے کہ عوام الناس یا متوسط طبقہ تب ہی برسر اقتدار آتا ہے جب کہ خبیثوں اور شریفوں میں تصادم انتہائی صورت اختیار کر جائے اور

دونوں میں سے پلہ کسی کا بھاری نہ ہو۔ ورنہ برے یا بھلے انتہا پسند عناصر میں سے جب کسی ایک کا پلہ بھاری ہو جائے تو متوسط طبقہ ہمیشہ فاتح کا ساتھ دیتا ہے اگر شریف غالب آ گئے تو عوام ان کا ساتھ دیں گے اگر خبیث غالب آ گئے تو عوام کو ان کے پیچھے چلنے میں عذر نہ ہو گا عوام الناس کی کثیر تعداد متوسط المزاج طبقہ سے تعلق رکھتی ہے وہ بروں یا بھلوں میں سے کسی کی خاطر جنگ کی پہلی صف میں شامل ہونے کو تیار نہیں۔ وہ تو جیتنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ہارنے والوں پر آوازے کستے ہیں۔

ملت پر نازک وقت پڑے تو اشراف سب سے پہلے کٹ مرتے ہیں

جن کے ساڑھے چار سال جو خون کی ندیاں بہتی رہیں، ان کے سیلاب سے قوم کے مذکورہ بالا تینوں طبقات کا باہمی توازن درہم برہم ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ متوسط طبقہ نے بھی بڑی قربانی دی لیکن اشراف کا وہ طبقہ جو جرمن قوم کی فضیلت کا امانت دار تھا قریب قریب سب کا سب کٹ گیا۔ وہ میدان جنگ میں شہید ہو گئے لڑائی میں جو سپوت کام آئے ان کی جگہ پر کرنا قریب قریب ناممکن تھا ساڑھے چار سال میں نہ جانے کون کون سے سورما اپنی گردنیں کٹوا چکے تھے لاکھوں ہی قوم کے کام آ گئے ہر محاذ پر رضا کاروں کی مانگ تھی ہر لڑائی سے پہلے دشمنوں کی صف میں جا کر خبریں لانے اور نگرانی رکھنے کے لیے رضا کاروں کی مانگ تھی گولیوں کی بوچھاڑ میں نامہ بری کے لیے رضا کاروں کی مانگ تھی جہاں توپوں کے آتشیں دہانے گولے اگل رہے ہوں وہاں ٹیلی فون کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے رضا کاروں کی مانگ تھی جب جان ہتھیلی پر رکھ کر پلیں بنانے کی ضرورت ہو تو رضا کاروں کی مانگ تھی مورچوں پر دھاوا بولنے کے لیے جانباز دستوں میں رضا کاروں کی مانگ تھی غرض میں کہاں کہاں شمار کراؤں ان ساڑھے چار سالوں میں ہزارہا موقعوں پر ہر جگہ اور ہمیشہ رضا کاروں کی مانگ تھی بار بار رضا کاروں کی مانگ تھی اور نتیجہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا سبزہ آغاز یا عنفوان شباب تک پہنچے ہوئے جوان جن کے دلوں میں وطن کی محبت تھی جن کے دل جری تھے جنہیں فرض کا احساس تھا

ہمیشہ ایسے ہی جوان تو رضا کاروں کی مانگ ہونے پر لبیک کہتے تھے، ہزار ہا اور لکھو کھہا ایسے جوان آگے بڑھے جوں جوں وہ آگے بڑھے توں توں قوم میں ایسے لوگوں کی کمی ہوتی گئی جن کی گردنیں نہ کٹیں وہ اپاہج ہو گئے یا زخم کھا کھا کر نڈھال اور ادھ موئے ہو گئے پھر بھی انہوں نے اپنا کام جاری رکھا کیونکہ اس قسم کے مزید سپوت فراہم نہ ہو رہے تھے 1914ء میں جرمن فوج کے کئی دستے ایسے ہی رضا کاروں پر مشتمل تھے امن کے زمانے میں ان رضا کاروں کو پوری عسکری تربیت بھی نہ مل سکی تھی ان کو عسکری تربیت نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ نام نہاد امن کے پجاری نا اہل ممبران پارلیمنٹ زمانہ امن میں جبری لام بندی کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ یہ جوان بری طرح گولیوں کا نشانہ بنے وہ چار لاکھ جوان جو فلانڈرز کے میدان جنگ میں مارے گئے یا اپاہج ہو گئے ان کی کمی پھر پوری نہ ہو سکی۔ ان کے مارے جانے کا نقصان ہوا اس کا اندازہ صرف تعداد کے شمار سے نہیں لگایا جا سکتا ان کی موت سے قوم کے معاشرتی میزان کے پلڑوں کا توازن درہم برہم ہو گیا ہمارے معاشرتی نظام میں پہلے ہی بہترین عناصر کا غلبہ برائے نام تھا ان محبان وطن کے کٹ مرنے سے اب چاروں جانب بدترین عناصر کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ بزدلوں اور پاجیوں کی بن آئی الغرض ہماری آبادی کے بدترین عنصر کو غلبہ حاصل ہونے لگا۔

رذیل طبقات سے ملت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے

پھر ایک اور بات بھی تھی جہاں ساڑھے چار سال تک قوم کے بہترین فرزند میدان جنگ میں گردنیں کٹا کر ختم ہو رہے تھے وہاں ہمارے بدترین افراد حیرت ناک طریقہ پر اپنی جانیں بچا کر چھپ رہنے میں کامیاب ہوتے آئے تھے ہر اس جانباز کے ساتھ ساتھ جس نے قوم کی خاطر جان کی بازی لگا دی، اور ہنستے کھیلتے جنت کا راستہ لیا کوئی نہ کوئی ایسا بھگوڑہ بھی موجود تھا جو چالاکی سے موت کو جل دے گیا اور یہ بہانہ گھڑ لیا کہ میں جس کاروبار میں مصروف ہوں یہ بھی قوم کی جدوجہد کے لیے نہایت ضروری ہے

یوں جنگ کے اختتام کے بعد قوم کا جو نقشہ بن چکا تھا وہ حسب ذیل تھا:

متوسط طبقہ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان و مال کی عظیم قربانی دی تھی قوم کا محب وطن طبقہ جانبداری کی عدیم النظیر مثال پیش کرتے ہوئے قریب قریب سارے کا سارا ناموس ملت کی خاطر کٹ مرا تھا اس کے مقابلے میں قوم کا خبیث اور نافرض شناس طبقہ قریب قریب سارے کا سارا محفوظ تھا اس طبقہ کے بچ نکلنے کی بڑی وجہ اول تو بعض احمقانہ قوانین تھے اور دوسرے یہ کہ سرکاری حکام نے جبری لام بندی کے قانون پر سختی سے عمل نہ کیا تھا۔

بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

ہماری قوم کے ان گندے عناصر نے جو مزے سے اپنی جانیں بچائے بیٹھے تھے انقلاب برپا کیا وہ انقلاب برپا کرنے میں اس لیے کامیاب ہو گئے کہ قوم کا اشراف اور محب وطن طبقہ ناموس وطن پر اپنی جانیں قربان کر چکا تھا یہ طبقہ ان باچیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اب زندہ نہ تھا۔

غرض جرمن انقلاب شروع سے ہی قوم کے ایک طبقے کی تائید سے بپا ہوا تھا ان برادر کش انقلابیوں نے جو جھک مارا اس کی ذمہ داری جرمن قوم پر نہیں اس کی ذمہ داری تو انہی گمنام غداروں، بھگوڑوں اور فسادیوں پر ہے جنہوں نے اس انقلاب کا بیڑا اٹھایا تھا۔

جو سپاہی محاذ جنگ پر لڑ رہے تھے انہوں نے جنگ ختم ہونے کا خیر مقدم کیا خیر مقدم کی وجہ یہ تھی کہ خون خرابہ بہت ہو چکا تھا سپاہی خوش تھے کہ گھر جائیں گے بیوی بچوں سے پھر ایک بار ملاقات ہو گی لیکن سپاہیوں پر انقلاب برپا کرنے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہ تھی وہ انقلاب کے حامی نہ تھے وہ انقلابیوں کے ساتھی نہ تھے جن لوگوں نے انقلاب بپا کیا اور انقلاب کی تحریک کے منظم سپاہی انہیں پسند نہ کرتے تھے سپاہی ساڑھے چار سال تک ایک جانکاہ جدوجہد میں مصروف رہنے کے باعث اپنے وطن

کے سیاسی مردار خوار لنگڑ بگڑوں کو بھول چکا تھا۔ سپاہی کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ اہل سیاست ذاتی مفاد کی خاطر کیسے کٹ مرتے ہیں۔

انقلابی فسادی ہوتے ہیں

انقلاب صرف جرمن قوم کے ایک محدود حلقے میں مقبول تھا۔ یہ وہ حلقہ تھا جس نے ایک نئی سرکار کے ماتحت اچکا پن اور اٹھائی گیری کو معزز شہری بننے کا مسلمہ طریقہ تسلیم کر لیا تھا یہ طبقہ بھی انقلاب کو انقلاب کی خاطر پسند نہ کرتا تھا بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہے کہ شاید صاحبان انقلاب درحقیقت انقلاب سے کوئی عقیدت رکھتے تھے حقیقت یہ تھی کہ حامیان انقلاب صرف اس لیے انقلاب کے ہمنوا تھے کہ انہیں انقلاب سے ذاتی فائدہ پہنچا تھا۔

مارکس ازم کے حامی دوسروں کا گھر لوٹ کر جیتے اس طریقے سے کوئی مستقل اقتدار حاصل نہیں کیا جا سکتا نئی سرکار کو بہر نوع اپنا اقتدار قائم کرنا تھا اگر نئی سرکار اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہتی تو بالآخر اس کی تباہی یقینی تھی کچھ عرصہ ملک میں تعطل رونما ہو جاتا اس کے بعد قوم کے بہترین عناصر باہم یکجا ہو کر انقلاب کا خاتمہ کر دیتے۔

انقلاب برپا کرنے والوں کو ان دنوں سب سے بڑا خطرہ یہ لاحق تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں جو طوائف الملوکی پیدا کی ہے وہی ان کے خاتمے کا سبب نہ بن جائے کوئی اور فولادی قوت اقتدار سنبھال کر انہیں گوشہ گمنامی میں دفن نہ کر دے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے مرحلوں پر اس قسم کے واقعات پیش آنے کی کئی مثالیں موجود تھیں لہذا حامیان انقلاب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح انقلابی سرکار کا اقتدار پائیدار اور مستحکم بنا دیا جائے۔

ظالم کو بھی سہارے کی تلاش ہوتی ہے

یہی وجہ تھی کہ انقلابی سرکار کے قیام کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اسے ضرورت لاحق ہوئی کہ اپنی تقویت کے لیے کسی اور ستون کا سہارا لے اس وقت انقلابی سرکار کی واحد بنیاد

ہر دلعزیزی تھی لیکن تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ عوام میں ہر دلعزیزی کافی نہیں اقتدار کو پائیدار بنانے کے لیے منظم قوت کی بھی حاجت ہوتی ہے جب دسمبر 1918ء جنوری اور فروری 1919ء میں انقلاب برپا کرنے والے جلادوں نے اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس کی تو انہوں نے چاروں جانب آسرے ڈھونڈ نے شروع کیے انہیں ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو عسکری قوت سے حکومت کی تائید کریں اس وقت تک ان جلادوں کو صرف عوامی مقبولیت کی تائید حاصل تھی انقلابی سرکار کا قیام اکثریت کو کچلنے کی خاطر عمل میں آیا تھا۔ لیکن اب خود اس سرکار کو فوجیوں کی تائید کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت تک انقلابی سرکار کا اقتدار بھانت بھانت کے مختلف عناصر کی حمایت سے قائم تھا ان عناصر میں فسادی تھے چور تھے، ڈاکو تھے، فوجی بھگوڑے تھے اور عسکری خدمت سے جان چرانے والے تھے۔ انہی عناصر کو اوپر ہم نے، کسی قوم کے خبیث عناصر، قرار دیا ہے ان لوگوں سے کسی مقصد یا اعتماد کی خاطر ایثار یا قربانی کی توقع رکھنا محال تھا جس طبقہ نے انقلابی تخیل کی حمایت کی اور انقلاب برپا کیا خود اس طبقہ کے اندر سے جانباز سپاہی مہیا نہ ہو سکتے تھے یہ طبقہ جمہوری سرکار کے قیام کا خواہش مند نہ تھا بلکہ وہ تو جو سرکار پہلے سے قائم ہو، اس میں انتشار اور خلل پیدا کرنے پر تلا ہوا تھا ان لوگوں کی زبان پر یہ نعرہ نہ تھا کہ جرمنی میں جمہوری سرکار کی تنظیم اور تعمیر کے لیے کمر باندھ لو بلکہ ان کا نعرہ تو تھا کہ جرمن سرکار کو فنا کی گھاٹ اتار کر خوب لوٹ مار مچاؤ۔

انقلابی نظم ونسق نہیں چلا سکتے

یہی وجہ تھی کہ جب عوامی نمائندوں نے گونا گوں خدشات سے متاثر ہو کر امداد کی اپیل کی تو اس طبقہ میں سے کسی نے اس اپیل پر لبیک نہ کہا الٹے اس طبقہ نے تلخی اور بربریت کا اظہار کیا ان کا خیال تھا کہ عسکری قوت کی فراہمی ان مواعید کے خلاف ہے جن کی بنا پر انقلاب بپا کیا گیا تھا ایسی حرکت بد دیانتی کے مترادف ہو گی یہ عناصر ملک میں کوئی ایسی طاقت دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتے تھے جس کی بنیاد عوام کی تائید کے علاوہ کسی

اور قوت پر ہو وہ سمجھتے تھے کہ ایسی قوت وجود میں آ گئی تو پھر انقلاب کا جو مفہوم ان کے نزدیک پسندیدہ ہے وہ ختم ہو جائے گا انہیں ڈر تھا کہ ڈاکہ مارنے کا مقدس حق چھین لیا جائے گا چوروں اور اچکوں کا من مانا راج قائم نہ رہے گا جن بدترین عناصر نے جیل خانوں سے زنجیریں توڑ کر معاشرہ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا ان کی سرداری معرض خطرہ میں پڑ جائے گی۔

عوام کے نمائندے کتنا ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر کیوں نہ چلائیں، یہ غیر منظم ہجوم کوئی منظم قوت فراہم نہ کر سکتا تھا نہ ہی ایسا کرنے پر آمادہ تھا جب کبھی عوام کے نمائندے مدد کے لیے پکارتے تو ان پر غدار کے آوازے کسے جاتے۔ یہ آوازے کسنے والے وہی لوگ تھے جن کی تائید سے نئی سرکار قائم ہوئی تھی۔

دانشور طبقہ اور عوام کا باہمی ربط کٹ جائے تو انقلاب برپا ہو جاتا ہے

یوں پھر ایک مرتبہ نوجوان جرمنوں کو فوجی وردیاں پہنا کر قانون اور امن کی حفاظت پر مامور کیا گیا یہ نوجوان اسی خیال میں مگن تھے کہ وہ فولادی خود پہن کر رائفل ہاتھ میں لے کر، اور پیٹی کمر سے باندھ کر وطن کی حفاظت کر رہے ہیں انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ وطن کے دشمنوں کو بچا رہے ہیں رضا کاروں کے دستے منظم کئے گئے وہ انقلاب سے نفرت کرتے تھے لیکن دراصل ان سے انقلاب کی حمایت کا کام لیا جا رہا تھا ان کے طرز عمل کا یہی نتیجہ تھا کہ انقلاب مستحکم اور مستقل ہو جائے بہر حال نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان کی نیتیں نیک تھیں۔

انقلاب کے اصل بانی اور تار ہلانے والے وہ بین الاقوامی ذہنیت کے یہودی تھے جنہوں نے ساری صورت حال کا خوب اندازہ کر رکھا تھا جرمن قوم ابھی بالشوزم کی خونیں دلدل میں دھکیلے جانے کے لیے تیار نہ ہو سکی تھی، جس طرح کہ روسی قوم کو خون کا غسل دیا جا چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کے دانشور طبقہ اور مزدوروں کے مابین ابھی تک نسلی اتحاد موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ معاشرہ کے عام حلقوں میں مہذب اشخاص کی کمی

نہ تھی مغربی یورپین کی دوسری اقوام بھی جرمنی کی طرح اشتراکی انقلاب کے لیے تیار نہ تھیں برعکس اس کے روس کا حال بالکل مختلف تھا روس کا دانشور طبقہ روسی قوم سے تعلق نہ رکھتا تھا روس کے جو دانشور روسی قومیت سے تعلق رکھتے تھے ان کے افکار ا تخیلات روسی نسل کی خصوصیات سے معرا تھے مزید بریں روس میں پڑھا لکھا اور ذہین دانشور طبقہ تھا بھی آٹے میں نمک کے برابر ان مٹھی بھر دانشوروں کو اسی وقت ایک پھونک مار کر اڑایا جا سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ دانشور طبقہ کو عوام کے ساتھ مربوط و منسلک رکھنے کے لیے کوئی درمیانہ طبقہ روس میں موجود نہ تھا مزید بریں روسی عوام کی غالب اکثریت کی اخلاقی اور ذہنی سطح بالکل پست تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب شورش پسند عناصر روس کے عوام کو بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے تو روس کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا روسی عوام پڑھ لکھ نہ سکتے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ صرف ملک کے بالائی حلقوں تک محدود تھا اس طبقے کا عوام سے رشتہ کٹ چکا تھا عوام اور دانشور طبقہ کے مابین کوئی مستقل ہمدردی نہ تھی غرض روس میں جب عوام کی تائید حاصل ہو گئی تو انقلاب کی کامیابی دو اور دو چار کی طرح یقینی تھی جب انقلاب کامیاب ہو گیا تو روس کے جاہل عوام اپنے یہودی ڈکٹیٹروں کے غلام بن گئے ان یہودی ڈکٹیٹروں کو اتنی عقل تھی کہ انہوں نے اپنی ڈکٹیٹر شپ کا نام ''کنگال شاہی'' رکھ دیا تھا۔

جس ملک کی روایات عسکری ہوں وہاں انقلاب بمشکل کامیاب ہوتا ہے

جرمنی میں حالات کچھ مختلف تھے یہاں انقلاب کو حقیقی کامیابی تبھی حاصل ہو سکتی تھی جب فوج کو بتدریج منتشر کر دیا جاتا یہاں دقت یہ تھی کہ فوج میں خلل پیدا کرنے کا باعث وہ سپاہی نہ تھے جو محاذ جنگ میں لڑ کر واپس آ رہے تھے بلکہ یہاں تو خلل ان بلوائیوں نے پیدا کیا تھا جو سامنے آتے ہوئے ڈرتے تھے، یہ بلوائی وہ سپاہی تھے جو یا تو مزے سے چھاؤنیوں میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے یا پھر وہ ایسے لوگ تھے جو اس بہانے

سے فوج میں شامل ہی نہ ہوئے تھے کہ ان کی تاجرانہ سرگرمیاں وطن کے لیے نہایت ضروری ہیں بلوائیوں کی اس فوج میں وہ دس ہزار بھگوڑے بھی شامل تھے جو محاذ جنگ چھوڑ کر اپنی جانیں بچالائے تھے۔

بھگوڑوں کو سزائے موت ملنی چاہیے

ایک بزدل شخص جس قدر موت سے ڈرتا ہے کسی اور شے سے نہیں ڈرتا۔ وہ موت سے بچنے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ محاذ جنگ اور بزدلوں کو چاروں جانب سے موت ہی موت نظر آتی تھی بزدلوں کو ادائے فرض پر آمادہ کرنے کا ہمیشہ صرف ایک ہی طریقہ رہا ہے اور جہاں تک بزدلوں کا تعلق ہے ان کے لیے آج بھی وہی ایک کارگر نسخہ ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ بزدل کو ذہن نشین کرا دیا جائے کہ اگر میدان جنگ سے بھاگے تو تمہیں گولی ماردی جائے گی۔ محاذ جنگ میں جو سپاہی لڑتا ہے اس کے مارے جانے کا تو فقط امکان ہوتا ہے۔ لیکن بھگوڑوں کی موت کو یقینی بنا دینا چاہیے صرف ایسے جلادی قانون سے ہی نہ صرف بلکہ گروہوں کو بھی پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ فوج کی تعزیرات میں بھاگنے کی سزا موت اسی مصلحت سے درج ہے۔

یہ عقیدہ خوب سہانا تھا کہ جب قوم اپنی زندگی اور موت کی جدوجہد میں مصروف ہے تو صرف رضا کارانہ وفاداری پر اعتماد کرنے سے ہی کام چل جائے گا فرزندان وطن خالی اسی لیے سرفروشی پر آمادہ رہیں گے کہ وطن کو سرفروشی کی حاجت ہے۔ اپنے فرائض کی رضا کارانہ انجام دہی صرف بہترین انسانوں کا خاصہ ہے۔ اوسط انسان اپنے فرائض محض اپنی خوشی سے ادا نہیں کرتا۔ اس کے لیے خاص قوانین کی حاجت ہوتی ہے۔ مثلاً چوری کی سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ جو لوگ فقط اخلاق کے خیال سے چوری کو برا نہ سمجھیں کم از کم خوف کے مارے اس جرم سے بچے رہیں۔ ایسے قوانین مجرموں کو خوفزدہ کر کے ارتکاب جرم سے باز رکھتے ہیں ایسے قوانین نہ ہوں تو صورت حال یہ بن جاتی

ہے کہ جتنا کوئی شخص زیادہ دیانتدار رہوا تنا زیادہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے اس طرز عمل کے پیچھے جو ذہنیت کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خالی ہاتھ کھڑے رہنے یا لٹ جانے سے یہ بہتر ہے کہ چوری کے مال میں سے بھی حصہ وصول کیا جائے۔

جب ہر انسانی قرینہ سے نظر آ رہا تھا۔ کہ جرمنی کو کئی سال جنگ لڑنا پڑنے گی تو یہ خیال غلط تھا کہ سینکڑوں غلط ہزاروں سال کے تجربہ سے انسان کو مشکل حالات اور اضطراب کی کیفیت میں اپنے فرض کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لیے جو قوانین لازم چلے آتے ہیں وہ اب ترک کئے جا سکتے ہیں۔

میدان جنگ میں سخت سزاؤں کی ضرورت

یہ درست ہے کہ جو شجاع اور جری لوگ رضا کارانہ طور پر جنگ میں شامل ہوتے ہیں ان کے لیے جنگی قوانین میں موت کی سزا عائد کرنا ضروری نہیں۔ لیکن یہ سزا ان خود غرض بزدلوں کے لیے ضروری ہے جو قوم پر نازک وقت آ جانے کی صورت میں اپنی جان کو قوم سے زیادہ قیمتی تصور کرتے ہیں۔ ایسے کمزور اور بے ہمت لوگوں کو اپنی جبلی بزدلی دکھانے سے باز رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے یہ طریقہ ہے سخت ترین سزاؤں کا خوف، جب انسان کو ہر روز موت کا سامنا ہو، جب ہفتوں تک خندقوں کے کیچڑ میں زندگی بسر کرنی پڑے۔ اس دوران میں خوراک بھی پوری نہ ملے تو جس انسان کا ایمان متزلزل ہو جائے اور اوسان جواب دینے لگیں، اسے صرف قید بلکہ قید سخت کی دھمکیوں سے بھی موریچوں پر ڈٹے رہنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے موقعوں پر تو صرف سختی سے سزائے موت کا نفاذ ہی کام دے سکتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے موقعہ پر ایک رنگروٹ قید خانے کو ہزار بار میدان جنگ پر ترجیح دیتا ہے قید خانے میں کم از کم جان تو خطرے سے باہر ہو گی دوران جنگ میں سزائے موت کو موقوف ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی تعزیرات اب نافذ نہیں۔ بھگوڑوں کی ایک فوج میدان جنگ کے عقب کے شہروں یا پھر اپنے گھروں کو واپس آنے لگی۔ 1918ء میں خاص طور پر ایسا ہو رہا تھا یوں

مجرموں کی وہ وسیع تنظیم وجود میں آنے لگی جس کا ہمیں 7نومبر 1918ء کے بعد یک لخت سامنا کرنا پڑا۔انقلاب انہی لوگوں نے برپا کیا۔

جرمنی میں کیوں بالشویک انقلاب بپا نہ ہوسکا

ان سب کارروائیوں سے محاذ جنگ پر لڑنے والوں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔یہ درست ہے کہ محاذ جنگ پر لڑنے والے سپاہی بھی صلح اور امن کے خواہاں تھے۔لیکن سپاہیوں کی یہ خواہش ہی انقلاب کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔جب متارکہ جنگ کے بعد جرمن سپاہی گھروں کو آنے لگےتو انقلابی خوف زدہ ہوکر باربار یہ سوال کرتے تھے کہ محاذ جنگ سے واپس آنے والے سپاہیوں کا طرزعمل کیا ہوگا۔جن لوگوں نے اپنے بال لڑائیاں لڑتے لڑتے سفید کر لیے کیاوہ انقلاب برداشت کرلیں گے؟

انقلاب بپا ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد تک انقلابیوں کا یہی تذبذب تھا جس کے باعث انہوں نے کم ازکم بظاہر اعتدال کا راستہ اختیار کرلیا۔وہ یہ خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے کہ جرمن فوج کے چند ڈویژن انقلاب کو کچل کر رکھ دیں۔اس وقت اگر کسی ایک ڈویژن کا سپہ سالار بھی اپنے ڈویژن کے سپاہیوں کو جنہوں نے ہمیشہ اس کے فرمان کی تعمیل کی تھی جمع کر لیتا اور سرخ جھنڈے کو پھاڑ پھینکنے کے بعد نام نہاد مجلس عمل کے اراکین کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیتا تو ایک مہینے کے اندر اندر اس کی فوج ایک ڈویژن سے بڑھ کر سات ڈویژن ہو جاتی۔اگر کوئی مقابلہ کرتا تو توپوں اور دستی بموں سے اس کے دھوئیں اڑا دیئے جاتے انقلاب کے تماشہ کے تار ہلانے والے دراصل یہودی تھے انہیں جتنا فوج کا خطرہ تھا اور کسی کا نہ تھا،اسی خطرے سے بچنے کی خاطر انہوں نے انقلاب کوقدرے اعتدال کے راستے پر ڈال دیا۔ان میں یہ جرات نہ تھی کہ انقلاب کو بالشوزم کی حد تک پہنچاتے۔اس لیے انہوں نے موجودہ صورت حال کوگوارا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اور منافقانہ طور پر صلح اور امن کی بحالی کا چرچا کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کئی اہم مسائل میں نرمی دکھائی مثال کے طور پر پرانے سرکاری

ملازمین اور فوج کے قدیم قائدین سے اپیل کی گئی کہ کچھ عرصہ مزید اپنے عہدوں پر کام کرتے رہیں جس طرح کافروں کا پتلہ بنا کر اس پر شمشیر زنی کی مشق کی جاتی ہے اسی طرح وقت گذر جانے پر پھر ان سرکاری ملازمین اور فوجی قائدین کو جواب دے دیا جاتا تھا۔ جمہوری سرکار سے انہیں بے دخل کر کے انقلابیوں کا قبضہ مستقل کر دیا جاتا تھا۔

انقلابیوں کا خیال تھا کہ بڈھے سپہ سالاروں اور سرکاری ملازمین کو دھوکا دینے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چال ممکن نہیں صرف اسی طریقے سے پیش آنے والی مخالفت کو روکا جا سکتا ہے کہ موجودہ برسر اقتدار گروہ اپنے آپ کو بے ضرر اور اعتدال پسند ثابت کر دے۔

عملی تجربہ سے ثابت ہے کہ ان کی یہ چال کیسی کامیاب رہی۔

جرمن انقلاب دیرپا کیوں ثابت نہ ہوا

انقلاب برپا کرنے والے قوم کے پرامن اور پابند قانون عناصر نہ تھے انقلاب تو فسادیوں، چوروں اور ڈاکوؤں نے برپا کیا تھا۔ انقلاب اب جس راستے پر چل نکلا تھا اس سے انقلاب برپا کرنے والے ان اصلی عناصر کی تسکین نہ ہو رہی تھی قائدین انقلاب کی بڑی دقت یہ تھی کہ وہ اپنے حامیوں کے سامنے اپنی چال کی پوری طرح وضاحت بھی نہ کر سکتے تھے اگر یوں وضاحت کر دی جاتی تو چال بے اثر ہو جاتی غرض حامیان انقلاب کو قائدین انقلاب مطمئن نہ رکھ سکے۔

جب اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی بتدریج برسر اقتدار آ گئی تو اس پر سے ایک انقلابی پارٹی کی وحشت اور بربریت کا رنگ آہستہ آہستہ اترنے لگا یہ درست ہے کہ اشتراکیت پسند جمہوریت کے حامی انقلاب چاہتے تھے لیکن ان کے لیڈروں کی یہ نیت نہ تھی یقیناً ان کی یہ نیت نہ تھی آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ ایک انقلابی پروگرام تو تھا لیکن اس انقلابی پروگرام کو پورا کرنے کے لیے آدمی نہ تھے۔ کسی جماعت کے دس لاکھ اراکین خود انقلاب برپا نہیں کر سکتے اگر یوں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جائے تو لیڈروں کو

جلد تجربہ ہو جائے گا کہ ان کے دس لاکھ ممبروں کی اکثریت اوسط درجے کے اعتدال پسند سست اور ذہنی جمود کے مارے ہوئے شہریوں پر مشتمل ہے جو کسی انتہا پسند کوشش کی طاقت نہیں رکھتے۔

اشتراکیت کس طرح انقلاب برپا کرتی ہے

یہودی یہ سب کچھ دوران جنگ میں ہی سمجھ گئے تھے اور اسی لیے انہوں نے اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی میں وہ پھوٹ ڈال دی تھی جو آج تک موجود ہے ایک طرف تو اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی اور اس کے کثیر التعداد ذہنی جمود کے مارے ہوئے اراکین کو اس طرح حکومت کے گلے ڈال دیا گیا کہ قومی دفاع کی گاڑی رک گئی۔ دوسری طرف سرگرم انتہا پسند عناصر کو اس جماعت سے نکال کر فسادی حملہ آوروں کی صورت میں منظم کیا گیا۔ آزاد سوشلسٹ پارٹی اور جانباز لیگ درحقیقت مارکس ازم کے انقلابی حامیوں کے مقدمۃ الجیش کے دستے تھے ان کے ذمہ یہ کام سپرد تھا کہ پہلے اقتدار کی مسند کو خالی کر دو پھر اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی سرکار کی اس خالی مسند پر قابض ہو جائے گی اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی کافی دیر سے اس کارروائی کے لیے تیار ہو رہی تھی مارکس ازم کے حامیوں نے بزدل کھاتے پیتے طبقات کی حیثیت کا صحیح اندازہ کیا تھا۔ اس سے کوئی خوف ہی نہ تھا۔ وہ تو کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے ہر نئے آقا کی ٹھوکریں کھانے پر آمادہ ہو جائیں گے یہ قدیم اور کہنہ روایات کے حامل لوگ کوئی ایسا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت ہو۔

جب انقلاب کامیاب ہو گیا اور انقلابیوں کا خیال تھا کہ پرانی سرکار کے تمام ستون گرائے جا چکے تو اس عالم میں محاذ جنگ سے واپس آنے والے سپاہی انقلابیوں کے لیے ملک الموت سے کم نہ تھے ان سپاہیوں کے خوف سے انقلاب جس راستے پر چل رہا تھا اسے وہاں سے لوٹنا پڑا۔ اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی نے جو کہ فوج کے قلب کی حیثیت رکھتی تھی مفتوحہ علاقہ پر قبضہ کر لیا آزاد سوشلسٹ پارٹی اور جانباز لیگ کے

مقدمۃ الجیش کو ادھر ادھر بھگا دیا گیا۔

لیکن یہ سب کچھ خاصی کشمکش کے بعد ہوا۔

انقلابیوں کے دو گروہ

جن سرگرم عناصر نے عملی جدوجہد سے انقلاب برپا کیا تھا وہ اس صورت حال سے مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا کہ ان سے غداری کی گئی ہے اب انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ جاؤ اپنی جنگ خود لڑو۔ جب انہوں نے سازشوں کی بھر مار کر دی تو خود انقلاب کی تار ہلانے والے بھی ان سے تنگ آ گئے ابھی انقلاب پوری طرح مستحکم بھی نہ ہوا تھا کہ انقلابیوں میں دو پارٹیاں قائم ہو گئیں ایک پارٹی قانون اور امن کی بحالی چاہتی تھی دوسری پارٹی خون خرابے اور فساد پر تلی ہوئی تھی یہ طبعی امر تھا کہ ہمارے کھاتے پیتے طبقات امن اور قانون کے حامیوں کی پشت پناہی کرنے لگے کھاتے پیتے طبقات پر مشتمل قابل رحم سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی کارنامہ انجام دینے کا موقع پایا۔ قافلہ پہلے سے انقلاب کی منزل کے راستے پر روانہ ہو چکا تھا یہ بھی خوشی سے قافلہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے یوں کھاتے پیتے طبقات اور انقلابیوں کے مابین ایک اتحاد قائم ہو گیا۔ اگرچہ کھاتے پیتے لوگ انقلابیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جرمن کھاتے پیتے طبقات کی سیاسی جماعت نے بالشوزم کا مقابلہ کرنے کے لیے مارکس ازم کے حامی قائدین کے ساتھ اشتراک کار کا اعزاز حاصل کر لیا۔

یوں دسمبر 1918ء اور جنوری 1919ء میں حسب ذیل صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔

انتہا پسند، اعتدال پسند اور رجعت پسند

قوم کے بدترین عناصر پر مشتمل ایک اقلیت نے انقلاب برپا کر لیا تھا۔ مارکس ازم کی حامی پارٹیاں اس اقلیت کی تقلید کر رہی تھیں انقلاب نے بہ ظاہر اعتدال کا راستہ اختیار کر لیا تھا اس لیے انتہا پسند عناصر ناراض ہو کر برسر پیکار تھے انتہا پسند عناصر کی

جانب سے دستی بم پھینکنے، مشین گنیں چلانے اور سرکاری عمارات پر قبضہ کرنے کے واقعات رونما ہونے لگے۔ انقلاب کی اعتدال پسند روش ختم ہوتی نظر آتی تھی اس دہشت کے دور کو بدتر بننے سے بچانے کی خاطر نئے اور پرانے حکمرانوں کے مابین ایک عارضی صلح اور شرط قرار پائی کہ مشترکہ دشمن یعنی انتہاپسندوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ جمہوری سرکار کے مخالف تھے وہ جمہوری سرکار کے دشمنوں کو دبانے کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اور جمہوریت کی دشمنی سے دست بردار ہو گئے۔ قدامت پسند کھاتے پیتے لوگ جن وجوہات کی بنا پر انتہاپسندوں کے مخالف تھے وہ ان وجوہات سے بالکل مختلف تھیں جن کی بنا پر جمہوری سرکار کے حکمرانوں اور انتہاپسندوں میں جھگڑا چل رہا تھا۔ قدامت پسند کھاتے پیتے لوگ جمہوری سرکار کے حکمرانوں سے بھی خوش نہ تھے۔ لیکن انتہاپسندوں کے خلاف جمہوری سرکار کے حکمرانوں اور قدامت پسند کھاتے پیتے لوگوں نے جو مشترکہ محاذ قائم کیا اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جمہوری سرکار کے حکمران قدامت پسند کھاتے پیتے لوگوں کی مخالفت سے محفوظ ہو گئے۔

اعتدال پسندوں نے کس طرح انتہاپسندوں پر فتح پائی

یہ بات بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے اس کو یاد رکھنے سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ جب قوم کے دس افراد میں سے نو نے انقلاب میں حصہ نہ لیا اور جب دس میں سے آٹھ افراد نے انقلاب سے بریت ظاہر کی، اور دس میں سے چھ افراد نے انقلاب کی مخالفت کی تو پھر قوم کے دس افراد میں سے محض ایک شخص کی حمایت سے انقلاب کامیاب کیسے ہو گیا۔

رفتہ رفتہ سڑکوں پر مورچے قائم کر کے فساد کرنے والے جانباز لیگ کے حامی ختم ہو گئے قوم پرست محبان وطن اور اصول پرست عناصر بھی بتدریج دب گئے ان دونوں گروہوں کے زوال کے بعد جیسا کہ دستور ہے اعتدال پسند درمیانہ طبقہ آگے بڑھا کھاتے پیتے طبقات اور مارکس ازم کے حامی دونوں نے موجودہ صورت حال کا فائدہ

اٹھانے کے لیے اشتراک کار کا راستہ اختیار کیا غرض جمہوری سرکار کی گاڑی چل نکلی۔ شروع شروع میں اس اشتراک کار کے باوجود کھاتے پیتے طبقات کی جماعتیں شاہ پرستی کا اظہار کرتی رہیں خاص طور پر انتخاب کے موقع پر شاہ پرستی کا چرچا کیا گیا ان کھاتی پیتی جماعتوں کی کوشش تھی کہ گڑے مردوں کو قبروں سے نکالا جائے۔

کھاتی پیتی جماعتوں کی یہ روش دیانت داری پر مبنی نہ تھی دل سے تو وہ شاہ پرستی کو عرصہ ہوا خیر باد کہہ چکے تھے۔ نئے حکمرانوں کے پاجی پن نے دلوں کو سیاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ خود کھاتی پیتی سیاسی جماعتوں میں بھی کمینہ جذبات پھیل رہے تھے اب عام کھاتے پیتے سیاست دان رشوت خوری کو ترجیح دیتے تھے پرانی سرکار کے عہد کی یادگار شرافت رخصت ہو چکی تھی۔ بس اس کی یاد باقی رہ گئی تھی۔

انقلاب کن حالات میں رونما ہوتا ہے

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ پرانی فوج میں انتشار پھیل جانے کے بعد نئے انقلابی حکمران اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی خاطر مجبور ہو گئے کہ کوئی نئی تنظیم قائم کریں۔ اس وقت ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ یہ نئی تنظیم صرف انہی لوگوں پر مشتمل ہو سکتی تھی جن کا ضابطہ حیات انقلابی حکمرانوں سے بالکل متضاد تھا۔ انہی عناصر سے آہستہ آہستہ ایک نئی فوج منظم ہوئی صلح نامہ کی شرطوں کے تحت اس نئی فوج کی تعداد بہت کم رکھی گئی۔ نئے حکمرانوں کے لیے باعث تقویت بننے کی کوشش میں اس نئی فوج کی روح بھی بدل گئی۔

یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ پرانی سرکار میں بعض ایسے نقائص تھے جن کے باعث انقلاب کامیاب ہوا اس کے علاوہ انقلاب کو بحیثیت ایک سیاسی واقعہ کے جو کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجوہات حسب ذیل تھیں:

1 پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ہماری قوم میں فرض شناسی اور اطاعت کے تصورات مسخ ہو چکے تھے۔

2 دوسری وجہ یہ تھی کہ سرکار کی حامی سیاسی جماعتیں ہمت ہار بیٹھی تھیں۔

معاشی اور تعلیمی نظام میں خلل ہو تو نتیجہ انقلاب ہوتا ہے

ان دونوں وجوہات کی وضاحت کے لیے ایک اور حقیقت ذہن نشین کرنا لازمی ہے ہماری قوم میں فرض شناسی اور اطاعت کے تصورات مسخ ہو جانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارا نظام تعلیم ناقص تھا۔ اس نظام تعلیم کے ماتحت سرکار پرستی کے جذبات کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن قوم پرستی کے جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس غلط تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ اہل قوم مقصد اور حصول مقصد کے ذرائع میں تمیز کرنے کی اہلیت سے بے بہرہ ہو گئے تھے۔ فرض شناسی، ادائے فرض اور اطاعت بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ سرکار بھی کوئی مقصد نہیں یہ تو سب حصول مقصد کے ذرائع ہیں اصل مقصد یہ ہے کہ جسمانی اور روحانی مزاج کے اعتبار سے ہم جنس انسانوں پر مشتمل ملت کی بقا اور ترقی کا اہتمام کیا جائے جب قوم کا بیڑا غرق ہوتا صاف دکھائی دے، جب نظر آ رہا ہو کہ ملت سنگدل ظالموں کا شکار بننے والی ہے اور اس تمام زبوں حالی کے ذمہ دار چند اشخاص ہوں تو محض فرض شناسی کے نام پر فقط اس لیے ان مٹھی بھر افراد کی اطاعت کشی سے منہ نہ مرنا کہ وہ مسند حکومت پر قابض ہیں سراسر رسم پرستی اور حماقت ہے ایسے حالات میں فرض شناسی اور ادائے فرض کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے خاطروں کی اطاعت کیشی سے منہ موڑ لیا جائے اور قوم کو تباہی سے بچایا جائے آج کل ہمارے کھاتے پیتے طبقات میں سرکار کی وفاداری کا جو تصور رائج ہے، اس کی رو سے اگر فوج کے کسی ڈویژن کے سپہ سالار کو اپنے حاکم سے یہ حکم وصول ہو جائے کہ لڑائی بند کر دو تو اطاعت کیشی کا تقاضا ہے کہ لڑائی بند کر دی جائے اس کھاتی پیتی ذہنیت کے نزدیک اندھی اطاعت قوم کی زندگی سے زیادہ ضروری ہے لیکن قوم پرست اشتراکی فلسفہ کے تحت نازک حالات میں نااہل اور بزدل حاکموں کی اطاعت لازمی نہیں، ایسے نازک مرحلہ پر ہر شخص کا فرض ہے کہ براہ راست قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور بغیر کسی رسمی اطاعت کی پرواہ کیے اس ذمہ داری کا حق ادا کرے۔

جب حالات نازک ہوں تو تشدد سے بھی کام لینا پڑتا ہے

انقلاب اس لیے کامیاب ہوا کہ ہماری قوم میں اطاعت کیشی کو قوم پرستی کے ماتحت رکھنے کا تصور فنا ہو چکا تھا ہماری حکومت بھی اس تصور سے عاری ہو چکی تھی اس کی بجائے رسمی اور تقلیدی اطاعت دستور بن چکی تھی۔

جہاں تک سرکار کی حامی جماعتوں کے ہمت ہار جانے کا تعلق ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری قوم کے مستعد اور دیانت دار عناصر کی بہت بڑی تعداد میدان جنگ میں گردنیں کٹا چکی تھی یہی وجہ تھی کہ ہماری کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں سست اور نا اہل بن چکی تھیں پرانی سرکار کی حامی صرف کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں تھیں ان جماعتوں میں یہ خبط سرایت کر چکا تھا کہ اپنے اعتقادات اور اصولوں کی حمایت صرف ذہنی حربوں سے کرنی چاہیے جسمانی طاقت کا استعمال فقط سرکار کا منصب ہے یہ غلط خیال بھی اسی کمزوری اور انحطاط کا آئینہ دار تھا جو چاروں جانب پھیل رہی تھی ایسے حالات میں جب کہ مدمقابل اس اصول کو تسلیم نہ کرتا ہو اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کھلم کھلا تشدد کی دعوت دیتا ہو، ذہنی حربوں کے ساتھ یہ مبالغہ آمیز عقیدت کچھ معقول معلوم نہیں ہوتی کھاتے پیتے طبقات کی جمہوریت میں مارکس ازم کا ظہور خود جمہوریت کا مرہون منت تھا۔اس عالم میں کھاتے پیتے جمہوریت پرستوں کا یہ ادعا کہ مارکس ازم کا مقابلہ ذہنی حربوں سے کیا جائے ایک ایسی حماقت تھی جس کی قیمت بعد میں بڑے خوفناک طریقے سے ادا کرنی پڑی مارکس ازم کا ہمیشہ سے یہی اصول رہا ہے کہ ہتھیاروں کا استعمال صرف مصلحت وقت پر مبنی ہے حربہ وہی ہے جو چل جائے اور کارگر ثابت ہو۔

کھاتے پیتے سفید پوش طبقات بزدل ہوتے ہیں

مارکس ازم کا یہ اصول سات نومبر سے لے کر دس نومبر 1918ء تک درست ثابت ہوا مارکس ازم کے حامیوں نے پارلیمنٹ یا جمہوریت کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی انہوں نے مجرموں کی ایک فوج ساتھ لے کر گولیاں چلاتے ہوئے شورش برپا کر دی اور پارلیمنٹ

اور جمہوریت دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

جب انقلاب کامیاب ہو گیا تو کھاتی پیتی سیاسی جماعتوں نے اپنے سائن بورڈ بدل دیئے ان کے دلیر قائدین جن تہ خانوں میں چھپے ہوئے تھے یا بنیوں کی دکانوں میں جہاں پناہ گزین تھے وہاں سے نکل آئے از کار رفتہ اور کہنہ اداروں اور ایسے اداروں میں کام کرنے والوں کی ہمیشہ یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ نہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے نہ وہ اس میں کسی اصلاح کی استعداد رکھتے ہیں ان کا سیاسی پروگرام ہمیشہ ماضی پر مبنی ہوتا ہے باوجود اس کے وہ خود نئے نظام حکومت سے وابستہ ہو چکے تھے ان کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ نئی حکومت میں اپنے حصے سے محروم نہ رہ جائیں اس مقصد کے لیے ان کا واحد ہتھیار زبان اور قلم سے لفظوں کا استعمال تھا۔

یہی وجہ تھی کہ انقلاب کے بعد کھاتی پیتی سیاسی جماعتوں نے بھی بڑی بری طرح بازاری طاقتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جب جمہوری سرکار کے تحفظ کے لیے سیفٹی ایکٹ منظور کیا جا رہا تھا تو ایوان کی اکثریت اس کی حامی نہ تھی لیکن باہر سڑکوں پر مارکس ازم کے دو لاکھ حامی مظاہرے کر رہے تھے۔ کھاتے پیتے سیاستدانوں کی خوف کے مارے جان نکل رہی تھی اس لیے انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف اس ایکٹ کے حق میں ووٹ دے دیئے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں ڈر تھا کہ جرمن پارلیمنٹ یعنی ریشتاغ سے باہر نکلنے پر ان کے سر توڑ دیئے جائیں گے۔

یوں نئی سرکار اپنے راستے پر چلنے لگی گویا کبھی اس کی کوئی مخالفت ہی نہ ہوئی تھی۔

سیاسی منصوبہ کے بغیر طاقت بھی بیکار رہوتی ہے

مارکس ازم اور اس کے مستقل حامیوں کا مقابلہ کرنے کی جرات اور طاقت صرف ایک نوعیت کی تنظیمات میں تھی۔ یہ تنظیمات رضا کاروں کے ان دستوں پر مشتمل تھیں جو بعض فوجی افسروں نے فوج منتشر ہو جانے کے بعد اپنے طور پر منظم کر رکھے تھے بعد

ازاں فوجی سپاہیوں نے خود حفاظتی کے لیے جو تنظیمات قائم کی تھیں یا سوک گارڈ کی تنظیمات یا فوجیوں کی انجمنوں میں بھی کسی حد تک یہ حوصلہ اور استعداد موجود تھی۔

لیکن اس قسم کے ادارے جرمن تاریخ کا رخ نہ موڑ سکتے تھے اس کی وجہ حسب ذیل تھی۔

قومی سیاسی جماعتیں تو اس لیے بے اثر تھیں کہ ان کے پاس کوئی ایسی طاقت نہ تھی جس سے وہ سڑکوں پر مظاہرے کرسکیں فوجیوں کی دفاعی انجمنیں اس لیے غیر موثر تھیں کہ ان کے پاس نہ کوئی سیاسی تخیل تھا اور نہ کوئی واضح سیاسی مقصد۔

مارکس ازم کو ایک مرتبہ جو کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ مارکس ازم کے حامیوں کے پاس ایک سیاسی مقصد بھی تھا اور طاقت بھی موجود تھی پھر اس مقصد اور اس قاہر طاقت کے مابین تعاون بھی تھا جرمن قوم پرستوں کو جرمنی کے ارتقا سے بے دخل کر دیئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ قوم پرستوں کی جسمانی طاقت اور معقول سیاسی مقاصد میں باہم کوئی رابطہ نہ تھا۔

قوم پرست سیاسی جماعتوں کے مقاصد کچھ ہی کیوں نہ ہوں، وہ بازاروں میں ان مقاصد کی خاطر جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔

دفاعی انجمنوں کے پاس جسمانی قوت تھی وہ بازاروں میں غالب اور سرکار پر قابض تھے لیکن ان کے پاس سیاسی تخیل کا افلاس تھا ان کے پاس کوئی ایسا مقصد نہ تھا جس کی خاطر ان کی طاقت استعمال ہوسکتی تھی یا جرمن قوم کے کسی طرح کام آسکتی۔عیار یہودیوں نے اپنی قوت کلام سے ایک جانب سیاسی تنظیمات کو سیاسی تخیلات سے محروم کر دیا تھا۔ یہ میدان تو سیاسی جماعتوں اور دفاعی فوجی تنظیمات میں پہلے سے موجود تھا یہودیوں نے اس میلان کو بس ذرا پائیدار اور مستحکم بنا دیا تھا۔

عدم تشدد یہودیوں کی ایک چال ہے

یہودی اس کام میں اپنے اخبارات سے خوب کام لیتے تھے ایک طرف انہوں نے یہ

مشہور کر رکھا تھا کہ فوجیوں کی دفاعی انجمنیں تو غیر سیاسی تنظیمات ہیں دوسری طرف سیاسیات میں وہ ہمیشہ اس امر پر زور دیتے تھے کہ سیاسی جنگ تو فقط ذہنی سطح پر لڑنی چاہیے جو کچھ یہ عیار یہودی مشہور کر دیتے، پھر لاکھوں سادہ لوح جرمن پوری حماقت سے ان کی گردان کرنے لگے انہیں یہ سمجھ ہی نہ تھی کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہتھیاروں سے محروم کر کے اور اپنے ہاتھ کو باندھ کر یہودیوں کے سپرد کر رہے ہیں۔

جرمنوں کی اس سادہ لوحی کی بھی ایک وجہ تھی جب تک کوئی عظیم الشان نصب العین سامنے نہ ہو، جس کی خاطر دل میں دنیا بدل دینے کی امنگ پیدا ہو تب تک انتہائی قوت عمل بیدار نہیں ہوتی جب یہ ایمان پیدا ہو جائے کہ صورت حال میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنا لازمی ہے تب ہی یہ اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے لیے بدترین حربے استعمال کرنے بھی جائز ہیں۔

جو تحریک اعلیٰ اور بلند مقاصد کی خاطر میدان میں نہیں آتی، وہ سخت ترین حربے استعمال کرنے کی استعداد سے بہرہ ور ہوتی ہے۔

معاشرہ بیر ایک عظیم نصب الین کے تخیل کے نہیں چل سکتا

انقلاب فرانس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ ایک نیا تخیل سامنے آ گیا تھا انقلاب روس کی فتح مندی بھی ایک تخیل کی مرہون منت تھی اٹلی میں فسطائیت نے ایک پوری قوم مسحور کر کے اس کی جو کایا کلپ کر دی ہے اس کی وجہ بھی ایک تخیل ہے۔

کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں ایسے کارنامے انجام نہیں دے سکتیں پھر کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں بھی ہمیشہ ماضی کو اپنے گلے سے نہیں لگائے پھرتیں فوجیوں کی دفاعی انجمنوں نے بھی ماضی پرستی کو اپنا نصب العین بنالیا تھا علاوہ ازیں فوجیوں کی دفاعی انجمنوں کا تو کوئی سیاسی پروگرام ہی نہ تھا ان کے دلوں سے پرانی عسکری روایات فراموش نہ ہوئی تھیں یوں جرمن قوم کا جو حربہ سب سے زیادہ کارگر ہو سکتا تھا وہی کند ہو گیا۔ نہ صرف یہ

حربہ کند ہو گیا بلکہ اس سے جمہوری سرکار کے غلاموں کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا یہ درست ہے کہ ان عسکری دفاعی انجمنوں کی نیت بہت اعلیٰ تھی ان کے حسن نیت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں باوجود اس کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کا طرز عمل نہایت احمقانہ تھا۔

سیاسی تخیل کے بغیر عسکری جماعتیں کامیاب نہیں ہو سکتیں

جونئی فوج منظم ہوئی اس کے بل بوتے پر مارکس ازم کی حمایت میں وہ طاقت فراہم ہو گئی جو مارکس ازم کا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے ضروری تھی اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ سپاہیوں کی جو دفاعی انجمنیں خطرناک سمجھی گئیں یا کارآمد نہ سمجھی گئیں انہیں اب منتشر کیا جانے لگا بعض ناعاقبت اندیش لیڈروں نے حکومت کے اس اقدام کے مقابلے کا فیصلہ کیا انہیں عدالت میں طلب کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ بہر حال وہ تھے بھی اسی سلوک کے مستحق۔

قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کے قیام سے ایک ایسی تحریک وجود میں آ گئی جس کا مقصد واضح تھا یہ جماعت صرف ماضی کی بحالی کی خواہش مند نہ تھی جیسا کہ کھاتی پیتی سیاسی جماعتوں کا عام دستور تھا بلکہ یہ تحریک تو حکومت کے موجودہ نامعقول خول کو مٹا کر اس کی جگہ ایک باضابطہ عوامی سرکار قائم کرنا چاہتی ہے۔

جس روز سے یہ تحریک قائم ہوئی اسی روز سے یہ اصول اپنا لیا گیا کہ اعتقادات کی تبلیغ صرف ذہنی وسائل سے نہیں کی جاتی بلکہ جہاں تبلیغ کے راستے میں مادی رکاوٹیں سامنے آئیں، وہاں بزور شمشیر بھی کام لیا جاتا ہے اس نئی تحریک کے قائدین کا ایمان تھا کہ ان کے پیش کردہ جدید اعتقادات نہایت اہم ہیں ایسے اہم کہ تحریک کا مقصد پورا کرنے کے لیے ہر قربانی جائز ہے جہاں زبان کو ہاتھ سے روک دیا جائے وہاں زبان کی مدد کے لیے ہاتھ سے کام لینا لازم ہو جاتا ہے۔

فساد اور جہاد کا فرق

میں وضاحت کر چکا ہوں کہ بعض خاص حالات میں جو تحریک عوام کا دل موہ لینے

کے لیے چلائی جائے اسے اپنے حریفوں کے تشدد کے جواب میں اپنے بچاؤ کی خاطر بسا اوقات جوابی تشدد سے کام لینا پڑتا ہے تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا میں کبھی سرکار کی رسمی طاقت اس تشدد پر غالب نہیں آسکی جس کی پشت پناہی کوئی ضابطہ حیات پر مبنی تشدد ہی دے سکتا ہے شرط یہ ہے کہ دوسرے ضابطہ حیات کے حامی بھی پہلے ضابطہ حیات کے مقلدین سے کم دلیر اور باہمت نہ ہوں دفتروں میں اہلکاروں کے لیے یہ اصول تسلیم کرنا ہمیشہ سے کڑوا گھونٹ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دفتری اہلکار تو بس سرکار کے رسمی اقتدار کے پرستار ہوتے ہیں لیکن دفتری اہلکار تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت پر ان کے ماننے یا نہ ماننے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کسی سرکار کے حکمران صرف اسی وقت تک قانون اور امن بحال رکھ سکتے ہیں جب تک کہ سرکار کی پشت پناہی کرنے والا ضابطہ عوام میں بھی تسلیم کیا جاتا ہو جب حکومت کا ضابطہ حیات عوام میں مقبول ہو تو شورش برپا کرنے والوں کو عام طور پر مجرم اور فسادی سمجھا جاتا ہے اکا دکا اور بے حیثیت فسادی برعکس اس کے جب سرکار کا ضابطہ حیات عوام میں مقبول نہ ہو تو سرکار کے خلاف شورش اور فساد کرنے والوں کو سرکاری عقیدہ کے خلاف ایک نئے عقیدہ کے علمبردار تصور کیا جاتا ہے جب سرکار کے عقیدے سے کوئی نیا عقیدہ لڑ رہا ہو تو کتنا ہی سخت تشدد کیوں نہ اختیار کیا جائے خالی تشدد سے ہرگز کامیابی نہ ہوگی بودے عقیدے پر مبنی تشدد بالآخر ناکام ثابت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کمزور عقیدے پر مبنی سرکار تشدد سے کام لینے کے باوجود فنا ہو جاتی ہے۔

محض تشدد سے کوئی اصولی تحریک ختم نہیں کی جاسکتی

جرمن سرکار کی مملکت میں چاروں جانب مارکس ازم کا دور دورہ ہے۔ ستر سال تک جرمن سرکار ہر قسم کی کوششوں کے باوجود مارکس ازم کا عقیدہ ملیا میٹ نہ کر سکی۔ مارکس ازم کے حامیوں کو قید محض اور قید سخت کی جو سخت سزائیں دی گئیں اگر ان سب کی میزان نکالی جائے تو شاید ہزاروں سال بن جائیں چیرہ دستی اور جبر و تشدد سے مارکس ازم کے ضابطہ حیات کے حامیوں کو ان گنت بار کچلنے کی کوشش کی گئی لیکن انجام یہ ہوا کہ ایک روز

سرکار کو بری طرح ہار ماننی پڑی۔ عام کھاتی پیتی سیاسی جماعتوں کے قائدین ان سب حقیقتوں کا انکار کرتے ہیں لیکن حقیقت کو جھٹلانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

جب یہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ 9 نومبر 1918ء کو سرکار نے غیر مشروط طور پر مارکس ازم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ کل صبح سرکار مارکس ازم پر غلبہ حاصل کرلے گی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے یہ کھاتے پیتے سادہ لوح دفتروں میں اسٹول پر چڑھ کر مختلف وزارتوں کے محکماتی دفاتر میں بیٹھے ہوئے گڑ بڑ کرتے رہتے ہیں کہ مزدوروں کے منشاء کے خلاف کیسے حکومت چل سکتی ہے جب یہ لوگ مزدوروں کا نام لیتے ہیں تو ان کی مراد مارکس ازم کے حامی ہوتے ہیں یہ لوگ جرمن مزدوروں کو بلا استثنا مارکس ازم کا حامی قرار دے کر نہ صرف ایک صریح جھوٹ بولتے ہیں بلکہ مارکس ازم کے عقیدہ اور تنقید کے سامنے خود اپنی شرمناک شکست پر بھی پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

رضاکاروں کی تنظیم عسکری نوعیت کی نہ ہونی چاہیے

موجودہ سرکار ہر پہلو سے مارکس ازم کے ماتحت آچکی ہے یہی وجہ ہے کہ قوم پرست اشتراکی تحریک اپنے عقیدے کو غالب لانے کے لیے نہ صرف عوام کو عقل اور سمجھ بوجھ کے ذریعہ قائل کرنا چاہتی ہے بلکہ خود اپنے دفاع کی خاطر اپنے آپ کو منظم رکھنے کی ذمہ داری بھی محسوس کرتی ہے یہ دفاع بین الاقوامی اشتراکیت کے حملوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے بین الاقوامی اشتراکیت کی جو کامیابیاں حاص ہوئی ہیں ان کے باعث ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔

میں پہلے یہ بیان کرچکا ہوں کہ ہماری نوعمر تحریک کو جیسے جیسے تجربہ حاصل ہوتا گیا ہم نے کس طرح اپنے جلسوں کے بچاؤ کی خاطر ایک تنظیم تیار کرلی یہ تنظیم آہستہ آہستہ ایک عسکری تنظیم کی صورت اختیار کرگئی یہ ایک ایسی عسکری تنظیم تھی جو امن وامان قائم رکھنے کی خاص تربیت حاصل کرچکی تھی رفتہ رفتہ اس تنظیم کے اندر باقاعدہ درجے اور عہدہ

داران کے منصب قائم کیے گئے۔

یہ درست ہے کہ ہماری نئی تنظیم بہ ظاہر سابقہ فوجیوں کی دفاعی انجمنوں سے ملتی جلتی تھی لیکن درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سابقہ فوجیوں کی دفاعی انجمنیں کسی واضح سیاسی عقیدے کی پیرو نہ تھیں وہ تو بس دفاع کی خاطر قائم کی گئی تھیں ان کی تربیت اور تنظیم بھی اسی محدود مقصد پر مبنی تھی یوں سمجھنا چاہیے کہ سرکار کی باقاعدہ فوج کی امداد کے لیے یہ انجمنیں ایک قسم کا بے قاعدہ لشکر تھیں ان دفاعی تنظیمات کی رضا کارانہ حیثیت قائم رہنے کی صرف دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ یہ تنظیمات خاص حالات میں قائم ہوئی تھیں دوسرے یہ کہ ان دنوں سرکار کو بھی ایک خاص صورت حال سے سابقہ تھا لیکن یہ دفاعی انجمنیں ان معنوں میں نہ آزاد تھیں اور نہ رضا کار، نہ کہ انہیں بطور خود اپنی مرضی سے کسی پسندیدہ سیاسی عقیدے کے دفاع کی خاطر منظم کیا گیا تھا اگرچہ بعض دفاعی تنظیمات اور ان کے قائدین موجودہ جمہوری سرکار کے مخالف ہیں، باوجود اس کے ان انجمنوں کو بالکل آزاد یا رضا کارانہ قرار نہیں دیا جاسکتا صحیح معنوں میں سیاسی عقیدہ کا مطلب فقط یہ نہیں ہوتا کہ رائج الوقت کی خالی خولی مخالفت کی جائے بلند سیاسی عقیدہ کا تقاضا ہے کہ مثبت طور پر ذہن میں کسی متبادل نظام کا نقشہ موجود ہو اس نعم البدل نظام کے قیام کی ضرورت پر پختہ ایمان ہو جس متبادل نظام پر ایمان ہے اس کے قیام کو مقدس ترین فریضہ سمجھا جائے۔

ان دنوں قوم اشتراکی تحریک کے ماتحت رضا کاروں کے جودستے جلسوں میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے وہ اس قسم کی دوسری تمام دفاعی تنظیمات سے بالکل مختلف تھے ان کو ممتاز کرنے والی صفت یہ تھی کہ ہماری تنظیم ہرگز انقلاب سے پیدا ہونے والی صورت حال کو برقرار رکھنے کے لیے نہ بنائی گئی تھی ہماری تنظیم کا مقصد فقط یہ تھا کہ ایک نئے جرمنی کی تعمیر کی جائے۔

رضا کاروں کو جسمانی تربیت کے علاوہ اعتقادی تربیت بھی ملنی چاہیے

شروع شروع میں ہمارے رضا کاروں کی اس تنظیم کا مقصد فقط جلسوں میں امن قائم رکھنا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ہمارے جلسے میں کوئی خلل پیدا نہ ہوا گر رضا کاروں کی یہ تنظیم نہ ہوتی تو ہمارے مخالفین جلسہ منعقد کرنا محال کر دیتے۔ ہمارے ان رضا کاروں کو حملہ کرنے کی تربیت تو دی جاتی تھی لیکن ہماری تربیت فقط ڈنڈا چلانے کی تربیت نہ تھی ان دنوں محب وطن جرمن عناصر اپنی سادگی کے باعث یہ سمجھتے تھے کہ فقط ڈنڈا چلانے کی تربیت بھی مفید ہوسکتی ہے ہمارے رضا کار ڈنڈا تو اس لیے استعمال کرتے تھے کہ جب کسی انسان کو ڈنڈے کے زور سے واسطہ پڑ جائے تو بغیر ڈنڈے کے اعلیٰ مقاصد کی تبلیغ ناممکن ہو جاتی ہے تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اعلیٰ ترین دماغوں کو کسی اجڈ نے مار ڈالا ہمارے محافظ تشدد کو بجائے خود مقصد تصور نہ کرتے تھے البتہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد اور بلند عزائم کی تعلیم دینے والے راہنماؤں کو تشدد کی زد سے بچانے میں قوت بازو کا استعمال جائز سمجھتے تھے علاوہ ازیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی ایسی سرکار کی حمایت ہرگز فرض نہیں جو قوم اور وطن کی حفاظت کے لیے مفید نہ ہو ہمارے محافظ رضا کار قوم اور سرکار کو ان پاجیوں سے بچانے کے لیے لڑتے تھے جو دونوں کا ستیاناس کر دینے کے در پے تھے۔

رضا کار ہمارے جلسوں کو خراب ہونے سے بچاتے تھے

میونخ ہاف براؤ ہاؤس میں جو دنگا ہوا، جہاں ہمارے مٹھی بھر رضا کاروں نے اپنے حریفوں کا شجاعانہ مقابلہ کر کے لازوال شہرت حاصل کی اس کے بعد ہمارے رضا کار دستوں کا نام طوفانی دستے مشہور ہو گیا جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے کہ یہ دستے ہماری تحریک کا ایک شعبہ تھے جس طرح جماعت کے ماتحت صحافت اور پروپیگنڈا ایک شعبہ ہے تعلیمی ادارے ایک دوسرا شعبہ ہیں تحریک کے دوسرے شعبہ جات ہیں، اسی طرح

رضا کار بھی ایک شعبہ ہیں۔

ہمیں تجربہ ہو گیا کہ رضا کاروں اور محافظوں کی یہ تنظیم کتنی ضروری ہے یہ تجربہ محض اس یادگار جلسہ پر مبنی نہ تھا بلکہ تحریک کے میونخ سے باہر لے جا کر جرمنی کے دوسرے حصوں میں پھیلانے کی کوشش سے بھی اس تجربے کی تصدیق ہوئی جب یہ صریحاً نظر آنے لگا کہ ہماری تحریک مارکس ازم کے لیے خطرہ ہے تو مارکس ازم کے حامیوں نے کوئی ایسا موقعہ خالی نہ جانے دیا۔ جہاں قوم پرست اشتراکی تحریک کے جلسوں کے انعقاد کو روکنے کی کوشش نہ کی جاتی جب انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے جلسہ خراب کرنے کی کوشش کی تو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ مارکس ازم کی حامی تمام جماعتیں بلا تفریق و امتیاز ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے نمائندوں کی ان کوششوں اور سرگرمیوں کی پشت پناہی کرتی رہیں۔

دشمن کے علاوہ حریفوں سے بھی مقابلہ ہوتا ہے

تعجب یہ ہے کہ جو کھاتی پیتی سیاسی جماعتیں انہیں مارکس ازم کے حامیوں کے ہاتھوں خاموش ہو چکی تھیں، کیونکہ ان کے نمائندے رائے عامہ کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے، وہ بھی مارکس ازم کے ہاتھوں ہماری پریشانی پر خوشی کا اظہار کرنے لگے جب کبھی ہمیں مارکس ازم کے مقابلے میں کوئی زک اٹھانی پڑتی تھی یہ کھاتی پیتی سیاسی پارٹیاں پوری حماقت اور کوتاہ نظری سے مسرت کا اظہار کرتیں انہیں خوشی یہ تھی کہ جن حریفوں کے مقابلے کی خود ان میں تاب نہیں، انہیں کوئی دوسرا بھی شکست نہیں دے سکا۔ سرکاری افسر پولیس کے حاکم اور کابینہ کے وزراء بھی اگرچہ ایک طرف اپنے آپ کو عوام کے سامنے قوم پرست ظاہر کرتے تھے لیکن دوسری جانب پوری بے حیائی سے اصول شکنی کرتے ہوئے ہم قوم پرست اشتراکیوں اور مارکس ازم کے حامیوں میں جب کبھی تصادم ہوتا تو مارکس ازم کے حامیوں کا ساتھ دیتے کئی لوگ یہودی اخبارات میں ذرا سی تعریف چھپ جانے کے شوق سے انتہائی ذلیل حرکات کرنے میں جانبازی سے

مارکس ازم کا مقابلہ نہ کرتے اور جان پر نہ کھیل جاتے تو کمیونسٹ بلوائی چند سال پہلے انہیں ذلیل اشخاص کو پرزہ پرزہ کر ڈالتے، یا سولیوں پر لٹکا دیتے۔

یہ قابل نفرین حرکات دیکھ کر ایک روز کوتوال شہر پر پوہنر کوتاؤ آ گیا ہمیں اس معزز شخص کی یاد کبھی فراموش نہیں ہوسکتی وہ ایسا اولوالعزم اور دیانت دار شخص تھا کہ اسے مکاروں اور فریبیوں سے دلی نفرت تھی اس کی نفرت ایسی شدید تھی کہ اس قسم کی شدید نفرت کسی سچے انسان کے سینے میں ہی پیدا ہوسکتی ہے ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ایک روز ہر پوہنر کوتاؤ آ گیا انہوں نے کہا ''ساری عمر میرا نصب العین یہی رہا ہے کہ میں پہلے اپنی قوم کا وفادار ثابت ہوؤں اور اس کے بعد اپنی سرکار سے وفاداری کا ثبوت دوں'' میں نے کبھی ان ذلیل افسروں کی نقل نہیں کی جو برسر اقتدار افراد کا خانہ زاد بن جانا اپنے لیے باعث اعزاز تصور کرتے ہیں ایسے لوگ تو بس یہ دیکھتے ہیں کہ برسر اقتدار افراد کا منشا کیا ہے اور پھر حاکموں کے منشا کے مطابق ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔

سرکاری ملازم بھی فرض شناس ہونے چاہئیں

یہ دیکھ کر دل ٹوٹ جاتا تھا کہ ہزارہا دیانت دار اور وفادار ملازمین سرکار رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کا اثر قبول کر رہے تھے بے اصولی کی مثالیں دیکھتے دیکھتے ہر سرکاری ملازم کے اخلاق کو گھن لگ رہا تھا یہ ذلیل انسان نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل کرتے تھے، بلکہ دیانت دار سرکاری ملازم کے لیے جینا دوبھر کر دیتے تھے۔ دیانت دار سرکاری ملازم سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان کا تنزل عمل میں لایا جاتا تھا۔ انہیں ان کے عہدوں سے تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ پھر یہ سب کچھ کرنے والے انتہائی ڈھٹائی سے ریاکاری کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو ''قوم پرست'' مشہور کر دیتے تھے۔

اس قسم کے سرکاری ملازمین سے ہمیں کیا امداد کی توقع ہوسکتی تھی وہ شاذ و نادر ہی ہماری مدد کرتے تھے ہماری تحریک کو اپنا بچاؤ خود کرنا پڑتا تھا۔ ایک تحریک جب تک خود اپنی حفاظت نہ کرے تب تک اس کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ نہ ہی اس کی جانب عوام کی

نگاہیں اٹھتی ہیں نہ ہی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مقام تو تب ہی نصیب ہوتا ہے جب کوئی تحریک اپنا بچاؤ خود کرنے کے قابل بن جاتی ہے اور جو کوئی اس پر حملہ کرے اسے منہ توڑ جواب دینے کی طاقت رکھتی ہے۔

عسکری تربیت کا غیر سرکاری انتظام مشکل ہے

طوفانی دستوں کی داخلی تربیت کے لیے ہم نے ایک اور اصول بھی وضع کیا ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے رضا کاروں کو نہ صرف جسمانی مستعدی کی تعلیم دی جائے گی، بلکہ انہیں ہر طرح سے تلقین کی جائے گی کہ وہ قوم پرست اشتراکی اعتقادات کے لیے دل و جان سے مقلد بن جائیں اس کے علاوہ انہیں نظم وضبط کی پوری سختی سے تربیت دی جاتی تھی۔ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم سے سابقہ فوجیوں کی دفاعی انجمنوں کی کوئی نسبت نہ تھی۔ بالخصوص ان انجمنوں کو جو کھاتی پیتی پارٹیوں سے تعلق رکھتی تھی ہماری رضا کاروں کی تنظیم کی کوئی بات خفیہ یا ڈھکی چھپی نہ تھی۔

یہ درست ہے کہ ان دنوں کے خاص حالات کے پیش نظر ہم نے قوم پرست جرمن اشتراکی مزدور پارٹی کے رضا کاروں کی تنظیم کو بظاہر ایک دفاعی انجمن کی شکل میں کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی میرے اس طرز عمل کی وجوہات حسب ذیل تھیں:

کسی غیر سرکاری انجمن کے لیے قومی دفاع کی خاطر کوئی تنظیم قائم کرنا عملاً ناممکن ہے غیر سرکاری انجمن یہ کام تبھی انجام دے سکتی ہے جب سرکار اپنی غرض کے لیے معقول مالی امداد دے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ بغیر سرکاری ادارے کے غیر سرکاری کوششوں سے قوم کی دفاع کی خاطر کوئی تنظیم کھڑی کی جا سکتی ہے وہ خود اپنی استعداد اور طاقت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے فوج کی بنیاد ضبط و نظم پر ہوتی ہے کسی غیر سرکاری عسکری تنظیم میں ضبط و نظم محض ''رضا کارانہ اطاعت'' پر مبنی ہوتے ہیں فقط رضا کارانہ اطاعت سے عسکری ضبط و نظم کا حق کبھی ادا نہیں ہوتا۔ رضا کارانہ اطاعت سے جو ضبط و نظم قائم ہو گا وہ محض جزوی ہو گا صحیح معنوں میں عسکری تنظیم کے لیے کلی ضبط و نظم کی حاجت ہوتی ہے

جزوری ضبط و نظم سے کام نہیں چلتا۔ غیر سرکاری تنظیمات میں احکام کی تنقید کے لیے سب سے بڑی قوت یعنی نافرمانی کی صورت میں سزا دینے کا اختیار مفقود ہوتا ہے۔

1919ء کے موسم خزاں بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ موسم بہار تک رضا کارانہ تنظیمات قائم کرنا دو وجوہات سے ممکن تھا ایک تو جو لوگ ان تنظیمات میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے تھے وہ پرانی فوج کے تربیت یافتہ تھے ضبط و نظم ان کی طبیعت میں رچ چکا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت ان تنظیمات پر جو فرائض عائد کیے گئے تھے ان کی نوعیت ایسی تھی کہ ہر رکن کو کم از کم ایک معین مدت تک طوعاً و کرہاً اطاعت کرنی پڑتی تھی ان حالات میں سوائے اطاعت کے چارہ نہ تھا۔

غیر سرکاری عسکری تربیت موثر نہیں ہوتی

آج کل جو دفاعی تنظیمات قائم کی جا رہی ہیں ان میں یہ دونوں خصوصیتیں مفقود ہیں جوں جوں ایک دفاعی تنظیم میں توسیع ہوتی ہے توں توں اس کے ضبط و نظم میں کمزوری آجاتی ہے جس قدر ضبط و نظم میں کمزوری آتی ہے اتنا ہی ارکین کا جذبہ ایثار کم ہو جاتا ہے یوں ایسی تنظیم رفتہ رفتہ غیر سیاسی فوجی انجمنوں اور سابقہ فوجیوں کی مجالس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایک کثیر التعداد گروہ کو رضا کارانہ نظام کے ماتحت عسکری تربیت دینا محال ہے کسی کثیر گروہ کو رضا کارانہ نظام کے ماتحت عسکری تربیت دینا تبھی ممکن ہوتا ہے جب فرمانروائی کے متعلق اختیارات حاصل ہوں ایسے مٹھی بھر لوگ تو ہمیشہ تلاش کیے جا سکتے ہیں جو اپنی خوشی سے رضا کارانہ طور پر وہی اطاعت کیشی اختیار کرنے پر آمادہ ہوں جو ایک عسکری نظام میں عادت اور قانون کے ماتحت نافذ ہوتی ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہوتی ہے۔

غیر سرکاری عسکری تربیت فوجی مقاصد کے لیے مفید نہیں

دفاعی انجمنوں کے وسائل اور ذرائع مضحکہ خیز حد تک محدود تھے۔ ایسے مضحکہ خیز حد

تک محدود ذرائع اور وسائل سے عسکری تنظیم کا کوئی معقول انتظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ عسکری تربیت کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تربیت پانے والوں کو بہترین اور قابل اعتماد تربیت دی جائے۔ جنگ ختم ہوئے آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سطور ۱۹۲۶ء میں لکھ رہا تھا) اس دوران وہ جرمن نوجوان جو سابقہ حالات میں اپنی موجودہ عمر تک پہنچنے سے قبل عسکری تربیت حاصل کر چکے ہوتے ابھی تک باقاعدہ عسکری تربیت سے محروم ہیں۔ کسی دفاعی تنظیم کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ پہلے سے عسکری تربیت حاصل کر چکے ہیں ان کو فی الفور ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ اگر یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا تو دو اور دو چار کی طرح حساب لگایا جا سکتا ہے کہ ایسی تنظیم کا آخری تربیت یافتہ رکن کس سال تک ناکارہ ہو چکا ہو گا۔ ۱۹۱۸ء کا سب سے نوعمر سپاہی بھی بیس سال گزرنے کے بعد عسکری تربیت بجا لانے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ موجودہ رفتار سے وہ وقت دور نہیں جب عسکری تربیت یافتہ افراد کو یہ فقدان تشویش ناک صورت اختیار کر لے گا۔ یوں دفاعی انجمنیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سابقہ فوجیوں کی انجمن بن کر رہ جائیں گی۔ یہ صورت حال کسی بھی ایسی تنظیم کے لیے خوش آئند نہیں ہو سکتی۔ جب اپنے آپ کو سابقہ فوجیوں کی انجمن نہیں کہنا چاہتیں۔ بلکہ قومی دفاع کی انجمن بنانا چاہتی ہے۔ قومی دفاع کی انجمن کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ پرانے فوجیوں کی روایات برقرار رکھی جائیں۔ یا ان کے مل بیٹھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں بلکہ ایک دفاعی انجمن کا پہلا مقصد یہ ہو گا کہ قومی تحفظ کا جذبہ عام کیا جائے۔ اس جذبے کو عملی شکل دینے کے ذرائع استعمال کیے جائیں۔ مختصر الفاظ میں ایسے لوگوں کی تنظیم کی جائے جو عسکری دفاع کی خدمات دینے کی تربیت پانے کی استعداد رکھتے ہوں۔

عسکری تربیت فوجی نظام کے ماتحت ہی ممکن ہے

یہ تبھی ہو سکتا ہے جب اس تنظیم میں شامل ہونے والوں کو عسکری تربیت دینے کا انتظام ہو۔ بحالات موجودہ ایسی تربیت کا کوئی انتظام نہیں نہ ہی ایسا انتظام دفاعی

انجمنوں کے بس کی بات ہے۔ حقیقی معنوں میں تربیت یافتہ سپاہی ایک ہفتے میں دو یا تین گھنٹے کی تربیت سے پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ جدید ضروریات جنگ ہر سپاہی پر جو عظیم ذمہ داریاں عائد کرتی ہیں ان کا حق تبھی ادا ہوسکتا ہے جب ایک رنگروٹ کو تربیت یافتہ سپاہی بنانے میں دو سال خرچ کیے جائیں۔ یہ کم از کم میعاد ہے۔ جنگ کے ایام میں ہم نے محاذ جنگ پر دیکھا کہ ہمارے نوجوان رنگروٹوں کو ناکافی عسکری تربیت ملنے کے کیا خوفناک نتائج بھگتنا پڑے۔ رضا کاروں کے وہ دستے جنہیں پندرہ یا بیس ہفتے آہنی عسکری تربیت مل چکی تھی اور انہوں نے اس دوران میں اپنے آپ کو مثالی قربانی و ایثار کے نمونے ثابت کیا تھا' جب محاذ جنگ پر پہنچے تو سوائے توپوں کا نشانہ بن جانے کے اور کسی خدمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ نوجوان رنگروٹ جنہیں چھ مہینے تربیت دی جا چکی تھی صرف اسی صورت میں رجمنٹ کے لیے کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ جب انہیں تجربہ کار اور پرانے سپاہیوں کی صفوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ ''آزمودہ کار'' سپاہیوں کی رہنمائی میں یہ رنگروٹ بھی رفتہ رفتہ اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل بن جاتے تھے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا جاچکا ہے اس کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ہفتے میں ایک یا دو ہفتے عسکری تربیت دے کر کوئی فوج تیار نہیں کی جاسکتی۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ احکام صادر کرنے کے اختیارات بھی محدود ہوں' اور وسائل بھی ناکافی ہوں۔ اس طریقہ کار سے شاید پرانے فوجیوں کو دوبارہ تربیت دے کر ان کا نظم وضبط تازہ تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نئے رنگروٹوں کو باقاعدہ سپاہی نہیں بنایا جاسکتا۔

ملک کی حفاظت سرکار ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے

یہ طریقہ کار بالکل فضول ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ کسی پہلو سے تسلی بخش نہیں۔ اس طریقہ کار کا ناقص ہونا اس حقیقت سے واضح ہے کہ جہاں یہ نام نہاد رضا کارانہ دفاعی تنظیمات بڑا شور مچا کر اور زور لگا کر ہزار مشکل سے مطلوبہ وسائل کے بغیر چند ہزار نیک نیت افراد کو قومی دفاع کی تربیت دیتی ہیں وہاں خود ہماری سرکار

ہمارے نوجوانوں کو جمہوری اور صلح پسندانہ عقائد کی تلقین کر کے لاکھوں افراد کو قومی احساسات سے عاری بنا رہی ہیں۔ ان کا جذبہ حب وطن کے منطقی تقاضے مسخ کیے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ انہیں بھیڑیوں کے ایک ایسے ریوڑ میں تبدیل کیا جا رہا ہے جسے جو چاہے اور جدھر چاہے ہانک کر لے جائے۔ یہاں یہ تذکرہ نہیں چھیڑتا کہ رضا کارانہ تربیت حاصل کرنے والوں میں بھی سب نیک نیت نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کی یہ روش جرمن نوجوانوں کے دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی جو کوششیں دفاعی انجمنیں کر رہی ہیں۔ اسے ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ اس روشنی میں دفاعی انجمنوں کی سرگرمیاں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ جب کے باعث میں نے ہمیشہ رضا کارانہ تنظیمات کے ذریعہ عسکری تربیت دینے کی مخالفت کی ہے۔ وہ وجہ حسب ذیل ہے:

فرض کر لیجیے کہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود کوئی دفاعی انجمن ہر سال چند جرمنوں کو مستعد فوجی بنانے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ یہ بھی فرض کر لیجیے کہ یہ سپاہی صرف ذہنی لحاظ سے مستعد نہیں بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی مستعد ہے۔ اور ہتھیاروں کا استعمال بھی سیکھ چکے ہیں پھر بھی نتیجہ صفر ہی رہے گا۔ نتیجہ صفر رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی سرکار کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں جو قوم کی دفاعی تنظیم کو صرف غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتی ہے۔ ایک رضا کارانہ غیر سیاسی تنظیم کیا کر سکتی ہے۔ جب کہ قوم کے سیاسی قائدین سرکار کو قومی تحفظ کے لحاظ سے ناکارہ بنانے پر تلے ہوں۔

سرکار سے قوم کے دشمنوں کا خارج لازمی ہے

یہ تمام سرگرمیاں اس وقت تک ناکارہ ہیں جب تک خود سرکار اپنے اعمال و افعال سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے کہ قوم کی عسکری قوت کسی کام نہیں آ سکتی۔ اس سرکار کے کارندے قوم کو عسکری قوت اور سوائے اپنی بد بخت ذات کی حفاظت کے لیے اور کسی

کام کی خاطر استعمال کرنے پر آمادہ نہیں۔

یہ ہے آج کی صورت حال۔کیا یہ بات مضحکہ خیز نہ ہوگی کہ دس ہزار افراد کو ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت دی جائے۔ان کی تربیت کے انتظامات خفیہ رکھے جائیں' درآں حالیکہ ابھی چند سال بھی نہیں گزرے ہماری سرکار نے پچاسی لاکھ باقاعدہ تربیت یافتہ فوجیوں کو برخاست کر دیا تھا۔نہ صرف انکی خدمات غیر ضروری خیال کی گئیں بلکہ ان کی قربانیوں کا برسر عام تمسخر اڑایا گیا۔ہماری سرکار نے فوجیوں کی احسان شناسی کا یہ عملی ثبوت دیا کہ کیا ہم اپنے فوجی ایک ایسی حکومت کے لیے تیار کریں جس نے ہماری نامور ترین سورماؤں کے منہ پر تھوکا' ان کے سینے پر سے تمغے اور طغرے اکھاڑ کر پھینک دیے۔کیا موجودہ حکومت نے قدیم فوج کا وقار بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا ہے۔کیا حکومت نے ان لوگوں سے کوئی پرسش کی جنھوں نے ہماری قدیم فوج کو تباہ کر دیا۔اور اس کی ہتک کے مرتکب ہوئے۔ہرگز نہیں۔برعکس اس کے اس قسم کے لوگوں کو موجودہ حکومت کے ماتحت اعلیٰ ترین مناصب اور عہدے حاصل ہیں۔کیا ہمارے آباؤ اجداد نے لیپ زگ کے میدان میں یہ سبق حاصل نہ کیا تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔موجودہ جمہوری سرکار کے ماتحت لاٹھی انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے انقلاب برپا کیا تھا۔یہ انقلاب ہماری قوم کے خلاف بدترین غداری کے ارتکاب کی یادگار ہے۔جرمنی کی تاریخ میں اس سے زیادہ ذلیل غداری کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔اس قسم کی لاٹھی کو قومی اور مضبوط بنانے کی خاطر اگر ایک جدید فوج تیار کر بھی لی گی تو اس سے قوم کو کیا فائدہ ہوگا عقل سلیم اس طریقہ کار کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔

جب تک سرکار اپنی نہیں بنتی فوج اپنی نہیں بن سکتی

یہ سرکار ۱۹۱۵ء کے انقلاب کے بعد اپنی پوزیشن کو عسکری لحاظ سے مستحکم بنانے کی خاطر مضطرب تھی۔یہ حقیقت دفاعی انجمنوں کو وسیع پیانے کے متعلق موجودہ سرکار کی

پالیسی سے واضح اور یقینی طور پر ظاہر ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد جو دفاعی انجمنیں وجود میں آئیں ان کا اس وقت تک خیر مقدم کیا گیا۔ جب تک ان سے انقلاب کے بعد برسر اقتدار آنے والی ذلیل ہستیوں کی ذاتی حفاظت کا کام لیا جا سکتا تھا۔ جب قوم کا جذبہ حمیت رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا گیا اور برسر اقتدار پاجیوں کی ذات کو خطرہ بھی کم ہو گیا تو پھر ان دفاعی انجمنوں کی ضرورت نہ رہی۔ انہیں غیر ضروری تصور کیا گیا ان کے ہتھیار چھین لیے گئے۔ اور جس حد تک ممکن تھا انہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاریخ کے صفحات بادشاہوں کی بے وفائی سے بھرے پڑے ہیں۔ آج جدید کھاتے پیتے طبقات میں کوئی ایک محب وطن ایسا نہیں جو انقلابیوں سے احسان مندی کی توقع رکھ سکے۔ یہ انقلابی ہیں کون! گھروں کو آگ لگانے والے بے گناہوں کو قتل کرنے والے لوگوں کو لوٹ کر اپنی جیبیں بھرنے والے اور قوم سے غداری کرنے والے جب کبھی یہ دفاعی انجمنیں قائم کرنے کا مسئلہ میرے سامنے پیش ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو آخر کس کی خاطر عسکری تربیت دیں۔ وہ کون سا مقصد باقی رہ گیا ہے جس کے حصول کے لیے انہیں تربیت دینے کے بعد طلب کیا جا سکتا ہے۔ ان سوالات کے جوابات سے واضح ہو جائے گا کہ ہمیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

خائن سرکار کی فوج دشمنوں کی معاون اور رعایا کی دشمن ہوتی ہے

اگر موجودہ سرکار نے کبھی اس قسم کے رضا کارانہ تربیت یافتہ عسکریوں کو فوجی خدمت کے لیے طلب کیا تو اس کا مقصد ہرگز قوم کو اجنبیوں سے محفوظ رکھنا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہوگا کہ خود قوم کے اندر جو ظالم اور جابر حکمرانی کر رہے ہیں انہیں عوامی بغاوت کے خطرے سے بچایا جائے۔ جب قوم محسوس کرتی ہے کہ اسے دھوکہ دیا گیا' اس سے جو وعدے کیے گئے تھے' ان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور ملت کے مفاد پر مہلک زد پڑنے والی ہے تو پھر اس قسم کے حکمرانوں کو ہمیشہ قوم کی جانب سے بغاوت کا خطرہ

لاحق رہتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کے طوفانی دستے عسکری تنظیم کی شکل اختیار نہ کریں گے۔ ہمارے رضا کار صرف قوم پرست اشتراکی تحریک کے تحفظ اور تبلیغ کی خاطر منظم کیے گئے۔ ان کے فرائض عسکری دفاعی تنظیمات سے قطعاً مختلف تھے۔

خفیہ انجمنیں سیاسی مقاصد حاصل نہیں کرسکتیں

طوفانی دستے کوئی خفیہ تنظیم نہ تھے۔ خفیہ تنظیمات تبھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ جب ان سے قانون کے خلاف کوئی کام لینا ہو۔ غرض خفیہ تنظیم کا مقصد اس کی نوعیت سے ہی ایک دائرے تک مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ جرمن قوم کیسی باتونی ہے یہاں کوئی وسیع تنظیم خفیہ نہیں رکھی جاسکتی۔ جرمنی میں کوئی وسیع تنظیم قائم کی جائے تو اس کا مقصد اور وجود دونوں پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ یہاں کوئی خفیہ تنظیم قائم کرنے کی کوشش بالکل فضول ہے۔ علاوہ ازیں آج کل ہمارے پولیس کے حکام کے پاس جاسوسوں اور مخبروں کی ایک ایسی فوج ہے جو ہمیشہ چاندی کے سکے لے کر ہر راز افشا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ جہاں کوئی راز نہ ہو وہاں وہ بہتان تراشنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس قسم کے امکانات کا راستہ بند کرنے کے لیے مقلدین کے منہ پر خاموشی کی مہر لگانا ممکن نہیں۔ بغیر مقلدین کی خاموشی کے کوئی تحریک خفیہ نہیں رہ سکتی۔ خفیہ انجمنیں صرف چند افراد تک محدود رکھی جائیں تو تبھی خفیہ رہتی ہیں ایسے چند افراد کی تلاش کرنے میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے مٹھی بھر لوگوں کی قلت تعداد ہی انہیں قوم پرست اشتراکی تحریک کا مقصد پورا کرنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ ہمیں تب اور آج بھی دو دو جان پر کھیل جانے والے سازشیوں کی حاجت نہ تھی اور نہ رہے۔ ہمیں تو اپنے ضابطہ حیات پر مخلصانہ ایمان رکھنے والے لاکھوں پیرووں کی حاجت ہے۔ یہ کام خفیہ مشوروں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ کام تو عظیم الشان عوامی مظاہروں کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ خنجر

پستول یا زہر کی شیشی سے تحریک کو وسعت دینے اور پھیلانے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ تحریک کی توسیع صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ بازاروں میں چلنے پھرنے والی عام مخلوق کو دلوں سے موہ لیا جائے۔ ہم نے مارکس ازم کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ مستقبل میں قوم پرست اشتراکیت کا گلی کوچوں پر تسلط ہو کر رہے گا۔ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب خود سرکار پر اسی تحریک کا قبضہ ہوگا۔

بالعموم افراد کے قتل سے قوموں کی قسمت تعمیر نہیں ہو سکتی

خفیہ انجمنوں کے ساتھ اور خطرہ بھی وابستہ ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ خفیہ انجمنوں کے اراکین بسا اوقات اپنے مقصد کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں انہیں وہم ہو جاتا ہے کہ بس ایک شخص کو قتل کرنے سے قوم کی نجات کا سامان ہو جائے گا۔ ملت کی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے گی۔ اس وہم کو یوں بھی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ تاریخ میں اکا دکا ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ جب کوئی قوم کسی ایک ظالم کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا تھی۔ ایسا تبھی ممکن ہوتا یہ جب وہ ظالم غیر معمولی قابلیت کا مالک ہو۔ اس غیر معمولی قابلیت کے باعث اسے خاص اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کا ظلم و ستم اور جبر ان خاص اختیارات کا نتیجہ ہوتا ہے ایسی صورت حال میں اگر مظلوم قوم کا کوئی ایک فرد اٹھ کر اپنے آپ کو قربان کر دے اور موت کا خنجر ظالم دشمن کے جگر میں پیوست کر دے تو قوم کو اس بد بخت ظالم سے نجات مل جاتی ہے۔ ایسا کارنامہ ہرگز قابل نفرین نہیں۔ ان کارناموں کو وہی جمہوریت پرست ذلیل لوگ قابل نفرین سمجھتے ہیں جنہیں خود اپنے جرم کا احساس ہے۔ جرمن قوم کی تاریخ میں سب سے بڑا حریت پرست شلر تھا۔ اس نے ولیم ٹل نامی ڈرامہ میں ایک ایسے شہید کا کردار پیش کیا ہے۔ اس نے اس کردار کو قابل نفرین نہیں بلکہ قابل تحسین قرار دیا ہے۔

قتل سے قوم کو صرف تب فائدہ پہنچتا ہے جب کسی غیر معمولی انسان سے مقابلہ ہو

۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک یہ خطرہ لاحق تھا کہ کسی خفیہ انجمن کے اراکین قومی زبوں حالی کی شدت سے مضطرب ہو کر اور تاریخ میں ایسے کارناموں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہیں ان لوگوں سے انتقام لینے کی کوشش نہ کریں جو وطن کی بربادی کا باعث بنے ہوئے۔ یوں مضطرب ہو کر ایسی حرکت کا ارتکاب کرنے والے کی نیت تو یہی ہوتی ہے کہ قوم کو زبوں حالی سے نجات دلائی جائے۔ لیکن ایسی کوششیں سراسر احمقانہ ہوتی ہیں۔ مارکس ازم کی کامیابی کسی ایک فرد کی غیر معمولی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی۔ مارکس ازم کی کامیابی تو کھاتے پیتے طبقات کی بزدلانہ نافرض شناسی اور انتہائی نااہلیت کا نتیجہ تھی۔ ہمارے کھاتے پیتے طبقات کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے انقلاب کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔ حالانکہ اس انقلاب نے غیر معمولی قابلیت کا ایک آدمی بھی پیدا نہیں کیا۔ یہ تو سمجھا جا سکتا ہے کہ رولپیری، ڈینٹن اور مراط کی غیر معمولی قابلیت کے سامنے لوگ کیوں سر جھکا دیتے تھے۔ لیکن یہ دوں ہمتی تو شرمناک تھی کہ پیر فرتوت شیڈین فریہ اغلام ہرارزبر جر فریڈرک ایبرٹ اور اس قسم کے دوسرے لاتعداد سیاسی مسخروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے گئے۔ جرمن انقلاب کے قائدین اسی حیثیت کے لوگ تھے۔ اس انقلاب میں کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جسے بطل عظیم کہا جا سکتا۔ یہ قوم کی بدترین بدقسمتی تھی کہ انقلابیوں کی صفوں میں ہر شخص یا کوئی کھٹمل تھا یا کوئی چوہا۔ ان میں سے کسی کو قتل کرنا کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکتا تھا۔ ایسے قتل کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ پرانی جونکیں اتار کر تازہ دم پیاسی اور موٹی جونکیں ان کی جگہ لینے کو آموجود ہوتی ہیں۔

اس زمانہ میں چند سال ایسے گزرے ہیں کہ ہمارے سیاسی حریفوں کو قتل کرنے کی تجویز کے خلاف ایک باقاعدہ مہم لڑنی پڑی۔ یہ تجویز اس لیے سامنے آتی تھی کہ تاریخ اس قسم کی عظیم قربانیوں کی قابل احترام مثالیں موجود ہیں۔ ان قابل احترام مثالوں کی تقلید موجودہ زمانے میں مفید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ زمانہ ہر لحاظ سے انحطاط اور زوال کا

شکار ہے۔ آج کل دشمن بھی ایسے پست حیثیت کے ملتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو ختم کر دینے سے مقصد کو تقویت نہیں پہنچتی۔

دشمنوں کو قتل کرنے میں دوستوں کو ضائع نہ کرنا چاہیے

یہی دلیل اس وقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے جب یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ ہر موقعہ پر غداری کرنے والے کو وہیں ختم کر دیا جائے۔ جب حکومت کے بڑے عہدوں اور اعلیٰ ترین مناصب پر وہ فسادی اور بلوائی قابض ہیں جنہوں ں ے ایک عظیم الشان سلطنت دشمن کے ہاتھ فروخت کر دی جنہوں نے بیس لاکھ فرزندان وطن کی قربانیوں پر پانی پھیر دیا۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں اپاہج ہو جانے والے لاکھوں زخمیوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر بلیک مارکیٹ میں نفع کمائے اور جن کے ضمیر نے جمہوری سرکار کا قیام عمل میں لاتے ہوئے ذرا ملامت نہ کی تو کیا یہ بات مضحکہ خیز اور خلاف عقل نہ ہو گی کہ جس بد بخت جرمن نے جنگ ختم ہو جانے کے بعد اتحادیوں کو کسی چھپائی ہوئی توپ کی نشان دہی کر دی اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔ جس سرکار کی حکومت نے بڑے بڑے غداروں کو کسی قسم کی سزا سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے اور معمولی غداروں کو مار ڈالنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک مخلص اور اصول پرست محبّ وطن کسی پاجی مخبر کو قتل کر دینے کی پاداش میں خود بھی سزائے موت پا سکتا ہے مخبر نے تو صرف جرمنی کے چھپے ہوئے اسلحہ خانوں کی اطلاع دشمن تک پہنچائی تھی۔ لیکن یہ محب وطن غازی تو ملکے غداروں کے سامنے کھلی عدالت میں پیش ہو گا۔ اور وہاں اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم سوال بھی قابل غور ہے۔ کیا حقیر غداروں کو اسی قسم کے حقیر غداروں کی مدد سے ختم کرنا بہتر ہے یا ایک غدار کے مقابلے میں ایک عالی شان اصول پرست بھائی کا مروا ڈالنا بہتر ہے۔ ایک حقیر غدار کو دوسرے حقیر غدار سے مروانے کی کوشش میں نقص صرف یہ ہو گا کہ پہلے سے ی یقین نہ ہو سکے گا کہ واقعی غدار کو سزا دینے میں کامیابی ہو گی یا نہیں۔ یا کامیابی ہو

بھی گئی تو اپنا منصوبہ بعد میں افشا ہو جانے کا خطرہ ہوگا۔ دوسری صورت میں ایک ذلیل پاجی کی موت یقینی ہو گی لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ایک اصول پرست ساتھی کی ذات سے محروم ہو جائیں گے۔ اصول پرست اور مخلص ساتھی ہر وقت آسانی سے فراہم نہیں ہوتے۔ کسی نازک وقت میں ایسا ایک ساتھی میسر ہونے یا نہ ہونے پر ساری مہم کا دارومدار ہو سکتا ہے۔

چھوٹے غداروں کو مارنے سے پہلے بڑے غداروں کو سزا دینے کی ضرورت ہے

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک بڑے بڑے چوروں کو آزاد پھرتے ہیں تب تک چھوٹے چھوٹے چوروں کو بھی سولی پر نہ چڑھانا چاہیے۔ ایک دن ایک قومی عدالت قائم ہو گی۔ اس عدالت کے سامنے وہ ہزار مجرم پیش ہوں گے جنہوں نے ماہ نومبر میں انقلاب برپا کر کے قوم سے غداری کا ارتکاب کیا تھا۔ اس انقلاب کے جو نتائج بد جرمن قوم کو بھگتنے پڑے ان سب کی ذمہ داری ان مجرموں کے سر پر ہے۔ ان مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔ ان سزاؤں سے ان چھوٹے موٹے غداروں کو سبق مل جائے گا۔ جنہوں نے ہماری چھپے ہوئے اسلحہ کے ذخیروں کی مخبری کی تھی۔

ان تمام کوائف پر نگاہ رکھتے ہوئے میں نے مستقل مزاجی سے ہر قسم کی خفیہ انجمنوں میں شرکت ممنوع کر دی۔ میں نے احتیاط ملحوظ رکھی کہ طوفانی دستے ایک خفیہ انجمن نہ بن جائیں۔ میں نے اس زمانہ میں قوم پرست اشترا کی تحریک کو ان سرگرمیوں میں حصہ لینے سے باز رکھا جن میں بعض نوجوان مصروف تھے۔ ان جوانوں کی نیتیں پاکیزہ اور عزائم بڑے بلند تھے لیکن وہ اپنی سرگرمیوں کے ہاتھ خود نقصان اٹھاتے تھے اور ان کی قربانیوں سے مادر وطن کی اذیت میں کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا۔

غرض اگر طوفانی دستوں نے عسکری نوعیت کی دفاعی انجمن بھی نہیں بننا اور خفیہ انجمن

کی صورت بھی اختیار کرنا نہیں تو اس سے مندرجہ ذیل اصول اخذ ہوتے ہیں:

رضا کاروں کو کس قسم کی تربیت ملنی چاہیے

۱۔ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم عسکری زاویہ نگاہ سے انجام نہ دی جائے گی۔ اس تنظیم میں صرف یہ ملحوظ رکھا جائے گا کہ تحریک کی فوری عملی ضروریات کس طرح پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس تنظیم کے اراکین کو اعلیٰ جسمانی تربیت دینا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا ان دونوں تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ زور فوجی ڈرل پر نہ دیا جائے۔ بلکہ رضا کاروں کو چست و چالاک بنانے کے لیے کھیلوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ میرے رائے میں مکہ بازی کی عملی تربیت اور اکھاڑے پر بانگ پٹہ کے چند ملتے جلتے داؤں کی مشق رائفل چلانے کی ناقص اور ناکارہ تربیت سے زیادہ مفید ہے اگر جرمن قوم کو ایسے نوجوان مہیا کر دیے جائیں جو مجاہدانہ کھیلوں کی ریاضت کر چکے ہوں۔ جن کے دل میں حب وطن کا ولولہ ہو جو لڑائی کی صورت میں پہل کرنے سے نہ جھجکتے ہوں تو ایک قومی سرکار کے قیام کے بعد ایسے نوجوانوں سے دو سال کے اندر زبردست لشکر تیار کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تربیت دینے کے لیے مستقل فوجی نظام میں ہر درجہ کے افسر موجود ہوں۔ ایسے تربیت دینے والے فوجی افسر صرف ہماری قومی فوج ہی مہیا کر سکتی ہے۔ یہ کام کسی دفاعی انجمن کا نہیں دفاعی انجمنوں کے پاس تو تربیت یافتہ افسر ہیں اور نہ کوئی مستقل نظام۔ جسمانی ریاضت سے مستعد اور چاق و چوبند ہو کر فرد میں اپنی برتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ انفرادی برتری کا یہ احساس تبھی بیدار ہوتا ہے جب مشق اور ریاضت سے فرد میں تندرستی اور اخوت کا شعور پیدا ہو چکا ہو۔ ہمارے رضا کاروں میں جسمانی بھرتی پیدا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان رضا کاروں سے تحریک کی خدمت لے کر انہیں اس پھرتی اور مستعدی کی تربیت دی جا سکتی ہے۔

تحریک کو سازش کا رنگ اختیار کرنے سے بچانا چاہیے

۲۔ طوفانی دستوں کو خفیہ کارروائیوں کی جانب کوئی رجحان اختیار کرنے سے

بچانے کی خاطر ایک طرف تو ان کی وردی ایسی رکھی گئی ہے جسے ہر شخص شناخت کرسکتا ہے۔ دوسرے ان رضا کاروں کی ایسی کثیر تعداد شامل کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کا رخ کس طرف ہے۔ گویا تحریک نوعیت کے متعلق عوام میں کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ طوفانی دستوں میں شامل ہونے والے رضا کار کبھی خفیہ جلسے منعقد نہیں کرتے۔ وہ کھلے بندوں عوام کے سامنے پریڈ کرتے ہیں۔ یوں خفیہ تنظیم کے متعلق تمام افواہوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ ان رضا کاروں کو چھوٹی چھوٹی سازشوں میں شرکت کرنے سے بچانے کے لیے شروع ہی سے ان کے ذہن پر تحریک کے بلند عزائم نقش کیے جارہے ہیں انہیں ان مقاصد کی تبلیغ کے لیے ایسی مکمل تعلیم دی جاتی ہے جس سے ان میں وسعت نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تعلیم کے بعد ہمارا کوئی رضا کار اپنا فرض یہ نہیں سمجھتا کہ کسی چھوٹے درجے یا بڑے درجے کے بدمعاش کو قتل کر دیا جائے بلکہ وہ اپنا فرض یہ سمجھتا ہے کہ ایک جدید قوم پرست اشتراکی عوامی سرکار کے قیام کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ یوں موجودہ سرکار کے خلاف جدوجہد انتظام اور چھوٹی چھوٹی سازشوں پست سطح پر نہیں' بلکہ ایک بلند تر سطح پر لڑی جارہی ہے۔ وہ بلند تر سطح یہ ہے کہ ایک نئے ضابطہ حیات کی کامیابی کے لیے ایک روحانی اور اخلاقی جہاد کیا جارہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مارکس ازم کو ہر صورت اور ہر نوعیت میں ختم کر دیا جائے۔

اپنی تنظیم کو دوسری متوازی تنظیمات سے ممتاز رکھنا چاہیے

۳۔ طوفانی دستوں کی تنظیم کی ہیئت تشکیل اور ان کی وردی اور ساز و سامان کا تعین کرتے وقت یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی کہ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم' قدیم فوج سے بالکل ممتاز رکھی جائے۔ ان رضا کاروں کو ان خاص ضروریات کے مطابق بنانا تھا' جنہیں پورا کرنے کے لیے طوفانی دستوں کی تنظیم عمل میں آئی تھی۔

یہ وہ اصول تھے جن پر میں ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک عمل کرتا رہا۔ میں نے کوشش کی کہ ہماری نوعمر تحریک کے اراکین بھی یہ اصول سرایت کر جائیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ

۱۹۲۱ء کے وسط گرما تک ہمارے پاس ایسے دستوں کی خاصی تعداد مہیا ہوگئی تھی۔ ہر دستے میں سو رضا کار ہوتے تھے۔اسی سال موسم خزاں کے اختتام تک ہمارے رضا کاروں کی تنظیم کے مختلف درجوں کی خصوصی وردیاں معین کر دی گئیں۔اس کے بعد تین ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے بعد میں طوفانی دستوں کی تنظیم پر زبردست اثر ڈالا۔

ہمارے رضا کاروں کا پہلا عوامی مظاہرہ

(الف) جمہوری سرکار کے تحفظ کے لیے جو سیفٹی ایکٹ منظور کیا گیا تھا۔اس کے خلاف ہمارے زبردست عوامی مظاہرہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ مظاہرہ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما کے اختتام میں میونچ شہر کے کونش پلاٹز میں سب محبّ وطن جماعتوں کی جانب سے منعقد کیا گیا۔قوم پرست اشترا کی تحریک نے بھی اس مظاہرے میں حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے اراکین منظم فوجی شکل میں پریڈ کرتے ہوئے سڑکوں سے گزرے۔ان کی ایک ایک ٹولی جدا جدا مارچ کر رہی تھی۔میونچ کے رضا کاروں کے چھ دستے جن میں سے ہر ایک کے اندر سو رضا کار تھے سب سے آگے تھے۔اس کے بعد پارٹی کے سیاسی شعبوں میں کام کرنے والے اراکین تھے۔ ہمارے ساتھ وہ بینڈ بجتے ہوئے جا رہے تھے۔ پندرہ جھنڈے ہمارے ہمراہ تھے۔جب قوم پرست اشترا کی بڑے چوک میں پہنچے تو جلسہ گاہ نیم پر تھی۔لیکن وہاں کوئی جھنڈا نہ لہرا رہا تھا ہماری آمد سے بے اندازہ جوش وخروش پیدا ہوا۔یہاں قریباً ساٹھ ہزار حاضرین کا اجتماع تھا۔اس جلسہ میں جن مقررین نے حصہ لیا ان میں بھی شامل تھا۔

اس مظاہرے کو بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی۔ بڑی بات یہ تھی کہ پہلی مرتبہ ثابت ہوگیا کہ میونچ کے قوم پرست بھی سڑکوں پر مارچ کر سکتے ہیں۔سرخوں کی دھمکیاں انہیں باز نہیں رکھ سکتیں۔ ہماری سرخ سرکار کے تحفظ کے لیے جو رضا کار تنظیمات کام کر رہی تھیں انہوں نے حسب معمول اپنے حربوں سے ہمارے جلوس کی مختلف ٹکڑیوں کو منتشر کر دیا اور وہ اپنی لہولہان کھوپڑیاں سہلاتے ہوئے رخصت ہوئے۔قوم پرست

اشترا کی تحریک نے پہلی دفعہ ثابت کر دیا تھا کہ ہم نے آئندہ سڑکوں پر مارچ کرنے کے لیے اپنے حقوق استعمال کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ہم سڑکوں پر مارچ کرنے کا حق صرف بین الاقوامیت کے حامی غداروں اور وطن کے دشمنوں کے لیے وقف کرنے پر تیار نہیں۔

شہر سے باہر رضا کاروں کی پہلی مہم

اس دن کے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ طوفانی دستوں کی تربیت کے متعلق ہمارے خیالات صحیح تھے۔یہ خیالات صرف نفسیاتی لحاظ سے درست نہ تھے بلکہ ان پر عمل کرتے ہوئے ہم نے جو تنظیم قائم کی تھی وہ بھی کارآمد ثابت ہوئی۔

اس کامیابی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے رضا کاروں کی صفوں میں زیادہ لوگ شامل ہونے لگے۔اس بھرتی کی رفتار اتنی تیز کہ ہر چند ہی ہفتوں میں میونچ کے اندر سو سو رضا کاروں کی ٹولیوں کی تعداد پہلے سے دگنی ہو گئی۔

(ب) دوسرا اہم واقعہ ہماری وہ مہم تھی جو اکتوبر ۱۹۲۲ء میں کوبرگ کے قصبہ تک بھیجی گئی۔

بعض عوامی انجمنوں نے کوبرگ کے قصبہ میں اوم جرمنی منانے کا فیصلہ کیا۔مجھے بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔دعوت نامہ میں ذکر تا کہ مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ میں اپنے مقلدین کو بھی ہمراہ لاؤں گا۔مجھے یہ دعوت نامہ ۱۱ بجے قبل از دوپہر ملا۔وقت تھوڑا ہی باقی تھا۔ایک گھنٹے میں ہماری شمولیت کے تمام انتظامات طے ہو گئے۔ہم جرمن کانگریس میں شمولیت کے لیے تیار تھے۔میں نے طوفانی دستوں کے ساتھ آٹھ سو رضا کار اپنے ہمراہ لے جانے کی خاطر منتخب کیے۔یہ رضا کار قریباً چودہ ٹولیوں میں منقسم تھے۔انہیں میونچ سے کوبرگ لے جانے کے لیے ایک سپیشل ٹرین استعمال کی گئی۔کوبرگ میں تھوڑا ہی عرصہ پہلے استصواب رائے ہو چکا تھا۔اس استصواب رائے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کوبرگ کے بویریا میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تھا۔قوم پرست اشترا کی

طوفانی دستوں کی جا شا کیں اس دوران میں بعض دوسرے مقام پر قائم ہو چکی تھیں انہیں بھی شمولیت کے احکام بھیجے جا چکے تھے۔

جرمنی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس قسم کی ٹرین چلائی گئی۔ تمام ایسے مقامات پر جہاں سے طوفانی دستوں کے رضا کار ہماری ٹرین میں آ کر سوار ہوئے ایک سنسنی پھیل گئی۔ کئی لوگوں نے پہلی بار ہمارا جھنڈا دیکھا تھا۔ ہر دیکھنے والا ہم سے بہت متاثر ہوا۔

قائد میں قوت فیصلہ، استقلال اور خودداری کی ضرورت ہوتی ہے

جب ہم کوبرگ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو یوم جرمنی منانے والوں کا ایک وفد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ مقامی ٹریڈ یونینوں کی ہدایات کے ماتحت یہ طے کیا گیا ہے کہ ہم اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہوں گے۔ نہ ہی ہمارے ساتھ بینڈ بجتا ہوا جائے گا۔ ہمارے ساتھ بیالیس موسیقار پر مشتمل ایک بینڈ بھی تھا۔ یہ بھی طے پا چکا تھا کہ ہم باقاعدہ پریڈ کرتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہوں گے یہ مقامی ٹریڈ یونینیں دراصل آزاد کمیونسٹ پارٹیاں تھیں۔ جنہوں نے اپنا نام ٹریڈ یونین رکھ چھوڑا تھا۔

میں نے فی الفور یہ شرائط جو ہماری عسکری شان کے خلاف تھیں نامنظور کر دیں۔ جن بزرگوں نے اس یوم کو منانے کا فیصلہ کیا تھا میں نے ان کو اس امر سے آگاہ کرنے میں کوئی توقف نہ کیا کہ میں حیران ہوں آپ اپنے حریفوں سے اس قسم کی گفت وشنید کیوں کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ ایسے معاہدات میں کیوں شریک ہوتے ہیں پھر میں نے اعلان کیا کہ ہمارے طوفانی دستے اسی وقت فوجی تربیت شہر میں داخل ہوں گے۔ ہمارے جھنڈے لہراتے ہوئے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اور ہمارا بینڈ بھی بجتا ہوا ہمراہ ہوگا۔

چنانچہ میری ہدایات پر عمل کیا گیا۔

جب ہم سٹیشن سے اترے تو وہاں کئی ہزار افراد کا ہجوم کھڑا شور مچا رہا تھا۔ اور نعرے

لگا رہا تھا کہ ان کے نعرے کچھ اس قسم کے تھے ''قاتل'' ''ڈاکو'' لٹیرے مجرم یہ تھے وہ خطابات جن سے جرمن جمہوری سرکار قائم کرنے والے یہ شرفا ہمیں نواز رہے تھے ۔طوفانی دستوں کے جوانوں نے ضبط و نظم کا قابل تعریف نمونہ پیش کیا۔ ہر ایک ٹولی ترتیب کے ساتھ اپنی اپنی جگہ ریلوے سٹیشن کے باہر صحن میں جمع ہوگئی مجمع جو توہین آمیز نعرے کے ساتھ اپنی جگہ ریلوے سٹیشن کے باہر سٹیشن میں جمع ہوگئی۔ مجمع جو توہین آمیز نعرے لگا رہا تھا ان کی کچھ پرواہ نہ کی گئی ۔پولیس والوں کو یہ تشویش ہو رہی تھی کہ پولیس نے ہمیں ہمارے جائے رہائش پر لے جانے کے لیے اصرار نہ کیا۔ ہمارے جائے رہائش کوبرگ کے قصبے سے باہر ایک طرف واقع تھی ۔ہم ابھی اس قصبے سے ناواقف تھے ۔ پولیس ہمیں قبضے کے وسط میں ہاف براؤ ہوئس کیلر تک لے گئی جو قصبے کے وسط میں تھا۔ جب ہم سڑک پر مارچ کرتے ہوئے جا رہے تھے تو ہمارے دائیں بائیں ہجوم بھی دوڑتا جا رہا تھا۔ ہجوم کا شوروغوغا ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہماری آخری ٹولی ہاف براؤ ہاؤس کے صحن میں جونہی داخل ہوئی ہجوم دیوانہ وار نعرے لگاتا ہوا ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تمام ہجوم نے ہلہ بول دیا پولیس نے اس حملہ کو روکنے کے لیے صحن کے دروازے بند کر دیے۔ میں نے دیکھا کہ اس طرح محصور ہونے سے کام نہ چلے گا۔ میں نے طوفانی دستوں کو حکم دیا کہ ہوشیار ہو کر سکون سے کھڑے ہو جائیں۔ پھر میں نے پولیس والوں سے کہا کہ دروازے کھول دیجیے۔ پولیس نے بڑے تامل کے بعد آخر دروازے کھول دیے۔

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

ہم جس راستے سے واپس آئے تھے اسی راستے سے مارچ کرتے ہوئے واپس چلے گئے ۔ہم اب اپنی قیام گاہ کی طر جا رہے تھے۔ قیام گاہ پر پہنچ کر ہمیں ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سارے راستے میں ہجوم کا شوروغوغا اور نعروں نے ہمارے رضا کاروں کو بالکل مضطرب نہ کیا۔ اشتراکیت' مساوات اور اخوت کے حامیوں نے ہم پر پتھر برسانے

شروع کیے۔اس پر ہمارے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا۔دس منٹ تک دائیں بائیں وہ ضربیں پڑیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اولے برس رہے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد سڑک پر کوئی ایک سرخا بھی نظر نہ آ رہا تھا۔

رات پڑنے پر جو تصادم شروع ہوا اس نے زیادہ سنگین صورت حال اختیار کر لی۔ طوفانی دستوں کی جو ٹولیاں پہرے پر مقرر تھیں انہیں معلوم ہوا کہ بعض اکا دکا قوم پرست اشتراکیوں پر حملہ کر کے ان کی ایسی درگت بنائی گئی تھی کہ توبہ ہی بھلی اس پر ہم نے بھی اپنے حریفوں کی خبر لینے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز صبح تک کوبرگ میں سالہا سال سے سرخوں نے اپنا جو رعب اور تسلط قائم کر رکھا تھا اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مارکس ازم کے حامیوں اور یہودیوں کا خاص قاعدہ ہے کہ جھوٹ پھیلانے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے بازاروں میں ایسے پمفلت تقسیم کیے گئے جن کا عنوان تھا بین الاقوامی کنگالوں کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے مزدور مرد اور مزدور عورتو۔ ان کتابچوں میں ہجوم کو ہمارے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا کہ ہماری ڈاکوؤں کی ٹولیوں نے کوبرگ شہر کے پرامن مزدوروں کے خلاف قتل و غارت کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس روز ڈیڑھ بجے بعد از دوپہر ''ایک عظیم الشان عوامی مظاہرے'' کا اعلان بھی کیا گیا۔ توقع یہ تھی کہ اس مظاہرے میں سارے ضلع کے مزدور شامل ہوں گے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اس سرخ دبدبے اور تغلب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ میں نے طوفانی دستوں کو حکم دیا کہ دوپہر کے وقت ان کا اجتماع ہو گا۔ ان کی تعداد اب پندرہ رضا کار دستوں تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان جوانوں کو ہمراہ لے کر کوبرگ کے میلے میں شمولیت کروں گا اور قصبے کے اس بڑے چوک سے بھی گزروں گا جہاں سرخوں نے مظاہرہ کرنا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا ان میں ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کی جرات ہے۔ جب ہم چوک میں پہنچے تو دیکھا کہ جن دس ہزار مظاہرین کا اعلان اشتہار میں کیا گیا تھا۔ ان کی جگہ صرف چند سو افراد

وہاں پر موجود تھے ۔ جب ہم وہاں پہنچے تو یہ لوگ زیادہ تر خاموش رہے اور کچھ وہاں سے بھاگ نکلے ۔صرف راستے میں بعض مقامات پر جو سرخے شہر کے باہر نظر اائے تھے اور ابھی ہمارے واقف نہ ہوئے تھے انہوں نے بھی کہیں کہیں ٹوکنے کی کوشش کی ۔ لیکن ایک آدھ ڈھول کھا کر وہ بھی رفو چکر ہو گئے ۔ وہ نظارہ دیکھنے کے قابل تھا کہ قصبے کے عوام جو اتنے عرصہ سے ہمت ہار چکے تھے کس طرح آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے ۔ اوران کے اوسان برقرار ہو گئے ۔ ہمیں خوش آمدید کہا گیا شام کے وقت جب ہم واپسی کے لیے مارچ کررہے تھے تو راستے میں جا ربجا خود بخود مسرت اور خوشی کے نعرے لگا رہے تھے ۔

کبھی جان پر بھی کھیل جانا چاہیے

اسٹیشن پر ہمیں ریلوے کے ملازمین نے یکلخت مطلع کیا کہ کاریگروں نے ہڑتال کر دی ہے اس لیے ہماری ٹرین نہیں چلائی جا سکتی ۔ اس پر میں نے ہڑتالیوں کے چودھریوں کو بلا کر دھمکی دی کہ اگر ہماری ٹرین روانہ نہ ہوئی تو میں ابھی حکم دے کر سرخ پارٹی کے تمام قائدین کو گرفتار کر لوں گا۔ جو ہمارے ہتھے چڑھ جائے اسے تو ہم چھوڑتے نہیں ۔ ہم اپنی ٹرین خود چلالیں گے ۔ اوران سرخ چودھریوں کو بھی بطور یرغمال اپنے پاس رکھیں گے ۔ ان سرخ چودھریوں میں سے بعض کو انجمن کے کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ بعض کو گاڑی کے آخری کمرے میں قید کر دیا جائے گا۔ اور بعض کو درمیانی گاڑیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح بین الاقوامی اتحاد کی اس برادری میں چند درجن افراد ہمارے ہمراہ سفر کریں گے ۔ میں نے ان شرفا پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ گاڑی ہمیں خود چلانی پڑی تو اس میں سب کی جان کو خطرہ ہوگا۔ ہمیں اپنی گاڑی چلانی تو آتی نہیں ۔ ہمارے ساتھ ان چودھریوں کی جان بھی خطرے میں ہوگی ۔ اگر ہماری گردن ٹوٹ گئی تو ہمیں کم از کم یہ تسلی رہے گی کہ ہم عدم آباد تنہا نہ پہنچیں گے ۔ بلکہ ہمارے ساتھ مساوات اور اخوت پر یقین رکھنے والے چند سرخ شرفا بھی ہمراہ ہوں

گئے۔

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا گاڑی وقت پر روانہ ہوگئی اور دوسرے روز صبح ہم صحیح سالم میونخ پہنچ گئے۔

یوں ۱۹۱۴ء کے بعد پہلی مرتبہ کوبرگ کے قصبے میں ثابت کر دیا گیا کہ قانون کے سامنے تمام شہریوں کی حیثیت یکساں ہے۔آج کوئی بر خود غلط اعلیٰ حاکم اگر یہ دعویٰ بھی کرے کہ سرکار اپنے تمام شہریوں کی جان کی محافظ ہے تو کم از کم ان دنوں اس اصول پر عمل نہ ہوتا تھا۔ان دنوں تو شہریوں کو اپنی جان ان لوگوں سے خود بچانی پڑتی تھی۔ جو آج موجودہ سرکار پر قابض ہیں۔

کامیابی سے کامیابی کا راستہ کھلتا ہے

شروع شروع میں ہمیں یہ اندازہ نہ ہوا کہ اس روز کے واقعات کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ان واقعات سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔کامیابی حاصل کرنے کے بعد طوفانی دستوں کی خوداعتمادی ترقی کر گئی۔انہیں اپنی قیادت کی معاملہ فہمی پر بھروسہ ہوگیا۔ ہمارے معاصرین ہماری جانب خاص توجہ دینے لگے۔پہلی مرتبہ کئی لوگوں نے اقرار کرنا شروع کیا کہ قوم پرست اشتراکیت تحریک ایک ایسی تنظیم ہے جو شاید وقت آنے پر مارکس ازم کی حمایت مابی سے قوم کو نجات دلائے گی۔

صرف جمہوریت پرست یہ واویلا مچاتے رہے کہ ہم نے اپنی کھوپڑیاں توڑنے کی اجازت کیوں نہ دی۔ایک جمہوری سرکار کے ماتحت ہمیں یہ جرات کس طرح ہوئی کہ جب ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم نے مکوں اور لاٹھیوں سے جواب دیا۔ہمیں تو چاہیے تھا کہ امن کے راگ گاتے رہتے۔

کھاتے پیتے اخبارات کی اکثریت نے یا تو افسوس ظاہر کیا یا بازاری الفاظ میں ہماری مذمت کی۔صرف چند شریف اخبارات نے اطمینان ظاہر کیا کہ کم از کم ایک علاقے میں تو بازاروں میں دہشت پھیلانے والے مارکس ازم کے حامیوں کو اینٹ کا

جواب پتھر سے ملا ہے۔

رضا کاروں کے پہلے عملی مظاہرہ کے مفید نتائج

خود کوبرگ میں مارکس ازم کے پیرو مزدوروں کے کارکن بھی کچھ اصولوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اسی چیز کے لیے لڑتا ہے جس پر ایمان رکھتا ہے اور جس کے تحت محبت کرتا ہے۔ اس قسم کے مزدوروں کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں ورغلا کر مارکس ازم کا حامی بنایا گیا ہے۔

کوبرگ کے واقعات سے خود طوفانی دستوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ ہمارے رضا کاروں کی تعداد اس سرعت سے بڑھ گئی کہ جب جنوری ۱۹۲۳ء میں ہماری پارٹی کانگریس منعقد ہوئی تو وہاں ہمارے جھنڈا لہرانے کی رسم میں چھ ہزار رضا کاروں نے شرکت کی۔ ان رضا کاروں کی راہنمائی کرنے والی ٹولیاں نئی وردی میں ملبوس تھیں۔

کوبرگ کے تجربہ سے ہم پر واضح ہو گیا کہ ہمارے طوفانی دستوں کو جداگانہ وردی میں ملبوس کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف جماعتی احساس کو تقویت ملتی ہے بلکہ جھگڑا ہونے پر دوست دشمن کی پہچان رہتی ہے اور کوئی مغالطہ نہیں ہوتا اس روز تک ہمارے رضا کار صرف بازو بند کے طور پر تحریک کا نشان لگاتے تھے۔ لیکن اب ہماری مشہور قمیض اور ٹوپی بھی زائد کر دی گئی۔

کوبرگ کے تجربے سے ایک اور اہم نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب ان تمام قصبات میں سرخوں کی پھیلائی ہوئی دہشت زدگی دور کر کے دم لیں گے۔ جہاں انہوں نے سالہا سال سے اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے علاوہ کسی مخالف عقیدہ سے تعلق رکھنے والے کے لیے جلسہ کرنا ناممکن بنا رکھا تھا ہم نے تہیہ کر لیا کہ آزادی اجتماع کا حق برقرار رکھا جائے گا۔ اس روز کے بعد ہم اپنے دستے ایسے مقامات پر لے جاتے تھے آہستہ آہستہ بویریا میں سرخوں کے تمام قلعے فتح ہو گئے۔ قوم پرست اشتراکی پراپیگنڈہ نے ان پر سبقت لے لی۔ طوفانی دستے اپنے کام میں روز بروز زیادہ ماہر ہوتے گئے۔

کبھی وقتی تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں

اب طوفانی دستے ایک دفاعی تحریک کے ارا کین کی طرح بغیر مقصد اور ولولہ کی تنظیم نہ تھے بلکہ وہ کھلے بندوں ایک عسکری تنظیم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ جو ایک نئی جرمن سرکار کے قیام کے خواہش مند تھے۔

ہمارے منطقی ارتقا کا یہ مرحلہ مارچ ۱۹۲۳ء تک طے ہوتا رہا۔ پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ تحریک جس راستے پر چلتی ہے وہاں سے اس کا رخ موڑا جائے ہماری ظاہری تشکیل میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۹۲۳ء کے ابتدائی مہینوں میں فرانسیسیوں نے جرمنی کے ضلع روہر پر قبضہ کر لیا۔ اس سے جو نتائج بر آمد ہوئے انہوں نے طوفانی دستوں کے ارتقا پر برا اثر ڈالا۔

ابھی یہ ممکن نہیں کہ اس موضوع پر آزادی سے کچھ بالیا جائے یا لکھا جائے۔ ایسا کرنا قوم کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ میں صرف اسی حد تک یہ تذکرہ چھیڑوں گا جس حد تک عوام کے سامنے اس پر بحث ہو چکی ہے۔ بحث کا یہ حصہ پہلے سے ہر شخص کے علم میں ہے۔

روہر کے ضلع پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہمارے لیے حیرانگی کا باعث نہ تھا۔ اس قبضے کے بعد امید پیدا ہوئی کہ شاید جرمنی بزدلی سے ہر معاملے پر اطاعت اختیار کرنے کی پالیسی ترک کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر دفاعی انجمنوں کے لیے موقع ہوگا کہ کچھ ٹھوس کارگزاری کر کے دکھائیں۔ طوفانی دستوں کی تعداد اب ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں تندرست اور قومی نوجوان شامل تھے۔ قوم کی خدمت کا کوئی ایسا موقع آیا تو یہ رضا کار بھی اپنا فرض ادا کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں اور موسم گرما میں ہمارے رضا کاروں کی یہ تنظیم ایک ایسی عسکری تنظیم میں بدل گئی جو میدان جنگ میں جانے کے قابل ہو۔ ۱۹۲۳ء میں ہماری تحریک کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم کی ہیئت تشکیل از سر نو بدل گئی۔

میں کسی دوسرے مقام پر ان واقعات کا تذکرہ کروں گا جو ۱۹۲۳ء میں پیش آئے۔ یہاں میں صرف یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ طوفانی دستوں کی تنظیم میں جو تبدیلیاں کی گئیں وہ عام حالات میں تحریک کے لیے مضر ثابت ہوئیں۔ہم نے یہ تبدیلیاں صرف اس لیے قبول کیں کہ فرانس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارا **ملک** اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس موقع پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ہماری تنظیم میں یہ تبدیلیاں لازم تھیں۔

اگر ایک کوشش ناکام ہو تو دوسری کوشش شروع کرنی چاہیے

۱۹۲۳ء کے اواخر میں جو واقعات پیش آئے اگرچہ وہ بظاہر بڑے ناپسندیدہ نظر آتے ہیں۔لیکن درحقیقت اگر مقصد اعلیٰ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان واقعات کا پیش کرنا لازمی تھا۔جرمن سرکار نے جو روش اختیار کی اس کے بعد طوفانی دستوں کو عسکری تنظیم کی شکل میں دینا لاحاصل ہو گیا۔حکومت کے رویے میں اس تبدیلی کے بعد بھی ہمارے رضاکاروں کی تنظیم عسکری صورت اختیار کیے رہتی تو اس سے تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔اس لیے ہمارے رضاکاروں کی عسکری تنظیم یک لخت ختم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا کام بھی اسی جگہ سے پھر شروع کیا۔ جہاں سے ہم اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر ایک فوری ضرورت پر متوجہ ہوئے تھے۔

۱۹۲۵ء میں جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی دوبارہ قائم کی گئی۔تحریک کو اپنے طوفانی دستے ازسرنو منظم کرنے پڑے اور انہیں دوبارہ انہی اصولوں پر تربیت دی گئی جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔اس تنظیم کے لیے لازم ہے کہ انہی اصولوں کی جانب لوٹ آئے جس پر اس کی ابتدا کی گئی تھی۔اس تنظیم کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ تحریک کی حفاظت کے لیے خدمات انجام دے اور تحریک کے عقائد کی روحانی تبلیغ میں معاون ثابت ہو۔

طوفانی دستوں کو ہرگز اس پست سطح پر نہ اترنا چاہیے کہ وہ ایک دفاعی انجمن یا خفیہ انجمن بن کر رہ جائیں ایسا انتظام کرنا لازمی ہے کہ ہمارے رضاکاروں کی تنظیم ان پر

ایک لاکھ جوانوں کا مقدمتہ الجیش ثابت ہو جو قوم پرست اشتراکیت کی خاطر جدو جہد پر تل ہوئے ہیں اور جنہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ایک عوامی سرکار قائم کر کے رہیں گے ۔

☆☆☆

باب دہم

وفاق کا نفاق

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

جنگ کے ایام میں ہی ایک مسئلہ خاصی نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے موسم سرما مین اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۲۰ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں ہماری نوعمر پارٹی مجبور ہوگئی کہ اس مسئلہ کے متعلق ایک واضح موقف اختیار کرے۔ میں نے اس کتاب کی پہلی جلد میں اختصار سے وہ واقعات بیان کر دیے ہیں جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان واقعات سے صاف نظر آ رہا تھا کہ جرمنی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان واقعات میں جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں سب سے پہلے تو وہ پراپیگنڈہ شامل تھا جو جرمنوں اور فرانسیسیوں نے شمالی جرمنی اور جنوبی جرمنی کا پرانا افتراق تازہ کرنے کے لیے منظم کیا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے موس بہار میں پہلی مرتبہ وہ رسالے بانٹے جانے لگے جن کا بعد میں ایک باقاعدہ تانتا بندھ گیا۔ ان رسالوں کا مقصد یہ تھا کہ پرسشیا کے خلاف جذبات ابھارے جائیں پرشیا کر جنگ شروع کرنے کے لیے واحد ذمہ دار قرار دیا جائے۔ ۱۹۱۶ء تک یہ چرچے ایک باقاعدہ نظام کی صورت اختیار کر چکے تھے اس نظام کو پوری عیاری اور بے حیائی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ انسان کے پست ترین جذبات کو ابھار کر اس پراپیگنڈے نے جنوب جرمنی کو شمالی جرمنی سے لڑا دیا۔ تھوڑا عرصہ بعد ہی دشمنوں کی اس چال کے نتائج ظاہر ہونے لگے۔ ان دنوں جو لوگ حکومت اور فوج کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے وہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے میں غفلت کے مرتکب ہوئے۔ خاص طور پر جو حکام بویریا کی فوج کے ناظم اعلیٰ تھے۔ زیادہ تر غفلت کے مرتکب ہوئے۔ ان لوگوں نے اندھا دھند اپنے فرض سے غفلت کی اور کوئی ایسا ٹھوس قدم نہ اٹھایا کہ جس سے اس پروپیگنڈہ کا تدارک ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سرے سے کچھ نہ کیا گیا برعکس اس کے بعد حلقوں میں تو اس پراپیگنڈہ کو خوش آمدید کہا گیا۔

بعض لوگ ایسے کوتاہ نظر تھے کہ ان کا خیال تھا کہ اس پروپیگنڈے سے جرمنی کے اتحاد میں مدد ملے گی۔ وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ شاید یہ پروپیگنڈہ ملک کا ایک وفاق قائم کرنے کی تحریک کے لیے باعث تقویت ثابت ہو۔ اپنے فرض سے یہ غفلت مجرمانہ تھی شاید تاریخ میں ایسی غفلت کے لیے اس سے زیادہ سخت سزا اٹھانے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ان لوگوں کا خال تھا کہ اس پروپیگنڈے سے پرشیا کمزور ہوگا تو ملک کی تمام وحدتوں میں مساوات کی بنا پر وفاق قائم ہو جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ پرشیا کے زوال کے بعد تمام جرمنی روبہ انحطاط ہو گیا۔ اس طرح جو تباہی مچی اس سے تمام جرمنی غارت ہوا۔ سب سے زیادہ نقصان ان ریاستوں کو آپہنچا جو وفاق کے قیام کی حامی تھیں۔

جس شہر میں پرشیا کے خلاف مصنوعی طور پر پیا کی ہوئی نفرت شدید ترین تھی وہیں سے جرمنی کے تاجداروں کے خاندان کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ یہی بغاوت انقلاب کی ابتدا ثابت ہوئی۔

تا نباشد چیزکے مرہوم نگویند چیزہا

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دشمن کے پروپیگنڈہ سے پرشیا کے خلاف جذبات کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دراصل ایسی وجوہات موجود نہ تھیں جن کی بنا پر عوام نے اس پروپیگندہ کو قبول کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کے اقتصادی مفاد کو دوران جنگ ناقابل یقین طریقہ سے پامال کیا گیا۔ مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو جنون کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ ساری مملکت کو مرکزی حکومت کا غلام سمجھا جاتا تھا۔ مملکت سے ناجائز استحصال کیا جاتا تھا یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر پرشیا کے خلاف جذبات پیدا ہوئے۔ ایک عام شہری یہ جانتا تھا کہ جنگ کے متعلق تمام ٹھیکے ان کمپنیوں کے سپرد کیے جاتے ہیں جن کے مرکزی دفاتر برلن میں واقع ہیں۔ عام شہری اس کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ تمام ٹھیکے برلن کو دیے جا رہے ہیں۔ برلن اور پرشیا میں کوئی تمیز نہ کی جاتی تھی۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمام جنگی ٹھیکوں کا فائدہ پرشیا کو پہنچ رہا ہے۔ عام شہری ان کمپنیوں کی

اندرونی تنظیم سے ناواقف تھا۔ یہ کمپنیاں لوگوں کو بری طرح لوٹ رہی تھیں۔ عام طور پر انہیں جنگی کمپنیاں کہا جاتا ہے۔ کسی کو یہ علم نہ تھا کہ ان کمپنیوں کی حقیقی ملکیت نہ برلن کے ہاتھ میں ہے نہ پرشیا کے قبضہ میں ہے۔ بلکہ خود جرمنوں کو بھی اس میں دخل نہیں لوگ تو صرف یہ دیکھتے تھے کہ بحیثیت مجموعی کیا بے قاعدگیاں ہوہ ہیں۔ انہیں تو صرف یہ دکھائی دیتا تھا کہ یہ قابل نفرت ادرائے مملکت کے دارالحکومت میں کن زیادتیوں کے مرتکب ہورہے ہیں اس کے بعد لوگوں کو غصہ پہلے برلن اور پھر پرشیا کی جانب منتقل ہوجاتا تھا۔ عوام کے اس غصے کو رفع کرنے سے بعض حلقوں نے بڑی غفلت کا ثبوت دیا۔ مثال کے طورپ؛ ربویریا کی حکومت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔ عوام کی غلط فہمی کو دور کرنے پر ذرہ بھر توجہ نہ دی گئی۔ الٹے اس غلط فہمی کو پھیلتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا گیا کہ اس طرح پرشیا کا اقتدار کم ہوگا۔

یہودی خود چوری کرتے ہیں اور دوسروں کو پکڑوا دیتے ہیں

یہودیوں جیسی عیار قوم یہ خوب جانتی ہے کہ انہوں نے جنگی کمپنیوں کے پردے میں لوگوں کو لوٹنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے ایک نہ ایک دن اس کی مخالفت ضرور ہوگی۔ یہودی دونوں ہاتھوں سے جرمن قوم کو لوٹ رہے تھے۔ اس لیے اگر اس لوٹ مار کی مخالفت کا رخ یہودیوں سے ہٹا کر کسی اور طرف پھیر دیا جاتا تو یہودیوں کو اس مین کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہودیوں نے اپنے آپ کو عوام کے غیض وغضب سے بچانے کی موثر ترین تجویز یہ سوچی کہ عوامی غصہ کا رخ کسی اورنشانہ کی جانب پھیر دیا جائے ء۔ بویریا پرشیا سے لڑے یا پرشیا بویریا سے لڑے جتنی لڑائی زیادہ بڑھے اتنا ہی ان دونوں ریاستوں کی باہمی کشمکش یہودیوں کے لیے پناہ کی ضمانت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام کی توجہ ان بین الاقوامی ناسور سے ہٹا دی گئی جو قوم کو اندر ہی اندر سے گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ یہودیوں نے ایسا پردہ اوڑھا کہ کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ تھا۔ اس کے بعد جب کبھی یہ خطرہ پیدا ہوا کہ صائب الرائے اشخاص جو آخر بویریا میں بھی مفقود نہ

تھے متحمل مزاجی کا سبق پھیلانے میں کامیاب ہو جائیں گے صورت حال پر منصف مزاجی سے غور کیا جائے گا۔ یوں پرشیا کے خلاف غیض وغضب کم ہو جائے تو تو ایسے موقع پر برلن کے یہودیوں کو ایک تیر بہدف نسخے کا استعمال یاد تھا۔ وہ عوام کو ذرا بھڑکا دیتے اور پھر تماشا دیکھتے۔ جب کبھی ایسا موقع پیش آیا تو جن لوگوں نے شمالی اور جنوبی جرمنی کے تصادم میں سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا وہی گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے بلند کرتے اور غیض وغضب کی آگ چاروں طرف پھیلا دیتے۔

یہودیوں کی یہ چال نہایت عیارانہ تھی اور موثر تھی یہودی پہلے جرمن قوم کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے لڑا دیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ لڑنے والوں کی توجہ یہودیوں کی طرف منعطف نہ ہو۔ اس کے بعد یہودی بڑے اطمینان سے سب کو لوٹنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد انقلاب رونما ہوا۔

دشمن ہمارے اندر افتراق ڈالتا ہے

۱۹۱۸ء تک بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس سال کے ماہ نومبر تک ایک اوسط جرمن شہری کو خاص طور پر نچلے درجے کے ناخواندہ سفید پوشوں اور مزدوروں کو بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ نہ ہی انہیں یہ سمجھ تھی کہ جنوبی اور شمالی جرمنی کی پھوٹ کیا رنگ لائے گی۔ جرمن قوم کی ان دو شاخوں کا باہمی تصادم بویریا کو کیا روبد دکھائے گا۔ کم از کم جو عناصر اپنے آپ کو قوم پرست کہتے تھے۔ انہیں تو انقلاب رونما ہونے کے بعد سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس پھوٹ کے نتائج کیا ہوں گے۔ جونہی بلوائیوں نے کامیابی حاصل کی۔ بویریا میں...... انقلاب کے قائد اور ناظم نے یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ میں تو بویریا کے مفاد کا محافظ ہوں۔ بین الاقوامیت پر یقین رکھنے والا یہودی جس کا نام کوٹ آئزنر تھا۔ بویریا کو پرشیا کے خلاف لڑانے لگا۔ یہ مشرق کا باشندہ بویریا کا محافظ کیسے بن بیٹھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ایک اخباری رپورٹر تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کی وجہ سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر تمام جرمنی میں گھومتا رہا تھا۔ اسے کیا پرواہ تھی کہ بویریا یا خدا کی دنیا

کا کوئی اور حصہ قائم رہتا یا مٹ جاتا ہے۔

کوٹ آئزنز نے جب بویریا میں انقلابی بغاوت کو پرشیا کے خلاف بغاوت کا رنگ دینا شروع کیا تو اس کا مقصد ہرگز بویریا کی حفاظت نہ تھا۔ وہ تو یہودیوں کی عالمگیر تحریک کے ایک گماشتے کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر وہ اہل بویریا کے موجودہ میلانات اور رجحانات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان حیلے بہانوں سے جرمنی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی جب جرمنی پرزہ پرزہ ہو جائے گا تو پھر اسے بالشوزم کا شکار بنانے میں سہولت رہے گی۔

کوٹ آئزنز نے جو چالبازی شروع کی تھی۔ اس کی موت کے بعد بھی کچھ عرصہ اس پر عمل ہوتا رہا۔ مارکس ازم کے حامی جنہوں نے آج تک جرمنی کی ریاستوں اور ان کے نوابوں کی انفرادی خدمات کا مذاق اڑایا تھا۔ یک لخت آزاد پارٹی کا روپ دھار کر ان جذبات اور میلانات کا سہارا لینے لگے جن کی بنیاد جداجدا ریاستوں اور وہاں کے نوابوں کے خاندانوں سے وفاداری پر تھی۔

یہودی بھائی کو بھائی سے لڑا کر خود بچ نکلتا ہے

جب بویریا کو وہاں کی کمیونسٹ جمہوری سرکار سے آزاد کرانے کے لیے لشکر بھیجا گیا اور اس سرکار کے مقابلے میں ہتھیار سنبھالے تو مارکس ازم کے حامی مبلغین نے اس کشمکش کو بویریا کے مزدوروں کی پرشیا کی عسکری جباریت کے خلاف جدوجہد کا نام دیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب میونخ کی حکومت جموری سرکار کو دبا دیا گیا تو اس سے وہ نتائج برآمد نہ ہوئے جو دوسرے جرمن اضلاع میں بہ آسانی برآمد ہو رہے تھے۔ کمیونسٹ سرکار سے نجات پانے کے بعد عوام کی عقل ٹھکانے نہ آئی۔ الٹے پرشیا کے خلاف غصہ اور نفرت کے جذبات بڑھ گئے۔

بالشوزم کے گماشتوں نے یہ چال اختیار کر رکھی تھی کہ جب بویریا کی کمیونسٹ جمہوری سرکار دبا دی گئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ "پرشیا کی عسکری جباریت" کو بویرین

عوام کی پرشیا اور عسکریت کے خلاف بغاوت کے کچلنے میں کامیابی ہوگئی ہے۔ان کی یہ چال چل گئی جب بویریا پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا تھا تو کوٹ آرزنز کے میونخ میں بمشکل دس ہزار پیروہوں گے اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے تین ہزار سے بھی کم پیرو تھے۔بویریا کی سرکار ختم کر دینے کے بعد جب دوبارہ انتخابات ہوئے تو ان دونوں پارٹیوں نے مل کر قریباً ایک لاکھ ووٹ حاصل کیے یہی وہ واقعہ تھا جس سے ذاتی طور پر متاثر ہو کر میں نے جرمن قوم کی مختلف شاخوں کولڑانے کی مخالفت شروع کی۔

عوام گمراہ ہو جائیں تو ان کی غلط فہمی دور کرنی خاصی دشوار ہوتی ہے

میرا خیال ہے میں نے اپنی ساری زندگی میں کوئی ایسا ہر دل عزیز کام کرنے کی نہ ٹھانی ہوگی جیسا کہ پرشیا کی مخالفت کی تحریک کو روکتے وقت میرے سر پر آن پڑا تھا جن دنوں میونخ میں کمیونسٹوں کی حکومت تھی بڑے بڑے عوامی جلسوں میں جرمنی کے خلاف نفرت پھیلائی جاتی تھی۔بالخصوص پرشیا کے خلاف تو نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان جلسوں میں شمالی جرنی کا کوئی باشندہ شریک ہوتا تو شاید عوام کے ہاتھوں اس کی جان کو خطرہ میں پڑ جاتی۔ان جلسوں کے اختتام پر وحشیانہ جنون سے کچھ اس قسم کے نعرے بلند کیے جاتے تھے''ہم پرشیا سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں''پرشیا مردہ باد''ہم پرشیا سے جنگ کرنا چاہتے ہیں''وغیرہ وغیرہ یہ جذبات پارلیمنٹ میں بھی کھلے بندوں پیش کیے جاتے تھے۔بویریا کی مطلق العنانی کے ایک وکیل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا''ہم پرشیا کے ماتحت ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے سے بہتر سمجھتے ہیں ک بویریا کی مطلق العنانی کی خاطر جہاد کرتے ہوئے مر جائیں''۔

میونخ شہر کے لوون براؤ کیلر میں ایک ایسا ہی جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔جب میں نے اس حماقت کے خلاف آواز بلند کی میرے اردگرد مٹھ بھر ہمنوا اور دوستوں کا حلقہ تھا۔اس احتجاج کے پورے معنی اس وقت تک سمجھنے مشکل ہیں جب تک کہ کسی شخص نے اس زمانے میں کسی ایسے جلسے میں خود شرکت نہ کی ہو۔اور یہ نہ دیکھا ہو کہ وہاں کیا فضا ہوتی

تھی ۔ذرا تصور کیجیے۔اس وقت ہم پر کیا گزری ہوگی جب ہم نے شوروغوغا مچانے والے اس ہجوم نے جو قابو سے باہر ہو چکا تھا غراتے ہوئے ہمیں مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ جنگ کے دوران جب ہم لوگ قوم کو بچانے کی خاطر میدان جنگ پر لڑ رہے تھے تو یہی ہجوم جو اسی قوم میں شامل تھا مزے سے گھر بیٹھا تھا۔اگر یہ لوگ بھرتی بھی ہوئے تو پھر بھگوڑوں اور بزدلوں کی طرح جان بچا کر محاذ جنگ سے بھاگ آئے جب ہجوم نے ہم پر ہلہ بولا تو یہی واقعہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوا میرے مٹھی بھر رفقا میرے ساتھ یک دل و جان تھے ۔انہوں نے تہیہ کرلیا کہ زندگی ار موت میں میرا ساتھ دیں۔

ہم نے بڑے دکھ جھیل کر عوام کی گمراہی دور کی ہے

۱۹۱۹ء میں بھی ایسے تصادم کے واقعات رونما ہوتے رہے۔لیکن ۱۹۲۰ء کے آغاز میں تھوڑا ہی عرصہ بعد اس تصادم کی شدت بڑھ گئی ۔بعض جلسوں میں تو میرے حلقہ کو جو اب خاصا وسیع ہو چکا تھا خاصے متشدوانہ حملوں کو سامنا کرنا پڑا۔اس وت مجھے ایک ایسا ہی جلسہ خاص طور پر یاد آ رہا ہے۔ یہ جلسہ میونخ شہر کے محلّہ سونن ٹسرا سے کے دیگز ہال میں منعقد ہوا تھا۔کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میری اور میرے درجن بھر ساتھیوں کی بڑی گت بنی ۔ہمیں فرش پر گرا کر پاؤں سے کچلا گیا۔حملہ آوروں نے ہمیں اٹھا اٹھا کر وہاں سے باہر پھینک دیا۔اس وقت ہماری حالت یہ ہوتی تھی کہ ہم نیم جان ہو چکے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ ہوش بھی نہ ہوتی تھی کہ مردہ ہیں یا زندی۔

یہ جہاد میں نے پہلے پہل تو تنہا شروع کیا۔پھر میرے ساتھ میرے ایام جنگ کے رفقاء بھی شامل ہو گئے تھے۔اس وقت ہماری نوزائیدہ تحریک نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ میں یہ کہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ ہمارا عزم ایک مقدس عزم تھا۔

میں آج یہ دعویٰ کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہم ہی تھے جنہوں نے فقط بویریا میں اپنے پیروؤں کی مدد سے بتدریج لیکن یقینی طور پر اس حماقت اور غداری کی باہمی سازش کا خاتمہ کر دیا۔ میں حماقت اور غداری کی مشترکہ سازش کا ذکر اس لیے کرتا ہوں

کہ گو مجھے یقین ہے کہ اس سازش میں شریک ہونے والے عوام بے وقوف تھے لیکن میں یہ نہیں مان سکتا کہ اس سازش کو منظم کرنے والے اور اس کی ترغیب دینے والے بھی سادہ لوحی کے عذر سے بے گناہ قرار دیے جا سکتے ہیں ان سازشیوں کو میں تب بھی غدار ہی سمجھتا تھا۔ اور آج بھی غدار ہی سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ فرانس سے تنخواہیں وصول کرتے تھے ان میں سے ایک مجرم کا نام ڈورٹین تھا۔ اس کے جرم کا ثبوت اب تاریخ کے اوراق پر ثبت ہو چکا ہے۔

وفاق کا نعرہ دراصل نفاق پر مبنی ہے

یہ امر صورت حال کو زیادہ خطرناک بنا رہا تھا کہ یہ سازش کرنے والے اپنی عیاری سے اپنے اصل مقاصد کو وفاق کی حمایت کے پردے میں چھپانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا پیدا کردہ شورش کا نصب العین فقط وفاقی نظام حکومت کا قیام ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ پرشیا کی مخالفت میں جو شورش کھڑی کی گئی اس کا وفاق کی حمایت سے کوئی تعلق نہ تھا "تحریک وفاق" کا یہ مطلب کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ جو وفاقی حکومت پہلے سے قائم ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے جو شخص دیانت داری سے وفاق کا حامی ہو جو وفاق کے اس تصور کا مخالف نہ ہو جو بسمارک نے مملکت کے اتحاد کی غرض سے پیش کیا حتا بھلا وہ بسمارک کی بنائی ہوئی یا کم از کم مکمل کی ہوئی پرشین سرکار کی کتر بیونت کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ کم از کم ایسا شخص ملک کے مختلف حصوں کے مابین قطع تعلق کی حمایت تو کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر پرشیا کی قدامت پسند پارٹی کا کوئی رکن بویریا سے فرانکونیا کی علیحدگی کا مطالبہ کرتا یا اس قسم کی علیحدگی کی تحریک کی حمایت میں خوئی کھلا سیاسی قدم اٹھاتا تو میونخ میں احتجاج کا کیسا غلغلہ بلند ہوتا۔ باوجود اسکے جو سچے اور مخلص حامیان وفاق اس بدمعاشی کی چال کو نہ سمجھ سکے اور اس کا شکار بن گئے وہ ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ دراصل حامیان وفاق نے وفاق کے تخیل کو یوں توڑ مروڑ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اگر جرمن سرکار کو وفاقی نظام قائم کرنا ہے تو

اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ایسے نظام کے ایک لازمی عنصر یعنی پرشیا کی تحقیر کی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے۔ اس طریقے سے تو وفاق کا قیام اگر ممکن بھی ہو تو ناممکن بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس لیے اور بھی قابل عمل تھا کہ ان نام نہاد حامیان وفاق نے اپنی شورش کا نشانہ پرشیا کے باشندوں کے اس عنصر کو بنا رکھا تھا۔ جو ماہ نومبر ۱۹۱۸ء میں قائم ہونے والی جمہوری سرکار کے گناہوں سے بالکل پاک تھا۔ یہ نام نہاد حامیان وفاق آئین وائمر کے مصنفین پر کوئی حملہ نہ کرتے تھے کیونکہ آئین وائمر کے مصنفین بیشتر جنوبی جرمنی کے باشندے تھے اور یا پھر یہودی تھے ان لوگوں کا تمام زور بیان رپشیا کے قدامت پسندوں کے خلاف صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ قدامت پسند آئین وائمر کے مخالف تھے اس تحریک کو چلانے والے یہودیوں پر ذرا بھر بھی الزام نہ رکھتے تھے۔ ان کی یہ روش باعث استعجاب نہیں۔ اسی سے تو سارے معمہ کا پول کھلتا ہے۔

یہودی اپنی بدمعاشی چھپانے کو قوم میں پھوٹ ڈال دیتا ہے

انقلاب سے پہلے یہودیوں نے عوام کی توجہ اپنے آپ سے ہٹانے کے لیے یہ ترکیب اختیار کر رکھی تھی کہ جمہور کو اور خالص طور پر بویریا کے باشندوں کو پرشیا کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ یہی نسخہ یہودیوں کی بنائی ہوئی جنگی کمپنیوں کو جمہور کی توجہ سے بچانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ انقلاب کے بعد یہودیوں نے پہلے سے دگنی لوٹ مچا رکھی تھی۔ اس لوٹ کو چھپانے کے لیے کسی ایسے ہی حیلے بہانے کی ضرورت تھی۔ یہودی اس دفعہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ وہ یوں کہ یہودیوں نے نام نہاد قوم پرست عناصر کو ایک دوسرے سے لڑا دیا۔ بویریا کے قدامت پسندوں کو پرشیا کے قدامت پسندوں سے لڑا دیا۔ حالانکہ یہ دونوں قدامت پسند تھے۔ یہ عمل انجام دیتے ہوئے یہودیوں نے انتہائی عیاری سے کام لیا۔ درحقیقت پرشیا کی باگ ڈور بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن پرشیا کے خلاف اس قسم کے وحشیانہ اور مجنونانہ جذبات پھیلائے گئے کہ جن لوگوں کو احمق بنایا جا رہا تھا انہیں احساس تک نہ ہوا یہودی سے کوئی

تعرض نہ کرتا تھا کہ جرمن ہی بھائی بھائی کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ بویریا کے باشندوں کو یہ دکھائی دیتا تھا کہ برلن میں چالیس لاکھ محنتی اور ہنر مند کام کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ انہیں تو صرف برلن شہر کے مغربی حصے میں بسنے والے سست اور انحطاط پذیر آبادی کے قصے سنائے جاتے تھے۔ پھر غیض وغضب کا نشانہ شہر کا یہ مغربی حصہ نہ تھا بلکہ پورا شہر تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تو پرشیا کا شہر تھا۔

بسا اوقات تو حالات ایسے نازک ہو جاتے تھے۔ کہ انسان مایوس ہونے لگتا تھا۔ یہودیوں میں یہ غیر معمولی قابلیت ہے کہ وہ عوام کی توجہ اپنے سے ہٹا کر اس کا رخ دوسروں کی جانب موڑ دیتے تھے۔ ان کی اس قابلیت کا مظاہرہ آج کل بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس قابلیت کی مثالیں موجودہ زمانے کے واقعات سے بھی مل سکتی ہیں۔

یہودی کی سازشوں کا قوم کو علم بھی نہ تھا

۱۹۱۸ء میں یہودیوں کی مخالفت کی تحریک کسی منظم شکل میں موجود نہ تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب کبھی ہم یہودیوں کا تذکرہ چھیڑتے ہیں تو ہمیں کیا دشواریاں پیش آتیں لوگوں کے چہرے ایسی حیرانگی کے آثار ظاہر کرتے گویا وہ سمجھے ہی نہیں۔ یا ایسا نہ ہوتا تو گہری اور سخت ناپسندیدگی کے آثار ہویدا ہوتے۔ اس زمانے میں ہم عوام ی توجہ قوم کے اصل دشمن کی طرف موڑنے کی جتنی بھی کوشش کرتے وہ سب بیکار نظر آتی۔ اس کے بعد صورت حال میں کچھ بہتری رونما ہونے لگی۔ اصلاح احوال کے اس رجحان کی رفتار نہایت سست تھی۔ ''دشمن سے بچنے اور دشمن پر حملہ کرنے کی لیگ'' کی تنظیم اگرچہ ناقص تھی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا یہ فائدہ ہوا کہ یہودیت کا مسئلہ ایک دفعہ پھر سامنے آ گیا۔ ۱۹۔ ۱۹۱۸ء کے درمیانی موسم سرما میں بنی سام کی مخالفت آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگی۔ اس ے بعد قوم رپست اشتراکی تحریک نے یہودیت کا مسئلہ ایک بالکل نئے پیرائے میں پیش کیا۔ ہم نے یہ مسئل بالائی طبقات اور سفید پوشوں کے حلقے سے نکال

کر ایک عوامی تحریک کے جذبہ عمل میں تبدیل کر لیا۔ جونہی ہم اس مسئلہ کر جرمن قوم کے سانے یوں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے کہ اس سے قوم کے اتحاد کو تقویت حاصل ہو' یہودیوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔ انہوں نے وہی پرانے حربے اختیار کر لیے۔ حیران کن مستعدی سے یہودیوں نے محب وطن تحریک میں پھوٹ ڈال دی۔ یہ پھوٹ ایسی پھیلی کہ ایک خلیج حائل ہو گی ایک طرف تو انہوں نے پاپائیت کی اطاعت واجب ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس کے بعد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں وہ چلی کہ توبہ ہی بھلی۔ اس وقت یہ مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑا ہی ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جو عوام کی توجہ دوسرے مسائل سے ہٹا سکتا تھا۔ غرض یہودیوں کے خلاف جو مہم شروع کی گئی تھی اس سے عوام کی توجہ ہٹا دی گئی۔ جن لوگوں نے قوم کو اس فرقہ وارانہ تنازعہ میں الجھایا انہوں نے قوم کے خلاف ایک ایسا جرم کیا جس کا کنارہ وہ کبھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال یہودی جو چاہتا تھا وہی کرتا تھا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دل بھر کا ایک دوسرے کے لتے لے رہے تھے۔ دوسری طرف آریاؤں کا دشمن بلکہ خود نصرانیت کا دشمن آستیں میں منہ چھپائے ان کی حماقت پر قہقہے لگا رہا تھا۔

یہودی ہماری قوم کی عصمت اور ناموس پر رسوائی کا داغ لگا رہا ہے

پہلے سال ہا سال وفاقی نظام حکومت اور وحدانی نظام حکوت کی نزاع میں عوام کو الجھایا گیا عوام کی قوتیں یوں ضائع ہوتی رہیں۔ یہودی مزے سے قوم کی جیبیں کاٹتا رہا۔ اس نے ہمارا بین الاقوامی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کیا۔ اب ایک مرتبہ پھر یہودی اپنی پرانی چال میں نئے انداز سے کامیابی حاصل کر رہا تھا۔ آج جرمنوں کے دو مذہبی فرقوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ وہ اس لڑائی میں مصروف ہیں۔ اور دونوں کی بنیادیں یکساں کھوکھلی کرنے والا مزے لوٹ رہا ہے۔ یہ بنیادیں اس زہر سے کھوکھلی ہو رہی ہیں کہ جو بین الاقوامیت اور آفاقیت کا حامی یہودی ہماری قوم کے اعتقادات میں تزلزل پیدا کر کے پھیلا رہا ہے۔

ذرا سوچیے تو ہماری قوم کے خون میں یہودی خون کی آمیزش سے کیسی تباہی کا سامان تیار ہو رہا ہے۔ یاد رکھیے کہ اس مسخ کر دینے والے زہر کا اثر قوم کے جسم سے شاید صدیوں بعد ہی دور ہو سکے۔ ممکن ہے کبھی دور نہ ہو سکے۔ یہ بھی غور کیجیے کہ نسل میں خلل پیدا ہونے سے ہماری جرمن قوم کی آریائی خصلتیں کیونکر مٹتی جا رہی ہیں بحیثیت ایک ملت کے ہماری ثقافتی و تخلیقی استعداد کند ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں میں یہ خطرہ رونما ہو چکا ہے کہ ہم پستی کے اس گڑھے میں نہ گر جائیں جس میں آج جنوبی اٹلی گر چکا ہے۔ خون کی آمیزش ایک وبائی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہماری قوم کے لاکھوں افراد اس وبا سے غافل ہیں یہودی اس وبا کو پھیلانے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ یہ نکھٹو جونکیں جو ہماری قوم کے جسم سے چمٹی ہوئی ہیں۔ ہماری معصوم سنہرے بالوں والی دوشیزاؤں کی عفت پر رسوائی کا داغ لگا رہی ہیں' ایسے داغ جن کے دھبے ہمارے ناموس کی پیشانی پر سے کبھی نہ دھل سکیں گے۔

آریہ خدا کی برگزیدہ اور بہترین مخلوق ہیں

آریہ خدا کی وہ برگزیدہ اور بہترین مخلوق ہیں جو اس نے اپنی خاص عنایت کے نمونے کے طور پر اس دنیا کو عطا کی ہے۔ یہودی خدا کی اس برگزیدہ مخلوق کو ناپاک کر رہے ہیں۔ وہ آریاؤں کی نسل کو مٹا رہا ہے۔ یہ گناہ عظیم عیسائیت کے دونوں بڑے فرقوں یعنی کیتھولک فرقہ اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی آنکھوں کے سامنے سرزد ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے یہ دونوں عیسائی فرقے اس گناہ کے ارتکاب کو روکنے میں اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل ہیں۔ جہاں تک دنیا کے مستقبل کا تعلق ہے اس سے کچھ فرق نہیں کرنا پڑا کہ ان دونوں عیسائی فرقوں میں سے کس کو کس پر فتح نصیب ہوتی ہے۔ لیکن دنیا کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ آریا نسل زندہ رہتی ہے یا نہیں باوجود اس کے یہ دونوں عیسائی فرقے آریہ نسل کے دشمن سے نہیں لڑتے بلکہ آپس میں لڑتے ہیں۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں حب وطن کا صحیح جذبہ موجود ہے چاہے

وہ کسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا ہو' اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ کی منشا کو پورا کرے ہر شخص اللہ کی رضا پوری کرنے کا زبانی دعوے دار ہے۔ یہ خالی خوالی زبانی دعوے کافی نہیں۔ عمل سے خدا کی منشا پوری کرنی لازم ہے۔خدا کی منشائیں پوری ہو سکتی ہے۔جس نے ہر نسل کے انسان کو جدا خون سے بنایا۔جدا جسمانی شکل دی۔جدا جبلت' جدا فطرت اور جدا استعداد عطا کی۔اب جو شخص اللہ کی صنعت میں دخل دے کر خلل پیدا کرتا ہے۔وہ رب کائنات کی مخلوق اور خود خالق حقیقی کے منشا کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے۔ جو شخص ایسی بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے اس کا مقابلہ کرنا ہر دیندار کا فرض ہے چاہے وہ کسی مذہبی فرقے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو ہاں یہ درست ہے کہ یہ مقابلہ اپنے مذہبی فرقے کے اندر رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔ جو شخص اپنے مذہبی فرقے کی حدود کی حد سے تجاوز کر کے دوسری مذہبی فرقے کے پیروؤں سے جھگڑا مول لیتا ہے اور اس طرح خدا کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے مقابلے میں توجہ ہٹاتا ہے۔اس کو روکنا بھی ہر دیندار کا فرض ہے۔یہ جھگڑا مول لینا عمل سے بھی ہو سکتا ہے۔اور قول سے بھی۔

پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کا مسئلہ

جرمنی میں جو مذہبی فرقہ وارانہ اختلافات موجود ہیں ان کے پیش نظر ایک فرقے کے پیروکار کا دوسرے فرقے کے بنیادی معتقدات پر حملہ کرنا سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا کہ دونوں فرقوں میں تباہ کن تصادم ہو جائے۔ایسا تصادم عیسائیت کے دونوں فرقوں کے لیے مضر ہوگا۔اس معاملے میں جرمنی کی صورت حال فرانس سپین یا اٹلی سے بالکل مختلف ہے۔ان تینوں ملکوں میں اگر کوئی شخص پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کے خلاف پراپیگنڈا کرتا ہے تو اس کا یہ نتیجہ ضروری نہیں کہ فرانسیسی ہسپانوی یا اطالوی قوم کے اندر افتراق اور انتشار پیدا ہو جائے۔جرمنی کی صورت حال فرانس سپین یا اٹلی سے بالکل مختلف ہے۔یہاں پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کیا گیا۔ تو اس میں پروٹسٹنٹ ضرور حصہ لیں گے غرض دوسرے ملکوں میں پاپائیت کی اطاعت

مطلقہ کے خلاف تحریک شروع ہو۔تو اس میں حصہ لینے والے کیتھولک بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی تحریک میں حصہ لینے والے کیتھولکوں کا مطالبہ یہ ہوگا کہ پادری صاحبان سیاسی مسائل میں دخل نہ دیا کریں۔ برخلاف اس کے جرمنی میں کوئی ایسی تحریک شروع ہو تو اس کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ کیتھولک فرقہ پر پروٹسٹنٹ فرقہ حملہ آور ہو رہا ہے۔

مذہبی فرقوں کی جنگ قوم کے لیے مضر ہے

کسی مذہبی فرقہ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو اختلاف رکھنے والوں کو غلط سمجھتے ہوئے بھی کم ازکم ان کا عقیدہ برداشت کرلیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے بالکل اسی مسئلے پر اختلاف رائے دو مذہبی فرقوں کے مابین پیدا ہو جائے۔ اور اس کے اختلاف کے اظہار میں حصہ لینے والے، مناظرہ باز فرقہ وارانہ لیڈر بھی ہوں، تو ایسے اختلاف سے ہرگز رواداری کا سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ اصول اس حد تک اثر دکھاتا ہے۔ کہ اگر ایک فرقے کے اندر کسی مسئلے پر اختلاف رائے پیدا ہو جائے ۔تو جو شخص اس اختلاف کے ماتحت کسی شکایت کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہے' وہی شخص جب یہ دیکھے کہ کوئی دوسرا فرقہ اسی شکایت یا اعتراض کو دور کرنے کے درپے ہے تو نہ صرف وہ اپنی حمایت سے دست بردار ہو جائے گا بلکہ غیر فرقے کی اندرونی اختلافات میں دخل دینا ناجائز' مناسب اور ناروا سمجھا جاتاہ۔ ایک مذہبی فرقہ دوسرے مذہبی فرقے کے اندرونی اختلافات میں اگر قومی مفاد کی خاطر دخل دے تب بھی یہ مداخلت برداشت نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بھی ہمارے دینی عقائد ہمارے سیاسی عقائد اور ہماری قومی وفاداری سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس صورت حال کو اس طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مذہبی فرقہ کو دوسرے مذہبی فرقے سے لڑا دیا جائے۔ اس کا علاج تو یہی ہے کہ مختلف شہروں کے مابین مذہبی رواداری پیدا کی جائے۔ اگر ایسا اتحاد ہو گیا تو پھر قوم باہم عظمت کے اس عروج پر پہنچ جائے گی' جہاں پہنچ کر مذہبی اختلافات کو بھی آشتی سے دور کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

مجھے یہ کہنے می کچھ باک نہیں کہ آج جو لوگ محبّ وطن تحریکات کو مذہبی اختلافات سے الجھانا چاہتے ہیں وہ بین الاقوامیت کے حامی کمیونسٹوں سے بھی بڑھ کر قوم کے بدتر دشمن ہیں' قوم پرست اشتراکی تحریک نے اپنا نصب العین یہ مقرر کیا ہے کہ ان کمیونسٹوں کو ان کے موجودہ عقیدے بدلنے پر مجبور کیا جائے۔ جو شخص خود اپنی تحریک کے دائرے میں باہر قدم نکال کر تحریک کو اس کے نصب العین سے منحرف کرنے کا خواہش مند ہے۔ وہ بدترین مذمت کا مستحق ہے۔ ایسا شخص یہودیوں کے مفاد کے ہاتھ سے کھیل رہاہ۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے کیا انجانے میں اس حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہودی تو خدا سے چاہتے ہیں کہ محبّ وطن تحریکات کا جوش وخروش فرقہ وارانہ مذہبی اختلافات سے متصادم میں صرف ہو جائے۔ ورنہ یہودیوں کو خطرہ ہے کہ محبّ وطن تحریکات یہودیوں کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہیں۔ میں نے عمداً اوپر یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ تحریکات کی قوت اور جوش یہودی غیر متعلقہ مسائل میں ضائع کر دینا چاہتا ہے۔ جب تک کوئی شخص تاریخ سے بالکل جدا نہ ہو وہ یہ مان نہیں سکتا کہ جس مذہبی مسئلہ کو بڑے بڑے سیاست دان صدیوں تک حل کرنے کی کوشش کرتے رہے آج تک کامیاب نہ ہوئے' اب اسے ہماری تحریک حل کردے گی۔

فرقہ وارانہ مذہبی اختلافات قوم کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دیتے ہیں

بہر حال حقیقت حقیقت ہے۔ جن لوگوں پر ۱۹۲۴ء میں یکلخت یہ منکشف ہوا تھا کہ ایک محبّ وطن تحریک کا سب سے بڑا فرض پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کے خلاف جدوجہد کرنا ہے آج وہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہو پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کو تو ختم نہیں کر سکے البتہ انہوں نے وطن تحریک میں ضرور پھوٹ ڈال دی ہے۔ میں تحریک کو ہر ایسے نابالغ ذہن سے بچانا چاہتا ہوں جو اس وہم میں گرفتار ہو کہ جو کام بسمارک نہ کر سکا اب اسے ہماری محبّ وطن تحریک پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ قوم پرست اشتراکی تحریک کے

چلانے والوں کا ہمیشہ یہ اولین فرض ہوگا کہ قوم پرست اشتراکی تحریک کو اس قسم کے مذہبی تصادم کی خاطر استعمال ہونے سے بچائیں جو اس قسم کا مکروہ پراپیگنڈہ شروع کرے اسے فی الفور تحریک سے خارج کر دینا چاہیے۔

۱۹۳۲ء کے موسم خزاں تک ہم اپنی تحریک کو اس قسم کے تنازعوں سے بچانے میں کامیاب رہے۔ ہماری تحریک میں ایک راسخ العقیدہ پروٹسٹنٹ اور ایک راسخ العقیدہ کیتھولک یکساں مل جل کر پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کے مذہبی معتقدات کا تعلق تھا ان میں اس اتحاد سے کچھ فرق نہ آیا۔ دونوں نے متحد ہو کر آریہ نسل کو برباد کرنے والوں کے خلاف جو جانکاہ جدوجہد کی اس کے دوران دونوں کے دل میں ایک دوسرے کا احترام پیدا ہو گیا۔ انہیں ایام میں ہماری تحریک کا اعتدال پسند پارٹی سے شدید تنازعہ ہو گیا۔ اس تنازدہ کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس تنازعے کی بنیاد قومی، نسلی، سیاسی اور اقتصادی مفاد پر تھی تب ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے جو روش اختیار کی تھی وہ درست تھی۔ آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ میں زیادہ عقل رکھتے ہیں انہیں اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مذہبی نعروں کا سر ہے نہ پیر

گزشتہ چند سال سے اس ضمن میں حالات اور بھی دگرگوں ہو گئے ہیں۔ نام نہاد محب وطن حلقوں پر خدا کی کچھ ایسی سنوار ہے کہ وہ مذہبی تنازعات میں بدستور گرفتار ہیں۔ انہیں اپنی حماقت کا احساس اس واقعہ سے بھی نہیں ہو رہا کہ دوسرے مذہبی فرقے کی اس حمایت کا رخ مارکس ازم کے مفاد کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ کھلبلی اور افراتفری مچی رہے۔ ایسے نعرے بلند کیے جاتے رہیں، اور ایسی ایسی تنقیحات پیدا کی جاتی ہیں کہ جن کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ آج ایک فریق کی خبر لی جاتی ہے۔ کل دوسرے فریق کی درگت بنتی ہے۔ یوں باری باری اشتعال سے مذہبی منافرت کی آگ روشن رکھی جاتی ہے۔

جرمن ایک ایسی قوم ہیں جن کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ توہمات اور لایعنی تخیلات کی خاطر بھی مدتوں باہم لڑتے لڑتے ہلکان ہو جاتے ہیں۔ ایسی قوم میں معمولی پھوٹ بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اکثر اس قسم کے نعرے بلند کر کے ہماری قوم کو اس کی زندگی کے اصل مسائل سے دور رکھا گیا ہے۔ جب جرمن مذہبی جنگوں میں ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے تو دوسری قومیں دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ آج محب وطن تحریکات اس بحث میں منہمک ہیں کہ پاپائیت کی اطاعت واجب تسلیم کرنے سے زیادہ خطرہ ہے یا یہودیوں سے زیادہ خطرہ ہے۔ ہم اس بحث میں گرفتار ہیں اور یہودی ہماری نسل کو مسخ کر کے ہمارا وجود ہی ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ایسے نام نہاد محبان وطن کی جنگ آزمائی کو دیکھ کر میں قوم پرست اشتراکی تحریک اور جرمن قوم کی جانب سے دلی دعا کرتا ہوں کہ ہمارے رب ہمیں ایسے دوستوں سے بچائیو ہم اپنے دشمنوں سے خود نپٹ لیں گے۔

میثاقی نظام حکومت

جرمنی کو متحد رکھنے یا یہاں وفاقی نظام حکومت قائم کرنے کے متعلق ۲۱-۱۹۲۰ء سے لے کر یہودیوں نے کمال عیاری سے جو بحث چھیڑ رکھی ہ۔ اس نے قوم پرست اشتراکیت کو مجبور کر دیا کہ وہ اس تنازعہ کی مذمت کرتے ہوئے اصل مسئلہ کے متعلق حسب ذیل موقف اختیار کرے۔ ''کیا جرمنی میثاقی نظام حکومت قائم ہونا چاہیے۔ یا ایک مرکزی نظام حکومت؟'' ان اصطلاحات کا صحیح مطلب کیا ہے۔ میری رائے میں پہلے سوال کی نسبت دوسرا سوال زیادہ اہم ہے۔ میں دوسرے سوال کو اس لیے اہم قرار دیتا ہوں کہ اس پر پورے مسئلے کا انحصار ہے۔ اس دوسرے سوال کا جواب طے ہو جائے تو پھر تمام غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اور ایک متفقہ حل دریافت کرنا ممکن بن جائے گا۔

میثاقی نظام حکومت سے کیا مراد ہے؟

میثاقی نظام حکومت کا مطلب ہے کہ کئی مطلق العنان حکومتیں برضا و رغبت خود اپنے

مطلق العنان اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ایک اشتراک قائم کر لیتی ہیں۔ اور اس طرح ایک نئی حکومت وجود میں آ جاتی ہے۔ اس نئی حکومت کو اشتراک میں شمولیت کرنے والی تمام حکومتوں کے اس قدر اختیارات منتقل کر دیے جاتے ہیں جو اتحاد کے قیام کے لیے لازمی سمجھے جائیں اور جن سے نئی حکومت کے تحفظ کا اہتمام ہو سکے۔

امریکی وفاقی نظام کی بنیاد کیا ہے؟

یہ تو ہے میثاقی نظام کا اصولی خاکہ لیکن اس خاکے پر آج تک کسی میثاقی نظام حکومت میں فی الحقیقت عمل نہیں ہوا۔ خاص طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو اس خاکے پر بالکل عمل نہیں ہو رہا۔ وہاں یہ کہنا دشوار ہے کہ اشتراک میں شامل ہونے والی اکثر وحدتیں پہلے مطلق العنان تھیں۔ بعض وحدتیں تو وفاق کے قیام کے بعد اس میں آ کر شامل ہوئیں جن وحدتوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شمولیت اختیار کر رکھی ہے، ان میں سے اکثر ایسی وحدتیں ہیں جن کے حدود اربعہ کا تعین محض اصطلاحی تھا۔ بعض ریاستوں کی حدود تو نقشہ نویس کے محکمہ نے مقرر کیں۔ شروع شروع میں تو ان ریاستوں کا کوئی جداگانہ حقوق تھے نہ ریاستیں مفقود ہونے کی حالت میں کسی قسم کے حقوق کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ امریکی وفاق نظام حکومت نے خود ان ریاستوں میں سے اکثر کی تشکیل انجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ مطلق العنانیت کے اختیارات اگرچہ بڑے وسیع ہیں لیکن یہ اختیارات وفاق کے قیام سے پہلے وفاق میں شامل ہونے والی تمام وحدتوں کو حاصل نہ تھے۔ بلکہ خود وفاقی نظام حکومت نے ان وحدتوں کو عطا کیے تھے۔ لہٰذا یہ اختیارات وفاقی نظام حکومت کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ اختیارات تو اس وسیع جغرافیائی منطقہ کی خصوصیات میں شامل ہیں جس کا رقبہ قریب قریب ایک براعظم کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسی متعدد وحدتوں کا تصور نہیں آتا جو مطلق العنان تھیں۔ بلکہ ایسی وحدتوں کا تصور ذہن میں آتا ہے جنہیں خودمختاری کے اختیارات وفاقی آئین کے

ماتحت حاصل ہوئے۔

جرمن وفاقی نظام کی خصوصیات

مذکورہ بالا تعریف ان حقائق پر پوری طرح حاوی نہیں جو جرمنی کے وفاقی نظام حکومت سے متعلق ہیں۔ یہ درست ہے کہ جرمنی میں وفاقی مملکت کے قیام سے پہلے وحدتوں کا وجود تھا۔ مملکت کا قیام ان وحدتوں کی بدولت عمل میں آیا۔ تاہم مملکت ان وحدتوں کے رضا کارانہ اتحاد سے قائم نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی وفاق میں شامل ہونے والی تمام وحدتوں کا باہمی تعاون رضا کارانہ تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ پرشیا کی ریاست نے رفتہ رفتہ باقی تمام ریاستوں پر قابو پر لیا۔ جرمن ریاستوں کے رقبوں کی باہمی تفاوت اس قدر زیادہ ہے کہ جرمن وفاقی نظام کو کسی طرح امریکی وفاقی نظام کے مماثل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بڑے رقبے وای جرمن ریاستوں اور چھوٹے رقبے والی جرمن ریاستوں کے رقبے میں باہمی تفاوت اس قدر زیادہ ہے اور پھر سب سے بڑے رقبے والی جرمن ریاست تو دوسری ریاستوں سے اتنی بڑی ہے کہ ان سب کے مابین مساوات قائم کرنا ناممکن العمل ہے۔ یہ چھوٹی بڑی ریاستیں وفاقی سلطنت کے قیام میں مساوی حصہ دار نہیں بن سکتیں۔ اکثر ریاستیں تو ایسی ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں کبھی مطلق العنان نہ تھیں۔ اوران ریاستوں کی مطلق العنانیت داخلی نظم ونسق تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مطلب نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ماضی کے واقعات نے اور پھر موجودہ زمانے کے واقعات نے ان میں سے اکثر نام نہاد ''مطلق العنان'' ریاستوں کا وجود ہی ختم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ''مطلق العنان'' ریاستوں کا وجود زیادہ تر خالی ہے۔

بسمارک کا قائم کردہ میثاقی نظام

ان ریاستوں کا قیام جن تاریخی حالات میں ہوتا تھا میں یہاں ان کی تفصیل بیان نہیں کرسکتا۔ البتہ میں اس حقیقت کی جانب ضرور توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر ریاستوں کا حدود اربعہ ان کے باشندوں کی نسلی یگانگت سے غیر متعلق تھا۔ یہ حدود

اربعہ بعض سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ یہ سیاسی حالات اس افسوسناک زمانے میں رونما ہوئے جبکہ جرمن سلطنت رو بہ زوال تھی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ یہ چھوٹی موٹی ریاستیں اس انحطاط اور زوال کا نتیجہ بھی تھیں اور اس کا سبب بھی ان کا وجود ہمارے وطن میں انتشار رونما ہونے کا نتیجہ تھا۔

قدیم جرمن سلطنت کا آئین ان تمام مذکورہ بالا حقائق پر مبنی تھا۔ کم از کم اس آئین میں ان حقائق کا ایک حد تک لحاظ رکھا گیا تھا۔ وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کو پارلیمنٹ میں مساوی نمائندگی نہ دی گئی تھی۔ ان کی نمائندگی ان کے رتبے کے اعتبار سے تھی یا پھر یہ نمائندگی ان کی حقیقی اہمیت کے تناسب سے دی گئی تھی یا سلطنت کی تعمیر میں ہر وحدت نے جو حصہ لیا تھا اسے ملحوظ رکھتے ہوئے نمائندگی دی گئی تھی۔

وفاق میں شامل ہونے والی مختلف وحدتوں نے اپنی مطلق العنانیت کے اختیارات تمام و کمال رضا کارانہ طور پر وفاق کو منتقل کر دیے۔ اکثر وحدتوں کی مطلق العنانیت عملاً مفقود تھی۔ ان وحدتوں کے اختیارات تو پرشیا نے اپنے غلبہ کے زور سے ضبط کر لیے۔ بسمارک نے اس وفاق کا آئین تیار کرتے ہوئے جو اصول مدنظر رکھا وہ یہ نہ تھا کہ مختلف وحدتیں اپنے اختیارات وفاق کو منتقل کرتیں بلکہ جو اصول مدنظر رکھا گیا وہ یہ تھا کہ جرمن سلطنت کے قیام کے لیے جو اختیارات ضروری ہیں وہ وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں سے طلب کر لیے جائیں۔ یہ حکمت عملی اعتدال پسندانہ بھی تھی اور دانشمندانہ بھی۔ ایک طرف تو بسمارک نے رسوم و رواج اور روایات کا پورا لحاظ رکھا۔ دوسری طرف اس کی حکمت عملی نے نئی جرمن سلطنت کو اس کے روز قیام سے ہی مقبول اور ہر دل عزیز بنا دیا۔ ہر وحدت کا رضا کارانہ اور مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی کہ سمجھا جائے بسمارک جب یہ آئین تیار کر رہا تھا تو اس کے نزدیک اس آئین کے ماتحت جرمن وفاقی نظام حکومت کو وہ تمام برتر اختیارات حاصل ہو گئے جو آئندہ ہمیشہ کے لیے درکار ہو سکتے ہیں بسمارک کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ کئی امور ایسے تھے

جو شاید وفاق میں شامل ہونے والی وحدتیں اس وقت تسلیم نہ کرتیں۔ بسمارک کو یہ توقع تھی کہ زمانے کی رفتار اور ارتقاء کے تقاضے خود بخود وحدتوں کے اختیارات میں کمی پیدا کر دیں گے۔ کئی کام بتدریج کیے جائیں تو زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ فی الفور ہر وحدت کو مجبور کر کے اس کے اختیارات چھینے جا سکتے ہیں تو شاید نتیجہ ویسا اچھا نہ ہوتا۔ بسمارک کی اس حکمت عملی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کیسا قابل سیاسی مدبر تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جرمن سلطنت کی مطلق العنانیت کے اختیارات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اور وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے بسمارک کو جو توقع تھی زمانے نے وہی کام کر دکھایا۔

جرمنی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا حشر

جب جرمنی کو جنگ میں شکست ہوئی اور قیصریت کا نظام حکومت ختم کر دیا گیا تو اس کے نتیجہ یہ نکلا کہ وفاق میں شامل ہونے والی مختلف ریاستوں کے اختیارات بہت کم ہو گئے۔ اور مرکزی حکومت کے اختیارات بڑھ گئے۔ جرمن وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں کسی نسلی بنیاد پر قائم نہ تھیں۔ ان ریاستوں کی بنیاد سیاسی کوائف پر تھی۔ جونہی قیصر نظام حکومت ختم ہوا' اور مختلف تاجدار خاندانوں کے اختیارات سلب کر لیے گئے' تو ان ریاستوں کا وجود بھی معدوم ہو گیا۔ یہ ریاستیں تو قائم ہی تاجدار خاندانوں کے دم قدم سے تھیں۔ حکمران خاندانوں نے ہی ان ریاستوں کو قائم کیا تھا انہیں کے اثر سے ان ریاستوں نے ترقی کی تھی۔ جب ان ریاستوں کے قیام کی اصل وجہ ختم ہو گئی تو ان ریاستوں کا جداگانہ وجود کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ عملی تقاضوں سے مجبور ہو کر ان ریاستوں نے اپنے ہمسایوں سے الحاق کر لیا۔ یا بصورت دیگر رضاکارانہ طور پر زیادہ طاقتور ریاستوں میں مدغم ہو گئیں۔ ان واقعات سے ثابت ہو گیا کہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے موہوم اختیارات مطلق العنانیت درحقیقت نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان ریاستوں کے باشندے ان ریاستوں کے جداگانہ وجود کی

کچھ زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے۔

ملوکانہ نظام حکومت ختم ہو جانے سے جرمن سلطنت کے وفاقی نظام کو سخت دھکہ لگا تھا۔ جب صلح کا نام نہاد عہد نامہ قبول کر لیا گیا تو اس معاہدے سے پیدا ہو جانے والی ذمہ داریوں نے وفاقی نظام کو مزید ضعف پہنچایا۔

جرمن مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع کی وجوہات

جب جرمن سلطنت نے جنگ ہار کر اقتصادی تاوان ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی تو ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کے متعلق وفاق میں شامل ہونے والی ہر وحدت سے کوئی اقتصادی معاہدہ نہ کیا گیا۔ اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ وفاق میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں کے مالی اختیارات مطلق العنان نہ رہے۔ جوں جوں صلح نامے کی شرائط پر بتدریج عمل ہونے لگا تو جرمن قوم کی غلامی کی زنجیریں زیادہ مضبوط ہوتی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی جرمن حکومت نے مجبوراً ڈاک خانہ اور ریلوے کے محکموں پر بھی تسلط جما لیا۔ جرمنی کو لوٹنے کے لیے جنگ میں فتح پانے والی قومیں جس قدر اپنے مطالبہ میں اضافہ کرتیں اتنا ہی مرکزی جرمن حکومت کو طوعاً و کرہاً اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا پڑتا۔

یوں رفتہ رفتہ مرکزی جرمن حکومت کے اختیارات وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ اختیارات ی اس توسیع کے لیے جو شکل اختیار کی گئی وہ مضحکہ خیز تھی لیکن اختیارات کی یہ توسیع حالات کا طبعی اور منطقی نتیجہ تھی۔ اس توسیع کا الزام دراصل ان لوگوں اور سیاسی پارٹیوں پر ہے جنہوں نے ضرورت کے وقت جنگ جیتنے پر پوری توجہ نہ دی۔ اگر انہوں نے جنگ لڑنے میں پوری توجہ صرف کی ہوتی تو جرمنوں کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اس جرم کا ارتکاب زیادہ تر ان سیاسی پارٹیوں نے کیا جنہوں نے اپنے خود غرضانہ مفاد کو جنگ کے دوران میں جرمنی کے مفاد پر ترجیح دی۔ ایسی جماعتیں زیادہ تر بویریا میں تھیں۔ انہوں نے جرنی کا وہ حق ادا نہ کیا جن کی جرمنی کو ضرورت تھی۔ ہم جنگ ہار گئے

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی جو کچھ ان سے طلب کرتا تھا اس سے دس گنا زیادہ تاوان جنگ انہیں لوگوں کو ادا کرنا پڑا۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کا انتقام۔ شاید کسی جرم کے ارتکاب پر آسمانی عذاب اتنا جلد نازل نہیں ہوتا جتنا کہ اس جرم کے ارتکاب کے بعد نازل ہوا۔ وہی سیاسی جماعتیں جنہوں نے چند سال پہلے اپنی ریاستوں کے مفاد کو جرمن سلطنت کے مفاد پر ترجیح دی تھی اب لاچار اور مجبور کھڑی دیکھ رہی تھیں کہ واقعات نے مرکزی حکومت کو مجبور کر کے اس کے ہاتھوں مختلف ریاستوں کا وجود ہی ختم کر دیا تھا۔ ایسی جماعتیں زیادہ بویریا میں تھیں۔ انہیں اپنی کرنی کا پھل خود ہی بھگتنا پڑا۔

بیرونی غلامی اندرونی خلل کا باعث ہوتی ہے

مطلق العنانیت کے اختیارات چھن جانے سے جرمن وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے درجے میں جو فرق آیا اس پر اب ان کا واویلا ریاکاری کی بدترین مثال تھا۔ ان کے اس واویلے کا خطاب زیادہ تر رائے دہندگان سے تھا۔ کیونکہ فی زمانہ سیاسی پارٹیاں ہر معاملے میں رائے دہندگان ہی سے خطاب کرتی تھیں ادھر تو یہ سیاسی جماعتیں واویلا کرتی تھیں۔ کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے اختیارات کیوں کم کیے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یہی جماعتیں جرمنی کے دشمنوں کی جانب سے عائد کردہ شرائط صلح کے قبول کرنے کی بھی حامی تھیں جب جرمنی کے دشمنوں کی جانب سے عائد کردہ شرائط صلح تسلیم کر لی جائیں تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر جرمنی کے اندر ایسے حالات پیدا ہو جاتے تھے جن سے مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع ایک لازمی امر تھا۔ دشمنوں کی عائد کردہ شرائط تسلیم کر لینے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ جرمنی کی اندرونی حالت برقرار رکھی جاتی۔ بسمارک نے جو جرمن سلطنت قائم کی تھی وہ مطلق العنان اور خود مختار تھی۔ وہ جرمن سلطنت کے بیرونی اثر کے تابع نہ تھی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ بیرونی اطاعت بھی قبول کر لی جائے اور بسمارک کا قائم کردہ جرمنی کا داخلی نظام سلطنت بھی تبدیل نہ ہو۔

تاوان جنگ جرمنی کے لیے ایک لعنت ہے

بسمارک کی قائم کردہ جرمن سلطنت کے کندھوں پر کبھی اس قسم کی غیر منفعت بخش اقتصادی ذمہ داریوں کا بوجھ نہ تھا جیسی اب ڈاویز منصوبے کے تحت جنگ کے بعد جرمنی کے ذمے ڈال دی گئی تھیں۔ داخلی معاملات میں بسمارک کی قائم کردہ سلطنت کو زیادہ اختیارات کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ سلطنت صرف ایسے داخلی امور میں دلچسپی لیتی تھی جو اس کا وجود قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس سلطنت کے ماتحت وفاقی نظام میں شامل ہونے والی ریاستوں پر مرکزی حکومت کو کوئی بالادستی کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ مرکزی حکومت کے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ رقم کافی ہو جاتی تھی جو وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں رضا کارانہ طور پر ادا کرتی تھیں۔ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کو مرکزی حکومت کے اخراجات پورا کرنے کے لیے تھوڑی رقم ادا کرنی پڑتی تھی کہ وہ اس مرکزی حکومت سے بہت خوش تھے۔ اب یہ کہنا خالی پروپیگنڈہ ہے۔ کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں صرف اس وجہ سے مرکزی حکومت سے ناراض ہیں کہ مرکزی حکومت نے ان پر اقتصادی اور مالی بالادستی حاصل کر لی تھی۔ حقیقت حال یہ نہیں۔ مرکزی جرمن حکومت سے ناراضگی کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مطلق العنانیت میں فرق آ گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مرکزی جرمن حکومت جرمن قوم کے مفادات کو بری طرح نظر انداز کر رہی ہے۔ آج جرمن قوم کا ہر عنصر یہ محسوس کرتا ہے کہ گو برائے نام قومی جھنڈے کا احترام کیا جاتا ہے اور آئین حکومت کو وقیع سمجھنے کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے لیکن موجودہ مرکزی جرمن حکومت اپنے شہریوں کی آرزوؤں کی ترجمان ہے۔ پنچایتی سرکار نے اپنے تحفظ کے لیے جو سیفٹی ایکٹ کا قانون بنا رکھا ہے اس سے پنچایتی سرکار کے خلاف لوگوں کی زبانیں تو بند کی جا سکتی ہیں لیکن ایک بھی جرمن شہری کی ہمدردی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ کس قسم کی سرکار ہے جسے ہمیشہ اس قسم کے قانون

بنانے کی حاجت رہتی ہے کہ اپنے شہری اس پر نکتہ چینی نہ کرسکیں۔اسی مقصد کے لیے سرکار نامدار لوگوں کو قید و بند کی سزائیں دینے پر بھی مجبور ہے۔اس پنچایتی سرکار کی ان حرکتوں سے ہی دنیا میں پنچایتی سرکار کے ادارے کا نام بدنام ہوگیا ہے۔

آئینی نظام سیاسی کمزوریاں ٹھیک نہیں کرسکتا

آج کل بعض سیاسی پارٹیاں کہتی ہیں کہ مرکزی جرمن حکومت اس لیے غیر ہر دل عزیز ہوگئی ہے کہ مرکزی حکومت نے وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مطلق العنانیت کے بعض ایسے اختیارات چھین لیے ہیں جو پہلے انہیں حاصل نہیں تھے۔ان سیاسی جماعتوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں فرض کیجیے کہ مرکزی حکومت وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں پر اپنے اختیارات میں توسیع نہ کرتی۔باوجود اس کے مرکزی حکومت کی ہر دل عزیزی میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کو جو معمولی اقتصادی بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے وہ تو پھر بھی برداشت کرنا پڑتا جب مرکزی حکومت صلح نامے کے ساتھ ماتحت ایسی شرائط قبول کرلیتی جن کی رو سے جرمنی میں کثیر تاوان ادا کرنا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا کہ وہ تاوان خود مرکزی حکومت ادا کرے یا وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں ادا کریں۔اگر ہر ریاست کو اپنے طور پر تاوان جنگ ادا کرنا پڑتا جو آج مرکزی حکومت ادا کر رہی ہے یا معاہدہ وارسائی کی ناواجب ہدایات پر عمل کرنا پڑتا تو اس صورت میں مرکزی حکومت کی مخالفت زیادہ شدید ہوتی مرے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مرکزی حکومت کے لیے وفاق من شامل ہونے والی ریاستوں سے علیحدہ علیحدہ تاوان جنگ وصول کرنا اور بھ مشکل ہوتا۔نتیجہ یہی ہوتا کہ اس تاوان کو وصول کرنے کے لیے جبر اور سختی سے کام لینا پڑتا آج جرمن پنچایتی سرکار جنگ کے بعد صلح ناموں کی ان شرائط سے نجات حاصل کی جائے میں نہ یہ ہمت ہے اور نہ یہ امنگ کہ صلح ناموں سے نجات حاصل کی جائے۔جب صورت حال یہ ہے تو پھر پنچایتی سرکار مجبور ہے کہ جن صلح ناموں کو اس نے قبول کر رکھا ہے ان کی شرائط پر عمل بھی کرے۔اس

صورت حال کی ذمہ داری تمام تر ان سیاسی جماعتوں کے سر پر ہے جو ایک طرف رائے دہندگان کو وفاقی ریاستوں کو خود مختاری قائم رکھنے کی تلقین کرتی ہیں دوسری طرف یہی سیاسی جماعتیں مرکزی جرمن حکومت اور اس کی پالیسی کی حمایت کرتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سرے سے **ملک** اور قوم کے تمام اختیارات مطلق العنانیت ہی ختم ہو جائیں۔

حکومت کی بیرونی مجبوریوں سے اندرونی کمزوریوں میں اضافہ ہوتا ہے

میں نے اوپر کہا ہے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہے ک **ملک** اور قوم کے حقوق آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میرے اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے پاس ایسے وسائل آمدنی نہیں جو اس کی موجودہ احمقانہ اور مجنونانہ داخلی اور خارجی سیاسی حکمت عملی کے اخراجات پورے کر سکیں۔ اس غلط داخلی اور خارجی پالیسی کا ایسا چکر چل گیا ہے کہ اندرونی مجبوریاں بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہیں۔

مرکزی جرمن حکومت ہر نیا قرضہ قبول کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے کہ جرمنی کے مفادات بیرونی حکومتوں سے تعلق قائم کرتے وقت مجرمانہ حد تک نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ ہر نیا قرضہ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندرونی حالات پہلے سے بدتر ہوتے جاتے ہیں جب اندرونی اقتصادی حالات خراب ہوتے ہیں تو مزید قرضے کی حاجت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات کم کرنے پڑتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس پالیسی کی مخالفت نہ کر سکے بلکہ مخالفت کرنے والوں کا وجود ہی مٹ جائے۔

باہر گیدڑ گھر میں شیر

موجودہ جرمن حکومت کی پالیسی اور پرانی جرمن حکومت کے حالات میں بڑا فرق یہ ہے کہ پرانی جرمن سرکار داخلی پالیسی میں اپنی رعایا کو آزادی دیتی تھی۔ اور بیرونی دنیا

سے معاملات طے کرتے وقت اپنی اولوالعزمی کا ثبوت دیتی تھی۔ برعکس اس کے موجودہ پنچایتی سرکار کا حال یہ ہے کہ گھر کے کمزور باشندوں پر تو شیر ہے اور باہر کے طاقتور اجنبیوں کے سامنے گیدڑ کی طرح دم دبائے پھرتی ہے۔ پرانی حکومت کی داخلی اور خارجی حکمت عملی بھی ایک دوسرے کا نتیجہ تھیں۔ ایک اولوالعزم قومی سرکار کو داخلی انتظامات چلانے کے لیے بہت زیادہ قانون بنانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ ایسی سرکار سے اس کی رعایا کی وابستگی اور عقیدت ہی نہیں حکومت کی اطاعت پر مائل رکھتی ہے۔ برعکس اس کے جو سرکار بین الاقوامی تعلقات میں غلام ہے اس کے زندہ رہنے کے لیے سوائے اس کے چارہ ہی نہیں کہ اپنی رعایا پر ظلم اور زبردستی سے اسے اپنے آقاؤں کی خدمت پر مجبور کرے۔

قومی جھنڈے اور نوکری کے ٹھپہ میں فرق

موجودہ سرکار جب ''آزاد شہری'' کی ترکیب استعمال کرتی ہے تو سفید جھوٹ بولتی ہے۔ آج اس سرکار کے ماتحت آزاد شہری کہاں پائے جاتے ہیں آزاد شہریوں کا وجود تو پرانی جرمن سرکار کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ موجودہ سرکار کے ماتحت تو جرمنی غلاموں کی ایک نوآبادی ہے جس کا کام فقط غیروں کی خدمت گزاری ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت کے تحت ہم رعایا کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ہم آزاد شہری کہلانے کے حقدار تو ہرگز نہیں۔ سرکار کے جھنڈے کو قومی جھنڈا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو نوکروں کی ایک انجمن کا ٹریڈ مارک ہے۔ یہ ٹریڈ مارک ہمارے ارمانوں اور تمناؤں کا ترجمان نہیں۔ اس ٹریڈ مارک کا ٹھپہ خالی قانون کے زور پر اور افسروں کے حکم سے چل رہا ہے۔ اس پنچایتی سرکار کی علامتیں اور نشانات وہی وقعت رکھتے ہیں جو خانساموں اور بہروں کی وردی کی ہوتی ہیں۔ جمہوریت کا یہ نسخہ کبھی ہمارے قوم کے مزاج کے مطابق نہیں بن سکتا۔ موجودہ پنچایتی سرکار کو قدیم روایات کے احترام کا کوئی احساس نہیں۔ یہ سرکار ماضی کی عظمت کی قدردان نہیں۔ اس سرکار نے گزری ہوئی

عظمت کے نشان خاک میں ملا دیے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب اس سرکار کو پتہ چل جائے گا کہ اس کی رعایا خود سرکار کے نشانات کا احترام کرتی ہے۔ یہ پنچایتی سرکار بھانڈوں کا وہ تماشا ہے جو کسی سنجیدہ مجلس میں محض طبع کے لیے تھوڑا وقت لے جائے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ پنچایتی سرکار وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے اختیارات کم کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے اس طرز عمل کی وجوہات صرف اقتصادی نہیں بلکہ اصولی بھی ہیں۔ یہ سرکار اقتصادی دھوکہ بازی کی مرتکب ہوئی ہیں وہ اپنی رعایا کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے میں شرم محسوس ہیں کرتی۔ یہ سرکار اپنی رعایا کے حقوق پر دست درازی کر رہی ہے۔ وہ اپنی رعایا کو اس لیے دبا کر رکھنا چاہتی ہے کہ کہیں اس کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔

گھر میں حکومت محبت کے بل پر ہوتی ہے نہ کہ جبر سے

ہم قوم پرست اشتراکی اس سرکار کے اصولوں کے الٹ چلیں گے۔ ہمارا اصول یہ ہو گا کہ ایک مضبوط قومی سرکر جس کا مقصد داخلی اور خارجی پالیسی میں اپنے شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہو ہمیشہ اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دے سکتی ہو۔ اس آزادی سے سرکار کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مضبوط قومی سرکار اپنے شہریوں اور وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی انفرادی آزادی اور اجتماعی مفاد کی خاطر بڑی حد تک پابندی بھی کر سکتی ہے۔ اس کی یہ پابندیاں بخوشی قبول کی جاتی ہیں کیونکہ ان کا طرز عمل قومی سلطنت کی نگہداشت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس کے قوانین اور فیصلے اس کے شہریوں کو اس لیے قبول ہوتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا مقصد ساری قوم کی قدر افزائی ہے۔

مرکز کو صوبوں پر بالا دستی ہونی چاہیے

دنیا کی ہر سرکار کو اپنی داخلی تنظیم میں اتحاد کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس معاملے میں جرمنی بھی مستثنیٰ نہیں۔ آج کل جرمن سلطنت میں شامل ہونے والی وحدتوں کی مطلق

العنانیت کا تصور قطعاً لایعنی ہے۔ ان میں سے بعض ریاستوں کا رقبہ اتنا چھوٹا ہے کہ ان کی مطلق العنانیت محض ایک واہمہ ہے۔ تجارت اور نظم ونسق دونوں کے لحاظ سے ریاستوں کی اہمیت اب بہت گھٹ چکی ہے۔ اور مزید گھٹ رہی ہے۔ جدید وسائل رسل ورسائل اور مشینی ترقی نے فاصلے کم کر دیے ہیں اور دور کے علاقے قریب بنا دیے ہیں۔ جو علاقہ کبھی ایک ریاست ہوتا تھا اب ایک صوبہ ہے۔ جو منطقہ کبھی براعظم کہلاتا تھا اب وہ ایک سرکار کے ماتحت ہے۔ اگر محض اصولی اور اصطلاحی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو جرمنی کے نظم ونسق کے لیے علاقائی تقسیم کا مسئلہ کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں کہ جو آج سے سو سال پہلے برانڈن برگ کے ضلعے کے نظم ونسق کا مسئلہ تھا۔ آج میونخ سے برلن جانا اس سے زیادہ آسان ہے جتنا آج سے سوال پہلے میونخ سے سٹارن برگ جانا مشکل تھا۔ جدید وسائل رسل ورسائل کے طفیل آج جرمنی کے تمام رقبے کی وسعت اس سے کم ہے جو نپولین کے ساتھ جنگ کے زمانے میں جرمن وفاقی ریاستوں کے رقبے کی وسعت تھی۔ اگر کوئی شخص ان حقائق سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک گزرے ہوئے زمانے میں ہی زندگی بسر کر رہا ہے دنیا میں ہمیشہ ایسے لوگ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جن کی زندگیاں زمانہ حال کی نسبت زمانہ ماضی سے زیادہ متعلق ہوتی ہیں۔ ایسے بزرگوار تاریخ کے ارتقاء کی رفتار کو سست تو کر سکتے ہیں لیکن وہ اسے روک نہیں سکتے۔

ریاکاری کا پول ایک دن کھل کر رہے گا

ہم جرمن قوم پرست اس اصول کے قائل ہیں' کہ سچ سچ ہوتا ہے اور حق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان مسائل پر ہم قوم پرست کھاتی پیتی سیاسی پارٹیوں کے لفظی نعروں سے گمراہ نہیں ہونا چاہتے۔ میں نے لفظی نعروں کی اصطلاح اس لیے استعمال کی ہے کہ ان پارٹیوں کو خود بھی سنجیدگی سے یہ اعتقاد نہیں ہے کہ ان کی تجاویز پر عمل ہو سکتا ہے۔ وہ خود ہی تو اس سازش میں شریک ہونے والے مجرم ہیں جنہوں نے موجودہ صورت حال

پیدا کی ہے۔ خاص طور پر بویریا میں مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو روکنا فقط ایک جماعتی نعرہ ہے جس کے پس پشت کوئی سنجیدہ منصوبہ نہیں۔ اگر ان جماعتوں کو کبھی اپنے لفظی نعروں کو عملی جامہ پہنانا پڑا تو ان کی حالت قابل دید ہوگی۔ بویریا کی مطلق العنانیت کے اختیارات پر مرکزی حکومت کی جانب سے ڈاکہ ڈالنے کا چرچا تو اتنا کیا جاتا ہے لیکن آج تک اس ڈاکہ کو روکنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی۔ ہاں ہر موقعہ پر کچھ غیر موثر نعرے ضرور بلند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سنجیدگی سے اس پاگل پن کی مخالفت کرتا ہے کہ مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو روکنا ٹھیک نہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تم موجودہ زمانے کی سرکار کی ضروریات اور ان کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع کی مخالفت کو جو شخص اچھا نہ سمجھے اس کی توہین کی جاتی ہے۔ اسے ایک طرفہ تماشا قرار دیا جاتا ہے۔ اسے تنگ کیا جاتا ہے کہ پھر یا تو اسے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تقریر کرنے سے منع کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات میں ہماری تحریک کے مقلدین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وفاق کا نفاق کس ریاکاری کا آئینہ دار ہے۔ یہ ریاکار لوگ وفاقی نظریہ کی حمایت سے ویسا ہی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جیسا کہ مذہب سے! ان کا اصلی مطلب دونوں صورتوں مس اپنا اور اپنی ٹولی کا ناجائز فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ملکی اتحاد صرف محبان قوم قائم کر سکتے ہیں

ملک میں ایک خاص حد تک اتحاد پیدا کرنا ضروری ہے۔ بالخصوص رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذرائع میں ایک متحدہ نظام لازمی ہے۔ ہم قوم پرست اشترا کی اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ موجودہ سرکار کے ماتحت "ملکی اتحاد" کے جو جھوٹے نعرے بلند کیے جاتے ہیں ان کی پوری طاقت سے مخالفت کریں۔ ان اتحاد کے نعروں کا مقصد فقط یہ ہے کہ موجودہ حکومت کی مہلک خارجی پالیسی پر پردہ ڈالا جائے بغیر اس پردے کے یہ پالیسی

نہیں چل سکتی ۔ موجودہ مرکزی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ریلوے ڈاک خانہ اور مالیات کے محکمے مرکزی تسلط کے ماتحت کر دیے جائیں گے ۔ اس تجویز کا مقصد یہ نہیں کہ قومی زاویہ نگاہ سے کوئی مفید پالیسی اختیار کی جائے ۔ بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ اغیار سے جو معاہدے کیے جا چکے ہیں ان کو پورا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے ۔ اس وجہ سے ہم قوم پرست اشتراکی ہر وہ ممکن اقدام کریں گے جس سے اس پالیسی میں رکاوٹ ڈالی جا سکے ۔ اگر ممکن ہو تو ہم یہ بھی کوشش کریں گے کہ اس پالیسی کو ختم ہی کر دیا جائے ۔ ہم ہر اس کوشش کا مقابلہ کریں گے جس کا مقصد تمام محکموں کو ایک مرکز کے ماتحت لانا ہو ۔ بالخصوص ایسے محکمے جو ہماری قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے بڑے ضروری ہیں ہماری اس مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ بحالات موجودہ تمام محکموں کو ایک مرکز کے تحت لانے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کروڑوں روپیہ تاوان جنگ ادا کیا جائے ۔ جرمن سامان اور جائیداد اس تاوان کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر غیروں کے حوالے کر دی گئی ۔ اس تمام کارروائی کے مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جنگ کے بعد جو معاہدات ہمارے نام نہاد سیاست دانوں نے قبول کیے ہیں ان پر عمل ممکن بنایا جائے ۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر قوم پرست اشتراکی تحریک کو ایسے رجحانات کا تدارک کرنا ہی پڑے گا ۔

چھوٹی چھوٹی جنگیں بڑے بڑے مقاصد کا نام لے کر جیتی جا سکتی ہیں

ہم اس مرکزی کی پالیسی کے اس لیے بھی مخالف ہیں کہ داخلی طور پر اس نظام کے ماتحت ملک میں ایک ایسی تقویت پہنچی ہے جس کی ہر حرکت جرمن قوم پر مصائب لانے کا سبب بنتی رہی ہے ۔ موجودہ جمہوری سرکار دراصل ایک یہودی سرکار ہے ۔ یہ سرکار جرمن ملت کے لیے ایک لعنت ہے جرمن وفاق میں شامل ہونے والی مختلف ریاستیں آج اس سرکار پر نکتہ چینی کر رہی ہیں ۔ یہ وہ ریاستیں ہیں جن پر ابھی زمانہ کا سایہ نہیں پڑا ۔ موجودہ

سرکار چاہتی ہے کہ اس نکتہ چینی کو ختم کر دیا جائے ۔موجودہ سرکار کی بھی یہ کوشش ہے کہ ان ریاستوں کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔اندریں حالات ہم قوم پرست اشتراکیوں کا یہ فرض ہے کہ ان ریاستوں کی انفرادی نکتہ چینی کو ایسی شکل دیں کہ جس سے اس نکتہ چینی کے زیادہ موثر ہونے کا امکان پیدا ہو جائے ۔اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کی مرکزیت کی پالیسی کے خلاف جدوجہد کو ای ایسی جدوجہد کی صورت دی جائے جو تمام جرمن قوم کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد کہلا سکے۔بویریا کی عوامی پارٹی اپنے محدود اور تنگ زاویہ نگاہ سے بویریا کی ریاست کی خصوصی حقوق کی جنگ لڑ رہی ہے ۔ہم بھی بویریا کے ان خصوصی حقوق کی خاطر جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس محدود اور تنگ زاویہ نگاہ سے نہیں ۔ ہمارا زاویہ نگاہ بالکل مختلف ہے ۔ ہماری یہ جدوجہد اعلیٰ قومی مفاد کی خاطر ہے۔ہم اس جدوجہد میں اس لیے شریک ہیں کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں برسر اقتدار آنے والی جمہوری سرکار کا قلع وقمع کر سکیں۔

مرکزیت اس حکومت کو زیبا نہیں جو غیروں کی آلہ کار ہو

ہم مرکزیت کی اس پالیسی کے اس لیے بھی خلاف ہیں کہ قومی ملکیت کی جو صورت فی الحال اختیار کی جا رہی ہے اس سے نہ اتحاد پیدا ہوتا ہے نہ نظم ونسق میں کوئی آسانی کی راہ نکلتی ہے ۔اس نام نہاد قومی ملکیت کے منصوبے کا بحالات موجودہ مطلب صرف یہ ہے کہ بعض اداروں کو وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کے خودمختارانہ قابو سے نکال کر انقلابی پارٹیوں کے حوالے کر دیا جائے ۔ جرمنی کی تاریخ میں دوست نوازی کی اس سے بڑھ کر کوئی مکروہ مثال نہیں ملتی جو جمہوری سرکار نے پیش کی ہے ۔آج جو مرکزیت اختیار کی جا رہی ہے یہ ان سیاسی پارٹیوں کا کارنامہ ہے جنہوں نے وعدے کیے تھے کہ صاحب استعداد افراد کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کی جائے گی ۔ کیا اصحاب استعداد افراد کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کا یہی مطلب ہے کہ عہدوں اور ملازمتوں پر صرف ان پارٹیوں کے جنبہ دار افراد کو مسلط کر دیا جائے؟ جب سے یہ پنچایتی سرکار بنی ہے

یہودیوں کو ہر اس اقتصادی ادارے میں بڑے بڑے عہدے ملتے رہے ہیں جس پر مرکزی حکومت نے قبضہ کیا ہے۔ یہودیوں کو قومی نظم ونسق میں بھی عہدے ملتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اقتصادی ادارے اور نظم ونسق دونوں یہودیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے دشمن کو ہمارے خلاف جنگ میں تمام ٹھکانے کی جگہوں پر تسلط حاصل ہو جائے۔ تو ہم مجبور ہیں کہ مرکزیت کی پالیسی کے حق میں ہر نئے قدم پر نگاہ رکھیں۔ اور ہر مرحلے پر اس کی مخالفت کریں۔ ہماری ان تمام سرگرمیوں میں ہمارا زاویہ نگاہ ہمیشہ یہ ہوگا کہ بلند قومی مقاصد ہمارے پیش نظر رہیں گے۔ ہم تنگ نظری اور تعصب سے ہمیشہ بچیں گے۔

قوم کے ماتحت اجزا کی خودمختاری تسلیم نہیں کی جاسکتی

تعصب اور تنگ نظری سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ہماری تحریک کے مقلدین میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ ہم جرمن سلطنت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے ماتحت تمام ریاستوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات پر بالادستی کے حقوق رکھتی ہیں۔ جہاں تک جرمن سلطنت میں اس حق کا تعلق ہے۔ ہم اس میں ذرہ بھی شک نہیں کر سکتے۔ اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سرکار محض ایک پیکر کا نام ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس پیکر کی جان یا مطلب کیا ہے۔ سرکار کے پیکر میں حقیقی روح اور اصل مطلب قوم ہوتی ہے۔ یہ واضح ہے کہ قوم کے بالاتر مفاد کے سامنے ہر مفاد قربان کیا جا سکتا ہے۔ ہر مفاد قومی مفاد کے ماتحت ہے۔ جرمن سلطنت اور قوم کے اندر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ مطلق العنانیت کی طاقت یا اختیار کسی اور وحدت کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ جرمن وفاق میں شامل ہونے والی بعض ریاستیں اپنے نمائندے غیر ملکوں میں بھیجتی رہتی ہیں۔ علی ہذا القیاس غیر ملکوں کے نمائندے ان ریاستوں کے ہاں مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ یہ ختم ہو کر رہے گی۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ بعض غیر ممالک جرمن

سلطنت کو سرے سے ایک سلطنت ہی نہیں سمجھتے۔ ان کی سیاسی روش بھی ان کے اسی شک کی ترجمان ہے۔ ان سفارتی نمائندگان کا تقرر اس لیے بھی ناقابل برداشت ہے کہ اس سے ذرا بھر بھی فائدہ نہیں پہنچتا' بلکہ بہت نقصان ہوتا ہے۔ اگر کسی غیر ملک میں کسی جرمن شہری کے مفاد میں جرمن سلطنت کے سفیر کی کوششوں سے حفاظت نہیں ہو سکتی تو یہ کہاں ممکن ہے کہ جرمن وفاق کی کسی ننھی منی ریاست کا نمائندہ اس کام میں کامیابی حاصل کر لے گا۔ دنیا میں موجودہ بین الاقوامی نظام میں جرمن وفاق کی ان ننھی منی ریاستوں کو وجود ہی مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی وفاقی ریاستیں غیر ملکی سرکاروں کی نگاہ میں محض جرمنی پر حملہ کرنے کے لیے دروازے اور سوراخ کا کام دیتی ہیں یا پھر وہ ایسا علاقہ سمجھی جاتی ہیں جسے جرمنی سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ہم جرمن قوت پرست یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ نوابوں کے کسی کہنہ خاندان کا کوئی فرد اس توقع سے بیرونی سفارتیں قبول کرے جو درخت اب مرجھا چکا ہے۔ اس کی ٹہنیاں از سر نو زمین میں گاڑ دی جائیں۔ تو شاید پھر یہ پورا ہرا بھرا ہو جائے۔ پرانی جرمن سرکار کے غیر ممالک میں سفارتی نمائندے ایسے ناکام ثابت ہوئے کہ اب آزمائے ہوئے تجربہ کو دوبارہ آزمانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صوبوں کی اہمیت ثقافتی ہونی چاہیے اور مرکز کی اہمیت سیاسی ہونی چاہیے

مستقبل میں ہماری پالیسی یقیناً یہی ہو گی کہ جرمن وفاق میں شامل ہونے والی مختلف ریاستوں کی انفرادی اہمیت ثقافتی دائرے تک محدود کر دی جائے جس تاجدار نے بویریا کو ایک مرکز بنا دیا وہ کوئی ضدی اور افتراق پسند یا جرمنی کا دشمن نہ تھا۔ بلکہ وہ تو جرمنی کی عظمت کا بھی ویسا ہی خواہاں تھا کہ جیسا کہ فنون لطیفہ کا قدردان تھا۔ اس کا نام لجوگ اول تھا۔ اس کا سب سے بڑا شوق یہ تھا کہ سرکاری اختیارات کے استعمال سے بویریا کی ثقافتی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ وہ بویریا کی سیاسی قوت

بڑھانے کا ایسا مشتاق نہ تھا۔ اس نے اپنے ثقافتی شوق سے بویریا کو ایسی ترقی دی کہ اگر وہ سیاسی اقتدار کے پیچھے بھاگتا تو شاید بویریا کو یہ منصب حاصل نہ ہوتا۔ اس بادشاہ کے زمانے تک میونخ محض ایک دیہاتی قصبہ تھا جس کی اہمیت معمولی تھی۔ اس شہر سے زیادہ تر باشندے یہاں رہائش رکھنے کے علاوہ کسی اور خصوصیت کے لیے مشہور نہ تھے۔ لجوگ اول نے اس شہر کو جرمن فنون لطیفہ کا مرکز بنا دیا۔ اس نے اس شہر کو عقل و دانش کا ایک ایسا سرچشمہ بنا دیا کہ آج بھی فقط اس شہر کی طفیل فرانکونیا بویریا میں شامل ہے۔ حالانکہ فرانکوینا کے باشندوں کی طبائع اہل بویریا سے بالکل مغائر ہیں۔ اگر میونخ ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ پہلے تھا تو جو واقعات سیکسینی میں پیش [illegible] ئے وہی بویریا میں بھی پیش آتے۔ بس فرق اتنا ہوتا ہے اور بویرین نیورن برگ آج بویریا کے شہر نہ ہوتے بلکہ فرانکوینا میں شامل ہوتے۔ میونخ کو ایک عظیم شہر بنانے کے لیے "پرشیا مردہ آباد" کا نعرہ بلند کیا گیا تھا۔ اس شہر کی اہمیت بڑھانے کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ شاہ لجوگ نے میونخ کو فنون لطیفہ سے مرصع کر کے جرمن قوم کی آرائش و زیبائش کے لیے ایک زیور بنا دیا۔ ایسا زیور جس کی خوبصورتی کا اندازہ اسے دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آج میونخ جرمنی کے جسم پر سچ مچ کا زیور کا کام دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جسے مستقبل میں بھی یاد رکھنا چاہیے۔ مستقبل میں مختلف ریاستوں کی اہمیت ان کی سیاسی و ریاستی طاقت پر منحصر نہ ہو گی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ریاستوں کو ثقافت، تمدن اور مقامی نسل کو محفوظ رکھنے کے مراکز بن جانا چاہیے۔ لیکن یہ خصوصیتیں بھی ایسی ہی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ دھندلی پڑ جائیں گی۔ موجودہ زمانے میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کے وسائل اتنے ترقی کر گئے ہیں اور ایک علاقے کے باشندے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے یوں گھل مل گئے ہیں کہ برادریوں اور قبیلوں کے امتیازات زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتے۔ حتیٰ کہ ثقافت اور تمدن کی صورت میں بھی رفتہ رفتہ سارے ملک میں یکساں ہو جائے گی۔

فوج کو صوبائی امتیازات سے بالاتر رکھنا چاہیے

فوج کو مختلف ریاستوں کے فرق سے پاک رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ماضی میں یہ غلطی کی جاتی تھی کہ مختلف ریاستوں کی تمیز فوج کے اندر بھی قائم رہتی تھی۔ یہ کام فوج کا نہ تھا۔ نہ فوج کے دائرے سے متعلق ہونا چاہیے تھے۔ آنے والے دور میں جب قوم پرست اشتراکی سرکار قائم ہو گی تو ماضی کی اس غلطی کو دہرایا نہ جائے گا۔ جرمن فوج اس لیے نہیں بنائی گئی کہ قبائلی امتیازات کو قائم رکھنے کے لیے ایک مکتب کا کام دے یا ان امتیازات کو ترقی دے جرمن فوج تو اس لیے قائم کی گئی ہے کہ تمام جرمنوں کو ایک دوسرے کی شناخت سکھانے اور ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے کی درس گاہ کا کام دے۔ قوم کی زندگی میں ہر وہ شخص جو انتشار اور افتراق پھیلاتا ہے جس سے جدائی کا احساس پیدا ہوتا ہے اسے فوج کے اندر اتحاد کی غرض سے استعمال کرنا چاہیے۔ فوج کا یہ فرض ہے کہ جرمن بچے کو اس کے پیدائشی صوبے اور ضلع کو ان کی مقامی خصوصیات سے سکھانے کی حاجت نہیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ بچوں کو مادر وطن کی خصوصیات سے آگاہ کیا جائے۔ جب سپاہی کو ایک دن جان ہتھیلی پر رکھ کر قوم کا دفاع کرنا ہو گا تو اس کے ذمے سارے ملک کی حفاظت ہو گی نہ کہ کسی خاص علاقے کا بچاؤ۔

عسکری رنگروٹوں کو مادر وطن کی سیر کرانی چاہیے

یہ ایک نہایت احمقانہ دستور ہے کہ جرمن نوجوانوں کو عسکری تربیت اس علاقے میں دی جاتی ہے جہاں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ عسکری تربیت کا زمانہ وہ دور ہے جب کہ ہر رنگروٹ کو تمام جرمنی سے آشنا کرنا چاہیے۔ آج سپاہیوں کو تمام جرمنی سے روشناس کرانے کی حاجت اور بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان جرمن جس طرح پہلے کبھی سارے ملک میں سفر کر کے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کیا کرتے تھے اب وہ خود اپنے شوق سے اس طرح اپنے سارے ملک کا سفر نہیں کرتے۔ ان حالات میں یہ کیسی غیر دانشمندانہ حرکت ہے کہ بویریا کے نوجوان رنگروٹ سٹٹ گارٹ میں رکھے جاتے

ہیں۔ بیڈن کے رنگروٹ بیڈن میں رکھے جاتے ہیں ۔والمر کے رنگروٹ سٹٹ گارٹ میں رکھے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ بویریا کے رنگروٹوں کو دریائے رائن اور بحر شمالی کی سیر کرائی جاتی ۔ہمبرگ کے باشندوں کو کوہ ایلپس کے نظارے دکھائے جاتے ۔مشرقی پرشیا کے جوانوں کو وسطی جرمنی کے پہاڑ دیکھنے کا موقع ملتا؟ یہ درست ہے کہ ہر علاقے کی خصوصیات کے مطابق اس علاقے کے فوجیوں کی تنظیم ہونی چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تربیت کے وقت بھی ان امتیازات کو روا رکھا جائے ۔ یہ تو ممکن ہے کہ فوج کو یکجا کرنے پر کسی کو اعتراض نہ ہو' لیکن فوج کے متحد کرنے پر کیسے اعتراض ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص سرکار کے دیگر محکموں کو یکجا کرنا ناپسند کرتا ہو لیکن فوج کو یکجا کرنے پر ہر شخص مسرت کا اظہار کرے گا۔آج کل جرمنوں سرکار کی فوج کی تعداد اتنی کم ہو چکی ہے کہ اب اس فوج کی ریاست وار تقسیم سراسر نادانی ہوگی۔آج جرمن فون کو یکجا اور متحد کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جس کے ہم مخالف نہیں بلکہ ہم مستقبل کی قومی فوج بھی اس نمونہ پر بنائیں گے ۔

اعتقاد اور ایمان سے سب زنجیریں کٹ جاتی ہیں

سب سے ضروری یہ بات ہے کہ قوم کے اندر ایک نئے اعتقاد اور ایمان کا جوش و خروش سرایت کر جائے ۔ایسا اعتقاد اور ایسا ایمان جس کی آخری کامیابی پر کسی کو شک نہ ہو۔ جب ایسا اعتقاد اور ایسا ایمان پیدا ہو گیا تو سب زنجیریں کٹ جائیں گی ۔ ہماری ترقی کے راستے سے ہر دشواری اور ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔قوم پرست اشتراکیت اس حق کی دعوے دار ہے کہ ہمارے اصول پوری جرمن قوم پر مسلط ہونے چاہئیں ۔ہم اس معاملہ میں ریاستی حدود کو کوئی رکاوٹ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ہم پوری جرمن قوم کو اپنے اعتقادات اور اپنے اصولوں کی تعلیم دے کر رہیں گے ۔جس طرح دنیا کے ادیان و مذاہب سیاسی حد بندیوں کو اپنی تبلیغ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں سمجھتے اسی طرح قوم پرست اشتراکی اعتقاد بھی جرمنی کی مختلف ریاستوں یا صوبوں کو ایسی دیواریں نہیں سمجھتا

جو عبور نہ کی جاسکتی ہوں۔ ہر ریاست مادر وطن کا جزو ہے اور اسے خطاب کرنا اور قابل کرنا ہمارا حق اور فرض ہے۔

انفرادی آزادی قومی استقلال کی جدوجہد کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے

قوم پرست اشتراکیت کے اصول کسی ایک ریاست کے سیاسی مفاد کے آلہ کار نہیں۔ وہ دن آنے والا ہے جب یہ اصول ساری جرمن قوم کے مرشد اور رہنما ہونے کی خدمت انجام دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان ملکی حدود کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں جو بعض ایسی سیاسی تبدیلیوں کے باعث قائم کر دی گئی ہیں جن کے ہم اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتے۔

جب ہمارے اعتقادات کا ملک میں پورا تسلط ہو جائے گا تب ہم تفصیلی مسائل میں اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ انفرادی حریت اور آزادی کے حقوق دے سکیں گے۔

☆☆☆

باب یازدہم :: تحریک کی تبلیغ اور تنظیم کا باہمی رشتہ

۱۹۲۱ء کا سال میرے لیے کئی پہلوؤں سے خاص طور پر اہم ثابت ہوا۔

پہلے ایمان درست کرو پھر جماعت خود بخود بن جائے گی

جب میں جرمن مزدور پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے فوراً تبلیغ اور پروپیگنڈا کا شعبہ سنبھال لیا۔ میرا خیال تھا کہ وقتی طور پر یہ شعبہ سب سے اہم ہے ابھی وہ وقت نہ آیا تھا کہ تنظیم کے مسائل پر اپنا دماغ پریشان کیا جائے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اپنے اعتقادات اور خیالات پھیلائے جائیں۔ تبلیغ ہمیشہ تنظیم سے پہلے کی جاتی ہے۔ تبلیغ سے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ پھر تنظیم انہیں اکٹھا رکھ کر ان سے کام لیتی ہے۔ میں کبھی اس بات کا قائل نہیں ہوا کہ جلد بازی اے رسمی اور دکھاوے کی تنظیم قائم کر دی جائے۔ ایسی تنظیم محض ایک بے جان جنجال ہوتا ہے۔ ایسی تنظیم شاذو نادر ہی ایک جاندار اور ترقی پذیر تنظیم کا کام دے سکتی ہے۔ تنظیم کی بنیاد ہمیشہ زندگی کے کسی تقاضے پر رکھی جاتی ہے۔ ایسا زندہ تقاضا جس میں آگے بڑھنے اور ترقی دینے کے امکانات ہوں۔ جب کچھ لوگوں میں خود بخود ایک ترتیب پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس فطری ترتیب اور طبعی تشکیل سے ان لوگوں میں خود بخود ایک ترتیب پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس فطری ترتیب اور طبعی تشکیل سے خود بخود تنظیم کا ہیولی رونما ہونے لگتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح یہاں بھی انسانی کمزوریوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک انسانی کمزوری یہ ہے کہ انسان اپنے سے کسی برتر انسان کی مطابعت قبول کرنے سے بھی شروع میں کچھ جھجکتا ہے اگر بالائی حلقوں سے ذیلی حلقوں کی تنظیم ایک بے رسمی اور بے جان انداز میں شروع کی جائے تو یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ ایسی تنظیم کے اندر کوئی شخص جس کی بابت ابھی یہ ٹھیک پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے محض جذبات اور رقابت کے زیر اثر اپنے سے بہتر اور قابل تر افراد کو پیچھے

دھکیل کر خود تحریک میں آگے آنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کشمکش کے نتائج ایک نئی تحریک کے لیے خاص طور پر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

تنظیم کے لیے ذہانت سے زیادہ مردم شناسی درکار ہوتی ہے

یہی وجہ ہے کہ پہلے تحریک کے اعتقادات کی تبلیغ کرنی چاہیے۔جن اصولوں پر تحریک کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ان کی عوام کے سامنے وضاحت کرنی چاہیے۔تبلیغ اور پروپیگنڈہ کا یہ کام کچھ عرصہ تک جاری رہنا چاہیے۔اس تبلیغ اور پروپیگنڈہ کی نگرانی ایک مرکز سے ہونی چاہیے۔جب کچھ لوگ ان خیالات کے حامی بن جائیں تو پھر بڑی احتیاط سے ان کی چھان بین کر کے ایسے افراد تلاش کرنے چاہئیں جن میں قیادت کی اہلیت ہو۔ان قیادت کی اہلیت رکھنے والے اشخاص کا امتحان نہ لینا چاہیے۔بسا اوقات دیکھنے میں آئے گا کہ بے حیثیت اشخاص کے بعد پیدائشی قائد اور لیڈر ثابت ہوتے ہیں۔یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ جو لوگ تحریک کے اصولوں کو سمجھنے میں ذہین ثابت ہوں۔ وہی تحریک چلانے کے لیے ذمہ دار منصب سنبھالنے کے بھی اہل ہیں۔اکثر حقیقت حال اس کے الٹ ثابت ہوتی ہے۔کئی ذہین لوگ تحریک چلانے کے لیے نااہل ثابت ہوتے ہیں۔اور کئی کند ذہن افراد اس تحریک چلانے کی اہلیت ہوتی ہے۔

غیر معمولی ذہانت کے مالک شاذو نادر ہی تنظیم کی اہلیت رکھتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اصول بنانے اور نظریات قائم کرنے کے لیے انسان میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ وہ تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے کلی قاعدے اخذ اور وضع کر سکے۔برعکس اس کے تنظیم کا اہل وہ شخص ہوتا ہے جس میں عام انسانوں کی نفسیاتی کیفیت کا صحیح اندازہ کرنے کی استعداد ہو۔یہ کام تفصیلات پر نگاہ رکھنے سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔جس شخص کے سپرد تنظیم کا کام ہو مجبور ہے کہ جیسے انسانوں سے واسطہ پڑے انہیں سے کام چلائے۔اس کوشش میں کامیابی تبھی ممکن ہے جب وہ پہلے صحیح طور پر ایسے انسانوں کو سمجھ تو سکے۔مردم شناسی تنظیم کے پہلی شرط ہے۔ایک ماہر تنظیم انسانوں کو ان کی حقیقت سے نہ

بلند سمجھتا ہے۔اور نہ پست۔وہ انہیں ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسے وہ ہوتے ہین۔وہ ان کی کمزوریوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔وہ ان کے گھٹیا پن اور پستی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ان کی دیگر خصوصیات پر بھی اس کی نگاہ ہوتی ہے۔وہ ان لوگوں میں سے ایک زندہ تنظیم کھڑی کر دیتا ہے ک اگر اسے منتشر کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر وہ جماعت مقابلہ کرتی ہے۔وہ اس جماعت کو ایک عقیدے کی ترجمان اور مبلغ بنا دیتا ہے۔وہ اس جماعت میں یہ سکت پیدا کر دیتا ہے کہ اپنے عقیدے کو کامیاب بنائے بغیر دم نہ لے۔

''ہادی'' اور ''امام'' کے منصب جدا ہیں

ممکن ہے ایسا کوئی شخص بھی مل جائے جو اہل نظر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تنظیم بھی ہو۔لیکن کسی اہل نظر کے ساتھ ایک امام اور قائد کی خوبیوں سے متصف ہونا بہت ہی نادر ہے۔ایک امام اور قائد کے لیے یہ لازم ہے کہ لوگوں میں ہیجان پیدا کر سکے۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے وہ لوگ اکثر تسلیم نہیں کرتے جو ہمیشہ سے مسائل کو علمی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔وہ نہیں مانتے تو نہ مانیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک طبعی امر ہے۔کثیر التعداد عوام میں ہیجان پیدا کرنے کی اہلیت اسی شخص میں ہوتی ہے جو عملی نفسیات کا بہت بڑا ماہر ہو۔ایک عوامی مقرر ہونے کے لیے بھی ماہر نفسیات ہونا لازمی ہے۔یہی جوہ ہے کہ بڑے بڑے مقررین خیالی فلسفیوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اور بہتر لیڈر ثابت ہوتے ہیں۔میاں فلسفی تو مخلوق سے دور اور دنیا سے پرے بس اپنے خیالات میں منہمک رہتے ہیں لیڈر امام یا قائد کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ عوام سے جو چاہے کروا سکے۔قیادت کی اہلیت ہرگز خیالات کی تراش خراش پر منحصر نہیں۔یہ ایک بے کار بحث ہے کہ ان دونوں قابلیتوں میں سے کون سی قابلیت زیادہ ضروری ہے یا زیادہ اہم ہے۔کیا بنی نوع انسان کے لیے اصول' نظریات اور اعتقادات وضع کرنے میں زیادہ اہم ہیں یا ان نظریات کو عملی جامہ پہنانا زیادہ اہم ہے۔جیسا کہ زندگی کے اور کئی شعبوں میں پایا جاتا ہے یہاں بھی اس قسم کی ایک پاکیزہ ترین اصول بیکار ہوں

گے۔ اگر کوئی قائد یا امام عوام کو ان اصولوں پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ دوسری جانب کسی قائد کی بہترین استعداد اور شان وشوکت اکارت جائے گی اگر کوئی اہل نظر انسانی جدوجہد کے لیے اصول اور نصب العین وضع نہ کرے ہاں جب اہل نظر اور ماہر تنظیم دونوں کی قابلیتیں کسی ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو پھر چشم آدم اس کرہ ارض پر وہ نظارہ کرسکتی ہے جو قرنوں کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ یہی دوسری قابلیت ہے جس سے بطل جلیل اور قائد عظیم وجود میں آتے ہیں۔

''اراکین'' اور ''معاونین'' کا فرق

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب میں پہلے پہل پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے ساری توجہ تبلیغ کے لیے وقف کر دی میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ رفتہ رفتہ چند لوگوں کا ایک ایسا دائرہ مہیا کیا جائے جو نئے اعتقادات کو قبول کر لیں۔ اور جوش و ولولہ سے انہیں کامیاب بنانے کے درپے ہو جائیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے ہم لوگوں کو اپنی طرف بلا سکتے ہیں جب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہوتے تو تبھی تنظیم کی عمارت بھی کھڑی کی جاسکتی تھی۔ غرض مبلغ کی ہمیشہ تنظیم کرنے والے کی منزل سے آگے رہتی ہے۔

اگر کوئی تحریک کسی نظام کو بدل کر اس کی جگہ کوئی اور دوسرا نظام قائم کرنا چاہتی ہے تو پھر اس تحریک کے قائدین کو حسب ذیل اصول خوب سمجھ کر مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ اصول یہ ہے کہ ہر تحریک کو جب کچھ پیرو میسر آجائیں تو انہیں دو حصوں مں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اول اراکین اور دورسے معاونین۔

مبلغ کا فرض یہ ہے کہ معاونین فراہم کرے۔ تنظیم کرنے والوں کا فرض یہ ہے کہ ان معاونین میں سے اراکین منتخب کریں۔

کسی تحریک کا معاون وہ شخص ہوتا ہے جو اس کے مقاصد کو سمجھ کر قبول کر لیتا ہے رکن وہ ہوتا ہے جو مقاصد کی خاطر جدوجہد کرتا ہے۔

معاون کو تبلیغ کے ذریعے تحریک کے عقائد کا مقلد بنایا جاتا ہے۔ تنظیم کی جانب سے

اراکین کے ذمہ یہ کام سپرد ہوتا ہے کہ نئے معاونین کو قائل کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں تاکہ پھر ان معاونین میں سے تازہ اراکین چنے جاسکیں۔

''مرید'' بآسانی مل جاتے ہیں ''رفیق'' مشکل سے ملتا ہے

معاون بننے کے لیے کسی عقیدے کو جب چاہے قبول کر لینا بھی کافی ہے۔ رکن بننے کی شرط یہ ہے کہ پھر اس عقیدے کی ترجمانی کی جائے۔ اور اس کے لیے جدوجہد کا ذمہ لیا جائے۔ دس معاونین میں بے بمشکل دو اراکین حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ معاون بننے کا اصل مطلب فقط یہ ہے کہ کسی شخص نے تحریک کی تعلیمات اور عقائد قبول کر لیے رکن بننے کا مطلب یہ ہے کہ اب اس شخص میں یہ حوصلہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جس عقیدے کو اس نے قبول کیا تھا اب اس کے پھیلانے کی جدوجہد میں عملی حصہ لے گا۔

چونکہ محض کوئی عقیدہ قبول کرنے میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلانے پڑتے' اس لیے اکثر لوگ کسی سیاسی اصول کا معاون بن جانا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت سست اور بزدل ہے۔ رکن بننے کے لیے ذہنی طور پر بیدار اور متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ وصف اقلیت میں ہی پایا جاتا ہے۔

جب معاون زیادہ ہوتے ہیں اور اراکین تھوڑے تو مبلغ کا فرض ہے کہ ان تھک کام سے تحریک کے لیے زیادہ سے زیادہ معاون حاصل کرے جس کے سپرد تنظیم ہے اسے ان معاونین میں سے پوری کاوش اور محنت کے ساتھ بہترین عناصر منتخب کر لینے چاہئیں تاکہ انہیں اراکین بنایا جاسکے۔ مبلغ کو یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں کہ جس شخص کو اس نے تحریک کا قائل کیا ہے اس کی انفرادی حیثیت کیا ہے۔ مبلغ کا یہ کام نہیں کہ لوگوں کو قائل کرتے وقت ان کی قابلیت ذہانت یا کردار کو ملحوظ رکھے۔ ہاں جو لوگ یوں قائل ہو جائیں ان میں سے تنظیم کرنے والوں کو ایسے افراد منتخب کرنے ہوں گے جس میں تحریک کو پایہ تکمیل اور کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے عملی جدوجہد کرنے کی بہترین استعداد ہو۔

''مبلغ'' اور ''منتظم'' کے فرائض میں تمیز

مبلغ کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ ساری قوم کو اپنے عقائد کا معتقد بنا دے منتظم کا فرض یہ ہوتا ہے کہ رکنیت میں صرف ان لوگوں کو داخل کرے جو اپنی نفسیاتی ساخت سے تحریک کے اعتقادات کو مزید پھیلانے میں رکاوٹ ثابت نہ ہوں۔

مبلغ اپنے اعتقادات عوام میں پھیلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مبلغ عوام کو اس وقت کے لیے بھی تیار کرتا ہے جبکہ اس کے اعتقادات غالب آ چکے ہوں گے اعتقادات کو یہ غلبہ ان جدو جہد کرنے والے اراکین کے طفیل حاصل ہوگا۔ جو تحریک کے معاونین میں سے چنے جائیں گے۔ یہ انتخاب اس بنا پر ہوتا ہے کہ کن معاونین کو تحریک کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی قابلیت اور عزم بالجزم موجود ہے۔ اگر مبلغ نے وسیع تعداد میں عوام کو تحریک کے اعتقادات کا قائل کر دیا ہے تو اس اعتقاد کا بالاخر برسر اقتدار آنا زیادہ آسان بن جائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تحریک کی تنظیم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ٹھوس ہیں سرگرم ہیں اور خود سر جوڑ کر دوسروں کو اپنے راز میں شریک کرنے کے بغیر کام کر سکتے ہیں۔

خواص کا دائرہ محدود رکھنا چاہیے

جب تبلیغ اس حد تک کامیاب ہو کہ ساری قوم کسی عقیدے کی پیرو بن جائے تو پھر تنظیم کے لیے اس تبلیغ کا فائدہ اٹھانا بہت آسان ہو جاتا ہے ایسی صورت میں یہ کام مٹھی بھر لوگوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ غرض تبلیغ اور تنظیم کا رشتہ یا معاون اور رکن کا باہمی رشتہ ایک دوسرے سے لازم وملزوم ہے جتنا تبلیغ کا نظام اچھا ہوگا اتنا ہی تنظیم کا دائرہ تنگ ہوگا جتنی معاونین کی کثرت ہوگی اتنی ہی اراکین کی تعداد محدود ہوگی۔ برعکس اس کے جس قدر تنظیم وسیع ہوگی اتنا ہی تبلیغ ناکام ہوگی۔ جس قدر اراکین زیادہ ہوں گے اتنے ہی معاونین کم ہوں گے۔ اگر تبلیغ غلط ہے تو تنظیم کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اگر معاونین مٹھی بھر ہیں' تو رکنیت کا دائرہ ضرور وسیع ہوگا۔ بغیر اس کے تحریک کی کامیابی مشکل ہوگی۔

''تبلیغ'' کا مفہوم

مبلغ کا یہ پہلا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو قائل کرے جو بعد میں تنظیم میں شامل ہو کر اس کی تقویت کا سبب بن سکیں۔ تنظیم کا اولین فرض یہ ہے کہ ایسے اراکین منتخب کر کے انہیں مناسب تربیت دی جائے جو تبلیغ کے دائرہ کو توسیع دے سکیں۔ تبلیغ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ رائج الوقت نظام کو اندر سے کھوکھلا کر کے اسے تباہ کر دے۔ جب تنظیم رائج الوقت نظام کو یوں راستے سے ہٹا دے گی تو ان نئی تعلیمات کی ترقی کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ جن کی یہ تنظیم علم بردار ہے۔ تنظیم کا ثانوی فرض یہ ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ تا کہ پھر اس اقتدار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے اعتقادات کو بالآخر مسلط کر دیا جائے۔

ایک انقلابی تصور کائنات اور انقلابی تصور حیات صرف تبھی فیصلہ کن کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ یہ جدید ضابطہ حیات ایک پوری قوم کو سکھا دیا جائے۔ یا اگر پوری قوم کو یہ ضابطہ حیات نہ سکھایا جائے اور اس سے پہلے اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر ضرورت پڑنے پر ساری قوم کو جبراً اس ضابطہ حیات کا پیرو بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کی بنیادی تنظیم ہمیشہ ان افراد کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ جو آئندہ بننے والی سرکار کے کلیدی مناصب اور عہدے سنبھال سکیں۔ بغیر ان لوگوں کے اس نئی سرکار کا انصرام کون کرے گا؟

بالفاظ دیگر ہر عظیم عالم گیر انقلابی تحریک کے تصورات اور اعتقادات اس کے اپنے حلقے سے باہر پھیلانے کا کام اس کے مبلغین کے سپرد ہوتا ہے۔ مبلغین کو بھی اس کام سے نہ تھکنا چاہیے کہ نئے تصورات اور اعتقادات لوگوں کو سمجھا دیے جائیں نہ صرف یہ تصورات اور اعتقادات لوگوں کو سمجھا دیے جائیں بلکہ عوام میں بھی پھیل جائیں۔ کم از کم مبلغ کا یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کی حیثیت میں تصور کر کے یہ کوشش کرے کہ عوام میں جو اعتقادات آج تک رائج ہیں انہیں متزلزل کر دیا جائے۔

"تنظیم" کے معنی

اس قسم کی تبلیغ میں جان پیدا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے پس پشت ایک تنظیم کام کر رہی ہو۔ تنظیم اپنے اراکین ان مقلدین میں سے منتخب کرتی ہے۔ جو تبلیغ سے متاثر ہو کر تحریک میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں اگر تبلیغ کی مہم شدت سے جاری رکھی جائے تو تنظیم زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہو جائے گی۔ اگر تبلیغ کے پس پشت تنظیم طاقت ور ہو اور باہمت ہو تو بھی تبلیغ ترقی کرتی جائے گی۔

غرض تنظیم قائم کرنے والوں کا کام یہ ہے کہ تحریک کے اراکین میں اگر کوئی اختلاف یا افتراق رونما ہو جائے تو اسے اس حد تک نہ بڑھنے دیا جائے کہ اس سے تحریک میں پھوٹ پڑ جائے اور تحریک کا کام رک جائے۔ تنظیم کا یہ بھی فرض ہے کہ تحریک کی تاب مقاومت میں ضعف یا کمزوری پیدا نہ ہونے دے اور نہ ہی تحریک کو ٹھنڈا نہ پڑنے دے بلکہ تحریک میں ہمیشہ نئے عزم اور تازہ ہمت کو زندہ رکھا جائے۔ ہر قدم پر تحریک قومی سے قوی تر ہو جائے۔ تحریک کے اراکین کی تعداد کو بے اندازہ بڑھائے جانا ضروری نہیں۔ بلکہ تحریک کے اراکین تھوڑے ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔ بہت کم انسان صاحب ہمت اور صاحب جرات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک اپنی تنظیم کا دائرہ بے اندازہ بڑھائے جاتی ہے۔ آخر وہ ایک روز نکمی سست اور بھدی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تنظیم کسی تحریک کے اراکین یا چلانے والے گروہ کا دوسرا نام ہے' جو تنظیم اپنا دائرہ ایک خاص حد سے آگے بڑھاتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ تاب مقاومت سے عاری ہو جاتی ہے۔ ایسی تحریک میں وہ قوت نہیں رہتی کہ وہ اپنے اعتقادات کی تبلیغ اس شد و مد' عزم اور جارحیت کے ساتھ جاری رکھے جو کہ کسی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے لازمی ہے۔

"تبلیغ" میں شدت سے کام لینا چاہیے

جس قدر کوئی عقیدہ عظیم اور زیادہ انقلابی ہوتا ہے اتنا ہی اس عقیدہ کے پیروؤں میں عزم بالجزم اور جذبہ عمل زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ایسے عقیدے کی تخریبی قوت ان لوگوں کو

دوڑا کر بھگا دیتی ہے۔ جو بزدل ہوتے ہیں۔ کم ہمت اور کم نظر کھاتے پیتے لوگ ایسے بلند عقائد کے پیرو نہیں ہوتے۔ اگر ان کے دل ایسے عقیدے کے قائل بھی ہو جائیں تو وہ اپنے اعتقاد کا کھلے بندوں اقرار کرنے سے ڈرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تنظیم کے پس پشت کوئی واضح اور ٹھوس عقیدہ ہو۔ اس کی رکنیت میں صرف ایسے صاحب ارادت اور صاحب عمل لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنے معاصرین میں جرات عمل سے ممتاز ہوں۔ ایسے لوگ اس تحریک کی شدید تبلیغ سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک کسی تحریک کے اراکین اس قسم کی تبلیغ کا اہتمام نہ کریں، جب تک اس تبلیغ کے پس پشت یہ جذبہ کام نہ کر رہا ہو کہ جو رکن پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے عقائد کی موثر تبلیغ کرے گا اسی کو آگے لایا جائے گا۔ تب تک تحریک موثر اور شدید تبلیغ کا اہتمام نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایسی تبلیغ کا اہتمام نہ ہو تب تک تحریک کے اعتقادات کو فتح یاب اور کامیاب بنانے کی جدوجہد کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ تبلیغ ان اعتقادات کی ہونی چاہیے جن پر تحریک قائم کی گئی ہے۔

تنظیم میں احتیاط سے کام لینا چاہیے

کسی تحریک کو سب سے بڑا خطرہ یہ پیش آ سکتا ہے کہ غیر معمولی اور تیز رفتار کامیابی سے متاثر ہو کر اراکین کی بہت بھاری تعداد یک لخت اس میں شامل ہو جائے۔ جب تک کوئی تحریک اپنے مقاصد کے لیے مجاہدانہ ارجانکاہ جدوجہد میں مصروف رہتی ہے، تب تک کمزور دل اور خود غرض انسان ایسی تحریک کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ لیکن جونہی ایسی جماعت کوئی واضح کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ تو پھر اس قسم کے لوگ فوراً اس میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تحریکوں کے ارتقاء کے دوران ایسے مواقع پیش آتے ہی رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کئی تحریکیں جو شروع میں بڑی کامیاب نظر آئیں، بالآخر وہ اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے سست گام ہو گئیں۔ ان تحریکوں کی سست روی کی وجہ داخلی کمزوری

تھی ۔اس داخلی کمزوری کے باعث ان تحریکوں نے جدوجہد کا راستہ چھوڑ دیا اور یوں رفتہ رفتہ ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔شروع شروع میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ناپسندیدہ نا اہل اور بزدل افراد اتنی تعداد میں تحریک کے رکن بن جاتے ہیں کہ بالاخر انہیں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے۔پھر وہ اپنے دوسرے اراکین کا جذبہ جہاد سر کر ڈالتے ہیں۔یہ پست فطرت عناصر تحریک کا رخ اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کے لیے کسی اور طرف موڑ لیتے ہیں۔ان تھڑ دلوں کی اپنی کم ہمتی کا جو ذلیل معیار ہوتا ہے' اسی سطح پر تحریک بھی آ جاتی ہے۔اس کے بعد اس عقیدہ کی خاطر کوئی جدوجہد نہیں کرتا جس پر تحریک کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔روز اول کے جوش وخروش کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔ تحریک کا جذبہ جہاد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔کھاتے پیتے لوگ ایسے موقع پر کیا خوب کہتے ہیں کہ تحریک کے شربت میں پانی مٹھاس کے اندازہ سے بڑھ گیا۔

السابقون الاولون

ان وجوہات کی بنا پر جو تحریک اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔اس کا فرض ہے کہ جونہی کامیابی حاصل ہو تو وہ اپنی صفوں میں مزید نئے اراکین بھرتی کی بند کر دے۔ ایسے موقعوں پر تنظیم کی مزید توسیع بڑی دور اندیشی دیکھ بھال اور رکنیت کے لیے درخواست کنندگان کی مکمل ہڑتال کے بعد ہونی چاہیے۔یہی ایک طریقہ ہے جس سے تحریک کی جڑیں صحیح وسالم تروتازہ اور سرسبز رکھی جاسکتی ہیں۔یہ احتیاط کرنا لازم ہے کہ تحریک کی باگ ڈور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں اور صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔جنہوں نے شروع میں اکٹھے ہو کر تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ بانیان تحریک کو تبلیغ کا اہتمام کرنا چاہیے۔خاص کر وہ تبلیغ جس کا مقصد تحریک کو عوام سے روشناس کرانا ہے جب تحریک برسر اقتدار آ جائے تو اسے ان تمام اقدامات پر عمل کرنے اور وہ قواعد بنانے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ جو تحریک کے اعتقادات کرانے کے لیے درکار ہوں۔

تحریک جو مناصب اور عہدے حاصل کرنے میں کامیاب ہوان پر ان لوگوں کو فائز کرنا چاہیے جنہوں نے آغاز کار میں تحریک کی بنیاد رکھی۔ حکومت کے اختیارات بھی انہیں لوگوں کے حلقے میں رہنے چاہئیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہنا چاہیے۔ جب تک جماعت کے اصول اور جماعت کے اعتقادات نئی سرکار کی بنیادی حکمت عملی نہ بن جائیں۔ جب یہ کام ہو جائے تو پھر جائز ہوگا کہ اقتدار جدید سرکار کے آئین کے ماتحت منتقل کر دیا جائے یہ نئی سرکار اور اس کا آئین خود تحریک کی روح کے ترجمان ہوں گے۔ بالعموم یہ انسانی ذہن کا نہیں بلکہ یہ مسئلہ ان عوام کا ہے جو رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان عوامل کا اندازتو پہلے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ان پر قابو رکھنا تب ہی ممکن ہے کہ جب ہر قدم اٹھانے سے پہلے ان پر نگاہ رکھی جائے۔

تمام بڑی تحریکیں چاہے ان کی نوعیت سیاسی ہو یا مذہبی تبھی کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ جب مذکورہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھا جائے جب ان کوائف سے تجاوز کیا جاتا ہے تو پائیدار کامیابی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

''پرہیزگار مقلدی'' اور ''مجاہد فدائی''

میں اپنی جماعت کا ناظم تبلیغ تھا۔ ایک طرف تو میں نے یہ کوشش شروع کی کہ بعد میں تحریک کو جو عظمت حاصل ہونے والی ہے اس کے واسطے بھی میدان تیار کرنا شروع کر دیا جائے۔ دوسری جانب میں نے ایسے انقلابی اقدامات کا اہتمام کیا ہے کہ تحریک کی تنظیم میں سوائے بہترین عناصر کے کوئی گھسنے نہ پائے۔ جتنا میرا تبلیغ کا انداز انقلابی اور ولولہ انگیز ہوتا ہے اتنا ہی کمزور اور مذبذب مزاج کے لوگ ہم سے پرے بھاگتے تھے یوں ہماری تنظیم کا اندرونی حلقہ ان کی یورش سے محفوظ رہتا تھا۔ شاید ان میں سے بعض لوگ معاونین میں شامل رہتے تھے۔ لیکن انہیں یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ ہماری تائید میں زبانیں کھولیں۔ برعکس اس کے وہ خاموش ہی رہتے تھے۔ ہزارہا افراد نے ان دنوں مجھے یہ یقین دلایا کہ وہ ہمارے ساتھ کامل طور پر متفق ہیں لیکن کسی قیمت پر ہماری تحریک

کے رکن بننے پر آمادہ نہیں وہ کہتے تھے کہ یہ تحریک ایسی انقلابی ہے کہ اگر ہم نے اس کے رکن بن کر اس میں حصہ لیا تو ہمیں برا بھلا کہا جائے گا۔ہمیں سخت خطرات پیش آئیں گے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بدستور ہمیں دیانت دار اور صلح پسند شہری ہونے کی شہرت حاصل رہے۔کم از کم وقتی طور پر ہم آپ کی تحریک سے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں۔یوں تہہ دل سے آپ کے ساتھ متفق ہیں

ہماری اس میں بہتری تھی۔ یہ سب لوگ جو اندر سے انقلابی تصورات کے حامی نہ تھے اگر اس وقت ہماری تحریک کے رکن بن جاتے تو آج ہم پرہیزگار بزرگوں کی ایک منڈلی ہوتے۔ہم ایک جوان ہمت تحریک کی حیثیت اختیار نہ کر سکتے جو ولولہ جہاد سے سرگرم ہے۔

میں تحریک کا امیر بن گیا

میں نے اپنی تبلیغ کو ایسا جاندار بنا دیا اور ایسا مجاہدانہ رنگ دیا کہ ہماری تحریک کا انقلابی میلان ہمیشہ کے لیے مستقل اور مستحکم ہو گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے اکا دکا مثالوں کے صرف انقلابی ذہن رکھنے والے افراد ہماری رکنیت میں داخل ہوئے۔

یہ ہماری تبلیغ کا ہی اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں لاکھوں باشندگان ملک کو دل سے یقین ہو گیا کہ ہم سچے ہیں اور راستی پر ہیں۔وہ ہماری کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔اگرچہ وہ خود کو ایسے بزدل تھے کہ ہمارے صابعین کی خاطر کوئی قربانی کرنے پر آمادہ نہ تھے۔نہ ہی وہ ہماری صفوں میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

۱۹۲۱ء کے وسط تک تحریک کے مقلدین حاصل کرنے کے لیے یہ آسان طریقہ کار کافی تھا اور خوب کارآمد ثابت ہوا۔لیکن ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ تحریک کی تنظیم کو بھی اسی انداز سے منظم کیا جائے۔جس انداز سے ہماری تبلیغ کامیابی حاصل کر چکی تھی۔

ہماری جماعت کے صدر کی تائید سے بعض حقیقت ناآشنا محبان وطن نے یہ کوشش

کی کہ ہماری جماعت پر قبضہ کرلیں۔ ان کی اس ننھی منی سی سازش کا قبل از وقت انکشاف ہوگیا۔ یہ سازش ختم کر دی گئی۔ جلسہ عام میں اتفاق رائے سے تحریک کی رہبری کے تمام اختیارات مجھے سپرد کردیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نیا قاعدہ بنایا گیا' جس کی رو سے تحریک کے صدر کو تحریک کی تمام ذمہ داری سپرد کر دی گئی۔ کمیٹیوں میں قراردادیں منظور کرنے کا دستور ترک کر دیا گیا۔ اس کی بجائے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا گیا۔ آج تک اس اصول پر بخوبی عمل ہو رہا ہے۔

"تقسیم کار" یا "مشترکہ ذمہ داری"

یکم اگست ۱۹۲۱ء کے عد میں نے ان اصولوں پر تحریک کی داخلی تنظیم دوبارہ شروع کی۔ اس کام میں کئی بھلے لوگ میرے ساتھ شریک تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی کارگزاری اور خدمت کا تذکرہ کیا گیا ایک ایک کا نام لے کر بعد میں کروں گا۔

میری کوشش یہ تھی کہ تبلیغ سے جو نتائج مرتب ہو چکے ہیں اب انہیں تنظیم کے استحکام کے لیے کام میں لایا جائے۔ اس طرح ان نتائج کا اثر پائیدار بنا دیا جائے۔ میں نے کئی پرانے دستور بدل دیئے کچھ ایسے نئے قواعد رائج کیے جو دوسری جماعتوں کے ہاں رائج نہ تھے۔

۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک ہماری تحریک کا کاروبار ایک مجلس منتظمہ چلاتی تھی۔ اس مجلس منتظمہ کے اراکین جلسہ عام میں منتخب ہوتے تھے۔ مجلس منتظمہ میں حسب ذیل عہدہ داروان شامل تھے۔ ۱۔ خزانچی ۲۔ نائب خزانچی ۳۔ دبیر نائب دبیر' صدر' نائب صدر۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ مجلس منتظمہ کا ایک رکن مجلس عاملہ کے نمائندہ کے طور پر شامل ہوتا تھا۔ ایک ناظم نشر و اشاعت بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مجلس منتظمہ میں بعض معمولی اراکین بھی ہوتے تھے۔

یہ بات خاصی مضحکہ خیز ہے کہ ہماری مجلس منتظمہ کی خود اپنی تشکیل اسی اصول کی بنا پر ہوتی ہے۔ جس کے خلاف لڑنے کے لیے تحریک قائم ہوتی تھی۔ یعنی پارلیمنٹری طریقہ

کار سے کام کرنے کے اصول۔ تحریک جس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس کا لب لباب یہی اصول تھا۔ ہماری تحریک کی مقامی شاخوں سے لے کر اضلاعی تنظیم تک اضلاعی تنظیم سے لے کر منطقہ وار تنظیم تک منطقہ وار تنظیم سے لے کر صوبائی تنظیم تک اور صوبائی تنظیم سے لے کر قومی مجلس نگران تک ہر ادارہ اسی اصول کی مخالفت کے لیے سرگرم عمل تھا۔ یہ وہ اصول تھا جس نے تب بھی ہمیں بہت نقصان پہنچایا۔ اور آج تک ہمارے لیے سخت ضرر رساں ہو رہا ہے۔

''کثرت رائے'' یا ''شخصی ذمہ داری''

اس صورت حال کو فوراً بدلنا نہایت ضروری تھا۔ ورنہ تحریک کی داخلی تنظیم میں اہ بنیادی نقصان ساری تحریک میں خلل پیدا کر دیتا۔ تحریک کا اعلیٰ مقصد پورا کرنا ناممکن ہو جاتا۔

مجلس منتظمہ کی کارروائی ایک آئین کے ماتحت ہوتی تھی۔ اس آئین کی رو سے تمام فیصلے کثرت آراء کے پابند تھے۔ غرض ہماری مجلس منتظمہ بھی ایک ننھی منی پارلیمنٹ تھی۔ شخصی ذمہ داری یہاں قطعاً مفقود تھی۔ ہماری سرکار کے بڑے بڑے نمائندہ اداروں سے جو حماقتیں اور خلاف منطق حرکات دیکھنے میں آتی ہیں وہی ہماری مجلس منتظمہ میں بھی سرزد ہوتی ہیں سیکرٹریوں خزانچیوں مندوبین مبلغین اور خدا جانے کن کن عہدوں کے لیے امیدواروں کے نام تجویز ہوتے تھے۔ مجلس منتظمہ کے تمام اراکین ہر مسئلہ کی تفصیلات میں دخل دیتے تھے۔ پھر رائے شماری کی نوبت آتی تھی۔ تب کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ناظم نشر و اشاعت اس مسئلہ پر بھی ووٹ دیتا تھا کہ مالیات کے معاملہ میں کس شخص کا تقرر مناسب ہے۔ ناظم مالیات ان معاملات میں بھی دخل تھا جن کا تعلق فقط تنظیم سے ہوتا تھا۔ ناظم تنظیمات ان امور میں رائے ظاہر کرتا تھا جو دبیر کے متعلق ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اگر خزانچیوں منشیوں اور تحریک کے نقیبوں نے بھی تبلیغ کے مسائل طے کرنے میں

دخل دینا ہےتو پھرایک ناظم تبلیغ مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔جس شخص میں رتی بھر بھی عقل ہو اسے یہ تماشا بالکل فضول نظر آتا تھا۔ایسا ہی فضول جیسا کہ کسی بڑے کارخانے میں مالیات کے نگران مشینوں کے کل پرزوں کے متعلق رائے دینا شروع کر دیں یا انجینئر نظم ونسق میں دخل دینے لگیں۔

میں نے یہ حماقت برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔تھوڑی ہی مدت بعد میں نے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں شمولیت ہی ترک کر دی۔میں سوائے تبلیغ کے محکمہ کا انصرام کرنے کے اور کسی بات میں دخل نہ دیتا تھا نہ ہی دوسروں کو یہ اجازت دیتا کہ وہ میری سرگرمیوں میں خواہ مخواہ مشورے دیں' میں خود بھی دوسروں کی سرگرمی کے متعلق انہیں کوئی مشورہ نہ دیتا۔

جن نیا آئین منظور ہوگیا اور میں صدر مقرر ہوا تو مجھے مطلوبہ اختیارات مل گئے۔تب میں نے اس قسم کی تمام حماقتوں کا خاتمہ کر دیا۔مجلس منتظمہ میں کثرت رائے سے فیصلہ کرنے کے بجائے اب مطلق شخصی ذمہ داری کے اصول پر عمل ہونے لگا۔

''قیادت'' اور ''اطاعت'' کے اصول کا طریقہ کار

صدر یا امیر تمام تحریک کو چلانے کے لیے ذمہ دار ہے۔امیر کے ماتحت ایک مجلس شوریٰ ہے اور امیر کچھ خاص فرائض اس مجلس شوریٰ کے ہر رکن کے سپرد کرتا ہے۔ خصوصی فرائض کے لیے امیر دیگر افراد کو نامزد کرتا ہے۔مجلس شوریٰ کے اراکین ہوں یا خصوصی فرائض انجام دینے والے افراد ہر ایک صرف ان فرائض کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ ہے جو اس کے سپرد کیے گئے ہیں۔اسی طرح ہر ایک کارکن براہ راست امیر کے سامنے جواب دہ ہے۔ان کارکنوں میں باہمی تال میل اور تعاون قائم رکھنے کا ذمہ دار امیر ہے۔امیر ہی کارکن مقرر کرتا ہے۔اور امیر ہی انہیں مشترکہ جدوجہد میں باہمی تعاون کے لیے تمام ہدایات دیتا ہے۔

مطلق شخصی ذمہ داری کا یہ اصول اب آہستہ آہستہ ساری تحریک میں رائج ہو رہا ہے

چھوٹی چھوٹی مقامی اور منطقہ وار یا اضلاعی تنظیمات میں اس اصول پر مکمل عمل ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ کسی فعل کے لیے مطلق شخصی ذمہ داری قبول کرنا ایسے لوگوں کو راس نہیں آتا وہ تو کسی نام نہاد کمیٹی کی کثرت رائے کی ٹٹی کی آڑ میں چھپ کر شکار کھیلنا چاہیت ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اپنے اعمال پر کمیٹی کے فیصلوں کے پردہ ڈالے رکھیں۔ میری رائے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اس زاویہ نگاہ کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کی جائے۔ جو لوگ ذمہ داری قبول کرنے سے ڈرتے ہیں ان کی بات ہرگز نہیں ماننی چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل پیرا ہونے میں کچھ وقت صرف ہو تو کچھ ہرج نہیں یہ اصول تسلیم کرنے سے ہی وہ قائدین ابھریں گے جن میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کی مطلوبہ قابلیت اور لیاقت ہوگی۔

''وحدت'' اور ''کثرت'' کا سیاسی اطلاق

بہر حال جو تحریک پارلیمنٹری اداروں کی حماقتوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے قائم ہوئی ہے۔ خود اس تحریک کو ایسی حماقتوں سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ صرف یہ طریقہ کار اختیار کرنے سے ہی تحریک میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ کہ اپنا مقصد پورا کر سکے۔

آج کل کثرت رائے ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ جو تحریک کے ایک لیڈر کے اصول پر چلائی جائے گی۔ اور تحریک کے تمام مسلمہ اقدامات کے لیے اسی ایک سیاسی لیڈر کو ذاتی طور پر ذمہ دار گردانے گی' وہ بہت جلد موجودہ نظام کا ٹاٹ الٹ کر رکھ دے گی۔ اور موجودہ حکمرانوں کے خلاف کامیابی حاصل کرے گی۔ یہ ایک حسابی سچائی ہے جیسے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہماری تحریک داخلی طور پر دوبارہ منظم کی جائے۔ جب یہ دوبارہ تنظیم شروع کی گئی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کے مالیات اور سیاسیات کے شعبے جدا جدا کام کرنے لگے۔ شخصی ذمہ داری کا اصول تحریک کے نظم و

نسق کے ہر محکمہ میں رائج کر دیا گیا۔ یہ اصول قبول کرنے سے تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی تحریک کا نظم ونسق سیاسی اثرات سے آزادہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کا نظم ونسق اقتصادی اصولوں پر چلنے لگا۔

تحریک کی ابتداء درویشانہ تھی

ہماری جماعت ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت جماعت کے صرف چھ ارکین تھے جماعت کا کوئی دفتر نہ تھا۔ جماعت کا کوئی عملہ نہ تھا۔ جماعت کے کوئی عہدہ دار نہ تھے۔ جماعت میں کوئی دفتری مہر نہ تھی۔ جماعت کا کوئی لٹریچر نہ تھا۔ ہماری مجلس منتظمہ کا پہلا اجلاس پہلے ہرگاسے کے بازار میں ایک ہوٹل کے اندر منعقد ہوا۔ اس کے بعد گاسٹیک کے ایک قوہہ خانے میں اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی تھی اس لے میں نے یہ معاملہ فوراً اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے میونچ کے مختلف ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کا ایک چکر کاٹا۔ غرض یہ تھی کہ جماعت کے استعمال کے لیے ایک کمرہ کرایہ پر لیا جائے۔ سٹرنکوبراؤ اسٹال کے پرانے احاطہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی چھت محرابی تھی یہ عمارت کسی زمانے میں ایک شراب خانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی تھی۔ روما کی مقدس سلطنت کے ماتحت بویریا سے آنے والے م؛ندوبین اسی شراب خانے مس بیٹھ کر غم غلط کیا کرتے تھے۔ یہ کمرہ نہایت تاریک اور زبوں حال تھا۔ بس یہ اس کام کے لیے موزوں تھا۔ جو ہمیشہ یہاں سے ہوتا آیا تھا۔ یہ اس نئے کام کے لیے موزوں نہ تھا۔ جو اب یہاں شروع ہونے والا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی یہ گلی ایسی تنگ تھی کہ گرمیوں کے دنوں میں جب تیز دھوپ چمک رہی ہو تب بھی کمرے میں دھندسی چھائی رہتی تھی۔ فضا میں ایک قسم کی گھٹن پائی جاتی تھی۔ یہاں ہم نے اپنی تحریک کا پلا مرکز قائم کیا۔ کرایہ تیس روپیہ ماہوار تھا۔ یہ رقم بھی اس زمانے میں ہمارے لیے بہت گراں تھی۔ ہم مجبور تھے کہ اپنے اخراجات غریبانہ رکھیں۔ مالک مکان جب ہمارے قبضہ کے چند روز بعد دیواروں پر

سے لکڑی کا غلاف اتار لیا تو بھی ہمیں یہ حوصلہ نہ ہوا کہ احتجاج کرتے۔ دیواروں پر لکڑی کا غلاف اس وقت چڑھایا گیا تھا جب سلطنت کے مندوبین یہاں شراب پینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ دیواروں پر سے لکڑی اتر جانے کے بعد کمرے کی شکل کسی پہاڑ کی کھوہ جیسی بن گئی۔

محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے

باوجود اس کے ہماری تحریک کو ایک دفتر مل جانا ترقی کی جانب ایک اہم قدم تھا۔ آہستہ آہستہ ہم نے یہاں بجلی لگوالی۔ پھر ٹیلی فون بھی آ گیا۔ ایک میز اور کچھ مانگی ہوئی کرسیاں منگوائی گئیں۔ کاغذات رکھنے کے لیے ایک الماری تھی۔ جس کے پٹ ندارد تھے۔ پھر ایک صندوق بھی آ گیا۔ مالک مکان کی ملکیت دے طاقچے تھے جہاں ہم اپنے رسالے اور اشتہارات وغیرہ رکھتے تھے۔

جب وقت گزرتا گیا تو تحریک کا کام چلانے کے لیے ہفتے میں ایک مرتبہ مجلس شوریٰ کا اجلاف ناکافی ثابت ہوا۔ تحریک کا روزانہ کاروبار چلانے کے لیے ہمیں ایک باقاعدہ تنخواہ دار ملازم کی ضرورت محسوس ہوئی۔

لیکن اس وقت کے حالات میں ہمارے لیے تنخواہ دار ملازم رکھنا خاص مشکل تھا۔ ابھی تحریک کے اراکین تعداد میں اتنے کم تھے کہ ان میں سے کوئی موزوں شخص تلاش کرنا جو معاوضہ بہت کم لے اور اس کے ساتھ ہی وہ مستعدی سے خدمات سرانجام دے سکے۔ جن کی تحریک کو ضرورت تھی، آسان نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان خدمات کے بجالانے میں وقت بھی صرف ہوتا اور ہمت بھی درکار تھی۔

دیر تک تلاش کرنے کے بعد ہم نے ایک سابق فوجی کو چن لیا۔ جس نے ہمارا پہلا ناظم دفتر بننا قبول کرلیا۔ اس کا نام ہرشیلر تھا۔ وہ جنگ کے ایام سے میرا رفیق چلا آ رہا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے ہر روز صرف چھ اور آٹھ بجے شام کے مابین دفتر آنا شروع کیا۔ پھر وہ ۵ بجے شام سے ۸ بجے رات تک ٹھہرنے لگا۔ اس کے بعد وہ سہ پہر

ہی سے دفتر آ جاتا تھا۔ آخر کار وہ ہمہ وقت ملازم ہو گیا۔ اور صبح سے لے کر شام تک دفتری کام کرتا رہتا۔ وہ ایک محنتی صاف گو اور دیانت دار اور صاحب ایمان شخص تھا۔ جو تحریک کا وفادار تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایڈلر مارکہ ٹائپ کی چھوٹی مشین بھی دفتر میں لے آیا ہماری جماعت کے کاروبار میں پہلی بار جو مشین استعمال ہوئی وہ یہی ٹائپ رائٹر تھا۔ بعد میں جماعت نے قسطیں ادا کر کے یہ ٹائپ رائٹر خرید لیا۔ ہمیں ایک محفوظ صندوقچے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی جس میں کاغذات اور فہرست اراکین رکھی جا سکیں اور چوری کا خطرہ بھی نہ ہو۔ ابھی تحریک کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اس کا صندوقچہ درکار ہوتا۔ بر عکس اس کے ہماری مالی حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے اکثر اپنی ذاتی جمع جتھا پر دست درازی کرنی پڑتی تھی۔

اٹھارہ مہینے گزر جانے کے بعد ہمارا دفتر ہماری ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم نے کارنیلینس وسٹراسے بازار میں ایک نیا دفتر لے لیا۔ ہمارا نیا دفتر بھی ایک ریسٹوران ہی میں واقع تھا۔ لیکن یہاں ایک کمرہ کی بجائے اب تین کمرے ہمارے پاس تھے۔ ایک کمرہ بہت بڑا تھا۔ جس کی کھڑکیاں بھی بڑی تھیں۔ اس وقت کے حالات میں ہمیں یہ نیا دفتر بہت ہی عالی شان معلوم ہوتا تھا۔ اس دفتر میں ہم نومبر ۱۹۲۳ء کے اختتام تک مقیم رہے۔

ہم نے اخبار نکالا

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہم نے خوکیشر بیوباختر نامی اخبار خرید لیا۔ جیسا کہ اس اخبار کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ عوام کا ترجمان تھا۔ اب ہم نے اس اخبار کو جرمن قوم پرست اشترا کی مزدور پارٹی کا ترجمان بنا لیا۔ پہلے یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا ۱۹۲۸ء کے آغاز میں اسے روزنامہ بنا دیا گیا۔ ماہ اگست ۱۹۲۸ء میں یہ اخبار بڑا سائز پر شائع ہونے لگا۔ اب اس سائز کے لوگ خوب متعارف ہو چکے تھے۔

میں صحافت میں بالکل نو آموز تھا۔ چنانچہ میں نے کئی نئے سبق سیکھے۔ یہ سبق میں

نے خاصی تکلیف اٹھا کر حاصل کیے۔

یہودیوں کے متعدد اخبارات تھے۔ اس کے مقابلے میں تب عوام کی ترجمانی کرنے والا یہ ایک ہی اہم اخبار تھا۔ یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ ایک سبق میں نے کئی تجربوں کے بعد حاصل کیا۔ وہ سبق یہ تھا کہ قوم پرست اخبارات کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا مالی انتظام سخت نااہل ہاتھوں میں تھا۔ ان اخبارات کے انتظام میں یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ باتیں بنانا کافی ہے۔ چاہے کوئی نتیجہ خیز عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ اصول بالکل غلط تھا کہ صحیح رائے اور سچا عقیدہ ضرور دل میں ہوتا ہے لیکن کوئی رائے یا عقیدہ جب سچا ہو تو وہ دل تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس پر عمل بھی کیا جاتاہ۔ جو شخص اپنی قوم کی قابل قدر خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ ثابت کر دیتا ہے ک اس کا عقیدہ بھی سچا ہے۔ اور اس کی رائے بھی صائب ہے۔ برعکس اس کے وہ شخص خالی اپنے عقیدے کے متعلق باتیں بناتا ہے اور عمل کچھ نہیں کرتا۔ وہ نہ تو قوم کے لیے مفید ہے ار نہ ہی اسے صائب الرائے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اعتقاد کے متعلق خالی باتیں بنانا ایک ایسی عادت ہے جو ملت کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔

صحافت بھی ایک تجارت ہے

ہمارا اخبار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ ایک ہر دل عزیز اخبار ہونے کا مدعی تھا۔ اس کی ساری باتیں اچھی تھیں۔ لیکن اس میں وہ غلطیاں اور کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں جو ہر دل عزیز اداروں کا خاصہ ہیں۔ اس اخبار کے مضامین اور اندرجات تسلی بخش تھے۔ لیکن اس کا مالی انتظام سخت بدنظمی کی حالت میں تھا۔ مالی انتظام اس اصول پر چلایا جاتا تھا کہ جو اخبار ہر دل عزیز ہونے کا مدعی ہو۔ اسے بس سالانہ چندے پر گزارہ کرنا چاہیے۔ یہ اصول اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ ہمارے اخبار کو بعض دوسرے اخبارات کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ یہ تو بددیانتی کی بات ہے کہ ہم محبان وطن کے چندوں سے اخبارات کے اخراجات کی کمی کو پورا کریں۔ اور اس کے مالی انتظام کا ٹھیک تاجرانہ

اصولوں پر اہتمام نہ کریں۔

میں نے تہیہ کرلیا کہ اس صورت حال کا فی الفور تدارک کیا جائے۔ مجھے اس خطرے کا احساس تھا جو اس صورت حال میں مضمر تھا۔ قسمت نے میری یاوری کی تھی مجھے ایک ایسا شخص مل گیا تھا جس نے اس وقت سے لے کر آج تک تحریک کے لیے بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے صرف ہمارے اخبار کے مالی مینجر کے طور پر کام ہی نہیں کیا بلکہ وہ ہماری تحریک کے مالی مینجر کی خدمات بھی انجام دیتا رہا۔

تحریک کا مشیر مال بھی ہونا چاہیے

۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ چکی تھی کہ میرا تعارف ہر ماکس آوان سے ہوا۔ وہ تب میرا افسر تھا۔ آج کل وہ ہماری سیاسی جماعت کی مالیات کا ناظم اعلیٰ ہے۔ مجھے جنگ کے چار سال کے عرصہ میں متواتر اس شخص کی غیر معمولی قابلیت محنت اور دیانت داری کا تجربہ ہوا۔ یہی شخص مستقبل میں میرا رفیق بننے والا تھا۔

۱۹۲۱ء کی موسم گرما میں مجھے اتفاقاً ایک روز ہر ماکس آوان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ جنگ کے دوران میں میری رجمنٹ کے اندر میرا افسر رہ چکا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ ہماری تحریک کا ناظم مالیات بن جائے۔ ان دنوں تحریک پر بڑا نازک وقت گزر رہا تھا۔ میں اپنے عملے کے کئی ملازمین سے مطمئن نہ تھا۔ ایک ملازم کے متعلق تو مجھے خاص طور پر تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ہر آوان تب ایک اچھی ملازمت پر مامور تھا۔ جہاں اس کے لیے ترقی کے بھی خاصے امکانات موجود تھے۔

پہلے تو وہ خاصی دیر تردد میں مبتلا رہا۔ پھر اس نے میری درخواست مان لی۔ لیکن اس نے میری درخواست قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ ایسے کئی نا اہل کمیٹی کے ماتحت کام نہ کرنا ہوگا۔ وہ صرف ایک حاکم کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس سے پرسش کرنے والا فقط ایک شخص ہونا چاہیے۔

ہماری سیاسی جماعت کی مالیات کے اس پہلے ناظم نے تحریک کے لیے بہت بڑی

خدمات انجام دیں۔تجارت کے متعلق اس کا علم وسیع اور گہرا ہے۔اس نے تحریک کے مختلف دفاتر میں باقاعدگی اور دیانت کے اصول نافذ کر دیے۔اس وقت سے لے کر اب تک ہمارے دفاتر میں ایک ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے۔ہماری تحریک کا کوئی دوسرا شعبہ ان دفاتر کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ جو شخص غیر معمولی قابلیت کا مالک ہوتاہ۔اس کے خلاف لوگوں میں حسد اور بغض پایا جاتا ہے۔اہر آوان کو بھی اسی آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔لیکن اس نے صبر وتحمل سے یہ آزمائش برداشت کی۔

تحریک کا دفتر کن اصولوں پر چلنا چاہیے

۱۹۲۲ء کے بعد ہماری تحریک میں بعض قواعد پر سختی سے عمل ہو رہا ہے۔یہ قواعد صرف تحریک کی مالیات سے متعلق نہیں بلکہ تحریک کی تنظیم سے بھی متعلق ہیں۔تحریک کے مرکز میں باقاعدہ تمام اراکین کے نام اور ان کے متعلق تفصیلات کی فہرستیں تیار رکھی جاتی ہیں۔تحریک کی آمدنی کا مستقبل اور تسلی بخش انتظام کر دیا گیا۔چالت اخراجات صرف چالت آمدنی سے پورے کیے جاتے ہیں۔غیر معمولی صرف مخصوص اخراجات کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشکلات کا سامنا ہونے کے باوجود تحریک کسی کی قرض دار نہیں۔ہاں تھوڑا بہت تو چلتا ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے سرمائے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ہماری مالیات کا اہتمام اس طرح کیا جات اہے کہ جیسا تجارت کے کسی پرائیویٹ ادارہ میں۔تحریک جن لوگوں کو ملازم رکھتی ہے۔وہ صرف دفتری کارگزاری کے بل پر تنخواہ وصول کرتے ہیں۔کسی کو یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ دفتری فرائض کی ادائیگی میں نا لائق یا نکما ہو اور تحریک کے ساتھ وفاداری کو آڑ بنا کر تنخواہ وصول کرتا رہے۔ایک قوم پرست اشتراکی اپنی اہلیت یوں ثابت کرتا ہے کہ جو فرائض اس کے سپرد کیے جائیں۔انہیں ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔اور محنت اور سلیقے سے کام انجام دے سکے۔اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ معاشرے میں وہ کس

مرتبہ پر فائز ہے۔ جو شخص اپنے عہدے کے فرائض ٹھیک طرح انجام نہیں دے سکتا وہ یہ کہنے کا حق دار بھی نہیں کہ وہ تحریک کا وفادار ہے۔ جس خدمت کا اس نے ذمہ لے رکھا ہے اس خدمت کے لیے اس کا نا اہل ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس کی وفا داری دکھاوے کی ہے۔

سیاسی خدمت وظیفہ خواری کے لالچ سے نہ ہونی چاہیے

ہماری جماعت کی مالیات کا نیا ناظم اس اصول کا قائل تھا کہ اس کے کاروبار میں کسی بیرونی اثر کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جب اس قسم کے اثر سے اس کے کام میں مداخلت کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ استقلال سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ تحریک کے نظم ونسق میں وظیفہ خوروں کے لیے کوئی ملازمت خالی نہیں کسی شخص کو جو کام کرنے کا نا اہل ہو فقط اس لیے تحریک میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ کہ وہ تحریک کا رکن ہے یا اس کا معاون جب ہماری تحری سرکاری ملازمین کے معاملہ مین سیاسی جماعتوں کی دوست پروری اور اقربا نوازی کی اس قدر سخت مخالف ہے تو خود تحریک کے اپنے نظم ونسق اور اپنے دفتر میں تو یہ خرابی ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہمارے اخبار کے دفتر میں بعض ایسے شخص ملازم ہو گئے جو پہلے بویریا کی عوامی پارٹی کے رکن تھے۔ ان کے کام سے ثابت ہوا کہ جو خدمت ان کے سپرد ہے اس سے خوب اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔ اس تجربہ کا نتیجہ خوب کامیاب رہا۔ انفرادی کارگزاری کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ ایک ایسی دیانت دارانہ اور مخلصانہ مثال تھی کہ اس سے ہماری تحریک نے اپنے ملازمین کے دل موہ لیے۔ اب ہمارے ملازمین اس قدر جلد اور ایسے خلوص سے تحریک کے وفادار ہو گئے کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ قوم پرست اشتراکی تحریک کے رکن بن گئے۔ ان کی یہ وفاداری لفظی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی دیانت دارانہ' مخلصانہ اور مستقل کارگاری سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نئی تحریک کے دل سے وفادار ہیں۔ ہاں یہ طبعی امر ہے کہ اگر ایک ملازمت کے دو امیدوار ہوں اور دونوں یکساں اہلیت ہو۔ تو پھر

ان میں سے تحریک کے رکن کو کسی اجنبی شخص پر ترجیح دی جائے گی۔ ہمارے جدید ناظم مالیات نے جس سختی ااور پابندی سے ان اصولوں پر بتدریج عمل کرنا شروع کیا۔اس کا تحریک کو بہت فائدہ پہنچا۔اس سے اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان کی بھی پرواہ نہین کی۔ یہی وجہ تھی کہ جب جرمن سکے کی قیمت گر گئی اور ہر ادارے کو مالی مشکلات پیش آنے لگیں حتیٰ کہ ہزاروں تاجر پناہ ہو گئے سینکڑوں اخبارات نے اشاعت بند کر دی تو ہماری تحریک کا محکمہ تجارت نہ صرف بدستور جاری رہا اور تمام حسابات چکاتا رہا بلکہ ہمارے اخبار نے مسلسل ترقی کی۔اس زمانے میں یہ اخبار جرمنی کے سب سے بڑے اخباروں میں شمار ہونے لگا۔

اہل پر نا اہل کو نکتہ چینی کی اجازت نہیں دی جا سکتی

۱۹۳۱ء کا سال میرے لیے اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ میں نے جماعت کے امیر کی حیثیت سے آہستہ آہستہ فیصلہ کن طور پر ان نکتہ چینیوں اور مداخلت بے جا کرنے والوں کا منہ بند کر دیا۔ جو ہماری مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور جماعت کے نظم و نسق اور دفتری معاملات میں دخل دیتے رہتے تھے۔ میرا یہ اقدام نہایت ضروری تھا کیونکہ اگر نا اہل نکتہ چیں مسلسل طور پر کام میں دخل دیتے رہتے تو ہمیں کسی کام کے انجام دینے کے لیے کوئی قابل شخص کس طرح مل سکتا ہے یہ مداخلت کرنے والی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دنیا کا ہر کام دوسروں سے بہتر کر سکتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ لوگ جس کام میں ہاتھ ڈالیں وہاں سوائے پریشانی اور ابتری کے کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ جب میں نے ان عقل کے پتلوں کی بات نہ سنی تو چپ چاپ اور انکسار سے گھر جا بیٹھے۔ انہوں نے اپنی کارگزاری کے لیے کوئی دوسرا میدان تلاش کر لیا۔ جہاں انہیں نگرانی کے فرائض ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ اور وہ نگران کار کی حیثیت سے دوسروں کو ہدایت کر سکیں کہ ایسا کرو ویسا کرو بعض لوگوں کو یہ جنون ہوتا ہے کہ وہ ہر کام میں جاسوسی کرتے پھریں ان کے ذہن ہمیشہ بلند منصوبوں اعلیٰ خیالات قیمتی تجاویز اور کام کرنے کے گر کی کثرت

سے اسقاط حمل کرنے والی کیفیت عارض رہتی ہے۔ طبعاً ان معززین کی نیت اور نصب العین ہمیشہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو جمع کر کے ان کی ایک ''نگران کار'' کمیٹی بنا دی جائے۔ جس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ با قاعدہ کام کرنے والے ماہرین فن کی ''دیکھ بھال'' کرتی رہے اور ان پر حکم چلاتی رہے۔ یہ بات قوم پرست اشتراکیت کی روح اور اصول کے خلاف ہے کہ نکمے اور نا اہل لوگ قابل کارکنوں کی کارگزاری میں ہمیشہ اپنی ٹانگ اڑاتے رہیں۔ یہ ''بانیان کمیٹیاں'' کبھی کچھ ٹھوس کام نہیں کر سکتے۔ میں نے اس زمانے میں اپنا یہ فرض سمجھا کہ ایسے دخل درمعقولات کرنے والوں سے ان کی حفاظت کروں۔ جنہیں کوئی با قاعدہ اور ذمہ دارانہ کام سونپا جا چکا ہو۔ کسی کو یہ اجازت نہ ہونی چاہیے کہ ایک کاریگر کے کام میں خواہ مخواہ جاسوسی کرتا پھرے۔ ایک صاحب ہنر کو فرصت اور فراغت ملنی چاہیے کہ جو کام ایک دفعہ اس کے سپرد کیا جا چکا ہے اسے اطمینان سے انجام تک پہنچائے۔

ان کمیٹیوں کے دخل درمعقولات سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے اراکین میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر کوئی ٹھوس کام سونپ دیا جائے ورنہ یہ لوگ ناقابل عمل تجاویز پیش کرنے میں بڑے دلیر ہوتے ہی۔ نئی نئی تجویزیں نہ پیش کریں تو بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ جب کوئی ٹھوس کام ان کے سپرد کر دیا جائے تو معزز اراکین رفتہ رفتہ کھسکنے لگتے ہیں۔ اور ڈھونڈنے سے بھی ان کا پتہ نہیں ملتا۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر بے اختیار جرمن پارلیمنٹ یاد آ گئی۔ اگر ان معزز اراکین پارلیمنٹ کو بھی خالی باتیں بنانے کی کوئی ٹھوس کام سپرد کر دیا جائے تو یہ لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ بالخصوص اگر ایک ایک رکن کے سپرد علیحدہ علیحدہ کام ہو اور ہر ایک کو شخصی طور پر اس کام کے لیے جواب دہ بنانا جائے۔ تو پھر ان حضرات کا کہیں جام و نشان بھی نظر نہ آئے گا۔

ہر کارے و ہر مردے

میرا مطالبہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ذاتی کاروبار میں ہم اس وقت تک نہیں تھکتے۔ جب تک کسی کام کے لیے ٹھکانے کا آدمی نہیں ڈھونڈ لیتے اسی طرح تحریک کے معاملات میں بھی تب تک دم نہ لینا چاہیے۔ جب تک کہ تحریک کے ہر شعبے کے ناظم یا قائد کے عہدے کے لیے سب سے زیادہ دیانت دار سب سے زیادہ قابل اور بہترین شخص تلاش نہ کرلیا جائے۔ جب ایسے شخص کو ایک مرتبہ کسی عہدے پر مقرر کردیا جائے تو پھر اسے مکمل اختیارات سونپ دیے جانے چاہئیں۔ اسے اپنے ماتحتوں سے کام لینے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ وہ جو ذاتی طور پر اپنے حاکموں کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ اس کے اختیارات بھی مکمل ہوں گے۔ اور اس کی ذمہ داری بھی مکمل ہوگی۔ کسی شخص کو اس وقت تک اس کے ماتحتوں پر حاکم نہ بنانا چاہیں جب تک وہ خود اس کام کا ماہر نہ ہو جو اس کو سونپا جائے۔ میں نے دو سال کے عرصہ میں اپنے ان خیالات پر زیادہ سے زیادہ عمل کروانا شروع کردیا۔ آج یہ حالت ہے کہ کم از کم جہاں تک ہماری تحریک کے بالائی حلقوں کی کارگزاری اور نگرانی کا تعلق ہے۔ یہ اصول مسلمہ مانے جاتے ہیں۔

میری یہ روش اختیار کرنے کا جواز ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ثابت ہوگیا۔ چار سال قبل جب میں تحریک میں شامل ہوا تھا تو تحریک کے پاس ربڑ کی مہر بھی نہ تھی۔ ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہماری تحریک خلاف قانون قرار دے کر جبراً منتشر کردی گئی اور اس کی تمام جائیدادیں ضبط کرلی گئیں۔ تب ہماری تحریک کی تمام جائیداد اور کاغذات کو نیلام کرکے اس کی جو قیمت وصول کی گئی وہ قریباً ایک لاکھ ستر ہزار جرمن سونے کی اشرفیوں کے برابر تھی۔

☆☆☆

باب دوازدہم :: ٹریڈ یونین کا مسئلہ

۱۹۲۲ء میں ہماری تحریک نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔اس ترقی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم ایک ایسے مسئلے پر توجہ دیں جسے ابھی تک حل نہ کیا گیا تھا۔

مزدوروں کو بھی ایک انجمن چاہیے

ہم ہر وقت یہ کوشش کرتے تھے کہ تحریک کو عوام کے دلوں تک پہنچانے کے لیے آسان ترین اور جلد سے جلد اثر کرنے والا طریقہ تلاش کیا جائے۔ ہماری ان کوششوں میں ہمیں ہر قدم پر اس اعتراض کا سامنا ہوتا تھا کہ جب تک مزدوروں کے پیشہ ورانہ اور اقتصادی مفاد کی نگہداشت ایسی سیاسی تنظیمات کے ہاتھ میں ہے جن کے سربراہوں کے اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔تب تک یہ کیسے ممکن ہے کہ مزدور مکمل طور پر ہماری تحریک سے وابستہ ہو جائیں۔

یہ ایک بڑا وزن دار اعتراض تھا۔عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ کسی پیشے کو اختیار کرنے والا مزدور جب تک کسی ٹریڈ یونین میں شامل نہ ہو۔اس کا کام نہیں چل سکتا۔ٹریڈ یونین میں شامل ہونے کے بعد نہ صرف مزدوروں کے پیشہ وارانہ مفادات محفوظ ہو جاتے تھے۔ بلکہ بغیر ٹریڈ یونین مین شامل ہوئے کام ملنا ہی محال تھا۔اکثر مزدور ٹریڈ یونین میں شامل تھے۔بحثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے۔کہ ٹریڈ یونیین اجرت کا ایک واضح نرخنامہ طے کروانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ٹریڈ یونیین اجرت کا ایک واضح نرخنامہ طے کروانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ ٹریڈ یونینوں کے ایسے عہد نامے طے کر رکھے تھے جن کی رو سے مزدوروں کی مستقل آمدنی کا انتظام ہوگیا تھا۔اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں نے ٹریڈ یونینوں کی اس جدوجہد سے فائدہ اٹھایا تھا۔دیانت دار افراد اگر اپنی اجرتوں کے نرخ ٹریڈ یونینوں کی مدد سے طے کرنے کا فائدہ اٹھانے کے بعد ٹریڈ

یونینوں کی مزید جدوجہد سے دست بردار ہو جاتے تو ان کا ضمیر انہیں اس حرکت پر ٹوکتا۔

''مالک'' کوتاہ اندیش ہوتے ہیں

اس مسئلہ کے متعلق ایک کھاتے پیتے آقا سے بحث کرنا خاصہ مشکل تھا۔ ان لوگوں کو نہ تو اس مسئلہ کے مادی پہلو سے واقفیت تھی' نہ وہ اس کا اخلاقی پہلو جانتے تھے۔ نہ وہ اس موضوع پر اپنے علم میں اضافہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ آخر کار مالکوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو مزدور ان مالکوں کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ان کی کسی قسم کی تنظیم مالکوں کے مفاد کے خلاف ہو گی۔ اس فیصلے کے بعد ان کھاتے پیتے مالکوں کا اس مسئلہ کا کوئی جانبدارانہ حل سمجھانا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی ان لوگوں کی توجہ مبذول کرانا نہایت ضروری تھا۔ جو نہ مالک تھے اور نہ مزدور' اس وجہ سے اس مسئل پر غیر جانبدارانہ حیثیت میں غور کر سکتے تھے۔ صرف غیر جانبدار اشخاص کے لیے ہی ممکن تھا کہ تفصیلات میں الجھ کر مسئلہ کی مجموعی حیثیت کو نظر انداز نہ کر دیں۔ غیر جانبدار حلقے تھوڑی سی ہمدردی سے بھی کام لیں تو ان کے لیے اس مسئلہ سمجھ لینا مشکل نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری قوم کے حال اور مستقبل دونوں کے لیے یکساں اہم ہے۔ اس مسئلہ کے صحیح حل پر ملک کی ہستی کا دارومدار ہے۔

معاشرتی بے انصافی کا تدارک لازمی ہے

میں اس کتاب کی پہلی جلد میں ٹریڈ یونین کی نوعیت اور اس کے مقاصد کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں۔ وہاں میں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جب تک یا تو سرکار اس مسئلہ کا کوئی حل نافذ نہیں کرتی یا تعلیم کے ذریعے کچھ نئے اعتقادات رائج کر کے مالکوں کا مزدوروں کے متعلق رویہ نہیں بدلا جا سکتا۔ تب تک مزدروں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے حقوق کی خود حفاظت کرے۔ مزدور اپنے حقوق کی حفاظت اس طرح کر سکتا ہے کہ مزدور اور مالک مساوی حیثیت کے فریقین کی شکل میں قوم کے اقتصادی نظام کے اندر رہتے ہوئے معاہدہ ملازمت کی شرائط باہم

طے کریں۔ ایسے معاملات میں سرکار کی جانب سے جبراً نافذ کردہ حل بالعموم متاثر ثابت نہیں ہوتا۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ٹریڈ یونین کے ذریعے معاشرتی بے انصافی دور ہو سکے تو یہ بات قومی مفاد کے لیے اچھی ہوگی۔ ورنہ یہ معاشرتی بے انصافی جاری رہی تو اس سے معاشرت کے پورے نظام کو سخت دھکا لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک مالکان میں ایسے افراد موجود ہیں جنہیں اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کا قطعاً احساس نہیں یا جو ابتدائی انسانی حقوق بھی ملحوظ نہیں رکھتے تب تک مزدور مجبور ہیں کہ وہ خود اپنے حقوق کے تحفظ کا اہتمام کریں۔ ساری بحث کا لب لباب بیان کرتے ہوئے میں نے یہ کہا ہے کہ جب مزدوروں کو خود حفاظتی کے لیے قدم اٹھانا ہی پڑے تو یہ بہتر ہو گا کہ ٹریڈ یونین کی بنیاد پر خود مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی جائے۔

ٹریڈ یونین کے مسئلہ کے مختلف پہلو

یہ تھے میرے اصولی خیالات' ۱۹۲۲ء میں انہیں خیالات پر قائم رہا۔ لیکن اب ضرورت تھی کہ واضح اور معین قاعدہ وضع کیا جائے۔ خالی مسئلے کا سمجھ لینا تو کافی نہ تھا۔ اب بعض ایسے نتائض اخذ کرنے کی بھی حاجت تھی جن پر عمل کیا جا سکے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات درکار تھے:

۱۔ کیا ٹریڈ یونینوں کی ضرورت ہے؟

۲۔ کیا جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کو خود ایک ٹریڈ یونین کے طور پر کام کرنا چاہیے؟ یا اس جرمن پارٹی کے اراکین کسی نہ کسی شکل میں ٹریڈ یونینوں کے اندر حصہ لیں؟

۳۔ اگر ایک قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین بنائی جائے تو اس کی شکل کیا ہو؟ ایسی ٹریڈ یونین کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اور اس کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

۴۔ اس لائحہ عمل اور مقاصد کے ماتحت ٹریڈ یونین قائم کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟

ٹریڈ یونین ضروری ہے

میرا خیال ہے کہ پہلے سوال کا تو تسلی بخش جواب میں دے چکا۔ بحالات موجودہ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہم ٹریڈ یونین کے بغیر کام چلا سکتے۔ برعکس اس کے قوم کے موجودہ حالات میں ٹریڈ یونین ایک نہایت اہم اقتصادی ادارہ ہے۔ ٹریڈ یونین فقط معاشرتی مسائل میں ہی اہم نہیں، بلکہ سیاسی مسائل میں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ٹریڈ یونینوں کی سیاسی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ جب قوم کے عام باشندے دیکھیں گے کہ ان کی وہ ضروریات جن پر ان کی زندگی اور موت کا انحصار ہے ایک انصاف پسند ٹریڈ یونین تحریک کے ذریعے پوری ہو رہی ہیں تو اس سے ساری قوم میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کا جذبہ تقویت حاصل کرے گا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ٹریڈ یونینیں وہ بنیاد ہیں جن پر آئندہ قوم کی اقتصادی پارلیمنٹ کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس قومی اقتصادی پارلیمنٹ کی ہیئت تشکیل یہ ہو گی کہ پارلیمنٹ کے اندر مختلف پیشوں اور حرفتوں کی جداگانہ پنچایتیں ہوں گی۔

سرکار پر قبضہ سے پہلے تحریک کو اپنا نظام باقاعدہ بنانا ہوگا

دوسرے سوال کا جواب دینا بھی آسان ہے۔ اگر ٹریڈ یونین تحریک اہم ہے تو ظاہر ہے کہ قوم پرست اشتراکیت کو اس مسئلہ پر کوئی واضح موقف اختیار کرنا چاہیے۔ یہ موقف صرف نظری نہ ہونا چاہیے کہ بلکہ عملی بھی ہونا چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس موقف پر عمل کیسے ہو؟ یہ سوال ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

قوم پرست اشتراکی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ قوم پرست اشتراکی قومی سرکار قائم کی جائے۔ اس لیے اس تحریک کو ہمیشہ یہ اصول اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ کہ جو سرکار نے ہم آئندہ بنانی ہے اس کے ماتحت ہم جو محکمے قائم کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی بنیاد ہمیں آج تحریک کے مختلف شعبوں کی سورت میں تیار کر لینی چاہیے۔ یہ سمجھنا بہت بڑی خطا ہوگی کہ صرف حکمرانی ہی اعلیٰ سیاسی قوت حاصل کر لینے سے بغیر ہم کسی بنیاد کے

یکلخت ایک نئی تنظیم کھڑی کر لیں گے۔ جدید نظام کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ جب تک ہمارے پاس ایسے کارکنوں کا ایک ذخیرہ نہ ہو۔ خاص طور پر اگر یہ کام تحریک کی روح کے مطابق انجام دینا ہے تو ایسی تربیت کی ضرورت اور بھی اشد ہو جاتی ہے۔ یہاں پھر یہ اصول تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر کام میں وہ روح]وہ عقیدہ اور جذبہ یا تصور زیادہ اہم ہوتا ہے جس کے ماتحت کوئی کام انجام دیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے عملی صورت کی اہمیت محض ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ کام کرنے کے ڈھنگ تو ایک رسم اور دستور طے کرنے کے بعد بڑی جلدی طے کیے جا سکتے ہیں لیکن حقیقی روح اور اصلی جذبہ پیدا کرنے میں دیر لگتی ہے۔ یہ روح اور جذبہ محض رسم اور دستور کی پابندی سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ایک قوم سیاسی لحاظ سے منظم ہے تو اس پر قیادت کا اصول جبری آمریت سے یکلخت نافذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس اصول کو ایک زندہ حقیقت بنانا تبھی ممکن ہو گا جب وہ تمام درجے طے کر لیے جائیں گے جن کے بغیر اس اصول کی طبعی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ وہ درجے یہ ہیں کہ سب سے نیچے ہر شہری کو اس اصول کے ماتحت تربیت دینی ہو گی۔ سب سے اوپر سرکار کے پورے نظام کو اس اصول کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ قیادت کے اصول کی تبلیغ اور نمائندگی کرنے کے لیے ایسے لوگوں کا ایک گروہ ہونا چاہیے۔ جو سالہا سال آزمانے کے بعد منتخب کیا گیا ہو۔ ان لوگوں کو زندگی کی کٹھن حقیقتوں کے تجربے نے پختہ کار بنا دیا ہو۔ تب ان لوگوں میں یہ اہلیت پیدا ہو گی کہ وہ قیادت کے اصول پر عمل کر سکیں۔

حکومت آئین سے نہیں ہوتی، تنظیم سے ہوتی ہے

یہ سوچنا فضول ہے کہ کسی سرکار یا آئین لکھا لکھایا ایک منٹ کے نوٹس پر قلمدان مین سے گھسیٹ کر نکالا جا سکتا ہے۔ اور اوپر سے ''احکام جاری کر کے ایسا آئین **ملک** میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے سوانگ رچائے تو جا سکتے ہیں، لیکن ان کا نتیجہ فقط یہ ہو گا کہ ایسے کھیل میں زیادہ دیر تک جاری رہنے کی طاقت نہ ہو گی۔ ایسا بے روح آئین اس

بچے کی مانند ہو گا جو پیدا ہی مردہ ہو۔ ایسے آئین کے تصور سے آئین وائمر کی مثال یاد آ جاتی ہے۔ اس آئین کی روح سے بھی تو یہی کوشش کی گئی تھی کہ جرمن قوم پر ایک نیا دستور حکومت اور ایک نیا سرکاری جھنڈا مسلط کر دیا جائے۔ اس دستور حکومت اور سرکاری جھنڈے کا گزشتہ نصف صدی میں ہماری قوم کی تاریخ کے عروج و زوال سے کوئی ربط نہ تھا۔

قوم پرست اشتراکی سرکار اس قسم کے ناکام تجربہ سے بچنا چاہتی ہے۔ یہ سرکار اس تنظیم کے بل پر قائم ہو گی جو خود عرصہ دراز سے کام کرتی رہی ہوں گی۔ خود اس تنظیم کے اندر قوم پرست اشتراکی زندگی کی عملی مثالیں موجود ہوں گی۔ انجام کار جب ایسی تنظیم ایک قوم پرست اشتراکی سرکار قائم کرے گی تو یہ سرکار ایک زندہ حقیقت ہو گی۔

پیشہ ورانہ پنچائتیں

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سرکار کا جو تناور شجر بہار لانے والا ہے اس کے بیج ان پیشہ ورانہ پنچائتوں میں موجود ہوں گے۔ جو ہر پیشہ اور ہر حرفت کے لیے جدا جدا قائم کی جائیں گی۔ یہ پنچائتیں ہی ٹریڈ یونینیں ہیں۔ غرض ٹریڈ یونین میں آنے والی سرکار کے ممکنات مضمر ہیں۔ پیشہ ورانہ نیابت کے اصول پر ایک مرکزی اقتصادی پارلیمنٹ کا ادارہ اگر ایک قوم پرست اشتراکی ادارہ بنتا ہے تو لازم ہے کہ آج بھی اس ادارے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی شاخ قوت پرست اشتراکی نظریہ حیات کی علم بردار ہو۔ ہماری تحریک کی آج کی شاخیں کل آنے والی سرکار کے محکموں کی شکل اختیار کر لیں گی۔ سرکار یکا یک چھومنتر سے تو قائم نہیں ہو جاتی۔ وہ تمام ادارے جادو سے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ جن سے سرکار بنتی ہے۔ اگر یہ بنیادیں جاندار نہ ہوں تو اس طرح جو سرکار بنتی ہے اس کے محکمے بے جان رہتے ہیں۔

اگر اس مسئلے کو بلند ترین زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ قوم پرست اشتراکی تحریک کو خود ٹریڈ یونین کے متعلق ایک واضح پالیسی اختیار کرنی ہو گی۔

پیشہ ورانہ رفاقت نہ پیشہ ورانہ رقابت

قوم پرست اشترا کی تحریک کو بھی ایک اور وجہ سے بھی ٹریڈ یونین کے متعلق واضح پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔ وہ وجہ ہے کہ ہمیں مزدور اور مالک دونوں کو صحیح معنوں میں قوم پرست اشترا کی اصولوں کی تعلیم دینا ہے۔ ہم نے دونوں کو سکھانا ہے کہ قوم نظام کے اندر رہتے ہوئے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہوگا یہ تعلیم خالی اصول درس یا اپیل اور وعظ و تلقین سے نہیں دی جاسکتی۔ یہ تعلیم فقط روزمرہ کی زندگی کی جدوجہد میں ہی دی جاسکتی ہے۔ تحریک کا فرض ہے کہ ملت کے نمایاں اقتصادی طبقات میں یہ جذبہ پیدا کردے اس جذبہ کی تعلیم دے کر ان مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ جب وہ قریب آجائیں ت پھر ان میں وسعت نظر پیداک جائے۔ جب تک یہ ابتدائی کام مکمل نہی ہوجاتا تو یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ ہم صحیح معنوں میں قومی معاشرہ کا کوئی نظام قائم کرسکتے ہیں۔ ہماری تحریک کا فلسفہ حیات ایک عظیم نصب العین پیش کرتا ہے ہماری تحریک اس نصب العین کی خاطر جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نصب العین کو اجتماعی فکر کی بنیاد پر بنانے کا کام آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔ جب ان بنیادوں پر اجتماعی فکر بنانے کا کام آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ انجام دیا جاستکا ہے۔ جب ان بنیادوں پر اجتماعی فکر مستحکم ہوجائے تو پھر یقین سے کہا جاسکتے گا کہ نیا نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ بغیر اس کے یہ نظام محض دکھاوے کا نظام ہوگا۔ اس وجہ سے تحریک کے لیے لازم ہے کہ وہ ٹریڈ یونین کے تخیل کی جانب ایک مثبت روش اختیار کرے اور اس کی مخالفت نہ کرے۔ صرف مخالفت ہی نہ کرنا ہی کافی نہیں۔ تحریک کو اس سے آگے بڑھنا ہوگا۔ آج ٹریڈ یونین کے اراکین اور معاونین کی عداد بہت بڑی ہے۔ ہماری تحریک کے لیے لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کو ایسی عملی تعلیم دے جس سے آنے والی قوم پرست اشترا کی سرکار کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب اوپر جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے

از خود اخذ کیا جا سکتا ہے۔

طبقاتی مصالحت نہ کہ طبقاتی جنگ

قوم پرست اشترا کی ٹریڈ یونین طبقاتی جنگ کی آلہ کار نہ ہوگی۔ ہماری ٹریڈ یونین تو مختلف پیشوں اور حرفتوں کی نمائندہ مجلس ہوگی۔ قوم پرست اشترا کی سرکار طبقاتی اختلاف کو تسلیم نہیں کرتی۔ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے ہماری سرکار صرف یہ تسلیم کرتی ہے کہ قوم کا ہر فرد سرکار کے ماتحت ایک مساوی رتبہ رکھنے والا شہری ہے۔ ہر شہری کے حقوق یکساں ہیں۔ حقوق کی مساوات کی نسبت سے سب کے فرائض بھی یکساں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہماری سرکار یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ سرکار کی رعایا میں شہریوں کے علاوہ کچھ ایسے سکونتی باشندے بھی ہوتے ہیں جو کسی سرکار کے ماتحت علاقہ میں رہائش تو رکھتے ہیں لیکن ان کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوتے۔

قوم پرست اشترا کی تصورات کی رو سے ٹریڈ یونین کا کام یہ نہیں کہ قوم کی ہیئت اجتماعیہ کے اندر سے چند افراد کو نکال کر انہیں ایک طبقہ کی صورت دے دے۔ پھر ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے لڑا دیا جائے۔ درآں حالیکہ سب طبقات قوم کی ہیئت اجتماعیہ کے اندر ہی پھوٹ ڈال کر قائم کیے گئے ہیں یقیناً ہم ٹریڈ یونین کے سپرد یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ ٹریڈ یونین کے سپرد یہ کام تو تب کیا جا سکتا ہے۔ جب ٹریڈ یونین مارکس ازم کے حامیوں نے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرنی شروع کی تھی۔ یہ خصوصیت ٹریڈ یونین کے اندر طبعاً ودیعت نہیں کہ ضرور اسے طبقاتی جنگ کے لیے آلہ کار کی حیثیت سے ہی استعمال کیا جائے۔ یہ تو مارکس ازم کے حامیوں نے خود اپنی طبقاتی جنگ میں ٹریڈ یونین کو بھی آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہودیوں نے ٹریڈ یونین کو ایک اقتصادی ہتھیار کی شکل دے دی۔ یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک اب ہتھیار کو آزادانہ اور خود مختار قومی سرکار کی اقتصادی بنیادی تباہ کرنے کی خاطر استعمال کرتی ہے۔ یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک خود مختار اور آزاد قومی سرکار کی قومی صنعتی نظام اور قومی

تجارت اسی ہتھیار کے ذریعہ سے تباہ کرتی ہے۔ اس کے بعد ان آزاد قوموں کو یہودیوں کی عالم گیر مالیتی قوت کا غلام بنایا جاتا ہے۔ یہودیوں کی یہ مالیاتی قوت دنیا بھر میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ قومی سرکاروں کی علاقائی حدود اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

''مالک'' اور ''مزدور'' دونوں قوم کے اعضا ہیں

برعکس اس کے قوم پرست اشترا کی ٹریڈ یونین کا فرض ہے کہ قوم کی اقتصادی زندگی میں حصہ لینے والے افراد کے جداگانہ گروہ منظم کر دیے جائیں۔ اس تنظیم کا مقصد فقط یہ ہو کہ قومی اقتصادی نظام کا بہتر طور پر تحفظ کیا جاسکے۔ قومی اقتصادی نظام کو زیادہ مستحکم بنانے کے لیے اس کے اندر سے وہ تمام خرابیاں دور کر دی جائیں جو بالعموم آخر قومی معاشرہ پر تباہ کن اثرات ڈالتی ہیں۔ ان خرابیوں سے قومی نظام کی قوت اور طاقت کو نقصان پہنچتا ہے۔ سرکاری بہبودی اور مرفع الحال میں خلل پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خرابیوں سے خود اقتصادی زندگی پر برا اثر پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قوم پرست اشترا کی ٹریڈ یونین ہڑتال کے ہتھیار کو قوم کے کارخانوں میں مال کی پیداوار میں خلل ڈالنے کے لیے یا گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے استعمال نہ کرے گی۔ ہماری ٹریڈ یونین تو ہڑتال کا حربہ صرف اسی لیے استعمال کرے گی کہ قومی پیداوار بڑھائی جاسکے۔ قومی پیداوار کو بڑھانے کے لیے ان تمام خرابیوں کے خلاف جدوجہد کی جائے گی جو معاشرہ میں خلل پیدا کر کے کاروبار کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان خرابیوں اور ایسے خلل سے قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ افراد میں کارگزاری کی اہلیت اسی حد تک پائی جاتی ہے۔ جس حد تک کہ افراد کو معاشرے میں حیثیت محفوظ ہوتی ہے۔ یا اقتصادی نظام کے ماتحت ہر فرد کے قانونی حقوق کا بچاؤ کیا جاتا ہے۔ افراد میں کارگزاری کی اہلیت قائم رکھنے کے لیے ایک دوسری شرط یہ بھی ہے کہ ہر فرد کو یقین ہو کہ قوم اقتصادی طور پر خوشحال ہوئی تو قوم کے ہر فرد کو اس خوشحالی میں سے حصہ

ملے گا۔

قوم پرست اشتراکیت قبول کرنے والے مزدوروں کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ خود ان کی مادی خوشحالی قوم کی اقتصادی مرفع الحالی پر منحصر ہے۔

علی ہذا القیاس قوم پرست اشتراکیت قبول کرنے والے مالکان کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کا وجود قائم رکھنے اور ان کی اقتصادی بہبود کو بڑھانے کے لیے مزدوروں کی خوشحالی اور اطمینان شرط اول ہے۔

مالک اور مزدور کے جھگڑے کس طرح طے ہوں گے

قوم پرست اشتراکی مزدور اور قوم پرست اشتراکی مالکان دونوں مل کر ساری قوم کے نمائندے اور کماشتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کو بڑی حد تک جو ذاتی آزادی دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ جس حد تک انفرادی آزادی دی جائے اتنا ہی فرد کی قوت پیداوار بڑھتی ہے۔ برعکس اس کے کہ جس حد تک فرد پر خارجی جبر کیا جائے اتنا ہی فرد کی قوت پیداوار بڑھتی ہے۔ مزدی بریں انفرادی آزادی سے ان فطرتی عوامل کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے جو قابل ترین لائق ترین اور سب سے زیادہ محنت کرنے والے شخص کو ترقی دے کر دوسروں سے بالاتر بنا دیتے ہیں۔ غرض قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین کے نزدیک ہڑتالی محض حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہیں۔ یہ ذریعہ اس وقت تک استعمال کرنا جائز ہے کہ جب تک قوم پرست اشتراکی سرکار قائم نہیں ہو جاتی۔ جب قوم پرست اشتراکی سرکار قائم ہو جائے گی تو مالکوں اور مزدوروں کے دونوں گروہوں میں عام جدوجہد کے امکانات از خود ختم ہو جائیں گے۔ ان دونوں طبقات کے تصادم سے ہمیشہ قومی پیداوار اور قومی معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان کا باہمی تصادم بند کر کے، قوم پرست اشتراکی سرکار ہر فریق کے حصول کی حفاظت اور ہر فریق کی نگہداشت خود اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ اوپر جس اقتصادی پارلیمنٹ کا ذکر ہو چکا ہے اس کا فرض ہوگا کہ قوم کے اقتصادی نظام کو چالت رکھے اور اس میں جو نقص یا

خرابی پیدا ہو جائے اسے دور کرے آج جن مسائل پر جھگڑے کی نوبت آ جاتی ہے۔اور پھر یہ جھگڑا لاکھوں انسانوں میں پھیل جاتا ہے۔ وہ قوم پرست اشتراکی سرکار کے ماتحت ہر پیشہ اور حرفت کی جداگانہ نمائندہ پنچائتوں یا مرکزی اقتصادی پارلیمنٹ میں طے کر دیا جائے گا۔ مالکان اور مزدوروں میں اجرت کے نرخوں یا کام کرنے کے اوقات کے متعلق کبھی باہم تصادم نہ ہوگا۔ ایسے تصادم سے دونوں فریقوں کو نقصان پہنچتا ہے۔قوم پرست اشتراکی سرکار کے ماتحت دونوں فریق ایسے مسائل اعلیٰ مصلحتوں کے پیش نظر حل کریں گے۔قومی معاشرہ اور قومی سرکار کی بہبود۔ ہر دو فریق کے نزدیک بالاتر نصب العین ہو گی فریقین باہمی گفت وشنید میں اس بالاتر نصب العین کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھیں گے۔

یہاں پھر یہ اصول مدنظر رکھا جائے گی کہ **ملک** کا مفاد ہمیشہ سیاسی جماعتوں کے مفاد پر قابل ترجیح ہے۔یہ وہ اصول ہیں جس سے کبھی انحراف گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں میدان خالی نہ ہو وہاں نیا اکھاڑا کیسے قائم کیا جائے

قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے اراکین کو مندرجہ بالا نصب الدین کی تلقین کرے اور اس پر عمل کی تربیت دے۔اس فرض کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے۔کہ قومی سرکار اور قوم کے تحفظ و بقا کے لیے سب کو مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ ہر فریق کو فطرت نے جو طاقت اور استعداد و دیعت کی ہے اور پھر یہ طاقت اور استعداد جس حد تک وقوم کی دستگیری سے تربیت پا کر ترقی پا گئی ہے۔اسی حد تک ہر فریق پر یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ قومی سرکار اور قوم کے تحفظ کے لیے قربانی دے اور کام کرے۔

ہمارا چوتھا سوال یہ تھا کہ ان اغراض و مقاصد کے لیے ٹریڈ یونین قائم کس طرح کی جائے گی؟اس سوال کا جواب دینا ذرا کٹھن ہے۔

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں پہلے کچھ نہ ہو وہاں کوئی عمارت تعمیر کرنا نسبتاً آسان ہے۔ برعکس اس کے کہ جہاں پہلے کوئی پرانی عمارت بن چکی ہو وہاں کوئی نئ

عمارت کھڑی کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اگر کسی ضلع میں کوئی خاص کاروبار پہلے سرے سے موجود نہیں تو وہاں کوئی شخص بڑی آسانی سے یہ کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی علاقہ میں ایک کاروبار پہلے سے چل رہا ہے تو پھر اس قسم کا دوسرا کاروبار کرنا ذرا دشوار ہو گا۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ اس رقبہ میں اس قسم کے ایک ہی کاروبار کی گنجائش ہو تو پھر یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ نئے کاروبار چلانے والوں کو نہ صرف اپنا کاروبار چلانے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بلکہ علاقہ میں جو کاروبار پہلے سے موجود ہے۔ اس کو ختم کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے' جب تک پہلا کاروبار ختم نہ ہو دوسرا کاروبار کیسے چل سکتا ہے۔

نئی انجمن کے ساتھ نئے جذبہ کی بھی ضرورت ہے

اگر دوسری ٹریڈ یونینوں نے چلتا رہنا ہے تو ان کے پہلو بہ پہلو ایک قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین چلا دینے سے کچھ تو فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین بنانے کا فائدہ تو تبھی ہو سکتا ہے جب اس ٹریڈ یونین میں ایک اعتقادی اور ایمانی جذبہ سرایت کر جائے کہ اپنے تنظیمی فرائض کو ضرور پورا کرنا ہے۔ اگر یہ اعتقاد اور ایمان پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ یہ خیال بھی ضرور پیدا ہو گا کہ اس قسم کی' یا اس سے ملتی جلتی کوئی مخالف تنظیم باقی نہ رہنی چاہیے۔ ایسی ٹریڈ یونین کے لیے یہ اصرار کرنا لازم ہو گا کہ صرف اسی ٹریڈ یونین کی بقا ضروری ہے۔ اس کی کوئی حریف تنظیم باقی نہیں رہنی چاہیے۔ بلکہ وہ روا نا روا غیری کا نعرہ بلند کرے گی۔ اس کا تقاضا یہ ہو گا کہ صرف اسی کو باقی رکھا جائے اور باقی سب کو فنا کر دیا جائے۔

مندرجہ بالا مقصد دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم ایک ٹریڈ یونین قائم کریں اور پھر رفتہ رفتہ مارکس ازم کی حامی بین الاقوامی ٹریڈ یونین سے مقابلہ شروع کریں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم مارکس ازم کی حامی بین الاقوامی ٹریڈ

یونین میں داخل ہو جائیں اور اس میں ایک نئی روح پھونک دیں ۔نیت یہ ہو کہ اس پرانی ٹریڈ یونین کو ایک نئے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا ہے۔

مزدوروں کو مالی امداد کی حاجت ہے

پہلا طریقہ تو اس لیے ہمارے مناسب حال نہ تھا کہ ان دنوں ہماری مالی حالت اچھی نہ تھی۔ ہماری مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ اس کے باعث ہمیں تشویش لاحق ہو رہی تھی۔ ہمارے آمدنی کے ذرائع بہت کم رہ گئے تھے۔جرمن سکہ کی قوت خرید گر جانے کا اثر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔اس سے ہماری مالی مشکلات اور بھی بڑھ گئی تھیں ۔ان دنوں ٹریڈ یونینیں اپنے اراکین کی کوئی ٹھوس مدد نہ کر رہی تھیں۔ جب ٹریڈ یونینیں اپنے اراکین کو مالی امداد نہ دیتی تھیں۔تو اراکین کیوں ٹریڈ یونین کو چندہ دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینیں جو پہلے سے موجود تھیں ان کا حال بھی پتلا ہو رہا تھا۔ہاں جب ہر کیونو نے روہر کے علاقہ میں ایک نئی پالیسی اختیار کی تو مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونین کے خزانہ میں لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ ہر کیونو تب جرمن سرکار کے وزیر اعظم تھے۔نام کو تو وہ قوم پرست کہلاتے تھے لیکن تاریخ میں ان کا تذکرہ آئے گا تو یہی لکھا جائے گا کہ جب مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینوں کا حال پتلا ہو رہا تھا تو ہر کیونو کی پالیسی کے مطابق ان ٹریڈ یونینوں کی مالی دقتیں دور ہو گئیں۔

ہم اس قسم کی مالی سہولتیں فراہم ہو جانے کی توقع نہ رکھ سکتے تھے۔پھر ایک ایسی نئی ٹریڈ یونین میں کوئی شخص کیوں داخل ہوتا ہے جو اپنی مالی کمزوری کے باعث اس کی کوئی امداد نہ کر سکتی تھی۔می نے ان حالات میں اپنا فرض یہی سمجھا کہ ایسی تنظیم بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ایسی تنظیم میں تو وہی لوگ شامل ہوں گے جو کوئی کام کاج نہیں کرتے' اور بس خیالی گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔

ہر کام کے لیے ایک رہنما چاہیے

ان دنوں صحیح قسم کے رفقاء کار حاصل کرنے کا مسئلہ میرے لیے ایک بڑا اہم مسئلہ

بن چکا تھا۔ میرے پاس کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جسے یہ اہم کام سپرد کیا جا سکتا۔ اس وقت کے حالات میں جو شخص مارکس ازم کی حامی یونین ختم کر کے اس کی جگہ قوم پرست اشتراکیوں کے اجتماعی تعاون کے فلسفہ کو رائج کر سکتا وہ ہماری قوم کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہوتا۔ اجتماعی تعاون کے فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ طبقاتی رقابت کی تباہ کن جنگ ختم کر کے اس کی جگہ طبقاتی تعاون رائج کیا جائے۔ جو شخص یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا اس کا مجسمہ رجز برگ کے ولہلا میں نسب کیا جانا چاہے تھا تا کہ آئندہ نسلیں ہمیشہ اسے خراج عقیدت پیش کر سکیں۔

میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو اس مرتبہ پر فائز کیے جانے کے قابل ہوتا۔

حملہ کے لیے مدافعت سے زیادہ طاقت درکار ہوتی ہے

یہ درست ہے کہ بین الاقوامی ٹریڈ یونینیں چلانے والے لوگ بڑی معمولی ذہنیت کے انسان ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ معمولی قائدین کے باوجود ان بین الاقوامی یونینوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب یہ یونینیں قائم ہوئی تھیں تو تب ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اس قسم کی دوسری کوئی یونین موجود نہ تھی۔ برعکس اس کے اگر آج ہم قوم پرست اشتراکی تحریک کوئی نئی یونین قائم کرتی ہے تو اسے ایک ایسی دیوار تنظیم سے ٹکر قبول کرنا ہوگی۔ جو مدت سے کام کر رہی ہے اس دیوزاد تنظیم کی جناتی بنیادیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ دیوہیکل تنظیم اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی طے پا چکی ہیں۔ اگر کوئی حملہ آور کسی مدافعت کرنے والے کو شکست دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ مدافعت کرنے والے سے زیادہ دانائی کا ثبوت دے۔ یہ درست ہے کہ مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینوں نے اپنی حفاظت کے لیے جو قلعہ تعمیر کیا ہے آج کل اس کا بچاؤ معمولی ذہانت رکھنے والے قائدین کے سپرد ہے لیکن اس قلعہ کو فتح کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ طریقہ ہے کہ ان تھک محنت اور جرات سے کسی غیر معمولی قابلیت کے مالک قائد کے

ماتحت اس پر حملہ کیا جائے ۔اگر ایسا قائد میسر نہ آسکے تو یہ جدوجہد کرنا فضول ہوگا۔اگر ایسا قائد میسر نہیں آسکتا تو پھر جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے اسے برداشت کرنا چاہیے۔جو کچھ موجود ہے جب اس سے بہتر نظام قائم کرنے کی طاقت ہم میں نہیں تو پھر موجودہ نظام برباد کرنا سراسر حماقت ہوگی۔

کوئی کام ادھورا کرنے سے بہتر ہے کہ نہ کیا جائے

یہاں میں زندگی کا ایک اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔یہ وہ اصول ہے کہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی کام کو ترک کردینا اس کام کو خراب کرنے طریقے سے انجام دینے کے مقابلہ میں بہت ہوتا ہے۔جب کوئی مہم انجام دینے کے وسائل میسر نہ ہوں تو پھر اس مہم میں ہاتھ ڈالنا اس مہم کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔

سیاسی مسائل کا حل اقتصادی جدوجہد سے پہلے کرنا چاہیے

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔یہ بات محض کہنے کی نہیں بلکہ اسپر عمل بھی ہونا چاہیے۔ان دنوں میرا پختہ عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص سیاسی میدان میں کسی عظیم اعتقادی جدوجہد کا اہتمام کررہا ہو تو پھر ایسی جدوجہد کے آغاز میں ہی اقتصادی اور مالی معاملات کو اپنی جدوجہد کا محور بنالینا مناسب نہیں ہوتا۔یہ اصول جرمن قوم پر بالخصوص عائد ہوتا ہے۔اگر اس اصول پر عمل نہ کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جو قوت سیاسی جدوجہد میں صرف ہوتی ہے وہ اقتصادی مہم میں خرچ ہونے لگے گی۔ اور اگر لوگوں کو یقین ہو جائے کہ وہ اپنی ذاتی بچت سے رقم پس انداز کرکے سر چھپانے کو مکان بنا سکتے ہیں تو پھر وہ بچت کرنے کے اہتمام میں ایسے منہمک ہو جائیں گے کہ سیاسی جدوجہد کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ بچے گا۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غاصب لوگ کسی حیلے بہانے لیس سیاسی اقتدار پر قائم ہو جائیں گے۔اور پائی پائی بچا کر جو جمع جتھا اکٹھی کی گئی ہے ایک ہی دفعہ ان غاصبوں کے قبضہ میں چلی جائے گی۔عوام کو جن اعتقادات اور خیالات کے لیے سیاسی جنگ پر آمادہ کیا گیا ہے وہ ان سے منحرف ہو کر

مصالحت کی کوششوں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ انجام کار سیاسی جدوجہد ایک طرف ناتمام رہ جائے گی اور دوسری طرف اقتصادی مقصد بھی حل نہ ہوگا۔

اعتقاد ٹھیک نہ ہوتو اقتصاد بھی بگڑ جاتا ہے

آج قوم پرست اشتراکی تحریک کی جدوجہد کا آغاز ہے۔ ابھی اس تحریک کی اولین توجہ اپنے اعتقادات اور تصورات کی تشکیل پر صرف ہونی چاہیے۔ تحریک کی تمام قوت اس جدوجہد پر خرچ ہونی چاہیے کہ تحریک کا نصب العین مقبول عام ہو جائے۔ یہ کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ تحریک کی تمام قوتیں اس ایک مقصد کے حصول کی خاطر جمع نہیں کر دی جاتیں۔

آج جرمنی کی جو حالت ہے وہ یہ اصول ثابت کرنے کی بہترین مثال ہے کہ جب کوئی قوم فقط اقتصادی مسائل حل کرنے میں منہمک ہو جائے تو پھر اس قوم کے قوائے عمل میں کس طرح شل ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی طاقت ان کے اعتقادات اور تصورات پر منحصر ہوتی ہے۔ جب اعتقادات میں ڈھیل پیدا ہو جائے تو خالی اقتصادی جدوجہد ہرگز سودمند ثابت نہیں ہوتی۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں جو عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ اسے ٹریڈ یونینوں نے برپا نہ کیا تھا بلکہ ٹریڈ یونینوں نے تو اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ باوجود اس کے انقلابات برپا ہو کر رہا۔ جرمنی کے باشندے اپنے **ملک** کا مستقبل محفوظ رکھنے کی خاطر کوئی سیاسی جدوجہد نہ کر سکے۔ وہ ایسی سیاسی جدوجہد سے اس لیے باز رہے کہ انہیں خیال تھا کہ محض اقتصادی دائرۂ عمل میں تعمیری جدوجہد جاری رکھنے سے **ملک** کا مستقبل بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی قوت نفاذ کے حصول سے قبل' معاشرتی اصلاح ممکن نہیں

اس تجربہ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے یہی روش اختیار کی تو ہمارا بھی یہی انجام ہوگا۔ جب ہماری تحریک کی ساری طاقت سیاسی جدوجہد میں صرف ہو گی

تو ہم اپنی سیاسی جدوجہد میں زیادہ پرامید ہونے کے حق دار ہوں گے۔ اگر ہم نے سیاسی جدوجید میں کامیابی حاصل کرلی تو پھر ہمیں ہرمحاذ پر فتح ہوگی۔ برعکس اس کے اگر ہم قبل از وقت ٹریڈ یونین کے مسائل میں الجھ گئے یا مزدوروں اور مالکان کے مابین مفاہمت تلاش کرنے لگے تو بحیثیت مجموعی ہمیں نقصان پہنچے گا۔ یہ درست ہے کہ ٹریڈ یونین کا مسئلہ بھی اہم ہے۔لیکن خود اس مسئلہ کا تشفی بخش حل بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب سیاسی طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے جب سیاسی طاقت ہمارے ہات میں ہوگی تو ہم ٹریڈ یونین کے متعلق بھی اپنے خیالات کو نافذ کرسکیں گے۔ جب تک ہمیں سیاسی قوت حاصل نہیں ہوجاتی۔ ایسے مسائل میں الجھنا سوائے تحریک کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے اور کچھ نتیجہ نہیں کرسکتا۔ اگر ہم قبل از وقت ٹریڈ یونین کے مسئلہ میں الجھ گئے تو تحریک کا اعلیٰ نصب العین پورا نہ ہوسکے گا۔ عین ممکن ہے کہ ٹریڈ یونین کے مقاصد تحریک کے سیاسی پروگرام پر غالب آجائیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ تحریک کی اعتقادی مصالحتیں ٹریڈ یونین پر غالب رہیں۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں صرف اس مقصد سے ہونی چاہیے کہ تحریک کے اعتقادات کو فروغ حاصل ہو۔

تحریک کو اجتماعی رقابت نہیں' بلکہ اعتقادی ایمان کی حاجت ہے

تحریک اور قوم کو ایک قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین کی تنظیم سے صرف اسی صورت میں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کہ ٹریڈ یونین مکمل طور پر قوم پرست اشتراکی اصول پر عامل ہو۔ جب تک ٹریڈ یونین مکمل طور پر قوم پرست اشتراکی اصول قبول نہ کرے گی تو خطرہ باقی رہے گا۔ کہیں یہ ٹریڈ یونی مارکس ازم کی تحریک کے قابو میں نہ آجائے۔ ایک ایسی قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین جو اپنے آپ کو فقط مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینوں کی حریف سمجھے' اگر سرے سے قائم نہ ہی کی جائے تو بہتر ہوگا۔ قوم پرست اشتراکیت ٹریڈ یونین کو مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونین سے صرف بطور ایک حریف انجمن کے نہیں لڑنا۔ بلکہ اس کی جنگ کی بنیاد تو اعتقاد پر مبنی ہونی چاہیے۔ قوم پرست ٹریڈ یونین اس لیے مارکس ازم

کی حامی ٹریڈ یونین سے لڑے گی کہ وہ طبقاتی رقابت اور طبقاتی جنگ کے تصورات کی مخالف ہوگی۔ طبقاتی تصادم کے نظریہ کے برعکس قوم پرست ٹریڈ یونین کا اصول یہ ہوگا کہ قوم کے اندر ہر پیشے اور ہر حرفت سے تعلق رکھنے والے افراد کے مفاد کی نگہداشت کی جائے۔

جو کام نہ کر سکتے ہوں اس میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیے

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری جداگانہ ٹریڈ یونین قائم کرنا' تب مناسب تھا نہ اب مناسب ہے۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ جب تک کوئی ایسا شخص بطور رفیق کار میسر نہیں آتا جسے قسمت نے یہ مسئلہ حل کرنے کی خاطر پیدا کیا ہو۔ تب تک مجھے اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

یہ موقف اختیار کرنے کے بعد صرف دو راستے کھلے تھے یا تو ہم اپنی تحریک کے اراکین کو ہدایت کرتے کہ ہو جن ٹریڈ یونینوں میں شامل نہیں انہیں چھوڑ دیں یا پھر ہم انہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ جن ٹریڈ یونینوں میں شامل ہیں کچھ عرصہ انہیں میں داخل رہیں تاکہ جہاں تک ہو سکے ان کے اندر خلل پیدا کیا جائے۔

عام طور پر میں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ دوسرا راستہ اختیار کیا جائے۔

۲۳۔۱۹۲۲ء کے درمیانی سال میں یہ روش اختیار کرنا ہمارے لیے خاصا آسان تھا۔ ان دنوں جرمن سکے کی قیمت گر چکی تھی۔ اس لیے ٹریڈ یونین میں شامل ہونے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ حاصل نہ ہو رہے تھے۔ ہماری تحریک کا ابھی آغاز تھا۔ لہذا ہمارے اراکین کی تعداد بھی تھوڑی تھی۔ ان حالات میں ہم اگر علیحدہ ٹریڈ یونین بناتے تو اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچتا۔ ہماری تحریک کے بعض اراکین جدا ٹریڈ یونین بنانے کے سخت مخالف تھے۔

جو انجمن اراکین کی مدد نہیں کر سکتی اسے چندہ بھی نہ لینا چاہیے

نئی ٹریڈ یونین بنانے کا منصوبہ شروع ہی سے نظر آ رہا تھا کہ نا کام ہوگا۔ اس لیے میں

نے اس قسم کا کوئی تجربہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کسی مزدور کی غریبانہ آمدنی میں سے چندہ لے کر ایک ایسی انجمن بنانا جو مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنے اراکین کی خدمت نہ کر سکے گی۔ میرے نزدیک ایک مجرمانہ حرکت ہوتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اگر ایک نوزائیدہ سیاسی پارٹی ختم ہو جائے تو اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو تو فائدہ پہنچتا ہے۔ بہر حال کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسی پارٹی کو ختم ہو جانے کے خلاف شکایت کر سکے۔ ایک سیاسی تحریک کا ہر رکن اس تحریک کو جو کچھ دیتا ہے یہ سمجھ کر دیتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ برآمد نہ ہو اور اس کی قربانی رائیگاں ہو جائے۔ برعکس اس کے جب کوئی شخص ٹریڈ یونین کا چندہ ادا کرتا ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے عوض اسے یہ ضمانت بھی ملے گی کہ مشکل وقت میں اس کی مالی مدد کی جائے گی۔ اگر ایک ٹریڈ یونین مشکل وقت پڑنے پر اپنے اراکین کی مالی مدد نہیں کرتی تو ایسی ٹریڈ یونین فریب کاروں کی ایک انجمن ہے۔ اگر وہ فریب کاروں کی انجمن نہیں تو کم از کم اس انجمن کے کرتا دھرتا ایسے غافل لوگ ہیں جنہیں ان کے فرائض کی انجام دہی کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

جلد بازی کا انجام اچھا نہیں ہوتا

۱۹۲۲ء میں اس مسئلہ کی بابت فیصلہ کرتے وقت ہم نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا۔ بعض دوسرے لوگوں نے ہم سے اختلاف رائے کیا اور ٹریڈ یونینیں بنا ڈالنے وہ لوگ ہمیں طعنہ دیتے تھے کہ ہم تنگ نظر ہیں اور مستقبل کے امکانات سے بے خبر ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد یہ ٹریڈ یونینیں ختم ہو گئیں۔ اگر ہم نے ٹریڈ یونین بنائی ہوتی تو ہمارا بھی یہی حشر ہوتا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہم راستہ اختیار کرتے تو نہ اپنے اراکین کو دھوکہ دیتے اور نہ خود اس مسئلہ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔

☆☆☆

باب سیزدہم ::: پہلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی حلیفوں کی بابت جرمنی کی پالیسی

غیر ہردلعزیز حکمران اچھے بیرونی حلیف نہیں ڈھونڈ سکتے

جرمن سلطنت کی خارجی حکمت عملی ایک عجیب اندھا دھند طریقہ سے چلائی جاتی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ خارجی حکمت عملی کسی معقول اصول پر مبنی نہ تھی ۔دوسری قوموں سے حلیفانہ تعلقات یا معاہدات بعض عملی اور مفید اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں ۔یہی روش انقلاب کے بعد بھی جاری رہی ۔بلکہ انقلاب کے بعد سورت حال پہلے سے بھی بدتر ہوگئی ۔جنگ سے پہلے ہمارے سیاسی تصورات کی بے ترتیبی کی بڑی وجہ تھی کہ جن مدبرین کے ہاتھ میں ہماری حکومت کی باگ ڈور تھی وہ نالائق تھے ۔لیکن جنگ کے بعد حکومت کی غلط روش کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ بد دیانت اور غیر مخلص تھے ۔جن سیاسی جماعتوں نے اپنے تخریبی مقاصد انقلاب کے ذریعے حاصل کیے تھے بھلا وہ کب پسند کرسکتی تھیں کہ جرمنی کا کسی بیرونی قوم سے کوئی ایسا معاہدہ ہوجائے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک مطلق العنان اور آزاد جرمن سرکار از سر نو قائم ہو جائے ۔ایک مطلق العنان اور آزاد جرمن سرکار قائم ہونا وہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے انقلاب برپا کرنے سے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ایسی سرکار قائم ہو جاتی تو جرمنی کا قومی اقتصادی نظام اور جرمنی کے مزدور' بین الاقوامی طاقتوں کے شکار نہ بنتے رہتے' سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر جرمن سرکار دوسرے ملکوں کے اثرات سے آزاد ہو گئی تو شاید اس کا اثر خود جرمنی کی داخلی سیاسیات پر بھی پڑے ۔داخلی سیاسیات میں یہ تبدیلی ان لوگوں کے لیے تباہی کا پیغام تھی جو آج کل جرمنی کی حکومت سنبھالے بیٹھے ہیں۔

خارجی وقار سے پہلے داخلی اتحاد لازم ہے

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم تنزل کے گڑھے سے نکل کر ترقی کی بلندی پر پہنچ جائے اور ایسا ہونے سے پہلے خود قسم کے اندر ملت پرستی کا جذبہ بیدار ہو چکا ہو۔ پہلے کوئی قوم داخلی طور پر متحد ہوتی ہے تب اسے خارجی عروج حاصل ہوتا ہے۔ خارجی حکمت عملی میں ہر کامیابی سے داخلی استحکام کو تقویت پہنچتی ہے۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جب کوئی قوم غلامی سے نجات سے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس میں قوم پرستی کا جذبہ پہلے سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے اور قوم کا احساس خودشناسی سے پہلے بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصول آزادی کی کوشش کے دوران میں منافی قوم رجحانات کا محاسبہ زیادہ سختی سے کیا جاتا ہے۔ جو عناصر قومی مفاد کے خلاف کسی حرکت کے مرتکب ہوں انہیں معاف نہیں کیا جاتا۔ امن کے زمانہ میں کئی ایسے اشخاص کی منافی قوم حرکات اور مفاد قومی کو ضرر پہنچانے والے کئی امور برداشت کر لیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن جب قوم پرستی کے جذبات بیدار ہو چکے ہوں تو ایسے اشخاص اور ان امور کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ خم ٹھونک کر ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جب تک ان سے نجات حاصل نہ کر لی جائے۔ تب تک دم نہیں لیا جاتا۔ اس سلسلہ میں جنگ چھڑ جانے کے بعد ہر جگہ جس طرح دشمن کے جاسوسوں کی موجودگی کا وہم پھیل گیا تھا اور اس وہم نے جنون کی شکل اختیار کر لی تھی وہ نہایت سبق آموز ہے۔ عوام کے جذبات برانگیختہ ہو چکے تھے۔ ایسے ایسے وحشیانہ ظلم توڑے گئے کہ ان کے تصور میں بھی تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ظلم توڑنے کے کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ زمانہ امن میں جاسوسوں سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن امن کے زمانہ میں جاسوسوں پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جنگ کے ایام میں قومی جذبات زیادہ مشتعل ہوتے ہیں۔

ملت کش حکمران کامیاب خارجہ حکمت عملی نہیں چلا سکتے

نومبر کے واقعات کے بعد جن سرکاری نکھٹوؤں نے حکومت پر قبضہ جما رکھا ہے اس

قوم کے سربراہ بن بیٹھے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر جرمنی کا اتحاد ایسی سلطنتوں سے قائم ہو گیا جن کے تعاون سے جرمنی کو آزادی مل سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ملک میں قوم پرستی کے جذبات کو فروغ حاصل ہو گا۔ جرمنی میں قوم پرستی کا احساس تقویت پکڑ گیا تو خود ان مجرموں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۱۸ء کے بعد جن لوگوں نے حکومت پر قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ جرمنی کے تعلقات خارجہ کے متعلق کوئی مثبت حکمت عملی اختیار نہیں کرتے۔ حکومت کا کاروبار اس طرح چلایا جا رہا ہے جن سے جرمن قوم کے مفاد پامال ہو رہے ہیں۔ یہ کارروائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جا رہی ہے۔ شروع شروع میں تو لوگوں کا خیال تھا کہ حکومت کی یہ پالیسی محض اتفاقی حالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن معاملہ کی چھان بین کی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے ماہ نومبر میں جو راستہ اختیار کیا گیا وہ قوم کش خارجی حکمت عملی اس کا منطقی نتیجہ ہے۔

ایسی خارجی حکمت عملی کے لیے ہماری قوم کے تین مختلف عناصر ذمہ دار ہیں۔ ان عناصر کی ذمہ داری یکساں نہیں۔ پہلا عنصر تو وہ لوگ ہین جو سرکاری نظم ونسق چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ یا جن کو سرکاری نظم ونسق چلانے کا ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔ دوسرا عنصر ہمارے عام پارلیمنٹری سیاست باز لوگ ہیں۔ تیسرا عنصر ہماری قوم کے عوام ہیں۔ جن کی بھیڑ چال اور معاملہ نافہمی عیاں ہے۔

پہلا عنصر جو کچھ کرتا ہے جان بوجھ کر کرتا ہے۔ دوسرا عنصر پہلے عنصر کی ہمنوائی کرتا ہے۔ اس ہمنوائی کی وجہ یا تو یہ ہے کہ شروع ہی سے انہیں رائج الوقت تصورات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس حکمت عملی کو ضرر رساں سمجھتے ہیں۔ اس کی مخالفت کرنے کی ان میں جرات اور ہمت نہیں تیسرا عنصر اس لیے چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے کہ ان میں کسی بات کو سمجھنے کی عقل ہی نہیں۔

اندرونی اصلاح کے بغیر بیرونی غلبہ حاصل نہیں ہوتا

ایک وقت تھا جب جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی ایک چھوٹی سی گمنام انجمن تھی۔ اس زمانہ میں اس پارٹی کے کئی اراکین کے نزدیک خارجی حکمت عملی محض ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ ان اراکین کی اس رائے کی وجہ یہ تھی کہ ہماری تحریک نے شروع سے خارجی حکمت عملی کے متعلق ایک اصول اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اصول نہایت ضروری ہے۔ اصول یہ ہے کہ کسی ملک کی خارجی حکمت عملی کو غیروں کی غلامی سے آزاد رکھنا کوئی ایسا انعام یا تحفہ نہیں جو آسمان سے ہم پر نازل ہو جائے۔ یا زمین کی کوئی حکومت ہمیں بخش دے۔ خارجی تعلقات میں مطلق العنانی خود اپنی اندرونی استعداد کو نشوونما دینے سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پہلے ہمیں وہ اسباب دور کرنے ہوں گے جو ہمارے تنزل کا باعث بنے۔ اسباب انحطاط دور کرنے کے بعد ہمیں ان لوگوں سے نجات حاصل کرنی ہو گی جو ہمارے زوال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جب یہ دونوں مرحلے طے ہو چکے ہوں گے تبھی ہم اس قابل ہوں گے کہ خارجی تعلقات میں خود مختاری حاصل کرنے کی خاطر جدوجہد کر سکیں۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اپنی نوزائیدہ تحریک کی ابتدا میں ہم خارجی تعلقات کو زیادہ اہمیت کیوں نہ دیتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہم اپنی توجہات داخلی اصلاح پر مرکوز رکھتے تھے۔

خارجہ پالیسی کچھ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے

رفتہ رفتہ جب ہماری چھوٹی سی اور حقیری سی انجمن وسعت حاصل کرتے کرتے اتنی پھیل گئی کہ شروع میں اس کی جو بنیادیں رکھی گئی تھیں ان میں بھی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ایک نوزائیدہ تنظیم ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر چکی۔ تو ہم نے پھر اپنا فرض سمجھا کہ خارجی حکمت عملی کے کچھ بنیادی اصول وضع کیے جائیں۔ ایک طرف تو یہ اصول ہمارے ضابطہ حیات کے مطابق ہونے لازمی تھے۔ دوسری طرف یہ ضروری تھا کہ یہ اصول ایسے ہوں جن پر خارجی تعلقات کی واقعی دنیا میں عمل بھی کیا جا

سکے۔

ہماری قوم کو خارجی تعلقات کے مسئلہ میں بالکل سیاسی تربیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کے مختلف شعبوں کے قائدین اور عوام کو وہ موٹے موٹے اصول سکھانے کی ضرورت ہے۔ جن پر ہماری خارجی حکمت عملی مبنی ہوگی۔ خارجی حکمت عملی کو کامیابی سے چلانے کے لیے یہ پہلا قدم تھا جسے پایہ تکمیل تک پہنچانا لازمی تھا اس کے بعد ہی وہ خارجی حکمت عملی اختیار کی جا سکتی تھی۔ جس سے قوم اپنے خارجی تعلقات خود طے کرنے کی آزادی حاصل کر لے۔ جب تک ہم اپنی خارجی حکمت عملی خود طے نہیں کرتے تب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جرمن سرکار مکمل طور پر آزاد ہے۔

خارجی حکمت عملی ایک وسیلہ ہے' کوئی مقصد نہیں

اس مسئلہ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ایک بنیادی اصول ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے۔ وہ اصول یہ ہے کہ خارجی حکمت عملی ایک ذریعہ ہے کوئی مقصد نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جرمن قوم کی بہتری کا اہتمام کیا جا سکے خارجی حکمت عملی کا ہر مسئلہ اسی زاویہ نگاہ سے اور صرف اسی زاویہ نگاہ سے طے ہونا چاہیے۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ فلاں حل اختیار کرنے سے ہماری قوم کو فائدہ پہنچے گا یا کیا یہ حل نقصان رساں ثابت ہوگا۔ بس سوال کا جواب تلاش کرنے کا بنیادی گر یہی ہے۔

اس مسئلہ کا حل تلاش کرتے وقت ہمیں فقط یہ اصول سامنے رکھنا چاہیے۔ جماعت کے اندرونی سیاسی تقاضے' مذہبی مفاد' بہبودی خلق کے اصول' یہ اور اس قسم کے دیگر عوامل قوم کو فائدہ پہنچانے کے لیے قربان کیے جا سکتے ہیں۔

خارجہ پالیسی قوم کی خاطر ہے قوم خارجہ پالیسی کی خاطر نہیں

جب جنگ نہ چھڑی تو جرمن خارجہ حکمت عملی کا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہماری قوم اور اس کے نونہالوں کو زندہ رکھنے کے لیے جو مادی سازوسامان درکار ہے۔ وہ کس طرح فراہم کیا جائے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ درکار ہوتا ہے اسے اختیار کیا

جاتا۔ان بین الاقوامی حلیفوں سے معاہدے کرنے چاہئیں تھے جو اس زاویہ نگاہ سے ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ایسے حلیف یہ غرض پورا کرنے میں ہماری امداد کرتے یا ہمارے ساتھ تعاون کرتے آج بھی نصب العین تو وہی ہے لیکن آج ہمیں ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا ہے جنگ سے پہلے سوال یہ تھا کہ جرمن قوم کو زندہ رکھا جائے جرمن قوم کو اس وقت تک جو مضبوط اور آزاد سرکار میسر تھی اور جو جرمن قوم کے تحفظ کی ضمانت تھی اسے بچایا جائے۔آج ہمارا مقصد یہ ہے کہ پہلے ایک آزاد اور مضبوط سرکار دوبارہ قائم کی جائے۔پھر ایسی سرکار کی مدد سے اپنی قوم کو دوبارہ طاقت ور بنایا جائے۔جب تک ایسی سرکار قائم نہیں ہو جاتی' تب تک کسی ایسی خارجہ حکمت عملی کے اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے ہماری قوم کا مستقبل محفوظ کیا جا سکے۔یا ان کی ضروریات زندگی انہیں بہم پہنچائی جا سکیں۔

بالفاظ دیگر آج جرمنی کی خارجہ حکمت عملی کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ کل اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس حاصل کی جا سکے۔

قوم آزاد ہو گی تو ملک بھی آزاد ہو جائے گا

اس ضمن میں ایک بنیادی اصول ایسا ہے جو ہمیں ہر وقت اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ وہ اصول یہ ہے کہ کسی قوم کی آزادی کے لیے لازم نہیں ہے کہ اس قوم کے ماتحت جتنا علاقہ تھا وہ سارا واپس حاصل کیا جا سکے۔اگر کم از کم رقبے پر بھی عوام اور سرکار کی آزادی کو بحال کیا جا سکے تو اس کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیے جو رقبہ حاصل ہے وہ کتنا تھوڑا ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ اپنے علاقہ کے اندر اس نئی سرکار کو پوری آزادی حاصل ہو تا کہ یہ سرکار ساری قوم کے جذبات کی ترجمان بن سکے۔نہ صرف اس سرکار کو قوم کے جذبات کا ترجمان بننا ہو گا بلکہ اسے اس عسکری جنگ کے لیے بھی تیاری کرنی ہو گی جس کے ذریعہ بالآخر تمام قوم کو آزادی نصیب ہو گی۔

اگر ایک قوم دس کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔اور یہ دس کروڑ کے دس کروڑ باشندگان

اس لیے غلامی کی زندگی قبول کر بیٹھے ہیں کہ جس سے رقبہ پر وہ آباد ہیں اور جس پر اب ایک سرکار کی حکمرانی ہے کہیں آزادی حاصل کرنے سے وہ رقبہ ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جائے۔تو ایسی قوم کی موجودہ صورت حال اس سے بدتر ہے کہ ان کی آبادی اور ان کی قوم تقسیم ہو جائے' لیکن کم از کم ان کے ایک حصے کو آزادی کامل نصیب ہو جائے ہاں شرط یہ ہے کہ جس حصے کو آزادی نصیب ہو اسے اپنے مقدس فرض کا احساس ہو۔ وہ مقدس فرض یہ ہے کہ نہ صرف یہ آزادی حاصل کرنے والا حصہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے اپنے ناقابل شکست روحانی اور تمدنی رشتوں کا اعلان کرتا رہے' بلکہ ہر ممکن اور ہر ضروری ذریعہ کو کام میں لاتے ہوئے اس عسکری جنگ کی تیاری بھی جاری رکھے جس کے ذریعہ بالآخر قوم کے مظلوم اور بچھڑے ہوئے بھائیوں کو آزاد کرایا جائے گا اور متحد کیا جائے گا۔

قوم کے مظلوم فرزند فقط نیک تمناؤں سے نہیں بچائے جا سکتے

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو اضلاع کبھی قومی سرکار کے ماتحت نسلی اور سیاسی لحاظ سے متحد تھے۔ ان کو اسی صورت میں دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب پہلے ایک شرط پوری ہو جائے۔ وہ شرط یہ ہے کہ پہلے مادر وطن کو آزادی اور سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ ایسی صورت حال میں جو اضلاع چھن چکے ہیں ان کے خصوصی مفاد کو دل پر پتھر رکھ کر ثانوی حیثیت دی جائے گی۔ ان کو ثانوی حیثیت دینے میں کسی جذباتی کمزوری کا اثر قبول نہ کیا جائے گا۔ پہلا کام یہ ہے کہ ملک کے مرکزی رقبے کو آزاد کرایا جائے۔ ایک قوم کے بچھڑے ہوئے اور مظلوم ٹکڑے یا کسی سابقہ عظیم الشان سلطنت کے منتشر اور پریشان اجزا خالی آرزوؤں' ارمانوں اور شکایتوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ مظلوم کی آہیں ظلم کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں۔ یہ کام تو تب ہو گا کہ قوم اور ملک کا جو حصہ کم و بیش خود مختار ہے وہ ان کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کر سکے۔ وہ کھوئے ہوئے علاقے جو کبھی ایک مشترکہ وطن میں شامل تھے۔

ظلم اور جبر کا مقابلہ صرف تلوار سے کیا جا سکتا ہے

لہذا جو علاقہ چھن چکا ہے اسے واپس لینے کی ایک صورت ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ پرانی سرکار کا جو حصہ تقسیم سے بچ گیا ہے اسے خوشحال اور طاقتور بنانے کے لیے پوری ہمت سے کام لیا جائے۔ عوام کے دلوں میں جو نا قابل فراموش آرزوئیں اور ارمان سوائے پڑے ہیں انہیں جگایا جائے۔ ان تمناؤں کو ہر روز نت نئ طاقتوں کے سہارے حاصل کرنے پر اکسایا جائے۔ ان سب کوششوں کا مقصد ایک ہو کہ جب ساری قوم کو آزاد اور متحد کرنے کا وقت آئے تو سب یک جان ہو کر اس مہم مین شریک ہوں غرض جو علاقے چھن گئے ہیں ان سب کے مفاد ایک بالاتر نصب العین کے ماتحت سمجھے چاہئیں۔ وہ نصب العین یہ ہے کہ جو مرکزی علاقہ بچ گیا ہے اس میں ایسی طاقت اور قوت پیدا کی جائے جو فتح یاب دشمن کے ارادے پر ایک دن غالب آ سکے۔ جس دن دشمن کے ارادے پر غالب آنے کی قوت فراہم ہو گی۔ تبھی قوم کو ظلم اور زیادتی سے نجات دلائی جا سکے گی۔ دردناک احتجاج اور "پرزور شکایتوں" سے وہ علاقے جرمن سلطنت کے ماتحت متحد نہیں کیے جا سکتے۔ جن پر آج ظلم ڈھائے جا رہے ہیں ظلم اور جبر کا مقابلہ صرف تلوار کی قوت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خارجی حکمت عملی صرف داخلی قوت فراہم کرنے کا موقعہ مہیا کر سکتی ہے

تلوار کی قوت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے؟ تلوار کی قوت پیدا کرنے کا کام فقط داخلی حکمت عملی سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس داخلی حکمت عملی سے تلوار کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے اس کو چلانا صرف ایک قومی حکومت کا حصہ ہے۔ جب داخلی حکمت عملی سے تلوار کی قوت بہم پہنچائی جا رہی ہو تو یہ فرض خارجی حکمت عملی پر عائد ہوتا ہے کہ داخلی حکمت عملی کے اس کام میں خلل پیدا نہ ہوا اور ہتھیار تیار کرنے اور ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے لیے سپاہ بھرتی کرنے کا کام بغیر کسی بیرونی مداخلت کے جاری

رہے۔

میں اس کتاب کی پلی جلد میں اس مسئلہ پر بحث کر چکا ہوں کہ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے بیرونی حلیفوں سے معاہدے کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ کیوں ناکافی تھی۔ جرمن قوم کو زندہ رہنے کے لیے سامان خورد و نوش کی ضرورت تھی۔ یہ سامان خورد و نوش چار طریقوں سے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ ان چار طریقوں میں سے چوتھا طریقہ سب سے زیادہ مشکل تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے یہ چوتھا طریقہ ہی اختیار کیا۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ یورپ میں جرمنی کے علاقہ کی توسیع کی جاتی۔ برعکس اس کے ہمارے قائدین نے نوآبادیاں فتح کرنے اور تجارت کی توسیع دینے کا راستہ اختیار کیا۔ یہ پالیسی اس وجہ سے اور بھی غلط تھی کہ اس کے چلانے والے اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ یہ راستہ اختیار کرنے سے جنگ سے بچ جائیں گے۔ جب کوئی شخص ایک سے زیادہ کرسیوں پر بیٹھنے کی بیک وقت کوشش کرتا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی ایک پر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر اسے فرش پر ہی تشریف رکھنی پڑتی ہے۔ جرمن سلطنت نے جو ناکام خارجہ حکمت عملی اختیار کی تھی اس کے لیے سخت سزا بھگتنی پڑی۔ سزا کی نوعتیں مختلف تھیں ان میں سے ایک نوعیت پہلی جنگ عظیم بھی تھی۔

قوم کی حریت اور استقلال تمدن اور ثقافت سے زیادہ ضروری ہیں

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مناسب ترین حل یہ تھا کہ تیسرا رشتہ اختیار کیا جاتا۔ تیسرا رشتہ ی تھا کہ براعظم یورپ میں جرمنی کے لیے مزید علاقہ حاصل کر کے جرمن سلطنت کو یورپ کی بڑی سرکار بنا دیا جاتا۔ جب یہ ہو جاتا تو پھر جرمنی کے اثر و رسوخ کی مزید توسیع کے لیے بیرونی نوآبادیات بھی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اس طریقہ سے نوآبادیات کا حصول بھی قابل عمل بن جاتا ہاں یہ درست ہے کہ یہ پالیسی اختیار کرنے کے لیے انگلستان کو حلیف بنانا ضروری تھا یا انگلستان کو حلیف نہ بنایا جا سکتا تھا تو پھر جنگی تیاریوں اور سامان حرب کے لیے اس وسیع پیمانے پر کوشش کرنی پڑتی کہ

چالیس یا پچاس سال کے لیے سوائے جنگ پر خرچ کرنے کے باقی تمام ثقافتی اور تمدنی سرگرمیاں پس پشت ڈالنی پڑتیں۔ اگر صورت حال یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی تو اس پر چلنا احاطہ امکان سے باہر نہ تھا۔ کسی قوم کی ثقافتی اور تمدنی حیثیت اس کی سیاسی حریت اور مطلق العنانیت پر مبنی ہے۔ بغیر سیاسی حریت کے تمدن اور ثقافت قائم نہیں رہ سکتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حریت کے بغیر تمدن اور ثقافت کسی عظیم پیمانہ پر پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ جب کسی قوم کی سیاسی حریت اور استقلال کے لیے جدوجہد کا مرحلہ درپیش ہو تو کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کے سالانہ میزانیہ آمدوخرچ سے جو رقمیں تمدنی اخراجات کی مد سے حذف کر کے سرکار کی غیر معمولی عسکری حاجات پر خرچ کرنی پڑیں' ان کی کمی میں بعد میں موزوں وقت آنے پر پوری کی جا سکتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جب کوئی سرکار اپنی آمدنی کے تمام وسائل سیاسی حریت اور استقلال کے حصول کے لیے وقف کرا دیتی ہے تو اس کے بعد ضرور ایک خوشحال اور فارغ البالی کا دور آتا ہے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قوم کی ثقافت اور تمدن کی روح جو کچھ عرصہ کے لیے دبی اور کچلی رہی۔ پھر موقع پانے پر پہلے سے زیادہ شان وشوکت کے ساتھ اپنے مظاہر پیش کرنے لگی۔ یونان نے ایران کے ساتھ طویل جنگ کے دوران جو مصائب برداشت کیے اس کے بعد پیری کلیز کا سنہری عہد شروع ہو گیا۔ رومتہ الکبریٰ کی پنچائتی سرکار نے جب کارتھیج کے ساتھ طویل جنگ کی مشکلات اور تکالیف سے نجات پائی تو پھر اس کی قوت ایک اعلیٰ ترین تمدن کے قیام پر صرف ہونے لگی۔

پارلیمنٹری نمائندے بزدل ہوتے ہیں

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کی اولوالعزمی کی حکمت عملی چلانے کے لیے جس ہمت کی ضرورت ہے وہ کسی احمق اور بزدل پالیمنٹری اکثریت کے نمائندوں میں نہیں پائی جا سکتی۔ ایسی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہو گا کہ قوم کی تمام سرگرمیاں صرف اس ایک کام پر مرکوز کر دی جائیں کہ مستقبل میں سرکار کے تحفظ کے لیے جو عسکری جنگ لڑنی ہے اس کی

تیاری کی جائے۔فریڈرک اعظم کے والد نے ایسی ہی جنگ لڑنے کی تیاری کرنے کے لیے عمر بھر قربانی کی۔لیکن ہماری اس احمقانہ پارلیمنٹری جمہوریت کے آباؤ اجداد جن پر یہودیت کا ٹھپہ لگا ہوا تھا بھلا ایسی قربانی کہاں دے سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جنگ عظیم سے پہلے یورپ میں مزید علاقہ حاصل کرنے کے لیے جرمنی کو جس جنگی تیاری کی ضرورت تھی۔اس کی طرف پوری توجہ نہ کی گئی تو قاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس حکمت عملی کی مناسبت سے جرمنی کو جس قسم کے بیرونی حلیفوں کی ضرورت تھی وہ بھی نہ مل سکے۔

دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے

جرمنی کی خارجہ حکمت عملی جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ سب باقاعدہ جنگ کے لیے تیاری کرنے سے گھبراتے تھے۔وہ ہر اس تجویز کو ٹھکرا دیتے تھے جس کا منشا یورپ میں مزید علاقہ حاصل کرنا ہو۔برعکس اس کے انہوں نے نوآبادیات کے حصول اور تجارت کی توسیع کی پالیسی کی ترجیح دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت انگلستان کا جرمنی کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کا جو امکان تھا وہ ضائع ہو گیا۔جب انگلستان سے معاہدہ نہ کیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ روس کو حلیف بنایا جاتا مگر یہ امکان بھی ضائع کر دیا گیا۔ آخر کار جرمنی کے اس وقت کے سربراہوں نے جرمنی کو جس منزل تک پہنچایا وہ یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور سوائے آسٹریا منحول ہیپز برگ کے شاہی خانوادہ کے جرمنی کا کوئی یارومددگار نہ تھا۔

خارجی پالیسی کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے

آج جرمنی کی حکمت عملی کی شان یہ ہے کہ اس کا کوئی معین یا قابل فہم نقشہ ہی نہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے تو غلطی یہ تھی کہ جیسا میں بیان کر چکا ہوں چوتھا راستہ اختیار کیا گیا۔ پھر یہ راستہ بھی نیم دلی سے اختیار کیا گیا۔انقلاب کے بعد مصیبت یہ ہے کہ خارجہ حکمت عملی میں سرے سے کوئی راستہ ہی اختیار نہ کیا گیا۔آج صورت حال اس سے بھی بدتر

ہے۔ جو جنگ سے پہلے تھی اب خارجہ حکمت عملی کا سرے سے کوئی منصوبہ ہی نہ تھا۔ اگر کوئی منصوبہ ہے تو یہ کہ قوم کے احیاء کا کوئی امکان باقی نہ چھوڑا جائے۔

آج یورپ میں مختلف سرکاروں کے ایک دوسرے سے تعلقات کا اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو ہم حسب ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

برطانیہ کی پالیسی ''قوت کا توازن'' برقرار رکھنا ہے

گزشتہ تین سو سال سے یورپ کی تاریخ ایک ہی زبردست قوت کے زیر اثر رہی ہے۔ وہ زبردست قوت انگلستان ہے۔ انگلستان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یورپ کی سرکاروں کو اس طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار رکھا جائے تاکہ فریقین میں ''قوت کا توازن'' برقرار رہے۔ اس قوت کے توازن کا مطلب یہ ہے کہ یورپ میں انگلستان کا عقب محفوظ رہے اور ادھر سے بے پرواہ ہو کر انگلستان دنیا پر اپنا تسلط جمانے کے منصوبے آسانی سے پورے کر سکے۔

ملکہ الزبتھ کے زمانہ سے برطانوی مدبرین کی سیاسی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ باقاعدہ طور پر کوشش کرتے ہوئے ہر حربے کے استعمال سے یورپ کی کسی سرکار کو اتنا طاقت ور نہ ہونے دیا جائے کہ وہ یورپ کی دوسری سرکاروں پر غالب آ کر انگلستان کی جانب متوجہ ہونے کی فرصت پا سکے۔ انگلستان ضرورت پیش آنے پر طاقت کا یہ توازن قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ عسکری مداخلت پر بھی آمادہ رہا ہے۔ انگلستان کی اس پالیسی کا یورپ میں اگر کوئی جواب ہے تو وہ پرشیا کی فوج کی روایات پیش کرتی ہے۔ انگلستان اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے قسماقسم کے راستے اختیار کرتا ہے۔ جیسی صورت حال دیکھی اور جیسا فوری ضروریات کا تقاضا محسوس کیا اس کے مطابق انگلستان اپنا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بہر حال راستے مختلف سہی انگلستان کی منزل ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ وہ منزل یہ تھی کہ یورپ میں اس کے ٹکے کا دوسرا کوئی حریف پنپنے نہ پائے۔ تاریخ میں ایسے دور بھی آئے کہ انگلستان کی پوزیشن خراب ہو گئی۔ لیکن جتنی انگلستان کی پوزیشن خراب ہوئی

اتنے ہی استقلال سے برطانیہ کی شاہی حکومت نے یورپ کی مختلف سرکاروں میں پھوٹ ڈال کر ان کو مفلوج کرنے کی کوشش کی۔ جب شمالی امریکہ میں برطانوی نوآبادیات نے انگلستان سے آزادی حاصل کر لی تو اس کے بعد انگلستان کے لیے یہ اور بھی ضروری ہو گیا کہ یورپ میں اپنا ایک بازو محفوظ رکھے۔ انگلستان کی پالیسی ایسی کا نتیجہ تھا کہ اسنے ہسپانیہ کو تباہ کر کے دم لیا۔ اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ہالینڈ کو ایک حقیر درجے کی بحری طاقت بنا دیا گیا۔ جب یہ کام ہو چکا تو انگلستان اپنی ساری طاقت فرانس کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے لیے صرف کرنی شروع کی۔ نپولین بوناپارٹ کا زوال انگلستان کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔ اس کے بعد فرانس کی عسکری برتری ختم ہو گئی۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن تھا جس سے انگلستان کو واسطہ پڑا۔

نئی پالیسی اختیار کرنے سے پہلے عوام کو ہمنوا بنانا پڑتا ہے

برطانوی مدبرین نے جرمنی کے متعلق اپنی روش بڑی آہستہ آہستہ تبدیل کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب تک جرمن ایک متحدہ قوم نہ بن جاتے ان سے انگلستان کو کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ فرانس کے ساتھ مقابلہ کے دوران انگلستان نے اپنی رائے عامہ کو جس طرح فرانس کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اس بغض' عداوت' منافرت کینہ اور عناد کا رخ آہستہ آہستہ ہی جرمنی کی طرف موڑا جا سکتا تھا۔ انگلستان کے مدبرین نے اپنی منزل تو معین کر لی تھی لیکن یہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے والے مدبرین ہمیشہ رائے عامہ کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ رائے عامہ سب سے بڑی متحرک قوت ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ ۔ اس لیے انگریزی مدبرین وقتی طور پر رائے عامہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ جب ایک مدبر اپنا ایک مقصد پورا کر لیتا ہے تو اس کی توجہ دوسرے مقاصد کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ لیکن عوام الناس کے جذبات کسی دوسرے رخ پر موڑنے کا کام بتدریج اور آہستہ آہستہ ہی انجام پا سکتا ہے۔ ی کام پراپیگنڈے سے انجام پا سکتا ہے۔ پھر جب رائے عامہ کا رخ

یوں موڑ لیا جاتا ہے تو جو ئی منزل معین کر سکتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے رائے عامہ کی طاقت استعمال کی جا سکتی ہے۔

۱۸۷۰۔۷۱ء میں ہی انگلستان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے جرمنی کے متعلق کیا روش اختیار کرنی ہوگی۔ یہ درست ہے کہ بعض موقع پر انگلستان کی اس طے شدہ پالیسی میں کچھ معمولی لغزشیں بھی ہوئیں۔ ان لغزشوں کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ دنیا کی تجارتی منڈیوں پر امریکہ کا رسوخ بڑھنے لگا۔ تو برطانیہ کو ادھر توجہ دینی پڑی یا اس کا سیاسی دائرہ تسلط وسیع ہوتا گیا۔ اس سے انگلستان کو تشویش لاحق ہوئی۔ بدقسمتی سے ان مواقع پر جرمنی نے انگلستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان کے مدبرین کی طے شدہ پالیسی مستقل ہوگئی۔

انگلستان دنیا پر تسلط رکھنا چاہتا ہے

اب انگلستان نے جرمنی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جرمنی انگلستان کی نگاہ میں ایک ایسی سلطنت تھی جس کی اہمیت سیاسی اور تجارتی لحاظ سے عالمگیر صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جرمنی میں غیر معمولی صنعتی ترقی ہو رہی تھی۔ اس ترقی نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ جرمنی اور انگلستان ایک ہی میدان میں مسابقت کی دوڑ یکساں جوش و خروش میں دوڑنے لگے۔ اس وقت جرمنی کی قسمت جن حکمرانوں کے قبضہ میں تھی ان کے نزدیک انسانی عقل کا نچوڑ یہ تھا کہ دنیا کو تجارت کے زور سے پر امن طور پر فتح کر لیا جائے یہی بات تھی کہ جو انگلستان کے مدبرین کو کھٹکتی تھی انگریز مدبرین نے جرمنی کی اس پالیسی کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقابلے کی صورت یہ تھی کہ با قاعدہ طور پر اور وسیع پیانے پر جرمنی کے راستہ میں متشددانہ رکاوٹیں حائل کی گئیں......
انگریز مدبرین کی بنیادی حکمت عملی یہ نہ تھی کہ ہر قیمت پر ضرور دنیا میں امن ہی قائم رکھنا ہے۔ انگریز مدبرین کی حکمت عملی تو یہ تھی کہ ہر قیمت پر ہر دنیا میں انگلستان کا غلبہ اور تسلط قائم رکھنا ہے اپنی اس حکمت عملی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر انگلستان نے ان ملکوں

سے حلیفانہ اتحاد قائم کیا جو ٹھوس عسکری طاقت کے مالک تھے۔ یہ اقدام بھی انگلستان کی روایتی حکمت عملی کے عین مطابق تھا۔ انگلستان کی روایتی حکمت عملی یہ ہے کہ مد مقابل کی قوت کا صحیح اور محتاط اندازہ لگایا جائے۔ پھر اپنی قوت میں جو ہنگامی کمزوری نظر آئے اس کا کھلے کھلے اقرار کرلیا جائے۔ اس حکمت عملی کے خلاف یہ کہنا بے اصولے پن پر مبنی ہے درست نہیں۔

دشمن کو ہر قیمت پر شکست دینی چاہیے

جب جنگ کے لیے آفاق گیر منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچانے ہوتے ہیں۔ وت ایسے موقعہ پر سوال حریف سے شجاعانہ اور فراخدلانہ سلوک کا نہیں ہوتا۔ بلکہ سوال تو یہ ہوتا ہے کہ مطلب کیونکر نکلتا ہے۔ اور مقصد کیسے حل ہوسکتا ہے۔ مدبرانہ حکمت عملی کا مقصد یہ نہیں کہ کوئی قوم شجاعانہ روایات کی لاج رکھتے ہوئے اپنی موت گوارہ کرلے۔ تدبر کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس قیمت پر بھی ہو اپنی جان بچاؤ۔ ہر وہ چال اور ہر وہ ہتھیار جائز ہے جس سے کام چل جائے۔ اور قوم بچائی جاسکے۔ اگر اس مقصد میں ناکامی ہو تو اسے اپنے فرض سے مجرمانہ غفلت قرار دیا جائے گا۔

جب جرمنی میں انقلاب برپا ہوگیا تو انگلستان کو جو یہ خطرہ لاحق تھا کہ دنیا پر جرمنی کا تسلط ہو جائے گا اس کا تسلی بخش تدارک ہوگیا۔

اس کے بعد اب انگلستان کے مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ جرمنی کو سرے سے یورپ کے جغرافیائی نقشہ سے ہی محو کر دیا جائے برعکس اس کے نومبر ۱۹۱۸ء میں جس طرح جرمنی دھڑام سے گر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی مدبرین ایک نئے مسئلہ سے دوچار ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ جرمنی کے غش کھا جانے سے جو سیاسی خلا پیدا ہوگیا ہے وہ کس طرح پر کیا جائے۔

ساڑھے چار سال تک برطانوی سلطنت یورپ میں جرمنی کے تسلط کو روکنے کے لیے لڑتی رہی۔ یکلخت صورت حال میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی کہ جرمنی یورپ کی صف

اول کی سرکاروں سے خارج ہو گیا۔ جرمنی کا زوال اس حد تک پہنچ گیا کہ قوم میں اپنا وجود برقرار رکھنے کی آرزو بھی باقی نہ رہی۔ غرض اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر یورپ کا سیاسی توازن بگڑ گیا۔ جرمنی ختم ہو گیا۔ فرانس یورپ کی عظیم ترین سرکار بن گیا۔

انگلستان کو فرانس کا عروج پسند نہیں

جنگ کے دوران میں انگریز عوام آخر دم تک لڑائی پر آمادہ رکھنے کے لیے جو زبردست پراپیگنڈہ کیا گیا تھا اس نے عوام کے حیوانی جذبات اور تعصب کو جرمنی کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ انگریز عوام میں جرمنی کے خلاف ایسا تعصب پیدا ہو چکا تھا کہ جس نے اب برطانوی مدبرین کے ہاتھ گویا زنجیروں سے جکڑ دیے تھے۔ جرمنی اب ہر لحاظ سے تباہ ہو چکا تھا۔ جرمنی کی نو آبادیات ختم ہو گئیں۔ جرمنی کا اقتصادی نظام ختم ہو گیا۔ جرمنی کی تجارت ختم ہو گی۔ انگلستان نے جن اغراض کے پیش نظر جنگ شروع کی تھی۔ وہ سب پوری ہو گئیں۔ اب ان اغراض سے آگے بڑھنا خود انگلستان کے مفاد کے خلاف تھا جرمنی کی مزید تباہی خود انگلستان کے لیے مفید نہیں۔ یہ خواہش تو انگلستان کے دشمنوں کی ہی ہو سکتی ہے۔ کہ جرمنی یورپ کے صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ ہاں نومبر ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کے موسم گرما تک انگلستان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے مدبرین کی پالیسی کو یکلخت بدل ڈالتا۔ جنگ کی طویل معیاد میں خود انگلستان نے عوام کے جذبات کو یوں بھڑکا دیا تھا کہ اب ان جذبات سے انحراف کرنا ممکن نہ تھا۔ انگلستان کے عوام جرمنی کے دشمن بن چکے تھے۔ اس لیے انگلستان جرمنی کے متعلق اپنی خارجہ حکمت عملی فوراً نہ بدل سکتا تھا۔ انگلستان کے لیے اپنی خارجہ حکمت عملی فوراً بدل ڈالنا اس لیے بھی دشوار تھا کہ فرانس کی عسکری قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ صلح ناموں کی شرائط کے لیے گفت و شنید فرانس اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ فرانس اس وقت ایسا طاقت ور تھا کہ اپنی من مانی شرائط یورپ کی دوسری حکومتوں سے منوانے کے لیے اپنی طاقت سے مجبور کر سکتا تھا۔ صلح نامے کی شرائط کے متعلق کئی مہینے گفت و شنید جاری رہی جب لین دین کا یہ سودا ہو رہا تھا

تو اس وقت فرانس کے منشا کو پورا ہونے سے روکنے کے لیے جس فوجی طاقت کی ضرورت تھی۔ اس کی کمی فقط جرمنی ہی پوری کر سکتا تھا۔ حالات جو صورت اختیار کر چکے تھے اس کا رخ پھیرنے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی۔ یہ طاقت جرمنی کی امداد کے بغیر اکیلا انگلستان فراہم نہ کر سکتا تھا۔ جرمنی کا یہ حال تھا کہ اس کے اندر خانہ جنگی کے باعث پھوٹ پڑ چکی تھی۔ جرمنی کے نام نہاد مدبرین پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ جرمنی پر جو شرائط بھی عائد کی جائیں وہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

اقوام ملل کے باہمی تعلقات کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم آپ اپنی حفاظت کرنے کے جذبے سے محروم ہو جائے اور جو دوسری قومیں اس کی تکا بوٹی کرنا چاہیں' ان کا مقابلہ نہ کر سکے تو ایسی قوم غلام بن جاتی ہے۔ اور اس کا ملک دوسری اقوام کی نو آبادی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انگلستان کا ان حالات میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرانس بہت ہی بڑی طاقت نہ بن جائے۔ جب اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جرمنی فرانس کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاری نظر آیا تو انگریزوں کے لیے صرف یہ چارہ کار باقی رہ گیا کہ صلح کی گفت و شنید میں خود بھی فرانس کے ساتھ جرمنی کے حصے بخرے کرنے میں شامل ہو جائیں۔

پہلی جنگ عظیم میں انگلستان کے مقاصد پورے ہوئے تھے

سچ تو یہ ہے کہ انگلستان جس مقصد کے لیے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ مقصد پورا نہ ہوا کہ یورپ کی کوئی ایک سلطنت دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور بن کر قوت کے توازن کو درہم برہم نہ کر سکے۔ فرانس نے یورپ کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ قوت حاصل کر لی اور فرانس کی یہ قوت بھی مستحکم ہو گئی۔

۱۹۱۸ء میں جرمنی کی عسکری قوت کا اندازہ لگانا ہو تو صورت حال یہ تھی کہ جرمنی دوسرے اور ملکوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک ملک یعنی فرانس کی

عسکری قوت جرمنی کے مساوی تھی۔ دوسرے ملک یعنی روس کے عسکری وسائل جرمنی سے زیادہ تھے۔ان دونوں کے علاوہ خود انگلستان کی بحری قوت جرمنی سے بدرجہا زیادہ تھی۔فرانس اور روس دونوں جرمنی کے مخالف تھے۔اور جرمنی کے عظیم طاقت بننے میں حائل تھے۔جرمنی سلطنت کا جغرافیائی محل وقوع جرمنی کی عسکری قوت کو کمزور بنا رہا تھا۔ جرمی کی یہ کمزوری اس امر کی ضمانت تھی کہ جرمنی کی قوت ایک حد سے آگے بڑھ سکے گی۔ جرمنی کا بحری ساحل یوں واقع تھا کہ بحری جنگ کے زاویہ نگاہ سے جرمنی کا مقابلہ انگلستان سے ہو جائے تو جرمنی انگلستان پر غالب نہ آ سکتا تھا۔جرمنی کا بحری بیڑا بڑ رنگ ارر کا ہوا تھا۔برعکس اس کے جرمنی کا بری محاذ بہت کھلا ہوا اور غیر محفوظ تھا۔

اس کے مقابلے میں آج فرانس کی حیثیت انگلستان کے مقابلے میں دیکھیے تو اور ہی نقشہ دکھائی دیتا ہے۔فرانس آج درجہ اول کی عسکری قوت ہے۔براعظم یورپ میں آج فرانس کا کوئی حریف موجود نہیں۔فرانس کی جنوبی سرحدیں ہسپانیہ اور اطالیہ کے مقابلہ میں جغرافیائی رکاوٹوں کے باعث محفوظ ہیں۔جرمنی سے فرانس کو اس لیے کوئی خطرہ نہیں کہ جرمنی کا اپنا برا حال ہو رہا ہے (فرانس کا ساحل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ برطانوی سلطنت کی رگ و جان کو ایک سے زیادہ مقام پر دبا سکتا ہے۔ نہ صرف فرانس کے طیارے اور دور مار کرنے والی توپیں خود انگلستان پر حملہ کرسکتی ہیں' بلکہ فرانس کی آبدوز کشتیاں اس کی بحری تجارتی شاہراہوں کی ناکہ بندی بھی بخوبی کرسکتی ہیں۔فرانس کا وہ ساحل جو بحر اوقیانوس کی جانب واقع ہے خاص وسیع ہے۔دوسری طرف بحیرہ روم میں فرانس کا یورپی ساحل اور شمالی افریقہ سے ساحل کا وہ حصہ جو فرانس کے قبضہ میں ہے خاصہ وسیع ہے۔اگر اس طویل ساحل کو کام میں لاتے ہوئے بحر اوقیانوس اور بحیرہ روم میں دونوں جانب سے بحری آبدوزوں کے ذریعے انگلستان کی ناکہ بندی کر دی جائے تو انگلستان کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے گی۔

یوں پہلی جنگ عظیم میں انگلستان کا مقصد تو یہ تھا کہ جرمنی کی طاقت کو روکا جائے۔

لیکن اگر اس جنگ کے سیاسی نتائج پر غور کیا جائے تو نظر یہ آتا تھا کہ فرانس کی قوت یورپ کے براعظم پر مسلط ہوگئی۔ عسکری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانس یورپ میں درجہ اول کی عسکری طاقت بن گیا ہے۔ اور اس کی عسکری قوت چاروں جانب سے محفوظ ہوگئی ہے۔ بحری قوت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو امریکہ اب برطانیہ کی مساوی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ جنگ کا اقتصادی نتیجہ یہ نکلا کہ کئی بڑے بڑے علاقے جہاں برطانیہ کو برتری کے ترجیحی حقوق حاصل تھے۔ اب برطانیہ کے جنگی حلیفوں اور ساتھیوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں

برطانیہ اپنے ہمسایوں کو ایک دوسرے سے لڑائے رکھتا ہے

برطانیہ کی روایتی حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ یورپ ایک خاص حد تک چھوٹی چھوٹی طاقتوں میں بٹ جاتا۔ اور یہ سب ایک دوسری سے برسر پیکار رہتیں۔ فرانس کی خواہش بھی یہ تھی کہ جرمنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے جو ایکدوسرے سے دست و گریبان رہیں۔

انگلستان کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے اور ہمیشہ یہی خواہش رہے گی کہ یورپ کی کوئی سرکار اتنی ترقی نہ کر جائے کہ دنیا کی زبردست سلطنت بن جائے یہی وجہ ہے کہ انگلستان یورپ کی مختلف سرکاروں کے مابین قوت کا توازن برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یورپ میں طاقت کا یہ توازن برقرار رکھے بغیر انگلستان دنیا پر اپنا تسلط جاری نہیں رکھ سکتا۔

فرانس کی خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے اور رہے گی کہ جرمنی کو زبردست طاقت نہ بننے دیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ فرانس جرمنی کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دینا چاہتا ہے۔ جو ایک دوسری سے لڑتی رہیں اور یوں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکے۔ جب یہ نقشہ قائم ہو جائے تو فرانس دریائے رائن کے کنارے پر قبضہ کر لے گا۔ دریائے رائن کے بائیں کنارے پر فرانس کا قبضہ ہوگیا تو وہ پہلی شرط پوری ہو جائے گی جس کے بغیر یورپ

پر فرانس کا تسلط محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مذکورہ بالا تجزیہ کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ برطانوی مدبرین اور فرانسیسی مدبرین کی پالیسی کی آخری منزل ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے گی۔

برطانیہ جرمنی کا حلیف بن سکتا ہے

جرمنی کے بیرونی تعلقات کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مندرجہ بالا امور کو نگاہ میں رکھنا نہایت ضروری تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے جو شخص اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ کون سی حکومتیں جرمنی کی حلیف بن سکتی ہیں وہ ضرور اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ سوائے انگلستان سے دوستی قائم رکھنے کے جرمنی کا حلیف تلاش کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ جنگ کے ایام میں انگلستان نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ جرمن کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ یہ پالیسی آج بھی جرمنی کے لیے مضر ثابت ہو رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کر سکتے کہ بحالات موجودہ انگلستان کے مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ جرمنی کو تباہ کر دیا جائے۔ برعکس اس کے برطانوی مدبری جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس امر پر مجبور ہوں گے کہ فرانس کی بڑھتی ہوئی حرص اقتدار کا مقابلہ کریں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی ملک کے لیے حلیف تلاش کرنے نکلیں تو گزرے ہوئے زمانے کی دشمنیاں اور شکایتیں ذہن میں رکھنے سے کام نہیں چلتا۔ ہاں ماضی کے تجربے سے جو سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کو ذہن میں رکھا جائے تو اس سے حلیف تلاش کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ تجربہ نے ہمیں سکھایا ہے کہ جو اتحاد محض کسی ملک کی دشمنی یا نفرت پر مبنی ہو اس میں ہمیشہ ایک کمزوری مضمر ہوتی ہے۔ قوموں کی قسمتیں تب ہی باہم متحد رکھی جا سکتی ہیں جب اتحاد کرنے والوں کے لیے اکٹھے ملک کر کسی مثبت منصوبہ میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوں۔ دو ملکوں کا حلیف بننا تب ہی بارآور ہو سکتا ہے کہ جب دونوں کے لیے ایک دوسرے کی مدد سے فائدے اور فتوحات حاصل کرنے کا امکان ہو۔ مختصر یہ کہ حلیف اس قوم اور ملک کو بنانا چاہیے جس

کے ساتھ مل کر دونوں حلیفوں کے اقتدار میں توسیع ہو سکے۔

بین الاقوامی تعلقات جذبات پر نہیں مفاد پر مبنی ہوتے ہیں

ہماری قوم خارجی حکمت عملی کے مسائل سے بالکل نابلد ہے۔ اس کا ثبوت ہارے روزنامہ اخبارات کی وہ خبریں ہیں جن میں یہ چرچے ہوتے ہیں کہ کسی غیر ملک کا فلاں مدبر جرمنی کا دوست اور خیر خواہ ہے اس دوستی اور خیر خواہی کو اس امر کی ضمانت سمجھا جاتا ہے کہ اس ملک کی حکمت عملی ضرور جرمن قوم کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ یہ سراسر نادانی اور سادہ لوحی کی باتیں ہیں بلکہ یہ سادہ لوحی حماقت کے درجے کو پہنچتی ہے۔ ایسی بے پر کی اڑانی صرف اس لیے چل جاتی ہے کہ ایک عام جرمن جب سیاسیات کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو وہ نرا کورا ہوتا ہے۔ برطانیہ امریکہ اور اطالیہ میں ایسا کوئی سیاسی تدبر نہیں جسے جرمنی کا حامی سمجھا جائے۔ ہر انگریز طبعی طور پر سب سے پہلے انگریز ہوگا۔ علی ہذا القیاس ہر امریکی سب سے پہلے طبعاً امریکی ہوگا۔ وہ کون سا اطالوی مدبر ہوگا جس کی پالیسی اطالوی مفاد کو سب سے زیادہ مقدم نہ رکھے گی۔ لہٰذا جو شخص غیر اقوام کے ساتھ اس شرط پر حلیفانہ معاہدے کرنا چاہتا ہے کہ ان ممالک کے مدبرین، حامیان جرمنی ہوں تو وہ شخص یا تو گدھا ہے اور یا وہ قوم کو دھوکا دیتا ہے۔ قومیں اس لیے اتحاد نہیں کیا کرتیں کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی یا احترام کے جذبات روکنے مشکل ہوتے ہیں۔ قومیں تو اس لیے ایک دوسرے کی حلیف بنتی ہیں کہ اتحاد سے فائدے حاصل کر سکیں۔ یہ درست ہے کہ ایک انگریز مدبر ہمیشہ برطانوی مفاد کا خیر خواہ ہوگا۔ اور کبھی جرمن مفاد کا محافظ نہ ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ انگلستان کے بعض مفاد شاید کے جرمنی کے بعض مفادات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ مفاد کی یہ مطابقت ہمیشہ جزوی ہوتی ہے کبھی کلی نہیں ہوتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج جن دو ملکوں کے مفادات باہم مطابقت رکھتے ہیں۔ کل متصادم ہو جائیں سیاسی مدبرین کا کام فقط یہ ہے کہ خاص اوقات میں جب دو اقوام کے مخصوص مفاد مطابقت رکھتے ہوں اور ان دونوں قوموں

کے حلیف بن جانے سے ان کے مشترکہ مفاد کی متفقہ نگہداشت ممکن ہو تو ایک دوسرے کے تعاون سے فائدہ اٹھایا جائے۔

فرانس جرمنی کا جانی دشمن ہے

مذکورہ بالا اصولوں کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے سے پہلے حسب ذیل سوالات کے جوابات تلاش کرنا ضروری ہے۔ آج کون سی حکومتیں اس مسئلہ سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں کہ وسطی یورپ سے جرمنی کا وجود مٹا دیا گیا تو فرانس کی اقتصادی اور عسکری قوت اس حد تک مستحکم ہو جائے گی کہ پھر کسی کے لیے اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔ ایسی کون سی حکومتیں ہیں جو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اور اپنی خارجہ حکمت عملی کے روایتی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے وسط یورپ میں فرانس کا اقتصادی اور عسکری تسلط اپنے مستقبل کے لیے ایک خطرہ سمجھتی ہیں؟

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں ایک مسلمہ حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ فرانس جرمنی کا جانی دشمن ہے اور ہمیشہ دشمن رہے گا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ فرانس میں کون سی حکومتیں قائم رہ چکی ہیں یا قائم ہوں گی چاہے فرانس میں بوربون کا شاہی خانوادہ حکمران ہو۔ چاہے انتہا پسند انقلابیوں کا دور دورہ ہو چاہے نپولین ہو' چاہے کھاتے پیتے طبقات کا نظام جمہوریت برسر اقتدار ہو چاہے کیتھولک مذہب پر عقیدہ رکھنے والی پنچایتی سرکار کے حامی حکمران ہوں اور چاہے کمیونسٹ بالشویک حاکم ہوں فرانس کی خارجہ حکمت عملی کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوگا کہ فرانس کی سرحدیں دریائے رائن تک وسیع کر دی جائیں۔ دریا کے اس کنارے پر فرانس کا تسلط مستحکم رکھنے کے لیے جرمنی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔

انگلستان فرانس کا عسکری غلبہ بھی ناپسند کرتا ہے

انگلستان یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی دنیا کی زبردست قوت بن جائے۔ فرانس یہ چاہتا ہے کہ جرمنی نام کی کوئی حکومت ہی باقی نہ رہے۔ ان دونوں خواہشات کا فرق ظاہر

ہے۔ آج جرمنی اس کے لیے جدوجہد میں مصروف نہیں کہ دنیا کی ایک بڑی زبردست حکومت کے طور پر اپنی حیثیت محفوظ رکھے۔ آج تو ہماری جدوجہد یہاں تک محدود ہے کہ ہمارے **ملک** کا وجود بچ جائے ہماری قوم ٹکرے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ جرمنی کے فرزند بھوکے نہ مریں جائیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھا جائے تو آج یورپ میں صرف دو حکومتیں ایسی ہیں جو جرمنی کی حلیف بن سکتی ہیں۔ ایک انگلستان اور دوسرا اطالیہ۔

انگلستان یہ دیکھ کر خوش نہیں کہ یورپ کے اندر فرانس کی عسکری قوت اب بے لگام ہو چکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک روز فرانس کوئی پالیسی اختیار کر لے جو کسی نہ کسی پہلو سے برطانوی مفاد کے منافی ہو۔ انگلستان یہ دیکھ کر کیسے خوش ہو سکتا ہے کہ مغربی یورپ میں لوہے اور کوئلے کی بہت بڑی کانوں پر فرانس کا قبضہ ہو جائے۔ ان کانوں پر قبضہ کرنے کے بعد ایک روز فرانس عالمگیر تجارت میں ایسا دخیل ہو سکتا ہے۔ جس سے برطانوی مفاد کو زک پہنچے۔ انگلستان یہ دیکھ کر کبھی خوش نہیں کہ یورپ کی باقی حکومتوں کے حصے بخرے ہو جانے سے آج فرانس کو یورپ میں یہ سیاسی مقام حاصل ہو چکا ہے کہ وہ چاہے تو عالم گیر تسلط حاصل کرنے کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔ نہ صرف فرانس عالم گیر تحفظ کے لیے کوشش کر سکتا ہے بلکہ یورپ میں فرانس کا غلبہ فرانس کو مجبور کر دے گا کہ وہ عالمگیر مسائل میں دخل دے۔ کبھی زیپلن کے جرمن طیاروں نے انگلستان پر جو بم برسائے تھے ان کے مقابلہ میں اب فرانس کے طیارے انگلستان پر ہزار گنا بم برسا سکتے ہیں۔ آج فرانس کا عسکری غلبہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے سینے میں ایک ڈراؤنے خواب کے بوجھ کی طرح مسلط ہے۔

اطالیہ بھی فرانس کو یورپ میں غالب نہیں دیکھنا چاہتا

اطالیہ بھی یہ نہیں چاہتا نہ چاہے گا کہ یورپ میں فرانس کی قوت مزید بڑھ جائے۔ اطالیہ کا مستقبل ان واقعات سے ہے جو بحیرہ روم میں پیش آئیں گے یا جن کا اثر بحیرہ روم کے گردوپیش کے ملکوں کے سیاسی کوائف کی صورت میں رونما ہو چکا ہے۔ اطالیہ

جنگ میں اس لیے شامل نہ ہوا تھا کہ بحیرہ ادریاٹک میں آسٹریا کو جو تسلط حاصل ہوا تھا اور جس کے باعث اطالیہ کو آسٹریا سے سخت دشمنی تھی اس کا تدارک کیا جا سکے' فرانس کی یورپ میں طاقت کو مزید غلبہ حاصل ہوا تو اس سے اطالیہ کی آئندہ ترقی پر برا اثر پڑے گا۔ اطالیہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتا کہ فرانس اور اطالوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نسل سے تعلق رکھنا قومی رقابتوں کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

سنجیدگی اور غیر جانب داری سے غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ برطانیہ اور اطالیہ کی سرکاروں کے قومی مفاد آج نہ صرف جرمن قوم کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ان سے متصادم نہیں بلکہ ان سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔

لیکن جب حلیفانہ معاہدوں کے امکانات پر غور کرنے بیٹھیں تو ہمیں تین نکات ہمیش مدنظر رکھنے چاہئیں پہلے نکتے کا تعلق خود جرمنی سے ہے۔ دوسرے دونوں نکات انگلستان اور اطالیہ سے متعلق ہیں۔

جسے جو اپنی پرواہ نہ ہو کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی

جرمنی میں آج کل جو حکومت قائم ہے کیا اس کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی دوسری حکومت اس سے حلیفانہ معاہدہ کر سکتی ہے۔ جب کوئی حکومت کسی دوسری حکومت سے حلیفانہ معاہدہ کرتی ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاہدہ کرنے والی حکومت کو اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں اس حکومت سے مدد ملے گی جس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہے۔ جو حکومت سالہا سال سے نااہلی اور بزدلانہ صلح پسندی سے اندھی ہو کر خود اپنی قوم کے مفاد سے غداری کا ارتکاب کر رہی ہو بھلا ایسی حکومت سے کوئی جارحانہ رزائم رکھنے والی حکومت کیوں معاہدہ کرنے لگی۔ ایسے ناکارہ ملک اور ناحق شناس ملت کے اعمال تو گویا چیخ چیخ کر عذاب الٰہی کے نزول کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں پہلی جنگ عظیم سے قبل جرمنی نے جو اتحاد ثلاثہ قائم کر رکھا تھا اس کا مقصد تو فقط یہ تھا کہ جو حالات پیدا ہو چکے

ہیں انہیں اعلیٰ درجہ برقرار رکھا جائے تا کہ اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کو موت کی گہری نیند سلا دے۔ یہ ایک کہنہ اور تباہ کن حلیفانہ معاہدہ تھا۔ دنیا کی ہر حکومت اس طرح اپنی موت مرنے کے لیے معاہدہ نہ کرنا چاہے وہ بھلا کسی ایسی سرکار سے زندگی اور موت کا ناطہ کیوں قائم کرے جس ک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے خارجہ تعلقات میں غیر حکومتوں کی کاسہ لیسی کرتی ہے اور جس کی داخلہ پالیسی یہ ہے کہ قومی جذبات کو بری طرح اور رسوا کن انداز سے کچلا جائے۔ کوئی ترقی پذیر سلطنت کسی ایسی سرکار سے کیوں معاہدہ کرے جس میں رتی بھر عظمت کی نشانی نہیں اور جس کی حکمت عملی کا کوئی پہلو شاندار نتائج پیدا کرنے کا مستحق نہیں۔ کیا یہ حلیفانہ معاہدے ایسی حکومتوں کے لیے کیے جائیں جن پر وہ لوگ حکمران ہیں جن سے ان کی اپنی قوم کے افراد متنفر ہیں اور اس وجہ سے بیرونی ملکوں میں کوئی ان کی عزت نہیں کرتا۔

قادر مطلق بھی بزدلوں کا دوست نہیں

ہرگز نہیں کہ جس حکومت میں عزت نفس کا احساس زندہ ہے اور جو محض اس لیے حلیفانہ معاہدے نہیں کرتی کہ اپنے حریص پارلیمنٹری نمائندوں کو سفارتی نوکریاں مہیا کرے، وہ موجودہ جرمنی سے نہ کوئی حلیفانہ معاہدہ کرے گی اور نہ کر سکتی ہے۔ بحالات موجودہ جرمنی کسی بیرونی حکومت سے صحیح معنوں میں حلیفانہ معاہدہ نہیں کر سکتا۔ جب کوئی دوسری حکومت جرمنی کی سچی دوست نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام دشمن ہمارا گھر لوٹنے کے لیے اکٹھے ہو بیٹھتے ہیں۔ جرمنی خود اپنی حفاظت کے لیے سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ ہماری منتخب شدہ پارلیمنٹ کھوکھلے احتجاج کرتی رہے۔ ان حالات میں باقی کی دنیا کو کیا پڑی ہے کہ وہ جرمنی کی حفاظت کے لیے لڑتے پھریں۔ قادر مطلق بھی بزدلوں کی کسی قوم کو آزادی نہیں بخشتا۔ ہماری نام نہاد "قوم پرست" انجمنیں شاید سمجھتی ہیں کہ قادر مطلق کو کسی بزدل قوم کو آزادی بخشنے پر مائل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ اندریں حالات جو حکومتیں جرمنی کو برباد کرنے کی خواہاں

نہیں' ان کے لیے بھی سوائے اس کے کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ فرانس کے ساتھ مل کر جرمنی میں لوٹ مار کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس ساری لوٹ مار کا فائدہ فرانس کو پہنچ جانے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔

کل کا دشمن آج کا دوست بھی بن سکتا ہے

دوسری بات جو ہمیں نہیں بھولنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جو قومیں ماضی قریب میں ہمارے ساتھ دشمن کی حیثیت سے لڑ چکی ہیں۔ وہاں عوام میں جرمنی کے خلاف پروپیگنڈہ اس زور و شور اور تسلسل سے ہوتا رہا ہے کہ ان ملکوں کے باشندوں کا بہت بڑا حصہ مستقل طور پر جرمنی کا مخالف بن گیا ہے۔ جب عرصہ دراز سے عوام کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک قوم چنگیز صفت قزاق طبع اور بربادی اور ہلاکت کی علم بردار ہے تو پھر یکلخت عام خلقت کے دلوں سے یہ میل کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ کل جو ہمارے دشمن تھے آج انہیں فی الفور حلیف نہیں بنایا جا سکتا۔

تیسری بات سب سے زیادہ قابل توجہ ہے کہ اگر ہمیں مستقبل میں یورپ کے اندر حلیفانہ معاہدے کرنے ہیں تو یہ تیسری بات انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔

سیاسی زاویہ نگاہ سے برطانیہ کا مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ جرمنی کو مزید برباد ہونے دیا جائے۔ ہاں بین الاقوامی سرمایہ کے جس لین دین پر یہودیوں کا قبضہ ہے اس کے مفاد کا تقاضا یہ ضرور ہے کہ جرمنی میں مزید تباہی مچائے۔

یہودی بدترین دشمن ہیں

برطانیہ کی سرکار یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ روایتی خارجہ حکمت عملی اور سرمایہ کے جس لین دین پر یہودی کا تسلط ہے اس کے تقاضوں میں ایک باہمی تصادم پیدا ہو چکا ہے یہ تصادم زندگی کے اور کئی پہلوؤں پر بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر وہ مسائل ہیں جو برطانوی خارجہ حکمت عملی کو درپیش آ رہے ہیں۔ برطانوی سرکار کے مفاد اور اس کی خوشحالی کے تقاضا کے برعکس یہودی سرمایہ دار یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ

ہنہ صرف جرمنی کو اقتصادی لحاظ سے بالکل تباہ کر دیا جائے بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی پورا غلام بنالیا جائے ۔ جرمنی کو اقتصادی نظام کو مکمل طور پر بین الاقوامی اثر کے ماتحت تب ہی لایا جا سکتا ہے کہ جب جرمنی میں بالشوزم کا اقتدار قائم ہو جائے ۔ جرمنی کے اقتصادی نظام کو مکمل طور پر بین الاقوامی اثرات کے ماتحت لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ جرمنی میں جو اجناس پیدا ہوتی ہیں اور صنعتی سامان بنایا جاتا ہے اس پر بین الاقوامی یہودی سرمایہ داروں کا تسلط ہو جائے ۔ مارکس ازم کے لشکروں کی قیادت بین الاقوامی یہودی اور بین الاقوامی سٹہ بازی چلانے والے سرمائے کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ دونوں طاقتیں مل کر بھی جرمنی کی قومی مدافعت کو اس وقت تک ختم نہیں کر سکتیں جب تک کہ انہیں فرانسیسی افواج مرمنی رپ حملہ کر کے جرمن سلطنت کے علاقہ پر قبضہ کر لیں ۔ یہ قبضہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ جرمنی کا قومی جذبہ فنا ہو جائے اور بین الاقوامی انتشار پسند طاقتیں یہاں مسلط ہو جائیں ۔ جب یہ ہو چکے تو پھر بین الاقوامی یہودی سرمایہ داری نے بالشویک فدائیوں کی جو فوجیں تیار کر رکھی ہیں وہ باہ آسانی جرمنی پر اقتدار حاصل کر لیں گی ۔

یہودی تسخیر عالم کا خواہش مند ہے

یہی وجہ ہے کہ بحالات موجودہ جرمنی کی تباہی کے سب سے بڑے محرک یہودی شورش پسند ہیں ۔ دنیا کے کسی حصے میں جرمنی کے خلاف انگیخت کرنے والوں کی خبریں پڑھی جائیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر جگہ یہودی فتنہ انگیزی کر رہے ہیں ۔ صلح کا زمانہ ہو یا جنگ کا وقت یہودیوں اور مارکس ازم کے حامیوں کی ملی بھگت سے چلنے والی سٹہ بازی نے سرمایہ فراہم کر کے جو اخبارات چلا رکھے ہیں وہ باقاعدہ جرمنی کے خلاف نفرت پھیلاتے رہتے ہیں ۔ یہ اسی منافرت انگیزی کی مہم کا نتیجہ ہیں کہ جنگ کے دوران یکے بعد دیگرے ایک ایک حکومت نے غیر جانبداری ترک کر دی اور سب جرمنی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد میں شامل ہو گئیں ۔ اس اتحاد میں شریک ہونے والی بعض حکومتوں کا

یہ اقدام خود ان کی قوم کے مفاد کے خلاف تھا۔ باوجود اس کے وہ جرمنی کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئیں۔

غرضی یہودی جس طرح سوچتے ہیں ان کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے جرمنی کو بالشوزم کے ماتحت لانے کے لیے ضروری ہے کہ محبِّ قوم اور محبِّ وطن جرمن دانشور طبقات کو ختم کر دیا جائے۔ یہ دانشور طبقات ختم ہو گئے تو پھر جرمنی کے مزدوروں کو بین الاقوامی یہودی سرمایہ کی فوج میں بھرتی کرلینا آسان ہو جائے گا یہودیوں کے اقتدار کو توسیع دینے کے لیے تحریک کا یہ پہلا قدم ہے۔ اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا کو صیہونی اقتدار کے ماتحت لایا جائے۔ تاریخ میں پہلے کئی بار ایسا ہو چکا ہے اور آج بھی جرمنی اس خوفناک جدوجہد کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اگر جرمن قوم اور جرمن سرکار ان ظالموں کے تسلط میں آ جاتی ہے جو ہمیشہ سے دنیا کی قوموں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ جو خون کے پیاسے اور روپے کے لالچی ہیں تو پھر اس کے بعد تمام دنیا اس عفریت کا شکار ہو جائے گی۔ اگر جرمنی اس عفریت کے پنجے سے بچ جاتا ہے تو دنیا کی قوموں کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا۔

یہودی بڑا موقعہ شناس ہے

یقین سے کہا جا سکتا ہے ک یہودی اپنی تمام تر سازشی سرگرمیاں بروئے کار لاتے ہوئے جرمنی کے خلاف دوسری قوموں کی پرانی دشمنیاں تازہ رکھتے ہیں نہ صرف وہ پرانی دشمنیاں تازہ رکھتے ہیں بلکہ وہ انہیں فروغ بھی دیتے ہیں جہاں ان کا بس چلے وہ اس دشمنی کو تلخ تر بنانے کی سعی کرتے ہیں یہ بھی یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کے خلاف اس منافرت انگیزی کی مہم میں جن قوموں کو بھڑکایا جاتا ہے ان کو اس منافرت انگیزی سے بہت تھوڑا فائدہ ہوتا ہے باوجود اس کے یہودی ان دیگر اقوام میں یہ زہر پھیلاتا رہتا ہے کہ دیگر ممالک میں یہ مہم چلانے کے لیے عام طور پر یہودی ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں جو خاص طور پر کسی مخاطب قوم کے میلانِ طبع سے مطابقت رکھتی ہوں یا اس ملک کے

خاص حالات کے پیش نظر زیادہ موثر ہوں یہودی خوب جانتے ہیں کہ کس ملک کی رائے عامہ کیا چاہتی ہے اور اپنے اس علم سے یہودی فائدہ بھی خوب اٹھاتے ہیں خود جرمن قوم کے خون میں بیرونی نسلوں کی آمیزش ہو چکی ہے یہی وجہ ہے کہ یہودی ہمارے خلاف جنگ اقتدار میں خود جرمنی کے باشندوں کے بعض حلقے بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ حلقے ہیں جو حب الوطنی کو برا سمجھتے ہیں اور آفاقیت کے دلدادہ ہوتے ہیں ایسے حلقے جرمنی میں موجودہ ہیں ان حلقوں کے اعتقادات امن پسندی اور بین الاقوامیت کے رجحانات پر مبنی ہوتے ہیں یہودی فرانس کو انگیخت کرنے کے لیے فرانسیسیوں کے رسوائے عام جزبہ تغلب کو استعمال کرتے ہیں انگلستان میں تجارتی رقابت اور عالم گیر سیاسی تصورات کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے مختصر یہ ہے کہ یہودی ہر قوم کے مخصوص ذہن کو بھڑکا کر خود فائدہ اٹھاتا ہے ان حیلے بہانوں سے جب یہودی کو سیاسی اور اقتصادی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو پھر وہ بے دھڑک ان حیلے بہانوں کی آڑ لینا ترک کر دیتا ہے یہودی حیلے بہانے تب ہی استعمال کرتا ہے جب تک ان کی ضرورت ہو جب حیلے بہانوں کی ضرورت نہ رہے تو یہودی اپنے اصل مقاصد اور حقیقی نیت کو عریاں طور پر پیش کرنے لگتا ہے اس مرحلے پر یہودی جس تباہی پر تلا ہوا ہے اس کی مہم زیادہ زوروشور سے شروع کر دی جاتی ہے ایک کے بعد دوسری سرکار کو کھنڈرات کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے یہودی اس طرح دوسری سرکاروں کو فنا کے گھاٹ اتار کر اپنی ہمیشہ رہنے والی ارضی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے۔

انگلستان اور اطالیہ دونوں ملکوں میں حقیقی مدبرین کی حکمت عملی اور یہودی سٹہ بازوں کی پالیسی کی باہمی تقادات گاہے گاہے بالکل صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

فرانس کالی نسلوں سے اختلاط کر رہا ہے

البتہ فرانس میں یہودی سٹہ بازوں اور فرانس کے تعصب پسند سیاست دانوں کی رائے میں اتحاد ہو چکا ہے کہ یہ اتحاد جرمن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اسی اتحاد کو مدنظر

رکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ فرانس جرمنی کا سب سے خطرناک دشمن ہے اور ہمیشہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن رہے گا۔ فرانسیسی قم میں حبشی نسلوں کا اثر روز افزوں ہے فرانس پر حبشیوں کا یہ نسلی اثر یورپ کی سفید فام اقوام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے خطرہ یہ ہے کہ حبشیوں کے نسلی اثر کے ماتحت خود فرانسیسی بھی یورپ کی سفید فام اقوام کے دشمن بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح یہودی دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے جس جدو جہد میں مصروف ہے اس کے ضمن میں فرانسیسی قوم بھی ایک آلہ کار کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے حبشیوں کا خون فرانسیسیوں کی رگوں میں ملتا جا رہا ہے۔ فرانسیسی دریائے رائن کے کنارے تک پہنچتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کالی نسلوں کا خون ایک طاعون کی صورت میں وسط یورپ تک یورش کر رہا ہے۔ فرانسیسی تو اس لیے طاعون کی پرواہ نہیں کرتے کہ جرمنی سے دشمنی ان کی وراثت اور گھٹی میں شامل ہے۔ اس دشمنی نے جذبہ انتقام اور ستم شعاری کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہودی ٹھنڈے دل سے اپنی چالیں سوچتا رہتا ہے۔ اسے فرانسیسیوں کی یہ روش خوب پسند ہے کیونکہ یہ اس کی چال کے عین مطابق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ فرانسیسیوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عین یورپ کے وسط میں نسلی اختلاط سے ایک دوغلی نسل پیدا ہو جائے گی۔ گوروں کے پاکیزہ خون میں کالوں کا پاجی خون شامل ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گوری اشراف قوموں کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے گا۔

فرانس آج وسط یورپ میں جو مہم چلا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانس کو حرص انتقام نے پاگل بنا دیا ہے یہودی سوچ سمجھ کر فرانسیسیوں کی اس مہم کی پشت پناہی اور راہنمائی کر رہا ہے۔ فرانسیسیوں کی یہ مہم گوری نسلوں کی زندگی کے خلاف ایک مجرمانہ ہے۔ خود فرانسیسی قوم بھی اس مجرمانہ اقدام کا نشانہ بننے والی ہے۔ آدم کو بھی جنت سے اس لیے نکلنا پڑا تھا کہ اس سے نسلی اختلاط کا گناہ سرزد ہوا تھا اب فرانس گوروں کا کالی نسلوں کے ساتھ مخلوط کر کے اسی گناہ کا ایک مرتبہ پھر ارتکاب کر رہا ہے۔ ایک دن آئے

گا کہ خود فرانسیسی قوم کو اس گناہ کا احساس ہو گا اور تب وہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے اس کے لیے فرانس ایک خطرہ عظیم ہے اس خطرہ عظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جذبات پرستی کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس بات کا خیال نہ رکھا جائے کہ کون سی گوری قومیں ماضی میں ہماری دشمن رہ چکی ہیں۔ بلکہ ہر ایک گوری قوم کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے جو جرمنی کی طرح فرانس کی جانب سے اس خطرے کا شکار ہونے والی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ جس قوم سے جرمنی معاہدہ کرے اس کو بھی فرانس کی جانب سے اس خطرے کا احساس ہو اور وہ فرانس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر یا غیر جانبدار رہنے پر آمادہ نہ ہو۔

فی الحال مستقبل بعید تک یورپ میں صرف دو قومیں ہیں جن سے جرمنی حلیفانہ اتحاد کر سکتا ہے۔ ایک برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے اطالیہ۔

دشمن سے بہتر سلوک کی توقع نہ رکھنی چاہیے

اگر ہم ماضی پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ دیکھیں کہ انقلاب کے بعد جرمنی کی خارجہ حکمت عملی کس انداز سے چلائی گئی ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ بار بار ہماری حکومت اپنے دشمنوں کے سامنے سر اطاعت خم کرتی رہی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ہماری حکومت ایسا کیوں کرتی رہی ہے۔ اس سوال پر غور کرنے کے صرف دو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہ جی چھوڑ کر گھر بیٹھ جائیں یا پھر غصے اور بغاوت کی آغ یوں مشتعل ہو کہ ہم ایسی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کے لیے شمشیر بکف گھروں سے نکل آئیں۔ ہماری حکومت اس روش کی وجہ سے یہ نہ تھی کہ وہ معاملہ کی اہمیت کو نہ سمجھتے تھی۔ یہ حکومت نادان نہیں خاصی عیار رہے۔ ان کے جناتی دماغوں نے ماہ نومبر کا انقلاب برپا کر کے دکھایا۔ حالانکہ کسی ذہین سے ذہین آدمی کو بھی اس کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے فرانس کے پاؤں پڑ کر اس کی منتیں کیں۔ اور اس سے خیرات مانگی۔ یہاں ہاں اس تماسالہا سال کے عرصہ میں یہ

لوگ بار بار اپنے سر فرانس کے پاؤں پر رگڑتے رہے۔انہوں نے اپنی ان حرکتوں میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ وہ لاعلاج سودائی نظر آتے تھے یہ اس ''عظیم قوم'' کے سامنے وفادار کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔فرانسیسی جلاد ہر مرتبہ جب سولی کا نیا پہلو بدلتا تھا تو یہ خوشامدی مسرت کے نعرے بلند کرتے تھے کہ دیکھو دیکھو اب جرمنی سے بہتر سلوک ہونے لگا ہے۔اس تمام کھیل کے پیچھے جو اصل تار ہلانے والے چھپے بیٹھے تھے وہ کبھی سچ مچ اس مغالطے میں گرفتار نہ تھے۔وہ تو فرانس سے دوستی کا ڈھونگ فقط اس لیے رچاتے تھے کہ جرمنی کسی دوسری قوم سے سچ مچ حلیفانہ اتحاد کر کے پھر اپنی آزادی کا انتقام نہ لے۔ان لوگوں کو فرانس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔خود فرانس میں جو لوگ پس پردہ تار ہلا رہے تھے ان کو بھی کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ان لوگوں نے جو کچھ کیا اور جو یہ سوانگ رچایا کہ ایسی حرکتوں سے جرمنی کو بچایا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ دراصل پوری مکاری سے وہ سوچ چکے تھے کہ یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا تو کہیں جرمن قوم کے عوام اپنی تقدیر کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں اور جس راستے پر یہ انہیں چلا رہے تھے اس سے روگرداں ہو کر کہیں دوسرے راستے پر نہ نکل جائیں۔

انگلستان سے جرمنی کی دشمنی بھول جانی چاہیے

یہ صحیح ہے کہ انگلستان کو مستقبل کے لیے جرمنی کا حلیف تجویز کرنا ذرا مشکل ہے۔ جرمنی میں جو اخبارات یہودیوں نے چلا رکھے ہیں۔وہ ہمیشہ انگلستان کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات خاص طور پر ابھارتے رہتے ہیں۔کئی سادہ لوح جرمن بالکل بےخبری میں وہی باتیں دہرانے لگتے ہیں جو یہودی ان کے کان بھر دیتے ہیں۔کبھی تو یہ شعلے چھوڑے جاتے ہیں کہ جرمن کی بحری طاقت بہر حال بحال کرنی ہوگی کہیں یہ احتجاج کیا جاتا ہے کہ جرمنی کے مقبوضات کیوں اس سے چھینے گیے چالاک یہودی سادہ لوح جرمنو کے یہ اقوال ان یہودیوں کے پاس نقل کر کے بھیج دیتے ہیں جو انگلستان میں بیٹھے ہیں پھر انگلستان مس رہنے والے یہودی جرمنوں کے یہ اقوال نقل کر کے جرمنی

کے خلاف خوب پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ جرمنی کے سادہ لوح کھاتے پیتے طبقات جو سیاسیات کا شغل اختیار کر لیتے ہیں انہیں یہ حقیقت بمشکل سمجھ میں آتی ہے کہ آج جرمنی بحری طاقت اور اس قسم کے دوسرے امور کے لیے جدو جہد میں مصروف نہیں جنگ سے پہلے بھی جرمنوں کی قومی قوت کو اس قسم کی مہمات میں مصروف کر دینا اس وقت تک بیکار تھا۔ جب تک پہلے یورپ میں جرمنی کی پوزیشن مضبوط نہ کی جاتی آج اس قسم کی توقعات کو انگیخت دینا سیاسی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

بارہا یہ دیکھ کر مایوسی کی شدت سے دل چاہتا ہے کہ سر پھوڑ لیا جائے کہ یہودی سازش کرنے والے کس طرح ہماری قوم کی توجہ ان مسائل پر مبذول کر دیتے ہیں جو آج ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ عوام کو ایک طرح مظاہرے اور احتجاج کرنے کی ترغیب دیتے ہیں دوسری جانب فرانس ہماری قوم کی باقاعدہ تکا بوٹی نوچتا رہتا ہے۔ جب قوم کی آزادی خطرے میں ہو تو اس قسم کے مظاہرے اور احتجاج کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

جنوبی ٹیرول کا مسئلہ

اس ضمن میں مجھے خاص طور پر وہ مثال یاد آتی ہے کہ اطالیہ میں واقعہ جنوبی ٹیرول کا علاقہ جہاں جرمن باشندوں کی اکثریت ہے اسے آزاد کرانے کی مہم چلا کر یہودیوں نے کس خوش اسلوبی سے جرمن قوم کو غلط راستے پر چلا دیا ہے۔

جی ہاں جنوبی ٹیرول کا چرچا آج کل ہماری قوم میں یہودیوں نے پھیلا رکھا ہے۔ میں یہاں اس مسئلہ کا تذکرہ اس لیے چھیڑ رہا ہوں کہ میں ان بدمعاشوں کی جانب سے توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جنہوں نے ہماری قوم کے کثیر گروہوں کی جہالت اور کمزوری حافظہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں مشتعل کر رکھا ہے۔ ان بدمعاشوں کا اس مسئلے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک چور کا شرافت سے تعلق ہو سکتا ہے۔ بھلا پارلیمنٹری نمائندوں کو قوم کا کیا درد ہو سکتا ہے۔

پہلے تو میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں کہ جنوبی ٹیرول کی قسمت کا فیصلہ اگست ۱۹۱۴ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۸ء کے درمیانہ وقفہ میں ہو گیا تھا۔ کئی دوسرے جرمنوں کی طرح میں نے بھی جنوبی ٹیرول کو بچانے میں حصہ لیا تھا۔ میں نے یہ حصہ اس جدوجہد میں لیا تھا کہ جس کے علاوہ جنوبی ٹیرول کو بچانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میری مراد یہ ہے کہ میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اس زمانہ میں جنگ میں ہم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کوشش کی تھی کہ جنوبی ٹیرول ہمارے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔ صرف جنوبی ٹیرول پر ہی کیا منحصر ہے۔ ہم نے مادر وطن کے چپہ چپہ کو بچانے کی کوشش کی۔

چھینے ہوئے علاقے صرف قوت بازو سے واپس مل سکتے ہیں

ان پارلیمنٹری دھوکہ بازوں نے تب اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ پاجی جماعتی سیاست بازی میں لگے رہے۔ جب ان سازشوں میں مصروف تھے تو ہم جنگ لڑ رہے تھے۔ ہم اس امید پر جنگ لڑ رہے تھے کہ ہم نے جنگ جیت لی تو جنوبی ٹیرول کا علاقہ بھی جرمن قوم کے قبضہ میں رہ جائے گا۔ تب یہ بلند و بانگ دعاوی کرنے والے غداران قوم کہاں تھے۔ یہ ایک باغیانہ بلوہ بپا کر رہے تھے تاکہ جرمنی کو فتح حاصل نہ ہونے پائے جب ان لوگوں نے قوم کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تو سیگفرائڈ کے محاذ پر جرمنوں کی شکست ہو گئی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جنوبی ٹیرول کو بچانے کا یہ طریقہ نہیں کہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اور وائنا کے راتھوز پلاسٹز ہال میں کھڑے ہو کر ریاکارانہ اور اشتعال انگیز تقریریں کی جائیں۔ یا میونخ کے فیلڈر ہال میں داد سخن دی جائے۔ ہمارے پارلیمنٹری حضرات تو جنوبی پیرول کو بچانے کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جنوبی ٹیرول کو بچانے کا صرف یہ راستہ تھا کہ محاذ جنگ پر لڑائی لڑی جاتی۔ جن لوگوں نے محاذ جنگ کو توڑنے کی تلقین کی انہوں نے جنوبی ٹیرول کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ ایک جنوبی ٹیرول پر ہی کیا موقوف ہے انہوں نے جرمنی کے کئی اضلاع دشمن کے حوالے کر دیے۔

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ احتجاج کرنے سے اور مظاہرے کرنے سے اور جلوس نکالنے سے جنوبی ٹیرول واپس مل سکتا ہے وہ یا تو ایک سادہ لوح گدھا ہے یا کوئی مکار دھوکے باز ہے۔

جو علاقے ہم سے چھن چکے ہیں انہیں واپس لینے کا طریقہ یہ نہیں کہ رب ذوالجلال کے عرش کے سامنے کھڑے ہو کر بد دعائیں دی جائیں یا لیگ آف آپشنز کی درگاہ میں فریادیں پہنچائی جائیں۔ چھنے ہوئے علاقے تو صرف قوت بازو سے ہی مل سکتے ہیں۔

اندریں حالات صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ سوال یہ ہے کہ آج ہمارے چھینے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے کون کون سے ہتھیار لے کر جنگ کرنے پر آمادہ ہے؟

بزدل میدان جنگ سے بھاگ جائیں گے

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے ضمیر کی گہرائیوں سے بولتے ہوئے یہ وعدہ کرتا ہوں کی مجھ میں اتنی جرات ہے کہ اگر آج یہ سرکاری مشیر اور پارٹیوں کے لیڈر اور پارلیمنٹری بابکارے ایک فوج بنا کر جنوبی ٹیرول فتح کرنے کی مہم میں نکلیں تو میں ان کی صفوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ میری بڑی آرزو ہے کہ میں یہ نظارہ دیکھ سکوں کہ جب سروں پر توپ کے گولے آ کر پھٹتے ہیں تو اس وقت ان مشتعل مظاہرے کرنے والوں کا کیا حال ہو گا۔ لعین ہی بتا سکتا ہے کہ اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ چوزوں کے کھانچے میں بلی کے گھسنے سے وہ افراتفری نہ مچتی ہو گی جو توپ کا گولہ پھٹنے سے ان کھوکھلے احتجاج کرنے والوں کے جلوس میں نظر آئے گی۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات ہے کہ یہ زبانی شور مچانے والے خود بھی دل سے یہ یقین نہیں رکھتے کہ ان کی ان حرکتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ان میں ہر ایک بخوبی جانتا ہے کہ یہ بہانہ سازی کس قدر مضر اور غیر موثر ہے۔ یہ لوگ تو سوانگ محض اس لیے رچاتے ہیں ک جنوبی ٹیرول کی واپسی کے لیے آج غلغلہ مچانا ماضی میں جنوبی ٹیرول کے

لیے جنگ کرنے سے بدرجہا آسان ہے۔

ہر شخص اپنی زندگی میں وہی کام انجام دیتا ہے جسے انجام دینے کے لیے اسے بتایا گیا ہے جب وقت تھا تو ہم نے خون کی قربانی دی۔ آج یہ لوگ اپنے دندان آز تیز کرر ہے ہیں۔

باتوں سے ملک فتح نہیں ہوتے

سب سے زیادہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ آج وائنا کے وہ حلقے جو پابندی قانون کے حامی ہیں کس طرح سے جنوبی ٹیرول کی واپسی کا مطالبہ کرر ہے ہیں ابھی سات سال ہی تو گزرے ہیں کہ ان حضرات کے ممدوح والا شان اور عالی دودمان شاہی خاندانوں نے غداری کا ارتکاب کرتے ہوئے اور جھوٹ بولتے ہوئے اتحادیوں کو یہ موقع دیا تھا کہ جنوبی ٹیرول پر قبضہ کرلیں۔ شاہی خاندانوں نے یوں فریب کاری کی جو پالیسی اختیار کی تھی تب ان حلقوں نے اس کی تائید کی تھی۔ اس وقت انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ جنوبی ٹیرول کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوگا یا کسی اور صوبے کا کیا حشر ہوگا۔ ہاں آج اس علاقے کی واپسی کے لیے کوشش کرنا آسان ہے کیونکہ اب اس جدوجہد میں خون بہنے کا امکان نہیں۔ خالی ذہنی ہتھیاروں سے جنگ کرنا کسی جلسہ میں احتجاج میں شرکت کرنا یا غیض وغضب سے بھری ہوئی تقریریں کرتے کرتے گلہ پھاڑنا' یا اخبار میں مضمون لکھتے لکھتے اپنی انگشت شہادت کو سیاہی کے دھبوں سے داغدار کردینا اس سے زیادہ آسان ہے کہ جتنا کہ مثال کے طور پر روہر کا علاقہ دشمن کے قبضے میں چلے جانے کے بعد وہاں کسی دریا کے پل کو ڈائنامائٹ سے اڑا دینا۔

کیا وجہ ہے کہ چند حلقوں نے آج جنوبی ٹیرول کے مسائلہ کو جرمنی اور اطالیہ کے باہمی تعلقات کی کسوٹی بنا رکھا ہے ان کی یہ پالیسی چند ہی سال سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ یہودی اور ہزبرگ کے شاہی خاندان کے تخت کی بحالی کی خاطر پابندی قانون کا نعرہ لگانے والے دراصل چاہتے ہیں کہ جرمنی کسی ایسے

ملک سے حلیفانہ معاہدہ نہ کر سکے جس کے ذریعے جرمنی کا دوبارہ آزاد ہونے کا امکان ہو۔ یہ لوگ جنوبی ٹیرول کی حمایت میں مصروف جدوجہد نہیں۔ وہ تو جس پالیسی کی حمایت کرتے ہیں اس سے جنوبی ٹیرول کی واپسی کے امکانات کم ہو رہے ہیں۔ انہیں تو خطرہ صرف یہ ہے کہ جرمنی اور اطالیہ میں باہمی معاہدہ نہ ہو جائے۔

کون خون بہانے پر آمادہ ہے؟

جھوٹ بولنا اور افترا پردازی ان لوگوں کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے اطمینان اور بے حیائی سے ہمارے خلاف یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم نے جنوبی ٹیرول کو غیروں کے حوالے کر دیا۔

ان لوگوں کو ایک ہی واضح جواب دیا جا سکتا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ وہ ہر جرمن جس کے اعضا صحیح و سالم تھے اور اس نے اپنے آپ کو ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک فوجی خدمت کے لیے پیش نہ کیا۔ وہ جنوبی ٹیرول غیروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ مادر وطن کی حفاظت کے سلسلہ میں اس پر جو فرض عائد ہوتا ہے وہ اسے ادا کرنے سے قاصر رہا ہے۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جنوبی ٹیرول غیروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے جس نے ایام جنگ کے دوران میں قوم کے جذبہ حب الوطنی اور جذبہ مدافعت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش نہ کی۔ اس کوشش کا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم پائمردی سے جنگ لڑتی اور مقابلے سے منہ موڑتی۔

تیسرے مرتبہ پر وہ شخص جنوبی ٹیرول غیروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے جس نے نومبر کے انقلاب میں حصہ لیا۔ اس انقلاب میں براہ راست حصہ لینے والے بھی ذمہ دار ہیں اور جن لوگوں نے اپنی بزدلی کے باعث اس انقلاب کا مقابلہ نہ کیا۔ وہ بھی ذمہ دار ہے۔ اس انقلاب نے ہمیں جنوبی ٹیرول واپس لینے کے قابل نہ چھوڑا۔

چوتھے مرتبہ پر جنوبی ٹیرول کے حوالے کر دینے کی ذمہ دار وہ تمام جماعتیں اور ان

کے پیرو ہیں جنہوں نے ورسائی اور سینٹ جرمین کے معاہدوں پر دستخط کیے۔

ایمیرے باتونی سورماؤ یہ ہے حقیقت حال۔

آج یہ میری سوچی سمجھی اور نپی تلی رائے ہے کہ جرمنی سے جو علاقے چھن چکے ہیں وہ سان پر چڑھائی ہوئی زبانوں سے واپس نہیں مل سکتے۔ وہ تو سان پر چڑھائی ہوئی تلوار سے ہی مل سکتے ہیں۔ سان پر چڑھی ہوئی زبانیں چاہے پارلیمنٹری تقریر بازوں کی کیوں نہ ہوں ان سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت تو خون بہانے کی ہے۔ ضرورت تو میدان جنگ میں لڑنے کی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی توقف نہیں کہ اب قسمت کا پانسہ پھینکا جا چکا ہے۔ جنوبی ٹیرول واپس لینے کے لیے اب جنگ چھڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ اگر جنوبی ٹیرول کو واپس لینے کے لیے جنگ چھڑنے کی تحریک شروع ہوئی تو میں اس کی مخالفت کروں گا۔ میں اس لیے مخالفت کروں گا کہ مجھے یقین ہے کہ ایسی جنگ کو جاری رکھنے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جرمن قوم میں جوش پیدا کرنا اور تا دم آخر ولولہ جنگ برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ جب کہ ستر لاکھ جرمن ہمارے ہمسایہ میں ہی غیروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ روہر کا علاقہ جرمن قوم کی شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج اس شاہ رگ کو فرانسیسیوں نے سیاہ فام حبشیوں سے پامال کر رکھا ہے۔

ساری دنیا سے دشمنی نہ مول لینی چاہیے

جنگ سے پہلے جرمنوں نے بڑی حماقت کی کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آج جرمنوں کو وہ غلطی دہراتے ہوئے اپنے آپ کو یورپ کے نقشے سے مٹا دینے کا سامان نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اس صورت حال کا تدارک کرنا چاہیے جس کے باعث غلطی کا ارتکاب ہوا۔ جرمنی کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن کون ہے۔ جب یہ طے ہو جائے تو پھر اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ہمیں اس دشمن کا قلع قمع کر دینا ہے۔ ایسے دشمن کا قلع قمع کرنے میں اگر کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ہمیں بعض

دوسرے مسائل میں قربانی بھی دینا پڑے تو آنے والی نسلیں ہمیں ا□ مزم نہ گردانیں گی۔ آنے والی نسلیں جب یہ سوچیں گی کہ ہمیں کن مشکلات کا سامنا تھا ہمیں کیا پریشانیاں لاحق تھیں ہم نے کن نازک حالات میں فیصلہ کیا تو وہ ہمیں ہرگز مزمت کا مستحق نہ گردانیں گی۔ وہ ہماری کارگزاری کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیں مستحق تبریک قرار دیں گی۔

یہاں میں پھر وہ بنیادی اصول دہرانا چاہتا ہوں کہ جو ہمیشہ میرے مدنظر رہتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ چھینے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ مادر وطن کو آزاد کرایا جائے اور طاقت ور بنایا جائے۔

سب سے پہلا کام یہ ہے کہ جرمنی کو آزاد کرانے کا امکان پیدا کیا جائے۔ جب یہ امکان پیدا ہو جائے تو پھر ہمیں بڑی سمجھ بوجھ سے ایسے حلیفانہ معاہدے کرنے ہوں گے جن کے ذریعے جرمنی کو آزاد کرانے میں مدد ملے گی۔ ی ہسب کچھ تب ہی ہوسکتا ہے جب جرمنی کی سرکاری پالیسی جرات اور ہمت سے چلائی جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم قوم پرست اشتراکی اس گڑھے میں گرنے سے بچے رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں' جہاں کھاتے پیتے محبان وطن یہودیوں کی ترغیب کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر ہم نے آنے والی جدوجہد کے لیے تیاری کی بجائے صرف زبانی احتجاج پر اکتفا کیا تو ہم خود اپنی ناکامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

حلیف ڈھونڈنے کی مشکلات

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی ک یتباہی کا باعث یہ تھا کہ ہم نے آسٹریا کی اس سرکار سے حلیفانہ معاہدہ کیا تھا جس پر ہیپنبر برگ کا شاہی خاندان حکمران تھا۔ آسٹریا کی یہ شاہی سرکار خود برلب گور تھی۔ اس برلب گور سرکار سے حلیفانہ معاہدہ کرنا بھوتوں سے دوستی کرنے کے مترادف تھا۔ آج بھی اگر ہم نے اپنی خارجہ پالیسی میں احمقانہ جذبات پرستی کو ترک نہ کیا تو مدت مدید تک جرمنی آزاد نہ ہو سکے گا۔

میں نے اوپر تین صفحات پیش کر کے جو کچھ بیان کیا ہے اس پر جو اعتراض ہو سکتے ہیں اب میں انہیں اختصار سے بیان کرتا ہوں۔

۱۔ آج جرمنی اس حد تک کمزور ہو چکا ہے کہ اس کی کمزوری بالکل عیاں ہے۔ بھلا اس حالت میں جرمنی کے ساتھ کوئی ملک حلیفانہ معاہدہ کیوں کرنے لگا۔

۲۔ جو قومیں جرمنی کی دشمن کی حیثیت سے پہلی جنگ عظیم لڑ چکی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اب وہ جرمنی سے حلیفانہ معاہدہ کریں۔

۳۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ دیگر اقوام میں یہودیوں کا اثر بڑی حد تک سرایت کر چکا ہے۔ یہ اقوام اس حد تک یہودیوں کے زیر اثر ہیں کہ انہیں خود اپنے مفاد کا احساس نہیں۔ ان اقوام میں یہودیوں کا اثر ان اقوام کے اپنے مفاد کے شعور کے طور پر غالب ہے۔ اندریں حالات جرمنی کے متعلق ان اقوام کی نیک خواہشات اور ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے منصوبے کس طرح پروان چڑھ سکتے ہیں۔ کیا یہودی ان خواہشات اور ان منصوبوں میں خلل پیدا نہ کریں گے۔

کمزور کا ساتھی کوئی نہیں بنتا

میرا خیال ہے کہ پہلے اعتراض کے دو پہلوؤں میں سے ایک کا جواب تو میں نے پہلے ہی دے چکا ہوں۔ یہ درست ہے کہ جرمنی کی موجودہ حالت میں کوئی قوم اس کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ جب ایک سرکار کی حالت یہ ہو کہ اس کی حکومت کو خود اپنے اوپر ذرہ بھر اعتماد نہ ہو تو دنیا کی کوی ء سرکار کیوں اس کے حلیفانہ معاہدہ کرنے لگی ہمارے بعض ہم وطن حکومت کی جانب سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ رائے عامہ میں ایسا خلل پیدا ہو چکا ہے کہ جرمن سرکار کی موجودہ روش کے علاوہ کوئی اور چارہ کار ہی نہیں رہا۔ میں اس عذر کو غلط سمجھتا ہوں اور اسکی پر زور تردید کرتا ہوں۔

یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ چھ سال میں ہماری قوم نے جس بے ہمتی کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے قوم کی شدید ترین ضروریات کو جس غفلت سے نظر انداز کیا

گیا ہے اور اس کے متعلق جس لاپرواہی کا اظہار کیا گیا ہے اسے دیکھ کر بسا اوقات تو سر سے امیدوں کے چھکے ہی چھوٹ جاتے ہیں ہماری قوم نے ایسی بزدلی کے مظاہرے پیش کیے ہیں کہ جو بلا شبہ عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسی قوم نے چند سال پہلے دنیا کے سامنے شجاعت اور تہور کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ ناز کرسکتی ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اوائل اگست ۱۹۱۴ء سے لے کر اقوام عالم کے مابین جو عدیم المثال دنگل شروع ہوا تھا اس میں دنیا کی کسی قوم نے دلیری، اولوالعزمی اور صبر و شکر کا وہ نمونہ پیش نہیں کیا تھا۔ جو جرمنوں نے پیش کیا تھا۔ آج یہی قوم بے ہمت ہو چکی ہے اور اوسان خطا کرچکی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری قوم کی موجودہ بے ہمتی اس کی جبلت میں داخل ہے۔ آج ہمیں جو ذلت اور مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے جس کے نظارے ہم اپنے چاروں جانب دیکھتے ہیں اور جس کا شکار ہم خود بن چکے ہیں۔ وہ اس غداری کا نتیجہ ہے جس کا ارتکاب ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو کیا گیا تھا کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

برے کام کا انجام برا ہوتا ہے

اس مقولے کی سچائی کی بہترین مثال ہماری موجودہ حالت ہے۔ پھر بھی ہماری قوم کی اصلیت میں بڑے بڑے جوہر پنہاں ہیں وہ جوہر آج بھی چھپے تو ہوئے ہیں لیکن بالکل ضائع نہیں ہوئے۔ یہ جوہر ہماری قوم کے ضمیر کی آواز میں اج خفتہ پڑے ہیں۔ آج کل چاروں جانب گھٹا اور اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں بھی یہ جوہر کبھی کبھی بجلی کی طرح کوند جاتے ہیں۔ ان کی چمک ثابت کرتی ہے کہ ایک دن پھر ایسا آئے گا جب جرمنی کے گزرے ہوئے ایام واپس آجائیں گے۔ بارہا ہم دیکھتے ہیں کہ جرمن نوجوان کسی اجتماع میں اکٹھے ہو کر جس طرح ۱۹۱۴ء میں قربانی کا حلف اٹھاتے تھے۔ اسی طرح اب بھی برضا و رغبت یہ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ قوم کو بچانے کی خاطر

اپنی جان عزیز نچھاور کر دیں گے۔ لاکھوں انسان یوں مصروف جدوجہد ہیں۔ اس طرح ایک سو ہو کر پوری ہمت اور جوش مشقت سے کر رہے ہیں۔ گویا ان پر انقلاب کا کوئی اثر ہی نہیں پڑا۔ لوہار اپنی بھٹی کے قریب ہتھوڑا چلا رہا ہے۔ کسان ہل چلانے میں مصروف ہے۔ سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں منہمک ہے۔ ہر شخص کو ادائے فرض کا خیال ہے کہ ان کے ولولے ان کے جوش اور ان کی وفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یہ درست ہے کہ جرمنی آج بھی اپنے دشمنوں کے ہاتھوں ظلم وستم کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے لیکن آج وہ حالت نہیں جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے دشمن کی بدسلوکی ہنسی خوشی برداشت کی جاتی تھی۔ آج دشمن کی بدسلوکی کے خلاف تلخی اور غصہ پیدا ہو رہا ہے کچھ شک نہیں کہ قوم کی روش میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

نااہل حکمران بڑی آفت ہیں

ابھی اس تبدیلی نے یہ شکل اختیار نہیں کی کہ اس تبدیلی کا شعور بھی پیدا ہو جائے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ قوم کی حریت اور سیاسی طاقت کو بحال کرنے کے لیے سوچ سمجھ کر جدوجہد شروع ہو جائے گی۔ اگر یہ جدوجہد ابھی شروع نہیں ہوئی تو اس کا الزام صرف ان نااہل لوگوں کے سر پر ہے۔ جن میں تدبر کی کوئی طبعی اہلیت نہیں۔ باوجود نااہل ہونے کے یہ لوگ ۱۹۱۸ء سے ہمارے حکمران بنے بیٹھے ہیں۔ اور ہمیں تباہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔

ہاں ہاں اگر آج کوئی شخص ہماری قوم پر الزام دھرتا ہے تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ قوم کی راہنمائی کے لیے کیا خدمت انجام دی گئی ہے۔ یہ شکایت کرنا بجا نہیں کہ عوام حکومت کے اقدام کی پوری تائید نہیں کرتے۔ سرکار کا وجود ہی کہاں ہے کہ اس کے کسی اقدام کی تائید کی جائے۔ پھر اگر سرکار کے اقدامات کی تائید نہ ہو تو اس کا مطلب یہی تو نہیں کہ قوم کا قصور ہے۔ حکومت ایک مقدس امانت ہے۔ اگر حکومت کے اقدامات کی عوامی تائید نہیں ہوتی تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ حکومت اس امانت کو بجا لانے سے قاصر

ہے۔آخر ہماری حکومت نے قوم کے جذبات خودشناسی' خوداعتمادی اورشجاعت وغیرت کو بیدار کرنے کے لیے کیا اہتمام کیا ہے۔ دشمن کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر کھڑے ہوئے کی ہمیں ترغیب ہی کب دی ہے۔

۱۹۱۹ء میں جب صلح نامے کے بعد معاہدہ جبراً جرمنوں پر ٹھونسا گیا تو یہ امید کی جاتی تھی کہ ظلم وستم کی اس مجسمہ دستاویز کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی کو آزاد کرانے کی آواز بہت جلد بلند ہوگی جب کوئی صلح نامے کا معاہدہ ایسی شرائط منواتا ہے جوقوم پر تازیانے کی طرح اثر کرے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مظلوم قوم میں آئندہ حریت اور استقلال حاصل کرنے کے لیے تحریک شروع ہوجاتی ہے۔

شکست سے بھی فتح کا سامان تیار ہوسکتا ہے

آیئے ذرا غور کریں اور عہدنامہ ورسائی سے جرمن قوم کو بیدار کرنے کے لیے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔اس معاہدے میں جرمنوں کا خون نچوڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔جرمنوں کو ذلیل کرنے کی ہرممکن کوشش کی گئی ہے۔اگر ہماری حکومت چاہتی ہے تو اس معاہدے وے قوم کو زیادہ سے زیادہ قربانی پر آمادہ کرسکتی تھی اگر پراپیگنڈے ک مہم ٹھیک طرح چلائی جاتی تو اس صلح نامے کے ظلم وستم اور ایذا رسانی کا چرچا کرکے لوگوں کی غفلت اور لاپرواہی دور کی جاسکتی تھی۔ان میں غیض وغضب پیدا کیا جاسکتا تھا۔اس جذبہ غیض وغضب سے وہ تاب مقاومت پیدا کی جاسکتی تھی کہ جو کسی قربانی سے پیچھے نہ ہٹتی۔

اس صلح نامے کی ایک ایک شرط جرمن قوم کے سینے پر نقش ہوجانی چاہیے تھی۔اس نقش گری سے سینے جل اٹھتے۔اس آگ کے شعلے یہاں تک بھڑکا دیے جاتے کہ چھ کروڑ مرد اور عورتیں یوں محسوس کرتے کہ ان کی روحیں پھنک رہی ہیں۔غیظ وغضب اور غیرت ک آنچ سب کی جلا کر بھسم کردیتی۔یہ آگ چاروں کھونٹ اس طرح پھیلتی کہ سارا ملک ایک دہکتی ہوئی بھٹی کی شکل اختیار کرلیتا۔پھر اس مٹی میں سے آہنی عزم کی تلوار

تیار ہو کر نکلتی۔ قوم ایک آواز سے پکار اٹھتی کہ سر ہتھیلی پر رکھو اور تلواریں بے نیام کر لو۔

بچوں کو پنگوڑے میں جنگ کی لوریاں دینی چاہئیں

ہاں ہاں ایسے معاہدے سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اس معاہدہ کے ظلم وستم اور سختی کی کوئی حد نہیں۔ اس معاہدے کے ماتحت جرمن قوم پر جو مطالبات عائد کیے گئے ہیں وہ گستاخانہ ہیں۔ اس ظلم وستم اور گستاخی کا انکشاف کر کے ایسا پراپیگنڈہ کیا جا سکتا تھا کہ قوم کے سوئے ہوئے جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے اور ہر شہری کے اکھاڑے میں کودنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

رات کو بچوں کو سلاتے وقت مائیں جو لوریاں دیتی ان میں یہی تذکرہ ہوتا کہ ملک کا ایک ایک اخبار یہی چرچا کرتا۔ ہر تھیٹر اور ہر سینما میں یہی غلغلہ برپا ہوتا ہر در و دیوار پر یہی اشتہار لگے نظر آتے۔ ہر کوچہ و بازار میں یہی نعرے بلند ہوتے۔ غرض اس عظیم جدوجہد میں ساری قوم شریک ہو جاتی۔ آج ہماری محبِّ وطن انجمنیں دبی ہوئی آواز سے جو یہ دعا مانگتی ہیں کہ ہمارے رب ہمیں غلامی سے نجات دے۔ یہ دبی ہوئی دعا ایک بلند آہنگ مناجات بن جاتی اور اس مناجاتر کے الفاظ یہ ہوتے اے قادر مطلق ہمارے ہتھیاروں میں طاقت دے۔ جب امتحان کا وقت آئے تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔ انصاف کر تو ہمیشہ سے عادل ہے۔ انصاف کر۔ اگر ہم آزادی کے مستحق ہیں تو ہمیں آزادی دے۔ اے رب ہمیں جدوجہد کی توفیق دے''۔

ان میں سے کسی موقعہ کا فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ کچھ بھی نہ کیا گیا۔

کیا ہم دنیا کے خانساماں اور بہرہ ہیں؟

اب اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہماری قوم کو جو ہونا چاہیے تھا وہ نہیں۔ یا جو وہ بن سکتے تھے نہیں بن سکے۔ باقی دنیا آج ہمیں اپنا خانساماں اور بہرہ سمجھتی ہے یا ہمیں ایسا وفادار کتا سمجھا جاتا ہے جو مالک کی ٹھوکریں کھا کر بھی اس کے پاؤں چاٹتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری قوم کی غفلت اور لاپرواہی اور دوسری قوموں کے ساتھ حلیفانہ

معاہدہ طے کرنے میں رکاوٹ ہے لیکن ہماری حکومت اس سے بھی بڑی رکاوٹ ہے۔ ہماری حکومت ایسی خائن اور بددیانت ہے اور آج بھی ایسی خائن اور بددیانت ہے کہ آٹھ سال کے ظلم وتشدد کے بعد اب عوام میں حریت کا جذبہ ہی ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔

اگر ہماری قوم دوسری قوموں سے حلیفانہ معاہدے کرنے کی خواہش مند ہے تو سب سے پہلے اسے دوسری قوموں کے سامنے اپنا کھویا ہوا وقار پانا ہے۔ ہمیں ایک ایسی حکومت قائم کرنی ہے جس کا کوئی وزن ہو۔ ایسی حکومت سے کام نہیں چلے گا جو بیرونی سرکار کے ہاتھ کی کٹھ پتلی ہو۔ ہماری حکومت ہمارے سروں پر غیروں کا مقرر کردہ داروغہ نہ ہوتی چاہیے بلکہ وہ تو قوم کی پکار کو دہرانے والا نقیب ہونا چاہیے۔

چھ سال میں انقلاب آ سکتا ہے

اگر ہماری قوم کو ایسی حکومت میسر آ جاتی ہے جو اس مہم کا انجام دینا اپنا فرض سمجھتی تو وہ چھ سال کی مدت کے اندر جرمن سلطنت کی خارجہ حکمت عملی اس جرات سے چلاتی کہ عوام میں اس کی حمایت راسخ ہو جاتی۔ عوام کا جذبہ حریت بیدار ہو جاتا۔ آزادی کی تڑپ تیز ہو جاتی۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جو قومیں پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی دشمن تھیں۔ اب وہ اس کی حلیف کیسے بنائی جا سکتی ہیں۔ اس اعتراض کا جواب حسب ذیل ہے۔

جنگ کے دوران میں جرمنی کے خلاف پراپیگنڈے کے باعث دوسرے ملکوں میں جرمنی سے جو عام دشمنی اور مغائرت کا احساس پیدا ہو چکا ہے وہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک جرمن قوم میں قوم پرستی کا جذبہ پھر ایک مرتبہ بحال نہیں ہو جاتا۔ جب ایسا ہو گیا تو جرمن سلطنت بھی بحیثیت ایک حکومت کے یورپ کے سیاسی شطرنج کے مہروں میں شمار ہونے لگ جائے گی۔ جب جرمن سرکار یورپ کی سیاسیات میں دخیل ہو جائے گی تو پھر دوسری حکومتیں بھی ہمارے ساتھ معاملہ فہمی پر آمادہ ہو جائیں گی۔ جب تک کوئی حکومت اور کوئی قوم پختہ تہیہ نہیں کر لیتی۔ کہ اسے ہمارے ساتھ حلیفانہ معاہدہ

کرنا ہے تب تک وہ ایسا پراپیگنڈہ کیوں شروع کرے جس سے اس **ملک** کی رائے عامہ جرمنی کے ساتھ ہو جائے ہاں جب کسی **ملک** کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کے مفاد کے لیے جرمنی کے ساتھ **حلیفانہ** معاہدہ کرنا مفید ہوسکتا ہے تو پھر اس **ملک** کی حکومت جرمنی کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دے گی۔ سالہا سال سے پوری استقامت اور استقلال سے کام لیا گیا تو تب کہیں جا کر یہ منزل طے ہوگی۔

بین الاقوامی اتحاد قوموں کے مابین ہوتے ہیں نہ کہ اشخاص کے مابین

چونکہ کسی **ملک** کی رائے عامہ ہموار کرنے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ مہم شروع کرنے سے پہلے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کسی مسئلہ پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مہم اس وقت تک شروع نہیں کی جاسکتی۔ جب تک یہ پختہ یقین نہ ہو جائے کہ اس مہم سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ مستقبل میں مفید ثابت ہوں گے۔ رائے عامہ اور احساس عامہ کو بدلنے کی مہم کسی وزیر خارجہ کی خوشامد سے متاثر ہو کر شروع نہیں کی جاسکتی۔ چاہے یہ وزیر صاحب کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں۔ ایسی مہم شروع کرنے سے پہلے اس امر کی کوئی ٹھوس ضمانت ہونی چاہیے۔ اس مہم کے نتائج واقعی مفید طلب ہوں گے۔ ورنہ دور اندیشی کے بغیر آئے دن رائے عامہ کو بدلنے کی نئی مہم چھیڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام میں انتشار اور پریشان خیالی پھیل جائے گی۔ اس قسم کی ٹھوس ضمانت یہی ہوسکتی ہے۔ کہ بحیثیت مجموعی کسی حکومت کی پالیسی واضح طور پر مستقبل اور معین ہو۔ نیز یہ پالیسی متعلقہ **ملک** کی رائے عامہ میں بھی مقبول ہو۔ کسی **ملک** کی حکومت کے کسی رکن کی میٹھی میٹھی باتیں یا دل آویز ادائیں اس امر کی ضمانت نہیں ہوسکتیں کہ بالاخر واقعی اس **ملک** س **حلیفانہ** اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے۔ ہاں جب ایک دفعہ ایسی ضمانت مہیا ہو جائے تو پھر ایسی پالیسی کے حق میں رائے عامہ کو زیادہ ہموار کرنے کے لیے حکومت بھی پراپیگنڈہ کی مہم شروع کر

سکتی ہے۔اس مہم کے ذریعہ حکومت کی پالیسی کا چرچا کیا جائے گا۔اوراس کے لیےعوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی جب پراپیگنڈہ کی ایسی مہم چلائی جائے گی تبھی پتہ چلے گا کہ وہاں کے عوام کس حد تک حکومت کی پالیسی کی مستقل تائید پر آمادہ ہیں۔

اپنی مدد آپ کروتو دنیا بھی تمہاری مدد کرے گی

آج ہماری قوم کی حالت ایسی ہے کہ ہم سے حلیفانہ معاہدہ کرنے پر کوئی حکومت تبھی آمادہ ہوگی جب ہماری رائے عامہ ہماری حکومت کی پشت پناہ پر آمادہ ہو۔نیز ہماری حکومت اور ہماری رائے عامہ دونوں پورے جوش وخروش سے قومی آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔جب تک ہماری حکومت اور ہماری رائے عامہ دونوں مل کر جرمنی کی آزادی کے لیے جدوجہد نہیں کرتیں۔جب تک ہماری حکومت کو رائے عامہ کی پوری تائید حاصل نہیں ہوجاتی تب تک دوسرے ممالک کی رائے عامہ کو جرمنی کے حق میں ہموار نہیں کیا جاسکتا۔آخر دوسرے ممالک کی رائے عامہ خود اپنے قومی اور ملکی مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔وہ ہمیں اپنا حلیف اسی صورت میں بنا سکتے ہیں جب انہیں یقین ہوجائے کہ ہم ان کے حلیف بن گئے تو ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوکر ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں گے۔جب تک کسی **ملک** کی رائے عامہ وہاں کی حکومت کی تائید نہ کرے اور دونوں مشترکہ طور پر کسی مستقل پالیسی کی خاطر قربانی دینے پر آمادہ نہ ہوں تب تک ان سے حلیفانہ اتحاد نہیں کیا جاسکتا۔

نئی پالیسی مقبول بنانے میں وقت درکار ہوتا ہے

اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ایک شرط اور بھی لازم ہے کہ کسی **ملک** کی رائے عامہ کو تبدیل کرنے کے لیے خاصی مشقت درکار ہوتی ہے۔اکثر لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کام خاصہ مشکل ہے۔جب کوئی **ملک** جرمنی کے حق میں اپنی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مہم شروع کرے گا تو وہاں کے کچھ عناصر اس کی مخالفت بھی کریں گے۔

مخالفت وہ لوگ کریں گے جو اس مہم کو ناکام بنانا چاہتے ہوں گے۔ یہ مخالف کوشش کرنے والے اپنی روش کے حق میں دلائل بھی پیش کریں گے۔ اب اگر خود جرمنی ایسی حرکتیں سرزد کرے گا کہ ان کی مخالفت کرنے والوں کو آسانی سے یہ حرکتیں دلیل کے طور پر استعمال کرنے کا موقع مل جائے تو کیا نامناسب ہو گا میں تو کہوں گا کہ ایسی حرکتیں سرزد کرنا ایک مجرمانہ اور احمقانہ فعل ہو گا۔

کسی ملک کی اندرونی پالیسی کے مقاصد عام لوگوں تک پہنچنے اور ان کی سمجھ میں آنے کے لیے خاصہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی پالیسی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو تیاریاں کی جاتی ہیں انہیں خفیہ رکھنا پڑتا ہے یا کم از کم ان تیاریوں کو جو اصل مقصد ہے اس کا انکشاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں تمام عوام کو حکومت پر اعتماد ہوتا ہے۔ سرکار کو اس پر تکیہ کرنا پڑتا ہے یا حکمران حلقہ کے ارکین کی بالغ ذہانت اور قیافہ شناسی از خود کسی پالیسی کا مطلب بھانپ لیتی ہے تو اس سے بھی حکومت کو تقویت پہنچتی ہے۔ اکثر لوگ اس قیافہ شناسی اور سیاسی بالغ نظری سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ کسی معاملہ کی تہہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں سیاسی مصلحتوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حکمت عملی کی تفصیلی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہ ک جب کسی ملک میں کوئی ن ءئ حکمت عملی شروع کی جاتی ہے تو وہاں کے دانشور طبقہ کے کچھ نہ کچھ رہنما اس پالیسی کی مخالفت ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماری جا رہی ہیں قدامت پسند حلقے ہر نئے تجربہ کے مخالف ہوتے ہیں۔ یوں ہر نئ پالیسی کو کچھ نہ کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈینگیں مارنے سے کچھ فائدہ نہیں

ان حالات میں ہر شخص کا فرض ہے کہ جو لوگ دو قوموں کے مابین مصالحت کی سعی کر رہے ہیں ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے۔ نادانی کی حرکتوں سے ان کی مشکلات میں اضافہ نہ کیا جائے۔ اس اصول کا اطلاق خاص طور پر وہاں ہوتا ہے

جب ہماری محب وطن انجمنیں اور نچلے طبقہ کے کھاتے پیتے لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھ کر سیاسیات کے متعلق چونچیں لڑاتے ہیں وہ ایسی دوں کی لیتے ہیں کہ اور ایسی بڑیں ہانکتے ہیں کہ جن کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ کبھی تو یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ ایک نیا جنگی بحری بیڑا بنانا چاہیے۔ کبھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہمارے مقبوضات تو ضرور واپس ملنے چاہئیں۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل اور سنجیدگی سے غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان شاندار تجاویز پر فی الحال عمل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ بے ضرر اور مجذوبانہ بڑیں جو احتجاج کے جوش میں ہانک دی جاتی ہیں۔ ہماری جان کے دشمنوں کی مطلب برآری کے لیے نہایت بہانے پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کھوکھلے نعروں کا چرچا کر کے ان کے ذریعہ جرمنی کے سیاسی مفاد کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

ہماری قوم کی طاقت اور اسکا جوش بیک وقت ساری دنیا کے خلاف شاندار لیکن بے ضرر مظاہروں میں ضائع کیا جا رہا ہے۔ ان مظاہروں سے الٹا ہمارے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو لوگ ان مظاہروں میں حصہ لیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسے معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کی اصل بنیادی شرط کیا ہے۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے پھر مکمل طور پر انجام دو۔ پانچ دس حکومتوں کے خلاف بیک وقت بھونکنے سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قومی طاقت اور امدادی وت اپنے بدترین دشمن کے خلاف پوری جسمانی ہمت سے ٹکر لگانے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ ان بے پردہ مظاہروں کے باعث اس امر کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ ہم کسی حکومت سے حلیفانہ اتحاد قائم کر کے اپنے بدترین دشمن کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اپنے ہاتھ مضبوط کر سکیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز کرو، بڑی باتوں پر توجہ دو

یہاں پھر قوم پرست اشتراکیت کے لیے موقع ہے کہ ملت کی رہنمائی کرے۔ اپنی قوم کو یہ سبق سکھانا ہمارا فرض ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنی توجہ ہٹا لو اور بڑے

بڑے مسائل پر اپنی توجہ ہمت صرف کر دو۔ غیر ضروری مقاصد پر اپنی طاقت ضائع نہ کرو۔ یاد رکھو کہ جب سر ہتھیلی پر رکھ کر جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو وہ ایک ہی مقصد ہے جس کی خاطر ہم جنگ میں کود یں گے وہ مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کے تحفظ اور بقا کی کوشش کی جائے یہ جنگ ہم صرف اس دشمن کے خلاف لڑیں گے جو آج ہماری جان کا لاگو ہو رہا ہے۔

ممکن ہے کہ ہمیں اپنے کندھوں پر ایک سے زائد بوجھ لادنے پڑیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم عقل کی کوئی بات نہ سنیں۔ ساری دنیا کے خلاف فضول نعرہ بازی میں الجھنے سے فائدہ کیا ہے؟ ہمیں تو اپنی تمام طاقت اس دشمن کے خلاف جمع کر دینی چاہیے جو ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

مزید بریں جب تک جرمن قوم ان مجرموں کو سزا نہیں دے دیتی جنہوں نے خود اپنی قوم سے غداری کی اور اپنے وطن کو فروخت کیا۔ تب تک ہمیں اس بات کا کوئی اخلاقی حق نہیں کہ باقی دنیا ہم سے جو سلوک کر رہی ہے اس کے خلاف احتجاج کریں۔ جب تک ہماری حالت یہ ہے کہ ہم گھر بیٹھے انگلستان اور اٹلی کو برا بھلا کہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم نے ان پاجیوں کو ملک کے اندر آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے کی اجازت دے رکھی ہے جو دشمن سے رشوت لے کر جنگ کے دوران ہمارے ہی خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے جنہوں نے ہمارے ہاتھوں سے ہمارے ہتھیار چھین لیے اور جنہوں نے ہماری قوت مدافعت ختم کر کے ایک گھٹیا سی قیمت کے عوض جرمن سلطنت فروخت کر دی۔ تب تک تمہیں کیا توقع کی جا سکتی ہو کہ دنیا میں ہماری آواز کو کہیں وقعت سے سنا جائے گا۔

دشمن نے اپنا فرض ادا کیا تم بھی اپنا فرض ادا کرو

دشمن نے تو وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اور جس کی ہمیں اس سے توقع کرنی چاہیے تھی۔ ہمیں اپنے دشمن کے طرز عمل سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس نے کیا خوب

اپنا فرض ادا کیا ہے اور کیا خوب ہمارے خلاف اپنے موقف پر قائم رہا۔

اگر کوئی شخص اس حقیقت کو قبول نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مستقبل میں جرمنی کے لیے ہر قسم کے حلیفانہ معاہدے کرنے کی کوشش سے دستبردار ہو جاتا ہے انگلستان سے تو ہمارا معاہدہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمارے مقبوضات چھین لیے ۔اطالیہ سے ہمارا معاہدہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس نے جنوبی ٹیرول پر قبضہ کر لیا۔اسی طرح پولینڈ اور چیکوسلواکیہ سے بھی ہمارا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔اس کے بعد سوائے فرانس کے اور کس سے ہمارا معاہدہ ہونے کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔آخر فرانس نے فقط الیس لیس اور لورین کے علاقے ہی تو ہم سے چھینے ہیں!

جرمنی کا فرانس سے اتحاد کس حد تک جرمن قوم کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہاں اگر کوئی سچ مچ اس تجویز کی حمایت کرے تو یقین سے یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہ شخص سادہ لوح دیوانہ ہے یا کوئی مکار پاجی!!!

جو لوگ ایسی تجاویز پیش کرنے کے سرغنہ ہیں ۔ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ سادہ لوح احمق نہیں بلکہ مکار پاجی ہیں!!!

خارجہ حکمت عملی میں پھوہڑپن ترک کرنا ہوگا

غرض مستقبل میں یہ ممکن ہے کہ جو قومیں آج تک جرمن کی دشمن رہی ہیں لیکن مستقبل میں ان کے حقیقی مفاد سے مطابقت رکھتے ہیں اب جرمنی کے متعلق اپنی روش بدل ڈالیں ۔لیکن جہاں تک عقل انسانی کام کرتی ہے ایسا تب ہی ہو گا کہ جب پہلے خود ہماری سرکار کی داخلی قوت اتنی بڑھ جائے گی اور ہماری قوم کے متعلق یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم اپنی بقا کے لیے جدو جہد پر آمادہ ہیں جب یہ دونوں شرائط پوری ہوں گی تو یہ واضح ہو جائے گا کہ کسی قوم کا ہم سے حلیفانہ اتحاد کرنا اس قوم کے لیے بڑا مفید ہو گا۔مزدی بریں یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنے قومی معاملات انجام دینے میں آئندہ پھوہڑپن کا ارتکاب ترک کردیں۔بعض دیگر مسائل میں اپنی ان مجرمانہ حرکات سے ہمیں اجتناب

کرنا ہوگا۔ جن کے باعث ان لوگوں کو پراپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جو جرمنی کے پرانے دشمن ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جرمنی کا حلیفانہ اتحاد ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔

تیسرے اعتراض کا جواب ذرا اور بھی مشکل ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جن ملکوں سے حلیفانہ اتحاد کا امکان ہے ان کے حقیقی مفاد کے ترجمان سیاسی مدبر' یہودیوں کی مخالفت کے باوجود اپنی خود اپنی صوابدید پر عمل کر سکیں؟ یہودی تو اب خود مختار اور ہر دل عزیز قومی سرکاروں کی جان کا دشمن ہے۔

مثال کے طور پر کیا برطانیہ عظمیٰ کے روایتی مدبر کی طاقتیں یہودیوں کے تاثرات کو شکست دے سکیں گی یا نہیں؟

فسطائیت نے صیہونیت کی کمر توڑ دی ہے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سوال کا جواب دینا خاص مشکل ہے۔ اس سوال کا جواب اتنے متعدد کوائف پر منحصر ہے کہ کوئی حتمی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ ہاں ایک بات یقینی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی سرکار کی کوئی ایک وزارت کسی خاص وقت میں رائے عامہ کا ایسا مکمل اعتماد حاصل کر چکی ہو اور ملک کے مفاد کی ایسی بے لاگ محافظ ہو کہ صیہونیت کی بین الاقوامی طاقتیں ایسی وزارت کی مجوزہ سیاسی حکمت عملی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوئی موثر اور واقعی کوشش نہ کریں۔

اطالیہ کی فسطائی حکومت نے یہودیوں کے تینوں سب سے بڑے ہتھیاروں کو ناکارہ کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہودیوں کے خلاف اس جدوجہد کے باوجود اطالیہ کی فسطائی حکومت یہودیت کے فتنہ کا کامل احساس نہ رکھتی ہو۔ اگرچہ ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ اطالیہ کی فسطائی حکومت کو اس فتنہ کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ بہر حال اس جدوجہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صیہونیت کی عالمگیر طاقت جو ہر قسم کی سرکاری حد بندیوں کے باوجود ایک عالمگیر طاقت ہے۔ اس کی

زہریلی قوت کا مقابلہ کرنے والے عناصر بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ اطالیہ کی فسطائی حکومت نے ایک طرف فری میسن اور دیگر خفیہ انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ دوسری جانب جو اخبارات اپنے آپ کو قومی مفاد کا پابند نہ سمجھتے تھے انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ تیسری جانب مارکس ازم قطعی طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرکار کے فسطائی تخیل کی نشوونما اور اس پر عمل درآمد جاری ہے یہ سب کوششیں چند ہی سال میں اطالیہ کی حکومت کو اطالوی قوم کے مفاد کی حفاظت کے قابل بنا دیں گی۔ اس کے بعد صیہونیت کا وہ اژدھا جس نے ساری دنیا کو لپیٹ میں لے رکھا ہے جتنا جی چاہے چنگھاڑتا رہے اس کا اطالوی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

امریکہ اور انگلستان کے دل بھی صاف نہیں

انگلستان میں حالات ایسے امید افزا نہیں کہ یہ ملک دنیا کی سب سے زیادہ آزاد جمہوریت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں یہودی اپنی من مانی چلاتا ہے۔ یہودیوں پر کوئی پابندی نہیں۔ یہودیوں کا رائے عامہ پر تسلط ہے۔ اور جو چاہیں بالواسطہ منوا لیتے ہیں۔ باوجودا س کے انگلستان میں ایک اور مستقل کش مکش جاری ہے۔ یہ کش مکش دو عناصر کے مابین ہے۔ ایک طرف وہ حلقے ہیں جن کے سپرد سرکاری مفاد کی حفاظت ہے۔ اور دوسری جانب یہودیوں کی عالم گیر آمریت کے وکیل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ کشمکش سب سے پہلے اس وقت سامنے آئی جب مسئلہ جاپان کے متعلق برطانیہ کے حکمران مدبرین نے ایک روش اختیار کی اور اخبارات نے اس کے مخالف روش پر چلنا شروع کر دیا۔

جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی امریکہ اور جاپان کی باہمی قدیم رقابت کھل کر منظر عام پر آئی جب امریکہ اور جاپان میں رقابت شروع ہو گئی تو یورپ کی بڑی بڑی سرکاریں اس مسئلہ سے غیر متعلق نہ رہ سکیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس کے باعث جنگ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ انگریز اگرچہ خون کے لحاظ سے امریکہ کے رشتہ دار ہیں لیکن

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر انہیں حسد اور تشویش بھی ہوتی ہے۔وہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ بین الاقوامی اقتصادیات اور بین الاقوامی سیاسیات دونوں پر چھائے جارہا ہے۔کبھی امریکہ محض برطانیہ کا مقبوضہ تھا۔پھر دنیا کی چہیت بڑی اماں کی رہی اور امریکہ بیٹی کی طرح جدا رہنے لگا۔اب نوبت یہ آچکی ہے کہ بیٹی ساری دنیا کی رانی بنتی جارہی ہے۔پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انگلستان اپنے حلیفانہ معاہدات پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔برطانوی مدبرین اس خطرہ کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔کہ جہاں تک دنیا میں یہ نعرہ بلند ہورہا ہے کہ دنیا کے سمندروں کی ملکہ برطانیہ ہے۔وہاں کہیں اب یہ نعرہ بلند نہ ہو جائے کہ دنیا بھر کے سمندروں پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کا تسلط ہے۔

براعظم امریکہ کی دیوزاد شمالی ریاست کا رقبہ اتنا زیادہ ہے پھر یہاں کے وسائل اور ذرائع اتنے تھوڑے عرصہ میں استعمال میں آنے لگے ہیں کہ جرمن سلطنت کی طرح امریکہ پر حملہ کرنا آسان نہیں۔اگر قسمت ایک دن ایسا پانسہ پھینکے کہ قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے امریکہ سے جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ بغیر کسی ساتھی کی مدد سے اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں دیکھتا۔یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اپنا گورا گورا ہاتھ جاپان کی پیلی پیلی قوم کی طرف بڑھا کر دونوں میں حلیفانہ اتحاد کا میلان پیدا کر دیا ہے۔نسلی زاویہ نگاہ سے برطانیہ کا اتحاد ایک نا قابل معافی گناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن سیاسی زاویہ نگاہ سے برطانیہ کی حیثیت کو برقرار رکھنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔آج برطانیہ کو دنیا میں عالم گیر حیثیت حاصل ہے۔لیکن براعظم امریکہ میں جو شدید امکانات پرورش پارہے ہیں ان سے برطانیہ کی اس عالمگیر حیثیت کو خطرہ لاحق ہے۔

اگرچہ یورپ کے میدان جنگ میں برطانیہ اور جاپان پہلو بہ پہلو لڑ چکے ہیں پھر بھی آخر کار برطانیہ نے اس ایشیائی قوم کے ساتھ حلیفانہ اتحاد قائم نہ کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے تمام یہودی اخبارات نے متفق ہو کر جاپان سے اتحاد کی مخالفت شروع کر

دی۔

یہودی نے برطانیہ میں رسوخ پیدا کرلیا ہے

آخر اس معمہ کا حل کیا ہے کہ ۱۹۱۸ء تک جب برطانوی حکومت جرمن سلطنت سے لڑ رہی تھی تو یہودی اخبارات نے برطانوی حکومت کی پالیسی کی پرزور حمایت کی۔ اب برعکس اس کے یہی اخبارات اپنی حکومت سے برگشتہ ہوکر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

جرمنی کو برباد کر دینا' برطانیہ کے مفاد کا تقاضا نہ تھا۔ یہ تو یہودیوں کے مفاد کا تقاضا تھا۔ آج جاپان کی تباہی اگرچہ برطانیہ کے سیاسی مفاد کے مطابق نہیں لیکن اس سے ان یہودیوں کے دوررس منصوبوں کو بڑی تقویت ملنے کی امید ہے۔ جو دنیا بھر میں صیہونی بادشاہت قائم کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ انگلستان اپنی ساری طاقت اس پر صرف کر رہا ہے کہ دنیا میں اپنی عالم گیر حیثیت برقرار رکھے۔ یہودی اپنے جارحانہ منصوبے اس غرض سے تیار کر رہا ہے کہ ''عالم گیر صیہونی بادشاہت'' قائم ہو جائے۔

سٹہ بازی کی منڈیاں

یہودی نے آج نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ یورپ کی ہر سرکار یہودیوں کی آلہ کار بن چکی ہے۔ کہیں تو یہودیوں کے نام نہاد ''مغربی جمہوریت'' کے نام پر رسوخ حاصل کر رکھا ہے۔ اور کہیں روسی بالشوزم کے ذریعہ براہ راست اقتدار کے ہاتھ میں ہے فقط دنیائے قدیم ہی یہودی کے جال میں نہیں پھنسی بلکہ یہودی اپنے پنجے نئی دنیا پر گاڑ چکا ہے۔ مالیاتی مبادلہ کے ذریعہ سٹہ بازی کی منڈیوں پر قبضہ کر کے یہودی امریکہ میں سرمایہ کا نفوذ حاصل کر چکا ہے۔ سال بہ سال امریکہ کے مزدوروں پر یہودیوں کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکہ کی آبادی اس وقت بارہ کروڑ ہے۔ اس آبادی کا بہت تھوڑا حصہ یہودیوں کے اثر سے باہر ہے۔ یہودی اس رپ کچکچاتا ہے کہ امریکہ کی رائے عامہ کا یہ تھوڑا سا حصہ بھی کیوں اس کے اثر سے باہر ہے۔

رائے عامہ کو نہایت چالاکی سے گھر گھار کر اپنے قبضہ میں لانے اور پھر اس رائے

عامہ سے اپنی اغراض پوری کرنے کا کام لینے میں یہودی کو اعلیٰ درجہ کا ملکہ حاصل ہے۔

یہودیوں کے بڑے بڑے لیڈروں کو پختہ یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب تو ریت مقدس کے احکام پورے ہوں گے۔اور یہودی دنیا کی تمام دیگر اقوام کو ہڑپ کر جائیں گے۔

صیہونیت کے عالم گیر غلبہ کا خواب

یہودیوں نے قوموں کی کثیر تعداد کو قوم پرستی سے منحرف کر کے ان کی یہ حالت بنا دی ہے کہ سب ملک اب یہودیوں کی نوآبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن اگر اس حلقہ میں ایک بھی آزاد سرکار قائم ہوگئی تو آخری دم تک اس پورے نظام کا سارا ڈھانچہ مسمار ہو سکتا ہے۔اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ بالشوزم ایک عالم گیر نظام ہونے کا مدعی ہے۔لہٰذا اگر اس عالم گیر نظام کا پوری دنیا پر قبضہ نہ ہو سکے تو بالشوزم کا دعویٰ غلط ثابت ہو جائے گا۔دعویٰ غلط ثابت ہو گیا تو سارا مقدمہ ختم ہو جائے گا۔اگر ایک سرکار بھی ایسی رہ جائے جس کی قومی طاقت محفوظ رہے اور قومی عظمت میں فرق نہ آئے تو یہودی صوبیداروں نے جو سلطنت بنائی ہوگی اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔قوم پرستی کا تخیل صیہونیت کے عالم گیر غلبہ کا خواب، ظلم و ستم کی دیگر داستانوں کی طرح پریشان کر کے رکھ دے گا۔

یہودیوں کو ہزارہا سال سے یہ تجربہ حاصل ہے کہ جیسی صورت حال ہو وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔اس تجربے کے باعث یہودیوں کو خوب علم ہے کہ نسلی اختلاط کے ذریعہ وہ اقوام عالم کی جڑیں کھوکھلی کر سکتے ہیں۔لیکن کسی ایشیائی سرکار مثلاً جاپان کے خلاف یہ حربہ کام نہیں دے سکتا۔ یہودی بندر کی طرح جرمنوں، انگریزوں، امریکیوں اور فرانسیسیوں کی نقالی تو کر سکتا ہے لیکن پیلے رنگ والے ایشیاؤں تک پہنچنے کا یہودی کے پاس کوئی بھی ڈھنگ نہیں۔اس لیے یہودی نے تہیہ کر لیا ہے کہ جاپان کی قومی سرکار کو تباہ کرنے کے لیے وہ دوسری قومی سرکاروں کو اپنا آلہ کار بنا لے۔اس طرح

آخری قومی سرکار پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے یہودی کو یہ موقعہ مل جائے گا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ خطرناک حریف کا صفایا کروا سکے۔ پھر جب یہودی کو تمام قومی سرکاروں پر تسلط حاصل ہو جائے گا تو وہ نہتے مظلوموں پر جی بھر کر ستم توڑے گا۔

صیہونیت کی ہزار سالہ ارضی بادشاہت

یہودی جب مستقبل میں اپنی ہزار سالہ ''ارضی بادشاہت'' قائم کرے گا تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت ایک جاپانی قومی سرکار بھی قائم ہو۔ اس لیے وہ اپنی آمریت قائم کرنے سے پہلے ہی اس جاپانی سرکار کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہودی دوسری قوموں کو جاپان کے خلاف اسی طرح اکسا رہا ہے جس طرح اس نے جرمنی کے خلاف دوسری قوموں کو اکسایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی مدبرین تو جاپان سے حلیفانہ اتحاد پر اپنی خارجہ حکمت عملی کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں لیکن برطانیہ اس بہانہ سازی سے کام لیتے ہیں کہ ہم تو ''جمہوریت'' کی فتح چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جاپان کو تباہ کر دینے کے لیے جنگ کی تیاری جاری ہے۔ نعرہ جنگ یہ بلند کیا جا رہا ہے کہ جاپانی عسکریت اور استعماریت مردہ باد۔

غرض آج انگلستان میں یہودی برطانوی سرکار کی حکمت عملی کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس وجہ سے ظاہر ہے کہ وہ دن دور نہیں جب خود برطانیہ بھی یہودیوں کے عالم گیر خطرہ کے خلاف جدوجہد شروع ہو جائے گی۔

یہ پھر ایک ایسا مسئلہ ہے جو قوم پرست اشتراکی تحریک کے لیے ایک عظیم کارنامہ انجام دینے کا موقع پیش کرتا ہے۔

دنیا بھر کے آریاؤ! متحد ہو جاؤ

اور جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کی روشنی میں بیرونی اقوام کے متعلق ہماری قوم کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ ہمیں دوسری قوموں کو بار بار ہوشیار کرنا چاہیے کہ آج وہ کون سا اصل دشمن ہے جس سے ساری دنیا کو خطرہ لاحق ہے۔ ہمیں آریوں کے خلاف نفرت

کی تبلیغ نہ کرنی چاہیے۔ آریائی اقوام سے اور ہر مسئلہ میں ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اور ہماری رگوں میں ایک ہی خون بہتا ہے۔ ہماری اور ان کی تہذیب وتمدن کی بنیادیں ایک ہیں۔ ہم سب کو مل کر اس سیاہ نیت دشمن کے خلاف عام جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ جو انسانیت کا حقیقی دشمن ہے۔ آج انسانیت کو جو بھی مصیبت لاحق ہے۔ اس کا حقیقی سبب یہودی ہے۔

قوم پرست اشتراکی تحریک کا یہ فرض ہے کہ کم از کم ہمارے ملک میں ہماری جان کے اصل دشمن کی شناخت میں کوئی مغالطہ نہ رہے۔ پھر اس دشمن کے خلاف جدوجہد میں آگ کے ایسے شعلے بلند کیے جائیں جو روشنی کے مینار کا کام دیں۔ ایسی روشنی میں اس منزل کی جانب رہنمائی کی جا سکے گی جہاں پہنچ کر ساری قوموں کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے گی۔ یہی منزل آریاؤں کی نجات کی منزل ہے۔ اسی جدوجہد کے ذریعہ وہ اپنی بقا کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔

میں آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عقل کو اپنا رہنما بناؤ۔ عزم بالجزم کو اپنا توشہ ہمت سمجھو۔ ہم جس مقدس جہاد کی خاطر اس سفر پر گامزن ہوئے ہیں اس کی پاکیزگی ہمیں استقامت اور صبر کی توفیق دے۔ یاد رکھو کہ ایمان کی پختگی سے بہتر تمہاری حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

☆☆☆

باب چہاردہم :: مشرقی یورپ میں جرمن حکمت عملی کا خاکہ

روس کے متعلق جرمنی کیا پالیسی اختیار کرے گا؟ میں اس مسئلہ کا خاص طور پر تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس خاص توجہ کی رو وجوہات ہیں:

ا۔ روس کے متعلق جرمنی کی پالیسی ایک ایسا مسئلہ ہے جو جرمنی کی خارجہ پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈالے گا۔

۲۔ اس ضمن میں جو مسائل حل کرنے ہوں وہ گویا ایک کسوٹی ہیں، جن پر نوزائیدہ قوم پرست اشتراکی تحریک کی قوت فکر وعمل کو پرکھا جا سکتا ہے۔

تعصب اور جہالت سے آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے

مجھے اعتراف ہے کہ جب کبھی میں دوسری اس وجہ پر غور کرتا ہوں تو اس سے مجھے بڑی تشویش پیدا ہوتی ہے۔ ہماری تحریک کے اراکین ان عناصر میں سے بھرتی نہیں کیے جاتے جو عادتاً قومی مسائل سے غافل ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ہماری تحریک کے اکثر اراکین انتہا پسند عقائد رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک طبعی امر ہے کہ ہماری تحریک کے اراکین خارجہ حکمت عملی کے مسائل کو ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ایک تو تعصب ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے دوسرے ان مسائل کی پوری واقفیت بھی نہیں۔ یہ تعصب اور جہالت انہیں ان حلقوں سے ورثہ میں ملے ہیں جن میں وہ ہمری تحریک کے اندر جشمولیت سے پہلے داخل تھے۔ جن سیاسی اور اعتقادی حلقوں سے ان کا سابقہ ربط تھا وہاں سے یہ تعصب اور جہالت وہ ساتھ لائے ہیں۔ یہ کمزوری فقط ان لوگوں میں ہی نہیں پائی جاتی جو پہلے کمیونسٹ تھے اور اب ہماری پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔ آج جو لوگ ہماری پارٹی کے رکن بنتے ہیں، اس سے پہلے وہ خارجہ پالیسی کے متعلق کیسی ہی تخریبی تعلیمات کے پیرو کیوں نہ رہ چکے ہوں، لیکن ان کے اندر سلیم الطبع ہونے کا ایک فطری رجحان ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ان کی جبلت ہمیشہ نیک تھی۔ اس لیے

ضرورت فقط یہ ہے کہ پہلے انہیں جو غلط اعتقادات سکھائے گئے تھے۔ ان کی جگہ صحیح اعتقادات کی تعلیم دی جائے۔ صحیح اعتقادات کی تعلیم مل جانے کے بعد ان لوگوں کے اندر طبعی خود حفاظتی کا جو جوہر موجود ہے اور جس طرح ان کی جبلت نیک ہے اسی طرح ان کے افکار اور اعمال بھی مفید نتائج مرتب کریں گے۔

خود جانتے نہیں اور سیکھنے پر آمادہ نہیں

کئی اور لوگ ایسے ہیں جن کو ابتدا میں جو سیاسی تعلیم دی گئی وہ کمیونزم سے کسی طرح کم احمقانہ اور خلاف منطق نہ تھی ان لوگوں کو صحیح سیاسی تعلیم دینا بڑا مشکل ہے۔ ان کے اندر قوم پرستی کا جبلی میلان ختم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ نظریاتی اور سراسر مادی اعتقادات نے لے لی ہے۔ ہمارے دانش ور طبقات کے کسی نمائندہ کو اس بات پر آمادہ کرنا خاص طور پر مشکل ہے کہ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر منطقی اصول کے مطابق غور کرے۔ دیگر اقوام نے اپنی قوم کے تعلقات کا مسئلہ طے کرتے وقت خود اپنا اور اپنی قوم کے مفاد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ ان لوگوں کے دماغ پر تعصبات اور لغویات کا ایسا بوجھ پڑ چکا ہوتا ہے کہ ان کے اندر خود حفاظتی کا طبعی میلان بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے ایسے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے قوم پرست اشتراکی تحریک کو بڑا زور لگانا پڑتا ہے۔ یہ کام اس لیے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک طرف یہ لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہا درجہ کے بر خود غلط ہوتے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے وہ اچھے خاصے سمجھدار لوگوں کو اپنے مقابلہ میں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ یہ مغرور اور چھچھورے لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر یہ استعداد بھی نہیں ہوتی کہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں۔ مسئلہ کا تجزیہ کریں، اور مخالف اور موافق دلائل پر غور کریں حالانکہ مبادیات کے بغیر خارجہ پالیسی کا مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔

بیرونی ممالک سے رشتوں کا نام خارجہ تعلقات ہے

یہی وہ حلقے ہیں کہ جن کے طفیل ہماری خارجہ پالیسی قوم کے حقیقی مفاد کی خدمت

سے منحرف کر کے ایسے ڈگر پر چلائی جا رہی ہے کہ جس کا انجام سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ لوگ جو حرکتیں کر رہے ہیں ان کا مقصد ان کے عجیب وغریب اعتقادات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اندریں حالات میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ پوری محنت اور کوشش سے اپنے رفقائے کار کے سامنے جرمنی کی خارجہ پالیسی کے سب سے اہم مسئلہ کی وضاحت کر دوں۔ وہ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جرمنی کے روس سے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کر دوں جسے عام طور پر سمجھا جا سکے۔ البتہ یہ وضاحت اس حد تک مختصر ہو گی جتنا کہ اس کتاب کی ضخامت اور حجم کا تقاضا ہے۔ سب سے پہلے حسب ذیل بنیادی اصول پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جب ہم خارجہ تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ خارجہ تعلقات سے مراد حکمرانی کا وہ شعبہ ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیرونی دنیا سے کسی قوم کے تعلقات کا تعین کیا جائے۔ کسی قوم کے خارجہ تعلقات جن اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں، وہ ہمیشہ خاص حالات پر منحصر ہوتے ہیں۔ ہم قوم پرست اشتراکی یا سمجھتے ہیں کہ ایک قومی سرکار کے خارجہ تعلقات مندرجہ ذیل طریقے سے قائم کرنے چاہئیں۔

قوم کی تعداد ملک کے رقبہ میں توازن ہونا چاہیے

ایک قومی سرکار کی خارجہ حکمت عملی کا سب سے پہلا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جس نسل کی سرکار ترجمان ہے اس کے تحفظ اور بقا کا اہتمام کیا جائے۔ کسی نسل کے تحفظ و بقا کا اہتمام تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ اس نسل کی موجودہ آبادی اور آبادی میں ترقی کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا رقبہ بطور وطن مہیا کر دیا جائے جس کی وسعت اور پیداوار اور ذرائع اس نسل کی ضروریات کے لیے کافی ہوں۔ آبادی اور رقبہ میں تناسب ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے قوم کی موٹی موٹی ضروریات پوری ہو سکیں۔

قوم اور رقبہ کا باہمی تناسب متوازن تب کہلائے گا جب وطنی رقبہ کی اتنی پیداوار اور

وسائل ہوں کہ وہاں کی زرعی پیداوار معدنی پیداوار قوم کی تمام ضروریات پوری کر سکیں۔ اگر وطن کا رقبہ اس ضرورت سے کم ہے تو چاہے یہ صورت حال صدیوں تک برقرار رہے بلکہ ہزار ہا سال تک برقرار رہے ہم اقتدار اور پیداوار کے اس تناسب کو متوازن نہیں کہہ سکتے۔ رقبہ کی کمی زود یا بدیر ضرور قوم کے زوال یا تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔

جب تک اس کرہ ارض کا مطلوبہ رقبہ حاصل نہ ہو کسی قوم کی حریت اور تحفظ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

زرعی ضروریات کے علاوہ عسکری ضروریات کے لیے بھی رقبہ درکار ہوتا ہے

قومی آبادی کی آباد کاری کے لیے جو رقبہ درکار ہے اس کا اندازہ صرف موجودہ ضروریات ک بنا پر لگانا ٹھیک نہیں۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے کہ رقبے کی زرعی پیداوار جتنی آبادی کو مکتفی ہو سکتی ہے۔ صرف اس کو مدنظر رکھا جائے۔ اس کتاب کی جلد اول میں "پہلی جنگ عظیم" سے قبل جرمنی کی خارجہ پالیسی کے عنوان سے میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ کسی سرکار کا رقبہ صرف قوم کو خوراک اور خام اجناس مہیا کرنے کے لیے درکار نہیں ہوتا بلکہ سیاسی اور عسکری ضروریات کے لیے بھی علاقہ درکار ہوتا ہے کسی قوم کی سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہو گی کہ اتنا بڑا رقبہ فراہم کیا جائے جس سے وطن کے علاقے کی حفاظت اور دفاع میں مدد ملے۔ قومی تحفظ کا انحصار کسی سرکار کی قوت پر ہے۔ ایک سرکار کی طاقت کا انحصار اس کے عسکری امکانات پر ہوتا ہے۔ عسکری امکانات جغرافیائی محل وقوع اور علاقہ کے رقبہ کی مقدار پر منحصر ہوتے ہیں۔

ہم جرمنی کی دنیا کی عظیم سرکار بنانا چاہتے ہیں

جرمن قوم کا مستقبل تبھی محفوظ ہو سکتا ہے جب کہ جرمنی دنیا کی ایک زبردست سرکار بن جائے۔ دو ہزار سال سے جرمنی اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لیے جو کوششیں کرتا آیا ہے ان کا شمار تاریخ عالم کے اہم واقعات میں ہوتا ہے۔ جرمنی کو کبھی اپنے خارجہ

سیاسیات میں کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی' لیکن بہر حال اس کا اثر ہر دو صورتوں میں دنیا کی تاریخ پر پڑتا رہا۔ ہم نے خود یہ دیکھا کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک ہم نے جس جناتی جدوجہد میں حصہ لیا' اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا میں جرمن قوم کی بقا کے لیے کوشش کی جائے۔ باوجود اس کے یہ کوشش اس انداز سے کی گئی کہ تاریخ میں اس کا نام دنیا کی پہلی جنگ عظیم مشہور ہو گیا۔

جب جرمنی نے اس جنگ مین حصہ لیا تو اس وقت یہ فرض کر لیا گیا کہ جرمنی دنیا کی زبردست سرکاروں میں شامل ہے۔ میں کہتا ہوں فرض کر لیا گیا تھا کیونکہ دراصل جرمنی اس وقت ابھی دنیا کی عظیم طاقت بننے نہ پایا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن آبادی اور جرمن علاقہ کے رقبہ میں جو تناسب تھا وہ جرمنی کو ایک عظیم سرکار کہلانے کے مستحق نہ بناتا تھا۔ اگر یہ رقبہ کافی ہوتا تو پھر جرمنی دنیا کی زبردست سرکاروں میں شمار ہونے کا مستحق ہوتا۔ اگر رقبہ کاری ہوتا تو دیگر امور سے قطع نظر کہا جا سکتا ہے کہ ہم جنگ جیت لیتے۔

یہاں اس بحث میں پڑنا تو میرا مقصد نہیں کہ اگر بعض شرائط پوری ہو جاتیں تو کیا ہوتا۔ لیکن یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ موجودہ صورت حال درحقیقت کیا معنی رکھتی ہے۔ اگر موجودہ صورت حال ایسی ہے جو جرمن کو کمزور رکھنے کا باعث ہے تو ہمیں بلاتوقف اس کا انکشاف کر دینا چاہیے۔ اس انکشاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کم از کم قوم پرست اشترا کی تحریک کو اس امر میں مغالطہ نہ رہے گا کہ جرمنی کی کمزوری کس سبب سے ہے۔ اور اس کا کیا حل ہے۔

سرکار کی عظمت ملکی رقبہ کی وسعت سے متعلق ہوتی ہے

آج جرمنی ہرگز دنیا کی عظیم سرکاروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔ اگر جرمنی کی موجودہ عسکری کمزوری دور ہو جائے تب بھی جرمنی دنیا کی عظیم سرکار کہلانے کا مستحق نہ ہو گا۔ موجودہ جرمن سلطنت کی آبادی کے مقابلہ میں اس کا رقبہ اتنا تھوڑا ہے کہ جرمنی ہرگز دنیا کی عظیم سرکار کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ آج وہ زمانہ ہے کہ دنیا کی سرکاریں ساری دنیا

کے حصے بخرے کر رہی ہیں۔ بعض سرکاروں کا رقبہ پہلے ہی اتنا زیادہ ہے کہ قریب قریب ایک پورے براعظم پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں اس سرکار کو کیوں بڑی سرکار کہا جا سکتا ہے۔ جس کا وطنی رقبہ بمشکل پانچ لاکھ مربع کلومیٹر ہو۔

اگر محض رقبہ اراضی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جرمن سلطنت کا علاقہ دنیا کی عظیم سرکاروں کے مقابلہ میں بالکل حقیر نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں انگلستان کی نظیر میرے قول کی تردید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ انگلستان کا وطنی رقبہ درحقیقت برطانوی عالم گیر سلطنت کے دارالحکومت کا رقبہ ہے۔ برطانوی سلطنت دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر پھیلی ہوئی ہے برطانیہ کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ، روس اور چین دنیا کی عظیم الجثہ سرکاروں میں شامل ہیں۔ ان حکومتوں کا رقبہ وسیع علاقوں پر پھیلا ہوا ہے۔ بسا اوقات ان کا علاقہ موجودہ جرمن سلطنت کے علاقہ سے دس گنا رقبہ سے بھی زیادہ ہے۔ فرانس کو بھی انہیں عظیم الجثہ سرکاروں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ اول تو فرانس اپنی وسیع سلطنت سے کالے سپاہی بھرتی کر کے مسلسل اپنی فوج بڑھا رہا ہے۔ دوسرے فرانس نسلی لحاظ سے بھی ایک دوغلی قوم بنتا جا رہا ہے۔ فرانس اب ایک افریقی سرکار ہے۔ جس کا رقبہ یورپ میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ فرانس نے آج کل نوآبادیات کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کا مقابلہ ماضی میں جرمنی کی اس پالیسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ جو جرمنی نے اپنی نوآبادیات کے متعلق اختیار کی تھی۔ فرانس نے آج کل جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اگر وہ اس پالیسی پر قائم رہا۔ اور یہ پالیسی آئندہ تین سو سال تک قائم رہی تو فرانس کی پہی نسل کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ اس کی جگہ ایک افریقیوں اور یورپیوں کی نئی مخلوط نسل پیدا ہو جائے گی۔ جو فرانس کی سرکار پر قابض ہو گی۔ ایسا ہو گیا تو یہ ایک زبردست اور متحد نوآبادیاتی رقبہ ہو گا۔ جو دریائے رائن سے لے کر دریائے کانو تک پھیلا ہو گا۔ یہاں ایک پست نسل آباد ہو گی۔ یہ پست نسل آہستہ آہستہ اس نسلی اختلاط سے پیدا ہو گی جو فرانس اور اس کے افریقی مقبوضات کے مابین جاری ہے۔

اس طرز عمل کی نوعیت فرانس کی نوآبادیات کے متعلق پالیسی کو ماضی میں جرمنی کی نوآبادیات کے متعلق پالیسی سے جدا کرتی ہے۔

جرمنی آج دنیا کی عظیم طاقت نہیں

جرمنی کی گزشتہ نوآبادیاتی پالیسی اسی طرح سے ادھوری تھی جیسے کہ اس زمانہ میں پرانی جرمن سرکار کی ہر بات ادھوری تھی۔ وہ نہ تو کسی علاقہ کو جرمن قوم کی آبادکاری کے لیے صاف کرتے تھے۔ نہ ہی کالی فوج بھرتی کر کے جرمن سلطنت کی طاقت میں اضافہ کرتے تھے۔ اگر جرمنی کالی فوج بھرتی کرتا تو یہ ایک ایسی مجرمانہ پالیسی ہوتی۔ مشرقی افریقہ میں جرمنی کے ماتحت جو مقامی عسکری بھرتی کیے جاتے تھے ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی پھر یہ عساکر بھرتی کرنے کی پالیسی بھی مذبذب تھی۔ دراصل یہ مقامی لشکر صرف نوآبادیات کے مقامی تحفظ کی خاطر بھرتی کیے جاتے تھے۔ کالی فوجیں بھرتی کر کے انہیں یورپ میں استعمال کرنے کا خیال کبھی جرمنی میں پیدا نہ ہوا تھا۔ پھر پہلی جنگ عظیم میں اس تجویز پر عمل کرنا جرمنی کے لیے ناممکن بھی تھا۔ برعکس اس کے فرانس کی نوآبادیات کے متعلق تمام سرگرمی کا محور یہی منصوبہ تھا کہ کالی فوجیں بھرتی کر کے انہیں یورپ میں استعمال کیا جائے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا میں کئی ایسی سرکاریں ہیں جن کی نہ صرف آبادی کی تعداد جرمنی سے زیادہ ہے بلکہ ان کی سیاسی قوت کا انحصار جس علاقائی رقبہ پر ہے وہ بھی جرمن سے بڑا ہے۔ جرمن سلطنت کے وطنی رقبہ کے مقابلہ میں اس کی آبادی زیادہ ہے ۔ رقبے اور آبادی کے تناسب میں یہ عدم توازن جرمنی کی تاریخ میں دو مراحل پر خاص طور پر نمایاں اور مضر ثابت ہوا ہے۔ پہلا موقع تو آج سے دو ہزار سال پہلے پیش آیا تھا۔ اور دوسرا مرحلہ آج درپیش ہے۔ دونوں موقعوں پر یہ عدم توازن دنیا کی دوسری زبردست سرکاروں کے مقابلہ میں جرمنی کی حیثیت کو کمزور کرنے کا سبب ثابت ہوا ہے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے جرمن ایک نوجوان قوم تھے۔ اس وقت کی دنیا بڑی

سرکاروں پر مشتمل تھی۔ جو رو بہ زوال تھیں۔ ان بڑی سرکاروں میں سے آخری سرکار رومتہ الکبریٰ کی دیوزاد سلطنت تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی تباہی میں جرمنی نے بھی مدد دی۔ آج پھر جرمنی اپنے آپ کو بڑی بڑی سرکاروں کی دنیا میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان بڑی بڑی سرکاروں کے مقابلہ میں جرمنی کی اہمیت روز بروز جا رہی ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس کا سامنا ہمیں ٹھنڈے دل اور سلجھے ہوئے ذہن سے کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ جرمن سلطنت کے رقبہ اور آبادی کا مقابلہ دنیا کی دوسری سرکاروں سے کریں۔ پھر اس تقابل کا مطالعہ گزشتہ صدیوں تک پھیلائیں۔ جب ہم ایسا کر چکیں گے تو میں جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ہم پر واضح ہو جائے گا کہ جرمنی کی فوجی طاقت زیادہ ہو یا تھوڑی لیکن جرمنی دنیا کی بڑی بڑی سرکاروں میں ہرگز شامل نہیں۔

رقبہ کی تنگی تمام خرابیوں کی جڑ ہے

دنیا بھر کی دیگر سرکاروں کی جرمنی کی حیثیت سے بالکل مختلف ہے۔ جرمنی کی آبادی اور رقبہ میں یہ توازن اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ہماری خارجی پالیسی نے کبھی جان بوجھ کر یہ منصوبہ اپنے سامنے نہ رکھا کہ ہمیں مزید علاقہ حاصل کرنا ہے۔ جرمنی اپنی حفاظت آپ کرنے کے جبلی احساس سے محروم ہو گیا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل کا مورخ جب جرمنی کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو قوم پرست اشترا کی تحریک کو اس فضیلت کا مستحق قرار دے کہ اس تحریک نے قومی خدمت کے مقدس فریضے کا حق خوب ادا کیا ہے تو ہمیں سب سے پہلے اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنا ہوگا کہ باقی دنیا کے مقابلے میں جرمنی کی حیثیت کیا ہے۔ اگر دنیا کے مقابلے میں جرمنی کی حیثیت کا احساس کرنے سے ہمیں دکھ ہوتا ہے تو بھی اس سے مفر نہیں۔ ہمیں یہ احساس کرنا چاہیے کہ پھر اس احساس سے اپنے اندر ہمت اور دلیری پیدا کرنا چاہیے۔ پہلے ہمیں حقیقت حال کا احساس کرنا ہوگا۔ جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا تب ہی ہم اس نا اہلیت اور فقدان منزل کا مقابلہ کر سکیں گے جو خارجہ حکمت عملی طے کرتے وقت

ہماری قومی کوششوں کا طغرائے امتیاز رہی ہے ۔ ہمیں اس بات کی پرواہ نہ کرنی چاہیے کہ خارجہ حکمت عملی کے متعلق جرمنی کی ''روایات'' ہمیں اس بات کی پروہ نہ کرنی چاہیے کہ خارجہ حکمت عملی کے متعلق جرمنی کی ''روایات'' کیا ہیں ہمیں خارجہ پالیسی کو پہلے سے تصور کیے ہوئے اپنے تخیل کے کسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ ہماری تحریک میں یہ جرات ہونی چاہیے کہ ہم قوم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک ایسے راستے پر ڈال دیں جس پر چل کر جرمنی اپنے رقبہ کی توسیع کر سکے ۔ آج جرمنی کے رقبہ کی تنگی ہی ہماری قومی زندگی کی تمام برائیوں کی جڑ ہے ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جرمنی کے رقبہ کی توسیع کریں ۔ یہ ہو گیا تو ہماری تحریک جرمن قوم کو ہلاکت کے خطرہ سے بچا لے گی ۔ یہ نہ ہوا تو ہلاکت کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ ہماری قوم کسی دوسری قوم کی غلام نہ بنا لی جائے ۔

اعلیٰ نسل کے حیوان ہی نہیں صحیح النسب انسان بھی درکار ہیں

آج ہماری قومی آبادی اور ہمارے وطنی رقبہ کا باہمی توازن ٹھیک نہیں ۔ یہ عدم توازن ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے ۔ ہماری تحریک کا فرض ہے کہ اس عدم توازن کو دور کرے وطن کا رقبہ قوم کی بقا کے لیے خوراک اور رہائش مہیا کرنے والے کے واسطے بھی درکار ہوتا ہے' اور قوم کی سیاسی طاقت کا انحصار بھی وطن کے علاقہ کی وسعت پر ہوتا ہے ۔ جرمنی کی گزشتہ تاریخ اور جرمنی کی موجودہ بیچارگی میں کوئی مطابقت نہیں ہمارا فرض ہے کہ اس تفاوت کو رفع کریں ۔ اپنی اس کوشش کے دوران میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم بنی نوع انسان کے بہترین نمونہ ہیں ۔ چونکہ ہم برگزیدہ ترین امت ہیں ۔ اس لیے ہمارے کندھوں پر فرائض کا بوجھ بھی بھاری ہے ۔ ہم یہ فرائض بھی تبھی ادا کر سکتے ہیں جب جرمن قوم نسلی عقیدہ سے سرشار ہو جاتی ہے ۔ جب جرمن قوم نسلی عقیدہ کی معتقد ہو جائے گی تو ہم صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور کتے اور بلیاں پالنے کی فکر نہ کریں گے بلکہ خود اپنی امت کا خون پاک رکھنے کا اہتمام بھی اپنا فرض خیال کریں گے ۔

کسی سرکار کی طاقت کا اندازہ دوسری سرکاروں کے مقابلہ سے ہی کیا جاسکتا ہے

میرا دعویٰ ہے کہ آج تک جرمنی نے جو خارجہ حکمت عملی اختیار کی اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ بے سود ثابت ہوئی۔ میرے اس دعویٰ کا ثبوت اس خارجہ حکمت عملی کی ناکامی کی صورت میں موجود ہے اگر ہماری قوم ذہنی لحاظ سے پسماندہ ہوتی یا جرات اور ہمت سے عاری ہوتی تو اس صورت میں بھی ہماری کوششوں کے نتائج اس سے بدتر نہ ہو سکتے تھے۔ جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے دس بیس یا تیس سال پہلے جو واقعات درپیش آئے وہ اس موضوع پر ہماری ہر قسم کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کسی سرکار کی طاقت کا اندازہ محض اس سرکار کی حالت کو سامنے رکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ ایسے اندازے کے لے اس سرکار کی حالت کا مقابلہ دوسری سرکاروں سے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جب جرمنی کی حالت کا مقابلہ دوسری سرکاروں سے کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دوسری سرکاروں نے اپنی طاقت اتنی بڑھا لی کہ نہ صرف انہوں نے جرمنی کی یورش کو روک لیا۔ بالآخر جرمنی پر غالب آ گئیں۔ جرمنی کی کمزوری مدت تک عیاں نہ تھی جرمنی دوسری سرکاروں کے مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گیا۔ افسوس آج ہماری آبادی بھی دوسری سرکاروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ہم اس دور میں بھی روز بروز پیچھے رہتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری قوم کی شجاعت کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی۔ ہماری قوم نے اپنے دفاع کی خاطر اپنا خون بہایا ہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم نے نہیں بہایا۔ اگر باوجود اس قربانی کے ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ ہم نے اپنی اس شجاعت کے استعمال کے لیے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔

ایک ہزار سال کی تاریخ کا نچوڑ

اس ضمن میں اگر ان سیاسی انقلابات کا مطالعہ کیا جائے جن سے گزشتہ ہزار سال میں یا اس سے زائد کچھ عرصہ میں ہماری قوم کو واسطہ پڑا ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے

کہ ہم نے خون کی ندیاں نہیں بلکہ خون کے سمندر بہائے ہیں ان سے صرف تین ٹھوس نتائج ایسے برآمد ہوئے ہیں جنہیں سیاسی کش مکش کا ماحصل سمجھنا چاہیے۔ یہ سیاسی کشمشک ہماری خارجہ حکمت عملی کا لب لباب کہی جا سکتی ہے۔ سوچنا چاہیے کہ ہم نے اس ایک ہزار سال میں کتنی جدوجہد کی کتنی جنگیں لڑیں اور پھر ان سب کے جو نتائج ہمارے سامنے ہیں ان کا بھی جائزہ لینا چاہیے مذکورہ بالا تین نتائج یہ ہیں:

۱۔ پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ جرمنی کی مشرقی سرحد پر جرمنوں کی نوآبادیات کی گئیں تھیں' وہ مستقل شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہ کارنامہ باوٴداری نے انجام دیا تھا۔

۲۔ دریائے ایلبے کے مشرق میں علاقے کا فتح کیا جانا' اور وہاں پر جرمنوں کی آباد کاری ہونا دوسرا کارنامہ تھا۔

۳۔ برانڈنزبرگ اور پرشیا کی جو مشترکہ سرکار قائم کیگئی وہ تیسرا کارنامہ تھا۔ یہ کام ہوہینزولون بادشاہوں کے خانوادہ نے انجام دیا۔ یہ سرکار بعد میں جرمن سلطنت کے قیام کے لیے نمونہ ثابت ہوئی۔

یہ تینوں نتائج اپنے اندر مستقبل کے لیے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ رکھتے ہیں۔

ہمیں اپنی قوم کی تاریخ کا صحیح علم نہیں

پچھلے دو نتائج ہماری خارجہ پالیسی کے دو عظیم ترین کارنامے ہیں اور یہی دونوں سب سے زیادہ پائیدار بھی ثابت ہوئے۔ اگر یہ دونوں کارنامے انجام نہ دیے جاتے تو ہماری قوم آج دنیا میں کسی حیثیت کی مالک نہ ہوتی۔ یہ کارنامے وہ پہلی کوشش تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی اور جس رقبے سے یہ آبادی اپنا رزق حاصل کرتی ہے ان دونوں کے مابین ایک توازن قائم کیا جائے۔ یہ دونوں کوششیں کامیاب ہوئیں لیکن بدقسمتی سے اس ضمن میں مزید کوئی کوشش نہ کی گئی۔ جرمن مورخین نے ان دونوں اہم واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی ان کی صحیح اہمیت کا پورا احساس نہیں کیا حالانکہ یہ دونوں واقعات آنے والی نسلوں کے لیے زبردست اہمیت رکھتے تھے۔ جرمن مورخین کی

یہ فروگزاشت ایک مہلک حقیقت کا آئینہ دار ہے۔وہ مہلک حقیقت یہ ہے کہ ہم جرمنوں کو اپنی تاریخ کے اہم ترین مراحل کی صحیح اہمیت کا احساس ہی نہیں۔اس کے برعکس یہی مورخین دیگر کئی واقعات کے متعلق قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں مثال کے طور پر تہور کی حد کی پہنچی ہوئی شجاعت لاتعداد ایسے واقعات جن میں محض دلیری اور ہنگامہ خیزی کا اظہار کیا گیا ہے کئی جنگیں وغیرہ وغیرہ۔ان مورخین کو یہ احساس نہ تھا کہ ان جنگوں کا ہماری قوم کی اصلی ترقی اور نشوونما پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ہر شخص اپنی حفاظت کرے، یا ملت سب کی حفاظت کرے

جرمنوں کی سیاسی سرگرمیوں کا تیسرا ثمرہ یہ تھا کہ ہم نے پرشین سرکار قائم کر لی۔یہ سلطنت سرکار کے ایک اچھوتے تخیل پر تعمیر ہوئی تھی۔جوں جوں یہ تخیل پروان چڑھا توں توں ہماری قوم میں اپنے تحفظ کا شعور بیدار ہو گیا اور اس شعور نے جرمن فوج کے ذریعے ملت کے دفاع کے لیے جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔یہ ایک ایسا کارنامہ تھا کہ جو موجودہ دنیا کے حالات کے عین مطابق تھا۔خود حفاظتی کا پرانا تصور یہ تھا کہ ہر شخص خود اپنا بچاؤ کرتا ہے اب اس تصور میں یہ ارتقاء ہوا کہ ملت اجتماعی طور پر اپنا تحفظ کرتی ہے۔خود حفاظتی کے تخیل کا یہ ارتقاء سراسر پرشین سرکار کا مرہون منت تھا۔پرشین سرکار نے سرکار کے اس نئے تخیل کو جنم دیا۔جرمن قوم حد سے بڑھی ہوئی فرد پرستی کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔پرشین فوج کی تنظیم سے اب یہ قوم ایک نضبط ار منظم شکل اختیار کر گئی۔یوں ملت المانیہ میں ایک قوم کی شکل اختیار کرنے کی استعداد کسی حد تک پیدا ہو گئی۔دوسری قومیں شروع ہی سے اجتماعیت کے جبلی احساس کے باعث وجود میں آئی تھیں۔برعکس اس کے جرمنوں کی فرد پرستی نے انہیں اس احساس سے عاری کر رکھا تھا۔اب عسکری تربیت سے جرمنوں میں بھی اجتماعیت کا احساس پیدا ہو گیا۔اور وہ افراد ے ایک گروہ کی بجائے قوم بن گئے۔یہی وجہ ہے کہ جبری قوم عسکری تربیت اگر دوسری قومیں ترک کر دیں تو شاید ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہو لیکن جرمن قوم جبری عسکری تربیت

ترک کر دے تو موجب ہلاکت ہوگا۔اگر جرمنوں کی دس پشتوں کو جبری عسکری تربیت کے تعلیمی اور اخلاقی اثرات سے محروم کر دیا جائے اور جرمنوں کے خون میں انتشار اور باہمی اختلاف کے جراثیم موجود ہیں انہیں پنپنے کا موقع دیا جائے تو نتیجہ ی ہو گا کہ جرمنوں کا تصور کائنات ایک نہ رہے گا۔دس نسلوں کے بعد ہماری قوم کے اندر کوئی ایسی خصلت باقی نہ رہے گی جس کے بل پر وہ بطور ایک آزاد قوم کے زندگی بسر کرسکیں۔

قربانی کرنے اور قربانی کا پھل کھانے میں فرق ہے

اگر یہ نوبت آ گئی تو اس کے بعد جرمنوں کی استعداد کبھی تہذیب وتمدن کے میدان میں جوہر نہ دکھا سکے گی۔جرمنوں کے لیے تہذیب وتمدن کی خدمت کرنے کا موقع اس کے بعد صرف یہ رہ جائے گا کہ غیر اقوام کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہوئے فقط شخصی حیثیت سے کوءتمدنی کارنامہ انجام دے سکیں۔ایسے انفرادی تمدنی کارنامے بھ ہمیشہ گمنام رہیں گے۔گویا تمدن کی کھیتی میں اہل جرمنی خالی کھاد کے طور پر استعمال کیے جائیں گے۔رفتہ رفتہ شمالی آریاؤں کی بقیہ نسل کا خون بھی نسلی آمیزش سے ناپاک ہو جائے گا۔اس سے شمالی آریاؤں کی نسل ہی مٹ جائے گی۔

کیسے تعجب کی بات ہے کہ گزشتہ ہزار سال کی جدوجہد میں ہماری قوم نے جو حقیقی سیاسی کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کا صحیح اندازہ ہمیں نہیں لیکن ہمارے مخالفین ان سے خوب آگاہ ہیں۔اج بھی ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس دور شجاعت کی مدح سرائی کرتے ہوئے وجد میں آتے ہیں،جس کا نتیجہ صرف ہی نکلا کہ ہماری قوم کی بہترین نسل کے لاکھوں افراد قربان کر دیے گئے۔بالآخر اس جدوجہد سے کوئی ٹھوس نتیجہ نکلا۔

آج اور آئندہ ہم جو خارجہ حکمت عملی اختیار کریں گے وہ طے کرنے سے پہلے یہ اشد ضروری ہے ک ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہماری قوم کی طویل تاریخ کے دوران ہم نے جو حقیقی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس کے مقابلہ میں جن مواقع پر ہماری قوم کا خون رائیگاں بہایا گیا ان دونوں میں کیسا بنیادی فرق ہے۔

نعرہ بازی کا نام حب الوطنی نہیں

ہم قوم پرست اشتراکی کبھی یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہمارے کھاتے پیتے طبقات نے جس نعرہ بازی کا نام حب الوطنی رکھ چھوڑا ہے۔ ہم بھی اندھا دھند اسی کی تقلید کرنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی جو کچھ کر رہا تھا اس کی بابت اس مغالطہ میں گرفتار ہو جانا کہ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے ہمارے لیے ایک مہلک خطرہ ثابت ہوگا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم ہر قدم اٹھانے سے پہلے گزرے ہوئے زمانہ کی نقالی پر مجبور ہوں گے۔ ہم یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ انیسویں صدی کے تاریخی پس منظر میں جن رجحانات کا آغاز ہوا تھا' ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر بھی ہے۔ انیسویں صدی کے جرمن مدبرین نے جو خارجہ پالیسی اختیار کی تھی ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد جس اصول پر اٹھانی ہے اس کا ذکر میں حال ہی میں اوپر کر چکا ہوں۔ وہ اصول یہ ہے کہ جرمنی کا علاقائی رقبہ اتنا بڑھانا چاہیے' جس سے جرمنی کی آبادی اور جرمنی کے رقبہ میں جو توازن درکار ہے وہ پیدا ہو جائے۔ ماضی کے واقعات سے ہمیں ایک ہی سبق سیکھنا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کا منتہائے نگاہ دوگونہ ہونا چاہیے۔

اول ہمیں جرمنی کے لیے مزید علاقے حاصل کرنا ہیں۔

دوسرے ہمیں اپنے ملک کے اندر اپنی داخلی سیاسی سرگرمیوں میں از سر نو اتفاق اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اس اتحاد اور اتفاق کی بنیاد قومیت کے اس تخیل پر ہوگی جو ہم سے مخصوص ہے اور جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

ظلم کا مقابلہ پر امن رہ کر نہیں کیا جا سکتا

اب میں اختصار سے یہ بیان کروں گا کہ جرمنی کے لیے مزید علاقہ طلب کرنا اخلاقی اور وجوبی پہلوؤں سے کیوں جائز ہے۔ یہ بیان اس لیے بھی اشد ضروری ہے کہ ہمارے نام نہاد قوم پرست حلقوں میں کئی ایسے لوگ شامل ہیں جو بس ایسے نعرے بلند

کرنے میں منہمک رہتے ہیں جن کے الفاظ خوش آئند ہوں۔ یہ لوگ جرمن قوم کو ایک طرف تو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہماری خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ۱۹۱۸ء میں جرمنی پر جو مظالم توڑے گئے اب ان کا تدارک کیا جائے۔ دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ یہی حضرات ساری دنیا کو یہ یقین بھی دلانا چاہتے ہیں کہ جرمن قوم دنیا کی دوسری تمام اقوام سے اخوت اور ہمدردی کے رشتے قائم کرنے کی خواہش مند ہے۔

میں اس نکتہ چینی کے متعلق صرف حسب ذیل تبصرہ کرنا چاہتا ہوں:

یہ مطالبہ ایک سیاسی حماقت ہوگی کہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کی جو سرحدات پہلے تھیں انہیں بحال کر دیا جائے۔ اس سیاسی حماقت کے نتائج ایسے مہلک ہیں کہ اس حماقت کے ارتکاب کا مشورہ دینے والے صریحاً خود مجرم ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن سلطنت کی حدود کسی منطق کی پابند نہ تھیں۔ اول تو یہ حدود اس لحاظ سے مکمل نہ تھیں کہ جرمن نسل کے تمام باشندے ان حدود کے اندر آباد نہ تھے۔ پھر یہ حدود اس لیے بھی خلاف عقل تھیں کہ جنگی دفاع کے موقعہ پر ان حدود کی جغرافیائی حیثیت جرمنی کے حق میں مفید نہ تھی۔ یہ حدود کسی ایسی سیاسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہ تھی جو سوچ سمجھ کر اختیار کی جاتی اور پھر اس پر عمل ہوتا۔ یہ حدود تو محض عارضی سرحدات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ عارضی سرحدات ایک ایسی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھی کہ جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ دراصل یہ سرحدات فقط اتفاقات زمانہ کا نتیجہ تھیں اگر یوں ہی ماضی کی بغیر کسی واضح مقصد کے پرستش کرنی ہے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہوگا کہ بجائے ۱۹۱۴ء کے کوئی دوسرا نمایاں عہد تقلید کی خاطر منتخب کر لیا جائے۔ اس کے بعد یہ مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جرمنی کی خارجہ حکمت عملی کا نصب العین یہ ہے کہ فلاں عہد میں جرمنی کی جو حالت تھی اسے بحال کرنا ہے۔

''قانون جمود'' کے گرفتار

میں نے جن مطالبات کا اوپر ذکر کیا ہے وہ ہمارے کھاتے پیتے فرزندان وطن کے

مزاج کے عین مطابق ہے۔ یہ لوگ ایسے معاملات میں مستقبل کے سیاسی مفاد کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ تو بس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد پر زندہ رہتے ہیں۔ پھر ماضی سے بھی ان کو فقط ماضی قریب کا زمانہ پسند ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کا حافظہ خود ان کے دیکھے ہوئے زمانہ سے زیادہ پیچھے نہیں جا سکتا۔ گویا وہ قانون جمود کے پیرو ہیں۔ اس قانون نے ان کے دماغ میں ڈال دیا ہے کہ جو کچھ ہے بس اسے ویسا ہی قائم رکھنا چاہیے وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ موجودہ حالات میں کوئی تبدیلی کی جائے۔ لیکن ان کی یہ مخالفت بھی کسی عملی جدوجہد کا سبق نہیں دیتی۔ وہ تو بس ایک بے عمل ضد کرنا جانتے ہیں اندریں حالات ہمیں اس سے کوئی تعجب نہیں کہ ان لوگوں کی سیاسی نگاہ ۱۹۱۴ء سے آگے کام نہیں کرتی۔ جب وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انکی سیاسی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کی سرحدات بحال کر دی جائیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ہمارے خلاف لڑنے والے دشمنوں کے اتحاد میں جو تھوڑا بہت خلل رونما ہونے لگتا ہے یہ دعویٰ سن کر رفع ہو جاتا ہے اور ان کی اتحاد بحال ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی حرکتوں کا تو یہ نتیجہ ہے کہ ایک عالم گیر جنگ ختم ہوئے آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اس جنگ میں حصہ لینے والے اتحادیوں کے مقاصد باہم متضاد ہونے کے باوجود ان کا گٹھ جوڑ آج تک ڈھیلا نہیں پڑا۔

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنی چاہیے

جن اتحادی حکومتوں نے مل کر جرمنی کے خلاف جنگ کی تھی جرمنی کی شکست سے ان سب نے فائدہ اٹھایا۔ اب ان کو خطرہ ہے کہ جرمنی کی طاقت کا جو مظاہرہ وہ دیکھ چکے ہیں۔ کہیں پھر سے اس سے سابقہ نہ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑی بڑی حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور دشمنی کے باوجود چپ سادھے بیٹھی ہیں انہوں نے سوچا کہ مستقبل میں جرمنی کی قوت کو ابھرنے سے روکنے کے لیے بہترین ضمانت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اب ان کا گناہگار ضمیر انہیں

بے چین رکھتا ہے کہ وہ آپس کا اتحاد اس لیے ترک نہیں کرتے کہ انہیں ہماری قوم سے ڈر لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اتحاد آج تک قائم ہے۔

اس کے علاوہ خود جرمنی کا طرز عمل ایسا ہے کہ اس سے اتحادیوں کی مزکورہ بالا ئیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ہمارے کھاتے پیتے طبقات ۱۹۱۴ء کی سرحدات کو بحال کرنا جرمنی کے سیاسی پروگرام کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ ہمارے دشمن اتحادی جو شاید بصورت دیگر آپس کا گٹھ جوڑ ترک کر دیتے یہ سنتے ہیں کہ جرمنی ۱۹۱۴ء کی دسرحدات کی بحالی چاہتا ہے۔ تو ان میں سے ہر ایک یہی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ جرمنی مجھ پر دھاوا ہی نہ بول دے۔ لہٰذا ہماری ہر دشمن حکومت یہی سمجھتی ہے کہ اگر اس نے اپنے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایسی حالت میں اسے جرمنی سے لڑنا پڑا تو وہ کسی حلیف کے بغیر اکیلی رہ جائے گی۔ غرض ۱۹۱۴ء کی سرحدات بحال کرنے کی پالیسی سے جرمنی کا ہر دشمن ملک اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کرتا ہے۔ یہی خطرہ سب کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ اب ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات کی بحالی کے پروگرام پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بجائے خود ایک احمقانہ پروگرام ہے۔ میں اس پروگرام کو مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر احمقانہ قرار دیتا ہوں۔

۱۔ اول تو جرمنی کے پاس وہ ذرائع اور وسائل نہیں جن کی مدد سے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا جا سکے۔

گڑگڑانے سے پناہ نہیں ملتی

۲۔ اگر یہ پروگرام کسی طرح کامیاب بھی ہو جائے تو اس کے نتائج ایسے برے ہوں گے کہ خدا بچائے۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات کو بحال کرنے کے لیے ہماری قوم کا خون ایک مرتبہ پھر بہانا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔

اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیے۔ کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات جنگ و جدل کے بغیر بحال ہو سکتی ہیں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ عہد نامہ ورسائی کو فاتحوں کے سامنے گڑگڑانے اور ادھر ادھر کی باتیں بنانے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کا دماغ

ایک نادان بچہ کا سا سادہ لوح دماغ ہے۔اول تو یہ سوچنا چاہیے کہ کسی مفتوحہ **ملک** کے چھنے ہوئے علاقے اسے واپس دلانے کے لیے ٹیلی رینڈ کے پایہ کے اعلیٰ مدبرین کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔آج کل جرمنی میں ایسا کوئی سیاسی مدبر نہیں جسے ٹیلی رینڈ کا ہم پایہ تصور کیا جا سکے۔ہمارے سیاست دانوں میں سے پچاس فی صدی ہوشیار اور بازیگر ہیں۔ان کا کوئی کردار نہیں۔عوام کے جذبات کی ان کی نگاہ میں کوئی قدرو قیمت نہیں بقیہ پچاس فیصدی نیک نیت' بے ضرر' مرنجاں مرنج' احمق اور نااہل لوگ ہیں۔اب وہ زمانہ نہیں جب وائنا کی کانگریس منعقد ہوتی تھی۔آج سلطنتوں کی سرحدات شہزادے اور درباری رنڈیاں آپس میں بحث ومباحثہ اور سودا بازی سے طے نہیں کرتیں۔آج تو یہ مسئلہ سنگدل اور آفاقیت کے مسلک کا حامی یہودی طے کرتا ہے۔یہودی دراصل خود اپنی جنگ لڑنے کی تیاریوں میں منہمک ہے۔اس کی جنگ یہ ہے کہ اسے تمام دنیا کی قوموں پر برتری حاصل ہو جائے۔اگر کوئی قوم یہودی کے جال سے بچ سکتی ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔وہ راستہ تلوار کا استعمال ہے۔جب قوم کے قومی جذات کسی تنظیم کے ماتحت منظم ہو جائیں گے تبھی وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامیت کے خطرے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔یہ بین الاقوامیت کا فلسفہ یہودی نے دیگر اقوام کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔

دنیا کی حقیقی بڑی بڑی حکومتیں چند ہیں

بہر حال جدوجہد متنازع فیہ ہے اور بغیر خون خرابہ کے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

اگر ہمیں ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ جرمنی کے مستقبل سنبھالنے کے لیے قربانی کی حاجت ہے تو ہم سیاسی دوراندیشی کا تماتر دور رکھتے ہوئے' ہمہ تن اس جدوجہد میں حصہ لینے کی تیاری شروع کر دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ جدوجہد جرمنی کی شان کے مطابق ہو۔اور ہمارا **ملک** اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو۔

جرمنی کا مستقبل تعمیر کرنے کے لیے اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ۱۹۱۴ء سے

پہلے کی سرحدات بحال ہوئی ہیں یا نہیں ۔ان سرحدات نے ماضی میں ہمیں حملہ آوروں سے محفوظ نہ رکھا۔مستقبل میں جرمنی کو اپنے بچاؤ کے لیے لڑنا پڑا تو یہ سرحدات ہماری کامیابی کی ضمانت نہیں ہوسکتیں ۔ان سرحدات کے بل پر جرمن قوم ایک یکجا وحدت کی صورت میں زندہ نہیں رہ سکتی ۔ان سرحدات کے بل پر جرمن قوم ایک یکجا وحدت کی صورت میں زندہ نہیں رہ سکی ۔نہ ہی یہ سرحدات اہل جرمنی کو رزق مہیا کرنے کے لیے کافی ہیں۔عسکری زاویہ نگاہ سے ان سرحدات کا کوئی فائدہ نہیں ۔الٹا ان کے باعث ہمیں تشویش لاحق رہے گی۔جب تک جرمنی ان سرحدات کا پابند ہے اہل جرمنی کے لیے اپنی حالت اس طرح سنوارنا ممکن نہیں جس سے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے مقابلے میں جرمنی کی حیثیت بہتر ہو جائے۔دنیا کی حقیقی بڑی بڑی حکومتیں صرف چند ہیں۔ان سرحدات کو قائم رکھتے ہوئے جرمنی اور برطانیہ عظمیٰ کے رقبہ میں جو تفاوت ہے وہ دور نہ ہوگا۔جرمنی کبھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے برابر رقبہ حاصل نہ کر سکے گا۔حتیٰ کہ بین الاقوامی تعلقات میں فرانس کی حیثیت گھٹانے میں بھی جرمنی کو کامیابی نہ ہوگی ۔

جب غیب سے روٹیاں نازل نہیں ہوتیں تو خود کمانا چاہیے

ایک بات تو بالکل یقینی ہے ۔۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات کو بحال کرنے کی کوشش کامیاب بھی ہوگئی تو اس جدوجہد میں ہماری قوم کو اس قدر خون بہانا پڑے گا کہ مستقبل میں قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے کسی موثر اقدام کی سکت باقی نہیں رہے گی ۔ایسی سطحی کامیابی کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہماری قوم اپنی آئندہ ترقی کے منصوبے ترک کردے گی۔ ''قومی وقار'' کے جذبہ کی جھوٹی تسکین ہو جانے کے بعد اور بیرونی بندرگاہوں سے جرمنی کو تجارت کرنے کے حقوق مل جانے پر ہم اسی فریب میں گرفتار ہو جائیں گے کہ اب کسی مزید توسیع اقتدار کی حاجت نہیں۔

اب ان سب خرابیوں کے تدارک کے لیے ہم قوم پرست اشتراکی اپنی خارجہ پالیسی کا جو اصول طے کر چکے ہیں اس پر ڈٹے رہیں گے۔ ہمارا وہ طے شدہ اصول یہ

ہے کہ جرمن قوم کو وہ مزید علاقائی رقبہ ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ جو اس کرہ ارض پر اہل جرمن کا وجود قائم رکھنے کے لئے درکار ہے۔ رب کائنات اور آنے والی نسلوں کی نگاہ میں بھی ہماری قوم کا مزید خون بہانا تبھی جائز ہوگا کہ جب اس کا مقصد جرمنی کے رقبہ میں توسیع ہو۔ قادر مطلق کے حضور میں ہمارا یہ اقدام اس لے جائز متصور ہوگا کہ جب اس نے ہمیں اس دنیا میں اپنا رزق خود کمانے پر مامور کیا ہے اور غیب سے ہم پر روٹیاں نازل نہیں ہوتیں تو پھر ظاہر ہے کہ زمین پر حاکم کی حیثیت میں ہم اپنا مقام صرف اپنی ذہانت اور جرات سے ہی محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ آنے والی جرمن نسلیں ہمارے اس اقدام کو اس لیے جائز سمجھتی ہیں کہ اس جدوجہد میں جا دینے والے ہر شہید کے عوض آنے والی نسلوں کے ہزارہا افراد کی زندگیاں محفوظ ہو جائیں گی آج زمین پر ہل چلانے والوں کی اولاد کا جتنا خون بہایا جائے گا اس کے بدلہ میں ہمیشہ جرمن کسانوں کو یہ موقعہ ملے گا کہ مفتوحہ علاقہ پر ہل چلائیں۔ اور اپنی اولاد کی پرورش کرتے رہیں آج جو حکمران مدبر اس قربان کا حکم دے گا شاید اس کے معاصرین اسے ملزم گردانیں گے۔ لیکن آنے والی نسلیں اس مدبر کو الزام دینے سے بری قرار دیں گی۔ وہ اقرار کریں گی کہ جس مقصد کے لیے قربانی کی طلب کی گئی تھی وہ اس قربانی کا مستحق تھا۔

کسی ملک پر قابض قوم کو خدا سے ٹھیکہ نہیں ملا

یہاں میں پوری شدت کے نام نہاد قوم پرست منشیوں کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا ہوں جو کہتے ہیں کہ جرمنی کے رقبہ میں توسیع کی کوشش ''انسان کے مقدس حقوق'' کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگی۔ اس قسم کے بہانے کھڑے کرنے کے بعد یہ اہل قلم حضرات اپنی انشا پردازی کا زور جرمنی کے رقبہ بڑھانے کی کوششوں کے خلاف صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سرگرمیوں کے پس پردہ جو خفیہ طاقتیں کام کرتی ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ ان حضرات کی حرکتوں سے جو انتشار پیدا ہوتا ہے اس سے ہمارے دشمنوں کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ وہی دشمن

ہیں جو ہماری قوم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ایسی حرکتیں ان سازشوں کی تقویت کا باعث ہوتی ہیں۔یہ منشی صاحبان یہ طرزِ عمل اختیار کرکے قوم کو داخلی طور پر کمزور کرنے کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ہماری قوم اپنی زندگی اور موت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے جو واحد راستہ اختیار کرسکتی ہے ایسی سرگرمیاں ہماری قوم کو اس راستہ سے گمراہ کرتی ہیں قوم کا عزم راسخ متزلزل ہو جاتا ہے۔نتیجہ یہ کہ یہ اہم قومی ضروریات پوری کرنے کا جو طریقہ ممکن ہے اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔دنیا کے کسی بھی حصہ زمین پر کسی قوم کا قبضہ خدا کی جانب سے ٹھیکہ پر نہیں ملتا۔نہ ہی خدا کا منشا یہ ہے کہ یہ قبضہ ہمیشہ رہے۔جرمنی کی موجودہ سرحدات تاریخی حادثات کا نتیجہ ہیں۔یہ سرحدات عارضی ہیں۔مختلف ادوار میں جو سیاسی جدوجہد ہوتی رہی جرمنی کی موجودہ سرحدات اس کا نتیجہ ہیں۔دوسرے ملکوں اور دوسری اقوام کی سرحدات کا بھی یہی حال ہے۔کوئی دیوانہ ہی یہ خیال کرسکتا ہے کہ دنیا کا جغرافیائی نقشہ جیسے اب بن گیا ہے ہمیشہ یونہی قائم رہے گا۔دنیا کا موجودہ جغرافیائی نقشہ درحقیقت تو ارتقائے عالم کی ایک منزل کا آئینہ دار ہے۔ارتقا کا یہ دور فطرت کی زبردست طاقتوں نے پیدا کیا ہے۔عین ممکن ہے کہ کل صبح سے پہلے سے زیادہ زبردست قدرتی طاقتیں دنیا کا موجودہ جغرافیائی نقشہ تباہ کرکے ازسرِنو بدل ڈالیں اسی طرح قوموں کی زندگی میں ان کا وجود قائم رکھنے کے لیے جو سرحدات مقرر ہوتی ہیں وہ بدلتی رہتی ہیں۔

دنیا کی حکومتوں کی سرحدات انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔یہ سرحدات انسان ہی بدل سکتا ہے۔

ملک انعام میں نہیں ملتے فتح کیے جاتے ہیں

اگر کسی قوم نے بہت بڑے علاقائی رقبہ پر قبضہ کرلیا ہے تو یہ کوئی وجہ نہیں کہ اب ہمیشہ اس پر قابض رہے۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ پر قبضہ فاتح قوم کی قوت اور مفتوح قوم کی کمزوری کا ثبوت ہے گویا قبضہ کی بنیاد صرف اس طاقت پر ہے جس

سے قبضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر جرمن قوم ایک چھوٹے سے رقبے میں مقید ہے اور اس قید کے باعث جرمنوں کا مستقبل تاریک ہے تو یہ تقدیر کا حکم نہیں۔ اگر جرمنی اس صورت حال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جرمنی تقدیر کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔ یہ کوئی خدائے برتر کا فیصلہ تو نہیں کہ جرمنی کے علاقہ دوسری قوموں کو زیادہ تر علاقائی رقبہ بنا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی کو کم رقبہ ملنے کے لیے خدائے برتر کی تقسیم کو نا منصفانہ قرار دینا غلط ہو گا۔ جس علاقہ پر ہم آج آباد ہیں یہ بھی آسمان نے ہمارے آباؤاجداد کو انعام کے طور پر نہ دیا تھا۔ اسی طرح مستقبل میں بھی ہماری قوم کو مزید علاقہ فتح کرنا ہوگا۔ تو اس کے ساتھ زندہ رہنے کا سامان بھی میسر آئے گا۔ یہ مزید علاقہ کوئی قوم ہمیں بطور تحفہ نہ دے گی۔ ہمیں بزور شمشیر یہ علاقہ فتح کرنا ہوگا۔

آج ہر جرمن کو پختہ یقین ہو چکا ہے کہ فرانس کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت تبدیل ہونی چاہیے۔ لیکن اگر جرمنی کی خارجہ حکمت عملی فقط اس تبدیلی پر اکتفا کرلے تو ہم اس کو پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جرمنی کو اس کا پورا فائدہ اسی صورت میں ہو گا کہ جب فرانس کے تعلقات استوار کرنے کے بعد جرمنی کی یہ سرحد محفوظ ہو جائے جو فرانس سے متصل ہے۔ ادھر سے بےفکر ہو کر جرمنی اپنے علاقہ پر پوری توجہ دے سکے۔ یہ علاقہ کی توسیع یورپ میں ہونی چاہیے۔ بغیر اس کے جرمن قوم کا وجود محفوظ نہیں ہو سکتا۔ نوآبادیاتی علاقے حاصل کرنے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ تو صرف اسی صورت میں حل ہو گا کہ ہماری قوم کو آباد کرنے کے لیے ایسا علاقہ حاصل کیا جائے جو ہمارے وطن کے رقبہ میں توسیع کر دے۔ یوں نہ صرف نوآباد کار آبادی کا رشتہ وطن سے استوار رہے گا بلکہ یہ وسیع رقبہ یکجا ہونے سے جرمنی کو وہ فوائد بھی حاصل ہو جائیں گے جو وسیع رقبہ پر پھیلنے کے باوجود ایک سیاسی مرکز سے وابستہ رہے بغیر، کسی قوم کو حاصل نہیں ہو سکتے۔

جرمن ام الامم ہیں

قوم پرست اشتراکی تحریک کو دوسری قوموں کی وکالت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں تو اپنی قوم کی حمایت کرنا ہے۔ ورنہ ایسی تحریک کا فائدہ کیا ہے۔ بہر حال گزرے ہوئے زمان کی تباہیوں پر واویلا کرنا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جب کہ ہم خود ماضی کی غلطیاں دہراتے ہیں۔ جرمنی کی پرانی خارجہ حکمت عملی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اسے شاہی خانوادہ کے مفاد محفوظ رکھنے کی نیت سے چلایا جاتا تھا۔ نئی خارجہ حکمت عملی کو اب اس غلطی کا ارتکاب نہ کرنا چاہیے کہ جذبات پرستی کی رو میں بہہ کر اپنی حب الوطنی کو اتنی توسیع دی جائے کہ دنیا کی ہر قوم کا درد جرمنوں ہی کے دل میں بیٹھنے لگے۔ ہم کئی چھوٹی چھوٹی غریب قوموں کے محافظ مقرر ہوئے ہیں؟ ہم تو جرمن قوم کے سپاہی ہیں۔

ہم قوم پرست اشتراکیوں نے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ جب یہ نوبت آئے گی کہ ایک عظیم قوم محض رقبہ کی وجہ سے تباہ ہونے لگے تو اس وقت مزید علاقہ حاصل کرنے کا حق ایک فرض کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خاص طور پر جس قوم کی یہ نازک حالت ہو جائے وہ حبشی نسل کی کوئی چھوٹی موٹی ٹولی نہیں بلکہ وہ ام الامم جرمن قوم ہے جس نے موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیادیں کھڑی کی ہیں' اور جس کے بغیر دنیا سے زندگی کا لطف جاتا رہے گا۔ تو پھر یہ فرض اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ جرمنی یا تو دنیا کی زبردست حکومت بن جائے گا یا صفحہ ہسیت سے اس کا نام مٹ جائے گا۔ دنیا کی زبردست حکومت بننے کے لیے جرمنی کو مزید رقبہ کی حاجت ہے۔ مزید رقبہ ملنے سے ہی جرمنی کو موجودہ زمانہ میں اہمیت حاصل ہو گی۔ اور آئندہ کے لیے جرمن شہریوں کے رزق فراہم کرنے کا اہتمام ہو گا۔

تقدیر کا اشارہ ہے کہ ہم روسیوں پر حملہ کریں

لہٰذا ہم قوم پرست اشتراکیوں نے جان بوجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ جن سے پہلے جرمن خارجہ حکمت عملی نے جو راستہ اختیار کیا ہے ہم اس راستہ پر نہ چلیں گے۔ جرمنی نے ہمیشہ سے جنوبی یورپ اور مغربی یورپ کی طرف بڑھنے کی جو کوشش کی ہے ہم یہ کوشش

ترک کر دیں گے۔اس کے بجائے ہم یورپ کے مشرق میں بڑھنے کی جدوجہد کریں گے۔ہم پہلی جنگ عظیم سے قبل کی نوآبادیات قائم کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کی پالیسی ترک کر کے آئندہ مزید رقبہ حاصل کرنے کی پالیسی پر کاربند رہیں گے۔

لیکن جب ہم آج کل یورپ میں مزید رقبہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو زیادہ تر روس اور اس کی سرحدی ماتحت ریاستوں پر ہی ہماری نظر پڑنی چاہیے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود تقدیر ہمیں اس جانب بڑھنے کا اشارہ کر رہی ہے۔قدرت نے روس کو بالشوزم کے حوالہ کر کے اس روسی دانشور طبقہ سے محروم کر دیا ہے جس نے کبھ روسی سرکار کو تخلیق کیا تھا۔یہ دانشور طبقہ ہی روسی سرکار کی بقاء کی ضمانت تھا۔جروسی سرکار کا قیام روس کی سقلابی نسل کی کارگزاری کا نتیجہ نہ تھا نہ اس میں سقالابی نسل کی سیاسی تعمیری استعداد کو دخل تھا۔دراصل روس کی سرکار کا قیام بھی جرمن نسل کے تعمیری کارناموں کی ایک مثال تھا۔جرمنوں میں قیام حکومت کی وہ طبعی استعداد موجود ہے کہ جب وہ کسی ادنیٰ نسل کے گھر جا کر آباد ہوتے ہیں تو وہاں بھی ایک سرکار کا قیام عمل میں لے آتے ہیں۔روئے زمین پر ایسی بہت سی عالی شان سلطنتیں جرمنوں کے طفیل قائم ہوئیں۔بسا اوقات جرمن عناصر نے ادنیٰ نسلوں کو منظم کر کے اور خود ان کے حاکم بن کر نہایت زبردست سرکاریں قائم کر دیں۔یہ سرکاریں اس وقت تک قائم رہیں جب تک خود جرمنوں کا نسلی حلقہ قائم رہا۔یہ سرکاریں تھیں تو جرمنوں کے ہنر کا کرشمہ اس لیے ہر ایسی سرکار اسی وقت تک قائم رہی جب تک کہ اس کے بنانے والے جرمن عناصر نسلی لحاظ سے باقی رہے۔صدیوں تک روس کے رزق کا اہتمام وہ سرکار کرتی رہی جس کے حاکموں کی بیشتر تعداد جرمنوں پر مشتمل تھی لیکن اب ان حاکموں کا حلقہ توڑ کر برباد کیا جا چکا ہے۔ان کی جگہ یہودیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔اب روسیوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ خود اپنی طاقت سے یہودیوں کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔دوسری طرف خود یہودی بھی اس زبردست سلطنت کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رکھ سکتے یہودی میں ہرگز یہ

صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہودی تو تباہی کے جراثیم ہیں مشرق میں روس کی عظیم الشان سلطنت ایک پکے ہوئے بیر کی طرح اس وقت کی منتظر ہے جب اسے ہڑپ کر کے ہضم کرلیا جائے۔ روس پر یہودیوں کا غلبہ بھی تبھی ختم ہوگا جب اس روسی سرکار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم جرمنوں کو قدرت نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ ہمیں روسی سرکار کی یہ تباہی دیکھنے کا موقع ملے گا۔ یہ سب سے بڑا ثبوت ہے ہمارا وہ نظریہ درست ہے کہ قوموں کی بنیاد ان کی نسل پر ہوتی ہے۔

دہقان کا ہل، اور مجاہد کی تلوار

یہ ہمارا فرض ہے اور قوم پرست اشترا کی تحریک کا نصب العین ہے کہ ہماری قوم میں ایک ایسی سیاسی ذہنیت پیدا کر دی جائے جس سے انہیں احساس ہو سکے کہ انہیں کس جذبہ سے کام لینا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے جو کوششیں کرنی ہیں ان کوششوں کی نوعیت کچھ خاص ہوگی۔ ہمیں محض جوش و خروش سے لطف اندوزی کی خاطر سکندر اعظیم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مہمات فتح کرنی بلکہ ہمیں تو جرمن کاشتکار کا ہل چلانے کی خاطر سخت محنت کرنا ہے، جرمنوں کی تلوار وہ علاقہ صاف کر دے گی جس پر ہمیں بعد میں ہل چلانا ہے۔

یہ طبعی بات ہے کہ یہودی اس پالیسی کی بری سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ یہودی دوسروں کے مقابلہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا تو خود یہودیوں کے لے کوئی امید باقی نہ رہے گی۔ صرف اس بات سے سچے محبان وطن لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہماری نئی حکمت عملی درست بھی ہے اور مناسب بھی۔ لیکن بد قسمتی سے سورت حال اس کے برعکس ہے۔ نہ صرف جرمن قوم پرست پارٹی بلکہ خالص قوم پرست حلقوں میں بھی مشرق کی جانب بڑھنے کی پالیسی شدید مخالفت کی جاتی ہے۔ اس مخالفت کے دوران میں جیسا کہ عام دستور ہے، اکابرین قوم کے نام اور اقوال بھی نقل کیے جاتے ہیں۔ اس انتہا درجہ احمقانہ مخالفت کی تائید میں بسمارک کی روایات کا تذکرہ

کیا جاتا ہے۔ یہ احمقانہ مخالفت جرمن کے مفاد کے لیے سخت مضر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بسمارک نے روس سے اچھے تعلقات پر بڑا زور دیا تھا۔ یہ بات کسی حد تک سچی ہے لیکن جو لوگ یہ تذکرہ چھیڑتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بسمارک نے اطالیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے پر بھی اتنا ہی زور دیا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ ہر فان بسمارک نے ایک مرتبہ اطالیہ سے حلیفانہ معاہدہ بھی کیا تھا۔ اس معاہدے سے بسمارک کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی اطمینان سے آسٹریا کے ساتھ اپنا حساب چکا سکے۔ آج کل بھی اسی پالیسی پر کیوں عمل نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ آج کل اطالیہ وہ اطالیہ نہیں جس سے بسمارک کو واسطہ پڑا تھا۔ خوب لیکن اے معزز حضرات! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آج کا روس بھی وہ روس نہیں جس سے بسمارک کو واسطہ تھا۔

بسمارک ابو الوقت تھا

بسمارک نے کبھی ایسی خارجہ حکمت عملی کا اعلان نہ کیا تھا۔ جس پر عامل ہونا بہر حال ضروری ہوتا۔ نہ ہی بسمارک نے کوئی اصولی پالیسی اختیار کی تھی۔ بسمارک تو ابو الوقت تھا۔ وہ جیسے حالات ہوتے تھے ان کے مطابق کام چلا لیتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو کسی ایسی مستقل پالیسی میں الجھانے کا قائل نہ تھا۔ آج یہ سوال نہیں کہ بسمارک نے کیا کیا۔ سوال یہ ہے کہ آج بسمارک کیا کرتا؟ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ بسمارک کا تدبر اسے کبھی یہ اجازت ہی نہ دیتا کہ وہ روس جیسی کسی ایسی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرے جس کی تباہی مقدر ہو چکی ہے۔

مزید بریں بسمارک نو آبادیات قائم کرنے اور تجارت کو وسعت دینے کا کچھ زیادہ قائل نہ تھا۔ بسمارک کی سب سے بڑی خواہش تو یہ تھی کہ اس نے سرکار کا جو نظام اپنے ہاتھوں سے قائم کیا تھا اسے مستقل شکل دینے ارو اندر سے مستحکم بنانے کا موقع مل جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کی خاطر اس نے روس کے ساتھ معاہدہ کرنا قبول کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس معاہدہ کے بعد عقب سے جرمنی پر کوئی حملہ نہ ہو سکے گا۔ تا کہ بسمارک

مغرب میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ لیکن اس زمانہ کے حالات میں جو بات مفید تھی وہ آج کل کا مضر بن چکی ہے۔

''مظلوم اقوام کی لیگ''

۲۱۔۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ جب ہماری نوزائیدہ تحریک کا بھی بالکل آغاز تھا اور سیاسی محاذ پر]رآہستہ آہستہ اس تحریک کا سایہ پڑنے لگا تھا تو کئی ملکوں میں جابجا جرمن قوم کی آزادی کے لیے انجمنیں قائم کی گئی تھیں۔ اس موقعہ پر کئی حلقوں نے ہماری تحریک سے درخواست کی کہ دوسرے ملکوں کی آزادی کے لیے کوششیں کرنے والی تحریکوں کے ساتھ ہماری تحریک کا رابطہ قائم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں مظلوم اقوام کی لیگ کی جانب سے ہمیں بھی دعوت موصول ہوئی۔ اس مظلوم لیگ کا ان دنوں بڑا چرچا تھا۔ اس مظلوم لیگ نے موٹے موٹے شرکائے کار مصر ہندوستان اور جزیرہ نمائے بلقان کی بعض ریاستیں تھیں لیکن مجھے تو یہ مظلوم لیگ والے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بس نیم ملا اور نیم طبیب قسم کے لوگ ہیں۔ یہ حضرات ڈینگیں تو بہت مارتے ہیں لیکن ان کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ بہر حال کئی جرمن' ان باتونی اہل مشرق کے جھانسے میں آ گئے۔ ان میں خاص طور پر قوم پرست خیالات کے کئی جرمن شامل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک آوارہ گرد ہندوستانی یا کسی مصری طالب علم سے بحث کرتے وقت وہ ہندوستان یا مصر کے کسی نمائندہ سے بات کر رہے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہ تھا کہ زیادہ تر ان کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ انہیں کسی نے معاہدات کرنے کی اجازت نہ دے رکھی تھی۔ غرض ایسے افراد سے بات چیت کرنے کا عملی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ معاملہ جہاں تھا وہیں رہتا۔ اس بات چیت میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ بالکل ضائع ہو جاتا۔ میں ایسی چالوں سے ہمیشہ بچتا رہا۔ اول تو میں ایسا مصروف رہا تھا کہ اس قسم کی بیہودہ گفتگوؤں میں فضول وقت ضائع نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یقین تھا کہ ہم سچ مچ کے نمائندوں سے بات کر رہے ہیں' تب بھی یہ پالیسی بالکل فضول

ثابت ہوگی ممکن ہے کہ یہ پالیسی مضر ثابت ہو۔

قبر کے مردوں سے اتحاد فضول ہوتا ہے

یہ بات قابل افسوس ہے کہ جرمنی نے زمانہ امن میں حلیفانہ معاہدات قائم کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی' اس کا کوئی عملی اور جارحانہ مقصد نہ تھا۔ اس پالیسی کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ جرمنی بعض بوسیدہ ریاستوں کے ساتھ دفاعی معاہدات میں پھنس گیا۔ یہ بوسیدہ ریاستیں ایسی تھیں کہ دنیا ان کو اپنی جانب سے قبر میں دفن کر چکی تھی۔ ترکی اور آسٹریا کسے ایسے معاہدات کوئی خوشی کا موقعہ مہیا نہ کرتے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی عسکری اور صنعتی سرکاریں ہمارے خلاف جارحانہ اقدام کے لیے ایک دوسرے کی اتحادی بن چکی تھیں۔ اس کے جواب میں ہم نے چند از کار رفتہ اور کہنہ سرکاروں کو جمع کر کے بھان متی کے کنبے کے ذریعہ جو ایک دنیا کے ایک زبردست عالم گیر اتحاد کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اس غلط خارجہ پالیسی کی وجہ سے جرمنی کو بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی۔ باوجود یہ مہنگی قیمت ادا کرنے کے جرمن تخیل پرستوں نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اب وہ پھر اس غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ زبردست اور فاتح حکومتوں کو صلح پسندی کی غرض سے ہتھیار رکھانے پر آمادہ کرنے کے لیے مظلوم قوموں کی لیگ بنانا' اگر مضحکہ خیز اور مہلک حرکت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ حرکت مہلک اس لیے ہے کہ ایسی فضول کوششوں میں مشغولیت کے باعث جرمنی ان واقعی امکانات سے محروم رہ جائے گا جنہیں ترک کر کے یہ بے فائدہ اور بے کار ہوائی قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج جرمنی کی حالت ایسی ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ تنکوں کے سہارے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ جہاں ایک خیالی امید پیدا ہوئی کئی لوگ اس کے پیچھے بھاگنا شروع ہو گئے۔ یہ مظلوم قوموں کی لیگ ہو یا لیگ آف نیشنز ہو یا دنیا کا کوئی اور دور از حقیقت پاکھنڈ ہو' ہزار ہا مخلص اس کے پیچھے دوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان پر انگریز راج ختم ہوا تو انگریز مٹ جائے گا

مجھے خوب یاد ہے کہ ۲۱۔۱۹۲۰ء میں بعض قوم پرست حلقوں کے اندر یکلخت کیسی بچوں جیسی امیدیں پیدا ہو گئی تھیں۔ حالانکہ ان کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ ان امیدوں کا محور یہ تھا کہ ہندوستان میں انگلستان کا راج ختم ہونے والا ہے۔ بعض کندہ ناتراش جاہل ایشیائی واعظ یہاں آ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تو آزادی ہندوستان کے داعی ہیں۔ اس کے بعد وہ یورپ کا دورہ شروع کر دیتے ہیں۔ اچھے خاصے معقول لوگوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ برطانیہ کی عالم گیر سلطنت جس کا مرکز ہندوستان میں ہے' اب ختم ہونے والی ہے۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں کہ اس قسم کے خیالات دراصل ان کی اپنی آرزوؤں کے ترجمان ہیں۔ نہ ہی کوئی یہ سوچتا ہے کہ ان کی آرزوئیں کیسی بے بنیاد ہیں۔ جب یہ لوگ سوچتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریز کا راج ختم ہونے والا ہے اور ہندوستان پر انگریز کا راج ختم ہونے سے برطانوی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا برطانوی سلطنت کے خاتمہ سے انگلستان کا اقتدار مٹ جائے گا تو ان لوں کا اپنا استدلال یہ واضح کر دیتا ہے کہ ہندوستان پر تسلط رکھنا انگلستان کے لیے کتنا ضروری ہے۔

انگریز افسر ہٹ گئے تو برطانوی حکومت ختم ہو جائے گی

کیا یہ قوم پرست جرمن جوتشی یہ سمجھتے ہی کہ دنیا کے اس اہم مسئلے کے یہ اندرونی خفیہ راز صرف انہیں پر منکشف ہوئے ہیں۔ کیا جن لوگوں کے ہاتھ میں انگریز کی قسمت کا باگ دور ہے وہ ان حقائق سے ناواقف ہے یہ فرض کر لینا کیا حماقت ہے کہ خود انگلستان کو اپنی بقا کے لیے ہندوستان پر قبضہ جاری رکھنے کی اہمیت کا احساس نہیں۔ اس قسم کے بے بنیاد مفروضات میں الجھے رہنا ثابت کرتا ہے کہ ہم نے پہلی جنگ عظیم سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ یا تو ہم انگریزوں کے عزم بالجزم سے آج بھی ناواقف ہیں یا ہم نے انہیں بالکل غلط سمجھا ہے۔ ورنہ ہم اس مغالطہ میں گرفتار کیسے ہوتے کہ انگلستان سے اپنے ہاتھ سے ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا چھن جانے دے گا۔ انگلستان اس وقت تک ایسا

نہیں ہونے دے گا جب تک وہ اپنے خون کا آخری قطرہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے صرف نہ کر چکا ہوگا۔ ان توہمات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جرمنی درحقیقت برطانوی سلطنت کے عزم بالجزم سے کتنا ناواقف ہے۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ برطانوی سلطنت کا نظم ونسق درحقیقت کن طریقوں سے چلایا جاتا ہے۔ ہندوستان پر انگلستان کا طبقہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک برطانوی راج اپنی حکومت کے افسروں میں غیر نسل کے عناصر کو داخل نہیں کر لیتا۔ ہندوستان کے موجودہ حالت میں اس غلطی کا ارتکاب کا کوئی امکان نہیں ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ختم ہو جانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی زبردست دشمن حکوت اپنی طاقت سے انگریزوں کو شکست دے دے۔ ہندوستانیوں کی بغاوت سے انگریزوں کا راج کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ ہم جرمنوں کو تجربہ ہو چکا ہے کہ انگلستان کو کسی کام پر مجبور کرنا کتنا کٹھن ہے۔ علاوہ ازیں بطور ایک جرمن کے میرے رائے یہ ہے کہ ہندوستان کا برطانیہ کے ماتحت رہنا یا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ہندوستان پر کسی دوسری قوم کا قبضہ ہو۔

مشین گن کی گولیاں ’’جہاد کا جوش‘‘ ٹھنڈا کر دیتی ہیں

یہ امیدیں بھی محض طفلانہ ہیں کہ مصر میں کوئی شجاعانہ بغاوت ہو جائے گی۔ ’’جہاد‘‘ کے نعرہ سے ہم جرمنو کو شاید یہ دھوکہ ہو جائے کہ اب دوسری قومیں ہماری خاطر اپنا خون بہائیں گی۔ اس دھوکہ سے ہم اپنے نفس کو خوش بھی کر لیں۔ اس قسم کی بزدلانہ خیال آرائیاں ہمیشہ ایسی توقعات پیدا کر دیتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں ہی برطانوی فوج کی چند پلٹنوں نے اپنی مشین گنوں سے کچھ گولیاں برسائیں' اور آسمان سے برطانوی بم اولوں کی طرح برسے یہ سارا جوش جہاد ٹھنڈا ہو جائے گا۔

اپاہجوں کی ایک فوج اکٹھی ہو کر کسی زبردست سلطنت پر کامیابی سے حملہ آور نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص جبکہ یہ سلطنت ضرورت پڑنے پر اپنا وجود برقرار رکھنے کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے پر آمادہ ہو۔ میں ایک قوم پرست ہوں میں خوب جانتا

ہوں کہ انسانیت کی نسلی بنیادوں کو قائم رکھنا کتنا ضروری ہے۔ اس لیے میں ان نام نہاد مظلوم قوموں کو نسلی لحاظ سے ذلیل سمجھتا ہوں۔ میرا یہ احساس ہی مجھے اس امر سے باز رکھتا ہے کہ میں اپنی قوم کی تقدیر چند ذلیل نسلوں کی تقدیر سے وابستہ کردوں۔

روس اور جرمنی میں اتحاد نہیں ہونا چاہیے

آج ہمیں روس کے مقابلہ میں بھی یہی روش اختیار کرنی ہے۔ آج روس اپنے اس حکمران طبقہ سے محروم ہو چکا ہے۔ جو جرمن نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے اس حکمران طبقہ سے محروم ہونے کے بعد روس اس قابل نہیں کہ جرمنی اپنی جنگ آزادی میں اسے اپنا حلیف بنائے۔ روس کے نئے حکمرانوں کی نیتیں اور سازشیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں، محض عسکری زاویہ نگاہ سے بھی مغربی یورپ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے روس اور جرمنی کا اتحاد ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ایسے اتحاد کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ ساری دنیا سے جنگ چھڑ جائے گی۔ یہ جنگ روس کے علاقہ پر نہ ہوگی بلکہ جرمنی کے علاقہ پر ہوگی۔ اس جنگ میں جرمنی کو روس سے کوئی موثر امداد نہیں مل سکتی۔ موجودہ جرمن سلطنت کی قوت کے ذرائع ایسے حقیر اور ناکافی ہیں کہ ہم اپنے ملک سے باہر اگر کوئی جنگ چھیڑ بیٹھیں تو اپنی سرحدات کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نہ صرف مغربی یورپ ہمارے خلاف ہوگا بلکہ انگلستان بھی ہمارے خلاف لڑ رہا ہوگا۔ جرمنی کے جس علاقہ پر جرمن صنعت سازی کے کارخانے واقع ہیں وہ بغیر کسی دفاع کے دشمنوں کے مشترکہ حملہ کے سامنے جرمنی کو خالی کرنے پڑیں گے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جرمنی اور روس کے مابین پولینڈ کی سلطنت واقع ہے۔ پولینڈ کی پوری طرح فرانس کے زیر اثر ہے۔ اگر جرمنی اور روس مل کر مغربی یورپ کے خلاف جنگ چھیڑیں تو جرمنی کی مدد کو پہنچنے کے لیے روس کو پولینڈ فتح کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں موجودہ زمانہ کی جنگوں میں سپاہیوں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی سامان حرب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس جنگ میں بھی ہماری وہی حالت ہوگی جو پہلی جنگ عظیم میں تھی بلکہ اس سے بھی

بدتر ہ گی۔ جنگ عظیم کے دوران میں بھی یہ حالت تھی کہ جرمن صنعت کاری کے کارکنوں کو اپنا گھر خالی کر کے اپنے شاندار حلیفوں کو امداد مہیا کرنی پڑتی تھی۔ صنعت اور ہنر کے اعتبار سے گویا جرمنی کو اکیلے ہی جنگ کا بوجھ برداشت کرنا پڑا تھا۔ جس مفروضہ جنگ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اگر اس کی نوبت آئی تو صنعت اور ہنر کے اعتبار سے روس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔

آئندہ جنگ مشینوں سے لڑی جائے گی

دوسری جنگ عظیم میں لڑائی کا سارا انحصار کلدار مشینوں پر ہوگا۔ ایسی جنگ میں مشینی لحاظ سے جرمنی بالکل نہتا ہوگا۔ اس میدان میں جرمنی شرمناک طور پر پیچھے رہ گیا ہے۔ پھر جرمنی کے پاس جو تھوڑی بہت مشینیں ہیں۔ ان میں سے روس کو بھی مدد دینی ہوگی۔ آج روس میں کوئی ایسا علاقہ نہیں جو موٹر سے چلنے والی توپ بنا سکتا ہو۔ ان حالات میں اگر مفروضہ جنگ چھڑ گئی تو بس ہمارا قتل عام ہی ہوگا۔ جرمن نوجوانوں کو اس سے بھی زیادہ جانیں دینی پڑیں گی جو پہلی جنگ عظیم میں وطن پر قربان ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے کی عزت کا سارا حصہ ہمیں کو ملے گا اور نتیجہ یقینی بربادی پہلے سے نظر آ رہا ہوگا۔ فرض کر لیجیے کہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد جرمنی مکمل تباہی سے بچ جائے تو پھر بھی یہ نتیجہ تو ضرور ہوگا کہ جنگ میں اتنے نوجوان مارے جائیں گے کہ جس سے جرمن قوم کا کچومر نکل جائے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ کے لیے جرمنی چاروں جانب سے بڑی بڑی عسکری حکومتوں کے مابین محصور ہو جائے گا۔ بتایئے ایسے حلیفانہ معاہدے اور ایسی جنگ سے فائدہ کیا ہوا؟

اتحاد ہمیشہ جنگ کی خاطر ہوتا ہے

یہاں یہ اعتراض فضول ہے کہ اگر ہم نے روس سے اتحاد کر لیا تو فوراً جنگ نہ چھیڑنی چاہیے بلکہ کچھ مدت جنگ کی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ ہیں نہیں! اوتو جو حلیفانہ معاہدہ جنگ کی خاطر نہ کیا جائے پھر ایسے معاہدے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ جب کوئی معاہدہ

کیا جائے چاہے اس وقت جنگ کا امکنا بعید ہو پھر بھی معاہدہ کا اصل مقصد تو جنگ کا امکان ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ سوچنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ دوسری حکومتیں جرمنی اور روس کے معاہدہ اتحاد کا مطلب نہ سمجھیں گی۔ روس اور جرمنی کا معاہدہ یا تو محض ایک کاغذی معاملہ ہو گا اور اس صورت می ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یا پھر معاہدہ میں جو کچھ لکھا ہو گا اس پر عمل بھی ہو گا۔ اور ایسی صورت میں ساری دنیا کو اس کا پتہ چل جائے گا۔ یہ تصور ہو گا کہ اس پر عمل بھی ہو گا۔ اور ایسی صورت میں ساری دنیا کو اس کا پتہ چل جائے گا۔ یہ تصور کرنا محض طفلانہ حرکت ہے کہ ان حالات میں انگلستان اور فرانس دس سال بیٹھے انتظار کرتے رہیں گے کہ روس اور جرمنی اپنے معاہدہ کے مطابق جنگ کی صنعتی تیاریاں مکمل کرلیں تو پھر دو دو ہاتھ کیے جائیں۔ نہیں نہیں۔ جونہی ایسا معاہدہ کیا جائے گا جرمنی پر جنگ کی بجلیاں فوراً کوندنے لگیں گی۔

لہذا روس سے جرمنی کا معاہدہ کا مطلب یہ ہو گا کہ فوراً ایک نئی جنگ چھیڑ دی جائے اور اس جنگ میں جرمنی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا امور کے ساتھ حسب ذیل کوائف پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے:

آج کل جو لوگ روس پر حکمران ہیں وہ کسی آبرومندانہ معاہدہ کرنے' یا معاہدہ کے بعد اس کی پابندی کے قائل ہی نہیں۔

روس کے حکمران بے رحم اور مکار ہیں

بھلا یہ کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے کہ روس کے موجودہ حکمران خونخوار مجرم ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کے بدترین اور پست ترین نمونے ہیں۔ وہ معاشرہ کے ادنیٰ طبقات سے اٹھ کر حالات کی سازگاری کے باعث ایک دور ابتلا میں ایک زبردست سرکار کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ انہوں نے لاکھوں پڑھے لکھے انسانوں کو مار ڈالا یا انہیں ان کے درجہ سے گرا کر ذلیل کر دیا۔ انہیں خونخواری کی یہ حرکات کرنے میں لطف آتا ہے۔ اب انہیں حکومت کرتے دس سال ہونے کو آئے ہیں۔ وہ اس ظلم و ستم کے ساتھ حکومت کر رہے

ہیں جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی ۔ یہ کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے ۔ کہ یہ حکمران ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس میں درندوں جیسی بے رحمی اور انتہا درجہ کی عیاری اور مکاری کی خصلتیں پائی جاتی ہیں ۔ انہیں یقین ہے کہ باقی دنیا پر ان کی مطلق العنانی کا راج قائم کرنا ہمیشہ سے ان کا فرض چلا آیا ہے ۔ اور اب یہ فرض پورا کرنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے ۔ یہ کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے کہ آج یہودی بلاشرکت غیرے روس کا مالک ہے ۔ یہودی آفاقیات کا قائل ہے ۔ اس لیے وہ جرمنی کو اپنا حلیف تصور نہیں کرتا ۔ بلکہ اس کی نگاہ تو جرمنی ایک ایسا ملک ہے جس کا وہی حشر ہونے والا ہے جو روس کا ہو چکا ہے ۔ بھلا اس کی حالت میں حلیفانہ اتحاد کیسے قائم ہو سکتا ہے جبکہ ایک حلیف دوسرے حلیف کو ختم ہی کرنے پر تلا ہو ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے کیا اتحاد کیا جا سکتا ہے ۔ جو اپنے آپ کو کسی معاہدے کا پابند تصور نہیں کرتے ۔ وہ تو اس دنیا میں خلوص اور ناموس کا اقرار نہیں کرتے' بلکہ لوٹ مار' ٹھگی' دھوکہ اور دروغ گوئی کی وکالت کرتے ہیں ۔ جو شخص نکھٹو جونکوں سے معاہدہ کرتا ہے اس کی حالت اس درخت کی سی ہے جو اپنا رس چوسنے والی امر بیل سے بغل گیر ہونے میں سرسبزی کی توقع رکھتا ہے ۔

یہودی آستین کا سانپ ہوتا ہے

آج روس جس خطرہ کا شکار ہو چکا ہے جرمنی بھی اسی خطرہ میں گرفتار ہے ۔ یہ تو محض کھاتے پیتے گدھے ہی تصور کر سکتے ہیں کہ بالشوزم کو سدھایا بھی جا سکتا ہے ۔ کھاتے پیتے طبقات کا انداز فکر ایسا سطحی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ آج جس کمیونزم سے ہمارا واسطہ ہے دراصل وہ ایک نسل کے خون کی پکار ہے ۔ کمیونزم درحقیقت یہودی قوم کی اس خواہش کا آئینہ دار ہے کہ وہ ساری دنیا کو مسخر کر کے اپنی بادشاہت قائم کر لیں ۔ یہودیوں کی یہ خواہش اسی طرح ان کی فطرت کے مطابق ہے جیسے کہ اینگلوسیکسن قبائل آج دنیا بھر کی حکومتوں پر تسلط جمائے بیٹھے ہیں ۔ اینگلوسیکسن نسل نے آپنی آئندہ حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنے علیحدہ طریقے گھڑ لیے ہیں ۔ اور اپنی افتاد طبع کے

مطابق ان طریقوں سے جنگ لڑتی ہے۔اس طرح یہودیوں نے اپنی افتادطبع کے مطابق اپنا طریقہ کار ایجاد کرلیا ہے اور وہ اس طریقہ سے جنگ کرتے ہیں۔

یہودیوں کا طریقہ یہ ہے کہ ہو سب سے پہلے دوسری قوموں کے معاشرہ میں کسی نہ کسی سوراخ سے گھس جاتے ہیں پھر وہ دوسری قوم کے معاشرہ کے اندر بل بنا کر وہاں ڈٹ جاتے ہیں۔یہودیوں کے ہتھیار دروغ گوئی بہتان تراشی اور اپنے زہریلے نفوذ سے دوسری قوم میں انتشار پیدا کر دینا ہیں۔یہودی ان ہتھیاروں سے اپنے حریفوں کو برباد کر دیتا ہے۔آج روس میں بالشوزم کی جو شکل فروغ پا رہی ہے درحقیقت وہ بیسویں صدی میں یہودیوں کے اس فلسفہ کی ترجمان ہے جس کے ذریعے یہودی ساری دنیا پر چھا جانا چاہتے ہیں۔آج سے پہلے اور قرنوں میں یہودی دوسرے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے لیکن اس کا مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے اور بنیادی طور پر اس کے حربے بھی یہی رہے ہیں۔

عزازیل کی اولاد

یہودیوں کی یہ کوشش ان کی فطرت کے عمیق ترین سرچشموں سے صادر ہوتی ہے اور ان کی طبیعت سے عین مطابقت رکھتی ہے۔کوئی قوم کبھی خود بخود اپنی اولاد پیدا کرنا یا اقتدار کی جستجو کرتے رہنا ترک نہیں کرتی۔صرف بیرونی حالات یا بڑھاپے کا ضعف کسی قوم کو اپنی نسل بڑھانے یا تلاش اقتدار سے باز رکھ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہودی کبھی خود بخود اپنی بادشاہت قائم کرنے کا خواب ترک نہ کرے گا۔نہ ہی وہ اپنی مادی تگ و دو سے دستبردار ہو گا۔یہودی کو باز رکھنے کی یہی ایک صورت ہے وہ یہ کہ کوئی خارجی طاقت اس کو پرے ہٹا دے۔دنیا پر بنی اسرائیل کی بادشاہت قائم کرنے کا خواب یہودیوں کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔کسی قوم میں پیرانہ سالی کے باعث ضعف یا قطع نسل کا عارضہ صرف تب پیدا ہوتا ہے جبکہ اس قوم کا خون پاک نہ رہے۔اور اس میں اختلاط پیدا ہو جائے۔یہودیوں نے اپنا نسلی خون پاک رکھنے کا اہتمام دنیا کی باقی نسلوں سے بہتر کر

رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہودی اپنی فطرت کے راستہ پر اس وقت تک گامزن رہے گا جس وقت تک کوئی اس سے زیادہ قوی طاقت سے اسے باز نہ رکھے۔عزازیل کی اولاد آسمان کے راز معلوم کرنے کے لیے جاسوسی کرنے آتی ہے۔اسے ان کی ملعون جائے پیدائش تک واپس بھیجنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔

آج جرمنی روسی بالشوزم کا اگلا میدان جنگ ہے۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک دفعہ پھر زندہ ہو جائے اگر ہم اپنی قوم کو بین الاقوامیت کے اژدھا کی کنڈلی سے نجات دلانا چاہتے ہیں اگر ہم یہ خواہش رکھتے ہین کہ ہماری نسل کے نسلی خون میں جو آمیزش ہورہی ہے اسے بند کیا جائے‘تا کہ ہماری قوم کی طاقتیں ایک دفعہ پھر آزاد ہو کر ہماری قومیت کے تحفظ کے کام آئیں‘اگر ہماری تمنا ہے کہ حال ہی میں ہماری قوم کو جو حادثہ پیش آیا تھا۔آئندہ کبھی دوبارہ پیش آنے کی نوبت نہ آئے۔تو ہمیں ایک جدید مجاہدانہ اور مبلغانہ اعتقادی نظری پیش کرنا ہوگا۔

شیطان سے نجات کے لیے بھتنوں کی پناہ درکار ہے

اگر ہماری منزل یہ ہے تو یہ کیسی حماقت ہوگی کہ ہم اس ملک سے حلیفانہ اتحاد قائم کریں جس کا آقا ہمارے منصوبوں کا جانی دشمن ہے۔ہم اپنی قوم کو اس زہریلے کنڈل سے کیسے نجات دلا سکیں گے۔اگر ہم خود بھی اس زنجیر میں گرفتار ہو گئے ہم جرمن مزدور کو یہ کیسے سبق دے سکیں گے کہ بالشوزم انسانی کے خلاف ایک خبیث گناہ کا ارتکاب ہے۔اگر ہم خود اس جہنمی فتنہ کے رفیق بن گئے اور اس کے وجود ہم نے تسلیم کرلیا عامتہ الناس کے جن گروہوں کو ایک خاص ضابطہ حیات سے وابستگی پیدا ہو رہی ہے‘ہمیں ان کی مذمت کا کیا حق ہوگا‘اگر خود ہماری سرکار نے اسی ضابطہ حیات کے ماننے والوں کو اپنا حلیف بنالیا۔

عالم گیر صیہونی بالشوزم کے خلاف جدوجہد کا تقاضا ہے کہ ہم سوویٹ روس کے متعلق بھی ایک واضح موقف اختیار کریں۔شیطان سے نجات حاصل کرنے کے لیے

بھتنوں کی پناہ حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

آج قوم پرست حلقے بالشوزم کے ساتھ ساتھ اتحاد قائم کرنے کی تجویز پر غور کرتے وقت بڑے جوش میں آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو جرمنی میں اپنے گرد و پیش نگاہ ڈال کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی حمایت کرنے والے کون ہیں؟ کیا ان قوم پرستوں کا خیال ہے کہ جس پالیسی کی حمایت اور تائید مارکس ازم اور بین الاقوامیت کے حامی اخبارات کر رہے ہیں، کبھی اس سے بھی جرمن قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا یہودی بھی کبھی قوم پرست مجاہدوں کے ہمنوا ہو سکتے ہیں۔

کبھی روس ور جرمنی کا اتحاد بھی ممکن تھا

قدیم جرمن سلطنت نے حلیفانہ معاہدات کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس پر ایک اعتراض خاص طور پر وارد ہوتا ہے کہ وہ اعتراض یہ ہے کہ قدیم جرمن سلطنت نے بھی اس فریق کا ساتھ دے کر اور کبھی اس فریق کا ساتھ دے کر، آخر کار تمام حکومتوں سے اپنے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ اس تذبذب کی وجہ یہ تھی کہ قدیم جرمن سلطنت ہر قیمت پر دنیا کا امن و امان برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ تاہم قدیم جرمن سلطنت کی خارجہ پالیسی میں بھی ایک خوبی ضرور تھی۔ وہ خوبی یہ تھی کہ قدیم جرمن سلطنت نے روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا سلسلہ ختم کر دیا۔

میں صاف گوئی سے یہ اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل میری رائے یہ تھی کہ جرمنی کے لیے بہتر ہوتا کہ اگر جرمنی نو آبادیات اور بحری قوت میں توسیع کے متعلق اپنی احمقانہ پالیسی ترک کر کے انگلستان کے ساتھ روس کے خلاف اتحاد کر لیتا۔ ایسا ہو جاتا تو جرمنی دنیا بھر میں پاؤں پھیلانے کی کمزور پالیسی سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ براعظم یورپ میں نیا رقبہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک اولوالعزم یورپی حکمت عملی پر کاربند ہو سکتا۔

روس میں مقالبیوں کے عالم گیر اتحاد کے حامی جرمنی کے خلاف جو گستاخانہ

دھمکیاں دیتے رہتے تھے وہ مجھے آج تک نہیں بھولیں میں یہ بھی نہیں بھولا کہ روس آئیدن جرمنی کو مضطرب کرنے کے لیے لام بندی کا اعلان کرتا رہتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں بھولا کہ جنگ سے قبل کے ایام میں روس کی رائے عامہ' جرمنی اور جرمن سلطنت کے خلاف' نفرت انگیز خیالات کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ میں یہ بھی نہیں بھولا کہ روس کے مرکزی اہمیت رکھنے والے اخبارات ہمیشہ جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی تائید کیا کرتے تھے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جنگ سے قبل ایک اور راستہ اختیار کرنا بھی ممکن تھا یہ ممکن تھا کہ جرمنی روس کی امداد حاصل کرکے انگلستان پر دھاوا بھول دیتا۔

شکست سے بھی سبق حاصل کیا جاسکتا ہے

آج حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ اگر جنگ سے پہلے ہم اپنے تمام جذبات نظر انداز کرتے ہوئے روس کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتے تو ایسا ممکن تھا لیکن دنیا بھر مین وہ حالات بدل چکے ہیں' اب قسمت پانسہ پھینک چکی ہے۔ یہ پانسہ فیصلہ کن انداز میں پھینکا گیا ہے۔ ہماری قوم کی قسمت کا فیصلہ اب کے ہوکر رہے گا۔

آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں استحکام حاصل کرچکی ہیں۔ ان کا استحکام ہمارے لیے تنبیہ کی علامت ہے ہم بھی اپنی فکر کریں۔ ہماری قوم کو خوابوں کی دنیا سے اتر کر ٹھوس حقائق کی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی۔ بغیر اس کے قدیم جرمن سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنا اور کامیابی کی منزل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

قوم پرست اشترا کی تحریک سمجھتی ہے کہ یہ عظیم اور اہم فرض اب ہمارے سپرد ہو چکا ہے۔ ہم اس فرض کی ادائیگی سے اسی صورت میں سبکدوش ہو سکتے ہیں جب خوش فہمیاں ایک طرف رکھ کر عقل کی روشنی میں قدم اٹھایا جائے۔ ایسا ہوگیا تو ۱۹۱۸ء میں ہم پر جو آفت آئی تھی وہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ثابت ہوگی۔ شکست سے سبق حاصل کرکے ممکن ہے کہ جرمن قوم اپنی خارجہ پالیسی کے لیے ایک بالکل نیا

انداز اختیار کرے۔قوم کے اندرونی استحکام کی بنیاد ایک جدید ضابطہ حیات پر ہوگی۔ یوں اندرونی استحکام حاصل کر لینے کے بعد جرمن کے لیے ممکن ہوگا کہ بیرونی دنیا سے بھی اپنے تعلقات مستقل بنیادوں پر استوار کرے۔ایسا ہوگیا تو پھر جرمنی کے پاس بھی سیاسی روایات کی ایک کسوٹی ہوگی۔ جب کبھی جرمن کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوگی تو اسی کسوٹی پر رکھ کر طے کیا جاسکے گا۔ کہ یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ انگلستان کو شروع ہی سے ایسی سیاسی روایات حاصل ہیں۔ایک زمانہ میں روس بھی ایسی روایات کا حامل تھا۔اور فرانس تو متعدد بار اپنی سیاسی روایات سے کام لیتا رہا۔

جرمن خارجہ حکمت عملی کے بنیادی اصول

جرمن قوم کی سیاسی روایات مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہوں گی۔ بیرونی ممالک سے تعلقات قائم کرتے وقت ہمیشہ ان سیاسی روایات کو مدنظر رکھا جائے گا:

جرمنی پر واجب ہے کہ اپنے سوا یورپ میں کوئی دوسری زبردست سرکار قائم نہ ہونے دے۔ اگر جرمنی کی سرحدات سے متصل کوئی دوسری عظیم عسکری سرکار قائم کرنے کی کوشش ہو تو جرمنی کو حق حاصل ہوگا' بلکہ اس کا فرض ہوگا کہ تمام ممکن ذرائع استعمال کرتے ہوئے' ایسی سرکار کو یا تو قائم ہی نہ ہونے دے' اور یا پھر اسے پیس کر رکھ دے۔ اس مقصد کے لیے ضرورت ہو تو فوج کشی سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے۔ایسی سرکار سے خطرہ ہوسکتا ہے کہ وہ جرمنی پر حملہ کردے۔بہرحال ایسی سرکار کو عسکری قوت نہ بننے دینا چاہیے۔ یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ ہماری قوم کی قوت کا انحصار نوآبادیات پر نہ ہو۔ بلکہ خود یورپ میں ہمارے وطن کے رقبہ پر ہماری طاقت کا انحصار ہو۔ جرمن سلطنت کو اس وقت تک محفوظ نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اسے ایسا علاقہ میسر نہ آجائے جو خود جرمنی کے ساتھ متصل ہو' اور آنے والے صدہا سال تک اس رقبہ میں سے جرمن نسل کے ہر فرزند کو زمین کا کچھ حصہ میسر آسکے جو خود اس کی اپنی ملکیت ہو' یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا کے تمام حقوق میں سے مقدس ترین حق یہ ہے کہ انسان کا زمین کے ایک ٹکڑے پر قبضہ ہو جس پر

وہ اپنے لیے کھیتی باڑی کر سکے۔ زمین کا یہ رقبہ حاصل کرنے کے لیے جو خون بہایا جاتا ہے وہ سب سے بڑی پوتر بھینٹ ہے۔

دشمن کو بے یارو مددگار بنا دینا چاہیے

میں یہ باب ختم کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جرمنی کے لیے موجودہ یورپ میں حلیفانہ اتحاد قائم کرنے کا آج کل ایک ہی امکان باقی ہے۔ حلیفانہ معاہدات کے سلسلہ میں جرمنی جلکو جو مسئلہ درپیش ہے اس بات میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انگلستان اور اطالیہ ہی ایسے ممالک ہیں جن سے ہمیں حلیفانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسا اتحاد جرمنی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ میں ایک دفعہ پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ایسے معاہدہ کی عسکری اہمیت کیا ہوگی۔

ایسے معاہدات کے عسکری نتائج اس سے بالکل الٹ ہوں گے جو جرمنی اور روس کے اتحاد سے لازم آتے ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ انگلستان اور اطالیہ کے ساتھ جرمنی نے صلح کر لی تو اس سے جنگ کا کوئی خطرہ نہیں۔ ایسے معاہدہ کی مخالفت سوائے فرانس کے اور کوئی حکومت نہ کرے گی۔ فرانس کی یہ حیثیت نہیں کہ جنگ چھیڑ سکے۔ اس معاہدہ سے جرمنی کو امن سے تیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جب یہ تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو ان معاہدات کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کوئی نہ کوی ایسی صورت نکل آئے گی کہ فرانس کے ساتھ جمع خرچ برابر کر لی جائے۔ ایسے معاہدہ کی بڑی اہمیت یہ ہوگی کہ اس کی تکمیل کے بعد جرمنی پر فوری حملہ کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا۔ جرمنی کے خلاف اتحادیوں نے جو گٹھ جوڑ بنا رکھا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے گا فرانس، روس اور انگلستان نے ہمارے خلاف جو محاذ قائم کر رکھا ہے، اور جس نے ہمیں اتنا نقصان پہنچایا ہے وہ ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ ہماری قوم کا جانی دشمن فرانس تنہا رہ جائے گا۔ یہ درست ہے کہ شروع شروع میں اس معاہدہ کا اثر محض اخلاقی دباؤ تک محدود رہے گا۔ لیکن یہ اخلاقی دبائع بھی جرمنی کو آزادی عمل کا موقعہ مہیا کر دے گا۔ بحالات موجودہ تو

ہم اس آزادی عمل کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انگلستان، جرمنی اور اطالیہ کا باہمی معاہدہ ہو گیا تو ہر معاملہ میں پیش دستی کا موقعہ اس معاہدہ کے ارکان کو حاصل ہو گا۔ فرانس کے لیے پیش دستی کا کوئی موقع نہ رہے گا۔

ساتھی ہنر مند ڈھونڈنے چاہئیں

ایک اور فائدہ یہ ہو گا کہ بیک جنبش قلم آج کل جرمنی جنگی لحاظ سے جس کمزور حیثیت میں ہے اس سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ جرمنی کی ایک جانب کی سرحدات ہر قسم کے حملہ سے محفوظ ہوں گی۔ جرمنی کو یہ ضمانت مل جائے گی کہ جرمنی کے لیے خوراک کا سامان اور اجناس خام سمندر کے راستہ ہمیشہ آتی رہیں گی۔ اس نئے معاہدہ کا ایک یہ فائدہ بھی ہو گا۔

اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ یہ ہو گا کہ اس نئے معاہدہ میں شریک ہونے والی تمام حکومتوں میں صنعت سازی اور ہنر مندی کی ایسی استعداد ہو گی جس سے وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گی۔ جرمنی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جرمنی کو ایسے اتحادی حاصل ہو ں گے جو اس کا خون چوس کر جونکوں کی طرح زندہ نہ رہیں گے بلکہ خود جرمنی کی صنعت سازی اور ہنر کاری میں مدد دیں گے۔

ایک اور بات بھی نہ بھولنی چاہیے۔ ایسا معاہدہ ہو گیا تو جرمنی کے حلیف ترک اور روس جیسے **ملک** نہ ہوں گے۔ دنیا کی سب سے زبردست سلطنت یعنی برطانیہ اور ایک نوجوان قوم پرست ملت یعنی اطالیہ جرمنی کو یورپ میں جدوجہد کے ایسے مواقع مہیا کر دیں گے جو گزشتہ جنگ عظم میں گلی سڑی نیم مردہ حکومتوں کے اتحاد سے جرمنی کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔

دوست بنانے کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا پڑتا ہے

میں یہ بات پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایسے معاہدہ کو تکمیل تک پہنچانے کے راستے میں بڑی مشکلات باقی ہیں۔ لیکن انگلستان فرانس اور روس کے معاہدہ میں بھی تو بڑی

مشکلات تھیں۔ اس اتحاد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم کو بڑا دخل تھا۔ اس کے رستہ میں بعض ایسی مشکلات حائل تھیں جو اتحاد میں شامل ہونے والی اقوام کے مزاج کا جزو سمجھنی چاہئیں۔ باوجود اس کے اس نے جو کامیابی حاصل کی۔ ہمیں بھی ضرور کامیاب ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہم کامیاب ہو کر رہیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ایسے معاہدہ کی ضرورت کا احساس ہمارے اندر اس جوش سے پیدا ہو جائے کہ ہم سمجھ بوجھ سے کام لیں' اور اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اپنے جذبات کو قائم رکھ سکیں۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ جب بحالات موجودہ ہمارے مسائل کا احساس ہمیں عمل پر مجبور کر دے۔ ہم اپنے سامنے ایک مقصد رکھ لیں گے۔ پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش کریں گے۔ گزشتہ دس بیس سال میں ہماری خارجہ حکمت عملی سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ہم انہیں نہ دہرائیں گے۔ اس زمانے میں تو ہمارا کوئی واضح مقصد ہی نہ تھا۔

بڑے بڑے زخموں کا علاج ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے گھاؤ خود ہی بھر جاتے ہیں

مستقبل میں ہماری خارجہ حکمت عملی کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو ہم مشرق کی جانب بڑھیں گے اور یا مغرب کی جانب۔ اب ہمارا مقصد فقط یہ ہونا چاہیے کہ ہم مشرق کی جانب بڑھیں اور نیا رقبہ حاصل کریں جرمن قوم کو اس نئے رقبہ کی ضرورت ہے۔ یہ پالیسی پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں طاقت ور بننے کی ضرورت ہے۔ ہماری قوم کا جانی دشمن فرانس ہمیں اپنے زیر اثر رکھ کر یہ طاقت نہیں کرنے دیتا۔ وہ پوری بے رحمی سے ہماری قوت کے وسائل خود چھین کر لے جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یورپ پر فرانس کا تسلط روکنے کے لیے جو قربانی بھی دینی پڑے' اس سے دریغ نہ کرنا چاہیے' بحالات موجودہ یورپ میں ہماری حلیف ہر وہ حکومت ہے جو یورپ پر فرانس کا تسلط گوارا نہیں کرتی۔ ایسی حکومتوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہمیں جو دقتیں درپیش ہیں' انہیں دور کرنے کے لیے ہمیں کسی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اس راہ میں جو قربانی بھی دینی پڑے

وہ ہمیں قبول ہونی چاہیے۔شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنے بدترین دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ چھوٹے چھوٹے زخم خود ہی جیسے زمانہ گزرے گا بھر جائیں گے۔ بڑی ضرورت یہ ہے کہ بڑے زخموں کی جراحی کرنے میں پوری سختی سے کام لیا جائے۔اور پھر انہیں مندمل ہونے دیا جائے۔

ہمیں اپنے منصب کے مطابق شان پیدا کرنی چاہیے

یہ تو قدرتی امر ہے کہ ساری قوم کے دشمن ایسی کوششوں کو روکنے کے لیے غصہ سے بھونک بھونک کر دیوانہ ہو جائیں گے۔لیکن ان کا یہ بھونکنا ہم قوم پرست اشتراکیوں کو اس بات سے باز نہ رکھ سکے گا کہ ہم اپنے دل کی بات پورے زور سے بیان کرتے رہیں۔ہم تو جن اقدامات کو ضروری خیال کرتے ہیں' ان کی تلقین کرتے ہی رہیں گے۔ ہم رائے عامہ کے موجودہ رجحان کا بھی مقابلہ کریں گے۔یہودی اپنی عیاری سے جرمنوں کی نادانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے' اس رائے عامہ کو اور بھی بھڑکا دیں گے۔یہ رائے عامہ ہمارے خلاف غیظ وغضب کا اظہار کرے گی۔جس دن ہم نے دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیرنا شروع کر دیا اس دن ہماری مشکلات خود بخود کم ہو جائیں گی۔آج ہم دریا کی غرقاب چٹان کی حیثیت رکھتے ہیں۔قسمت کو منظور ہے تو عنقریب ہی وہ دن آنے والا ہے جب یہ چٹان تہ سے ابھر کر دریا کا رخ پلٹ دے گی۔

اندریں حالات یہ ضروری ہے کہ باقی کی دنیا کی نگاہوں میں ہماری تحریک کا موقف واضح ہو جائے۔وہ سمجھ سکیں کہ ہماری تحریک کا ایک واضح سیاسی پروگرام ہے۔ہم اس پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔قدرت نے ہمیں ایک زبردست مہم سر کرنے کے لیے چن لیا ہے۔اب ہمیں اپنے اندر وہ شان پیدا کرنی ہے جس سے ہم نگاہ ڈالنے والے شناخت کر سکیں۔

دشمن کی ایک نہ سننی چاہیے

جب ہمیں خود یہ احساس ہو جائے گا کہ ہم نے جو جارحانہ حکمت عملی اختیار کی ہے

اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ ممکن نہیں تو اس پختہ یقین سے ہمارے اندر وہ عزم بالجزم پیدا ہو جائے گا جس کے بغیر ہم اپنے مخالفین کی کوششوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ ہمارے مخالفین کبھی اخبارات کے ذریعہ ہم پر تابڑتوڑ گولہ باری کریں گے، کبھی بڑی دلآویز آواز میں سرگوشیاں کی جائیں گی کہ ہمیں ذرا نرمی برتنی چاہیے۔ ادھر سے پیچھے ہٹ جائیں یا ادھر سے ایک طرف سرک جائیں۔ تاکہ ساری دنیا تو ہماری مخالف نہ ہو جائے۔ چنانچہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی ان بھیڑیوں کی ہمنوائی بھی اختیار کر لینی چاہیے۔ جو ہمارا خون چوسنے کے لیے وحشیانہ انداز سے چلا رہے ہیں۔

☆☆☆

باب پانزدہم :: خود حفاظتی کا حق

شکست پر مجبور بھی ہو جاؤ تو رضا مند نہ ہونا چاہیے

۱۹۱۸ء میں جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد جرمنی نے جو پالیسی اختیار کی اس کا تقاضا یہ تھا کہ بتدریج جرمنی مکمل طور پر غلام بن جاتا۔ جہاں تک عقل انسانی کام کرتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قسم کی مثالوں کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی قوم پوری طرح سے مجبور ہوئے بغیر ہتھیار ڈالتی ہے تو پھر وہ بڑی ذلتیں اور جرمانے قبول کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔ اسے یہ جرات نہیں ہوتی کہ اپنی تقدیر بدلنے کے لیے دوبارہ وہ ہتھیار اٹھائے جو ایک دفعہ دشمن کے سامنے ڈال دیے تھے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہے۔ ایک دانش مند فاتح قوم مفتوح پر اپنے جرمانے اور احکام بتدریج اور آہستہ آہستہ ہی نافذ کرتا ہے۔ ایک وقت میں اتنا ہی بوجھ ڈالا جاتا ہے کہ جو قابل برداشت ہو۔ پھر ایک دن یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ فاتح کو یقین ہو جاتا ہے کہ مفتوح قوم کے اندر سے غیرت کی آخری رمق بھی ختم ہو چکی ہے۔ جو قوم برضا و رغبت اپنے کسی دشمن کے سامنے جھک جاتی ہے۔ اس کی غیرت کو اسی دن سے گھن لگ جاتا ہے۔ پھر جب ایسی مریض غیرت والی قوم اور دوسرے ظلم کے درمیان کچھ وقفہ رکھا جائے۔ ایسا ہوتا رہے تو یہ غیرت کو بیچنے والی مفتوح قوم باری آنے پر ہر ظلم کو یہ سمجھ کر برداشت کر لیتی ہے کہ اگر اسے برداشت نہ کیا اور اگر اس کا مقابلہ نہ کیا تو کہیں کوئی نیا ستم نہ ٹوٹ پڑے۔ یہ نیا ستم بھی جب ٹوٹتے تو اس سے اگلے ستم کے ڈر سے اسے بھی برداشت کر لیا جاتا ہے۔ بہر حال ہتھیار اٹھانے کا عزم ہر مرتبہ یہ سوچ کر ملتوی کر دیا جاتا ہے کہ اگلی مرتبہ ایسا ہوا تو پھر یوں کریں گے۔ جوں جوں مظالم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے توں توں مقابلہ کرنے کی سکت

بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ اور جوں جوں مقابلہ کرنے کی سکت ختم ہوتی جاتی ہے توں توں یہ خیال تقویت پکڑتا جاتا ہے کہ افسوس پہلے مقابلہ نہ کیا۔ اب تو حالت اتنی خراب ہو چکی ہے۔ کہ مقابلہ کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ بزدل اور بے غیرت قومیں رفتہ رفتہ یوں ہی ہر بے عزتی کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ بے چارگی کا احساس ہمیشہ ان کے بغاوت کے ارادے کو اگلے روز پر ملتوی کرتا رہتا ہے۔ غرض غلامی کے تجربہ سے خوئے غلامی اور بھی راسخ ہو جاتی ہے۔ یوں شروع شروع میں جن مظالم کا ذکر بھی نا قابل برداشت ہوتا ہے آخر کار ان کو بڑی ہنسی خوشی سے رعایتیں سمجھ کر برداشت کرلیا جاتا ہے۔

اگر ایسی قوم کبھی بغاوت بھی کر دے تو دنیا کی دوسری قومیں یہی سمجھتی ہیں کہ جب اس سے پہلے اتنا کچھ برداشت کرلیا تھا تو اب اتنی سی بات پر ایسا بگڑنے کا کیا موقعہ تھا؟ زمانہ قدیم میں قرطاجنہ کی تباہی ایک خوفناک مثال پیش کرتی ہے۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم آہستہ آہستہ رو بہ انحطاط ہو جاتی ہے تو اس کا انجام کیسی تباہی ہوتا ہے۔ یہ تباہی خود قوم کی اپنی غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

غیرت بڑی چیز ہے

فنون حرب کے مشہور ماہر جرمن مصنف کلازوٹس نے اپنی کتاب موسومہ ''تین شرائط ایمان'' میں اس حقیقت کو اچھی طرح بیان کیا ہے' اس نے اس مرض کو تشخیص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب کوئی قوم بزدلی سے ہتھیار ڈال کر غلامی کا داغ اپنی پیشانی پر لگالیتی ہے۔ تو پھر یہ داغ آسانی سے نہیں دھلتا۔ اس حرکت کے بعد غلام قوم کے ہر خون میں زہر کے جو قطرات داخل ہو جاتے ہیں وہ پھر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہتے ہی۔ اس زہر سے آنے والی نسلوں کی قوت کو بھی مفلوج ہو جاتی ہے۔ ان کو گھن لگ جاتا ہے تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے کلازوٹس نے لکھا ہے کہ جب کوئی قوم جان پر کھیل کر باعزت طور پر جنگ لڑتی ہے تو ایسی حالت میں اگر اسے شکست بھی ہو جائے

اگر اسے غلام بھی بنالیا جائے تو اس کی دوبارہ زندگی اور آزادی بحال ہو جانے کی امید باقی رہتی ہے۔ایسی جری قوم کسی ایسے کٹے ہوئے پیڑ کے تنا کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑیں سرسبز ہوں۔اس سے ایک نہ ایک دن ایک نیا درخت ضرور پھوٹتا ہے۔

یہ تو قدرتی بات ہے کہ جب کوئی قوم غیرت کے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور اس کی قوت کردار ضائع ہو جاتی ہے تو پھر وہ مذکورہ بالا قاعدہ کو درست نہیں مانتی۔لیکن جو قوم اس عقیدہ پر کاربند رہے وہ کبھی ہیشہ کے لیے پست نہیں ہوتی۔صرف وہی قومیں تباہ ہوتی ہیں جو اس اصول کو بھول جاتی ہیں یا اسے تسلیم ہی نہیں کرتیں۔یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے بزدلانہ طور پر ہتھیار ڈالے تھے ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اب انہیں یکلخت ہوش آجائے گا یا یہ کہ وہ اپنا طرز عمل بدل ڈالیں گے۔ان سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اس راستہ پر چلنے لگیں گے جس پر انسان کی عقل کا تقاضا ہے کہ غیرت مند قوموں کو چلنا چاہیے۔اس کے برعکس یہ بزدل لوگ ہمیشہ اس قاعدہ کی تردید کرتے ہیں۔ان کی یہ تردید اس وقت تک جاری رہتی ہے کہ جب قوم یا مستقل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے یا پھر قوم کا بہتر عنصر سامنے آکر خائن اور غدار عناصر کے ہاتھ سے جبراً ہتھیار چھین لیتا ہے۔اگر غلامی کی زنجیریں قوم کو مستقل طور پر جکڑ لیں تو برسر اقتدار بزدل طبقہ اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ان کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ فاتح عام طور پر غلاموں کی نگرانی اور جمعداری کے فرائض انہیں بزدلوں کے سپرد کر دیتا ہے۔یہ بزدل پاجی تو ہوتے ہیں اس لیے انہیں جو اقتدار حاصل ہوتا ہے' اسے اپنی قوم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔وہ اپنا اقتدار استعمال کرتے وقت ایسے ستم توڑتے ہیں کہ خود دشمن قوم کا کوئی ظالم سے ظالم فرد بھی ایسا ظلم نہیں توڑتا۔

دشمن سے رحم کی امید نہ رکھنی چاہیے

۱۹۱۸ء کے بعد جرمنی میں جو واقعات پیش آئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاکارانہ طور پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر اس سے رحم کی امید رکھا کیسی نادانی کی

حرکت ہے۔اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے سیاسی اعتقادات اور عوام کی سیاسی سرگرمیوں پر بہت اثر ہوا۔ میں نے ''عوام'' کا نام جان بوجھ کر لیا ہے۔ کیونکہ میں یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ اس زمانہ کے قائدین جو فرائض ادا کرنے سے قاصر رہے اور جن حرکات کے مرتکب ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کی طرح انہیں بھی حقیقت حال کا علم نہ تھا۔ نہ ہی میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ اس طرح جو تباہی آئی ۔وہ ان کی نادانی کے باعث تھی ۔ جنگ عظیم کے بعد جرمن قوم کی قسمت کی باگ ڈور کھلے بندوں یہودیوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم پر جو مصیبتیں ٹوٹیں ان کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے اس وقت کے قائدین کو صحیح صورت حال کا علم نہ تھا۔اس کے برعکس واقعات کی شہادت یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری قوم کو جان بوجھ کر تباہی کے راستہ پر واقعات کی شہادت یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری قوم جان بوجھ کر تباہی کے راستہ پر چلایا گیا۔اگر اس زمانہ میں جرمنی کی پالیسی کا ذرا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خارجہ پالیسی جیسی احمقانہ نظر آتی ہے درحقیقت ایسی احمقانہ نہ تھی ۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ خارجہ پالیسی بعض سوچے سمجھے' چالاکی سے طے کیے ہوئے ایسی منطقی اصولوں پر مبنی تھی جن پر باقاعدہ عمل کیا گیا۔ان اصولوں کا مقصد یہ تھا کہ اس عقیدہ کو فروغ دیا جائے کہ دنیا پر یہودیوں کی بادشاہت قائم ہونی چاہیے۔

غلامی برداشت کرنے سے خوئے غلامی پختہ ہو جاتی ہے

۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۳ء تک پرشیا بربادی کی حالت میں تھا۔نپولین نے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا۔باوجود اس کے یہ غلامی کا دور قوم کے اندر نیا ولولہ پیدا کرنے کا سبب بنا۔قوم میں ایک دفعہ پھر یہ عزم پیدا ہوا کہ جنگ لڑنی چاہیے۔ ۱۹۱۸ء سے لے کر آج تک اتنی ہی مدت گزر چکی ہے لیکن ہمیں ذلت کے اس دور سے ویسا کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ برعکس اس کے جرمن سرکار کی قوت مسلسل کمزور ہوتی چلی آئی ہے۔

نومبر ۱۹۱۸ء کے سات سال بعد لوکارنو کے معاہدہ پر دستخط ہوئے۔

غرض اوپر میں نے زوال وانحطاط کے جس تسلسل کا تجزیہ کیا ہے اس کا عمل جرمن قوم پر شروع ہو چکا ہے' جب ایک دفعہ جنگ بند کرنے کے شرمناک معاہدہ پر دستخط کیے گئے تو پھر ہماری قوم میں یہ جرات اور حوصلہ پیدا نہ ہوا کہ ہمارے دشمن نے ہم پر جو مسلسل ظلم وستم توڑنے شروع کیے' ان میں سے کسی ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے لخت کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جاتے دشمن کو بھی اتنی عقل تھی کہ اس نے اپنے تمام مطالبات یک لخت پیش نہ کیے۔ دشمن ایک وقت میں اتنا ہی مطالبہ یا جرمنہ عائد کرتا رہا کہ جو اس کی رائے میں اور خود ہماری جرمن حکومت کی رائے میں وقتی طور پر لوگوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا تھا۔ یوں کسی مرحلہ پر یہ خطرہ پیدا نہ ہوا کہ رائے عامہ بغاوت کر دے گی۔ جوں جوں ہر ایک جرمانہ اور سختی برداشت کی گئی توں توں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر ظلم برداشت کرنے کے بعد کسی نئے ستم کے خلاف احتجاج کرنا' اس لیے ناواجب معلوم ہوتا تھا کہ جب ایسے کئی مظالم پہلے برداشت کر چکے ہیں تو اب اس میں ایک سختی کا مقابلہ کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے یہی وہ زہر کا قطرہ ہے جس کا کلازوٹس کے مذکورہ بالا قول میں ذکر ہے۔ جب ایک دفعہ بزدلی دکھائی جائے تو اس کے بعد حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ ہر گزشتہ کم ہمتی آئندہ کے لیے ضمیر کو کمزور کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ بے غیرتی قوم کے گلے میں لعنت کا طوق بن کر پڑتی رہتی ہے۔ اس وزنی طوق کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم غلامی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

زحمت بھی قدرت کی رحمت ہوتی ہے

یوں درجہ بدرجہ جرمنی کے ہتھیار چھین لیے جرمنی پر ستم توڑنے اور جرمنی کو اقتصادی طور پر لوٹ لینے کے احکام یکے بعد دیگرے نافذ ہوتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جرمنی سیاسی لحاظ سے لاچار ہو گیا۔ اس سے ساری قوم میں پست ہمتی پھیل گئی۔ اس پست ہمتی نے نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ جرمن سے تاوان جنگ وصول کرنے کے لیے مسٹر

ڈاویز کا منصوبہ پیش ہوا تو ہم نے اسے سایہ رحمت سمجھا۔ لوکارنو کے معاہدہ پر دستخط ہوئے تو ہم نے اسے کامیابی جانا۔ جب چاروں جانب یہ مصائب ٹوٹ رہے تھے تو ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا جسے عاقبت بینی کی نگاہ سے واقعی قوم کے حق میں مفید سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ واقعہ ی تھا کہ انسان تو غچہ کھا گئے لیکن قدرت کو کیسے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ جب ہم نے لعنت کو رحمت سمجھا تو قدرت نے ہماری اس حد تک دستگیری کی کہ اس لعنت کے بعد ہمیں مسلسل زحمت میں مبتلا رکھا اور کبھی ایک پل بھی راحت کا منہ نہ دیکھنے دیا۔ جس دن ہم نے غلامی کی لعنت کو قبول کیا ہے مصیبت اور زبوں حال ہماری قوم پر مسلط ہو چکے ہیں۔ ذلت و مسکنت ہمارے تنہا وفادار رفیق ہیں۔ جنھوں نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ تقدیر نے ہمارے ساتھ کوئی رعایت برت کر ہمیں غافل ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ قسمت نے ہمیں وہی کچھ عطا کیا ہے جس کے ہم مستحق تھے۔ جب ہم نے غیرت اور ناموس کی قدر پہچاننے سے انکار کر دیا تو فطرت نے ہمیں ہ سبق سکھایا کہ حریت سے محروم ہو کر تم پیٹ سے بھی...... بھوکے رہ گے۔ آج قوم بھوک سے مضطرب ہو کر روٹی مانگنے کے لیے چلا رہی ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ وہ دن بھی قریب ہے جس سے ہم حریت کی دعائیں مانگنا سیکھ جائیں گے۔

گدھے اصطبل سے نکل کر مسند حکومت پر بیٹھ گئے

۱۹۱۸ء کے بعد ہماری قوم ایسی رو بہ زوال ہو چکی تھی کہ ہماری تباہی سب پر عیاں تھی۔ اس بربادی سے دلوں میں تلخی بھر گئی تھی یہی وہ زمانہ تھا کہ جس پر ہم پر دشمنوں نے بدترین مظالم توڑے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ پہلے سے لگایا جا سکتا تھا۔ ہماری قوم نے جس حکومت کی اطاعت اختیار کر لی وہ جیسی پھوہڑ اور نا اہل تھی ویسی ہی مغرور اور برخود غلط بھی تھی۔ اس حکومت کی نالائقی کا بڑا ثبوت یہ تھا کہ جس کسی نے اسے تنبیہہ کی جس نے اس حکومت سے ذرا روگردانی کی یا جس نے حکومت کی ناراضگی مول لی۔ اسے ملک کا غدار مشہور کر دیا گیا۔ اس کے بعد چشم حیرت نے یہ تماشا دیکھا اور